ابّا تمہارے ہم سے خفا جانے کیوں ہوئے
حالانکہ ہم تھے وقتِ ملاقات ہوش میں
اِتنا ضرور ہے کہ ہُوا جب مصافحہ
ہم نے دبا دیا تھا جوانی کے جوش میں

بیڑیاں ٹوٹیں، زمانہ ہوگیا
رُخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی ملی تھی رات میں
سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

لیڈروں سے آج تک پایا بھی کیا؟
اُن کے منصوبوں کا سرمایا بھی کیا
اُن کے وعدوں پر بھروسہ کیا کریں
ریت کی دیوار کا سایا بھی کیا!

جذبات دوستی کے نہیں ہیں تو کیا ہوا
آپس میں بات چیت کی راہیں کھلی رہیں
یہ سب سے اوّلین سیاسی اصول ہے
دل کے کواڑ بند ہوں یا نہیں کھلی رہیں

مصروفِ شغلِ ساغر و مینا رہا کروں!
یا روز و شب عبادت و ذکرِ خدا کروں
عمرِ دراز مانگ کے لایا تھا چار دن
دو کٹ گئے ہیں اور دو باقی ہیں کیا کروں

ایک محفل میں سُنایا میں نے جب اپنا کلام
ایک اک مصرعِ سخن کی آبرو ہونے لگا
میرے چہرے پر ٹماٹر بیک آنے لگے
دیکھتے ہی دیکھتے میں سُرخرو ہونے لگا

اک یہی اہلِ سیاست میں کمال اچھا ہے
ہر الکشن میں نئے وعدوں کا جال اچھا ہے
اُن سے آجاتی ہے اُردو کے بھی منہ پر رونق
ہم سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

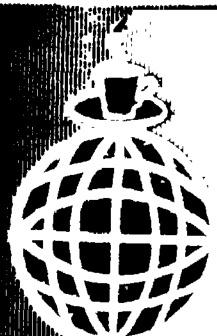
کبھی غصّہ میں وہ دیکھا نہ جائے
غرور اُس میں ذرا پایا نہ جائے
بہت ہی منکسر ہوتا ہے نیتا
کسی کرسی پہ جب تک آ نہ جائے

آئندہ برس

قوم کے قائد یہ فرماتے تھے کل تقریر میں
امن کا پودا نمو پائے گا آئندہ برس
وہ علاقہ واریت ہو، یا عقائد کا جنوں
ہر تعصب ختم ہو جائے گا آئندہ برس

اُن کے فرمانے پہ ہم بھی سر ہلاتے تھے مگر
دیکھنا ہے کس برس آئے گا آئندہ برس؟


سوغات
سلور جوبلی نمبر



زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

5702

جلد : ۲۷
شمارہ : ۱ و ۲

جنوری
فروری ۱۹۹۴ء

سلور جوبلی نمبر

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر : عابد معز

مجلسِ ادارت :
مظفر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

اوورسیز کمیٹی
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (ریاض)
سعید شوکت (")
ایس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلسِ مشاورت :
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

سرورق : طالب خوندمیری
کتابت : محمود سلیم۔ محمد غالب۔ فضل محمد۔ محمد [illegible]
طباعت : دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ : بارہ روپے
زرِ سالانہ : [illegible] روپے
بیرونی ممالک سے : ۲۰ امریکی ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ :
ادارہ شگوفہ [illegible]، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس : 557716 مکان : 521064

مزاحیہ نثر و نظم کے کل ہند انعامی مقابلے

زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" کی سلور جوبلی کے موقع پر ادارہ "شگوفہ" کی جانب سے مزاحیہ نثر و نظم کا ایک کل ہند مقابلہ منعقد کیا جارہا ہے۔ اس مقابلہ کے لیے دو عنوانات "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟" اور "اپنے بھارت میں کیا نہیں ؟" تجویز کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی عنوان پر مزاحیہ مضمون یا نظم لکھی جاسکتی ہے۔ صفحات یا اشعار کی کوئی قید نہیں۔ کسی بھی عمر کے ادیب یا شاعر مقابلہ میں حصہ لے سکتے ہیں۔

مقابلہ میں اول اور دوم آنے والوں کو ان کی غیر مطبوعہ نثری و شعری تخلیق پر ۶۰۰ اور ۴۰۰ روپے کے دو علٰحدہ علٰحدہ انعامات دیئے جائیں گے۔ ان کے علاوہ ترغیبی انعامات بھی دیئے جائیں۔

تخلیقات ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۲۵ فروری ۹۴ء ہے۔ مقابلے میں شرکت کی کوئی فیس نہیں۔ مقابلہ کے لیے تخلیقات 'شگوفہ' ۳۱ بیچلر کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ پر ارسال کی جاسکتی ہیں۔

ججس کا ایک پیانل وصول ہونے والی تخلیقات کی جانچ کرکے نتائج کا اعلان کرے گا۔ جن کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔

تخلیقات خوش خط اور کاغذ کی ایک ہی جانب لکھیں۔ مضمون اور نظم کے اختتام پر تحریر کے 'طبعزاد' اور 'غیر مطبوعہ' ہونے کا اندراج ضرور کریں ورنہ شریک مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

بال ہفت (انشائیے)

سفر نامہ

دخل در معقولات (ڈرامہ)

آدھا تیتر آدھا بٹیر

حق تو یہ ہے کہ (ترجمہ)

بہت شور سنتے تھے (دل بیتی)

سلور جوبلی کے موقع پر

پچورن (منظومات)

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

8/825-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈز حیدرآباد 500010 اے پی

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلنے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے۔ یہ قرضہ جات دو اسکیموں کے تحت دیے جاتے ہیں:

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم:

اس اسکیم کے تحت 10000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25 فی صد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ اداکرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم:

اس اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، گھریلو صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20 فی صد یا زیادہ سے زیادہ 40000 روپے کارپوریشن کی جانب سے بطور "مارجن منی" شرح سود ۶٪ فی صد پر دیا جاتا ہے اور اس کو (30) آسان اقساط میں واپس کرنا پڑتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

یہ کارپوریشن تمام ریاست میں اب تک 44004 افراد میں 5,65,60,000 روپیے مارجن منی جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 32,55,73,000 روپیے ہے۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتے پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
منیجنگ ڈائرکٹر

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش سرگرمیاں

مخدوم ادبی ایوارڈ: ۱۹۹۳ء کا مخدوم ادبی ایوارڈ صحافت کے لیے مختص کیا گیا تھا جس میں ۱۵ ہزار روپے کا یہ ایوارڈ بعد از مرگ جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر سیاست کو دیا گیا۔

مطبوعات پر انعامات: ۱۹۹۱ اور ۱۹۹۲ء کے درمیان شائع شدہ ریاست کے مصنفین کی تقریباً ۲ درجن کتابوں کو انعامات دیے گئے۔ اس مد پر (۳۹) ہزار روپے کا خرچ ہوا۔

مجموعی ادبی خدمات پر انعامات:

اس سال چار نئے انعامات مجموعی ادبی خدمات پر دیے گئے۔ ہر انعام کی رقم پانچ ہزار روپے ہے۔ اس سال یہ انعام ڈاکٹر مغنی تبسم، جناب اکبر الدین صدیقی، جناب اقبال متین اور جناب وقار خلیل کو عطا کیے گئے۔

اردو کتابوں کی اشاعت پر مالی اعانت:

اس سال ۸۲ مسودات پر تقریباً دو لاکھ روپے کی مالی امداد منظور کی گئی۔

طلبا اور طالبات کو میرٹ اسکالرشپ:

پہلی جماعت سے پی ایچ ڈی تک اردو کے ۳۴۳ طالب علموں کو ایک لاکھ ۳ ہزار روپے میرٹ اسکالرشپ تقسیم کیے گئے۔

کتب خانوں کو امداد:

۱۹ ہزار روپے کی کتابیں کتب خانوں کو فراہم کی گئیں۔

اردو رسائل و جرائد: کو ۱۲ ہزار اور اردو خبر رساں اداروں کو ۱۱ ہزار روپے کی مالی اعانت دی گئی۔

اردو ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ: اکیڈیمی جملہ ۴۸ لڑکوں کو ٹائپ رائٹنگ کی تربیت دے رہی ہے۔ حیدرآباد کے پرانا شہر علاقہ میں بھی ایک نئے انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح عمل میں آچکا ہے۔

اردو کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ: ملک میں اپنی نوعیت کے منفرد کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا ۲۶ جنوری ۹۴ء کو افتتاح عمل میں آچکا ہے جہاں ۳۶ طالب علموں کو ٹریننگ دی جائے گی۔

ان کے علاوہ اردو اکیڈیمی حیدرآباد و اضلاع میں اردو بھون کی عمارتوں کی تعمیر پر بھی توجہ کر رہی ہے۔

سید رحمت علی	بزمیندر اختر	اقبال مظفر احمد
صدر	صدر نشین عاملہ	ڈائرکٹر / سکریٹری

مجتبیٰ حسین
(دہلی)

یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی

جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے تو ادھر آپ کی زندگی میں نیا سال آچکا ہوگا۔ جو ہر سال آتا ہے اور ادھر بمبئی میں بزرگ مزاح نگار یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی مکمل ہو رہی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پل دو پل کی بات نہیں یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ اگر یوسف ناظم کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے اور کسی ٹسٹ میچ میں ان کی نصف سنچری مکمل ہوتی تو اسٹیڈیم میں موجود سارے تماشائی ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہو جاتے اور تالیوں کی گونج میں ان کے فن کی داد دیتے لیکن ادب اور کرکٹ کے میدان میں داد دینے کے نہ صرف آداب مختلف ہیں بلکہ ان کے اصول بھی جداگانہ ہیں۔ ادب کے میدان میں ادیب کو آؤٹ کرنے کے لیے کسی بولر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اکثر ادیب تو اپنی وکٹیں خود گرا کر نہ صرف آؤٹ ہو جاتے ہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے "فیلڈ آؤٹ" تک ہو جاتے ہیں۔ پچاس برس تک لگاتار اور مسلسل لکھنا کرکٹ کا کھیل نہیں ہے کہ آدھے دن میں نصف سنچری بنالی اور پھر "مین آف دی میچ" قرار پاکر داد وصول کرلی۔ پھر یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر ایک رخا نہیں ہے بلکہ یہ وہ چومکھا سفر ہے جس میں ادیب راستے بدل بدل کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ کبھی شمال میں جا رہا ہے تو کبھی جنوب میں، کبھی مغرب کی طرف گامزن ہے تو کبھی مشرق میں بڑھ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ کبھی شعر کہہ رہا ہے تو کبھی ترجمے کر رہا ہے۔ کبھی تنقید لکھ رہا ہے تو کبھی مزاح لکھ رہا ہے۔ کبھی بچوں کے لیے لکھ رہا ہے

تو کبھی بچوں کے والدین کے لیے لکھ رہا ہے بلکہ بچوں کی ماؤں کے لیے بھی کبھی کبھی الگ سے لکھ دیتا ہے۔ ایسے جملے لکھنے کے لیے صرف قلم اور کاغذ ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے ادیب کے پاس ایک اچھا منقطی اور بیدار دل بھی ہونا چاہیے (خدا کے فضل سے یوسف ناظم کے پاس یہ کلیجہ موجود ہے)

یوسف ناظم جامعہ عثمانیہ کے اولین مزاح نگاروں میں سے ہیں جیسے مخدوم محی الدین اور سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے اولین شعراء رہے ہیں۔ میں انھیں کبھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ دکن کا "بابائے مزاح نگاری" کہتا ہوں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایسے ان کی ناراضگی بے سبب بھی نہیں۔ ہر کیوں کہ وہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا حشر خود اپنی چشم پاک باز سے دیکھ چکے ہیں۔ (چشم گنہ گاراں کے پاس نہیں ہے یہ تو ہم جیسے پاک بازوں کے حصے میں آتی ہے) لہذا بابائے مزاح نگاری کے لقب سے بزرگی جھلکتی ہے اور یوسف ناظم ۳۰ برس کے ہو جانے کے باوجود بزرگی کی تہمت اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہیں (یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی حال حال تک اپنے بالوں کو خضاب سے رنگتے رہے ہیں) وہ اب بھی نہ صرف نوجوانوں کی سی زندگی جیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو حرکتیں بھی نوجوانوں کی سی کرتے ہیں۔ ۲۷ کی عمر میں ۱۲ برس کی عمر والا قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے یوسف ناظم کو ہی دیکھا۔ اپنی باتوں پر مجھے کبھی ہنسی نہیں آئی۔ یوسف ناظم اپنی ہی باتوں پر بے ساختہ ہنسنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی چست فقرہ ان کی نوک زبان پر ہوتا ہے اور فقرہ بھی ایسا جس سے بھلے ہی ان کی اپنی دل آزاری ہوتی ہو تو ہو لیکن دوسرے کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ وہ فقروں کے وزیر اعلیٰ نہیں بلکہ وزیر اعظم ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذہین اور دلچسپ فقروں کی مدد سے اپنے مضمون کا محل تعمیر کر دیتے ہیں۔ ان کا مضمون جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے بیا کے گھونسلے کا خیال آجاتا ہے۔ جس طرح بیا ادھر ادھر کے چھوٹے بڑے تنکے جمع کرکے ایک مضبوط گھونسلہ تعمیر کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ اپنے مضمون کا تانا بانا بنتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیا اپنے گھونسلے میں تنکوں سے ہٹ کر بریکٹوں کا استعمال نہیں کرتی (کیوں کہ بے چاری بریکٹوں کا استعمال جانتی ہی نہیں) جب کہ یوسف ناظم اپنے مضمون میں بریکٹوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بے تکان بریکٹ لگاتے چلے جاتے ہیں (ان کے مضامین میں بریکٹ کی آمد ہوتی ہے آورد نہیں) اردو کے سارے ادیبوں نے مل کر اپنی تحریروں میں اتنے بریکٹ نہیں لگائے ہوں گے جتنے اکیلے یوسف ناظم نے اپنی تحریروں میں لگائے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں زیادہ تر افسانے ڈیشس (DASHES) کی مدد سے لکھے جاتے تھے۔ رومانی افسانوں کا دور آگیا تھا لیکن اخلاقی قدریں بھی باقی تھیں۔ لہذا افسانے کے کسی خاص موڑ پر افسانہ نگار جب ڈیش لگاتا تھا تو رومان کے نازک ترین اسرار و رموز خود بخود ہویدا ہو جاتے تھے۔ ہیرو اس ڈیش کی آڑ میں اپنی ہیروئن سے بغل گیر ہوتا تھا اور اس ڈیش میں وہ وصل کی لذتوں سے ہمکنار ہوتا تھا اور سماج نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کھلے بندوں یہ پوچھ بیٹھتا کہ "چولی کے پیچھے کیا ہے؟" غرض اس زمانے میں لفظوں میں اتنی ترسیل نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ڈیشوں میں ہوتی تھی۔ افسانہ سو صفحوں کا ہوتا تھا اس میں لگ بھگ پچاس صفحوں کے ڈیش استعمال ہوتے تھے۔ ڈیشوں کی ایسی فضول خرچی کبھی نہیں دیکھی۔ جب کاغذ کے دام بڑھنے لگے تو افسانوں کی رومانی فضا خود بخود کم ہوتی چلی گئی اور اب ڈیش جانے ادب سے تقریباً غائب ہو چکے ہیں۔ (سماج کی

آنکھ کا پانی مرچکا ہے) اس خلا کو پر کرنے کے لیے یوسف ناظم نے بریکٹوں کو زحمت دی۔ وہ بریکٹوں کے بھلے ہی موجد نہ ہوں لیکن ان کے استعمال پر انھیں جو قدرت حاصل ہے وہ کسی کے حصہ میں نہ آئی۔ میں نے اپنی تحریر میں جب بھی بریکٹ لگانے کی کوشش کی میری تحریر بریکٹ سے باہر نکل آئی۔)

یوسف ناظم ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں بھرپور زندگی جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو مخدوم، میر حسن، شنکر جی، ظفر الحسن، اشفاق حسین اور سکندر علی وجد کے فوراً بعد نمودار ہوئی تھی۔ ان کے اپنے ہم عصروں میں عابد علی خاں، خواجہ حمید الدین شاہد، ہاشم علی اختر، محبوب حسین جگر، میکش، لطیف ساجد وغیرہ رہے ہیں۔ لیکن یوسف ناظم نے اپنے ہم عصروں کے سہارے ہی زندہ رہنے کو کافی نہیں سمجھا۔ جامعہ عثمانیہ نے بعد میں اردو کی جتنی نسلیں پیدا کیں ان سے انھوں نے دوستانہ مراسم قائم کیے۔ جن لوگوں نے عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم اور انور معظم وغیرہ سے (جمان سے بہت جونیر رہے) یوسف ناظم کی بے تکلفی دیکھی ہے۔ وہ اول الذکر اصحاب کو یوسف ناظم کا ہم مکتب سمجھتے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ حد ہوگئی کہ بعض لوگ تو انھیں اب مزاح کا بدولت راہم کا بھی ہم مکتب سمجھنے لگے ہیں (اس بہانے دولت رام کو بھی مکتب میں جانے کی سعادت حاصل ہوگئی ہے۔) یوسف ناظم اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہی نہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ کا ایک تسلسل بھی ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کا لقا کی علامت ہیں۔

یوسف ناظم نے آج سے پچاس برس پہلے غالباً شاعری سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاعری تو انھوں نے صرف ضرورت شعری کے تحت کی تھی مگر اس لمبے تخلیقی سفر کے بعد اب یوسف ناظم کی سب سے بڑی اور اکیلی پہچان ان کی منفرد مزاح نگاری ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں کوئی عترم کی بات نہیں ہے۔ اردو کے اچھوتے شاعر اور بے مثال مزاح نگار ابن انشا کا جب انتقال ہوا تھا تو خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی یاد میں ایک مضمون لکھتے ہوئے ایک جملہ اس طرح کا بھی لکھا تھا "افسوس کہ اردو کے ایک منفرد شاعر کو پاکستان کے اہل ادب نے اسے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے رخصت کیا۔" خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کے اس جملے پر میں نے ان سے خاصی بحث کی تھی اور بعد میں وہ ابن انشا کی مزاح نگار والی شناخت سے مطمئن ہو گئے تھے۔ ایک بار یوسف ناظم سے کسی نے کہا تھا "مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے۔" اس پر یوسف ناظم نے کہا تھا "اس لیے کہ اردو میں پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا۔"

یوسف ناظم ہمارے کلاسیکی ادب کی بہترین روایات کے امین ہیں اور اگر مزاح نگاری دوسرے درجہ کا ادب ہے تو یوسف ناظم بلاشبہ اس دوسرے درجہ کے ادب کے پہلے درجے کے ادیب ہیں۔ میں یوسف ناظم کو ان کے تخلیقی سفر کے پچاس سال مکمل ہونے پر سلام کرتا ہوں (مجھے یقین ہے کہ جواب میں وہ مجھے وعلیکم السلام ضرور لکھ بھیجیں گے) آخر میں ایک بریکٹ اور برداشت کریں۔ یوسف ناظم پر کالم لکھنے کا ہی یہ فیضان ہے کہ اس کالم میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بریکٹ راہ پا گئے ہیں۔ ذرا گن کر تو بتائیے)

سید ضمیر جعفری (پاکستان)

ضمیریات

توازن : نہیں پھول رنگ اور خوشبو بغیر
کوئی گیت بے تال، بے دھن بغیر
غلط مرد — مردانہ پن سے تہی
وہ کیا زن کہ جس میں تھا زن نہیں

 o

نشانِ امتیاز : شہر میں تھے اک رئیس ابن رئیس ابن رئیس
ہر بزرگ خاندان سرنامۂ ایام تھا
صفحۂ تاریخ پر گو کچھ نہیں چھوڑا مگر
گھر کے سارے برتنوں پر ثبت ان کا نام تھا

o

سیرِ منزل : دونوں ہاتھوں سے ہیں دو دو پوتیاں لٹکی ہوئیں
ہر قدم پر چار چھ پوتوں کی ہش ہش ہشت ہشت
سرحدِ پیری کی شاید آخری منزل ہے یہ
دوست کم ہیں اور زیادہ خارشتانِ بازگشت

نیاز سواتی (پاکستان)

سو فی صد

مجھ پہ کر اعتبار — سو فی صد
ہے مجھے تجھ سے پیار - سو فی صد
قتل کر مجھ کو بھینگی نظروں سے
ہے تجھے اختیار - سو فی صد
ہے اگر تجھ کو نزلہ اور کھانسی
ہے مجھے بھی بخار - سو فی صد
تیس فی صد تو مجھ کو واپس دے
کر نہ واپس ادھار - سو فی صد
کب تلک اک جھلک دکھائے گا
ہو کبھی جلوہ بار - سو فی صد
ہانکتا ہے ادھر ادھر کی جو
ہے پیے کا خمار - سو فی صد
آدھا اندر ہوں آدھا باہر ہوں
بس سے مجھ کو اتار - سو فی صد
اب فقط مال و دولت و زر پر
منحصر ہے وقار - سو فی صد

o

بعض بے کار فلسفیوں کا مشغلہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف چیزوں کا اثر زندگی کے مختلف واقعات میں ڈھونڈتے ہیں۔ جیسے ڈالڈا کا اثر اردو تنقید پر ـــــ لتا منگیشکر کا اثر اردو شاعری پر ـــــ شمس الرحمٰن فاروقی کا اثر اردو افسانے پر ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ

لیکن آج ایک خبر پڑھ کر اپنے آپ کو ریسرچ اسکالر کہلوانے پر مجبور ہو گئی۔

خبر یہ ہے کہ جاپان میں ایک سترہ سال کے لڑکے نے اسّی پیالی چائے پینے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ایسی خبریں جاپان جیسے ملکوں کے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ جہاں کے محنتی لوگ چائے پیے بغیر ہی دنیا کو حیران کر دینے والی ایجادیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ہندوستانی، جو آفسوں میں اپنی نیند کو دور کرنے کے لیے ہر روز اسّی پیالی چائے روزانہ پی ڈالتے ہیں ان کا نام کسی اخبار میں نہیں چھپا کیوں کہ انھیں شہرت سے زیادہ چائے عزیز ہے۔ کچھ لوگ شراب کی بجائے چائے پیتے ہیں۔ کچھ حضرات پانی کی بجائے چائے پیتے ہیں اور بہت سے لوگ چائے [illegible]

جیلانی بانو



کچھ چائے کے بارے میں

پیتے ہیں۔ اداس ہو جائیں تو ان کی خوشی چائے کو دیکھ کر لوٹ آتی ہے۔ اور بے حد خوش ہوں تو یہ مسرت چائے سے دوبالا ہو جاتی ہے۔ شاعروں پر جب برا وقت آتا ہے (جو اکثر و بیشتر آیا کرتا ہے) تو وہ چائے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ چائے سے پہلے اور چائے کے بعد والی ان کی شاعری کو آپ اسی طرح پہچان سکتے ہیں جیسے ترقی پسند اور جدید افسانے کو پہچاننے کے لیے ہمارے نقادوں نے ایک اصول مقرر کر دیا ہے کہ "یہ افسانہ آپ کی سمجھ میں آ گیا لہٰذا ترقی پسند ہے۔ یہ افسانہ آپ سمجھ نہیں سکے۔ یہ جدید افسانہ ہے۔"

لیکن آپ اردو شاعری پر ریسرچ کر رہے ہوں تو ان اشعار کو پہچان جائیں گے جو چائے دستیاب ہونے پر شاعر نے کہے ہیں جیسے [illegible]

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا پھر:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے

وغیرہ وغیرہ۔
آپ چاہیں تو چائے اور عالمی سیاسی تعلقات کے باہمی ربط پر غور فرما سکتے ہیں۔ چاہے وہ عراق اور کویت کی لڑائی ہو یا ہندوستان اور پاکستان کے بیچ باہمی مذاکرات کی ناکامی ہو، ان تمام مسائل کی ناکامی کے پیچھے اچھی بنی ہوئی چائے کی غیر موجودگی کا اہم حصہ ہے۔ میرے خیال میں دنیا کے تمام اہم سیاسی مسائل جو حل نہ کیے جا سکے ان کا بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ان لیڈروں کو ان کی پسند کی چائے نہیں پلائی گئی تھی۔ ورنہ چائے کی پیالی میں وہ طوفان اٹھا سکتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ چائے ہے تو جہان ہے۔ کسی کی مٹھی گرم کرنا ہو تو کہتے ہیں اس کی چائے پی لیجیے اور کسی سے طلب کرنا ہو تو چائے کے نام طلب کرتے ہیں۔ چائے کے ایک شوقین صاحب بیمار پڑ گئے۔ جب ان کا بلڈ ٹسٹ لیا گیا تو نتیجہ کیا نکلا ——— ؟ چائے، دودھ، شکر ——— خون کا کہیں پتہ نہیں چلا۔

بلڈ ٹسٹ کا یہ رزلٹ دیکھ کر ان کی بیٹی نے غصہ میں کہا۔

"اب میں سمجھی کہ ابا جان ہم سے زیادہ چائے کو کیوں چاہتے ہیں۔ رگوں میں دوڑنے والی چائے جوش مارتی ہوگی"
چائے کے شوقین ایک صاحب نے جوش کا یہ شعر سنا:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

شعر سن کر وہ صاحب خوش نہ ہوئے اور برا سا منہ بنا کر بولے:
"شعر اچھا ہے مگر جوش کو کافی کی بجائے "چائے" لکھنا چاہیے۔ چائے کے مقابلے میں کافی کو اتنی اہمیت دے کر جوش نے اپنے ان بے شمار چاہنے والوں کو ناراض کر دیا ہے۔ جنھوں نے چائے پی پی کر ان کی وہ شاعری سنی ہے جو وہ ڈانٹ ڈانٹ کر سناتے رہے ہیں۔

یوں تو ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے چائے کی زلف گرہ گیر کے سب ہی اسیر ہیں۔
لیکن چائے پینے والے سماج کے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ مجال ہے کہ ایک خاص برانڈ کی چائے پینے والا کسی دوسری برانڈ کی چائے کو منہ لگائے۔ اسی لیے ایک مخصوص ہوٹل میں چائے پینے والے کسی دوسرے ہوٹل میں جانا پسند نہیں کرتے۔ چناں چہ حیدرآباد کے ایک پرانے ہوٹل "اورینٹ" کی چائے میں سنا ہے عجیب تاثیر تھی کہ جو اس چائے کو پی لیتا وہ ایک ہی طرح سے سوچتا، ایک ہی طرح سے لکھتا؛ . . . .
. . . . ایک ہی انداز میں بولنے لگتا، چاہے وہ زندگی میں کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو۔ سنا ہے اس ہوٹل کی چائے پینے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں مگر جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو چلا چلا کر کہتے ہیں: [illegible]

ہم ایک ہیں؟

عام طور پر لوگوں کو اپنی پسندیدہ چائے دوسروں کو پلا کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ چناں چہ ماسکو کی رائٹرس یونین کی طرف سے جب ہمیں استقبالیہ دیا گیا تو وہاں کی سکریٹری مسز سلگا نیک نے ہمیں وہاں کی مخصوص چائے پلائی، جسے انھوں نے اس طرح تیار کیا۔۔۔ گرم پانی میں چند پنکھڑیاں چائے کی ڈالیں، ایک چمچہ شکر اور آدھا کپ آئس کریم۔۔اس چائے کا ہر گھونٹ گرم اور سرد ذائقے کا ایک امتزاج تھا۔ بعد میں چائے کے غیر مستقل مزاج ہونے کا یہی انداز سوویت یونین کے بکھر جانے کا اہم سبب بنا۔

ایک میزبان نے انتہائی خلوص کے ساتھ اپنی بیگم سے کہا تھا:

"بانو کو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بارہ مسالے والی چائے پلاؤ۔"

بارہ مسالے والی چٹ پٹی چائے پینے کے لیے آپ کو دو سخت مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے اس چائے کو ختم کرنا اور چہرے پر خوش گوار تاثرات کو برقرار رکھنا۔

اس طرح اکثر میزبانوں نے پستے بادام والی کشمیری چائے، زعفرانی چائے، چنبیلی کے پھولوں والی چائے، سبز پتیوں والی چائے، مولانا آزاد کے خاص الخاص نسخے کے مطابق بنی ہوئی چائے پلائی ہے۔ چائے کی یہ تمام قسمیں مختلف علاقوں اور مختلف گھرانوں کی مخصوص تہذیب کا ذائقہ اور خوشبو رکھتی ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ چائے دل کے مریضوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اپنی دانست میں ڈاکٹر نے اہلِ دل کو یہ مژدہ سنایا ہے۔ شاید وہ بچارہ نہیں جانتا کہ چائے نہ صرف دل کو فائدہ پہنچاتی ہے بلکہ پینے والی تمام چیزوں میں جیب کو بھی بہت فائدہ پہنچاتی ہے۔ کیوں کہ چائے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ دوسرا پلائے اور آپ پئیں تو مزہ دوگنا ہو جاتا ہے۔

کئی بار بار لوگوں نے چائے کے مقابل آئس کریم کو رکھنے کی کوشش کی اور منہ کی کھائی۔ کیوں کہ جہاں چائے محفل کو جگاتی ہے، آئس کریم سلا دیتی ہے۔ چناں چہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آئس کریم کھاتے وقت بڑے سے بڑا منہ زور مقرر بھی چپ سادھ لیتا ہے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ ادیب اور شاعر حضرات غیر موجود دوستوں کی کمزوریوں پر منہ کھول کر قہقہہ لگانا بند کر دیتے ہیں اس لیے دور اندیش حضرات دو مخالف پارٹیوں میں صلح کرانا چاہتے ہیں تو فوراً آئس کریم سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے سارے گرما گرم اختلافات آئس کریم کے سلائس کی طرح گھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دھویں کے بادل اڑاتی گرما گرم چائے لڑائیوں میں بطور ہتھیار کام آتی ہے۔ اسی لیے جو جھگڑے گھروں میں نہ طے پا سکیں، چائے خانوں میں نمٹائے جاتے ہیں۔

آپ ذرا دور دور نظر دوڑائیے۔۔۔۔ جب چائے کا چلن نہیں تھا تو سرمایہ داری تھی نہ کمیونزم ترقی پسندی تھی نہ جدیدیت۔ سوشلزم، شعور کی رو، تجریدی آرٹ، رمز و کنایہ، یہ سب چائے کی بدولت ہی وجود میں آئے۔ اس سے پہلے ادب اور آرٹ کی فضا بالکل سرد بلکہ گھلی ہوئی آئس کریم تھی جو کھائی جائے نہ پی جائے۔

ہر گھر میں چائے بنانے کے الگ الگ طریقے ہیں جیسے ہماری پڑوسن ہیں جو اسی طرح چائے بنا دیتی ہیں جیسے ان کی دادی جان نے سالوں پکایا تا سکھایا تھا یعنی چائے، پانی، دودھ اور شکر ملا کر چولہے پر رکھ دو اب جو چیز دیگچی میں پک رہی ہے وہ چائے ہوگی۔ مشکل وقت میں چائے بڑے بڑے کام نکال دیتی ہے۔ جب لوگ کرنسی نوٹوں کا نام لینے سے شرماتے ہیں تو بات کو چائے کی پیالی میں گھول دیتے ہیں۔ چائے پینے کے کچھ آداب ہیں اور کچھ مدارج بھی ہیں۔

مثلاً ایک کلرک اپنے باس کو چائے پلائے تو یہ خوشامدانہ چائے ہوگی۔

ایک شاعر کسی نقاد کو چائے پلائے تو یہ دور اندیشانہ چائے ہے۔

ایک باس اپنے کلرک کو چائے پر بلائے تو یہ بدبختانہ چائے ہے۔

ایک لڑکا کسی لڑکی کو چائے کی دعوت دے تو یہ رومانی چائے ہے۔

اس لیے چائے کی دعوت قبول کرنے سے پہلے رسم دنیا، موقعہ اور دستور پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

چائے نہ صرف اپنے ذائقے اور رنگ میں جدا جدا ہے۔ بلکہ چائے پلانے والوں، بنانے والوں اور بیچنے والوں کے بیچ بھی سخت بھید بھاؤ ہے۔ لفظ "چائے" اپنے صوتی اثر کی وجہ سے کتنے معنی بدل دیتا ہے اور بولنے والے کے کردار، قومیت، اس کی سماجی پوزیشن کو بھی ظاہر کر سکتا ہے۔ اس بات کا تجربہ مجھے ایک بار ٹرین کے سفر میں ہوا۔ میرے ساتھ ایک موسیقار خاتون بھی سفر کر رہی تھیں۔ رات کا وقت تھا، بار بار نیند سے چونک کر میں حیدرآباد پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔

ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی اور چائے والے کی آواز پر چونک کر میں نے اپنی ہم سفر خاتون سے کہا۔ "شاید جھانسی آگیا۔"

وہ سنگیت کی مہا کلاکار مسکرا کر بولیں۔

جی نہیں۔ چائے والے کی آواز سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ قاضی پیٹھ ہے۔

●●

طالب جوندپوری

تضمین بر غزل مرزا غالبؔ

تیری گلی کا کوئی گداگر نہیں ہوں میں
جاسوس بھی کسی کا سراسر نہیں ہوں میں
درباں بھی تیرے گھر کا مقرر نہیں ہوں میں
"دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں"
"خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں"

پیری میں کیسے زہرہ جبینوں پہ آئے دل
اس سن میں عاشقی کے کہاں گل کھلائے دل
کب تک دیارِ حسن کے چکر لگائے دل
"کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
"انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں"

دنیائے رنگ و بو سے اٹھاتا ہے کس لئے
منظر سے زندگی کے ہٹاتا ہے کس لئے
مجھ جیسے شاعروں کو گنواتا ہے کس لئے
"یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
"لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں"

کیوں ہے گریز مجھ پہ عنایت کے واسطے؟
ترسوں میں کس لئے تری رحمت کے واسطے
کیوں شرط پارسائی ہے جنت کے واسطے
"حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
"آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں"

اربابِ حسن کیوں نہیں پہچانتے مجھے؟
"نوشہ" بھی کس لئے نہیں گردانتے مجھے؟
کیوں قابلِ قبول نہیں مانتے مجھے؟
"کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں"

۱۸

دکھنی زبان میں بھی نہیں ہیں یہ گرم "دیغ"[۱]
بے معنی لفظ بھی تو نہیں جیسے مضطلیغ[۲]
آنکھیں بچھی ہیں میری، اک دلربا شگفتہ تیغ
رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
"رتبہ میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں"

میں نے تو صرف دستِ کرم ہی کے کِس[۳] لیے
غیروں نے آکے پاؤں پہ ماتھے بھی گھس لیے
آیا تھا بارگاہ میں، میں بھی تو اس لیے
"کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
"کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں"

دربارِ مغلیہ سے جو خلعت ہوئی عطا
موقع یہ تم کو ذوقؔ کی رحلت سے مل سکا
چلنے لگی ہے خوب تمھاری بھی اب ہوا
"غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا"
"وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"

---

۱ ڈیگ کا دکھنی تلفظ ۲ قافیہ کے لیے یہ لفظ وضع کیا گیا ۳ KISS

اک یہی اہلِ سیاست میں کمال اچھا ہے
ہر الیکشن پہ نئے وعدوں کا جال اچھا ہے
جن سے آجاتی ہے اُردو کے بھی مُنہ پر رونق
ہم سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

طالب



غالباً یسوع مسیح نے یہ تلقین کی تھی کہ دوسروں کا امتحان مت لو تاکہ تمھیں بھی امتحان دینا پڑے۔ لیکن دنیا کے کسی بھی تعلیمی ادارے نے یہ نیک نصیحت قبول نہیں کی۔ پڑھائی ہو یا نہ ہو لیکن امتحان لازمی طور پر لیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے طلبا یسوع کی اس نصیحت پر عمل کروانے کی کوشش میں ہڑتالیں بھی کرواتے رہتے ہیں۔ لیکن حکام ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہاں کبھی کبھار امتحان ملتوی ہو جاتے ہیں لیکن بالآخر منعقد کیے جاتے ہیں۔ حکام کا کہنا ہے کہ اگر امتحان نہ ہوں تو نوجوانوں میں تعلیم یافتہ بے روزگار کیسے بنیں گے۔ ہاں طلبا کے بار بار اصرار پر اتنی رعایت ضرور دی گئی ہے کہ وہ امتحان میں نقل ماریں۔

ہم نے زندگی میں بہت امتحان دیئے ہیں۔ سکول، کالج، یونیورسٹی میں تو خیر سب لوگ امتحان دیتے ہیں۔ ہم نے سروس شروع کرنے کے بعد بھی امتحان دیئے ہیں اور آج تک ہمیں ڈراونے خواب آتے ہیں کہ ہم امتحان میں پاس ہو گئے۔

ہم نے شروع سے ہی ایک اصول بنا لیا تھا۔ جس مضمون میں ایک بار فیل ہو جاتے تھے، وہ چھوڑ دیتے تھے۔ ہائی اسکول میں ایک بار سائینس میں فیل ہو گئے۔ ہم نے فوراً سائینس چھوڑ کر اردو کا مضمون لے لیا۔ اسی لیے ہم آج تک سائینس میں باقاعدہ کورے ہیں۔ ہمیں یہاں تک معلوم نہیں کہ ایٹم بم کیسے گرایا جاتا ہے نہ ہی ہماری یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تھرماس میں گرم چیز گرم اور ٹھنڈی چیز ٹھنڈی کیسے رہتی ہے۔ گرم چیز کو گرم رکھنا یا ٹھنڈی چیز کو ٹھنڈا رکھنا تو ہم

سمجھ سکے ہیں لیکن تھرماس کو یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کو گرم رکھنا ہے اور اس چیز کو ٹھنڈا۔ ویسے ہمیں سائنس نہ پڑھنے کا کوئی افسوس نہیں کیوں کہ سائنس اس رفتار سے ترقی کر رہی ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے زمانے میں سائنس کی تعلیم حاصل کی وہ بھی اب نئی نئی ایجادوں کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ اس کے برعکس اردو میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ وہیں کا وہیں ہے۔ بس ہم جیسے [illegible] ادیبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہمیں سمجھنا مشکل نہیں۔

سائنس کے علاوہ ہم حساب میں بھی بہت کمزور تھے۔ لیکن اس میں فیل ہونے سے بچ گئے۔ ماسٹر نے کہا کہ جتنے سوال غلط ہوں گے اتنے ہی بید پڑیں گے۔ امتحان کے بعد سوالوں کے جواب بلیک بورڈ پر لکھ دیے گئے اور ہر ایک طالب علم سے کہا گیا کہ وہ بتائے کہ اس کے کتنے سوال غلط ہیں۔ ہمارے بہت سے ہم جماعتوں کو کافی مار پڑی۔ جب ہماری باری آئی تو ہم نے کہا کہ ہمارا ایک سوال غلط ہے۔ اس طرح ہمیں سب سے کم بید پڑے۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے صرف دو سوال ہی نکالے تھے۔ باقی کے آٹھ سوالوں کو حل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

ایک بار ہمارا زبانی امتحان ہوا۔ اس میں پوچھا گیا چھ جمع چار کتنے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا تقریباً گیارہ۔ ماسٹر نے کہا غلط۔ چھ جمع چار دس ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا چھ جمع چار دس نہیں ہو سکتے کیوں کہ پانچ جمع پانچ دس ہوتے ہیں۔ اس پر ہمیں بید پڑی۔

ایک بار ہمیں حساب میں انعام بھی ملا۔ وہ ایسے ہوا کہ سوال پوچھا گیا کہ چھ ضرب سات کتنے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا چونتیس۔ بلاشک یہ غلط تھا۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ چھ ضرب سات بیالیس ہوتے ہیں لیکن ہمارا جواب صحیح جواب سے نزدیک ترین تھا۔ باقی سب طالب علموں کا جواب چونتیس سے کم تھا۔ اس لیے ہم انعام کے حق دار ہوئے۔

مڈل سکول کے B فائنل امتحان میں ہم جغرافیہ کے سوا تمام مضامین میں فیل ہوگئے۔ جغرافیہ میں اس لیے فیل نہیں ہوئے کیوں کہ یہ مضمون ہم نے لیا ہی نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد ہم نے سکول ہی بدل لیا۔ دوسرے سکول کے ہیڈ ماسٹر نے ہمیں پہلے سکول کے امتحان کے نتیجے کی بنا پر پاس کر دیا۔ ہم یہ بتانا بھول گئے تھے کہ اگر ہم فیل ہونے پر مضمون نہیں چھوڑ سکتے تھے تو سکول چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ہمیں خواہ مخواہ کی رسوائی ہرگز منظور نہیں تھی۔

ایک بار اردو میں ہمارے سو میں سے ایک سو دس نمبر آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے اعتراض کیا کہ سو فی صد سے زیادہ نمبر نہیں آ سکتے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ حضور وہ تو صحیح ہے لیکن اس بچے نے ایک ایسے سوال کا جواب بھی دیا جو پرچے میں نہیں تھا۔ ہمارا یہ ریکارڈ آج تک نہیں ٹوٹا۔ آج کل ایسے استاد کہاں ملتے ہیں۔

ہم نے میٹرک کا امتحان دیا تو اس وقت آزادی کے تعلق سے فسادات ہو رہے تھے۔ جس سنٹر سے ہم نے امتحان دیا اس کو جلا دیا گیا۔ ہمارے پرچے بھی جل گئے۔ ہمیں دوبارہ امتحان دینے کو کہا گیا لیکن امتحان سے پہلے کرفیو لگ گیا۔ وہ امتحان بھی نہ ہو سکا۔

اس اثنا میں ہم ہندوستان آ گئے تھے۔ یہاں ہمیں پھر ایک بار میٹرک کا امتحان دینے کو کہا گیا۔ ہم نے صاف انکار کر دیا کہ زندگی میں میٹرک کا امتحان دینے کے علاوہ ہمیں اور بھی کچھ کرنا ہے۔ پھر حکومت نے ایک اسکیم نکالی۔ ہمیں ایک مہینے کے لیے ایک ریفوجی کیمپ میں سوشیل سروس کرنے کو کہا گیا۔ اس کے بعد ہمیں میٹرک پاس

قرار دے دیا گیا۔

کالج میں نقل اڑانے کا عام رواج تھا۔ پہلی بار ہم نے نقل ماری تو فیل ہو گئے۔ اگلی بار ہم ایک ذہین طالب علم کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اس کے جوابوں کی نقل کی۔ ہم سکنڈ کلاس میں پاس ہو گئے کیوں کہ اس کے جواب ہو بہو ہمارے جوابوں سے ملتے جلتے تھے اس لیے نقل مارنے کی سزا کے طور پر اسے فیل کر دیا گیا!

جب ہم نوکری کے لیے تیار ہوئے تو وہاں بھی امتحانوں کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے طلبا کو یہ رعایت دی گئی کہ ان کا زبانی امتحان لیا گیا۔ امتحان میں صرف دو سوال پوچھے گئے۔

"تمھارا نام کیا ہے ؟"

اس پر ہمیں چھہتر فی صد نمبر ملے۔ دوسرا سوال تھا۔

"تمھارے والد کا کیا نام ہے ؟"

اس میں ہمیں پچاس فی صد نمبر ملے۔ لیکن دونوں کو ملا کر ہم 62 فی صد نمبر لے گئے۔ اس طرح ہمیں نوکری مل گئی۔

نوکری ملنے کے بعد ہم نے سوچا چلو اب تو امتحانوں سے خلاصی ہوئی لیکن یہاں بھی ہر مرحلے میں امتحان تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ امتحان لینے والے ہمارے افسر ہی تھے۔ انھیں ہماری امتحانوں سے الرجی کے بارے میں پورا علم تھا۔ اس لیے انھوں نے ہمیں امتحان میں پاس کر دیا۔ اس طرح ہم ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔

اب ہم ریٹائرمنٹ کے قریب آ گئے ہیں۔ اب سنا ہے کہ ایک امتحان شروع کیا گیا ہے۔ جو افسر یہ امتحان پاس نہیں کریں گے انھیں ریٹائر نہیں کیا جائے گا۔ اس امتحان میں فیل ہونے کی ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اس کے لیے ہمارا فیل ہونے کا دیرینہ تجربہ کام آئے گا۔

پروفیسر راہی قریشی
گلبرگہ (کرناٹک)

اکیسویں صدی میں!

انصاف ہوگا رُسوا، اکیسویں صدی میں — قانون ہوگا اندھا، اکیسویں صدی میں
بائیں طرف سے جس کو لکھیں گے لوگ سارے — وہ ہوگا اُردو اِملا، اکیسویں صدی میں
کالج یا جامعہ میں شرکت کے ساتھیں دلو — ڈگری ملے گی اصلی، اکیسویں صدی میں
عبرت تو ہوگی اُس دن گھٹ گھٹ کے جب مریں گے — یہ میر اور مرزا، اکیسویں صدی میں
پردے سے ہوں گے باہر، پردے کے کام سارے — عقلوں پہ ہوگا پردہ، اکیسویں صدی میں
مظلوم کو ملے گی پھانسی، صلیب، سولی — انصاف ہوگا ایسا، اکیسویں صدی میں
میں بیسویں صدی میں یارب یہ سوچتا ہوں — نیکوں کو کیا ملے گا، اکیسویں صدی میں
روٹی کے بدلے اب تک غم کھا چکا ہے لیکن — کیا کھائے گا یہ بھوکا، اکیسویں صدی میں
اب تک جو پیش آیا، اب تک جو کچھ ہے دیکھا — ہوگا وہی تماشہ، اکیسویں صدی میں
بچے، جوان، بوڑھے، دیکھیں گے سب خوشی سے — اخلاق کا جنازہ، اکیسویں صدی میں
انسان کا جو ہوگا، انسان سے تعلق — یہ ہوگا اِک عجوبہ، اکیسویں صدی میں
مرشد ہو یا منسٹر، چپراسی ہو یا افسر! — بینکوں کو دے گا دھوکا، اکیسویں صدی میں
یہ خون جس میں سُرخی تھوڑی سی رہ گئی ہے — بالکل سفید ہوگا، اکیسویں صدی میں
بھائی کو کیا سُناؤں، بیوی کو کیا بتاؤں — بیٹا نہ ساتھ دے گا، اکیسویں صدی میں
ممکن ہے خونِ اِنساں ارزاں ہو اور، لیکن — پانی ملے گا مہنگا، اکیسویں صدی میں
جب چاند کی زمیں پہ دش بنیل گھر بسیں گے — ہوگا فساد دنگا، اکیسویں صدی میں
ہر موقع ہر محل پہ فٹ آنے والا چہرہ — بازار میں ملے گا، اکیسویں صدی میں
اب تک تو ہر صدی میں چلتا رہا ہے ڈنڈا — چلتا رہے گا ڈنڈا، اکیسویں صدی میں
سب کا حساب آخر بے باق ہوگا، یعنے — نہلے پہ ہوگا دہلا، اکیسویں صدی میں
ہندی ہی جب پڑھیں گے "سیتا" ہی جب لکھیں گے — سمجھیں گے کیسے "ایلا"، اکیسویں صدی میں
اک سمت چرچ مسجد — ایک سمت گردوارہ — مندر بنے گا ایسا، اکیسویں صدی میں
لَوٹیں گے جب عرب سے، لائیں گے ایسی مرغی — سونے کا دے گی انڈا، اکیسویں صدی میں
راہی رہیں گے زندہ پینسٹھ برس کے سِن میں — اور کھائیں گے وظیفہ، اکیسویں صدی میں

سائنس میں مُصطفیٰ کے، یہ مصطفیٰ ہو راہی
جاری رہے "شگوفہ" اکیسویں صدی میں

یوسف ناظم
(بمبئی)

امریکہ میری عینک سے



پھل پھول اور ترکاریاں :-

امریکہ پھلوں پھولوں اور ترکاریوں کا ملک ہے۔ پھولوں میں گو کہ خوشبو نہیں ہوتی لیکن جو رنگ ان پھولوں میں ہوتے ہیں وہ انسانی ذہن میں نہیں آسکتے۔ نظم طباطبائی نے اپنی نظم میں (جو گرے کی مثنوی کا ترجمہ ہے) ایک جگہ "گلِ انار" کا ذکر کیا ہے۔ یوں سمجھئے یہ گل انار یہیں پیدا ہوتے ہیں۔ یوں بھی امریکہ میں اس قدر اعلیٰ درجے کے پرفیوم استعمال ہوتے ہیں کہ پھولوں میں خوشبو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پھلوں میں مفرح عرق اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ ناشپاتی بھی مفرح افزا کی بوتل معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے لوگ یہاں پانی نہیں پیتے صرف پھلوں کا جوس پیتے ہیں۔ ٹماٹر خربوزے کے سائز کے ہوتے ہیں اور سکندر علی وجد کے مجموعہ کلام 'لہو ترنگ' کی یاد دلاتے ہیں اور یہاں کے تربوز اُف۔ یہ مجسمہ سر پہ چاہے کہ اٹھائے نہ بنے۔ تربوز کو ٹرالی میں ڈال کر باہر لانا پڑتا ہے۔ ہر تربوز بحر احمر میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بات اس کے کھلنے پر معلوم ہوتی ہے۔ سیب اور شفتالو اتنے سرخ ہوتے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے یہ غصے سے سرخ نہ ہوئے ہوں۔ ہر پھل سے پیاس بجھتی اور بھوک چمک اٹھتی ہے۔ انجیر تو نظر نہیں آئے لیکن خشک انجیر مٹھائی کی طرح کھائے جاتے ہیں۔ ان کا نام ہی ٹنگ بار ہے (یہاں بار ہر چیز کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ قانون کی ڈگری بھی دیتے ہیں تو بار ایٹ لا کہہ کر دیتے ہیں۔ خوبانی بھی کیا میوہ ہے اس کے نام ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھیڑ کے لائق ہے۔ بعض شارحین غالب کا خیال ہے کہ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے مصرع کی تخلیق اسی پھل کی مرہون منت ہے۔ لیکن یہ شرح غلط ہونی چاہئے کیونکہ غالب تو آم کے عاشق تھے اور آموں سے لدے درختوں کو محقق کی نظر سے دیکھتے تھے کس پھل پر ان کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہاں کے عنابی رنگ کے گول انگوروں میں اتنا عرق ہوتا ہے کہ کھانے والے کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے لیکن یہ عرق انفعال نہیں ہوتا عرق شیریں خیال ہوتا ہے۔ کھٹے انگور تلاش کرنے پر بھی دستیاب نہیں ہو سکے۔ امریکہ میں کوئی دس گنی ترکاریاں پیدا ہوتی اور کھائی جاتی ہیں۔ صرف چند ترکاریاں ہیں جو انڈو امریکی معلوم ہوتی ہیں ورنہ بیشتر ترکاریاں

اتنی پھلواریں ہیں جتنا کہ یہ ملک۔ ترکاریوں کے ناموں کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیئے۔ پھولوں کا مسئلہ بھی یہاں ہے۔ ابوالکلام کو آنا چاہتے تو شاید ان سارے پھولوں کو اردو دیتے۔ اُن کی غبارِ خاطر میں کئی انگریزی پھولوں کے اُردو ترجمے موجود ہیں لیکن اسے ترقی اردو بیورو کو ان ناموں سے استفادہ کرنا چاہیئے! کیا انقلاب آرہا ہے۔ ہندوستان میں ایک زمانے میں پھلواڑیوں کی سیر کے نام سے سالانہ جلسہ ہوا کرتا تھا اور ساری دلی خوشبوؤں میں سے مہک اٹھتی تھی۔ پھولوں کا محمد ولی نہیں ہوا ہے لیکن گلی ہدست و ک خال خال ہو گئے ہیں۔ فضا میں دھوئیں اور تعفن کی آلودگی تو ہے [illegible] تمام فرانس کی آلودگی زیادہ ہو گئی ہے۔ احساس مذہبی تقدس کا مظاہرہ ہوتا ہے [illegible] لیکن یہاں تقدس کا شعور [illegible] لیکن اس کا ملبوس نہیں کرنا چاہیئے [illegible] خواہ وہ برصغیر کا ہو یا [illegible] کا ہو [illegible] قسم قریب ہی رہتا ہے۔ ہندوستانی جنت نشان تو اب بھی ہے لیکن [illegible] ہوئے پھولوں کا ہے ہاں یاد آیا کسی [illegible] نے شاید کہا تھا کہ مسرت کوئی جنس نہیں ہے کہ سامنے [illegible] ایک کیفیت ہے جو آدمی کو خود اپنے دل میں اور دل کے توسط سے اپنے چہرے [illegible] کرنی پڑتی ہے اور [illegible] دوسرے آدمی کو دیکھ کر بھی خوش ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے امریکہ میں [illegible] شخص گھر سے باہر [illegible] وقت اس مقصد کے لئے کو سرکی ٹوپی بنا کر پہن لیتا ہے اور [illegible] یہ ٹوپی پہنے ہی رہتا ہے [illegible] بات پر بھی میں نے بہت غور کیا کہ امریکہ میں ہر کسی کے سر پر ٹوپی ضرور ہوتی ہے یہ ٹوپیاں گول ہوتی ہیں اور سر پر چپاں ہو جاتی ہیں یعنی یہ سر پر اس طرح فٹ ہوتی ہیں کہ کاسۂ سر اور ٹوپی میں کوئی خلا باقی نہیں رہتا۔ اِن ٹوپیوں پر ایک چھجہ لگا رہتا ہے جو ہوتا تو سامنے کی طرف ہے لیکن کچھ لوگ اس کا رُخ پیچھے کی طرف موڑ دیتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ آدمی آپ کی طرف آ رہا ہے یا مخالف سمت میں جا رہا ہے۔ ہر نوجوان لڑکے کے پاس کم سے کم دو ٹوپیاں ضرور ہوتی ہیں۔ نہ ہوں تو اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔

انڈے کی بے حرمتی:-

اس ملک میں ایک شوق عام ہے یہ سگریٹ نہ پینے کا شوق ہے۔ زیادہ تر مکان چونکہ لکڑی کے بنے ہوتے ہیں اس لئے گھروں میں لوگ سگریٹ جلاتے ہی نہیں ڈرتے ہیں کہ اس گھر کو گھر کے چراغ سے نہ آگ لگ جائے اور گھر کے باہر اس لئے نہیں پیتے کہ دل کے پھپھولے نہ جل اٹھیں۔ سینے پہ دوسری قسم کے داغ لگے ہوں تو لگے ہوں پھیپھڑے کے داغ کم سے کم نہیں لگتے۔ انڈوں کا یہاں یہی حال ہے۔ قانون تو کوئی نافذ نہیں ہے لیکن ڈاکٹروں کی طرف سے ہفتے میں صرف ایک انڈا کھانے کی اجازت ہے۔ یاد رکھنا پڑتا ہے کہ پچھلے ہفتے کس دن انڈا کھایا تھا۔ جو لوگ اتنے دن صبر نہیں کر سکتے وہ روزانہ انڈے کی سفیدی کھا لیتے ہیں اس کی زردی کا کھا لینے میں پھر نہیں۔ بہتوں کا رنگ بھی اسی لئے انڈے کی سفیدی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ کسی نے بتایا کہ یہاں انڈے کی زردی شیمپو میں استعمال کی جاتی ہے۔ جو مرد بالوں میں چوٹی ڈالتے ہیں ان کے متعلق یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ انھوں نے انڈے کی زردی کا شیمپو استعمال کیا ہے۔ ان مردوں کو ان کی گرل فرینڈ ان کے بے داغ بالوں پر صاف اور پُر پھندنے کا تحفہ دیتی ہیں۔

امریکہ میں بھی قناعت پسند ہیں لیکن صرف اس وقت جب باسکٹ بال کے [illegible]

ہوتے ہیں۔ ٹورنامنٹ کے زمانے میں ۱۲، ۱۵ وفاتیں اور ۷، ۸ سو گرفتاریاں معمول ہوتی ہیں۔ ہر اسٹیڈیم کے اردگرد پولیس اور فوج کے سپاہی سینہ تان کر چوکنے کھڑے رہتے ہیں اور ضرورت بھی ہو تو سو پچاس آدمیوں کو ضرور گرفتار کرتے ہیں۔ یہ یہاں کی روایت ہے۔ یہاں زمین اتنی افراط ہے کہ ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول حتیٰ کہ گولف کے میدان جگہ جگہ موجود ہیں۔ سڑکوں پر اول تو راہگیر ہوتے نہیں جو ہوتے ہیں وہ چلتے نہیں اسکیٹنگ کرتے ہیں میں تو سمجھتا ہوں یہاں اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ممبر واک آؤٹ کرنے کے لئے بھی رولر اسکیٹنگ ہی کرتے ہوں۔ اسکیٹنگ کرتے ہوئے آدمی زمین سے ۲ انچ بلند ہو جاتے ہیں ــــ لیکن بلندی تو اسے کہتے ہیں جو (Sears) ٹاورس کو فتح کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔ میں نے احمد خاں کے ساتھ اس ایک سو دس منزلہ عمارت پر چڑھائی کی۔ ۱۰۳ منزل کا سفر شاید ۳ سیکنڈ میں طے ہوا۔ اس منزل سے شکاگو اس طرح دکھائی دیتا ہے گویا ہتھیلی کی لکیروں میں جنت منتقل ہو گئی ہو۔ یہ شہر قطاروں کا شہر ہے کوئی صف کج نہیں ہے کیا مجال جو کوئی مکان عروض کی غلطی کا شکار ہو۔ غالب جو مجھے ہر جگہ یاد آتے ہیں یہاں بھی یاد آگئے اور ان کا یہ شعر جو خاصا مشکل ہے یاد آ گیا۔ ؎

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ٭ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

حد نظر تک کہکشاں ہی کہکشاں بکھری ہوئی تھی۔ بلندی پر منظر بنانے اور عرش سے پرے ایک اپارٹمنٹ کی خواہش سیئرز ٹاور پر پوری ہو سکتی ہے۔

سان فرانسسکو اور حسن :-

لیکن شکاگو میں وہ حسن و جمال نہیں ہے جو سان فرانسسکو کو عطا ہوا ہے۔ خوبصورتی، کیا شئے ہوتی ہے اس کے معنے یہیں سمجھ میں آئے ہے بلکہ لغت میں یہ لفظ آیا ہی اس شہر کے لئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت نے شاید فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ فرش زمین پر جاؤ اور ایک سیمسٹر (Semester) وہیں گزارو لیکن کچھ تعمیراتی کام بھی کرو ایسا کام جو تعمیراتی بھی ہو اور تعمیری بھی۔ مصنوعی تو ہو لیکن قدرت کی صناعی کا نمونہ۔ معلم الملکوت نے انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اگر اسے حکم دیا جاتا کہ فرانسسکو کو سجدہ کرو تو ـــــ لیکن کسی حکم کی شاید ضرورت ہی نہ پیش آتی وہ اس شہر کو دیکھتے ہی خود بخود سجدے میں گر جاتا اور وہیں پڑا رہتا)

فرانسسکو پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ اس شہر میں داخل ہونے کے لئے ایک پل پار کرنا پڑتا ہے جو ساڑھے سات میل لمبا ہے۔ پیسفک سی (Pacific Sea) کا پانی ایک خلیج کی شکل میں اس شہر کا محاصرہ کرتا ہے اور اس خلیج کے کنارے بلندی پر کھڑے ہوئے لوگ آئینہ حیرت بنتے ہیں۔ خلیج کے کنارے سنگی چبوترے ایک مسلسل دائرے کی شکل میں بنے ہوئے ہیں اور صبح صبح آسمان سے گرنے والی شبنم ان کے غسل صحت کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ چبوترہ خالی نہیں ہے اور یہاں چاٹ اور بھیل پوری نہیں ملتی۔ لوگ یہاں صرف قدرت کا کمال دیکھنے آتے ہیں وڑے پکوڑے کھانے نہیں آتے۔ سرد ہوائیں چلتی ہیں لیکن ناظرین کپڑوں میں ملفوف ہو کر ان ہواؤں کی لذت سے بالمشافہ استفادہ کرتے ہیں۔ کنارے پر کوائٹ COIT نام کا ایک مینار کھڑا ہے جو ایک سو دس منزلہ تو نہیں ہے لیکن اتنی اونچی ضرور ہے کہ گردن شکن معلوم ہوتی ہے۔ اس دور

عمارت میں داخلہ منع نہیں ہے۔ عمارت قد آور بھی ہے اور مشہور بھی۔ یہیں کولمبس کا ایک مجسمہ آپ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ اس ملک امریکہ کو اسی شخص نے "ایجاد" کیا تھا (یہ ملک آباد پہلے سے تھا ایجاد بعد میں ہوا) اہل امریکہ کرسٹوفر کولمبس کا بڑا احترام کرتے ہیں اور اس ملک کے تقریباً ہر شہر میں ان صاحب کے مجسمے ایستادہ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ صلاح مجسمے ہم شبیہ ہیں۔ کولمبس صاحب جیسا کہ سب جانتے ہیں، پندرہویں صدی کے آدمی ہیں۔ جو سولہویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بھی زندہ رہے۔ انھیں لمبی عمر نہیں ملی۔ یہ صرف (۵۷) سال جیئے۔ بچپن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کافی دن ان کے بھائی چارٹ میکر تھے۔ انھوں نے شادی بھی کی لیکن اپنے رشتۂ ازدواج کو اپنے مشغلۂ سیاحت کی راہ میں حائل رہے۔ نہیں ہونے دیا اور جب عمر کی (۴۲) بہاریں دیکھ چکے تو اسپین سے امریکہ کو کھوجنے نکل پڑے۔ تین سمندری کشتیاں اس سفر پر روانہ ہوئیں۔ جب انھوں نے "امریکہ" کو ڈھونڈ نکالا تو اسپین نے انھیں بحری کپتان (ایڈمرل) بنا دیا لیکن کولمبس واسکوڈی گاما کی طرح خوش قسمت نہیں تھے۔ واسکوڈی گاما بھی ان کے ہمعصر تھے۔ اور انھوں نے ہندوستان کا پہلا سمندری سفر انجام دیا تھا۔ پرتگالی سرکار نے انھیں وائسرائے بھی بنا دیا تھا۔ اس کے برخلاف کولمبس کو لوگوں نے ان کی اخیر عمر میں فراموش کر دیا تھا۔ اور یہ جب مرے تو کسمپرسی کے عالم میں مرے۔ اہل امریکہ نے بہرحال انھیں بعد مرگ (POSTHUMUS) اعزاز کا اہل سمجھا۔ یہ ساری باتیں مجھے کوائنٹ میں ان کے مجسمہ کو دیکھ کر یاد آئیں۔ کولمبس کو مجسم و متشکل دیکھ کر مجھے یوسف کمبل پوش بھی یاد آ گئے جنھوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ ان کا سفر نامہ (اردو میں) گو کہ کمیاب ہے لیکن نایاب نہیں ہے۔ میرے پاس بھی تھا جو میں نے فرمائش پر مرحوم ظ انصاری کو دیا تھا۔ مجھے یہ سفر نامہ اس لئے یاد آتا ہے کہ یہ مشفق خواجہ کا نادر تحفہ تھا۔

سان فرانسسکو کو شہر کہا جائے یا سبزہ زار۔ ہندوستان میں پونا کا گھاٹ شہرت کے لحاظ سے درجہ اوّل کا خطرناک اور محیّر العقول ہے لیکن سان فرانسسکو شہر تو ہے ہی پیچ و خم کا کہسار۔ اس شہر کے مکین رہتے ہی پھولوں میں ہیں۔ ایک علاقے میں تو راستہ ہی کچھ اس طرز کا بنا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کی تعمیر میں چینی رسم الخط استعمال ہوا ہے۔ اس راستے سے موٹریں گذرتی ہیں تو لوگ دم سادھ لیتے ہیں۔ بلندی سے نیچے کی طرف جب موٹریں آتی ہیں تو ہر موڑ زندگی کا آخری موڑ معلوم ہوتا ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں اس راستے سے گذرنے والوں کو سلامی نہ دیں تو اور ان کی صلوٰۃ توجہ ان پھولوں کی طرف نہ ہو تو اس پیچ در پیچ راستے پر ان کی جان نکل جائے۔ اس ٹیڑھے میڑھے راستے کا نام اہل فرانسسکو نے کروکیڈ اسٹریٹ (Crooked Street) رکھا ہے یہ کروکیڈ تو یقیناً ہے۔ لیکن اسٹریٹ بالکل نہیں ہے اور اسٹریٹ (straight) تو ہے ہی نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس گھنگھریالے راستے کے سارے معمار اپنے انجینیر کی سرکردگی میں سیدھے جنت میں جائیں گے۔ یہ کارِ خیر ان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ جوش ملیح آبادی کو بھی "ثبوتِ حق" کے لئے کسی اور گواہی کی ضرورت نہ پیش آتی۔ لوگوں کے گھر اسی پر پیچ و خم راستے پر شاداب کیاریوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اگر ان مکانوں کے مکین سوتے ہیں تو پتہ نہیں خوابوں میں کیا مناظر دیکھتے ہوں گے لیکن انھیں خواب دیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ میر تقی میر بھی یہاں رہتے تو وہ بھی کھول کر دن رات صرف مناظر دیکھتے رہتے۔ اتنے سارے شعر کہنے کا انھیں وقت نہ ملتا۔ یوں بھی ان کے چند شعر ہی اہل ذوق کے لئے کافی ہوتے۔ یہ اشعار بھی کم از گلشن کشمیر نہیں ہیں۔ تھوڑے سے مبالغے کے ساتھ۔ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ سان فرانسسکو کی سیر طرح

سے پہلے مکان کی خواہش کی تکمیل نہ سہی اس کا دیباچہ مزید معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہوں گے کہ اس سے بہتر مقامات بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن انسان کو زیادہ ہوس نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں تو مشورہ یہ دیا گیا تھا کہ شکاگو سے کیلی فورنیا کا سفر ٹرین سے کیا جائے کیونکہ ٹرین ہرے بھرے جنگلوں، دلفریب مرغزاروں اور پرشکوہ شہروں سے گزرے گی۔ حسین و جمیل مناظر قدرت دیکھنے کو ملیں گے لیکن ہمیں کون سی ورڈز ورتھ کے طرز کی شاعری کرنی تھی اور دو ہزار میل کا سفر ٹرین سے کرنے کو جی نہیں چاہا۔ ہمارا وقت سونے میں گزر جاتا۔ کتابوں کے مطالعے میں بھی ہم یہی کرتے ہیں موٹی موٹی کتابوں کے چند صفحے پڑھ لئے اور سمجھ لیا بلکہ دوسروں کو بھی باور کرادیا کہ ہم ساتھ اور کانکا کو پورا پورا پڑھ چکے ہیں۔

(سلسلہ آئندہ شمارے میں)

اعجاز الدین پاپولر

غزلیں

تازہ اشعار سنانے کے لیے آئے ہیں
اک نیا رنگ جمانے کے لیے آئے ہیں

ایک مدت سے نہیں جن کی توجہ ہم پہ
ان حسینوں کو منانے کے لیے آئے ہیں

اب بہت کم ہمیں آنے لگے دعوت نامے
روٹھے یاروں کو پٹانے کے لیے آئے ہیں

ہم کسی اور کی غزلوں پہ توجہ کیوں دیں
ہم تو صرف اپنی سنانے کے لیے آئے ہیں

کھول کر ہونٹ نہیں دیتے کبھی شعر کی داد
ہم فقط ہاتھ اٹھانے کے لیے آئے ہیں

فن کے بازار میں دکھلا کے چرایا ہوا مال
بھاؤ کچھ اور بڑھانے کے لیے آئے ہیں

شعر فہمی سے نہیں کوئی تعلق پھر بھی
تیرِ تنقید چلانے کے لیے آئے ہیں

ہوٹ جب ہوتا ہے کوئی تو مزا آتا ہے
قہقہے ہم بھی لگانے کے لیے آئے ہیں

پاپولر ہو گیا دنیائے ادب میں اعجاز
اس کی شہرت کو گھٹانے کے لیے آئے ہیں

○

جوان بازو میں طاقت بہت ضروری ہے
ہمارے بچوں کو کسرت بہت ضروری ہے

تری نگاہِ عنایت بہت ضروری ہے
لگی ہو پیاس تو شربت بہت ضروری ہے

اگر ہو خرچ زیادہ قلیل ہو تنخواہ
تو یہ سمجھ لو کہ رشوت بہت ضروری ہے

انھیں تو کوئی نہیں پوچھتا جو بزدل ہیں
یقین جانیے ہمت بہت ضروری ہے

پولیس والوں کو میرا یہ مشورہ دے دو
ستم گروں کی مرمت بہت ضروری ہے

کہیں نہ شانِ ترنم پہ حرف آ جائے
میاں گلے کی حفاظت بہت ضروری ہے

تم اپنا عیب چھپانا ہی چاہتے ہو تو پھر
جنابِ شیخ کی دعوت بہت ضروری ہے

سنا یہ ہے کہ زمانے کا غم بھلانے کو
شراب پینے کی عادت بہت ضروری ہے

اے پاپولر کرو ہمراہ ٹی وی والوں کو
ہمارے دور میں شہرت بہت ضروری ہے

مسیح انجم

قصہ "درس" سناتے ہیں....

اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کس سال، کس مہینے، کس تاریخ اور کتنے بج کر کتنے منٹ پر پہلی کلاس لی تھی؟ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی کلاس لیتے وقت دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلاس ہم نے نہیں لی تھی۔ بلکہ ہماری کلاس خود طلبا نے لی تھی۔ یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہ ہوگی کہ ہم نے اپنی ملازمت کے لیے پیشۂ تدریس کا انتخاب کیا تھا۔ کیوں کہ ہمیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر تم عاقبت میں عافیت چاہتے ہو اور حور و غلمان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو پیشۂ تدریس اختیار کرو۔ اس کے علاوہ ہم نے پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ نظر بندی کے زمانے میں جب شاہ جہاں سے یہ پوچھا گیا کہ وہ اپنی تنہائی اور بوریت کو کس طرح کاٹنا پسند کرے گا؟ تو ہز مجسٹی نے فرمایا تھا کہ "چند لڑکوں کا انتظام کر دو میں انھیں پڑھایا کروں گا۔" تاریخ خاموش ہے کہ شاہ جہاں کی اس فرمائش کی تعمیل کر دی گئی تھی یا نہیں۔ البتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شاہ جہاں سے سوال کرنے والے کوئی اور نہیں، اُن کے لائق و فائق فرزند اورنگ زیب تھے۔ جن کے تعلق سے ابن انشا کا یہ تبصرہ خوب ہے: "اس نے کوئی نماز قضا نہ کی اور کسی بھائی کو زندہ نہ چھوڑا۔"

پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں ہم نے یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ خلیفہ ہارون رشید کے لڑکے تو اپنے اُستاد کی جوتیوں کو اٹھانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ پیشۂ تدریس کے انتخاب کے وقت ہم بھی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے کہ لڑکے ہمارے آگے پیچھے سَر (SIR)، سر (SIR)، "صاب، صاب" کہتے پھریں گے اور ہماری جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے آپس میں اس حد تک لڑیں گے کہ نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کی نوبت آ جائے گی۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے وہ اس حد تک اُٹھائیں گے کہ ہماری جوتیاں بھی پھاڑ دیں گے اور ہم درس کو ننگے پاؤں خود ہونے کی نوبت آ جائے گی۔

موجودہ دور میں ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے اور ٹیچر کے عہدے پر فائض ہونے کے لیے ٹی ڈی سی یا بی ایڈ کا امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ایک رنگروٹ کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گزار کر ٹیچر کے روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ اب یہ ٹریننگ پانے والے پر منحصر ہے کہ آگے چل کر وہ آئیڈیل ٹیچر بنے یا سکسس فل ٹیچر (SUCCESSFUL TEACHER) کا روپ دھارے۔ آئیڈیل ٹیچر وہ ہے جس کی محدود آمدنی اور محتاط زندگی کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی اسے اپنا داماد بنانے پر راضی نہ ہو۔ سکسس فل ٹیچر وہ ہے جو مدرسے میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضر رہے۔ فرائض منصبی سے دور بھاگے۔ فرصت کے گھنٹے میں اسٹاف روم میں رمی* کھیلے اور پڑھانے کے گھنٹے میں لڑکوں کو خارج از نصاب سرگرمیوں میں مصروف رکھ کر کرسی پر دراز ہو جائے (اور اگر کرسی نہ ہو تو بوریئے پر لیٹ جائے) امتحانات کے زمانے میں لڑکوں کو نقل کے نت نئے طریقوں سے واقف کرائے اور پیروی کر کے بسٹ ٹیچر (BEST TEACHER) کا ایوارڈ حاصل کرے۔

جب میں اپنے حافظے کے اوراق اُلٹ پلٹ کرتا ہوں تو مجھے ان اوراق میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک ٹیچر کا مرقع جھانکتا نظر آتا ہے جو سکسس فل ٹیچر کے زمرے میں آتے ہیں۔ ذرا ان کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ شیروانی پہنتے تھے (بھلا اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے) لیکن سینے پر تین چار بٹنوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے تاکہ پتہ چلے کہ شیروانی کے نیچے کیا ہے۔ اور وہاں کس قسم کے زلزلے پرورش پاتے ہیں؟ پنجابی سینڈل پہنتے تھے۔ لیکن تسمے کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ جیسے بل ڈاگ کو بھونکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ چنانچہ چلتے وقت بکل کے ہلنے سے "چھنن چھنن" کی آوازیں آتیں۔ یوں لگتا گویا پاؤں میں گھنگھرو: بندھا اونٹ، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، کے مصداق اپنے پاؤں پھینکتا چلا آ رہا ہو۔ کلاس روم میں پہلے "چھنن چھنن" کی آوازیں داخل ہوتیں اور پھر تمام طلبا کو متنبہ کرتیں کہ خبردار! سرکس کے رنگ ماسٹر تشریف لا رہے ہیں، کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ پھر اس کے بعد موصوف معہ اپنی نحوست کے داخل ہوتے اور ایک گمبھیر "ہوں" کے ساتھ لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ ریاضی پڑھانے پر مامور تھے۔ راتوں میں فرائض غیر منصبی اور فرائض غیر ازدواجی میں مصروف رہتے اور مضمون ریاضی کی مناسبت سے راتوں میں کلب میں 'برج'* کھیلتے تھے۔ صبح جب کلاس روم میں داخل ہوتے تو ان کے چہرے پر "برج بھاشا" برستی رہتی تھی۔ پتوں کا سارا قصور بچوں پر نکالتے تھے۔ چونکہ اپنے مضمون پر حاوی نہیں تھے اس لیے لڑکوں پر حاوی ہونے کے لیے پیار کے بجائے "مار" کا سہارا لیتے تھے، اور اس کار خیر کے لیے نت نئے بہانے تلاشتے تھے البتہ ہوشیاری یہ کرتے کہ خرگوش قسم کا دبو لڑکا پٹے، اور اس کی دھکائی اور پٹائی کو دیکھ کر باغی قسم کے لونڈے مرعوب ہوں۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ ریاضی کا پورا پیریڈ پڑھائی کے بجائے پٹائی کے لیے وقف کیا اور ایک دبو قسم کے لڑکے سے ایک عجیب و غریب سوال پوچھا :

کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں کیوں ؟

اب لڑکا حیران کہ جواب دے تو کیا دے؟ یہ کوئی درسی سوال تو تھا نہیں کہ لڑکا "ہاں" یا "نہیں" میں جواب دے کر حسب استطاعت پٹتا۔ یہ تو اونٹ کی خصلت والے ٹیچر کے وقار کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ دو چار سکنڈ سوچ کر

---

* تاش کا ایک مشہور کھیل * تاش کا ایک کھیل۔

اس لڑکے نے ایک ٹھسک سے جواب دیا "نہیں صاحب! آپ جھوٹ نہیں بولتے!"

تڑ سے ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے فرمایا "میں کوئی ولی ہوں جو جھوٹ نہ بولوں؟"

یہ سنتے ہی لاکھ ضبط کے باوجود ہمارے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ پھر کیا تھا، شامت ہمارے پاس آگئی۔ پوچھا۔ پوچھا کیا، وہی سوال دہرایا "کیوں رے، کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں نہیں؟"

ہم نے سوچا کہ ٹیچر کے احترام پر مبنی مبالغے پر جب ایک طالبِ علم کی پٹائی ہوسکتی ہے تو کیوں نہ حق بات کا برملا اظہار کرتے چلیں۔ چنانچہ ہم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پٹاخ سے جواب دیا "جی حضور، صاحب، آپ جھوٹ بولتے ہیں!"

ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے فرمایا "کیوں رے لونڈے، میں جھوٹا ہوں؟" اور پھر جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا "استاد کا مار کھایا ہے۔ تو جنت میں ضرور جائے گا!"

اس چنگیزی سلوک کی اطلاع ہیڈ ماسٹر کو ملی تو انھوں نے ان کا ٹائم ٹیبل بدل کر ریاضی کے بجائے اردو پڑھانے پر مقرر کیا۔ دوسرے روز اردو کے گھنٹے میں کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے۔

لڑکوں کو تین چار اٹھک بیٹھک کرواکر کہا "چلو آج غالب کی غزل پڑھتے ہیں!"

پھر ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا "پڑھو غالب کی غزل۔ میں ذرا آپ لوگوں کا تلفظ دیکھنا چاہتا ہوں" اور پھر بڑی حقارت سے فرمایا: "پتہ نہیں سابقہ ٹیچر نے آپ کو کیا غیر غلط پڑھایا ہے؟"

لڑکے نے مطلع پڑھا۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

"بہت اچھے! ہاں تو دوسرا شعر پڑھئے!"

لڑکے نے کہا "سر! پہلے شعر کا مطلب؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا "مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو!"

لڑکے نے دوسرا شعر پڑھا اور پھر پوچھا "سر! مطلب؟"

مولوی صاحب نے کہا "مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو!"

لڑکے نے ایک اور شعر پڑھا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے پہلے کہ لڑکا پوچھتا کہ "سر! اس شعر کا مطلب؟" مولوی صاحب نے ہمیں اونگھتے دیکھ لیا جو ان کی افہام و تفہیم سے بیزار اور غالب سے بے نیاز ہوکر کہیں غرق ہوگئے تھے۔

اس اثنا غفلت کی حالت میں ہمیں پاکر اب کی بار مولوی صاحب نے اپنی توپ کا رُخ ہماری طرف پھیر دیا "بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟"

ہم نے کتاب پر جو نظر ڈالی تو شعر میں ایک نہیں دو "حق" موجود تھے۔ یعنی کہ دو سنگِ گراں!

پڑھنے کے ڈبل چانسس ہیں گویا ڈبل پروموشن ۔ بدنی صورت بنا کر فرمائشی آواز میں جواب دیا "سر! میرا مطلب بالکل صاف ہے، نیکی کے بڑھنے یہ زمین کو پہنچے اور پھر جنت کی بشارت دے کر ثواب دارین پائیے!!"

تو عرض کرنا یہ ہے کہ زمانہ کبھی SUCCESSFUL TEACHERS سے خالی نہیں رہا۔ لیکن ڈھونڈو تو ہزار ملتے ہیں بلکہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ۔ صرف تھوڑا سا وقت نکال کر اسکول کے معائنے کے لیے جانا کافی ہے ۔ آپ کا دل بھی بہل جائے گا اور سکسس فل ٹیچروں سے ملاقات بھی ہو جائے گی ۔ خدا خیابان حکیم صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ، جب کبھی تعلیمی مسائل اور مدارس کے زوال کا ذکر چھڑتا ہے تو وہ اپنے وطن مالوف کے حوالے سے ایک واقعہ کو لطیفہ بنا کر سنا دیتے تھے ۔ اور پھر اپنی داہنی ران پر ہاتھ مار کر ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنسی میں شامل کر لیتے تھے ۔ وہ لطیفہ نما واقعہ آپ بھی سن لیجئے:

ایک دن ایک انسپکٹر آف اسکولز ، دیہات کے ایک اسکول کے معائنے کے لیے جیپ میں نکلے کچھ دور جانے کے بعد ، ان کو جیپ سے اُتر جانا پڑا کیونکہ آگے راستہ ناقابلِ عبور تھا ۔ انہوں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی معقول سا آدمی مل جائے تو راستہ دریافت کریں ۔ اتفاق سے ایک نہیں ، تین چار معقول آدمی نظر آئے جو قریب والے تالاب میں بیٹھے جھک مار رہے تھے ، یعنی مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے (بیکار وقت گزارنے کو جھک مارنا بھی کہتے ہیں)۔ اس موقع کو غنیمت جان کر انسپکٹر آف اسکولز ان کے پاس جا پہنچے اور راستے کے بارے میں تفصیلات دریافت کیں ۔ لیکن ان شکاریوں کا راستہ بتلانے کا انداز کچھ اتنا پیچیدہ تھا کہ ساری تفصیلات بغیر کمپیوٹیشن کے دماغ میں نہیں گھس سکتی تھیں چنانچہ انسپکٹر آف اسکولز نے اُن سے درخواست کی کہ وہ چل کر جیپ میں تشریف رکھیں اور گائیڈ (GUIDE) کے فرائض انجام دیں ۔ مختصر یہ کہ شکاریوں کی سرکردگی میں جیپ منزلِ مقصود کو پہنچ گئی ۔ جیپ جب گاؤں میں داخل ہوئی تو اس کی آواز پر سرپنچ اور اُپا سرپنچ دوڑے دوڑے جیپ کے پاس آئے ۔ اُن کی آمد سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر آف اسکولز نے پوچھا:

"یہاں اسکول کہاں ہے؟ اور کتنے ٹیچر کام کرتے ہیں؟"

سرپنچ نے جیپ کی اندر والی سیٹوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا:

"ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟ یہ آپ اپنے ٹیچروں سے ہی پوچھ لیجئے جو آپ کی جیپ میں بیٹھے ہیں!"

ہم نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے کے لیے کئی طرح کے ... امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ٹریننگ کالج میں لیکچرز سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس ضمن

ہمیں اپنی ٹیچنگ کے زمانے کے ایک لیکچرر یاد آتے ہیں جن کا وجود کالج میں ایک بھرتی کے شعر کے مماثل تھا۔ دو سینیئرز کا حق مار کر پروموشن پر تشریف لائے تھے۔ زبردست PERSONALITY کے حامل تھے۔ لیکن ان کی PERSONALITY میں ہمارے شہر کی پوری MUNICIPALITY آباد تھی۔ اُن کو ایک ایم۔ ایل۔ اے کا آشیرواد حاصل تھا جو ایک حفاظتی ہالہ بن کر اُن کی پروموشن کا تحفظ کرتا رہتا۔ CURRENT PROBLEMS پڑھانے پر مامور تھے لیکن ان کو آتا جاتا کچھ نہیں تھا سوائے پرابلم کھڑا کرنے کے۔ چنانچہ ان کا پیریڈ پرابلم سے شروع ہو کر پرابلم پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں کوئی بات بن نہ پڑتی تو جھٹ کہہ دیتے:

THIS IS THE CURRENT PROBLEMS.

اُن کے کرنٹ پرابلموں سے تنگ آکر یار لوگوں نے ان کا نام ہی کرنٹ پرابلم رکھ دیا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں کرنٹ پرابلم والے لیکچرر پروموشن پر کالج میں تشریف لائے تھے تو انہی دنوں گریڈ اور گرانی الاؤنس کے بڑھانے کے سلسلے میں ملازمین کے نمائندوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات زوروں پر جاری تھے۔ اس طرح موصوف کے ہاتھ ایک نیا موضوع آگیا تھا جو ایک ہفتے تک وقت گزاری کے لیے کافی تھا، چنانچہ جب ایک دن کلاس روم میں داخل ہوئے تو گریڈ اور گرانی الاؤنس کا پرابلم ان کے ساتھ تھا۔ کرسی پر براجمان ہونے سے پہلے کھڑے کھڑے فرمایا: "آج کا سب سے بڑا گمبھیر مسئلہ بڑھتی ہوئی گرانی ہے حکومت کے پاس پیسہ ہے لیکن وزیرِ خزانہ قارون بنا بیٹھا ہے۔" پھر اس کے بعد وزیرِ خزانہ اور قارون کے حوالے سے ایک تلمیح طلب مصرعہ، جو پتہ نہیں کہاں سے اُڑا لائے تھے، طلبا کی طرف اچھال دیا۔

ع بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون

اس پر ایک طالب علم نے دکھتی میں گرہ لگائی:

ع اس کی ماں کا خلیل خاں ماروں

پھر تو پورا پیریڈ تک بندی اور جگل بندی میں گزر گیا۔

بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون
اس کی ماں کا خلیل خاں ماروں

عملِ تنقید کے جوش میں ہم یہ بتانا بھول گئے کہ مصرعۂ ثانی میں جہاں 'خلیل خاں' استعمال ہوا ہے وہ ہماری تحریف کا نتیجہ ہے ورنہ اصل مصرعہ میں تو خلیل خاں کی جگہ [illegible] کا متضاد لفظ استعمال ہوا تھا۔

دوسرے دن طلبا نے گزارش کی کہ "سر! کچھ نوٹس لکھوائیے!"

تو موصوف نے سوشیالوجی کو کرنٹ پرابلمس سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

SOCIALOGY IS CONSIDERED TO BE THE MOTHER ROOT OF OTHER SOCIAL SCIENCES.

اس سنہرے نکتے چلنے کے بعد اُن کی گاڑی نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا علمی سرمایہ

پھونک کر رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ گاڑی کو دھکا دینے کے لیے ایک طالب علم نے پوچھا "سر! سوشیالوجی کا کنسٹیپلس سے کیا تعلق؟ اور پھر یہ "مدر روٹ" کیا ہے؟

جواب ملا: "مدر روٹ؟ یعنی ماں کا روٹ!"

لڑکے نے حیرت سے کہا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

جواب سے سرفراز کیا گیا "میں اینگلو اُردو میں فرما رہا ہوں!"

اب ہم کہاں تک ذکر کریں۔ یہ تو صرف اُن کے دو تین پیریڈ کا ٹریلر تھا۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے ارشادات سے وہ طلبا کی نارمج میں فالج پیدا کیا کرتے تھے۔ چونکہ عملی اسباق کے مارکس اور ریمارکس اُن کے ہاتھ میں ہوتے تھے اس لیے کوئی بھی طالب علم ان کے آگے دم نہیں مارتا تھا۔ جو ٹرینی گاؤں کا اصلی گھی اصلی شہد اور چٹ پٹا اچار پچھلے دروازے سے ان کی خدمت میں پیش کرتا، اس کے عملی اسباق کے ریمارکس سبق ملاحظہ فرمائے بغیر ہی "شاندار" لکھ دیتے تھے اور جو بے چارہ ان چیزوں کا متحمل نہ ہوتا اس کے حصہ میں عجیب و غریب ریمارکس آتے مثلاً ایک ٹرینی کو جس نے گھی نہیں پیش کیا تھا یوں ریمارک کیا تھا:

"بورڈ پر لکھتے وقت مدرس کے چاک کی آواز سماعت پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ چاک کو یوں نہیں، یوں پکڑنا چاہیئے تھا۔ جب موصوف نے عملی مظاہرے کے طور پہ بورڈ پر چاک سے لکھ کر بتانے کی کوشش کی تو چاک چاک نہیں رہی تھی بلکہ چاک چاک ہوگئی تھی۔

تاریخ کے ایک سبق "سکندر اور پورس" کے ریمارکس یوں لکھے تھے:

"سکندر اور پورس" کے قصے کو مدرس اگر کٹ پتلیوں کے ذریعہ پیش کرتا تو سبق انتہائی کامیاب ہوتا!"

جانوروں سے متعلق ایک سبق میں تو انھوں نے حد ہی کر دی تھی۔

"مدرس صاحب گدھے کو کلاس روم میں بہ نفس نفیس پیش کرتے تو لڑکے بڑی آسانی سے گدھے کا سبق سمجھ پاتے!"

یہ تو صرف مدرسین سے متعلق تھا جو ذکور کی تعریف میں آتے تھے۔ اب ذرا اُناث کی طرف آیئے۔ جو لیڈی ٹیچر ان کے اجلاس پر حاضری دیتیں، ان کے سبق کے ریمارکس بڑے شاندار لکھ دیئے جاتے۔ اور جو لیڈی ٹیچر اپنے کام سے کام رکھتیں ان کے ریمارکس کچھ اس طرح ہوتے:

"ٹیچر کو چاہیئے کہ وہ گہری اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک استعمال نہ کریں۔ گہری لپ اسٹک کی وجہ سے طلبا کی نظریں ٹیچر کے ہونٹوں پر ہی مرکوز رہیں اور وہ سبق میں دلچسپی نہ لے سکے۔

"ٹیچر کو یہ نہیں چاہیئے کہ دورانِ سبق اپنے آنچل کو بار بار ٹھیک کریں۔ اس عمل سے طلباء کی توجہ میں خلل پڑتا ہے۔"

"ٹیچر بالکل سیدھے سادے انداز میں کلاس روم میں داخل ہو" (یعنی کہ اس کے چہرے پہ خاک اڑتی رہے اور وہ صورت سے بالکل چڑیل دکھائی دے!)"

جب نظم کو تحت میں پڑھانے کے بجائے ترنم سے پڑھائیں اور تھوڑی سی ادائیں بھی دکھائیں تو سبق انتہائی کامیاب ہوتا۔
قصہ مختصر یہ کہ ایسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں پہلی کلاس لینی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ٹیچرز ٹریننگ کے دوران ایک مدرس کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گزار کر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کس حد تک کامیاب مدرس ثابت ہوگا۔ چونکہ عملی اسباق کے نمبرات بھی مقرر ہوتے ہیں اس لیے ہر مدرس کو کلاس لینی پڑتی ہے جبکہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ تھیوری کی حد تک تو آپ کچھ نہ کچھ پڑھ کر یا حسب استطاعت نقل کرکے امتحان پاس کرلے سکتے ہیں لیکن عملی اسباق کی کامیابی کا سارا دارومدار ممتحن کے ریمارکس پر ہوتا ہے
ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ کرنٹ پرابلم والے جیسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں پہلی کلاس لینی تھی۔
اور اس پہ طرفہ تماشہ یہ کہ ہمیں جس جماعت کے طلبا الاٹ کیے گئے تھے وہ سارے کے سارے مشقی مدرسے یعنی (PRACTICING SCHOOL) سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھیں ٹیچرز تختۂ مشق بنایا کرتے تھے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تختۂ مشق بنتے بنتے وہ اس حد تک قیافہ شناس ہوگئے تھے کہ ٹیچر کے چہرے اور چال ڈھال پر نظر پڑتے ہی بھانپ لیتے کہ وہ کتنے پانی میں ہے ؟ اور اس کو جواب کے لیے کس حد تک ترسایا جاسکتا ہے ؟
وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ ٹیچر کے سبق کی کامیابی کا سارا دارومدار ان کے جوابات پر ہے ورنہ ٹیچر کو نااہل، ناکام و ناکارہ قرار دیا جائے گا۔ وہ اس وقت تک ٹیچر کے سوال کا جواب نہ دیتے، جواب دینا تو دور کی بات ہوئی، رسماً ہاتھ تک نہ اٹھاتے جب تک انھیں چاکلیٹ کی پیش کش کا لالچ نہ دیا جاتا۔ (اس طرح طلبا کی عادتوں کو بگاڑنے میں سکسیس فل ٹیچرز کا ہاتھ تھا) چونکہ ہمیں اس راز سے بہت بعد میں واقفیت حاصل ہوئی تھی اس لیے ہم نے پہلی کلاس کے موقع پر چاکلیٹ وغیرہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی بلکہ سبق کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ (آئیڈیل ٹیچر جو بننا تھا) ہم نے سبق کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، حتیٰ کہ ILLUSTRATIONS (توضیحات) تک اپنے مبارک ہاتھوں سے بنائے تھے۔
توضیحات کے ضمن میں سبق کی مناسبت سے ایک ایسی تصویر بھی بنائی تھی جس میں ایک فقیر کو بھیک مانگتا ہوا بتایا گیا تھا۔ ہم نے اس تصویر کو بنانے میں اپنی توانائیاں اس حد تک صرف کر دی تھیں کہ تصویر کو دیکھتے ہی یوں لگتا تھا جیسے فقر و فاقہ کا خاتمہ بس اسی پہ ہو رہا ہو۔ ہم نے تصویر کے اوپر جلی حروف میں "فقیر" لکھ دیا تھا اور تصویر کے نیچے "تیار کردہ مسیح انجم" ذرا جلی حروف میں لکھ دیا تھا تاکہ لڑکوں پر مدرس کا رعب پڑے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان کو پڑھانے والا کوئی معمولی مدرس نہیں بلکہ ایک بہت بڑا آرٹسٹ بھی ہے۔ خیر جناب، ہم پوری طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر مقررہ وقت پر، مقررہ پیریڈ میں پہلی کلاس لینے کے لیے جماعت میں داخل ہوئے۔ لڑکوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اسٹینڈ (STAND)، سٹ (SIT) کروائے اور پھر درس و تدریس کے اصولوں کے مطابق سبق سے متعلق تمہیدی سوالات کیے۔ لیکن جواب کے لیے نہ تو کسی لڑکے کا ہاتھ اٹھا اور نہ کسی لڑکے کے ہونٹ ہلے۔ بالکل سناٹا جیسے لڑکوں نے اپنے ہونٹ سی لیے ہوں ——
(اور اس سناٹے کو صرف چار آنے والے چاکلیٹ ہی توڑ سکتے تھے) بہرحال کچھ ہو اب سبق کو کسی نہ کسی طرح

آگے بڑھانا ہی تھا۔ چنانچہ ہم نے سبق کی مناسبت سے فقیر کی تصویر کو بورڈ پہ آویزاں کر کے نہایت ہی آسان سا سوال پوچھا "بچو! بتاؤ، اس تصویر میں کون ہے؟" بڑا آسان سا جواب تھا "فقیر!" لیکن کسی ماں کے لال نے نہ تو جواب کے لیے ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی جواب دیا۔ تب ہم نے پھر وہی سوال دہراتے ہوئے کہا "بڑا آسان سا سوال ہے، غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ اس تصویر میں کون ہے؟" پھر بھی سناٹا چھایا رہا اور ایسا سناٹا جیسے شہر خموشاں!

ابھی ہم آگے کے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا "سر! میں بتاتا ہوں!"

ہم نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "شاباش بیٹے! بتاؤ اس تصویر میں کون ہے؟"

تڑ سے جواب دیا "مسیح انجم"

اس جواب کے ساتھ ہی جماعت کے مختلف گوشوں سے ہنسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔

جی میں آئی کہ بدتمیز لونڈے کو تڑا تڑ پیٹ دیں۔ لیکن ٹریننگ کے اصول کے مطابق لڑکوں کو پیٹنے کا معلم کو حق نہیں ہے۔ اب مار تے تو کیوں کر؟ اور دوسری بات یہ کہ کلاس کے ایک گوشے میں وہی پرابلم والے ممتحن بیٹھے ہمارے سبق کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ گویا ایک نہ شُد دو شُد والا معاملہ تھا۔ تب ہم نے سوچا لڑکوں کو تھوڑا سا اشارہ دے کر سوال کریں تو شاید صحیح جواب ملے۔ چنانچہ ہم نے تھوڑی سی وضاحت کے ساتھ وہی سوال دہرایا "بچو! تصویر کے اوپر والی تحریر پڑھ کر بتاؤ کہ یہ تصویر کس کی ہے؟" لڑکوں نے اوپر کی تحریر کی بجائے تصویر کے نیچے والی تحریر پڑھ کر کورس میں جواب دیا "مسیح انجم"۔

اب ہمارے پاس چاکلیٹ تو تھے نہیں جو لڑکوں کو پیش کر کے صحیح جواب لیتے۔

بالآخر مایوس ہو کر پہلے لڑکے سے جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا تھا اُس کا نام پوچھا۔

"بابا! تمھارا نام کیا ہے؟"

بولا: "مبشّر!"

ہم نے پوچھا "تم شَر ہو یا شرِّ؟" جواب ملا: "شَر شِر!"

اس طرح سبق کی تمہید ہی میں کوئی بیس پچیس منٹ نکل گئے۔ گھڑی جو دیکھی تو پیریڈ کے ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔

اور پندرہ منٹ میں سبق کو ختم کرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ پھر تو ہم پہ زلزلہ سا طاری ہوگیا۔

یہ دیکھ کر پرابلم والے ممتحن نے قریب آکر پوچھا "کیا ہوا؟"

ہم نے لڑکھڑاتی زبان میں جواب دیا "وہی ہوا جو لڑکوں کو منظور تھا۔"

• قلمی معاونین اپنی تخلیقات پر مکمل پتہ ضرور لکھیں۔
تخلیقات صفحے کے ایک جانب لکھے جانے چاہئیں۔

جسٹس محمد حمید اللہ مہدی

شعر سے شیئر تک

(اردو کے شعر سے انگریزی کے شیئر تک)

کسی زمانے میں ہم طالب علم ہوا کرتے تھے، طالب علم تو خیر اب بھی ہیں ان معنیٰ میں کہ پہلے مکتب عرف مدرسے کے ہوا کرتے تھے اب کتب عرف کتب جامعہ لمیٹیڈ بمبئی کے مستقل طالبین میں رہے ہی غیر مستقل حاضرین میں منزود شامل ہوتے ہیں البتہ کتب میں نصابی کتابوں سے پالا پڑا کرتا تھا مکتبے میں غیر نصابی کتابوں اور کتابی چہروں میں گھرے رہتے ہیں۔ بہرحال بات اس وقت ہم طفل مکتب والے زمانے کی کر رہے ہیں جب ہم بھی علم کی طلب ڈنڈے کے زور سے جگائی جاتی اور ڈنڈا افعلی کر کے مدرسے بھجوایا جاتا تھا تب بھی ہمارا جھکاؤ بائیں بازو کی بہ نسبت دائیں بازو کی طرف زیادہ تھا۔۔۔۔ اور اب بھی ہے ——— یہاں اس بات کی صراحت کر دیں کہ بائیں اور دائیں سے ہماری مراد کسی سیاسی یا نیم سیاسی پالیسی سے ہرگز نہیں ہے کہ ہماری نظر میں شروع سے سیاسی پارٹیوں اور فاحشاؤں میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اول الذکر کے وعدوں اور آخر الذکر کے قول و قرار و عہد و پیماں کا کوئی بھروسہ کوئی اعتبار نہیں بلکہ بھروسے کا خون کرنے میں ہماری بیشتر سیاسی پارٹیاں بازاری فاحشاؤں سے بھی دو جوتے آگے ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کا وہ سانحۂ عظیم جس کا ایک زمانہ چشم دید گواہ ہے۔ خیر دائیں اور بائیں کے حوالے پر سیاسی پارٹیوں کا ذکر برسبیل تذکرہ آ گیا، اصل میں بائیں اور دائیں سے ہماری مراد الٹی طرف سے لکھی اور پڑھی جانے والی انگریزی زبان اور دائیں سے مراد سیدھی طرف سے لکھی اور پڑھی جانے والی اردو زبان سے ہے اور اتفاق سے شروع ہی سے ہمیں انگریزی سے کم اور اردو سے زیادہ لگاؤ رہا ہے بالخصوص اردو شعر و ادب سے اور اب بھی جبکہ اسکول و کالج سے نکلے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے شعر و ادب بدستور ہماری کمزوری ہے بلکہ ذریعۂ روٹی اور روزی بھی ہے کہ ہمارے قلم کا شعر و ادبی و غیر ادبی مختلف میدانوں میں چلتا ہے کبھی ذرا تیز کبھی دھیرے ——— یعنی کبھی مسائل تصوف عرف شعر و ادب پیغام فرسائی کرتے ہیں تو کبھی مسائل تاسف عرف ترسیل و ابلاغ کی تشہیری ذرائع ابلاغ پر قلابازیاں کھاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ نا قدانِ ادب اکثر ہمارے ادب پاروں پر تجارتی ادب کا ٹھپہ لگا کر بیک جنبش قلم

ادب کے دائرے سے اسکو نیلڈ کے ماہر فن ہماری غیر ادبی تحریروں کو ادبی قرار دے کر اپنی ساکھ سے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔

شعر و ادب سے مستقل شغف اور مسلسل مشق نے اگرچہ ہمیں غالب دوراں، اقبال زماں اور ملک الشعراء تو نہیں بنایا لیکن اتنی سوجھ بوجھ ضرور پیدا کی کہ جب کوئی شاعر، غزل سرائی کے دوران شعر دیکھئے گا حضور!" کہتا ہے تو ہم شعر و ادب سے نابلد کسی جاہل مطلق سامع کی طرح یہ نہیں پوچھتے کہ کون سا شعر حضور والا؟ زور والا کہ سرکس والا۔" کہنے کا مطلب یہ کہ شعر و ادب سے وابستگی کے طفیل ہم نہ صرف اردو کے شعر اور زو کے شیر میں تمیز کر سکتے ہیں بلکہ شیروں کی دیگر اقسام سے بھی اچھی طرح واقف ہیں جیسے وہ شیر جو دسترخوان کے حدود اربعہ میں زیب و زینت سے آراستہ ہوتے ہیں اور وہ شیر جو دسترخوان کے آگے زانو ئے ادب تہہ کیے دسترخوان پر موجود اشیائے خورد و نوش کے اس رفتار سے کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں کہ نگران اور میزبان دونوں کی کھٹیا کر دیتے ہیں مطلب یہ کہ ان کی عزت اتار دیتے ہیں۔

دسترخوانی شیروں کے علاوہ دو پایہ شیروں کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے جو حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں "ابوشیر" کہلاتی ہے۔ ابوشیروں کی پہچان یہ ہے کہ یہ ڈکارتے نہیں صرف ڈینگ مارتے ہیں۔ اتفاق سے ایک عدد حیدرآبادی ابوشیر کو ہم صحبت بھی چکھے ہیں۔ قصہ ان دنوں کا ہے جب حضرت آپ بش مہاراج سابق صدر امریکہ حال مقیم اپنے کا تانہ تازہ عتاب عراق پر نازل ہوا تھا۔ مذکورہ ابوشیر بھی تنور سے نکلی گرم گرم روٹی کی طرح تازہ تازہ عراق سے لوٹے تھے اور اتفاق سے ساتا کروز ایرپورٹ پر ہم سے ٹکرا گئے اور بمبئی سے حیدرآباد تک گفٹ مجر کی پرواز کے دوران اپنی بہیتم جھاک کی پرواز بلند کرتے رہے۔ موضوع گفتگو ظاہر ہے کہ خلیجی جنگ سے جدا کیسے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حیدرآبادی ابوشیر نے جنگ کا نقشہ کھینچنا شروع کیا۔ امریکی جنگی طیاروں کے عراقی توپ خانے کے ذریعہ مار گرائے جانے کی تفصیلات مع جذبات کے اس انداز سے بیان فرمائیں کہ یوں لگا جیسے سب کچھ واقعی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے بلکہ دیا۔ امریکی طیارے عراقی توپ خانے سے پہلے آنجناب ہی نے مار گرائے ہیں۔ ایک واقعہ تو ایسا بیان کیا کہ ہمارے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خالص دکنی لب و لہجہ میں بولے ـــــ "امریکہ کے پیاشیات' میزائلوں کا ذکر آپ بھی سنے ہونگے، کیا بولوں بغداد کی گلی گلی میں گلی کے ویسا آکے گرے تھے جیسا اپن لوگاں بھٹے کھا کے بیٹے پھینک دیتے دیکھو ـــــ ایک دن کیا ہوا بولے تو میں نائٹ ڈیوٹی کر کے گھر کو لوٹ رہا تھا کہ دن بولو تو یہ بڑا پیاشیات میزائل میرے قدموں میں آکے گرا، میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کو دنا دن دنا دن دو چار میزائلاں میرے چاروں طرف آکے گرے، بس وئی مثل اعظم کا نقشہ تھا چاروں طرف پیاشیات میزائیلاں اور بیچ میں میں اکیلا تن تنہا ـــــ میں سمجھ گیا جیسا ظل الہی، اکبر اعظم، باپ بیٹے انارکلی کو تن تنہا دیواروں میں چن دیئے تھے، ویسا ای امریکہ بھی میرے کو پیاشیات میزائلوں میں چن دینے کا پروگرام بنالئے میں دل میں بولا ـــــ فتح خاں یہ وقت خالی ہاتھ فتح خاں کے ویسا کھڑے رہنے کا نئیں ہے جوابی کارروائی بھی ضروری ہے۔ مگر جوابی کارروائی کرنے کے واسطے بھی ہتھیار ضروری ہوتے نا حضرت؟ اور اس وقت میرے ہاتھاں بھی خالی اور جیباں بھی خالی ـــــ لیکن دشمنوں میں پڑ گیا یا اللہ کروں تو کیا کروں اور اتنے میں ترنت بولا ہے یہ کہو...

میں شیئر یاد آ گئی دنیا کا کاٹ کے دیوکر بڑھانا بول کا پھر کیا تھا اس کا نام سے کے جگا اور ایک کے بعد ایک بیالسٹک میزائیلوں اٹھایا اور یا صدام حسین ملک کے بیاک ٹو دی پویلین BACK TO THE PAUALION یعنی امریکہ کی طرف اچھال دیا ـــــ

خلیجی جنگ میں امریکہ اور اس کے حلیف ممالک نے پیٹریاٹ میزائل کے علاوہ اور بہت سے ٹیکنالوجی اسلحہ کا استعمال کیا تھا جنہیں ہمارے مذکورہ ابوشیر اپنی زبان کے زور سے ایک ایک کر کے واپس امریکہ کی طرف اچھال سکتے تھے لیکن اچھال اس لیے نہیں سکے کہ طیارہ حیدرآباد پہونچ گیا اور اس طرح مذکورہ ابوشیر سے ہماری ملاقات ہو گئی۔

حیدرآبادی ابوشیر کے بعد ذرا ان شیروں کا ذکر ہو جائے جو مٹی کے شیر کہلاتے ہیں اور ہر شہر ہر محلے ہر گلی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ یہ دفتروں میں باس کے اور گھر میں بیوی اور ساس کے خوف کے کارن زیادہ تر باتھ روموں کے اندر الماریوں کے پیچھے یا پلنگوں کے نیچے پائے جاتے ہیں حیدرآباد میں تو ایک پورے کا پورا محلہ ان کے نام سے موسوم ہے اور عرف عام میں مٹی کا شیر کہلاتا ہے۔ ـــــ دو پاؤں والے ہمہ اقسام کے شیروں کے ساتھ یہاں اس پالتو چوپائے کا ذکر یقیناً بے محل نہ ہوگا جس کے تعلق سے یہ کہاوت برسوں سے مشہور ہے کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے گویا کتا فل ٹائم نہ سہی پارٹ ٹائم شیر ضرور ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ اپنی گلی کا یہ پارٹ ٹائم شیر دوسرے کی گلی میں قدم دھرتے ہیں ڈھیر ہو جاتا ہے یعنی گیدڑ ہو جاتا ہے اور گیدڑ کے تعلق سے بھی یار لوگوں نے ایک عدد کہاوت گھڑ رکھی ہے کہ شیر کی کھال اوڑھ لینے سے گیدڑ شیر نہیں ہو جاتا۔

اردو زبان کے شعروں اور اردو معاشرے کے شیروں کے علاوہ ایک شیر انگریزی کا بھی ہوتا ہے اور یہی ہمارے مضمون کا مقطع ہے۔ انگریزی کا یہ شیر اردو کے شعروں کی طرح نہ آمد کا ہوتا ہے نہ آورد کا نہ علامتی ہوتا ہے نہ الہامی بلکہ خالصتاً کاروباری ہوتا ہے کہ خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اردو میں البتہ واحد ہو تو حصہ اور جمع ہو تو حصص کہلاتا ہے اور جہاں اس کی کھلم کھلا خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہ جگہ شیر مارکٹ یا شیر بازار کہلاتی ہے ایسا نہیں ہے کہ کبھی شیر بازار کے قریب سے ہمارا گزر نہیں ہوا، ہوا ہے بلکہ بمبئی جیسے کاروباری شہر میں رہنے کی پاداش میں بارہا شیر بازار کے اطراف و اکناف کے گلی کوچوں سے ہمارا گزر ہوتا رہتا ہے اس کے باوجود وہاں سے جب بھی گزرتے ہیں بقول شاعر کے اس مصرع کی طرح بے لوث گزرتے ہیں۔

ـــــ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ظاہر ہے کہ ہم ٹھہرے بے کار آدمی سرتاپا شعر و ادب والے کاروباری شہروں سے بھلا ہمیں کیا لینا دینا۔ بلکہ کاروباری سے کیا لینا دینا ہم تو بس ایک ہی کاروبار سے واقف ہیں جو شعر و ادب کی زبان میں گلشن کا کاروبار کہلاتا ہے جس میں سوائے گھاٹے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا ـــــ نتیجتاً نہ تو کبھی ہمیں یہ خیال چھو کر نکلا کہ شیر بازار کے اندرونی کوائف کی خبر لیں، نہ ہی شیر بازار کے کسی چھوٹے موٹے دلال نے دانستہ یا نادانستہ ہم سے کبھی یہ کہا کہ میاں سکندر اعظم کے بعد تم دوسرے اعظم ہو یہاں سے جب بھی گزرتے ہو اس مخصوص انداز میں گزرتے ہو جو صرف سکندر اعظم سے منسوب ہے اور جس کا نقشہ شاعر نے کچھ اس طرح کھینچا ہے ـ

لایا تھا کیا سکندر کیا لے گیا جہاں سے ۔ تھے دونوں ہاتھ خالی باہر کفن سے نکلے

بلکہ میری شعوری عمر تم سکندر اعظم سے بھی بڑے اعظم ہو محض اس بنا پر کہ وہ تو بعد فنا خالی ہاتھ دنیا سے گیا تھا اور تم جیتے جی خالی ہاتھ گزر رہے ہو! آخر کب تک ؟ کبھی تو کاغذی شیروں کی اس منڈی میں قدم رنجہ فرما کے اتنا تو دیکھو کہ :

شیئر کیا چیز ہے ؟ نفع کیا ہے ؟ -!!

سچ تو یہ ہے کہ ایک زمانے تک شیئر اور شیئر بازار کے تعلق سے ہماری معلومات عامہ صرف اس لطیفہ تک محدود تھیں جو یہ ہے کہ شیئر بازار کے ایک شاطر سیٹھ جب تک اپنے منیم کی زبانی شیئروں کے تازہ ترین بھاؤ اور چڑھاؤ کی تفصیل رپورٹ سن نہیں لیتے تھے انھیں نیند نہیں آتی تھی۔ ایک شام معمول کے مطابق منیم تازہ رپورٹ پیش کر رہے تھے :

"سیٹھ جی گپت چرن خبر لایا ہے کہ چاندی کا بھاؤ گرنے والا ہے!"

سیٹھ نے جواب دیا ، چاندی کا سارا اسٹاک بیچ دو۔ فوراً —!

منیم نے آگے کہا ، کپاس کا بھاؤ سنا ہے اور چڑھنے والا ہے !"

سیٹھ جی بولے : "مارکٹ کی ساری کپاس خرید لو۔ فوراً !"

منیم نے فرمایا : "سنا ہے مرداری مل کے شیئر کا بھاؤ گرنے والا ہے"

سیٹھ بولے : "سارے شیئر بیچ دو۔ فوراً"

اتنے میں نوکر نے آکر گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی۔ سیٹھ جی ! غضب ہو گیا۔

"سیٹھانی چھجے مالے سے گر گئیں ۔!"

سیٹھ اسی روانی سے بولے — "بیچ دو فوراً"

شیئروں کے باب میں راوی نے اس لطیفے کے بعد کچھ نہیں لکھا تھا۔ لہذا ایک عرصہ تک اسی آدھی ادھوری معلومات کے سہارے چین سے زندگی کے دن کٹ رہے تھے کہ ایک دن اچانک قاضی بدیع الزماں علاقہ قاضی مطیع الزماں ساکن قاضی پورہ (خورد) اورنگ آباد (کلاں) حال مقیم مدن پورہ بمبئی ہمارے ایک ہفت وارہ ملاقاتی کے توسط سے داخل حلقۂ احباب ہوئے اور یوں کچھ عرصے کے لیے ہمارا چین و سکون غارت ہو گیا ، کیونکہ جس طرح بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹتا ہے اسی طرح قاضی بدیع الزماں کے ہاتھوں سارے کا سارا شیئر بازار ہمارے پھکا پھلا بھجلی میں آ ٹپکا — جیسا کہ نام کے اولین حصے سے ظاہر ہے قاضی صاحب قبلہ کے آبا و اجداد پیشے کے اعتبار سے رجسٹرڈ قاضی ہوا کرتے تھے لیکن موصوف نے ترک وطن کے ساتھ آبائی پیشہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اور شیئروں کا دھندا اختیار کر لیا تھا۔ گو باپ دادا وطن مالوف میں نکاح نامے تقسیم کیا کرتے تھے ، موصوف وطن ثانی میں شیئر سرٹیفکیٹ بیچنے لگے !

ایجنٹ چاہے بیمہ کا ہو ، شیئر بازار کا ہو یا بازار حسن کا ، باتوں کے طوطا مینا بنانے میں پیشہ ور آرٹسٹوں کے بھی کان کاٹتا ہے۔ قاضی صاحب قبلہ اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس مہارت اور چابک دستی سے باتوں کے طوطا مینا بناتے تھے کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ طوطا مینا ہیں یا زاغ و زغن — موصوف کی لچھے دار باتوں کا صرف ایک نمونہ پیش ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے ان سے پوچھا " قاضی صاحب قبلہ ، یہ بتایئے شیئر کہتے کسے ہیں ؟"

تبسم فرماتے ہوئے بولے ـــ سوال اگرچہ ٹیڑھا ہے لیکن میرا کام ہر بات کو اچھی طرح کھول کر سمجھانا ہے لہٰذا غور سے سنیے آپ چونکہ شعر و ادب کے آدمی ہیں اس لیے آپ ہی کی زبان میں سمجھاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا ہے کہ شیئر کیسے بکتے ہیں تو عرض ہے ـــ

ایک فن ہے سمجھنے کا اور سمجھانے کا

شیئر بکتے ہیں جیسے حباب ہے دکھانے کا ـــ آداب عرض ـــ !!

ہمارا استفسار تھا شیئر خریدتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

بولے ـــ شیئر بھی آم کی طرح ہوتے ہیں اس لیے انہیں خریدتے وقت مرزا غالب کی طرح صرف ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے، میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ آداب عرض !!

ہم نے آگے دریافت کیا۔ عوام الناس میں عام طور پر غلط فہمی عام ہے کہ شیئر کا کاروبار ایک طرح کا سودی کاروبار ہے، کیا یہ درست ہے ـــ؟

بولے ـــ بالکل غلط، غلط فہمی ہے یہ، شیئر کا کاروبار سود کے کاروبار سے ایک دم مختلف ہے۔ سود کے دھندے میں اصل رقم تو جہاں کی تہاں رہتی ہے اور سود افتادہ کی بوس کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے جبکہ شیئر کے بھاؤ مسلسل پارے کی طرح چڑھتے اترتے رہتے ہیں گویا شیئر کے کاروبار میں نفع کے ساتھ نقصان لگا رہتا ہے بقول شاعر ـــ

خوشی کے ساتھ اس دنیا میں اکثر غم بھی ہوتے ہیں

بجتی ہے شہنائی کبھی ماتم بھی ہوتے ہیں

سچ پوچھیے تو شیئر کا کاروبار سود کا نہیں، سوجھ بوجھ کا کاروبار ہے۔ اس میں نہ تو [illegible] کی دال آزمودہ فارمولا کام آتا ہے نہ بہاؤ کی مخالف سمت تیرنے سے گوہر مقصود ہاتھ لگتا ہے۔ شیئر بازار کے تیز رفتار ریلے میں کسی تجربہ کار ایجنٹ کی رہنمائی کے بغیر تیرنا ناممکن ہے۔ کسی فلمی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ـــ

جنہیں ان راہوں پر چلنا ہے

انہیں گرنا اور سنبھلنا ہے ـــ آداب عرض !!

اس سے پہلے کہ موصوف اپنی لچھے دار باتوں سے شیئر و شیئر بازار کی گتھیوں کو مزید پیچیدہ کر کے ہمارے دماغ کا دہی کر دیتے کہ خود شیئر بازار میں ایک ایسا بھونچال آگیا جو شیئر بازار اور قاضی صاحب قبلہ کے کاروبار دونوں پر وقتی طور پر مکمل جھاڑو پھیر گیا!

شیئر بازار کی گہماگہمی اور کاروباری پیچ و [illegible] کاروبار میں ہلچل دینے والے اس بھونچال کا نام نامی بتانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ آج دیس کا بچہ بچہ بلکہ پردیس کے بچے بھی ان کے نام اور کام دونوں سے کما حقہٗ واقف ہیں یہاں [illegible] محض عادتاً آگیا۔ موصوف شیئر بازار کا یہ شیر اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت پچھلے سات برسوں [illegible] اخبار کی سرخیوں کی زینت بنا رہا۔ ایک [illegible] شیئر، شیئر بازار کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اب سے دس پندرہ برس قبل اس وادی امارت [illegible] فرمایا تھا تب یا [illegible] لیکن اپنی شیئر بندی، شیئر بازاری و شیئر فہمی کے بل بوتے پر [illegible] اس وقت کے [illegible]

سارنے بھی رہبر مانِ شیخی کو اس قدر مرعوب و متاثر کیا کہ دو چار روز ان کا ذکر ہی کیا۔ سیکڑوں قوم اس کے نقش قدم پر چلنے کے فقشہ ہو بہو وہی تھا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب بازار شیر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور کارواں بھی ماشا اللہ کیا! اعلیٰ ارفع اونچا معیاری یعنی سرکاری دربار کے بھکاری ہر شعبے ہر محکمے کے افسران اعلیٰ حکام کی چہرہ شناسی کوئی چھپی چھپائی نہیں سب ہی اپنے اپنے شعبے کے صدا اپنے اپنے محکمے کے بے تاج کے بادشاہ لیکن سارے شیر شیئر بازار کے آگے دست بستہ و سرنگوں ہر قدم پر دامے درمے سخنے ہر قسم کے تعاون کے لیے آمادہ و تیار ہے۔

جو لوگ اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ حکام بالا کی طرف سے اکثر شاکی رہا کرتے ہیں کہ یہ فرض منصبی الضرورت مندوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کرتے، محض ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے جس فراخدلی سے شیئر بازار کے شیر کی طرف اپنا دست تعاون دراز کیا، اسے دیکھ کر نہ صرف ہماری آنکھیں کھل گئیں بلکہ اس بات پر بھی ہمارا ایمان پختہ ہو گیا کہ ہمارے ارباب مجاز جب تعاون کرنے پر آتے ہیں تو پھر کسی چھوٹے موٹے تعاون پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہزاروں لاکھوں یہاں تک کہ کروڑوں روپے تعاون کے نام پر جھونک دیتے ہیں ـــــ اب اگر اس تعاون کے مارے میں انھوں نے تھوڑا سا کمیشن کھا لیا اپنا اور اپنی اگلی دو چار پشتوں کا مستقبل محفوظ و مضبوط کر لیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے، کاروبار میں تو لین دین چلتا ہی ہے اور پھر جس تعاون کے پیچھے خیر سگالی کا جذبہ کارفرما ہو اس کی مذمت نہیں تعریف کی جانی چاہیے بلکہ اس قسم کے باہمی تعاون کو مثال بنا کر پیش کیا جانا چاہیے تاکہ امداد باہمی کے جذبہ کو فروغ حاصل ہو۔

شیئر بازار کے شیر کے پردہ زنگاری والے کھیلوں میں افسران اعلیٰ حکام بالا کے علاوہ اور جتنے معشوق پیچھے تھے سب ایک ایک کر کے باہر آ چکے ہیں ان میں صرف سیاست کے پیرو جوان ہی نہیں بلکہ پیر مغاں بھی ہیں یہ اور بات ہے کہ پردے کے پیچھے سے باہر آنے کے بجائے "سوٹ کیس" میں سے برآمد ہوتے ہیں، بہرحال شیر شیئر بازار کے ان عظیم الشان کھیلوں اور کھیلوں کی سرکاری سطح پر پردہ داری و پردہ دری کے عالمی پیمانے پر ہونے والوں چرچوں نے یہ ثابت کر دیا کہ جس کے پاس شیئرز کی طاقت ہو وہ ملک کی سب سے بڑی ہستی کے گریباں پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے اور شیئرز کے بے شمار کمالات میں یہ کمال ایسا ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، جتنا لکھا جائے تھوڑا ہے

••

ہمارے آم کا لکھا کہاں ہوئے



وجاہت علی سندیلوی

پانچ چھری اور چاقو بڑی تندہی اور انہماک سے چل رہے تھے۔ ہر وار کارگر تھا، کوئی اوچھا نہ جاتا۔ آج کل کی آگ اور خون کی فضا میں غنیمت یہی تھا کہ ان سے لہو کے بجائے رس ٹپک رہا تھا۔ اور ان کے ہدف قتلوں میں بھیگتے ہوئے بنارسی لنگڑا، راجہ پسند، دسہری، رٹول، بے نظیر، خاص الخاص، حسن آرا، مکھن، زردآلو، بدلا ثمار، وغیرہ وغیرہ آم تھے۔

تاریخ ۱۵ رجون ۱۹۹۳ء تھی اور جائے وقوع مرزا صاحب کا باغ فردوس، غالب وقت بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے متعلق ہم ہندستانیوں کے اقدار ساری دنیا سے نرالے ہیں اور اگر ۱۱ بجے کی کوئی تقریب ۳ بجے منعقد ہو جائے تو منتظمین کو ان کی وقت کی پابندی پر لائق تحسین سمجھا جاتا ہے۔ بہرکیف ہم لوگوں نے اس کارِ خیر کا آغاز ساڑھے ۸ بجے سویرے کیا تھا اگرچہ مرزا صاحب نے آم کھانے کے لئے مدعو کرتے وقت تاکیداً ۸ بجے کا وقت مقرر کر دیا تھا۔ خوشحال سنگھ کو انھوں نے پہلے لجاجت اور پھر کچھ غصے سے سمجھا دیا تھا "دیکھئے سردار جی! آپ ہی ہمیشہ لیٹ لطیف ثابت ہوتے ہیں۔ معاف کیا آپ کو! ۸ بجے تک پہونچ جائیے گا۔ ورنہ معاف کیا آپ کو، میں آپ کا اسکوٹر اٹھا کر چنوا تال میں واقعی پھینک دوں گا۔ کیونکہ اسی کی خرابی ہر جگہ آپ کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ معاف کیا آپ کو"۔

سب سے آخر میں سوا دس بجے خوشحال سنگھ ہی پہونچے تھے، اس عذر کے ساتھ کہ ایک بھینس کو بچانے کی کوشش میں ان کے اسکوٹر کا ایک پہیا، ایک کھلے مین ہول میں جاتا رہا تھا۔ مرزا صاحب کے منہ سے غیر ارادی طور سے ان کا تکیہ کلام "معاف کیا آپ کو" فوراً نکل نہ گیا ہوتا۔ تو غالباً دیر تک اس موضوع پر بحث ہوتی کہ قصور بھینس کا تھا یا اسکوٹر کا یا مین ہول کا۔ اور پھر آخر میں امرناتھ، منصف مجسٹریٹ، شاید یہی فیصلہ کرتے کہ قصور ان تینوں کا نہیں بلکہ خود مرزا صاحب کا تھا جنھوں نے یہ دعوت اتنے منتقد کی تھی سے

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ۔۔۔۔ بات پہونچی تری جوانی تک

واہ! کیا محتمد میں دماغ پایا ہے آپ نے! کہتے ہوئے ان کی تائید کرتے کیونکہ ان کے خالو کے ایک بھتیجے کا کوئی مقدمہ منصف مجسٹریٹ صاحب کے اجلاس پر زیر سماعت تھا۔

مرزا صاحب ایک شکاری چاقو لئے اور "معاف کیا آپ کو" کہتے ہوئے آم کے تسلوں کی میزوں کے گرد گھوم رہے تھے اور سب سے زیادہ واجب القتل آموں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ "کرم چند! یہ بد اطوار کیوں نہیں کھاتا، کھانے کا تو عمر بھر ہونٹ چاٹتا رہ جائے گا" "امرناتھ جی! آپ جیسا منصف اور اس دسہری کے ساتھ انصاف نہ کرے آپ تو صرف اپنے جیب خرچ سے آم کھا رہے ہیں۔ آپ ذائقے کے بجائے مقدار پر جاتے ہیں۔ اس خاص انگلی کو چھوئیے اور کبھی مجھے کہتے ہو کیسی صاحب یقین جانیے کوئی لنگڑا کھانے سے لنگڑا نہیں ہو جاتا۔ آپ ثمن کو چھوڑ کر اس لنگڑے پر چھری چلائیے" ہر ایک یا دو جملے کے بعد "معاف کیا آپ کو" کہہ کہہ کر مرزا صاحب، کسی گرگ باراں دیدہ قسمت کے مخبر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور بیچارے آموں کو مجرموں کی طرح کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنے پہ تلے ہوئے تھے۔

مجھ کو اور خوشحال سنگھ کو آموں کے حسب نسب، ذات اور قسم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم لوگوں کے لئے چچا غالب کا یہ مقولہ بہت کافی تھا کہ وہی آم اچھے جو میٹھے ہوں اور بہت ہوں" امرناتھ چونکہ ڈالیوں کے آم کے عادی ہو چکے تھے لہذا ان کی دلچسپی بھی ہم سے کم غنیمت تھی۔ البتہ کرم چند جو اپنے آپ کو آموں کا مبصر سمجھتے بات بات پر مرزا صاحب سے اُن کی قسم، رس کے گاڑھے یا پتلے ہونے، سائز، رنگ و بو، چھلکے کی دبازت اور گٹھلی کی جسامت وغیرہ کے متعلق الجھ رہے تھے۔ اور مرزا صاحب غیر معمولی تحمل سے، کیونکہ میزبان تھے، "معاف کیا آپ کو" کہہ کہہ اُن کی ہر بدعت طرازی کا جواب اس طرح دے رہے تھے جیسے کسی غبی طالب علم کو کوئی نیا سبق پڑھا رہے ہوں۔

امرناتھ نے کہا "ارے بھائی مرزا تمہاری سبز پری کہاں ہے؟"

مرزا، تسلوں کے درمیان سبز پری تلاش کرنے میں ناکام رہے تو انھوں نے خوشحال سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"معاف کیا آپ کو" معلوم ہوتا ہے سبز پری کو کالا دیو صفاچٹ کر گیا ہے"۔

اس اثناء میں خوشحال سنگھ نے چھری رکھ دی تھی اور دست خود دہان خود کے اصول پر کاربند ہو گئے تھے۔ وہ آموں کو کھا نہیں بلکہ بھنبھوڑ رہے تھے جس کی گواہی اُن کی رس بھری داڑھی دے رہی تھی۔ جتنی دیر میں ہم چار آدمی چار چھلکوں اور گٹھلیوں کو اُن کے لئے رکھے ہوئے ڈرم تک پہنچاتے اتنی ہی دیر وہ اس ڈیوڑھے چھلکے اور گٹھلی اس میں پہنچا دیتے ــــ اُن کے لئے تو چل میں آ کا مضمون تھا۔

کرم چند نے ٹوکا "اجی یہ بھی کوئی آم کھانے کا طریقہ ہے؟" "جب چھری اور چاقو نہیں ایجاد ہوئے تھے۔ تب آم کیسے کھائے جاتے؟" خوشحال سنگھ نے جواب دیا۔

"تب آپ کا اسکوتر بھی ایجاد نہیں ہوا تھا اور لوگ آم کھانے دیر سے نہیں بلکہ قبل از وقت پہونچ جایا کرتے" امرناتھ بولے۔

"بھئی میں وقت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ جو کام ۲۰ سکنڈ میں ہو سکتا ہو اس کے لئے ۳ منٹ کیوں ضائع کئے جائیں۔ کام ہم آپ ایک ہی کر رہے ہیں یعنی آم کے گودے اور رس کو اپنے پیٹ میں اور اس کے چھلکے اور گٹھلی کو ڈرم میں پہنچا رہے ہیں" یہ کہتے ہوئے خوشحال سنگھ نے ایک گٹھلی ایسے پھینکی کہ وہ مرزا صاحب کے سر سے پھسلتی ہوئی ڈرم تک جا پہونچی۔ دیکھنے والے یہی سمجھے کہ مرزا صاحب نے اپنے سر سے گول کیا ہے۔

"کرم چند بھئی اس تسلے میں ایک 'فیروزہ' تھا وہ کس کے ہاتھ لگ گیا؟"

"معاف کیا آپ کو! کیا فیروزہ باد میں آپ کی سسرال ہے؟ یہ لیجئے میں آپ کے لئے یہ دوسرا فیروزہ تلاش کر لایا ہوں"

میں نے خوشحال سنگھ سے کہا "سردار جی اب خدا کے لئے اگر اپنے پیٹ پر نہیں تو اپنے اسکوٹر پر رحم کرو اور آم کھانا بند کرو — اُس کے ٹائر ٹیوب برسٹ ہو گئے تو اب کی بار تم ہسپتال میں جانے کے بجائے بجلی کے کھمبے پر چڑھ جاؤ گے"

میری بات کو سنی اَن سُنی کرتے ہوئے خوشحال سنگھ نے کہا "اگر مرزا غالب آج زندہ ہوتے تو میں اُن کے تذکرے اُن کے اس مقولے میں کہ آم میٹھے ہوں اور بہت ہوں، ایک ترمیم مزید پیش کرتا"

"معاف کیا آپ کو! وہ کیا؟" مرزا صاحب نے دریافت کیا۔

"وہ یہ کہ آم میٹھے ہوں، بہت ہوں، اور پرائے ہوں، یعنی اپنے نہ ہوں تاکہ انہیں بے دردی سے کھایا جا سکے۔

سب نے قہقہہ لگایا۔

آم کھانے کا سلسلہ ختم ہوا تو ہم لوگ ہاتھ منہ دھو کر باغ کے وسط میں بنے ہوئے کمرے کے برآمدے میں پہونچ گئے اور صوفوں پر بیٹھ کیا ڈھیر ہو گئے۔ ہمارے منہ نمکین کرانے کے لئے مرزا صاحب نے درمیانی میز پر اپنا ہاٹ باکس کھول دیا۔ سیخ کے کباب اگرچہ جسل نہیں رہے تھے۔ لیکن کچھ ایسے ٹھنڈے بھی نہیں ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم لوگوں نے چمچے اور پلیٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں براہ راست کھانا شروع کر دیا۔

مرزا ایک "ہائے" کہنے کے بعد بولے "معاف کیا آپ کو! اب آموں میں بھی اپنا اور پرایا ہونے لگا ہے۔ ہمارے وقتوں میں۔۔۔۔" گویا موجودہ وقت اُن کا نہیں تھا "جب نخالص (بمعنی خالص) گھی روپے کا سیر بھر بلکہ اکثر اٹھارہ اور بیس چھٹانک تک ملا کرتا، معاف کیا آپ کو! اللہ جھوٹ نہ بلوائے اٹھارے ایک روپے کے چونسٹھ ملتے اور بالشت بھر بھر کی دسہریاں تین روپے کے بائیس پنجے ملتیں!"

"یہ بائیس پنجے کیا ہوتے؟" امرناتھ نے پوچھا۔

"معاف کیا آپ کو۔ بائیس ضرب پانچ یعنی ایک سو دس" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"مرزا صاحب! کیا اُس وقت عام طور سے دسہریاں ایک ایک بالشت کی ہوا کرتیں؟" میں نے پوچھا۔

"معاف کیا آپ کو! اگر آپ اتنی بڑی دسہری نہیں ہضم کر سکتے تو دو چار انگل کم کر دیجئے" مرزا صاحب نے کہا اور اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا "معاف کیا آپ کو! اُس وقت آم چکھنے کا رواج بھی عام تھا۔ خریدار جن میں اکثر ناخریدار بھی شامل ہوتے دو چار آم بیچنے والے کے تکلف یا اپنی بے تکلفی سے چکھ بھی لیا کرتے۔ اور معاف کیا آپ کو، بیشتر آم کے بھر پیٹ وہی لوگ ہوا کرتے جو منڈی جا کر مختلف آم بیچنے والوں کی ڈھیریوں سے اتنے آم چکھ ڈالتے کہ پھر انہیں آم کھانے اور خریدنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی"

"کاش کہ مرزا غالب اُس زمانے میں ہوتے! اگر ہوتے تو وہ پھر یہ نہ کہتے کہ "ہوئی صبح اور کان پر رکھ کر قلم نکلے" بلکہ یہ کہتے کہ "ہوئی صبح اور ہونٹ پر رکھ کر زباں نکلے" کہہ کر میں نے اپنی عقلمندی کا ثبوت پیش کیا۔

مرزا صاحب نے جھلا کر کہا "معاف کیا آپ کو! اگرچہ تم بالکل ہی عقل سے تُرپ ہو۔ یعنی میں ذکر کر رہا ہوں ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ کا اور تم معاف کیا آپ کو، ذکر کر رہے ہو مرزا غالب کا جو اس سے سو سال پہلے جب

آم اس سے بھی زیادہ کہیں سستا تھا، دوستوں اور شاگردوں سے فرمائش کر کے آم بھیجنے والوں کو بہلا پھسلا کر یا پھر شعر سنا کر یا [illegible] کے بجائے اُدھار آم کھایا کرتے"

"ہمارے نانا بھی بتایا کرتے" امرناتھ نے کہا "کہ اُن کی جوانی میں آم کے بعض شوقین آموں کی فصل میں سویرے ہوا خوری کے بہانے نکل کھڑے ہوتے، اور باغوں میں جہاں اُس وقت بازار میں لے جانے کے لئے ٹوکرے سجائے جا رہے ہوتے، منہ اندھیرے بن بلائے مہمانوں کی طرح پہونچ جاتے اور موقع واردات ہی سے واردات یعنی آم چکھنا شروع کر دیتے"۔

کرم چند، اپنی گذشتہ حماقت کا ازالہ کرنے کی کوشش میں بقراط بنتے ہوئے بولے "آم والے مبصرین کی یہ دست درازیاں برداشت کیسے کر لیتے؟ سے

بھائی چارے کا یہ مطلب ہے نرالا دوستو
ہم تو سمجھیں بھائی اُن کو اور وہ چارہ ہمیں

"معاف کیا آپ کو!" مرزا نے جواب دیا "یہ ادائیں اور خطائیں طوعاً و کرہاً نہیں بلکہ معاف کیا آپ کو ہنسی خوشی برداشت کی جاتیں کیونکہ اس وقت چاندی کے روپے میں کھنک اور جس کی جیب میں وہ ہوتا اس کے لہجے میں معاف کیا آپ کو، دھمک ہوتی"

"ہر چیز سستی تھی، کوئی چیز گراں تھی تو بس خود روپیہ" امرناتھ نے کہا۔

"بھئی یہ آموں کے درمیان اقتصادیات کیسے گھس آئی؟" خوشحال سنگھ نے اعتراض کیا۔

"جیسے میں ہول میں آپ کا اسکوٹر!" میں نے عرض کیا۔

میری بات کو اَن سُنی کرتے ہوئے خوشحال سنگھ کہنے لگے "میری ساس بتاتیں کہ میرے سسر بھوپندر سنگھ آموں کے بڑے شیدائی تھے۔ اُن کی ایک چھوٹی سی بغیا میں تھی۔ آموں کے بارہ پیڑ تھے۔ وہ اُن کی فصل بڑی مشقت سے بچاتے اور جب تک آم توڑ کر گھر لاتے اور پال رکھنے کے قابل نہ ہو جاتے وہ تن تنہا رات کو لٹھ لے کر پیڑوں ہی کے پاس سوتے۔ وہ اپنے آم کسی کو نہ دیتے اور گاؤں والے اُن کی اس کنجوسی پر اُن سے خفا رہتے۔ گاؤں کا یہ پرانا دستور تھا کہ آبادی کے اندر جو پیڑ آم، جام، جامن، امرود وغیرہ کے ہوتے اُن کے مالک اُن کے پھل ہمیشہ گاؤں والوں میں بانٹ کر کھاتے"۔

"معاف کیا آپ کو! ہمارے گاؤں میں بھی یہی دستور ہے۔ اور اُس کی خلاف ورزی کرنے والے پر فوراً جرمانہ ڈال دیا جاتا ہے" مرزا نے بات کاٹ کر کہا۔

"ایک رات بھوپندر سنگھ اپنے پیڑوں کے پاس بے خبر سو رہے تھے۔ دفعتاً اُن کی کے لنگے تو ندر پر تین چار مینڈھک آ کر گرے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ انھوں نے دیکھا کہ اُن کی بغیا سے کچھ فاصلے پر کفن پہنے ایک بے سر کی لاش پاس ہی کے پیڑ سے لٹک رہی ہے اور اُس کے اندر سے یہ غصے بھری آواز آ رہی ہے۔ ابے بھوپندر سے الو تجھ سے پیر کا بھی حصہ ہڑپ کر جاتا ہے کل سے روز چوبیس [illegible] آم مزار پر پہونچا دینا اور خبردار بات اپنے تک رکھنا ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ بھوپندر سنگھ ڈر سے ڈر کر گھگیانے لگے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے

ایک مینڈک پر اُن کا پیر پڑا تو وہ چیخ مار کر گر پڑے اور تھوڑی دیر کے لیے بے سُدھ ہو گئے۔" خوشحال سنگھ نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"دوسرے دن بجو پندر سنگھ، ہم بیکر نو گزے پیر کے مزار پر تو گئے لیکن کچھ فاصلے پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب بہت تھوڑی [illegible] رات کی روشنی میں اور [illegible] کی [illegible] کی لاش [illegible] تھے گھوڑے تو رہنا بد معاشوں پہ چیختے ہوئے پہ جھپٹ پڑے۔ ہم نے کہ بد معاش تو نو دو گیارہ ہو گئے اور ملے نہیں البتہ بے سر کی لاش کا کفن یعنی ایک پھٹی چادر مزار کے قریب جھاڑیوں میں اُلجھی چھوڑ گئے۔ بہر کیف جیت بد معاشوں ہی کی ہوئی یعنی اس تاریخ سے بجو پندر سنگھ اپنے پیڑوں کے آم بڑی فیاضی سے گاؤں والوں کو بھی کھلانے لگے۔"

"معاف کیا آپ کو! معاف کیا آپ کو!" کہہ کہہ کر مرزا صاحب نے بڑی خوشدلی سے اپنے ہر ایک مہمان کو رخصت کیا۔

کلیم چغتائی
(کراچی)

زمیں غالب کی ہے اِس میں اُگا کیا؟

معالج نے کھلائے گل ہیں کیا کیا
علالت کیا، طبابت کیا، دوا کیا؟

کوئی ہو پاس میرے ہم پیالہ
اکیلے چائے پینے کا مزا کیا؟

لکھائی ان کی تھی بے حد شکستہ
کتابت کیا، طباعت کیا، چھپا کیا؟

گرانی یہ کبھی نہ ختم ہوگی
صدا دیتا ہے کوئی دل جلا کیا؟

میں یک طرفہ محبت کر رہا ہوں
اکیلا بھاڑ پھوڑے گا چنا کیا؟

فقیروں کو عطا کرتے ہیں گالی
انھی کا نام ہے جود و سخا کیا؟

یہ ساون کا نہیں موسم ہے پھر بھی
نظر ہر سمت آتا ہے ہرا کیا؟

پڑوسی آ رہے ہیں خیر باشد
ہمارے گھر میں آخر ہے پکا کیا؟

مجھے مشکل میں ڈالے جا رہا ہے
سمجھتا ہے مجھے "مشکل کشا" کیا؟

رقم کے جیب میں آتے ہی فوراً
بدل جاتے ہیں یہ ارض و سما کیا؟

یہ طرفہ ہے یہاں پستے ہیں گھن بھی
ہے گھن کے ساتھ گیہوں بھی پسا کیا؟

زبر ہے، زیر ہے یا پیش ہے یہ
کُھلا ہے یا کِھلا ہے یہ، کھُلا کیا

ڈاکٹر حبیب ضیا (حیدرآباد)

ہم نے فلیٹ خریدا

برسوں کھلے اور ہوادار آنگن میں سانس لینے کے بعد ہم نے فلیٹ خریدنے کی ٹھانی۔ فلیٹ کا تصور آتے ہی گلاب، چنبیلی، موتیا کی خوشبو اور کھل دینے والے فرحت سے محرومی کے اندیشے ستانے لگے۔ لیکن فلیٹ بہرحال لینا ہی ٹھیرا۔ دوست احباب اور رشتہ داروں نے دل کھول کر مخالفت کی۔ زمین اپنی نہ آسمان اپنا والا جملہ متعدد بار سننے کو ملا۔ ہم جو فلیٹ لینے والے تھے ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ مالک سے دورانِ گفتگو ہم نے اپنی پریشانی کا اظہار کر ہی دیا۔ ہم نے کہا سبھی مخالفت کر رہے ہیں اور یہ کہہ کر ڈرا رہے ہیں کہ فلیٹ میں اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ انھوں نے ہمیں تسلی دی، پانی پیش کیا۔ کہنے لگیں کون کہتا ہے کہ زمین آسمان اپنے نہیں ہوتے۔ دونوں اپنے ہیں۔ اپنانے کا سلیقہ چاہیے۔ ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ جواب ملا۔ میں فلیٹ سے کچرا زمین پر پھینکا کرتی ہوں اور چھت پر جا کر بڑیاں سکھاتی ہوں۔ زمین آسمان میرے ہوئے کہ نہیں؟" اس سے ڈھارس سی بندھی۔ ہم فلیٹ میں آ گئے۔

اکثر فلیٹ کے سامنے گراؤنڈ نہیں ہوتا جہاں بچے کھیل سکیں تو جہاں جتنی جگہ ملی، پلے گراؤنڈ بن گیا۔ ہمیں یہاں آئے چند ماہ ہوئے تھے۔ ملازمت اور گھر کے کام کاج کے بعد دل و دماغ کو سکون دینے کا جو ہی منصوبہ بناتے، بچوں کی اچھل کود اور

کرکٹ کے ماہر کھلاڑیوں کے شور سے کافی تیز ہوتا۔
دروازے پر بڑے چھوٹے ہر قسم کے گولے آکر گرتے۔ چند دن ہم انجان رہے۔ یہ سوچ کر کہ کالجوں میں جس طرح نئے سال پر ریگنگ RAGGING کی جاتی ہے اسی طرح نئے پڑوسی کو ستایا جاتا ہوگا۔ جب ہماری غلط فہمی دور ہو گئی تو ہم نے انتہائی انکساری سے کہا: "بال کی آواز بہت تکلیف دہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض گھروں میں ضعیف، بیمار، دل کے مریض بھی ہوں۔"
پڑوسن نے بے اعتنائی سے کہا: "دوسروں سے آپ کو کیا لینا دینا۔ یہ دنیا آنی جانی ہے۔ بال کی آواز سے مرنا ہے تو وہ اسی طرح سے مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی موت کا کوئی نہ کوئی سبب رکھا ہے۔ آپ اپنی خیر منائیے۔"
یہاں رہنے والے کافی مہذب اور شائستہ ہیں۔ ایک دفعہ لفٹ میں ایک صاحب بچے کو لیے کھڑے تھے۔ انھوں نے لفٹ روک کر دروازہ کھولا۔ ہم نے کہا: "ہمیں نیچے جانا ہے۔" وہ بولے: "کوئی بات نہیں، تشریف لائیے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑ آؤں گا۔ دراصل میں اپنے نواسے کو لفٹ میں بہلا رہا ہوں۔ پہلے بہت دیر تک روتا تھا۔ اب لفٹ میں سنبھل جاتا ہے۔ بس پانچ دس منٹ میں سو جائے گا۔"
پانچویں منزل پر ہم نے چار گھروں کے درمیانی حصے میں NO SMOKING کی تختیاں لگی دیکھیں۔ غالباً کسی نے عاجز آکر یہ اقدام کیا تھا۔ فرش پر نظر پڑی تو جگہ جگہ ادھ جلے سگریٹ پائے گئے۔ اسی اثنا میں ایک گھر کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ ایک گول گول گلتی بچہ برآمد ہوا۔ اس سے ہم نے پوچھا: "بیٹے! یہاں سگریٹ کون ڈالتا ہے؟" بچے نے خوشی خوشی کہا "جی۔ سگریٹ میرے انکل پیتے ہیں۔ شکاگو سے آئے ہیں۔" ہم نے کہا "ماشاء اللہ بڑے مہذب ہیں۔ شکاگو سے آئے ہیں۔" بچے کی خوشی کی انتہا نہ رہی "پلاٹ۔ پرسوں ٹماورس میں جو فائر انجن آیا تھا نا—— وہ انکل کے سگریٹ ہی کی وجہ سے آیا تھا۔"
ایک دن ہم... گھر سے نکل کر نیچے اترے ہی تھے کہ بالکنی سے آم کے چھلکے سر پر آگرے۔ ہم نے اوپر آکر مکین کو نرم لہجے میں مشورہ دیا کہ کچرا بالکنی سے نیچے پھینکنے کی بجائے پلاسٹک میں باندھ کر دروازے کے باہر رکھ دیا کریں۔ جمعدارنی تو آتی رہتی ہے۔" انھوں نے اکھڑے لہجے میں جواب دیا "یہ جالیں مجھے مت سمجھائیے۔ دس سال سے یہاں رہتی ہوں۔ آپ ابھی نئی نئی

آئی ہیں۔ کچرا پلاسٹک میں بند کرنا مجھے بھی آتا ہے۔ میں پیاز کے چھلکے بند تھیلی میں رکھتی ہوں میٹھا پھلکے اوپر سے پھینکتی ہوں۔ آخر میرا معیارِ زندگی بھی تو کچھ معنی رکھتا ہے۔"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فلیٹ نمبر ۱۶ میں ساس ، بہو پر طنز کے تیر برساتی ہے تو ہم سمجھتی ہیں کہ ۱۱۹ کی بہو نشانہ بنی۔ ۲۰۴ میں کوئی شریف آدمی اپنی بیوی کو ننگی گالیاں دیتا ہے تو شبہ کسی غیر شائستہ انسان کی طرف جاتا ہے۔

یہاں سب ایک خاندان کی طرح مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دن ایک امریکہ ریٹرن خاتون ہمارے پاس آئیں۔ پوترے کی شرارت کا ذکر کرتے ہوئے فخریہ کہنے لگیں "پتہ ہے آپ کو؟ ذرا سی بات نہ سننے پر آج میرے سات سالہ پوترے نے مجھ سے توبہ کروائی۔" ہم نے انھیں مبارک باد دی۔ بے فکر رہیے۔ آغاز اچھا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ چند ماہ بعد آپ اٹھک بیٹھک کریں گی۔"

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ناشکرے لوگوں کو عبرت دلانے کی خاطر بڑے بڑے ٹاوروں کے پہلو میں غریبوں کی ایک بستی ہوتی ہے۔ جہاں ٹی وی کے اینٹینا نصب ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایک ایسی ہی بستی ہے۔ دن بھر کی چہل پہل ختم ہونے کے بعد جب سارے ماحول پر سکوت سا چھا جاتا ہے، یہ بستی والے اپنا اصلی روپ دھار لیتے ہیں ـــــ رات کا کھانا ہضم کرنے کے لیے روزانہ ایک لڑائی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح گالیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ زنانی اور مردانی ہر قسم ہر معیار کی گالیاں سادگی صفائی اور روانی سے دی جاتی ہیں۔ بعض زنانی گالیاں اتنی جاندار اور خطرناک ہوتی ہیں کہ انھیں سن کر وہ حضرات بھی گھروں میں چھپ جاتے ہیں جو اپنی بیوں کو جھگڑا کرنے سے منع کرنے کے لیے باہر آئے تھے تماشائے اہلِ ستم دیکھنے والے بھی گھر کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ جن کی مادری زبان تلگو ہے وہ بھی نہ صرف لگاتار ایک ایک گھنٹہ اردو میں لڑتے ہیں بلکہ شستگی سے اردو ہی میں گالیاں دیتے ہیں۔ قومی یکجہتی کی اس سے عمدہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے بس ـــ ویسے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ ہم اردو والوں کو مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جب تک یہ بستیاں بسی رہیں گی کوئی سالا ـــ معاف کرنا، کسی کی بیوی کا بھائی اردو کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ غزل کی خاطر اردو سیکھنے والوں کی طرح گالیوں کے چسکے میں اب کئی حضرات تعلیم بالغان کے مراکز پر دیکھے جا رہے ہیں۔

حالت نشہ میں انسان سچ بات کہہ جاتا ہے۔ آپ نے اکثر پکچرس میں دیکھا ہوگا کہ کسی سے سچ اگلوانا ہو تو ویلن کسی طوائف کے ہاتھوں اسے شراب پلا دیتا ہے۔ ایک رکشہ والا ہے جو رات دیر گئے حالتِ نشہ میں بستی میں واپس آتا ہے۔ غالباً ہر روز وہ ایک غلط دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جب دروازہ نہیں کھلتا تو وہ ماں بہن کی گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے۔ یوں بھی بعض معزز حضرات جب گالی دیتے ہیں تو ماں بہن کی صراحت نہیں ہوتی۔ یقیناً وہ اپنوں ہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ خونی رشتہ داروں کو بغیر کپڑے پہنائے گالی دینے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

چند ماہ قبل ہم نے ایک فلیٹ کی بالکنی میں ایک طالب علم کو پڑھنے میں منہمک دیکھا۔ رات دیر گئے تک اس کی مصروفیت اور حصولِ علم کی لگن دیکھ کر ہم نے دل میں سوچا کاش سارے بچے اسی انہماک سے پڑھتے۔ کاغذ قلم کے ساتھ میز پر ٹیپ ریکارڈر دیکھ کر جستجو ہوئی کہ یہ متضاد چیزیں ایک جا کیسے ہوئیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ ایم فل کے لیے مقالہ لکھ رہا ہے۔ مقالے کا عنوان ہے "اردو زبان میں گالیوں کا آغاز وارتقا اور سماج میں ان کی افادیت"۔ اس طالب علم کا دستور تھا کہ بستی میں جب بھی لڑائی شروع ہوتی وہ فوراً ٹیپ کر لیتا۔ معلوم ہوا کہ دو چار دن کا وقفہ ہو جاتا اور اس کا ریسرچ پیپر ا جکٹ متاثر ہوتا تو وہ مقالے کے نگران کے مشورے پر دو ایک چھوٹے پتھر بالکنی سے مکانوں پر پھینک دیتا۔ ایک پتھر کی برکت سے اس کا پراجکٹ کافی آگے چل نکلتا

گذشتہ ہفتے ایک صاحبہ ہم سے ملنے آئیں۔ ہمارے لیے اجنبی تھیں۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا "فلیٹس میں بچے اودھم تو نہیں مچاتے؟" ہم نے کہا "ارے آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ یہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ بچے بھی رہتے ہیں۔ فیملی پلاننگ کا نعرہ "ہم دو" پر ہی دم توڑتا نظر آتا ہے۔ ان کے چند اور سوالات تھے ــــ "لفٹ میں زیادہ وقت لفٹ کے باہر تو نہیں گذارتے؟" ــــ "بچے دیوان خانے کا کام باہر ٹھیری ہوئی اسکوٹر سے تو نہیں لیتے؟" ــــ "لوگ گھر کا کچرا باہر تو نہیں پھینکتے؟"

نفی میں جواب سن کر وہ مسکرائیں۔ بولیں ــ "میں اسی ٹاور میں رہتی ہوں۔"

پڑوسنوں کا بھرم رکھنے کے لیے دو سال تک میں بھی یہی کہتی تھی۔"

ہم نے پوچھا —— "پھر اب؟" —— "اب —— میں نے فلیٹس میں رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔" "کیسا ڈھنگ؟" وہ بولیں —— "اب میں بھی اپنے بچوں کو دوپہر میں باہر نکال کر آرام سے سوتی ہوں —— گھر کا کچرا پڑوسن کے گھر کی طرف ڈھکیل دیتی ہوں۔ لفٹ مین کی لاپرواہی اور غیر حاضری سے جب لفٹ بار بار خراب ہوتی ہے تو ہنستی کانپتی چھٹی منزل تک سیڑھیوں سے چلی جاتی ہوں۔ پھر بھی میں خوش ہوں اس لیے کہ یہ میرا اپنا گھر ہے اپنا فلیٹ ہے۔"



وہ اپنی زندگی میں اتنا
مشہور نہیں تھا



وہ اپنے اناڑی کے مشورے کے بغیر آگے
نہیں بڑھتا

غزل — مرزا کھونچ (بیتا)

سسرال جانا ٹھیک نہیں بار بار کا
خطرہ ہے اس میں تھوڑا بہت خلفشار کا

عاشق کا بال بال سیہ فام بک گیا
لیکن لگا نہ مول دلِ داغ دار کا

بڈھے کیا جو پاس تو والد نے یہ کہا
لختِ جگر ہے میرا اکاون ہزار کا

ہر موڑ پر رقیب مسلط ہیں آج کل
کیسے کٹے گا وقت ترے انتظار کا

تھانے گیا ہوا تھا کھانے کو ساتھ
چلتا بنا اٹھا کے قلم تھانے دار کا

چھینی گئی ہے جب سے اداسے کے باگ ڈور
گردش میں ہے ستارا مرے کاروبار کا

آیا نکل چمن پہ ہے الو کی ڈیوٹی
یارو خدا بھلا کرے فصلِ بہار کا

غزل — محمود نشتر

وہ نہ آفتاب سے کم ہے
اور نہ رنگت گلاب سے کم ہے

عشق کیا ہے میں کیسے سمجھاؤں
عمر ان کی نصاب سے کم ہے

بعد شاپنگ کے یوں کہا اس نے
آج کل کے جناب سے کم ہے

ہو جو لیڈر کی اپنے نس بندی
بولیے کیا ثواب سے کم ہے

دی ہے زردولا نے تقویت دل کو
ناتوانی شراب سے کم ہے

بعد مرنے کا ذکر کیوں واعظ
کیا گرانی عذاب سے کم ہے

چار ہی عقد کیوں لکھے مالک
سکّی یہ میرے حساب سے کم ہے

وقت اچھا تھا سیر کا نشتر
اب تو ہستی حباب سے کم ہے

غزل — محسن الہ آبادی

لعنت اس فکر پہ جو شعر بھی تھوڑے نکلے
کہیں خچر، کہیں گیدڑ، کہیں گھوڑے نکلے

شعر چننے کو ہی لیٹا تھا کہ بس پل نہ کٹا
رات بستر سے مرے لال کوڑے نکلے

نہ جواب آیا کسی خط کا اگرچہ ہم نے
خط لفافے میں کئی ڈال کے موٹے نکلے

قاضیٔ شہر کے فتوے سے فضا ناخوش ہے
لوگ ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے کوڑے نکلے

بن میخانہ میں جب کوئی نہ صورت نکلی
ساغرِ جم کو بھی جھنجھلا کے وہ توڑے نکلے

میرے احساس مری فکر کی چوپائی پر
شام ڈھلتے ہی ٹہلتے ہوئے جوڑے نکلے

کشتِ ویراں کی سینچائی کو جو نکلے تھے کبھی
وائے قسمت کبھی سیل، کبھی پھوڑے نکلے

آؤ بریانی کھائیں

فیروز حیدر

معاف کیجیے یہ ہماری طرف سے کسی دعوتِ طعام کا اعلان نہیں اور نہ ہی یہ بریانی کے پکوان کی ترکیبوں پر مشتمل کوئی کتاب ہے بلکہ یہ اس کتاب کا نام ہے جو ہمارے دوست مرزا کی پچیس سالہ دعوتی زندگی سے ہدایات اور حادثات کے علاوہ ان دعوتوں میں کیے گئے کامیاب تجربات کا نچوڑ ہے۔

اپنی کتاب کے دیباچے میں مرزا فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ایسے معصوم بلکہ مظلوم دعوتیوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی جو اپنی کم علمی اور ناتجربہ کاری کے باعث ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور آج کل کی دعوتوں میں گھنٹوں کھانے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں اور جب کبھی کھانے کی میز پر بیٹھنے کا موقع ملتا بھی ہے تو میز پر موجود تجربہ کار اور عادی مدعوئین و غیر مدعوئین کے سامنے نروس ہو کر احساسِ کم مائیگی بلکہ کم کھائیگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عموماً یہ لوگ شرافت اور تکلّف کے ایک خول میں بند رہتے ہیں۔ اور صرف دعوت کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ لیکن اکثر صرف دھکے کھا کر اپنے خول میں واپس لوٹ جاتے ہیں۔ یہی معصوم مدعوئین برخلاف عادت اکثر کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونا چاہتے ہیں اور جب ہاتھ دھو کر پلٹتے ہیں تو کفِ افسوس مل کر ہاتھ کو پھر سے خشک کر لیتے ہیں۔

یہ لوگ کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونے کے لیے ویسے ہی واشنگ اسٹینڈ پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو خود کبھی نہیں دھویا جاتا۔ پانی جس کی ٹونٹیوں سے گر کر نیچے لگے سنک کے ٹیوب سے زیادہ بہتا ہے۔

شاید یہ لوگ ہاتھوں کی Dry cleaning سے ناواقف ہوتے ہیں جس میں ایسے کاغذ کا استعمال

کیا جاتا ہے جس کی ساخت جاذب نہ ہوتی ہے۔ جو ہر قسم کی رطوبت اور کثافت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اسے کاغذ ٹیشو [illegible] یا Tissue paper بھی کہتے ہیں۔ مغربی ممالک میں" اس کاغذ کا استعمال بالکل ناگزیر ہے کا فرش ہر مقام اور ہر وقت پر کیا جاتا ہے۔ ان ممالک میں ہاتھ صاف کرنے کے علاوہ زندگی کی بہت ساری ضروریات ضروریہ و غیر ضروریہ کے لیے یہ کاغذ بہت ضروری ہے۔

ڈرائی کلیننگ کے ہندوستانی حربہ میں ہاتھ صاف کرنے کے لیے کاغذ کی بھی ضرورت نہیں بلکہ میزبان کی نظر بچا کر شامیانے کی دیواروں اور پردوں سے باری باری ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ اکثر شامیانے کی دیواریں بریانی، سالن اور میٹھے کی ملی جلی خوشبو سے مہکتے رہتے ہیں اور جب یہی شامیانے کسی بھوک ہڑتالی کیمپ میں استعمال ہوتے ہیں تو بھوک ہڑتالی کے لیے بڑے صبر آزما ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا بالعموم دعوت پسند اور بالخصوص بریانی پرست واقع ہوئے ہیں۔ دعوت شناسی کا یہ عالم کہ مستند قیافہ شناس بھی ان کے سامنے شرمندہ ہو جائیں۔ دعوت نامے کے کاغذات اور طباعت کے معیار سے دعوت کے مینو (menu) کی پیش قیاسی کرتے جو اکثر موسم کی پیش قیاسی .... سے زیادہ صحیح ثابت ہوتے۔

مرزا کبھی چائے کی دعوت کو چائے کا وقفہ کہتے اور حتی الامکان پرہیز کرتے۔

کوئی مدعو کرنے شخصی طور پر ان سے رجوع ہوتا تو اس سے صاف صاف کہہ دیتے پہلے مجھے اس بات کی طمانیت دی جائے کہ خلافِ مرضی مجھے حلیم نہیں کھلائی جائے گی۔"

مرزا کا اندازِ گفتگو ہمیشہ عاجزانہ رہتا۔ کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے۔ جب کوئی نامور شادی کی دعوت نامہ لے کر آتا تو بہت عاجزی سے کہتے "میں بہت چھوٹا آدمی ہوں مجھے چھوٹا کارڈ ضرور دیجیے۔" چھوٹا کارڈ یہ اصطلاح کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

اور دعوت نامہ حاصل ہونے پر سلیقہ سے چھوٹا کارڈ الگ کر لیتے ہیں اور اس کی تفصیلات کو خود ساختہ خود نوشتہ جنتری یعنی دعوتوں کے کلینڈر میں دعوتِ حقیقی کے کالم میں لکھ لیتے۔

بقول مرزا صرف چھوٹے کارڈ کی دعوت کو ہی دعوتِ حقیقی کہنا چاہیے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دعوت کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور سے بریانی۔

پھر اسی چھوٹے کارڈ کی حد تین زیراکس کاپیاں کروا کے گھر کے مختلف حصوں میں نمایاں طور پر چسپاں کرتے تاکہ بھول چوک نہ ہو جائے۔

بات اس پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ چھوٹے کارڈ کو وزیٹنگ کارڈ کی طرح سینے سے لگائے پھرتے اور ہر دعوت میں پابندیٔ وقت شریک ہوتے اور فخریہ کہتے کہ ایک ریکارڈ ہے آج تک کوئی دعوت قضا نہیں ہوئی۔

اپنی کتاب [illegible] کے پہلے باب "دعوت کی تیاری" میں مرزا فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ دعوت کے حال سے پہلے تیاری میں [illegible] کر دیتے ہیں اور پھر کھانا بھول جاتے ہیں۔ یہ ان کی بنیادی غلطی ہے۔ انہیں

...... تیاری ناشتہ سے شروع کرنی چاہیے ۔ یاد رکھیے کہ دعوت کی تیاری کا یہ باب خالص مردانہ ہے کیونکہ خواتین کے لیے دعوت کی تیاری کا مفہوم جدا اور وقت طلب ہے۔ اس میں کھانے سے زیادہ بناؤ سنگھار پر زور ہوتا ہے۔ اکثر وہ اسی تیاری کا شکار ہو کر دعوت میں تاخیر سے پہنچتی ہیں۔ انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "کھانے سے جلد جانا بہتر ہے۔"

عموماً مرد کھانے کی دعوت میں انتخاب لباس کو اہمیت نہیں دیتے جس کا تقاضہ ہے۔ شادی شدہ حضرات 3 Piece Suit کو ولیمہ کا یونیفارم سمجھتے ہیں اور اکثر ولیمہ کی دعوت میں اپنے ولیمہ کا ہی سوٹ پہنتے ہیں۔ چاہے ان کا ولیمہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے کوٹ کے دونوں Shoulders میں کھینچا تانی دیکھ کر ان کے ولیمہ کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ویسے بھی "کوٹ" آج کل کی دعوتوں کے لیے قطعی مناسب نہیں کیونکہ کوٹ کی تنگ آستین کی وجہ سے ہاتھوں کی حرکت اور دسترس دونوں محدود رہتے ہیں جیسے شطرنج میں گھوڑے کی چال ایک دو اور ڈھائی گھر۔ مکمل فوائد اور صحیح نتائج کے لیے ڈھیلے ڈھالے لباس کا انتخاب کیجیے جس سے ہاتھ میز کے کونے کونے تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں کھیل کود اور ورزش کے لیے پہنا جانے والا لباس ٹریک سوٹ بہت مناسب ہے۔ جس کے پہننے کے بعد بھی جسم کی طبعی لچک باقی و برقرار رہتی ہے۔ اس لباس میں آپ اپنی کمر کو مرکز مان کر ہر جانب 45 درجہ کا زاویہ بہ آسانی بنا سکتے ہیں۔ جس سے تمام بکروں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

دوسرے باب "موقع واردات کا انتخاب" میں فرماتے ہیں کہ اکثر مدعوین۔ صرف اسی لیے پریشان ہو جاتے ہیں کہ وہ کھانے کی میز کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قبل از وقت آکر کھانے کے میدان کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ شادی خانے میں داخل ہوتے ہی میزوں کی تعداد اور ترتیب پر طائرانہ نہیں بلکہ ناقدانہ نظر ڈالیے۔ یہ دیکھیے کہ "سروس سنٹر" کس جانب ہے جہاں سے بکرے نکلتے ہیں۔ پھر اس مقام سے قریب ترین میز کا انتخاب دل ہی دل میں کر لیجیے۔ اور خبردار اپنا مقصد بر آنے تک اس میز کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجیے۔ ثابت قدمی سے وہیں منڈلاتے رہیے۔ کھسیانے کی ضرورت نہیں آہستہ آہستہ بہت سارے مدعوین اسی طرح منڈلاتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس انتظار گاہ میں کسی دعوت شناسا سے ملاقات ہو جائے تو لمبی گفتگو سے پرہیز کیجیے۔ اپنی بات چیت کو objective type کی طرح ہاں یا نہیں پر مشتمل رکھیے۔ اس میں قطع کلامی کی گستاخی نہیں ہوتی۔ ذہن کو منتشر ہونے سے روکیے اور حواس پر قابو رکھیے۔ چھٹی حس اگر کام کر رہی ہو تو اس سے میزبانوں اور بکروں کے اشاروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ان زرین اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے آپ کے قدم میزبان کا اشارہ ختم ہوتے ہی میزوں کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ اس طرح آپ سب کے آگے اور باقی سب آپ کے پیچھے گویا آپ کو "قائد دعوت" کا اعزاز بھی مل جاتا ہے۔ ویسے آج کل قیادت کے لیے اتنی صلاحیت کافی ہے۔

اور اگر آپ اپنے کم سن بچوں کے ساتھ ہوں تو ان کی عملی تربیت کیجیے۔ اس معرکہ میں انھیں اپنی لڑائی آپ

وقت دیجیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ پیچھے لانگ جمپ اور ہائی جمپ کا استعمال کر کے آپ سے پہلے میز تک پہنچ چکے ہوں گے۔

ان تمام ترکیبوں سے آپ پہلے راؤنڈ یا پہلے دستر کے حق دار بن جاتے ہیں اور پہلے دستر پر جگہ پانا خوش نصیبی کی علامت ہے۔ آج کل صرف پہلے راؤنڈ کے میز پوش سفید رہتے ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں کے بے داغ لباس کی طرح اور ساتھ میں پلیٹیں اور چمچے بھی چمکتے رہتے ہیں۔

باب سوم "کھانے کے آداب" میں مرزا یوں فرماتے ہیں کہ لقمی کباب دراصل لوازمات نہیں بلکہ "ڈیکوریشن" کی اشیا ہیں اور ظاہر ہے ڈیکوریشن کی اشیا کھانے کے لیے نہیں ہوتیں۔

کرسی پر بیٹھتے ہی لقمی کی پلیٹ اپنے ہاتھ میں لے لیجیے ــ اور ادب سے دوسروں کی تواضع کیجیے۔ لقمی سے اپنی پلیٹ اور نیت دونوں صاف رکھیے۔ اور اتنا ذہن نشین رکھیے کہ ایک ہتھیلی برابر لقمی بریانی کے دس لقموں کا کام تمام کر دیتی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب مرغ کی پلیٹ میز پر لائی جائے گی تو دوسروں کی طرح آپ کے ہاتھ لقمی سے نہیں بندھے ہوں گے۔ اب آپ مرغ کے ذریعہ اپنی خاطر آپ کر سکتے ہیں۔

اس جذبۂ ایثار پر لقمی کی بدولت آپ کھانے کی دوڑ میں دوسرے سے ایک قدم آگے نکل جائیں گے اور اگر کھانے کی مقدار اور رفتار میں صحیح تال میل برقرار رہے تو یقیناً کامیابی آپ کا منہ چومے گی اور آپ کا انعام ہوگا، "خوبانی کا میٹھا"۔ ظاہر ہے انعام ہر ایک کو تو نہیں مل سکتا۔

کھانے کی میز پر دوستی بڑھانے کی کوشش ہرگز نہ کریں کہ یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں۔ ہر شخص دستِ خود دہنِ خود کا جیتا جاگتا نمونہ بنا رہتا ہے۔ ہاں اگر امداد باہمی کے لیے پہلے ہی سے انتظام کر لیں تو کھانے کی ابتدا سے انتہا تک میز پر آپ کی برتری اور بالادستی قائم رہ سکتی ہے۔ ایک اور ضروری بات یاد رکھیے کہ کھانے کے میدان میں بڑھتے بچوں اور گھٹتے بزرگوں کو کمزور مت جانیے کہ اکثر یہ جوانوں کو پچھاڑ دیتے ہیں۔

کبھی ستاروں کی کمزوری کے باعث میز پر آپ کا مقابلہ سخت بھی ہو سکتا ہے۔ جو بریانی کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آپ کو چنے چبانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا ہو تو آپ مقابل کی طرف متوجہ ہو کر باآوازِ بلند کہیے۔ "کل آپ شادی میں نظر نہیں آئے"۔ یہ جملہ معترضہ صرف چوتھی، ولیمہ کی دعوت میں استعمال کے لیے ہے۔ اس جملے کے ادا ہوتے ہی سب چونک جائیں گے اور ایک لمحہ کے لیے ان کا دھیان بٹ جائے گا۔

اس ایک لمحہ کا پورا پورا فائدہ اٹھائیے۔

اور اگر خدانخواستہ یہ وار بھی کارگر نہ ہو تو دوسرا آزمائیے۔ اب آپ امریکی رسالوں اور ڈاکٹروں کے فرضی حوالے سے مرغن غذاؤں کے نقصانات اور امراض پیچیدہ کی تکالیف کا ذکر پر اثر انداز میں کیجیے۔ کھانے کی میز پر بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک جیسے الفاظ کا اثر سیدھا کھانے کی رفتار پر ہوتا ہے مگر خیال رہے کہ ان باتوں سے آپ کی طبیعت متاثر نہ ہو۔ ویسے عالم بے عمل بنے رہنا آج کل کچھ مشکل نہیں۔

پانچویں باب "خوش طعامی" میں مرزا فرماتے ہیں کہ خوش طعامی کی راہ میں اور بھی دو مرحلے ہیں جن سے گزرے بغیر بریانی کی منزل نہیں مل سکتی۔ پہلا حلیم اور دوسرا ویڈیو گرافر۔

حلیم اپنی مرضی سے اور حلیم کی نیت سے ہی کھائی جائے اور مقدار میں دوسرے کی مرضی شامل حلیم نہ ہو تو بہت ذائقہ دار ہوتی ہے۔ حالاں کہ ہوٹلوں کی اشتہاری حلیم دعوتی حلیم سے رنگ اور ذائقہ میں جدا اور لذیذ ہوتی ہے۔ اس لذت کا دارومدار اجزائے ترکیبی پر نہیں بلکہ کیفیتِ دیگ پر ہوتا ہے۔ جو مہینہ بھر چبوترہ میں مدفون رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ مدفون کا غسل ممکن نہیں۔

اب رہے ویڈیو گرافر۔ ان سے تو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے غنیمت جانیے ان لمحوں کو جب یہ کیمرہ لیے دوسری میز پر مصروف ہوں اور جوں ہی کیمرہ کا رخ آپ کی جانب پلٹے فوراً منہ کا مشین بند کر دیجیے۔ بائیں ہاتھ سے پلیٹ کو یوں ڈھانکے رہیے کہ پلیٹ میں موجود گوشت اور ہڈیوں کی مقدار کیمرہ کی آنکھ سے نظر نہ آئے۔ ہوشیار کہ یہ کیمرہ والے زاویہ بدل بدل کر فلم بناتے ہیں۔ غفلت برتنے پر یہ اندیشہ ہے کہ مستقبل کی دعوتوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ یعنی آپ کا نام معزز مدعوئین کی فہرست سے خارج ہو جائے گا۔ یہ فلمیں اندرون و بیرون خاندان بہت گشت کرتی ہیں۔ اور اکثر صدورِ خاندان اکثر پرغیر خواتین کے چہروں کا اور مدعوئین کے پلیٹوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد معززین کی فہرست کو مختصر کر دیتے ہیں۔

کتاب کے آخری باب اردو اور بریانی میں مرزا یوں لکھتے ہیں کہ انگلش میڈیم کے مدعوئین کی اکثریت صرف ڈنر کو ہی بریانی کی دعوت سمجھتی ہے۔ انھیں یہ بتانا ضروری ہے کہ عشائیہ، تناولِ طعام یا ہم طعامی جیسے الفاظ بھی بریانی کی دعوت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ عموماً ایسے دعوت ناموں میں استعمال ہوتے ہیں جب تقریبِ نکاح میں بریانی کا انتظام ہو مگر یاد رکھو کہ دعوتِ تقریبِ نکاح اور دعوتِ نکاح کے معنی بالکل الگ ہیں۔ "ہم طعامی" جہاں استعمال ہوتا ہے اس میں داعی آپ کے ہم طعامی کا متمنی رہتا ہے۔ مگر آپ داعی کے ساتھ ہم طعامی کے متمنی ہرگز نہ رہیے کیوں کہ اکثر ان دعوتوں میں اژدحام کے باعث داعی کے ساتھ ہم طعامی تو کجا ہم کلامی کا بھی شرف حاصل نہیں ہوتا۔

مرزا کی کتاب کیا تھی ہدایت نامہ تھا۔ مدعوئین کے لیے جو اتنی مقبول ہوئیں کہ اردو کی کتاب بھی لوگ پسند کی جا سکتی ہے، اس کا یقین کرنا ممکن نہ تھا۔ مرزا کی خوب بن آئی دھڑا دھڑ دعوتیں ملنا بند ہو گئیں۔ مگر جو اس سے مستفید ہوتا وہ بطورِ شکرانہ ان کو کسی نہ کسی دعوت میں ضرور مدعو کرتا۔

ایک دفعہ ایک جہلم کی دعوت میں بریانی نوش فرمانے کے بعد انکو احساس ہوا یہ معمولی بریانی نہیں بلکہ غیر معمولی بریانی ہے۔ اس روز اس قدر خوش ہوئے کہ ہتکر کی بلائیں لے لیں۔ اور باورچی کی دست بوسی کے بعد اس سے عہد و پیمان کروائے کہ ان کی جہلم کی بریانی بھی وہی پکائے گا۔

اس واقعے کے کئی روز بعد سے مرزا کسی دعوت میں نظر نہیں آئے تو ہم بے چین ہو گئے اور مرزا کی خیریت لینے جب ان کے گھر پہنچے تو مرزا کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چہرے پر سوجن، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔ بال الجھے ہوئے۔ ایسی حالت میں مرزا کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں پریشان دیکھ کر مرزا نے کہا "کیا بتاؤں وہ باورچی۔ وہی جہلم کی بریانی والا۔ کم بخت باورچی نہیں ملک الموت بن گیا ہے۔ روز خواب میں نظر آتا ہے۔ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے صرف ایک ہی سوال کرتا ہے۔ بریانی کب پکانا ہے۔ بریانی کب کھانا ہے۔ ●●

غزل

ملنے لگا ادھار تو میں نے غزل لکھی
کھانے لگی انار تو میں نے غزل لکھی

کوڑی کا ذکر میری غزل میں نہ آ سکا
جب بڑھ گئی بیگار تو میں نے غزل لکھی

دو تین مرتبہ کی کوئی اہمیت نہ تھی
وہ آئے بار بار تو میں نے غزل لکھی

دھتکارا جب حسینوں نے خاموش میں رہا
ملنے لگا فشار تو میں نے غزل لکھی

سب لوگ جانتے ہیں میں ایذا پسند ہوں
یاد آئی اس کی مار تو میں نے غزل لکھی

مدت سے اس حسین کا غم کھاتے ہی گئے
جس وقت چاند چار تو میں نے غزل لکھی

یہ کیفیاتِ دل نہ تھیں بیکاری کے دور میں
پینے لگا سگار تو میں نے غزل لکھی

کی دیکھی دار و پیش مجھے اس حسین نے
یاد آئے جب خمار تو میں نے غزل لکھی

آیا یقین فاقوں کی نوبت نہ آئے گی
خوش دیکھے کاشتکار تو میں نے غزل لکھی

میرا مزاج پوچھنے آیا وہ چارہ گر
اترا مرا بخار تو میں نے غزل لکھی

یہ سچ ہے عام دار کو گنتا نہیں ہوں میں
کہتا تھا خاصدار تو میں نے غزل لکھی

گیہوں کی روٹی معدہ پہ ہو جاتی تھی گراں
کھانے لگا جوار تو میں نے غزل لکھی

وہ میرے ساتھ ہو گئے جب فلم کے لیے
خالی گیا نہ وار تو میں نے غزل لکھی

فکرِ سخن کے واسطے لازم تھی دل پہ چوٹ
وہ ہو گیا فرار تو میں نے غزل لکھی

وہ جانِ آرزو مرے مرنے پہ سوگوار
آیا سرِ مزار تو میں نے غزل لکھی

جب آزمائے اپنی نگاہوں کے اس نے تیر
سینہ ہوا فگار تو میں نے غزل لکھی

خوش ہو کے جب کبھی مرے پیغامِ وصل پر
اس نے کیا وچار تو میں نے غزل لکھی

اردو ادب میں بھینس کا بھی اب مقام ہے
پیدا ہوئی بلکار تو میں نے غزل لکھی

تنہائی، بے کسی میں لکھا مرثیہ لقب
پاس آیا غمگسار تو میں نے غزل لکھی

عبدالحفیظ لقب عمران

یوسف یکتا

مانگتا پھر رہا ہے اب چندہ

بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیجے
آپ کا ہاتھ ہے بڑا گندا

تیز ہو جائے گی بصارت بھی
روز کھاتے رہو میاں انڈا

جن کے ہاتھوں میں پھول تھے کل تک
آج تھامے ہوئے ہیں وہ جھنڈا

کیا وظیفہ میں کھانے لگا یکتا
مانگتے پھر رہا ہے اب چندہ

عابد معز (ریاض)

قصّہ تیمارداری کا

شوہر
خوش نصیب
ہے کہ بیوی اس
کی خدمت کرتی ہے
کھانا تیار کرنا، چائے
بنانا، شرٹ میں بٹن لگانا،
پیر دابنا، کپڑے دھونا اور
استری کرنے سے لے کر تیمارداری
تک حسین خدمت کی ایک طویل فہرست
ہے...... اس ضمن میں برصغیر
کا شوہر کچھ زیادہ ہی خوش قسمت واقع ہوا
ہے۔ برصغیر میں بیوی، شوہر کی خدمت کو ایک
مقدس فریضہ اور اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہے بلکہ
بعض صورتوں میں یہ ایک ناقابلِ فرار مجبوری بھی ہے۔
دوسرے مقامات پر بیوی شوہر کی خدمت کو کیا سمجھتی ہے
اور آیا وہ بھی شوہر کی خدمت کرتی ہے یا صرف حکم چلاتی ہے؟
اس بات کا مجھے اور نہ میرے دوستوں کو کوئی تجربہ حاصل ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن دفتر میں میری ناک گدگدائی، مسلسل چار چھینکیں آئیں۔ ناک سے کچھ جل بہا اور پھر میرا ماتھا گرم ہوا۔ سر کا درد اور اعضا شکنی پریشان کرنے لگی تو میں چھٹی لے کر گھر پہنچا۔ بے وقت گھر پہنچنے پر بیوی نے استفسار کیا۔ "آپ اس وقت کیسے آگئے۔ دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

میں نے جواب دیا "بیگم دشمن تو مزے میں ہیں لیکن مجھے ہی نزلہ کی تحریک معلوم ہوتی ہے۔" پریشان ہوتی ہوئی بیوی نے میرے ماتھے کو چھوا "خدا خیر کرے۔ آپ کو اچھا خاصا بخار ہے" اور پھر سوالات کرنے لگیں۔ صبح بھلے چنگے دفتر گئے تھے۔ یہ بخار کب آیا۔ کیسے آیا۔ کیوں آیا۔ چائے تو نہیں پیا۔ کیا کھانسی ہے، کیا ناک بہہ رہا ہے؟ اجابت ٹھیک آئی تھی؟ کینٹین سے الم غلم تو نہیں کھا لیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا؟

میں نے بیوی کو سمجھایا "آپ پریشان نہ ہوں، معمولی بخار ہے جیسے آیا ہے ویسے ہی چلا جائے گا۔"

بیوی نے کہا: "پریشان تو خیر میں نہیں۔ بیماری انسان ہی کو آتی ہے۔ میرے خیال میں آپ ٹھنڈے پانی سے نہانا بند کر دیں۔ نہانے کے بعد دفتر جانے کی جلدی میں سر برابر نہیں پونچھتے لگتا ہے سردی جم گئی ہے اور یہ روز روز کا نہانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

میں بحث کے موقف میں نہ تھا "ٹھیک ہے۔ گھر میں اسپرین ہو تو دیجیے۔"

جواب ملا "دوائیں ڈاکٹر کے مشورے کے بعد ہی استعمال کیجیے گا۔ فی الحال دودھ میں ہلدی جوش دے کر پلاتی ہوں۔ ہلدی اور گرم دودھ سردی کا توڑ ہے۔ سونے سے قبل انڈا اور کالی مرچ بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔"

بیوی گرم دودھ ہلدی کا گلاس لے آئیں اور پینے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ عجیب سا بدمزہ سیال پینے کے لیے طبیعت مائل نہ تھی لیکن بیوی کے اصرار پر کہ یہ نسخہ ان کی پردادی اور دادی جان کا آزمودہ ہے، آنکھ اور ناک بند کر کے پینا پڑا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ منہ کا اپنا کوئی مزا نہ تھا۔ منہ میں بخار کا مزہ رچا بسا تھا۔ کوئی شے بھاتی نہ تھی۔ کچھ دیر بعد بیوی بادام کا حریرہ لے آئیں: "اٹھیے حریرہ پی لیجیے۔"

"ابھی دودھ پیا ہے۔ بھوک بھی نہیں ہے۔ مجھ سے حریرہ نہ پیا جائے گا۔" میں نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

بیوی سمجھانے لگیں "دودھ میں پانی زیادہ تھا۔ حریرے میں بھی پانی ہی ہے۔ سمجھیے پانی ہی پی رہے ہیں۔" اور پھر پیار سے بہلا پھسلا کر حریرہ کا گلاس میرے منہ لگا دیا۔ دو چار گھونٹ پیا میں نے منہ پھیر لیا۔ بیوی منہ میں غصے سے پیر پٹختی چلی گئیں۔ میں آنکھیں بند کیے ہاتھوں میں اپنے سر کو جو درد سے پھٹا جا رہا تھا، تھامے لیٹا رہا۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ بیوی گوشت کا شوربا لیے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔ "شوربا پی لیجیے تو ہم ڈاکٹر سے مشورہ کر آتے ہیں۔"

شوربا پینے سے انکار کیا تو بیوی نے کہا "بچوں کی سی ضد نہ کیجیے۔ خالی پیٹ بیماری سے مقابلہ کیسے ہو گا۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ معدہ اور جیب میں کچھ تو ہونا چاہیے۔ ضرورت اور بلا ضرورت ڈاکٹر سوئی بھی لگا دیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چکر آ جائے۔"

میں نے بیوی کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی "آپ بے فکر رہیے۔ مجھے کچھ نہ ہو گا۔ زندگی بھر تو کھاتا پیتا رہا ہوں۔ ایک دن نہ کھانے سے مجھے کچھ نہ ہو گا۔" لیکن تریا ہٹ کے آگے کچھ نہ چلی۔ شوربا کو حلق میں انڈیلنا پڑا۔

شوربا پلانے کے بعد ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بیوی نے میری پیکنگ شروع کی۔ بنیان، دو بنین، شرٹ، سویٹر، کوٹ اور پھر اوور کوٹ۔ پیروں میں دبیز موزے۔ ہاتھوں میں دستانے، چہرے پر بندر ٹوپی اور بندر ٹوپی پر مفلر۔ میری صرف دو آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

میں نے بیوی سے کہا "آکسیجن بھی دے دو۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔"

بیوی نے ڈانٹا "فضول باتیں نہ کیجیے۔ بدشگونی ہوتی ہے۔" میرا بازو پکڑ کر اٹھانے لگیں۔

چند گھنٹوں کے بخار نے مجھے اتنا کمزور بھی نہ کر دیا تھا کہ بیوی کے اٹھانے سے اٹھ جاتا۔ دو تین مرتبہ ندو لگانے
کے بعد بیوی نے تھک ہار کر کہا "میں بچوں کو بلاتی ہوں۔"

"ضرورت نہیں ہے" کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پیروں پر چلنے لگا۔ پھر بھی بیوی میرا — ہوا
بازو تھام کر چلنے میں مدد کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے شرارتاً اپنا بوجھ ان پر ڈالا اور — ہے۔ مجھے یہ
وہ لڑکھڑانے لگیں۔ لیکن مجھے نہ چھوڑا۔ گھبرا کر پوچھا "کیا چکر آ رہے ہیں؟" — خواہش ہے۔

میں نے جواب دیا "ہاں عرصہ بعد آپ اتنا جو قریب آئی ہیں۔" — نکلنے میں تکلیف
بیوی نے انتباہ دیا "بیماری میں بدپرہیزی ٹھیک نہیں ہوتی۔" — کھانسی ابھی شروع ہوئی
ہم دواخانے پہنچے۔ میں اطمینان سے آنکھیں بند کیے منتظر پڑا ہوا — ہوئی۔ بہت کمزور ہوگئے
میں طوف اپنی باری کا انتظار کرتا رہا۔ جبکہ میری بیوی پہلو بدل کر رہ جاتی — ہیں۔ بھوک نہیں ہے۔ کچھ کھا پا
سے کبھی ڈاکٹر کے کمرے میں جھانک آتیں تو کبھی نرس سے جلدی — نہیں رہے ہیں۔ دودھ تک پینے سے
کرنے کے لیے کہتیں۔ آخر میری باری آئی اور ڈاکٹر کا دیدار نصیب — انکار کرتے ہیں۔ آپ انھیں سمجھائیے
ہوا۔ فیملی ڈاکٹر نے مجھے نہ پہچانتے ہوئے بیوی سے سوال کیا — اگر غذا استعمال نہ کریں تو اور کمزور ہو جائیں گے
"کہیے مزاج کیسے ہیں۔ اس گٹھڑی میں کسے لائی ہیں؟" — بیوی سانس لینے کے لیے رکیں تو ڈاکٹر نے میری
بیوی ناراض ہو کر کہنے لگیں "گٹھڑی میں کیا — جانب دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں "تمھیں کچھ
مطلب۔ یہ میرے شوہر ہیں۔" — کہنا ہے۔" میں نے بھی آنکھوں سے کہا "میری تکالیف
میں اپنے خول سے باہر آنے لگا تو ڈاکٹر — کچھ زیادہ ہی بیان کر دی گئی ہیں۔ مجھے ان میں کوئی اضافہ
"معاف کیجیے" کہہ کر ہنسنے لگا۔ — نہیں کرنا ہے۔"
اس سے پہلے کہ میں اپنی شکایات — ڈاکٹر نے میرا طبی معائنہ مکمل کیا تو بیوی استفسار کرنے
سناتا بیوی ڈاکٹر سے کہنے لگیں — لگیں "کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔ کیا ملیریا ہے۔ جاڑا تو نہیں
"شام سے تیز بخار ہے۔ سر — ہوا۔ میرے خیال میں ملیریا نہیں ہوگا۔ کیا یہ میعادی بخار ہے۔"
درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ — ڈاکٹر نے جواب دیا "معمولی بخار ہے۔ سردی زکام کا بخار"
ہاتھ پیر بہت درد — بیوی نے مشورہ دیا "قارورہ اور خون کا معائنہ کروالیں۔"
کر رہے ہیں۔ — ڈاکٹر نے سمجھایا "آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ ایک دن میں یہ بالکل ٹھیک ہو
ناک سے — جائیں گے۔
پانی نل — بیوی نے سوال کیا۔ "غذا میں کیا دوں۔"
کی — "سب کچھ" ڈاکٹر نے حیرانگی سے جواب دیا۔
"چاول بھی"

"پیوند ...

تیمیہ بھی دیجیے؟"

"لیکن ... ." بیوی اپنا جملہ مکمل کرنے نہ پائی تھیں کہ ڈاکٹر نے کہا۔

"مت دیجیے۔ بد ہضمی ہوگی؟"

ڈاکٹر کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بیوی نے پھر سوال کیا: "خدانخواستہ اگر طبیعت بگڑ گئی تو کیا کریں؟"

"کسی وقت بھی مجھے یاد کیجیے گا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا اور دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔

پہلا ... ایک
نہ مانی - کالی
مرغی بھلا دیں اور
کالی مرغ سے میں کا
نظر لیے اتار سکا مجھے
نظروں میں ہسپتال کی آ رہی آثار

بیوی نے واپسی کے لیے میری ری پیکنگ کی اور مجھے سہارا دیتے ہوئے گھر لائیں۔ راستے میں میرے معدے میں ہلدی دودھ اور شوربے کے درمیان فساد شروع ہوا۔ مجھے سواری سے سیدھے باتھ روم جانا پڑا۔ آدھے گھنٹے کے دوران جھک کر تین اجابتیں آئیں۔ بیوی پریشان ہو اٹھیں۔ پڑوسن سے مشورہ کیا۔ دونوں نے مرض کی تشخیص کی کہ مجھے نظر لگی ہے۔ راستہ اور دفتر میں معلوم نہیں کیسی کیسی نظروں سے پالا پڑتا ہے۔ مجھے لگی نظر کو اتارنے کا فیصلہ کیا گیا میں انھیں سمجھاتا رہ گیا کہ مجھے نظر کیسے لگے گی۔ میری نظر تو ہر دم ادھر ادھر لگی رہتی

جاتی ہے ←

غذا کے نام پر ایک کٹورا دودھ میں بھیگا ہوا ڈبل روٹی کا گودا، دو بسکٹ اور ایک گلاس سیب کا عرق سامنے آیا۔ چاٹنے چاٹنے کی لت کے بعد "دودھ اچھا نہیں لگتا اور پھر روٹی کا گودا، بسکٹ اور عرق معلوم نہیں بیماری کے دوران کیوں انگریزی کھانے زبردستی کھلائے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ انگریز اپنے کھانے کھا کر بیمار نہیں پڑتے۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ سدا خون کی کمی اور سفید پڑنے کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔

میں نے پلیٹ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑا چاول، لہسن کی چٹنی اور بھنا ہوا گوشت دیجیے۔"

بیوی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بخار میں گوشت کھائیں گے۔ جگر خراب ہوگا۔"

"لیکن ڈاکٹر نے سب کھانے کی اجازت دی ہے۔"

کہنے لگیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں ہی کہہ دیتے ہیں۔ بھگتنا تو مریض کو پڑتا ہے۔ بخار کم ہونے دیجیے پھر آپ کو مرغ مسلّم، ادم کا گوشت، کڑاہی کا گوشت، آپ جو کہیں گے وہ بنا کر کھلاؤں گی۔"

میں خیالی پلاؤ تناول کرتے ہوئے بسکٹ اور روٹی کے گودے کو سیب کے عرق کے ساتھ حلق سے اتارا۔ کچھ لمحوں میں مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ طبیعت ناساز ہو تو نیند بھی برابر کہاں آتی ہے۔ دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ سر پر ٹھنڈے پانی میں تر تولیہ رکھا تھا۔ لحاف ایک

تھکی تھی
کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ چھوٹا بھائی غور سے تھرما میٹر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچے اور دوسرے رشتہ دار
چاپ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ چہروں کے دروازے سے جھانکتے بھی نظر آئے۔ میں نے شاکی سے
پوچھا کیا بات ہے؟

جواب ملا "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بخار کچھ بڑھ گیا تھا۔ اب کم ہے۔ آپ آرام رونے
کیجیے۔" ڈاکٹر نے کچھ ہدایتیں دیں اور اپنا بیگ سنبھالے باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر کے پیچھے ایک لگیں۔
کے بعد ایک سبھی باہر جانے لگے۔ کمرے میں صرف بیوی رہ گئیں۔ آنکھیں خمار تھیں میں بیوی
کو دیکھ رہا تھا۔ بیوی قریب آگئیں۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟" کو سمجھانے لگا۔
"ٹھیک ہوں۔ مجھے بتلاؤ تو سہی کیا ہوا تھا اور آپ رو کیوں رہی ہیں۔" "ایسے پریشان ہوکر
"کچھ نہیں۔ نیند لگنے کے بعد آپ کو بخار بڑھ گیا اور آپ بڑبڑانے لگے۔" رویا نہیں کرتے۔ انسان کو
"بڑبڑانے لگا" مجھے تجسس ہوا کہ میں نے کیا بڑبڑایا۔ اصرار حقیقت پسند ہونا چاہیے۔
کرنے پر بیوی نے بتلایا۔ آج نہ سہی ایک نہ ایک دن تو ایسا
آپ بار بار میرا نام لے رہے تھے۔ بیوی کی آنکھیں ہوگا۔"
بھر آئیں۔ بیوی نے میرا منہ بند کرتے ہوئے
میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری زبان کہا۔ خدارا ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آپ کے بغیر
پر کوئی اور نام نہ آیا۔ ورنہ یا نیلی کا نام بھی آسکتا ہمارا کیا ہوگا۔ میں اس تصور سے بھی لرز جاتی ہوں۔
تھا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ "نیند اور حالت . . . . ہم جو بھی ہیں آپ کی بدولت ہیں۔
بیماری میں آپ میرے کتنی قریب ہیں۔ میری خوشی، میری زندگی، میرا سنگھار، میرا سب کچھ آپ
یہ خوشی کی بات ہے۔ آپ روئیں کے دم سے ہے۔ آپ نہیں تو میں بھی نہیں۔ آپ سلامت رہیں۔
کیوں؟" میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ آپ ایسی باتیں نہ کیجیے۔
بیوی کے آنسو جو تھم پہلی مرتبہ مجھے مجازی خدا کے معنی معلوم ہوئے اور مجازی
رہے تھے بہہ نکلے۔ آپ خدا ہونے کا احساس بھی ہوا۔ میں ممنونیت سے بنت حوا کی جانب دیکھا اور
نے کئی مرتبہ کہا کہ میرے اس کی عظمت کو سلام کیا۔
بعد تمہارا اور بچوں بیوی نے میرے ماتھے کو چھوکر بخار کا اندازہ کیا اور تھرما میٹر منہ میں رکھ دیا کہ
کا کیا ہوگا۔ میں مزید بات چیت نہ کروں۔ دو منٹ بعد بیوی نے تھرما میٹر نکال کر دیکھا۔ بخار اب بھی
بیوی زیادہ تھا۔ میرے سر پر بھیگی تولیہ کو بدلا اور پینے کے لیے پانی دیا۔
باقاعدہ بھائی، کنبہ اور دیگر رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ احباب سے بات
کرکے میں نے ان کی پریشانی دور کی۔ بیوی سے کہا کہ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔ آرام کریں۔ بیوی
نہ مانیں۔ بقیہ رات سرہانے بیٹھی تو کبھی جھک کر سر پر رکھتی گئیں، ماتھے کو چھوکر بخار کا اندازہ کرتیں، وقتاً فوقتاً
تھرما میٹر منہ میں رکھتیں، پندرہ بیس منٹ سے پانی، ہریرہ یا شوربا پلاتیں اور ہر گھنٹہ بعد مصلی بچھائے ہاتھ

بھلانے میری صحت کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔

صبح ہوئی، بخار کچھ کم ہوا۔ بیوی مجھے چھوڑ کر بچوں کی خدمت میں لگ گئیں۔ بیوی نے ڈاکٹر کو بلوا بھیجا ڈاکٹر آنکھیں ملتے مجھے دیکھنے آئے۔ معائنہ کیا اور کیفیت پوچھی۔ میں نے جواب دیا۔ طبیعت کافی بہتر ہے لیکن رات نیند نہیں آئی۔

ڈاکٹر نے کہا "آپ اکیلے ہی نہیں دوسرے بھی رات نہ سو سکے"۔

اس دوران بیوی آگئیں اور ڈاکٹر سے میری صحت کے تعلق سے مختلف سوالات کرنے اور مشورے دینے لگیں۔ بخار اب تک کم کیوں نہیں ہوا۔ شاید معائنوں کی ضرورت ہے۔ سر پہ ٹھنڈی تولیہ رکھنے سے نمونیا تو نہیں ہوگا۔ کھانا کچھ نہیں رہے ہیں۔ بھوک لگنے کے لیے دوا میں گنجائش رکھیے گا۔

ڈاکٹر جمائیاں لیتے ہوئے بیوی کی باتوں کو نظر انداز کر گئے اور جب انھیں موقع ملا تو کہا "مریض کی حالت بہت حد تک سنبھل چکی ہے لیکن لگتا آپ تھک گئی ہیں۔ میں ایک قرص دیتا ہوں۔ تھکن دور ہو جائے گی اور اپنی نگرانی میں بیوی کو گولی کھلائی۔ بیوی کے جانے کے بعد مجھ سے کہا "میں نے بیگم صاحبہ کو نیند کی گولی دی ہے۔ وہ سو جائیں تو آپ بھی آرام کر لینا"۔

اور ہوا بھی یہی۔ بیوی گولی کھا کر سو گئیں۔ مجھے بھی نیند آگئی۔ چھ گھنٹے سے زاید نیند پوری کرنے کے بعد بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ تھرما میٹر سے درجۂ حرارت معلوم کیا۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر درد تھا نہ اعضا شکنی۔ لیکن ناک کا سُرڑ سُرڑ کرنا باقی تھا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ "بھوک لگی ہے"۔

بیوی خوش ہوئیں "بھوک صحت کی علامت ہے"۔ دوڑ کر کچن میں گئیں، دودھ، ڈبل روٹی اور میوہ اٹھا لائیں۔ میں بلبلا کر رہ گیا۔ یوں ہی مزید دو دن مجھے بستر پہ آرام کرنا اور پرہیزی غذا استعمال کرنی پڑی۔ ڈاکٹر کی ڈاکٹری چلی اور نہ میرا غصّہ اور روٹھنا کام آیا۔ ●



معاف کیجیے۔ ہم ٹی وی کی خرابی کی گیارنٹی دیتے ہیں۔ پروگرام کے ذمّہ دار ہم نہیں

پروفیسر حفیظ بنارسی

عروج و زوال

جب پرانی شاعری سے لوگ اُکتانے لگے
بارِ خاطر ہوگیا جب قصۂ ہجر و وصال
جب گل و بلبل کی باتوں سے طبیعت بھر گئی
محتسب اور شیخ سے جب سب کو نفرت ہوگئی
جب تنزل کے شکار اہلِ ترقی ہوگئے
منچلوں نے اک نئے معشوق کی تخلیق کی
اس کی خاطر ہر روایت سے بغاوت مول لی
جتنی قدریں تھیں پرانی دیدیا سب کو کفن
دیکھ کر معشوقِ نو سب اس کے دیوانے ہوئے
اس کی شہرت کے لیے شب خون بھی مارا گیا
لفظ پھر ڈھونڈے گئے پیکر تراشی کے لیے
اک نئے سانچے میں اس کے حسن کو ڈھالا گیا
اک اصولِ تازہ سے پھر ضرب اس کو دیدیا
پی کے اس کی آنکھ سے بھی پیاس کو شکوا رہا
یہ تو میں کیسے کہوں رسوائی کا ساماں کیا
اور پھر معشوق کی دُرگت بنائی اس طرح
چونچ میں سورج لیے اک مرغ یوں گویا ہوا
اس نئے معشوق کا ہر دل پہ قبضہ ہوگیا
کچھ دنوں تک اس کی رعنائی پہ سب مرتے رہے
ہر جریدہ، ہر رسالہ اس کے گن گاتا رہا
پھر نہ جانے کیا ہوا، کس کی لگی اس کو نظر
دیکھ کر اس کا بڑھاپا، اُس سے کترانے لگے
دل شکن جب بن گیا افسانۂ حسن و جمال
عشق کی خوراک سے جب بھوک سب کی مر گئی
جب سخن کی بزم بھی نذرِ سیاست ہوگئی
وادیٔ ظلمات میں جب آنکھ والے سو گئے
اور اس کی خوبیوں کی طرح توثیق کی
اک دکانِ شاعری ہر بوالہوس نے کھول لی
اور سب کے آگے رکھا، یہ نگارِ پُرفتن
کل جو معیارِ جنوں تھا اس سے بیگانے ہوئے
اک نیا جوڑا عروسِ نو کو پہنایا گیا
تازہ تر زیور بنے اس شاہزادی کے لیے
مغربی تہذیب کی آغوش میں پالا گیا
زندگی کا سارا درد و کرب اس کو دے دیا
کاروانِ عاشقاں ہر بھیڑ میں تنہا رہا
انجمن در انجمن "تنہائی" کا ساماں کیا
ٹوٹ پڑتے ہیں کسی غنچے پہ بھونرے جس طرح
ہر طرف اس کی سخن سنجی کا ڈنکا بج گیا
منفرد اس کے ثناخوانوں کا لہجہ ہوگیا
چند بوڑھے لوگ بھی اس بت کا دم بھرتے رہے
ڈونگرے تعریف کے اس بت پہ برساتا رہا
دیکھتے ہی دیکھتے زائل ہوا اُس کا اثر

(سلسلہ اگلے صفحہ پر)

اُس کی رنگت اڑ گئی، اس کا بھی جوبن ڈھل گیا — وقت کا افسون اس دوشیزہ پر بھی چل گیا
بٹ گیا اس کا تقدس، لُٹ گیا اس کا سہاگ — گھر کے لوگوں نے لگا دی اس سہاگن کو بھی آگ
اس کے عشوے اس کے غمزے سب پرانے ہو گئے — اس کے غم میں جاگنے والے ہزاروں سو گئے
کچھ دوانوں کو تو اس سے فائدہ حاصل ہوا — یہ نیا معشوق لیکن کتنوں کا قاتل ہوا
اب یہ چکر چل رہا ہے کون ہے آخر جدید — جو قریبی دوست تھے آن میں بھی جھگڑے ہیں شدید

وقت کا فرمان سب کے سامنے آجائے گا
ناقدِ فردا ہی اس کا فیصلہ فرمائے گا

پروفیسر حفیظ بنارسی

دیکھتے جاؤ

نقاب الٹو ذرا تصویرِ بھارت دیکھتے جاؤ — کرپشن نے جو ڈھائی ہے قیامت دیکھتے جاؤ
نکالو جیب سے پیسہ خریدو جو بھی جی چاہے — سجا ہے ہر طرف بازارِ رشوت دیکھتے جاؤ
جسے پینا نہیں آتا اسی کو جام دیتا ہے — ذرا ساقیِ محفل کی حماقت دیکھتے جاؤ
یہاں پگ پگ پہ مل جائیں گے تم کو گیان کے مندر — مگر تعلیم کی ہے کیسی درگت دیکھتے جاؤ
یہاں بازار میں بکتی ہے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی — ہے کیسی مستند اپنی جہالت دیکھتے جاؤ
نہ ہندو کوئی ہندو ہے نہ مسلم کوئی مسلم ہے — بنامِ مندر و مسجد تجارت دیکھتے جاؤ
جلا دیتے ہیں دلہن کو ذرا سی بات کی خاطر — یہاں مظلوم ہے کس درجہ عورت دیکھتے جاؤ
اسی کی قدر ہوتی ہے جو پیسے والا ہو جائے — یہاں کیسا ہے معیارِ شرافت دیکھتے جاؤ
گھٹالے میں یہاں شامل ہیں اربابِ حکومت بھی — ذرا نزدیک سے، یاروں کی صورت دیکھتے جاؤ
گروہِ قاتلاں آزاد ہے ہر ظلم کی خاطر — یہاں مجبور ہے لیکن عدالت دیکھتے جاؤ

یہاں مٹی بھی مہنگی ہے، یہاں پانی بھی مہنگا ہے
مگر سستا ہے خونِ آدمیت دیکھتے جاؤ

مصر کی منڈی میں

مانک ٹالا۔ بمبئی

ایک روز ہمارے باس (BOSS) کو بشارت ہوئی کہ انہیں ایکسپورٹ کا کاروبار بھی شروع کر دینا چاہیئے۔ اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ایکسپورٹ میں نمبر دو کا پیسہ کمانے کے بڑے چانس تھے۔ بڑے بڑے امپورٹ لائسنس ملتے تھے جن کی کھلے بازار میں قیمت اوسطاً پانچ سات ہزار تھی کہ نمبر پر سو روپے کا معاہدہ ہوتا اور باقی پانچ سات سو روپیہ نقد فقط کڑک کرنسی نوٹوں کی شکل میں ملتا۔

ہم اپنے باس کے دست راست تھے۔ یعنی اُن کے نمبر دو کے دھندوں میں راستی اور ایمان داری کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ اُن کے نمبر دو کے سبھی معاملات ہمارے ہی دستِ مبارک سے سرانجام پاتے تھے۔ اُن کی کئی کئی پیٹیاں[1] اور نمبر دو کے بھی چوپڑے ہمارے ہی غریب خانے پر مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے رہتے۔ چنانچہ وہ ہمیں ناک کے بال کی طرح عزیز رکھتے اور ہماری دیکھ ریکھ فرماتے۔ ہمارا غریب خانہ اصل میں اُن ہی کا دولت خانہ تھا کہ اسے انھوں نے اپنی نمبر دو کی دولت سے ہمارے نام خرید فرمایا تھا اور اس میں زیادہ تر اُن ہی کی دولت کا نواس رہتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس نیک کام کے لئے بھی ان کی نظرِ انتخاب ہم ہی پر پڑی۔ ہمیں حکم ہوا کہ دفتر میں ایکسپورٹ کا بھی محکمہ قائم کیا جائے۔ اور اس سلسلے کے ہر جوڑ توڑ کا سلسلہ وار انتظام کیا جائے۔ ہم نے سب سلسلے فٹ بٹھا دیئے۔ حتیٰ کہ امپورٹ لائسنس کے محکمے کے ایک بڑے افسر کے نادار اور بیکار سالے کو اپنا ماتحت بھی مقرر کر دیا۔ کیونکہ امدادِ باہمی کے اصولوں کو فروغ دینے کا یہ بے جوڑ طریقہ کار ہے۔ ویسے بھی ہمارے دیش کے آدھونک اتہاس میں جوڑ توڑ کے بھائیوں نے بڑے بڑے کارہائے گراں بہا انجام دیئے ہیں اور دیتے رہیں گے۔

اور اب کے ہمیں بشارت ہوئی کہ ہمیں سب سے پہلے مصر کی زیارت کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتے تھے لیکن کئی روز کی سرگردانی کے بعد ہم پر یہ راز افشا ہوا کہ اب وہاں کی منڈی میں یوسف بے کارواں کی کوئی قیمت نہیں رہی کہ وہاں کی زلیخائیں اب غلاموں کی خرید و فروخت میں دلچسپی نہیں رکھتیں اور وہ دیگر منفعت بخش اشغال میں مصروف ہیں۔ ہم آئینے میں اپنا سا منہ دیکھ کر

[1] نمبر دو کے کاروبار کی اصطلاح میں ایک پیٹی ایک لاکھ روپے کے برابر ہوتی ہے۔

رہ گئے۔

اب وہاں کی منڈیوں میں ڈیزل انجنوں ان کے پرزے ، ٹرانزسٹر وغیرہ کی قسم کی اجناس کی بڑی مانگ تھی اور ہمارے ملک سے یہ اشیاء وافر مقدار میں وہاں جاتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے ان اشیاء کے حصول کی تفصیلات حاصل کرنے کے لئے بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے اور خود عربی زبان سیکھنے کی طرف متوجہ ہو گئے کہ ان کی مادری زبان میں اپنے کاروباری ہتھکنڈے استعمال کر کے انہیں اور زیادہ متاثر کر سکیں گے۔

ہم نے سنا کہ چند عربی زبان کسی ثقہ زبان دان سے سیکھنے کی ٹھانی کہ اس کی وجاہت ، لطافت اور نفاست سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کا شین کاف بھی درست ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے ہم سعودی کانسولیٹ میں بہ نفسِ نفیس خود تشریف لے گئے اور حسب منشا ایک ثقہ عرب الفضل حضرت کی خدمات زیرِ کفشیہ صرف کر کے حاصل کر لیں۔ ان محترم نے ہمیں عربی زبان چٹکیوں میں سکھلانے کی گارنٹی دی۔ لیکن ان حضرت نے ہمارا شین کاف درست کرنے کی بجائے ہمارا عین غین درست فرمانا شروع کر دیا۔ ہر آواز حلق سے نکالنے کی مشق کرتے کرتے ہمارا حلق حلقۂ دام میں آ گیا۔ اور ہم غوں غاں کے قابل بھی نہ رہے۔ کئی روز تک غرارے کرتے رہے اور وِکس کی گولیاں چوستے رہے۔ چنانچہ ہم نے عربی زبان سے توبہ کی اور اپنا کام اپنے ملک کی مادری زبان انگریزی سے چلانے کا فیصلہ کر لیا۔

قاہرہ کے ہوائی مستقر سے ہوائی کمپنی کے کوچ میں ہم شہر کے ٹرمینل کے لئے روانہ ہوئے۔ بڑی بڑی طویل و عریض شاہراہیں اور بلند و بالا عالیشان عمارتیں ——— لیکن ہمیں تو کسی طلسماتی ماحول و فضا کی امید تھی کہ ہم نے آٹھویں درجہ کی انگریزی ریڈر میں پڑھا تھا کہ وہاں پتھریلی اینٹوں (COBBLE-STONE) کے بنے ہوئے تنگ و تنگ راہوں میں کہیں اٹھائی گیرے نظر آتے ہیں اور کہیں جادوگرنیاں ——— !

آپیرا اسکیور (OPERA SQARE) میں ہمیں ایک درمیانہ درجے کے اچھے آرام دہ ہوٹل میں جگہ مل گئی ، ہوٹل میں ہمیں کئی نائٹ کلبوں اور سیر و تفریح کروانے والی کمپنیوں کے پمفلٹ نظر آئے۔ ایک اشتہار مرحوم و مغفور شہنشاہ فاروق کی ذاتی کلب کا بھی تھا۔ پہلے کبھی اس کلب میں شہنشاہ سلامت اپنے خاص الخاص دوستوں ، مہمانوں اور امرا و وزرا کے ساتھ تھرکتی ، ابلتی ، اچھلتی جوانیوں کے رقص سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ لیکن انقلابات ہیں زمانے کے کہ اب وہاں ہما شما قسم کے لوگ بھی ان رقاصاؤں کے خدنگِ نظر اور نگاہِ ناز کے گھائل ہو سکتے تھے۔

مصر میں سب سے مشہور رقص بیلی ڈانس (BELLE DANCE — حسینہ حسیناؤں کا رقص) ہے۔ فاروق کلب میں کئی نازنینوں کے منفرد اور ملے جلے رقص ہوئے۔ کمریں معدوم معدوم سی۔ تاہم لٹو کی طرح گھومتی ہوئی کوئی چیز یہ ثبوت دے رہی تھی کہ جسم کے اوپر اور نیچے کے حصے کسی مہ نیم کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں ——— آخر میں ریتا ہیورڈ کی شباہت و قامت والی ایک رقاصہ تشریف لائی۔ گردن کی صراحی ہچکولے سی کھاتی ہوئی دف کی تھاپ پر اس نے کمر ، کولہوں اور جسم کے وہ چھل بل دکھائے کہ تماشائی عش عش کر اٹھے۔ کمر کے جھٹکے دیکھ کر رحمٰن کا دوہا یاد آ گیا ـــ

رحمٰن دھاگا پریم کا مت توڑو جھٹکائے
ٹوٹے پاچھے پھر نہ ملے۔ ملے گانٹھ پڑ جائے

آخر میں اُس قطامہ نے جسم سے کپڑے چھیل چھیل کر پھینکنے کا عمل شروع کر دیا۔ کلب میں طوفان ہو گیا۔ آخر میں جس دو گرہ کپڑا اوپر اور چار گرہ کپڑا نیچے رہ گیا ــــ پھر قمقموں نے ایک ہلکی سی ہچکی لی۔ اور جب دوبارہ اسٹیج پر روشنیوں کی یلغار ہوئی تو دیدۂ عبرت نگاہ نے دیکھا کہ انگ سے انگیا اور سر سے زلفوں کی آبشار دونوں غائب تھے۔ اور کہ وہ لگاتار گھنٹہ بھر دلوں پر بجلیاں گرانے والی نازنین عورت نہیں مرد تھا ــــ !

کام کے کولہو میں جُتنے سے پہلے ہم نے مناسب سمجھا کہ پہلے فراعین مصر سے دو دو ہاتھ کر لیں کہ انہوں نے پانچ ہزار سال پہلے خواص و عوام میں بہت دہشت پھیلا رکھی تھی۔ قاہرہ کی سیر و تفریح کرانے والی ایک کمپنی کے کوچ میں ہم اہرام کے دیدار کے لئے روانہ ہوئے۔ سامنے دریائے نیل ایک بے حس و حرکت اژدھے کی طرح پڑا تھا۔ فرعونوں نے اس کے پانیوں کو بخشنے کتنی کنواری لڑکیوں کی بلی دی تھی کہ آج بھی فضا میں خون کی بُو باس بسی ہوئی لگتی تھی۔

دریائے نیل کا پل پار کر کے ہم گیزہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ ایسا لگا کہ ٹائم مشین ہمیں کئی سو سال پہلے کے زمانے میں واپس گھسیٹ لے گئی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف کھجور کے جھنڈ، گدھوں پر سامان لاد کر انہیں ہانکتے ہوئے لوگ سر تا پا برقعوں اور چادروں میں مستور عورتیں، وغیرہ ــــ

جہاں تارکول کی سڑک ختم ہوتی ہے وہاں سے ریت کا اتھاہ سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ریتیلی دھرتی کے سینے پر تین اہرام اپنی نوکیلی چوٹیوں سے آسمان کی چھت میں سوراخ کرنے میں مصروف نظر آئے۔

اہرام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے مصر میں سائنس اور ٹکنالوجی اپنے عروج پر تھی ورنہ اتنے بڑے بڑے سینکڑوں من وزنی پتھر کس طرح ایک دوسرے کے اوپر اس ترتیب سے ٹکائے جا سکتے تھے؟ اس کام کے لئے مزدور بڑی بڑی برقی کرینیں استعمال میں لائی گئی ہوں گی۔

پہلا ہرم فرعون شعیپ کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اگر شومئی قسمت سے مکھی بیٹھ ہی جاتی تو تلواریں چل جاتیں اور پلک جھپکنے میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ لیکن مکھیوں کا کچھ نہ بگڑتا۔ بلکہ اُن کی ضیافت کا اہتمام ہو جاتا۔ وہ لاشوں کے اوپر بھنبھناتی نظر آتیں۔

یہی موذی آج بالکل بے ضرر بنا دریائے نیل کے اُس پار قاہرہ کے عجائب گھر کے ایک بڑے کمرے میں سینکڑوں حنوط شدہ لاشوں کے انبار میں پڑا ہے۔ پہلے وہ اس ہرم میں اپنے سارے جاہ و جلال اور دولت و مال کے ساتھ دفن تھا۔ کیوں کہ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ اس دنیائے دنی سے اپنے ہیرے جواہرات سمیت عدم آباد کی طرف کوچ کرے گا۔ چنانچہ ہرم کے جس کمرے میں وہ دفن تھا اس میں ایک بڑا سوراخ بھی ہے کہ تازہ ہوا آتی رہے تا کہ اُس کی روح دم گھٹنے کے عارضے میں مبتلا نہ ہو جائے اس ہرم کے لئے ایک کشتی پڑی ہے جس میں اس کی روح سوار ہو کر رات کے وقت آسمانوں کی بلندیوں پر سیر و تفریح کے لئے جایا کرتی تھی۔ کشتی میں کوئی کل پرزہ نہیں لگا ہوا ہے۔ غالباً جنات کی طاقت سے وہ عالم بالا کی وسعتوں میں تیرتی ہو گی۔

ان تینوں اہرام میں استراحت فرما فراعین، ان کی بیگمات اور زر و جواہر کی پاسبانی کے لئے ابوالہول کا دیوہیکل مجسمہ بھی موجود ہے۔ اس کا دھڑ شیر کا اور چہرہ انسان کا ہے۔ لیکن اگر اس کا دھڑ بھی انسان کا ہوتا تو کیا حرج تھا ــــ انسان بذات خود بڑی ہولناک اور ہیبت ناک ہستی ہے۔

بہرحال ابوالہول سے بھی ان کی حفاظت نہ ہو سکی۔ کچھ دولت کفن چوروں نے لوٹ لی اور باقی قاہرہ کے عجائب گھر میں مقفل پڑی ہے۔ لوگ باگ ان فراعین اور آل کی دولت کو دیکھتے ہیں لیکن عبرت حاصل نہیں کرتے۔ واہ رے انساں دو اور اس طرح کے عبرتناک مقامات کی زیارت کے بعد طبیعت میں کسلمندی سی پیدا ہو گئی۔ اس کسلمندی کو دور کرنے کے لئے ہم ہفتہ بھر نائٹ کلبوں اور اس قسم کے دوسرے ٹھکانوں پر بیلی ڈانسوں کی معدوم کمروں کا جغرافیہ دریافت کرتے رہے۔

آخر ایک روز شستہ صورت دیکھ کر ہم اس کام کے لئے نکلے کہ جس کے لئے ہمارے باس نے ہمارے اوپر سینکڑوں ڈالر پھونک ڈالے تھے ـــــ ہم کچھ لکھے پتے اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ ڈائری کھول کر نظر دوڑائی۔ ایک پتا: تیر آفرین لگا۔ کیونکہ اس کے مالک کے نام کے ساتھ "دکتور" (ڈاکٹر) کی ڈگری بھی چسپاں تھی۔ ہم اس پتے پر خراماں خراماں تشریف لے گئے۔ جناب دکتور بڑی تہذیب و تواضع سے پیش آئے۔ ہم نے اپنے نزول کے اغراض و مقاصد گوش گزار کئے۔ انہوں نے ہماری پیش کردہ تفصیلات کا معائنہ و مطالعہ فرمایا اور کافی غور و خوض کے بعد فرمایا کہ وہ ہماری مصنوعات کے لئے مارکیٹ کا جائزہ لیں گے۔ اس مقصد کے لئے وہ ہمیں مس رودمیو کے ساتھ بازار میں بھیجیں گے۔ لیکن چونکہ مس رودمیو اس وقت کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں اس لئے ہمیں کچھ دیر انتظار کھینچنا ہوگا۔

ہمارے سامنے قہوے کا پیالہ رکھ دیا گیا اور ہم مس رودمیو کے تصور میں کھو گئے۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ مصری، فرنچ لڑکیاں بے حد حسین اور جاذب نظر ہوتی ہیں۔ جی میں بہت خوش ہوئے کہ مس رودمیو سے تھوڑا سا فلرٹ کرنے ملے گا ـــــ گرم گرم قہوے کے دھوئیں کے ساتھ ہمارا دماغ بے پر کی اڑانے لگا۔ یہ نا ہنجار دل، تصور میں کبھی اس کی گردن کی سیمیں صراحی پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ کبھی بھنوؤں کی کمان سے گھائل ہونے لگتا اور کبھی سینے کے بھنور میں پھنسنے لگتا ـــــ ہم نے سوچا کہ جب مس رودمیو سے ہمارا تعارف ہوگا تو ہم کہیں گے کہ ہمارا نام مسٹر جولیٹ ہے۔ اس پر ایک نقرئی قہقہہ پڑے گا اور اس کا چھریرا بدن بل کھانے لگے گا۔ اور ـــــ

جب مس رودمیو تشریف لائیں اور ہمارا ان سے تعارف کرایا گیا تو ہمارے ارمانوں پر فراعین کے تینوں اہرام دھڑام سے آ گرے۔ وہ چھ فٹ کو چھوتی ہوئی ایک لحیم شحیم محترمہ تھیں۔

حاقی شاہ
(حیدرآباد)



پیاز کا اغوا

بازار سے پیازیں اچانک غائب ہو گئیں جیسے کسی دولت مند کی اکلوتی خوب صورت جوان
[illegible] نہیں۔ لڑکی کے غائب ہونے پر تھوڑے تمام پولیس اسٹیشنوں پر رپورٹ لکھوا دی جاتی ہے اور
سختی کے ساتھ تلاش کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں اتا پتا نہیں چلتا۔ بڑی رات
گئے کسی نامعلوم مقام سے کوئی ٹیلی فون پر اطلاع دیتا ہے۔ سیٹھ جی! آپ کی بیٹی کہیں
بھاگی ہے اور نہ کوئی عاشق اسے لے اڑا ہے بلکہ ہم نے اس کا اغوا کر لیا ہے اور
وہ بڑے آرام سے ہماری تحویل میں محفوظ ہے۔ اگر آپ اس کی جان
کی خیر چاہتے ہیں تو براہ کرم کل رات کے دو بجے شہر سے
سے پچاس کلو میٹر دور حضرت مست قلندر
کی درگاہ سے متصل قبرستان کی دیوار
کے پچاس لاکھ سے کرا دیجئے ورنہ آپ
کی بیٹی کی عزت محفوظ رہے گی اور
نہ جان ــــــ ہاہاہا ــــــ اگر
اگر آپ نے پولیس کو خبر دینے کی
کوشش کی تو آپ بھی باقی نہ رہیں گے
سمجھے ــــــ ہاہاہا ــــــ تو سنئے اپنی
بیٹی کی آواز ــــــ

کہیں دور سے نہ جانے کہاں سے خوف اور دہشت میں
ڈوبی ہوئی تیز تیز آواز آتی ہے۔ "ڈیڈی مجھے بچالو ڈیڈی ــــــ ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔
پلیز ڈیڈی ــــــ"

•

کروڑ پتی یا لکھ پتی کی بیٹی کے اغوا کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن پیاز کو کس نے اغوا کیا ہے؟ پیاز کی

تلاش میں دکان دکان گھومتے ہوئے میں سوچنے لگا۔

اس تلاش میں میں تنہا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ بچے، بوڑھے مرد اور عورتیں اپنے اپنے ہاتھوں میں باسکٹس اور تھیلیاں لیے حیران پریشان گلی گلی اور کوچہ کوچہ گھوم رہے تھے!

اور جب کسی نئی گلی کی موڑ پہ دوسری گلی سے آنے والوں کا آمنا سامنا ہوتا تو سب ایک ساتھ پوچھتے، کیا مل گئی ؟

جواب کی بجائے وہ اپنے ہونٹوں کو لٹکا دیتے۔

گھر سے ایک کیلومیٹر دور بڑی سڑک پر ایک بڑا جنرل اسٹور تھا جو اپنی ایمان داری اور کم نرخوں کی وجہ سے مشہور تھا اور جہاں سے میں اکثر تو نہیں لیکن کبھی کبھی کچھ نہ کچھ خرید لیتا تھا۔ جب میں اسٹور روم پہنچا تو مالک اسٹور روم نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ اور کہا، آیئے آیئے —— تشریف لایئے غالباً آپ بھی پیاز کے لیے آئے ہیں ؟

میں نے کہا، ہاں بھائی —— یہی تو چکر چل رہا ہے۔

تو پھر یہ —— وہ دیکھیے —— اس نے اسٹور روم کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں منوں پیاز ایک ڈھیر کی شکل میں پڑی ہوئی تھی۔

میں نے کہا، تول دیجیے کوئی آٹھ دس کیلو ——

مگر صاحب ذرا مہنگی ہے۔ محض آپ حضرات کی خدمت کی خاطر لایا ہوں تاکہ آپ سب کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

یہ کام آپ نے بہت اچھا کیا۔ بہت سے لوگوں کو آپ نے گھومنے سے بچا لیا۔ تو دیجیے مجھے دس کیلو پیاز ——

مگر صاحب! ذرا مہنگی ہے!

آخر کتنی مہنگی ہے ؟ معلوم تو ہو ——

پچاس روپے کیلو ——

پچاس روپے —— آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں ؟

اس میں مذاق کی کیا بات ہے صاحب! فی کیلو مجھے ایک آدھ روپیہ منافع بھی نہیں ہے۔ محض آپ سب کی خدمت کا جذبہ تھا۔ اس لیے گنج سے یہ منوں پیاز اٹھا لایا ہوں۔ ٹرانسپورٹ کا خرچہ بھی میری طرف سے ہے!

باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لمبی چوڑی موٹر کار ایک جھٹکے کے ساتھ دکان کے سامنے رکی اور کار میں سے ایک لمبی چوڑی گوری چٹی عورت برآمد ہوئی جو قریب قریب چھ فیٹ کی تھی اور بولی، آئی وانٹ آنینز۔

یس میڈم —— کتنا دوں ؟

دو کیلو ——

مالک نے دو کیلو پیاز تولی اور پلاسٹک کے ایک خوب صورت پیاکٹ میں رکھ کر اس کے ڈرائیور کے کے ہاتھ میں تھما دی۔ اور پھر اس نے کہا' سو روپیے۔

میڈم نے بڑے ہی ٹھسّے سے اپنے خوب صورت پرس کی زِپ کو کھینچ کر سو کی نوٹ نکالی اور مالک کو دیتے ہوئے چلتے چلتے کہا' جیب میں پیسے نہ ہوں تو لوگ بازار میں آخر کیا خریدنے آتے ہیں ؟ محض وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں !

جی میڈم۔ جنرل اسٹور کا مالک ایک وفادار اور پالتو گھوڑے کی طرح ہنستے ہوئے ہنہنایا !

میڈم تیز تیز چلتی ہوئی دوسری دکان کی طرف آگے بڑھ گئی اور ڈرائیور کار کو آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلانے لگا !

دکان دار سے میں نے پوچھا' اجی جناب ! یہ کون مغرور عورت تھی جو ہم سب کا مذاق اڑا کر چلی گئی۔ اور جس کی ہاں میں ہاں ملا کر آپ ہنس رہے تھے !

جواب تھا' حضور والا ! میں اس میڈم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ یہ بھی آپ کی طرح ہماری گاہک ہیں ۔ بازار میں بیٹھے ہیں تو سب کی سننا ہی پڑتا ہے لیکن آپ کچھ زیادہ ہی خفا ہو گئے !

خفا نہیں تو کیا میں خوش ہوتا۔ سو روپے کی نوٹ آپ کی طرف پھینک کر وہ اپنی امارت کا اظہار ہی تو کر رہی تھی !

حضور! آپ غصّہ تھوک دیجیے۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ چلیے۔ ایک روپیہ کم دیجیے۔ پچاس کی بجائے اُنچاس روپے کیلو کے حساب سے لے لیجیے۔ تول دوں دس کیلو ؟

نہیں مجھے معاف کیجیے۔ میں اس جرم میں خود کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ پیاز کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں ـــــ

چلو بھائی لوگ ـــــ پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے چھوٹے قافلے کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا ـــــ

ہاں چلو بھائی ـــــ بہت سی آوازیں آئیں۔

قریب کچھ مزدور بھی کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں پھاوڑے لیے اور سیمنٹ پکڑے ہوئے جو کسی کامپلکس کی تعمیر کے لیے جا رہے تھے ! انھوں نے جیسے ایک آواز میں کہا' مگر صاحب اب ہم کیا کریں گے ؟ روکھی روٹی' مرچ کے ساتھ ہم پیاز کو چکھ چکھ کر کھاتے تھے۔ اب روکھی روٹی حلق سے کیسے اترے گی ؟

○

پیاز جہاں غریبوں کا کھاجا ہے وہیں بڑی بڑی ڈنر پارٹیوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ٹیبز وں پہ سیخ کے کباب کے ساتھ پرت پرت پیاز' ٹماٹر اور آلو کے پتلے پتلے ٹکڑوں کے ساتھ یوں سجائی جاتی ہے کہ پیچھے آنکھوں کی نیت خراب ہو جائے !

یا بالو میکرو کے لیے پیاز بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ کھائیں یا نہ کھائیں لیکن یہ ضرور چاہیں گے کہ پیاز نظروں کے سامنے رہے۔ کیفیت کی خاص سطح اور "ہینگ اوور" کے نازک لمحے میں پیاز ہی وہ واحد شے ہے جو نجات دلاتی ہے۔ ایک آدھ ڈلی چبا کر کھانے سے نشہ ہرن تو نہیں ہوتا لیکن قابو میں ضرور آجاتا ہے۔ اور پینے والا بے قابو نہیں ہوتا۔ ویسے کوئی بالغ سے زوش پیاز کھاتا تو کیا اسے چھونا بھی پسند نہیں کرتا۔ البتہ ان بے ضرر معصوم شوہروں کے لیے پیاز ایک ڈھال بن جاتی ہے جو پینے کے بعد پیاز کو چباتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ اور اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیویوں کو بہت ہی خوب صورت انداز میں چکمہ دے دیا!

شراب سے زیادہ پیاز کو یار لوگوں نے رسوا کیا۔ شراب کا کاروبار کرنے والے لائسنس یافتہ چھوٹے چھوٹے بارس میں کچن کے متصل اٹیچڈ روم ہیں جہاں اور کئی چیزیں اندھی پڑی رہتی ہیں وہیں منوں پیاز کے ڈھیر بھی۔ جہاں کسی گاہک نے وسکی، برانڈی یا جن کا آرڈر دیا وہیں بیرا تلی ہوئی مونگ پھلی اور چنوں کے ساتھ چھیلی ہوئی پیاز بھی بڑے سلیقے سے پلیٹ میں رکھ دیتا ہے۔ پیاز چھیلنا بھی ایک بہت بڑا آرٹ ہے۔ اس میں ہمیشہ انگلیوں کے زخمی ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ فکر تونسوی نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اسی شوق میں گزارا۔ اور وہ اپنے قلم کے نشتر سے پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکے نکالتے رہے۔ لیکن شراب خانوں کے مالک اس کاروبار سے جتنا کما لیتے ہیں اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں! اس کی بنیادی وجہ شاید یہی ہے کہ مالکین بار پیاز اور شراب کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں کا اثر ان پر مطلق نہیں ہوتا!

لیکن پیاز کو تو وہ چکھ سکتے ہیں۔ چبا کر نگل سکتے ہیں۔ اس سے نقصان کیا فائدے ہی فائدے ہیں۔ مثلاً روز کچی پیاز کھانے والے ہائی اور لو بلڈ پریشر جیسی بیماری کا شکار نہیں ہوتے۔ شکر کے مریضوں کے لیے یہ ایک آزمودہ علاج ہے۔ کیوں کہ خون میں پیدا ہونے والی چربی کو پیاز ختم کر دیتی ہے جسے میڈیکل سائنس کی زبان میں "کولسٹرل" کہتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مغرور عورت کی چربی کیوں نہیں پگھلی جو کچھ دیر پہلے سب کا مذاق اڑا کر چلی گئی! ——— کدھر نظام علی اور کدھر پیاز کی ڈلی! ——— دکنی زبان کا یہ محاورہ آج بھی دکن کی وادیوں میں صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے ایک نغمے کی طرح گونج رہا ہے!

بڑی بوڑھیاں، مرد، عورتیں اور بچے کہتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں ——— یہی کہتے ہیں، کدھر نظام علی اور کدھر —

یہاں بادشاہ وقت نواب نظام علی خاں سے مقابلہ مقصود نہیں تھا۔ پیاز کی ڈلی کو محض علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کہنا یہی ہے کہ نواب نے اپنے دورِ حکومت میں ایک روپے میں منوں پیاز بکوادی یہ فیوڈل سماج کا بڑا کارنامہ تھا۔ لیکن آج ڈیموکریسی کے اس دور میں کون ہے جو غریبوں کے منہ سے نوالہ کھینچ رہا ہے؟ کبھی پیاز بازار سے غائب ہو جاتی ہے، کبھی انڈا، ٹماٹر اور آلو۔ کون ہے جو ان اشیا کو وقفہ وقفہ سے مہنگا کر رہا ہے!

آخر کون ہے وہ شیطان؟ ●●

اردو ادب کے ابتدائی سفرنامے اتنے ثقیل اور واقعاتی لحاظ سے اس قدر روکھے پھیکے تھے کہ عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں، کٹھن مراحل اور خشک تفاصیل نے بہت کم لوگوں کو سیاحتی کی طرف راغب کیا۔ یوں بھی سفرنامے کے مندرجات کچھ اس نوعیت کے تھے کہ سوائے ریٹائرڈ فوجی افسروں اور دفتر میں بابوؤں کے کسی کو دلچسپی پیدا نہ ہو سکی اور یوں اردو ادب کی یہ صنف قبولیت سے محروم رہا۔

جب سے ہوائی سفر عام ہوا ہے سفرناموں میں بھی خاطر خواہ اضافہ نظر آتا ہے۔ اس میں جہاں آمد و رفت کی ترقی کو دخل ہے۔ وہاں سفرناموں کے رنگین اور دلچسپ واقعات بھی شامل ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے سفرناموں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے سفرنامے عوامی ادب کا حصہ بنتے جا رہے ہیں اور ان کا مستقبل

ہدایت نامہ سفر نویسی

ظفر اقبال کھوکھر
(ریاض)

روشن ہے۔ ممکن ہے آپ کو بھی مستقبل قریب میں کسی سفر سے پالا پڑے اور آپ کو بھی سفرنامہ لکھنے کی تحریک ہو۔ چنانچہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر سفرنامہ کے بارے میں کچھ مجرب و مستند ہدایات دی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ کو اپنے سفر کے لیے مناسب ممالک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر آپ افریقہ یا جنوبی امریکہ کے سفر کا ارادہ رکھتے ہوں تو بہتر ہے کہ "شکایات" کے بارے میں لکھیں۔ سفرنامہ لکھنا درست نہیں۔ آسٹریلیا بھی ابھی اردو قارئین کا پسندیدہ براعظم نہیں۔ آپ کے سفر کی سمت شمالی امریکہ اور یورپ ہونی چاہیے۔ اگر آپ کے سفر کی سمت شمالی امریکہ میں نیویارک، شکاگو، لاس اینجلس، ہوسٹن اور فلاڈیلفیا کا یہ نام رکھیں اور یورپ میں لندن، پیرس، ایمسٹرڈم، کوپن ہیگن، میونخ اور روم کے شہروں کا نام شامل کر لیں تو ...

ایک بنا مکمل قسم کا سفرنامہ "تیار" ہو سکتا ہے۔

سفرنامے کی ابتدا آپ گھر سے ایرپورٹ روانہ ہونے سے شروع کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے گھر سے ایرپورٹ کا یہ سفر متعدد بار کیا ہو لیکن سفرنامے میں ایرپورٹ کا یہ مختصر سفر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں آپ سفرنامے کا مجموعی مزاج اور سفر کی جملہ منصوبہ سازی استعاروں میں بیان کرسکتے ہیں۔ ان تمہیدی کلمات کا بڑا کلیدی اثر ہوگا۔ آپ کے ذہن میں کوئی فرسودہ لایعنی فلسفہ موجود ہو تو اس کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اپنی کوئی آزاد نظم جس کو عام حالات میں تحریر کرنے سے ہچکچاتے ہوں بآسانی شامل کرسکتے ہیں۔ اپنے کسی بچھڑے ہوئے "دوست" کو یاد کریں اور اسی طرح کی دیگر کیفیات جن کے اظہار کا موقعہ نہ ملا ہو۔ پہلے باب کی زینت بن سکتی ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو ایرپورٹ کسٹم، امیگریشن یا ایرلائین کو ہدف تنقید بنایا جاسکتا ہے۔ انھیں ضروری مشورے اور ہدایات دی جاسکتی ہیں۔ زمینی عملے کی ایرہوسٹس پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر متعلقہ سفارت خانے سے ویزے کے حصول میں دشواری آئی ہو تو ان پر بھی غصہ نکالا جاسکتا ہے۔ یاد رکھیں جہاز میں بیٹھنے سے قبل آپ کے سفرنامے کا پہلا باب مکمل ہونا چاہیے۔

جہاز میں بیٹھتے ہی آپ کی نشست کے دائیں یا بائیں ایک حسین وجمیل مہ جبین کا ہونا ضروری ہے۔ خیال رہے کہ ایرلائین آپ کو کہیں بھی نشست دے۔ لیکن سفرنامے میں آپ کی ہم سفر کوئی پیری وش ہی ہوگی ورنہ سفرنامے کا مستقبل مخدوش ہے۔ اپنی ہم سفر حسینہ کو قومیت دیتے وقت احتیاط سے کام لیں کیوں کہ یہ قومیت دیگر ابواب میں آپ کے کام آئے گی اور بعد کی ملاقاتیں سفرنامے کو مستند بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ آپ ہم سفر سے کیا گفتگو کریں گے تو اس سلسلہ میں آپ پر کوئی خاص پابندی نہیں۔ بس یہ خیال رکھیں کہ چھ سات گھنٹہ کی فلائیٹ میں آپ کو دوسرا باب مکمل کرنا ہے۔ گفتگو دلچسپ اور مفاد عامہ میں ہونی چاہیے۔ اپنے کسی تخیلاتی "عشق" کو تحریر میں لے آئیں۔ مجاز کے اشعار سے استفادہ کرلیں۔ اپنے رومانی خیالات کے مدارج طے کرلیں۔ لیکن آپ کی ہم سفر کا آپ کے خیالات اور شخصیت سے متاثر ہونا لازمی امر ہے ورنہ قاری دوسرے باب میں ہی دل شکستہ ہو جائے گا۔ اپنی گفتگو کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے آپ چند غیر معروف لطیفوں کا اضافہ بھی کرسکتے ہیں۔ بہرحال جہاز اترنے سے قبل آپ کی ہم سفر منگنی پر تو راضی ہو جانی چاہیے لندن امیگریشن پر حسب مسلک چند تنقیدی جملے لکھ کر آپ دوسرا باب مکمل کرسکتے ہیں۔ عملی زندگی میں آپ شعر وشاعری سے کتنے ہی گریزاں کیوں نہ ہوں لیکن سفرنامے کی حد تک آپ کا شعری ذوق بہت عمدہ ہونا چاہیے۔ بہت سی ایسی کیفیات جو نثر میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ شعر کے ذریعے بآسانی درج کی جاسکتی ہیں۔ بلکہ ایک آدھ مصرع سے بھی کام چل سکتا ہے۔

تیسرے باب کی ابتدا آپ لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ کی تعریف سے شروع کرسکتے ہیں۔ لیکن جب سے کراچی کا نیا ایرپورٹ کھلا ہے اور لوگوں نے دوسرے ممالک کے ہوائی اڈے بھی دیکھے ہیں۔ سمجھ دار سفرنویس تعریف میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ تاہم دیگر سہولتوں اور ذرائع آمد ورفت خصوصاً UNDERGROUND کا ذکر آپ کھلے دل سے کرسکتے ہیں۔ ایرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے آپ کا کوئی کزن یا انکل آسکتا ہے لیکن اگر آپ شاعر یا ادیب کی حیثیت

سے لندن پہنچ رہے ہیں تو مشاعرے کی . پوری انتظامیہ کمیٹی کا موجود ہونا شرط ہے ۔

اگر آپ آئندہ بھی لندن آنا چاہتے ہیں تو اپنے میزبانوں سے تعلقات اچھے رکھیں۔ ان کے گھر کو رکھاؤ اور کھانوں کی مبالغہ انگیز تعریف کریں یہ مصلحت آپ کو مستقبل میں بھی کام آئے گی۔ لندن کی سیر وہاں کی رنگینیوں کے قصے، چند نئے تعارف، دوستوں سے ملاقاتیں اور اسی قسم کے دیگر امور کا ذکر چنداں دشوار نہیں۔ سب سے پہلے تو آپ اچھی سی چند LONDON GUIDE BOOKS حاصل کریں جن کی مدد سے انگلستان اور لندن کی تاریخ و جغرافیہ پر ایک عالمانہ تحریر قلمبند کریں۔ پھر لندن میں سیر کے دوران آپ کی کئی دوست بنیں گی۔ ان کا ذکر منفرد انداز میں کریں۔ اپنے قیام کے دوران چند ایک خود ساختہ حسین واقعات کا اہتمام کریں۔ آپ کا تیسرا باب مکمل ہے۔ لندن کے تجربات پر ہی آپ دیگر یورپی اور امریکی شہروں پر بھی فی شہر ایک باب بآسانی تحریر کر سکتے ہیں۔ بلکہ چند شہر گھومنے اور چند باب لکھنے کے بعد ان شہروں پر بھی قلم آرائی کر سکتے ہیں جہاں آپ کو جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ جہاں چہ آپ جتنے شہروں کی سیاحی کرنا چاہیں اتنے ہی باب رقم ہو سکتے ہیں۔ پہلے دو باب اور آخری باب تمام سفر ناموں میں مشترک ہیں۔

یاد رکھیں بر دکھاوے میں بے شک آپ رعایتی نمبروں سے پاس ہوئے ہوں لیکن یورپ اور امریکہ کی حسیناؤں میں آپ کی حیثیت یونانی دیوتاؤں سے کم نہیں ہوگی۔ یورپ کے ہر شہر سے باہر ایک ماہ لقا پھولوں کی مالا لیے آپ کی منتظر ہوگی۔ آپ کو یہ اعتماد تمام سفرنامے میں برقرار رکھنا ہے اور کم از کم تحریری طور پر یہ تاثر قائم رہنا چاہیے۔

یورپی اور امریکی خواتین کے نام اکثر مشکل ہوتے ہیں۔ اور ان کا .... یاد رکھنا دشوار ہے۔ اس لیے آپ چند آسان نام مثلاً کیتھی، جوڈی، لینڈا، میری، سوزی، مارگریٹ اور جینیفر وغیرہ یاد کر لیں۔ مذکر ناموں سے آپ کا واسطہ تحریری طور پر بہت کم پڑے گا۔ اس کے لیے ٹام، پیٹر اور جیک سے کام چل جائے گا۔

تصاویر کی سفرنامے میں بڑی اہمیت ہے۔ دراصل انھیں کی بدولت آپ اپنے تمام حسین حادثات کا تاثر قائم کر سکیں گے۔ یقین رکھیں یورپ و امریکہ میں مذکورہ تصاویر لینا کچھ دشوار نہیں۔ اس کا عملی تجربہ ہونے کے بعد آپ چاہیں تو سفرنامے کی جگہ فوٹو البم بھی شائع کر سکتے ہیں۔ یورپی اور امریکی شہروں کے CASINO اور NIGHT CLUB کا "مطالعاتی دورہ" آپ کی جیب اور اخلاق پر گراں گزرے گا۔ اس لیے کوشش کریں کہ جملہ تفصیلات کتب و رسائل سے حاصل کی جائیں۔ سنی سنائی باتیں بھی بآسانی شامل کی جا سکتی ہیں۔

آخری باب میں آپ کو یورپ اور امریکہ کی رنگینیوں کو دوہرا کر اخلاقیات پر ایک پرسوز درس تحریر کرنا ہے۔ اس میں مغربی معاشرے کی برائیاں اور کمزوریاں درج کرنی ہیں۔ اگر آپ مذہبی رجحان اجاگر کرنا چاہیں تو اسلامی تعلیمات کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کے چند شعر لکھنے ہیں اس سلسلے میں اور کوئی شاعر آپ کا مددگار نہیں ہو سکتا۔ جی بھر کر مغربی معاشرے کو کوسیں اگرچہ واپسی کی ٹکٹ بھی چھپ کر لکھنے کی ہوگی۔ لیکن یہ تمام عرصہ آپ سوکر گزاریں گے وطن واپسی پر آپ کلمہ خیر ادا کریں گے اور پھر دوبارہ سفر کا انتظار کریں گے۔

[illegible]

غزل

خواہ مخواہ (مرحوم)

اگر نہیں ہے کوئی کام، کام پیدا کر
کہیں سے ڈھونڈھ کے مینا و جام پیدا کر

تو ہر طرح کے سبھی کام لے غلاموں سے
غلام گر نہیں ملتے، غلام پیدا کر

دلوں میں تیر کی مانند جو اُتر جائے
تلاش کر کے کچھ ایسا کلام پیدا کر

سنا کے نام سے اپنے بڑے دھڑلے سے
اساتذہ کی صفوں میں مقام پیدا کر

زمانہ در پہ ترے آ کے سر جھکائے گا
کسی طرح سے سیاست میں نام پیدا کر

رہیں گی دو سے زیادہ بھی جس میں تلواریں
کسی طرح سے اک ایسی نیام پیدا کر

لگا کے پان میں کھائے تو قوم سو جائے
ملا کے بھنگ، نیا اک قوام پیدا کر

تو چاہتا ہے تری خواہ مخواہ شہرت ہو
خودی کو بیچ امیری میں نام پیدا کر

قطعات

چلو ملا کر موسم کی طرح لیڈر بدلتے ہیں
نہیں بنتی کسی افسر سے تو دفتر بدلتے ہیں
بتا کر خواہ مخواہ مجھ کو بہت حیران کرتے ہیں
یہ کیسے دوست ہیں ہر آٹھویں دن گھر بدلتے ہیں

مری بستی کے نیتا کو تھا اتنا خوف رسوائی
انھوں نے بعد مرنے کے یہی اک تصویر کھنچوائی
خدا بخشے سُنا ہے ابتدا سے ایسے ظالم تھے
کہ بریانی ولیمے کی نئی دُلہن سے پکوائی

مشکل میں اک نجات دہندہ ضرور ہو
سر جس پہ رکھ کے رو سکیں وہ کندھا ضرور ہو
معشوق ہو حسین، یہ ضروری نہیں مگر
عاشق کو چاہیئے کہ وہ اندھا ضرور ہو

جانِ جاں یہ نہ سمجھ موت سے ڈر جاؤں گا
تو کہے گی تو ابھی جاں سے گزر جاؤں گا
میں تری جھیل سی آنکھوں میں اتر بھی جاتا
بس یہی ڈر ہے کہ میں ڈوب کے مر جاؤں گا

رفیعہ منظور الامین
(حیدرآباد)

نیا سال مبارک

کردار —

مسافر: خلاء سے آیا ہوا شخص ۔ چنگھاڑتا ہے ۔ عجیب سی آواز میں بولتا ہے
شمس الدین (عرف شمسو میاں): عمر پچاس سے اوپر
زینب بی: شمسو میاں کی بیوی
لڑکی: نوجوان
لڑکا: نوجوان
اللہ:
اندھا فقیر:
سردار فقیر:
ٹھیکے دار:
انجینئر:
دلہن کا باپ:
عبدالعلی:
عبدالعلی کی بیوی:
پولیس والا:
رپورٹر لڑکی:
ٹی ۔ وی کا پروڈیوسر:
ریسرچ اسکالر:
ناول نگار خاتون:
سیکریٹری:
ایک آواز
منتری:
سائنس داں:
اشتراکی:

(کوئی ترنم سے شعر پڑھتا ہے)

جلاؤ چاند ستارے چراغ کافی نہیں		یہ شب ہے جشن کی خوب روشنی زیادہ کرو

(برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ)

شمس: لڑکیاں ابھی یہیں ہیں؟
زینب: معلوم ہے باورچی خانے میں ہیں — گرد صاف
(منت ملاتے ہوئے) اور ان برتنوں کا معلوم نہیں تم لوگ کب — کہاں شکر کیا لوٹ گئے۔

دیکھو، کون آگیا!

زینب: (آتے ہوئے) میں دروازہ کھلا نیکو رکھتی۔ تمیچ بچے کے ویسا نئے سال کے روشنیاں دیکھنے کو گئے تھے۔ کھلا چھوڑے ہوئیں گے (کون آیا! ــــ کون ہے رے بابا تو؟ اندر کیسا آیا؟

شمسو: یہ سب میں اس سے پوچھ چکا۔ منہ میں لڈو رکھلے ویسا چپ کھڑا۔

زینب: صورت دیکھو تا کچھی ملے کی ــــ ہاتھ بھر کا قد ہے۔

شمسو: انسان کا بچہ ہے جی، کائیکو ایسا بول رئیں۔

مسافر: چنگھاڑتا ہے۔ زینب اور شمسو اچھل پڑتے ہیں

زینب: اسرافیل علیہ السلام صور پھونکے ویسا اندلایا تو۔

مسافر: گالی مت دو۔

زینب: گالی دیئے رے تیرے کو؟

مسافر: انسان بولے۔

شمسو: انسان بولے تو گالی ہوتی رے۔ بھونکتا ہے تو کیا ہوا، پھر بھی انسان نئیں تو کون ہے تو۔

مسافر: ہمارے ہاں گالی دیتی ہو تو اسے انسان کہتے ہیں۔

زینب: پھر کائیکو تشریف لائے ہمارے پاس؟

مسافر: راستہ بھٹک گیا تھا۔

شمسو: کون سا راستہ، کدر کے سفر کو جا رہا تھا؟

مسافر: ہم تمھیں نہیں بتائیں گے۔

شمسو: (نقل کرکے) ہم تمھیں نہیں بتائیں گے۔ (وقفہ) بات تو لکھتے کے انسان کے ویسا کر رئے۔ پر یہ میاں کے سائنس کا پتلی ایسا ئچ ہے۔

(مسافر چنگھاڑتا ہے)

زینب: یا میرے مولا ــــ اچھی لکڑ بولتا ــــ پر یہ میاں کے سائنس کا پوتا بی انسان ہے نا ــــ اس کو انسان بولتے اچ اکھڑ رائے۔

شمسو: (سمجھا کر) تو جو کچھ بھی ہے ــــ کدر سے آیا؟ کاں جانا ہے ــــ کچھ بتایا تو تیرے کو تیرے گھر پہنچا دیتوں۔

مسافر: بہت دور ہے میرا گھر۔

زینب: بچارا ــــ کیا چھوڑ دیئے ہوں گے اماں باوا اس کو اکیلا۔

مسافر: میں بچہ نہیں ہوں۔

شمسو: (چمکار کر) پروا نئیں میں تیرے کو بس میں لے چلتوں۔ گھنٹے دو گھنٹے کا سفر ہی ہے تو پروا نئیں۔ تیرے کو تیرے اماں باوا کے حوالے کرتوں۔

مسافر: بڈھے، لاکھوں کیلو میٹر کا سفر، دو گھنٹے میں!

شمسو: (غصے سے) بڈھا؟

زینب: اِبی تم اور کتے سالاں بڈھا بولے تو یہ جڑتے رہیں گے؟ پہلے اس بلا کو ٹالو۔

شمسو: ہاں تو بول کاں سے آیا تو؟

مسافر: پہلے تمیز سے بات کرو۔ میں بڑا ہوں تم سے۔

زینب: لو خوش ہو جاؤ۔ تمارے سے بڑا ہوں بولا۔

شمسو: گنوار کی پھلی کے اتا ہے۔ میرے سے بڑا ہوں بولتا۔ کیا عمر ہے تیری؟

مسافر: ساڑھے تین سو سال۔

شمسو: (قہقہہ)

زینب: اور آیا کاں سے بول نا۔

مسافر: وہاں سے، جہاں تم لوگ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔

زینب: (جز کر) ہٹ دوانے! ہم برسوں سے چاند کو جانے کی کوشش کر رئیں نئیں ہو سکتے، تو تو ہمارے سے بھی غریب دکھ رئے۔ کہاں کاں سے

لایا؟

مسافر: نہیں - اس جگہ سے جو تمہاری زمین سے لاکھوں میل دور ہے۔

زینب: ارے جا۔

مسافر: کیوں، خود تمہارے شاعر نے نہیں کہا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

شمسو: ٹھہرو جی ـــ تم اخبار پڑتے نئیں۔ تمہارے کو معلوم نئیں ـــ میں سمجھا کہ اُنے خلا سے آیا سو ہے، بڑا لمبا سفر، لمبی مسافت طے کیا۔

زینب: اچھا جی ہوا۔ میرے کو پڑتا نئیں آتا۔ تم سب واہیات باتاں پڑتے رہتے۔ سارا وقت خراب۔

شمسو: (الگ سے) تماری سمجھ میں نئیں آتا، کتی اہم بات ہے یہ۔ ان سے ہماری قسمت بن سکتی۔ اس کو اپن اپنے پاس رکھیں گے (با آواز) تو خلا سے بھٹک کے یاں آگیا؟۔

مسافر: نہیں میں جھوٹ بولا تھا۔

زینب: دیکھو یہ لوگاں بی جھوٹ بولتے۔ اپن سمجھ سے تھے ہمارے لوگاں جھوٹے ہیں۔

شمسو: تو پھر بتا نا سچی بات کیا ہے۔

مسافر: میں تے یہاں روشنیاں دیکھیں تو چلا آیا۔

شمسو: ہو سچی بات ہے ہمیشہ اندھیرا رہ کو کبھی کبھی اجالا ہو تو لوگاں کھینچ کو آتے۔ ہمارا نیا سال آیا ہے تا اس واسطے روشنی ہے۔

مسافر: میں دیکھنا چاہتا ہوں تم لوگ نیا سال کیسے مناتے ہو۔

زینب: کا تیکو ـــ تمہارے پاس نیا سال نئیں آتا کیا؟

مسافر: ہمیں خوشیوں کے بہانے ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔

(بینڈ باجوں کی آواز جو کچھ دیر کے لیے دب جاتی ہے)

مسافر: یہ شور کیا ہے؟

شمسو: نیا سال آنے کی خوشی میں باجے بج رئیں۔ ہم لوگاں خوش ہوئے تو شور مچاتے۔ چل میں تیرے کو روشنیاں دکھا کے لاتوں۔

مسافر: تمہارے گھر میں روشنی کیوں نہیں ہے؟

زینب: یہاں ایسا ئچ ہوتا۔ گھروں میں اندھیرا۔ باہر روشنی۔

شمسو: ایسی ناشکری نکو کرو۔ لیو یہ بوتل بھر کے تیل لایا نا۔ آج تو بلیک میں بی نئیں۔ کم پیسے دیکو لایا، نیا سال ہے نا۔ راشن کے دام بڑھ گیا۔

زینب: آسے پاسے بھر کم بخت کیا روشنی دیگا۔

شمسو: باتاں کرو ئیں (مسافر سے) چل تو۔ مگر میرا مفلر اچھا لپیٹ لے۔ کوئی بی نئیں دیکھنا تیرے کو۔

مسافر: کوئی دیکھ لے تو کیا ہوگا؟

شمسو: پریشان ہو جائے گا تو۔ یاں لوگوں کی عادت ہے۔ ایک آدمی پل پہ سے نیچے جھانکا تو اس کے ساتھ نیچے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔

مسافر: دو اپنا مفلر۔

شمسو: لے اچھی طرح لپیٹ لے۔

مسافر: (ناک سکیڑنے کی آواز) اونف - اس میں بہت بدبو ہے۔

زینب: اور کیا ہوئیگا۔ سال کو سال دھلتا ان کا مفلر۔ نئے سال کو دھلا مفلر پہن کو بسنتے

چلو بدبو کا ایک سال گزر گیا - اب نیا سال والا ہے تا کل دھو دوں گی -

شمسو : اچھا اچھا بس کرو - نیا دیکھے نہ پرانا ' سب کے سامنے گھر کے پائپ کھول کو رکھ دیتے تم - چلو جی تم بیت الخلا کے مسافر -

مسافر : بیت الخلا نہیں ' صرف خلا - انگلش Space تم مجھے خلا کے مسافر نہیں صرف مسافر کہا کرو - پھر میں تیار ہوں -

(موسیقی)

شمسو : ٹرک کا ٹیکو گیا چل نا -

مسافر : تم بھی رک جاؤ - دیکھتے نہیں وہاں وہ دو پریمی بات کر رہے ہیں - ان کے بیچ میں کیوں ٹانگ اڑائیں -

شمسو : کچھ نہیں ہوتا رے تو چل ' ہمارے کو عادت ہے دوسروں کی باتاں سننے کی -

لڑکی : جاؤ ' میں تم سے نہیں بولتی -

لڑکا : ایسا غضب مت کرو - میں جیوں گا کیسے ؟ کچھ تو کہو ہوا کیا ؟

لڑکی : تم نے وعدہ کیا تھا کہ نیا سال آنے سے پہلے ہمارے سڑک کے گڑھے بھروا دوگے -

لڑکا : تم ایک کارپوریشن کے انجینئر کی دلہن بننے والی ہو !

لڑکی : تو ؟

لڑکا : میونسپالٹی جو پیسہ دے رہی ہے اس سے میں سڑکیں ٹھیک کروا دوں تو ہمارے ہنی مون کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا -

لڑکی : وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابو کی ٹانگ کا کیا ہوگا - کل رات گڑھے میں گر گئے -

ابو : (کراہتے ہوئے) فرخندہ . . . . - فرخندہ بیٹی -

لڑکی : (گھبرا کر) شاید ابو آ رہے ہیں - جاؤ چلے جاؤ -

ابو : نہیں بیٹی - میں نے کچھ نہیں سنا نہ دیکھا — یہ گڑھے مت بھروا ؤ — میں نے تمہاری شادی کے رقعے میں یہ گڑھوں والی سڑک کا دیا ہے - گڑھے بھر جائیں تو سارے رقعے بیکار ہو جائیں گے -

لڑکی : جی ابو — مگر آپ کی ٹانگ

ابو : (ہنستے ہنستے) پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ -

لڑکا : (دھیرے سے) تمہارے والد کا تخلص مرغا ہے کیا ؟

لڑکی : shut up وہ ٹیچر ہیں -

ابو : تم سمجھتی کیوں نہیں - اس بار تو پریس والے کے لڑکے کو پاس کر کے رقعے مفت میں چھپا لیے تھے - ارے رے رے میری ٹانگ — اب کی بار پیسے دینے پڑیں گے -

شمسو : چل نا میاں ' کیا اڑیل بن کے کھڑا ہے -

مسافر : نہیں — مجھے کہیں نہیں جانا ہے -

شمسو : کیا یا پیچ کسی گڑھے میں دفن ہونا ہے ! باتاں کرراتے -

مسافر : (معافی) نہیں — وہ لڑکی کتنی اچھی ہے ؟

شمسو : کھینچ کے لگا توں دو — کیا اپنی دنیا میں عشق کا دھندا کرتا تھا ہے بھول جا سب - دیکھا نئیں - اس لڑکی کے منگیتر کو — سڑک بنانے کے بڑے بڑے انجناں چلاتا ہے — تو انجن کے ایک پہیے کے برابر بی نئیں سمجھ لے خشر اپنا — سڑک پہ بیل کے چپاتی کر دیگا تیرے کو

مسافر: (بیزار) چلتا ہوں نا — عطر بیچ کر کیوں پیچھے پڑے ہو ۔ پہلے ہی اس کی بدبو سے چکرا رہے ہیں مجھے ۔

شمسو: بہت چڑتا ہے رے تو — ہمارے کو دیکھو زندگی گزر گئی، گندے نالے کے کنارے رہتے رہتے — اب تو آتی عادت ہو گئی کہ عطر کی بو اچھی نہیں ۔ اب چلتا آگے کیا یا نیچے سڑک پہ چپاتی بننا ہے ۔

(موسیقی)

اندھا ہے تو اندھے کو مائی باپ، اندھے کو بھیک دیتے جاؤ ۔ بال بچے سلامت رہیں ۔

(المونیم کے کٹورے میں سکے گرنے کی آواز)

(گاکر)

اے خدا محروم بینائی مجھے کیوں کر دیا
کیا بھری دنیا میں کچھ بھی دید کے قابل نہیں

شمسو: دیکھو مسافر ۔ اللہ ایک چیز چھینتا تو اس کے بدلے میں دوسری چیز دے دیتا ۔ اس فقیر کے آنکھاں نہیں ہیں تو اس کی آواز میں کتنا درد دے دیا ۔

مسافر: تم اس کی آواز سننے میں رہ گئے ۔ ادھر دیکھو کوئی آ کر اس کے پیسے چرا رہا ہے ۔

شمسو: چل ہٹ اس کی نانی یکڑ لیتوں ۔ (قدموں کی آواز) کون ہے رے تو اندھے بھکاری کے پیسے چرا رہا ہے شرم نہیں آتی تیرے کو ۔

سردار فقیر: چھوڑ میری گردن ! — دینا ہے تو اس کو بھیک دو، نصیحت مت کرو ۔

مسافر: بھیک ۔ اس لیے کہ تو اس سے چھین لے ۔

سردار: (بالغیض) (چھوٹا منہ بڑی بات) سنا آتو بھی ان کے ٹولے میں شریک ہو جا ۔

شمسو: میرے مہمان کو تم بھکاری بننے کی دعوت دے رہیں ؟

سردار: کام دے رہا ہوں کام ۔ اس میں تو وہ سارے گن ہیں جن کی وجہ یہ ایک کامیاب فقیر بن سکتا ہے ۔ بالشت بھر کا قد ۔ ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں ۔ کھوپڑی سے ابلتی آنکھیں، گنجا سر — مجھے تو ایسے انسانوں کی تلاش رہتی ہے ۔

(مسافر چنگھاڑتا ہے)

سردار: ارے باپ رے یہ تو کچھ اور ہی چیز لگتا ہے ۔ میری گردن پر گرگٹ کی طرح چپک گیا تھا ۔ اب وہاں جلن ہو رہی ہے ۔ کیا چنگھاڑ ہے اس کی ۔ بولو کتنے میں بیچو گے ۔

شمسو: پھر وہی — ایسا اڑنگا دیونگا ۔

مسافر: (متانت سے بات کاٹ کر) خفا مت ہو شمسو میاں ۔ مجھے اس سے بات کرنے دو ۔ (سردار سے) جب میں تمہیں اتنا برا لگتا ہوں تو مجھے خریدنا کیوں چاہتے ہو ۔

سردار: کبھی سرکس دیکھی تھی زندگی میں ؟ تجھے سرکس والوں کو بیچوں تو تیری بھی شہرت میری بھی چاندی ۔ جتنے میں تجھے میں خریدوں گا اس سے دس گنا دام میں بیچوں گا ۔ (قہقہہ)

شمسو: انسانوں کا دھندا کرتے ہو کیا تم ؟

سردار: بہت دھندے کر کے دیکھے ۔ سب سے اچھا یہی دھندا ہے ۔ انسان بہت اچھے بکتے ہیں ۔

جتنا بُرا انسان ہوتا ہے اتنا ہی اچھا بکتا ہے۔

اندھا فقیر: (ہانک لگاتا ہے) اے خدا کے نام پر، رحم ... بینائی مجھے ....

سردار: چپ رہ۔ دیکھا نہیں میں بات کر رہا ہوں۔

(اندھا فقیر اچانک خاموش ہو جاتا ہے)

شمسو: تم بھی فقیر، یہ بھی فقیر، پھر تم اس کو کیا ڈانٹ سکتے ہو؟

سردار: پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ میرا نوکر ہے۔

شمسو: نوکر ——— اچھا، یالو کوئی کتے یا لو روٹی!

سردار: تم سمجھ کیا رہے ہو مجھے ——— میں ایسا ویسا فقیر نہیں۔ گدی پہ بیٹھتا ہوں۔ اس کی طرح کے ایک سو بھیترا اور میرے نوکر ہیں۔

شمسو: سمجھ گیا، نوکر کما کر دیتے، تم بیٹھ کر کھاتے ہو۔

سردار: کھلاتا بھی ہوں۔ کبھی کمائی نا بھی ہو تو اس کے پیٹ کا دوزخ میں ہی تو بھرتا ہوں۔

شمسو: (ٹھنڈی سانس) ہو بھی کروڑوں بھکاریوں کے اس ملک میں حکومت اکیلی سب کا پیٹ کیسا بھرے گی۔ تمہارے جیسے لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے ——— لے میاں تو لے لے یہ چونی۔

اندھا فقیر: کھوٹی ہے یہ چونی۔

شمسو: ارے ڈھونگی ——— تیرے آنکھیں ہیں۔

اندھا فقیر: اس دنیا میں بہت سے لوگ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے ہوتے ہیں، میں کم از کم اپنے اندھے پن کو استعمال کرتا ہوں۔

شمسو: بات تو سچی بولا۔ چل مسافر یہاں سے ———

(موسیقی)

مسافر: روشنی ہو تو ایسی ہو ——— کتنی بڑی بلڈنگ ہے یہ جگمگا رہی ہے۔

شمسو: کل نئے سال پہ اس کا افتتاح ہونے والا ہے۔ بہوت بڑا وزیر آرہا ہے افتتاح کرنے کے واسطے

(بم کے دھماکے، پھر بلڈنگ کے تباہ ہونے کی آواز)

شمسو: ارے بھاگ بھاگ یہاں سے، نہیں تو ہم دونوں دب جائیں گے۔ گرتی سو بلڈنگ کے نیچے ———

(دونوں بھاگتے ہیں، شمسو کے ہانپنے کی آواز)

مسافر: رک جاؤ۔ تم بری طرح ہانپ رہے ہو۔ چلو کچھ دیر اس چھت کے نیچے سستا لیں۔

شمسو: نہیں نہیں چلو آگے ——— یہ گھر اسی ٹھیکیدار کا ہے جو وہ گری سو بلڈنگ بنایا۔

مسافر: وہ بلڈنگ گورنمنٹ کی تھی، یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ کیوں گرے گا۔

شمسو: ہو، بابا تیرے کو بہوت جلدی سمجھ آرہی ہے۔

انجینیر: ٹھیکے دار ہو گیا کام!

شمسو: شش ——— (آواز دبا کر) ٹھیکے دار کے پاس کوئی بیٹھا ہے۔

ٹھیکے دار: (ہنستے ہوئے) کام کیسے نہیں بنتا، تین بم ایک ساتھ پھٹیں تو بلڈنگ کیا بچ سکتی تھی۔ میں کوئی کچا کام تھوڑے ہی کرتا ہوں۔

انجینیر: یہ مت بولو۔ بلڈنگ کا کچا کام تو تم نے ہی کیا تھا۔

ٹھیکے دار: مگر اسے پاس تو آپ ہی نے کیا تھا چیف انجینیر صاحب۔

انجینیئر: (لڑکھڑاہٹ سے) جس کا معاوضہ تم نے مجھے بہت کم دیا۔

ٹھیکے دار: (سمجھاتے ہوئے) آئیں گے اور بھی موقعے آئیں گے۔ اگلا ٹینڈر میں بھردوں گا۔

انجینیئر: مگر تم نے بلڈنگ اڑانے میں اتنی دیر کیوں کی؟

ٹھیکے دار: چیف انجینیئر مجھے خون خرابہ بالکل پسند نہیں۔

انجینیئر: کیا مطلب؟

ٹھیکے دار: کل بلڈنگ کا افتتاح ہوتا لوگ باگ جمع ہوتے کام شروع ہو جاتا تب بلڈنگ گرتی تو کتنی جانیں جاتیں —— اور بلڈنگ کو تو آج نہیں تو کل گرنا ہی تھا۔ سمجھے نا آپ؟

انجینیئر: ہاں سمجھ رہا ہوں۔

ٹھیکے دار: بلکہ میں نے تو اپنے ساتھ آپ کو بھی بچالیا۔ کل اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ دہشت گردوں نے بلڈنگ اڑادی۔

انجینیئر: واقعی ہمارے اخبار بہت بڑی قومی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

(کتا بھونکنے لگتا ہے)

ٹھیکے دار: شاید کوئی آیا۔

انجینیئر: برا ہوا —— ہو سکتا ہے اس نے ہماری باتیں سن لی ہوں۔

ٹھیکے دار: چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ (تیزی سے جانے کی آواز)

شمسو: مسافر بھاگ۔ آئیں تجھے گودی میں اٹھالوں۔

مسافر: تم اپنی فکر کرو۔ میں اڑ لوں گا۔

(افراتفری۔ دوڑنے کی آواز)

انجینیئر: وہ جا رہے ہیں۔

ٹھیکے دار: یہی ہیں وہ دہشت پسند۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں کہ بلڈنگ اڑا کر اب وہ بھاگ کر اڑانے آئے تھے۔

انجینیئر: چھوڑو جانے دو، پولیس خود یہ کام کرے گی۔ بھاگ گئے بھگوڑے۔

(بینڈ بجتا ہے)

(بینڈ باجوں کی آواز جو پل بھر کو کم ہوتی ہے)

شمسو: (ہانپتے ہوئے) چل، چل برات دلہن کو لے کر جانے والی ہے۔ ان میں شامل ہو جائیں گے۔

(بینڈ باجوں کا شور بڑھ جاتا ہے)

مسافر: دلہن کہاں جا رہی ہے۔ یہ تو بازار ہے دیکھو سب سامان سجا ہے۔

شمسو: دکان نئیں دلہا نے دولن کا جہیز ہوتا یہ شادی کرے تو یہ سب دینا پڑتا ہے۔

مسافر: اگر نہ دیا جائے تو؟

شمسو: نئیں دیئے تو بچی کو مارتے پیٹتے حلیہ بگاڑ دیتے، جلا دیتے۔

دلہن کا باپ: آیئے آیئے بیٹھیے۔ کیا رشتہ ہے آپ کا ہمارے داماد سے۔ کچھ منگواؤں آپ کے لیے۔ اے بیرا ادھر لے آؤ۔

شمسو: ہم لوگاں دولے والے نئیں ہیں۔

دلہن کا باپ: بیرا واپس لے جاؤ۔

شمسو: یہ ہمارے خلا سے آئے سو مہمان ہیں ان کو اپنے ریت رواج بتا رہا تھا۔

دلہن کا باپ: اچھا اچھا تو آپ خلا سے آئے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر —— اور ہاں آپ کے پاس کچھ لڑکے ہوں تو بتایئے —— میری تین لڑکیوں کی شادی باقی ہے۔ لڑکے آپ جیسے بھی ہوں تو چلے گا۔ گھوڑے جوڑے کی رقم جہیز سب کچھ دوں گا۔

شمسو: جہیز میں تو آپ سب کچھ دیئے۔ ٹی وی، ریڈیو

موڑ سیکل مگر دولہا کے تو پاؤں ابھی نہیں ہیں۔
موڑ سیکل کیا چلائے۔

دلہن کا باپ: پاؤں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ اس کی ماں نے
کہا کہ جب اس کے بچے ہوں گے تو وہ چلائیں گے
اسے

شمسو: بڑی سمجھ دار عورت ہے دیکھو —— اپنے کو اتنی
بات سمجھ میں نہیں آتی پھر عورتوں کو بڑا اُو پر اٹھا دیتے۔
بٹسو عورتاں اتی عقل کی بات کرسکتے کیا؟

مسافر: ارے سفید رنگ کی اوری کیسی ہے اسٹانڈر ہے۔
ایسا تو میں نے تمہارے علاقے مسافر کو پہنے دیکھا
ہے۔

دلہن کا باپ: (فخر سے) یہ ایسا لباس ہے جس پر آگ
اثر نہیں کرتی۔ ہم نے اپنی بیٹی کو سمجھایا ہے کہ جب
وہ اپنی ساس کے ساتھ اکیلی ہو تو پہن لیا کرے۔
محفوظ رہے گی۔

مسافر: آں ہاں۔ اب سمجھ گیا میں کہ تمہارے پاس مٹی کا تیل
اتنا مہنگا کیوں ہے۔ بھئی لڑکی کو جلانا ہو تو جہیز
میں الکٹرک ہیٹر کیوں نہیں مانگتے۔

شمسو: نئیں، یہ ہمارے کلچر کی چیز نئیں ہے۔ ریت رواج
بھی تو کوئی چیز ہیں۔

مسافر: نئیں تم لوگ لکیر کے فقیر ہو۔

دلہن کا باپ: (آواز دبا کر) خدا کے لیے دھیرے بولو۔
لڑکے کی ماں کے کان بہت تیز ہیں۔ ابھی رخصتی
نہیں ہوئی ہے۔ ماں باپ نے سن لیا تو اس کی
بھی فرمائش کر بیٹھیں گے اور زیادہ ٹھہرے ہوں تو
آپ کے لیے پانی منگواؤں۔

شمسو: نئیں، نئیں شکریہ۔ ہم جاتے ہیں۔
(بینڈ باجے زور سے بجنے لگتے ہیں)

مسافر: تو تمہارے پاس لڑکی کے ساتھ پیسہ جہیز سب

پھر دیا جاتا ہے۔

شمسو: اب یہ بھی کا نصیب ہے۔ کبھی دیتے کبھی بیچ بازار
میں بھول گیا۔ تم بولے تو یاد آیا۔ عبدالعلی کے
پاس جاتا تھا۔ اس کی بچی کا نصیب ہے آگے ہم
کچھ خیال نئیں کرتا۔ بہوت غریب لوگاں ہیں اکو۔

(موسیقی)

شمسو: عبدالعلی —— عبدالعلی۔

عبدالعلی: ٹھہرو شمسو بھائی میں آرہا ہوں۔

شمسو: عبدالعلی بڑی کا کاروبار کرتے۔ اردو اخباراں
پڑھتے پڑھتے زبان ایچ لگا لیے۔ اپنی شعراں
تو اتنے یاد ہیں ان کو بابا۔

عبدالعلی: وہ آئے ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے۔

شمسو: مسافر میں بولا تھا نئیں —— کاں تک بات
بڑھی۔

عبدالعلی: شیخ صاحب آگئے۔ ذرا عمر پکی ہے۔ دلال بھی
آگیا مگر ایک مشکل آگئی۔

شمسو: کیا ہوا۔ میں تو پہلے ایچ تمارے کو بولا رہا تھا اِن
شیعروں کے چکر میں نکو پڑو۔ بچیوں کو پڑھاؤ لکھاؤ۔

عبدالعلی: لو۔ ان کی سنو —— یہاں یہ حال ہے کہ
دھوکو مانگ کے پانی خجل نہ کر اے میر
وہ مفلسی ہے تیمم کو گھر میں خاک نہیں
اور آپ بول رہے بچیوں کو پڑھاؤ لکھاؤ۔ دس
بچے اتنے چھوٹے کمرے میں سوئیں تو ایک کا
گھٹنا تو دوسرے کا پیٹ ——

مسافر: ایک شعر اور سنایئے۔

عبدالعلی: کون بولا —— کون بولا؟

شمسو: پریشان نکو ہو۔ اور یہ میرے پیچھے بیٹا ہے

مسافر: خلا ——

شمسو: ہو خلا سے آیا سو مسافر ہے۔ زمین والوں کی دنیا

کا روپ اس کو لوٹ لیا۔

بیوی: ارے کس تمہارے شعروں پر مٹی پڑ دوال دو لوگا افطار کریں تمہارے کو شاعری سوجھ رہی ہے۔

میں بتا تیوں شمسو بھائی۔ دلال لایا سو شیخ نے جمیلہ کے واسطے دس ہزار پہ بات ٹھہری۔ اس نے ساتھ قاضی کو بھی لیکو آ گیا۔

شمسو: تو پریشانی کیا ہے؟

بیوی: شیخ کے سامنے جمیلہ کے ساتھ، منع کرے تو بھی کم بخت شکیلہ آ گئی۔ اب شیخ اڑ گیا جمیلہ سے نہیں شکیلہ سے نکاح کریگا۔

شمسو: ارے دھتکار دو اس بڈھے کھوسٹ کو۔ شکیلہ سے نکاح کرتا کیا گیارہ سال کی بچی ہے؟

بیوی: (جذباتی انداز میں) اسے شکیلہ کے واسطے بیس ہزار دینے کو تیار ہے۔ کیا سمجھے آپ ——؟ مگر یہ بوٹ بھر کی حرامزادی ہرگز راضی نہیں ہو رہی ہے۔ لونڈی کو دو تھپڑ مار کو راضی کراتیوں میں۔

مسافر: ٹھیک تو کہہ رہی ہے وہ۔ اتنی سی بچی اس بدشکل بڈھے شیخ کے پلے کیوں باندھی جائے۔

بیوی: تو چپ رہ بیٹھے۔ چپکی اٹھا کو ایسا ماروں گی —— صورت دیکھا آئینے میں۔

مسافر: (برا مان کر) شمس الدین —— چلو تم یہاں سے —— میں خلا سے آیا ہوں، ابھی کوئی میری عزت نہیں کرتا۔ جس کے منہ جو آیا بک جاتا ہے۔ اب واپس چلو۔

شمسو: تیری عزت میں کر رؤں تا بس نئیں۔

عبدالصمد: شمسو دلال بول رائے آدھی رقم دے گا۔ صدیق شیخ کو لے کر واپس چلا۔

بیوی: اور تم منہ لٹکا کو میرے پاس آ گئے اور یہ شمسو بھائی کو نسا دم نئیں سو جنور ساتھ لائے کہ

بنی سو بات بگڑ رہی ہے۔ چلو چلو یہاں سے۔

مسافر: دیکھا . . . . دیکھا۔ دم نئیں سو جنور بولی۔

شمسو: اچھا بھئی چل —— واپس چل گھر کو۔

(موسیقی)

شمسو: امی . . . . امی!

زینب: کیا ہے آ گئے واپس بھٹکے کو سیر کرا کے۔

شمسو: اب تم کچھ نکو بولو۔ تھکن ہو رہی ہے۔ اس کو اور مجھے کچھ کھانے کو دو۔

مسافر: نہیں، میں نہیں کھاؤں گا۔ میں برسوں بغیر کھائے زندہ رہ سکتا ہوں۔

(دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

شمسو: کون آیا رے —— میرے گھر میں گھسنے کا انتظار کر رہا تھا کیا۔ (پکار کر) آ ملک۔ آ رو میں۔

(دروازہ دو بار کھٹکھٹاتے۔ مجمع کے بڑھنے کی آواز)

شمسو: (دروازہ کھولتے ہیں) کیا ہے۔ کون لوگاں ہیں آپ سب؟ سب کائیکو آئے۔

(آٹھ دس لوگوں کی بات چیت کی آواز)

پولس والا: ہم نے سنا آپ کے پاس کوئی مہمان ٹھہرا ہے۔ اسے ہمارے تھانے چلنا ہوگا۔ اس کا پاسپورٹ دکھلیے۔ (دھیرے) سو دیڑھ سو میں کام بن جائے گا۔

رپورٹر لڑکی: مسٹر شمس الدین (دھیرے) میں اخبار کی رپورٹر ہوں۔ آپ کے پاس آئے ہوئے مسافر سے انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔ میں بس پانچ منٹ لوں گی۔

شمسو: یہ کیسے لیکو کان کھا رئیں۔ میرے کو ٹینشن کرنا ہے ظلم و ستم میرا کام

ٹی وی کا پروڈیوسر: ٹیلی ویژن کی طرف سے آئے ہیں

ہم لوگ۔ یہ بیسوی صدی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے
کہ خلا سے کوئی زمین پر آیا۔ ہم ساری دنیا کو
بتائیں گے کہ بھارت نے کتنی ترقی کی ہے کہ خلا
سے یہاں لوگ آنے شروع ہو گئے ہیں۔

رپورٹر لڑکی : مسٹر شمس الدین آپ وہ خوش قسمت انسان
ہیں جس کے گھر سب سے پہلے خلا سے کوئی آیا
ہے۔ آپ اپنا پورا نام عمر اور خاندان کے بارے
میں کچھ بتائیے۔ اتنا تو میں جانتی ہوں آپ
برسوں Space city ہیوسٹن میں رہ
چکے ہیں اور آپ کے والد کو خان بہادر کا
خطاب ملا تھا۔

زینب : (دھیمے) باوا کا نام کا ٹیکو اچھال رہئے یہ
چھوکری۔ میرے کو اتا معلوم فلمی بھرت ایچی
کرتے تھے باوا۔ اور تم تو مغل پورے سے آگے
بی نہ گئے نئیں۔

شمسو : جاؤ تم اندر جاؤ۔ دیکھتے نیں بھیڑ بڑھتے جارئیے۔

ریسرچر : (کھنکار کر) سنیے بڑے میاں۔

شمسو : کیا بولا ؟

ریسرچر : سنیے جناب میں غذائیت پر ریسرچ کر رہا
ہوں۔ سنا آپ کے پاس جو مہمان ٹھہرا ہے
وہ برسوں بغیر کچھ کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہے۔
اس کرشمے کی خاطر ہمارے ملک کو بہت
ضرورت ہے جہاں اکثر لوگ بھوکے رہ کر
بس چند ہی دنوں میں دم توڑ دیتے ہیں۔ میں
ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

ناول نگار خاتون : سنیے میرے قابلِ تعظیم بزرگ۔
میں ایک ادیبہ ہوں۔ یہاں کوئی کم بخت پبلشر
میرا ناول چھاپنے تیار نہیں۔" میں نے "مُٹے سال
کا تحفہ" نام سے ایک ناول لکھا ہے۔ اس
میں خلا میں چھپوانا چاہتی ہوں۔ یہ مسودہ میں
Space man کو دینے کے لیے آئی ہوں
خدارا اس سے ملوا دیجیے۔

(کار کے آنے کی آواز)

سیکیورٹی کا آدمی : ہٹو ہٹو ـــــ دور اور دور،
منتری جی کے لیے جگہ چھوڑو۔ کمانڈو سنیے
تم ان سب کی تلاشی لو ـــ بم، چاقو، دانت
میں کرنے کا خلال تک مت چھوڑو ـ آئیے
آئیے منتری جی ـــــ چبوترے پر سے ہٹ
جاؤ بڑے میاں ـــــ منتری جی آئیے،
پدھاریئے۔

منتری : نمسکار، آداب ـــ پیارے بھائیو اور بہنو
ـــــ میں آپ سب کو نئے سال کی مبارک
باد دیتا ہوں اور اس صدی کے چمتکار کی
بھی جو ہمارے ساتھ انترکش سے ہوا ہے۔
آپ سب جانتے ہیں میں زیادہ لمبے بھاشن
دینا پسند نہیں کرتا۔ اب بس اتنا کہوں گا کہ
اپنے علاقے میں میں نے آپ سب کے لیے
وہ وہ کام کر دکھائے کہ ان کی شہرت
ہماری اس زمین پر تو کیا آسمان تک جا پہنچی
ہے۔ اس لیے اب ہمارے پاس انترکش
سے مہمان آنے شروع ہو گئے۔ میں آپ سب
سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے نئے سال یہاں
کے لیے ایک کالونی بن کر تیار ہو جائے گی۔
آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے پچھلے نئے سال
یہی وعدہ کیا تھا۔

ایک آواز : ہاں، ہاں، تیرے وعدے ایسے ہیں ہم تو یہ

جان چھوٹ جاتا۔

منتری: اب آپ سب کی اجازت سے انتر کشش کے اس مہمان کو لے جانے کے لیے میں ایک پنجرہ ساتھ لایا ہوں۔ کیوں کہ میرے پریوار کے سب لوگ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

سائنس داں: منتری جی اس کا حق ہمیں ملنا چاہیے۔ ہم دونوں سائنٹسٹ ہیں۔ ہم خلا سے آئے ہوئے اس مسافر کو اپنی لیباریٹری میں لے جانا چاہتے ہیں تاکہ اس کی جانچ کریں۔ اس کی اصلیت کا پتہ چلائیں۔

منتری: (ڈپٹ کر) نہیں پہلے میری پتنی اور میرے بچے اس کے ساتھ فوٹو لیں گے۔ ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنا مقدمہ آگے بڑھاتا ہے)

اشتراکی: بگھس پرٹو اندر۔ کب تک سرمایہ داروں کے ظلم و ستم برداشت کروگے۔ انقلاب زندہ باد ––– اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔

مجمع: انقلاب زندہ باد ––– (آگے بڑھنے کی آواز)

شمسو: اب میں کیا کروں ––– میرے نام کو بٹہ لگ جائیگا لیکن کچھ تو بی نہیں ہوا تو۔

زینب: کدھر کو بھاگ رہا ہے دیکھو۔ یہ سب لوگاں ہاتھ دھو کو اس کا پیچھا کر رہیں۔

مجمع: پکڑو ––– دیکھو وہاں مٹکے میں چھپا ہے۔ نہ دیکھو دیوار پر چپک گیا ہے۔ نہیں نہیں چھت سے لٹک رہا ہے۔

مسافر: بس بہت ہو چکا۔ الوداع ––– الوداع ––– اب تم دونوں بھی پرانے سال کو الوداع کہو۔ تمھیں نیا سال مبارک ہو۔

(دھماکہ ہوتا ہے)

مجمع: دیکھو دیکھو وہ گیا۔ گیا ––– روشنی تھی؛ نہیں اڑن طشتری تھی۔ اس بڈھے کو پکڑو۔ اسی نے اسے غائب کر دیا۔ بتاؤ۔ بتاؤ کون تھا؟

شمس الدین: (متانت سے) دوست تھا ––– نئے سال کی مبارک باد دینے آیا تھا!

(موسیقی)



اس زمانہ میں لوگوں کو پتا تھا کہ ڈھانچہ کیسے تیار کیا جائے!

مچھر دان [illegible]

نعیم زبیری

مچھر دان اِس دور کی سب سے زیادہ اہم ایجاد ہے۔

مچھر دان اس لئے کہ مچھر کو اور کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا ـــــ بلکہ سُنا ہے کہ نئے زمانے کا مچھر تو تقریباً Drug addict ہو گیا ہے ایک زمانہ تھا کہ آپ DDT کا ایک ٹن اور سپرے گن گھر لاتے تھے تو مچھروں میں ایک کھلبلی مچ جاتی تھی اور چھڑکاؤ سے پہلے ہی پہلے گھر خالی ہو جاتا تھا ـــــ لیکن موجودہ زمانے کا مچھر پڑھ لکھ گیا ہے اور اپنے تحفظ کے بارے میں اس نے بھی غالباً کوئی ایسا بندوبست کر لیا ہے کہ اب دواؤں کا چھڑکاؤ بھی اسی طرح بے اثر ہو گیا ہے جیسا طلبائے کے جلوس پر اشک آور گیس ـــــ

چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی عادات و اطوار اور رہن سہن کے تعلق سے کافی ریسرچ کی گئی ہے لیکن یہ کیسا تعصب ہے کہ مچھر دان کے تعلق سے ایسی کوئی تحقیقات سامنے نہیں آئی ہیں کہ میری رائے میں مچھر کے متعلق بھی اس زاویئے سے کوئی ریسرچ ضرور ہونی چاہیئے ـــــ ویسے بھی ریسرچ کے لئے topics کی کمی ہو گئی ہے ـــــ میرا مطلب سائنس والوں کی ریسرچ سے نہیں بلکہ سماجیات یا ماحولیات کے نقطۂ نظر سے ہے ـــــ مجھے یقین ہے کہ اُس مچھر میں جس نے تو تنخ امن کو کاٹا ہوگا ـــــ اور اس مچھر میں جو این ٹی راما راؤ کو کاٹتا ہے بڑا فرق ہوگا۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مچھروں کی عادات و اطوار میں کوئی نہ کوئی فرق آیا ہی ہوگا ـــــ ایک فرق تو میں نے خود اپنی زندگی میں محسوس کیا ہے۔ بچپن میں جب اندھیرے رُوشنیوں سے زیادہ ہوتے تھے ـــــ مچھروں کے غول آپ کے بیڈ روم میں گھس آتے تھے اور ایک عجیب قسم کی ہموار موسیقی ان کی آمد کا پتہ دیتی تھی ـــــ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس موسیقی میں اور آج کی موسیقی میں جو جدید مچھر پیدا کرتے ہیں بیّن فرق آیا ہے ـــــ اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ کل کا مچھر بڑے غلام علی خاں کو کاٹتا تھا اور کلاسیکی موسیقی سے متاثر ہوتا تھا ـــــ اور آج کا مچھر پاپ سنگر کو کاٹ کے "Rap" سے متاثر ہے ـــــ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ لائٹ آف کر کے ـــــ نئے زمانے کے مچھروں کی موسیقی سنیئے۔ آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ آج کا مچھر بھی MTV سے متاثر ہے ـــــ میرا خیال ہے کہ تحقیقات پر پتہ چلے گا کہ مچھر بھی ایک نہایت ذہین مخلوق ہے اور اس کے پاس بھی بدلے کی وہی بھاؤنا ہے جو نسل کے ہیرو کے ہاں اُسی ویلن کے

خلاف ہوتی ہے جس نے کبھی اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ لیکن مچھروں کے بعض group [illegible] نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ اس source ہی کو ختم کر دیا جائے جس کی وجہ سے اسے ہلاک کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں یعنی انسانی دماغ چنانچہ حالیہ چند دنوں میں لوگ مچھر کے کاٹنے سے دماغی بخار سے مرنے لگے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ پوچھیں کہ عام طور پر دماغی بخار سے بچارے دیہاتی ہی زیادہ مرتے ہیں اور ان معصوموں کی جان لے کے مچھروں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان مچھروں نے فرقہ پرستوں کو کاٹا ہو گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دماغی بخار پیدا کرنے والے مچھروں کے دستوں کو فی الحال تجرباتی طور پر دیہاتوں میں بھیجا گیا ہے۔

میں نے کبھی کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ میرے ہاتھ پر یا سینہ پر بیٹھا ہوا مچھر عجیب لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں آگے بڑھ رہا ہے تو پتہ چلا کہ وہ پڑوس سے آیا ہے جہاں نیا سال منایا جا رہا تھا۔ بہرحال میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ احساس دلاؤں کہ مچھروں کے رویہ کی طرف ریسرچ اسکالرز کی توجہ مبذول کرواؤں۔

میرا موضوع — مچھر دان ہے۔ میں اس شخص کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے مچھر جیسی جارح اور دار پر چڑھ جانے والی مخلوق کے خلاف مچھر دان جیسا ہتھیار ایجاد کیا تھا۔ اس لئے کہ مچھروں کے خلاف جب ساری دوائیں — ساری خوشبوئیں اور عطریات ناکام ہو جاتی ہیں تو صرف مچھر دان کام آتا ہے۔ یہاں بھی صرف اسی وقت جب مچھر دان میں خود کو محصور و محفوظ کر لینے سے پہلے آپ یہ اطمینان کر لیں کہ یہ ظالم اپنے گروہ کے ساتھ اندر کسی کونے میں چھپا ہوا شب خون مارنے کا منتظر تو نہیں ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جنھوں نے ایک جمبو سائز مچھر دان آرڈر دے کے تیار کروایا ہے جس میں وہ اپنی بیوی اپنی اولاد اپنے T.V کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور مچھر اس قلعے کے باہر ہی تڑپتے ترستے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ دسترخوان اسی مچھر دانی قلعے کے اندر بچھا دیا گیا تھا۔ مجھ سے [illegible] مچھر دان کو الٹ کے جلدی سے اندر آنے کے لئے کہا گیا — اور میرے داخلے سے پہلے دونوں میاں بیوی سب بچے مجھ پر جھپٹنے کے لئے اسی طرح تیار ہو گئے جیسے بلی چوہے پر جھپٹنے کے لئے پوزیشن لیتی ہے — معلوم ہوا کہ جیسے ہی قلعے کا دروازہ کھلے گا — دشمن کی فوج اس میں داخل ہو جائے گی۔ بہرحال ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ اس خاندان نے مچھروں سے لڑنے کا طریقہ ایجاد کر ہی لیا ہے۔

میں ذرا مچھر دان کے تعلق سے نفسیاتی مریض ہوں — مچھر دان میں گھسنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں قبر میں ہوں جو تنگ ہوتی جا رہی ہے — اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ یاجوج اور ماجوج کی طرح مچھر کونوں میں سے نکل آتے ہیں ایک زمانے میں مچھر ملیریا کے specialist مانے جاتے تھے۔ لیکن آج کل انہوں نے کئی دوسرے شعبوں میں مداخلت شروع کر دی ہے اور تقریباً دو قسم کا بخار پیدا کرنے کے ماہر ہو گئے ہیں۔

مچھروں سے لڑنے کا ایک دوسرا طریقہ جو حالیہ برسوں میں ایجاد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے بچے سخت ترین سردی کے عالم میں فین کھول کے اور پھر سر تک بلانکٹ اوڑھ کے سوتے ہیں۔ ادھر کسی وجہ سے فین بند ہوا اور ادھر ان کی نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ میرے ایک دوست نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ انہوں نے فین کی آواز کو ریکارڈ کر لیا ہے — اور وہ فین بند کر کے اپنا ریکارڈ آن کر دیتے ہیں اور بچے یہ آواز سنتے ہوئے سوتے رہتے ہیں — اور نمونیا کا خطرہ نہیں رہتا۔

مچھروں کی لاکھ مذمت کی جائے ۔ لیکن یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ وہ قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور بلا لحاظ مذہب و ملت سب کو ایک ہی طرح سے کاٹتے ہیں ۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ پنڈت جی ان کے حملے کی زد میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ آتے ہیں کیونکہ وہ ننگے رہتے ہیں ۔ خود کردہ را علاج نیست ۔ مچھروں پہ فرقہ پرستی یا اقلیتوں کے appeasement کا الزام لگانا تو کوئی معقول بات نہیں ہوگی۔

بہر حال میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی فوراً ایک مچھر دان خرید لیجئے اور مچھروں سے محفوظ رہیئے ۔ یا پھر مچھروں سے کٹواتے رہیئے اور رات بھر جاگ کے شاعری کیجئے کیونکہ دوسرا کچھ کرنے سے تو آپ معذور رہیں گے ۔

--

واجد ندیم
(شکاگو)

قصہ داڑھی کا

نوٹ: مضمون نگار کا داڑھی والا ہونا ضروری نہیں لیکن مضمون پڑھنے کے لیے قاری کا داڑھی والا ہونا ضروری ہے۔

قصہ کیا تھا . . . . . بس ایک روز صبح سو کر اٹھے تو داڑھ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ ہم نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی اور کام پر چلے گئے۔ دن تو کام کاج اور مصروفیت میں گزر گیا۔ لیکن شام سے پھر درد ہونے لگا۔ اپنا ملک ہوتا تو کسی ڈاکٹر کو دکھاتے یا کسی حکیم یا وید سے دیسی نسخہ لکھواتے . . . . . لیکن پرایا ملک اور انجانے لوگ . . . . نہ ہم کسی ڈاکٹر کو جانتے تھے نہ کسی ڈاکٹر نے یہاں ہماری نبض دیکھی تھی۔ پھر ہم نے دو ایک دوستوں کو فون کیا تو جواب ملا کیا کھال کھنچوانی ہے . . . . ویسے ہی علاج یہاں مہنگا ہے . . . . اور پھر دانتوں کا . . . . . بس بھول جاؤ" ہم نے کہا، "ہم تو بھول جانا چاہتے ہیں لیکن درد کی ٹیسیں یاد دلا دیتی ہیں کہ ہم بھی منہ میں دانت رکھتے ہیں" پھر کسی نے مشورہ دیا ایک آدھ ہفتہ آرام کر لو . . . . . بس ٹھیک ہو جاؤ گے۔ واہ کیا علاج تھا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ ہم نے چار و ناچار اسی مشورہ پر عمل کیا۔ آخر درد کب تک ہوتا۔ ایک نہ ایک دن تو آرام ہونا ہی تھا یعنی یوں سمجھیے کہ ہم غالب کے اس مصرعے کی تفسیر بن گئے "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" چنانچہ چار چھ دن میں درد اپنی حدوں سے گزر گیا اور ایک رات ہمیں نیند آ ہی گئی اور پھر

صبح اٹھے اور چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ منہ کے اندر تو داڑھ تھا اور اب باہر داڑھی ہے۔ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو پتہ چلا کہ چہرے پر اچھا خاصہ سبزہ اگ آیا ہے۔ درد بڑی حد تک کم تھا پھر بھی ہم نے مناسب سمجھا کہ وہ چلہ روزانہ کام کیا جائے اور اس مدت میں درد گھٹتا گیا اور داڑھی بڑھتی گئی اور اب اس قدر بڑھ گئی کہ بڑھ کر ہماری بیگم کے ہاتھوں سے نکل گئی اور وہ ہماری بڑھی ہوئی داڑھی دیکھتیں اور ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔ ورنہ بقول مولانا حالی کے بدلے سارٹھی دینی پڑتی۔ ہماری داڑھی اس قدر بڑھی کہ بیوی تو پھر بیوی ہے اوروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ ایک دن پڑوسن ہماری بیگم سے کہنے لگی "تمہارے میاں نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ بیگم تو ویسے ہی ہم پر غار کھاتی بیٹھی تھیں۔ اس پر پڑوسن کے ریمارک نے آگ پر تیل کا کام کیا اور بیگم نے جھلا کر جواب دیا "آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ . . . . . . ہمارے میاں کی داڑھی ہے . . . . . . کہیں آپ کو تو نہیں چبھتی؟" بس وہ دن اور آج کا دن ہم ایک عدد داڑھی کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں اس طرح "بڑھ گئی داڑھی بات کچھ بھی نہ تھی"۔

ایک دن ہم . . اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ آواز دی تو ان کا چار پانچ سالہ لڑکا باہر آیا۔ ہم پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور اندر بھاگ گیا۔ ہم یہ سوچتے رہ گئے کہ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے" یہ وہ لڑکا تھا جو ہم کو دیکھ کر چاچا کہہ کر ہماری گود میں آجاتا اور آج . . . . یوں ہم سے بے رخی برت رہا تھا۔ سوچتے سوچتے ہم نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ یہ تو سب ہماری داڑھی کی کرامت تھی خدا جانے کرامت تھی کہ یہ دہشت کہ لڑکا ڈر کر اندر بھاگ گیا۔ اتنے میں اندر سے لڑکے کے بولنے کی آواز آئی۔ لڑکا کہہ رہا تھا "امی کوئی داڑھی والا ہے ابا جی کے لیے"۔ یہ سن کر ہم اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔ بس چلتا تو داڑھی کو چہرے سے الگ کرتے اور لڑکے سے کہتے "بیٹا ہم تو وہی تمہارے چاچا ہیں" آج ہمیں پتہ چلا کہ ہم نے داڑھی کیا پالی کہ ہماری شخصیت میں سوائے داڑھی کے اور کچھ نہیں رہ گیا۔ ہم صرف داڑھی والا ہو کر رہ گئے۔ اتنے میں ذرا سا دروازہ کھلا اور کسی نے جھانکا . . . . پھر بولنے کی آواز آئی "کہہ دو ابا گھر میں نہیں ہیں"۔ یہ تو ہماری بھابی کی آواز تھی جو ہمیشہ چائے بسکٹ سے ہماری تواضع کرتیں لیکن آج ہم نے داڑھی سے کیا وفا کی کہ ساری دنیا ہم سے بے وفا ہو گئی۔ اپنے پرائے اور جانے ان جانے بن گئے۔ ہم سوچنے لگے کہ کاش ہمارے دشمن اور قرض خواہ بھی اسی طرح ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیں۔

یہ تو ہم نے ہندوستانی فلموں میں دیکھا ہے کہ ویلن نے چہرے پر داڑھی لگائی اور جیسے ساری دنیا سے روپوش ہو گیا اور کمال ہے سوائے تماشائیوں کے اور کوئی اسے نہیں پہچانتا۔ نہ ہیرو اسے پہچانتا ہے اور نہ پولس۔

پھر ایک مرتبہ یہ ہوا کہ کسی کا پتہ پوچھتے پوچھتے ایک دروازے پر کھٹکا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے کی جھری میں سے کسی نے جھانکا اور پھر آواز آئی "معاف کرو بابا اس وقت گھر میں کچھ نہیں"۔ اب ہمارے پاس سوائے داڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور کیا رہ گیا تھا۔ بہت دن کے بعد ہمارے ایک دوست راستے میں مل گئے۔ پہلے تو ہمیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر کہا "اچھا تو آپ ہیں . . . . . . یہ داڑھی آپ نے کب سے چھوڑ دی ہے" ہم نے کہا "چھوڑی کہاں ہے بھائی پکڑ لی ہے"۔ پھر ہم خود ہی سوچتے رہ گئے کہ ہم نے داڑھی پکڑ لی ہے یا داڑھی نے ہمیں پکڑ لیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو اب ہم مع داڑھی ہی کہیں آتے جاتے ہیں اور وہ سہولت

ہمیں نہیں تھی جو اوقات وطن کی تھی۔ سنتے ہیں کہ کبھی وہاں مسجدوں میں ٹوپیوں کے ساتھ داڑھیاں بھی لٹکی رہتی تھیں امام صاحب مسجد میں داخل ہوتے کھونٹی سے داڑھی اتار کر اپنے چہرے پر سجالی، پھر اسی طرح گزرے داڑھی پہن کر جیسا جیسے ان کی اپنی ہو بجر پڑھے ہیں خشوع و خضوع سے امامت کے فرائض انجام دیتے۔ بعد نماز چہرے سے داڑھی اتار کر اور بڑے عقیدت سے چوما، آنکھوں سے لگایا اور دیوار سے لٹکا کر چلے گئے۔ ہمارا بس چلے تو تمام قسم قسم کی داڑھیاں لٹکا دیں تاکہ ہر کوئی اپنی پسند اور ناپسند کا حق رہے اور آدمی ایک ہی قسم کی داڑھی پر مجبور نہ ہو جائے۔

غالباً کبیر داس کے زمانے میں داڑھی مونڈھنے کا رواج نہیں تھا۔ اور اگر لوگ داڑھی رکھنے کو چھوڑنا کہتے تو ان کو اپنے دوہوں میں چلتی کو گاڑی کہے رتی کو نارنگی" کے ساتھ " پکڑے کو چھوڑنا کہے" کا بھی اضافہ کرنا پڑتا۔ وہ بھی کیا زمانہ رہا ہوگا کہ ہر طرف داڑھیاں ہی داڑھیاں نظر آتی ہوں گی۔ چھوٹی، بڑی، اونی، خشخشی، چگی، فرنچ وغیرہ وغیرہ۔ عورت اور مرد میں بڑی آسانی سے تمیز ہوتی ہوگی اور اب تو بال، چال، ڈھال، لباس سب میں یکسانیت آگئی ہے۔ Equality کا اس قدر بول بالا ہے کہ جنس کو بھی اس قدر یکساں کر دیا ہے کہ عورت اور مرد میں تمیز مشکل سے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ حجام اپنی دکانوں پر Unisex کے بورڈ لگاتے ہیں۔ اللہ بھلا کرے لارڈ کرزن کا جو کسی زمانے میں ہندوستان کا وائسرائے تھا اور داڑھی صفا کرنے میں ماہر...... جیسا حاکم ویسی رعایا...... رعایا نے بھی اس کی تقلید میں داڑھیاں مونڈھنی شروع کر دیں۔ اس طرح اس نے بر صغیر کے پہلے ہی داڑھی مونڈھ کر Gentleman کے زمرے میں بدل دیے تھے۔ جبھی تو علامہ اقبال نے کہا تھا " کر دیا کرزن نے زن مردوں کی صورت دیکھیے "۔ بہرحال داڑھی رکھنے یا چھوڑنے کے بعد جو بھی ہم سے ملتا ہماری تعریف کے گن گاتا۔ "پرنم بھی نیک قدم اٹھایا ہے آپ نے " بھئی بہت اچھا ہوا۔ ایک سنت کی تکمیل ہوگی۔" وغیرہ وغیرہ۔ داڑھی والے ایسا کہتے تو ٹھیک بھی تھا۔ داڑھی منڈے بھی کہنے لگے تو ہم سوچ میں رہ گئے کہ آخر ان کو کس نے روکا ہے۔ روزانہ جب بیٹھے کہ ہم داڑھی کا قلع قمع کرنے کی سوچتے تبھی سارے جملے ہمارے کانوں میں گونجنے لگتے اور ہمارے ہاتھ خوف سے خود بخود رک جاتے اور اس طرح ہماری داڑھی بڑھتی گئی اور مولانا کی کہی ہوئی بات درست نظر آنے لگی۔ " میاں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے بیٹھے رہو۔ داڑھی خود بخود بڑھتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا " داڑھی مونڈھنے میں تو پھر بھی محنت لگتی ہے اور داڑھی رکھنے میں تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا اور پھر بہت الگ اور ہم نے دیکھا کہ داڑھی رکھنے سے داڑھی جانا بیسٹ کا خرچ بچ گیا تھا اور پھر ہم جب بے فکری الگ تھی۔ ہم نے تو بعض ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جو اسی کی فکر میں بات ہی بات میں داڑھی بڑھا لیتے ہیں۔

داڑھی رکھنے کے بے شمار فائدے بتائے جاتے ہیں جو آہستہ آہستہ ہم پر کھلتے جا رہے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ جو بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ داڑھی بڑھانے سے زندگی بڑھتی ہے کا سب سے پہلا تجربہ یوں ہوا کہ ایک دن داڑھی والے دوستوں سے بہت اکتا گئے تو ہم نے سوچا کہ یوں کرکے ابھی سی ختم کرتی جائے۔ اب ہم ہال کے سامنے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ ہمارے ایک جان پہچان والے مل گئے اور ہمیں دیکھ کر حیرت سے بولے " اچھا تو آپ بھی چلے آئے ہیں داڑھی کے " یہ سن کر ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ہم نے داڑھی کیا کیا داڑھی ترقی کا کمال ہی کر گئی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں کرنے دیتی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ظلم کیجئے کے لیے ہم داڑھی

کو کہاں رکھاتے۔ جس طرح لوگ بچوں کی "بے بی سٹنگ" کرواتے ہیں اسی طرح داڑھی والے "داڑھی سٹنگ" کراتے۔ اب ہم کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ فلم کے لیے داڑھی کو چھوڑا جائے یا داڑھی کے لیے فلم کو۔ اور ہم نے داڑھی بچانے کے لیے فلم کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح داڑھی جرائم سے روکتی ہے یہ بات ہماری سمجھ میں آئی۔ لیکن یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ داڑھی کس طرح ایک چلتی ہوئی بائیسکل روک سکتی ہے۔ جب ایک داڑھی والے سیکل سوار نے کسی کو ٹکر دے دی تو اس نے غصہ سے کہا "آپ کو شرم آنی چاہیے داڑھی رکھ کر ٹکر دیتے ہیں" تو اس پر داڑھی والے نے جھنجھلا کر کہا تھا "میاں یہ میری داڑھی ہے سیکل کا بریک نہیں"۔

دنیا میں قسم قسم کی داڑھیاں نظر آتی ہیں۔ "جتنے منہ اتنی باتیں" کے بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جتنے منہ اتنی داڑھیاں۔ بے حد لانبی اور بھرپور اور نہایت بے ترتیبی سے اُگی ہوئی جسے ہاتھ لگانا شاید گناہ سمجھا جاتا ہے اور اپنی مرضی سے اگنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسی داڑھی میں چہرہ کم دکھائی دیتا ہے اور داڑھی زیادہ۔ دور سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے داڑھی چلی آرہی ہے۔ ایسی داڑھی ... عموماً سادھوؤں اور فقیروں کی ہوتی ہے۔ ایک ہوتی ہے شرعی داڑھی نہ بہت لانبی نہ بہت چھوٹی۔ اس کی لمبائی اتنی ہوتی ہے کہ پکڑو تو مٹھی میں آجائے تاکہ کسی بھی غلطی پر آسانی سے پکڑا جاسکے۔ ایسی داڑھی سلیقے سے کٹی ہوتی ہے اور مونچھوں سے بے نیاز۔ ... مولویوں اور ملاؤں کی ہوتی ہے۔ ایک ہوتی ہے فرنچ کٹ جو صرف ٹھوڑی پر ہوتی ہے۔ بالکل مختصر اور نوکیلی۔ اس کو مارشل بلگانن کی داڑھی بھی کہتے ہیں۔ عرب کے شیخوں میں اس کا بہت رواج ہے۔ اس لیے اسے شیخوں کی داڑھی بھی کہا جاتا ہے۔ یہی داڑھی اگر ٹھوڑی پر لانبی ہوجائے تو اسے جگّی داڑھی کہتے ہیں۔ یہ بوکرڑ کی داڑھی یا چینی داڑھی بھی کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک داڑھی ہوتی ہے جو ٹھوڑی پر تو صاف ہوتی ہے لیکن گالوں پر گچھے ہوتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اس کا بہت رواج تھا۔ حیدرآباد کے نظام .... نواب میر محبوب علی خاں ایسی ہی داڑھی رکھا کرتے تھے۔ ایک اور داڑھی ہوتی ہے ...... خشخشی ...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چار چھ دن سے shave نہیں کیا۔ اس کا بعض مشائخین اور مجاورین میں رواج عام ہے۔ سالانہ عرس سے آٹھ دس دن پہلے رکھ لی اور عرس کے اختتام کے ساتھ ہی مونڈ دی۔ اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں "خشخشی داڑھی سے صفائی بہتر"۔ ایک اور داڑھی ہوتی ہے جو ٹھوڑی پر تو صاف ہوتی ہے لیکن قلموں سے شروع ہو کر مونچھوں میں مل جاتی ہے۔

اب تو لوگ داڑھی کی تراش خراش کرکے مختلف اقسام کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب لوگ اپنے گالوں پہ ہاتھی گھوڑے بنانے لگیں۔ جیسے پارکوں اور باغوں میں جھاڑیوں کو ...... خراش کر بنایا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں جب کہ جاگیردارانہ نظام تھا کہا جاتا تھا کہ فلاں کی حویلی پر ہاتھی جھولتے ہیں اب کہا جائے گا کہ فلاں کے گالوں پر گھوڑے ہنہناتے ہیں۔

داڑھیوں کو رنگنے کا بھی بڑا رواج ہے۔ جہاں اللہ میاں نے اپنی قدرت سے داڑھی کا رنگ سیاہ

سے سفید کیا تو بندے نے بھی اپنی قدرت سے اسے مختلف رنگ دے دیئے۔ اللہ نے ایک رنگ دیا تو بندے نے کئی رنگ دے دیئے۔ کہیں خضاب سے کالا کیا جا رہا ہے تو کہیں رنگ لگا کر گلابی اور کہیں مہندی لگا کر لال۔ ابھی امریکہ والوں کو نہیں سوجھی ورنہ جیسے کپڑے ویسی داڑھی کا رواج شروع ہو جائے۔ جس طرح یورپ کی عورتیں اپنے بال لباس کے لحاظ سے رنگواتی ہیں۔ اس طرح مرد بھی داڑھیاں رنگوانے لگیں۔ پیلا سوٹ ہو تو پیلی داڑھی۔ سبز ہو تو سبز اور لال ہو تو لال۔

ہمارے ملک میں داڑھیوں کی بہت عزّت اور توقیر کی جاتی ہے۔ اگر کہیں اپنے ملک میں داڑھی رکھ لیتے تو ہماری بے حد عزت ہوتی۔ کوئی مولانا کہتا، کوئی مولوی اور کوئی ملّا جی ؟ ...... پڑوسی ہم سے اپنی مرغیاں ذبح کرواتے ہیں اور جہاں کہیں نذر و نیاز ہوتی تو ہم کو فاتحہ پڑھنے کے لیے بلایا جاتا۔ چاہے ہم کچھ بھی پڑھیں، داڑھی کے ساتھ منہ ہلانا کافی ہے ...؟... دعوت یقینی۔

ایک دن مع داڑھی کے ہم اپنے پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمارے حلیہ کو دیکھا...... خوش ہوئے اور ہماری ہمت افزائی کی۔ کیوں کہ وہ ہمیں اور ہمارے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے...... آخر وہ ہمارے پیر و مرشد تھے۔ ان کی ہمت افزائی پر ہم نے سوچا کہ اپنے پیر سے کیا چھپانا، صاف صاف بتا دیا کہ یہ داڑھی داڑھی کی برکت و عنایت ہے۔ پیر صاحب یہ سن کر مسکرائے اور ایک واقعہ سنایا کہ کسی نے ایک مکان بنایا اور جب مکان بن کر تیار ہو گیا تو اس کے افتتاح کے لیے کسی بزرگ کو دعوت دی۔ بزرگ نے مکان گھوم پھر کر دیکھا اور جب دیوان خانے میں تشریف لائے تو کھڑکی کو دیکھ کر کہا کہ یہ بڑے ہی موقعہ سے لگوائی ہے۔ اس پر مالک مکان نے خوش ہو کر کہا "جی ہاں روشنی اور ہوا کے لیے بنوائی ہے۔ بڑی اچھی ہوا آتی ہے اس رُخ سے" اس پر بزرگ نے بگڑ کر کہا۔ اے نادان اگر یہ کہہ دیتا کہ ادھر مسجد ہے اور کھڑکی اس لیے لگوائی ہے کہ اذان کی آواز آئے تو تجھے اس کا ثواب ملتا۔ رہا روشنی اور ہوا ...... وہ تو ویسے بھی آتی۔

یہ اشارہ تھا پیر صاحب کا ہمارے لیے کہ ہم بھی اپنی نیت کی تجدید کر لیں اور صحیح کر لیں۔ اب تو ہم یہی دعا کرتے ہیں کہ جیسے تیسے ہم نے داڑھی کو اپنایا ہے اب داڑھی بھی ہمیں اپنا لے۔ ○○



ڈاکٹر صاحب ایکسیڈنٹ سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی ان پٹیوں سے ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محبوب راہی

اردو کے دشمن

اعلان پہ رہتے ہیں نہ وہ زیر زمیں ہیں · بستے ہیں اسی دیش میں رہتے وہ یہیں ہیں
اس گھر کے جو بدخواہ ہیں اس گھر کے مکیں ہیں · اردو کے جو دشمن ہیں کوئی اور نہیں ہیں
اردو کے پرستار ہی اردو کے ہیں دشمن

بیٹھے بجا ہیں اردو جو بولتے بھی ہیں اردو · جو اوڑھتے ہیں اور بچھاتے بھی ہیں اردو
پڑھتے بھی ہیں اردو جو پڑھاتے بھی ہیں اردو · اردو ہی کماتے ہیں جو کھاتے بھی ہیں اردو
اردو کے نمک خوار ہی اردو کے ہیں دشمن

جوتے کبھی کپڑے تو کبھی ہار خریدیں · اوقات سے کچھ بڑھ کے کئی بار خریدیں
توفیق نہیں ان کو کہ اخبار خریدیں · اردو کی کتابیں کوئی دو چار خریدیں
وہ سارے خریدار ہی اردو کے ہیں دشمن

کرتے ہیں سر بزم کچھ حرکات عجب جو · خود اپنی ہی رسوائی کا بنتے ہیں سبب جو
اشعار سناتے ہوئے ڈھاتے ہیں غضب جو · کرتے ہیں ہر اک شعر کا نذرانہ طلب جو
وہ شاعر و فنکار ہی اردو کے ہیں دشمن

بے تاج شہنشاہوں پہ جن کا ہے گزارا · دولت کی پناہ گاہوں پہ جن کا ہے گزارا
اردو کی چراگاہوں پہ جن کا ہے گزارا · شہرت نما افواہوں پہ ہے جن کا گزارا
شہرت کے طلب گار ہی اردو کے ہیں دشمن

فٹ پاتھوں پہ اردو کے وہ چلتے ہوئے اخبار · کندھوں پہ جو نعروں کے اچھلتے ہوئے اخبار
جذبات کو شعلوں میں بدلتے ہوئے اخبار · ہر سانحہ رسالات میں ڈھلتے ہوئے اخبار
اردو کے وہ اخبار ہی اردو کے ہیں دشمن

اردو کی بدولت جنہیں آیا ہے قرینہ · پتوار سے اردو کی چلاتے ہیں سفینہ
اردو ہے جنہیں قیمتی دولت کا دفینہ · اردو کو بناتے ہیں ترقی کا جو زینہ
اردو کے وہ سب یار ہی اردو کے ہیں دشمن

مکار ہیں جھوٹے ہیں وفا بند ہیں بدخو · ہاتھوں پہ تھما دیتے ہیں جو وعدوں کے جگنو
جیسے وہی دنیا میں ہوں اردو کے ہی ... · ہر دم غم اردو میں بہاتے ہیں جو آنسو
اردو کے وہ غم خوار ہی اردو کے ہیں دشمن

شکیل اعجاز
(اکولہ)

چل میرے دل لہرا کے چل

کار: ماروتی Omni

اقبال سنگھ: پہلوان قسم کے آدمی۔ عادتوں کے ٹھیکے دار۔ بات بات پر زندگی سے بھرپور قہقہہ لگانے والے۔ چاروں دوستوں میں سب سے سینئر۔

ماہیت: گورے چٹے۔ گول مٹول۔ سیدھے سچے۔ صاف ستھرے آدمی۔ چہرے سے نہایت پروقار۔ گاڑی کے مالک۔ دوستوں نے ان کو سرداری دے رکھی ہے۔

مسرور: سانولا رنگ۔ درمیانہ قد۔ بے حد خراتی۔ اس سفر میں کار چلانے کی ذمہ داری انہی کو دی گئی ہے۔

دیپ: عمر میں سب سے چھوٹا۔ قد میں سب سے چھوٹا۔ سب کا چہیتا۔ تصویریں بنانے کا شوقین۔

٥

گاڑی میں سامان رکھ دیا گیا ہے۔ سوٹ کیس اوپر باندھ دیئے گئے ہیں۔ فادر نے کہا اوپر کا سامان برابر بندھا ہوا نہیں ہے۔ اقبال سنگھ بولے مسرور کے گھر سے بھی سامان لینا ہے وہیں مسرور مضبوطی سے باندھ دیں گے۔

ماہیت: اتنی مضبوطی سے باندھیں گے کہ اورنگ آباد میں بھی نہیں کھلے گا۔

(اقبال مسرور کا سامان اس میں شامل ہوا) مسرور لیٹے: اقبال سنگھ! باندھو مضبوطی سے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بہت مضبوط ہیں۔

اقبال سنگھ: تم ہی باندھو۔ شاعر نے ہاتھ سے، تمہارے ہاتھ بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

مسرور: (سامان باندھتے ہوئے) اب میرے ہاتھوں کی تعریف سفر سے واپسی تک کرتے رہنا۔ نظاروں سے تم لوگ محظوظ ہوتے رہنا۔ میں سامان کی رسیاں باندھتا رہوں گا۔ شانے ہاتھ جوڑے میرے۔

اورنگ آباد سے پہلے اجنتا کے غاروں میں پہنچ گئے ہیں۔ غاروں کو بڑی تفصیل سے دیکھتے ہوئے اظہار کرتے ہوئے رابرٹ نے کہا۔ لگتا ہے ہر دیش واسی بس اسی کام میں لگا ہوا تھا۔ مورتیوں پر اتنی محنتیں کیں کہ اس زمانے میں سائنسی ترقی بالکل نہ ہو سکی۔ یورپی اقوام سائنس میں بڑھ رہی تھیں۔ ہم مورتیاں بنا رہے تھے۔

مسرور: یورپی اقوام اپنی سائنسی ترقی کے باوجود آج بھی ایسی مورتیاں نہیں بنا سکتیں۔ دیکھا آس پاس کتنے غیر ملکی لوگ دیکھتے رہتے ہیں۔

گاڑی اورنگ آباد کے راستے پر اڑی جا رہی ہے۔ راستے میں ایک جگہ کتے گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے آیا۔ غصہ میں بھونکتا رہا۔ وجے نے اس سے کہا ــــ آؤ رے آؤ ــــ سب کے سب آؤ۔ جب میں اکیلا سائیکل پر ہوتا ہوں تب تو بہت ستاتے ہو۔ میں ڈر کے مارے پیڈل چھوڑ کر دونوں پیر ہینڈل پر رکھ لیتا ہوں۔ تب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سائیکل رک کر گر جاتی ہے۔ میں بھی گر جاتا ہوں۔ تب تم لوٹتے ہو۔ ناظرین ہنسی میں لوٹتے ہیں۔

اقبال سنگھ رابرٹ سے بار بار پوچھ رہے ہیں کہ اورنگ آباد کتنے کیلو میٹر رہ گیا ہے۔ زچ ہو کر رابرٹ نے کہا ــــ تم ہر منٹ میں ایک کلو میٹر کم کر کے پتہ کرتے جاؤ۔

اورنگ آباد چند کیلو میٹر رہ گیا ہے۔ وقت گزاری کے لیے وجے سائن بورڈ پڑھ رہا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے: "یہاں مسافروں کو پینے کا پانی اور نہانے کا پانی مفت ملتا ہے۔"

مسرور بولے "اور سامان چوری ہوا تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہم نے پانی کا انتظام اس لیے کیا ہے۔"

وجے اپنی ڈائری میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ لکھتا جا رہا ہے۔ اقبال سنگھ نے مسرور سے پوچھا یار یہ کیا لکھ رہا ہے۔ مسرور بولے "اس کو لکھنے دو۔ سفر ختم ہو گا تب ہم اس کی ڈائری لے کر بھاگ جائیں گے۔"

تین بجے کے آس پاس کھانے کے لیے ایک باغیچہ میں بیٹھے۔ ایک کتا آیا۔ وجے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وجے کو پہلے ہی کتوں سے بڑی چڑ ہے۔ اقبال سنگھ نے ہڈیاں پھینکیں تاکہ وہ لے کر بھاگ کھڑا ہو۔ لیکن وہ وجے کے قریب ہی کھانے لگا۔ چپ چپ کرنے لگا۔ وجے نے کہا: "اب ہڈیاں کتے کو مت دینا مجھے دینا تاکہ میں دور پھینک دوں۔"

مسرور بار بار صرف یہی جملہ دہرا رہے ہیں اور وجے کے علاوہ سب ہنس رہے ہیں کہ اب ہڈیاں کتے کو مت دینا، مجھے دینا۔ "اب ہڈیاں کتے کو مت دینا، مجھے دینا۔"

یہ جملہ کہتے وقت مسرور کسی کی طرف دیکھ نہیں رہے ہیں۔ چہرہ اتنا سنجیدہ بنا رکھا ہے جیسے کوئی دنیا سے بے خبر اپنے آپ میں بڑبڑا رہا ہو۔

وجے: بخار بہت تیز ہے۔ اسی لیے بڑبڑا رہے ہیں بیچارے۔

مسرور: چھٹیاں کٹے کو مت دینا مجھے دینا۔

اورنگ آباد میں بی بی کا مقبرہ گھوم لینے کے بعد تھک کر ایک جگہ کھڑے ہیں۔

مسرور: ایک عجیب سا سکون محسوس ہو رہا ہے یہاں۔

رابرٹ: سکون کی کتنی قسمیں ہیں؟ مجھے تو بس ایک ہی سکون لگتا ہے۔ سکون یعنی سکون بس۔ عجیب سا سکون کیا ہوا!

مسرور: ایک سکون نقصان نہ ہونے کا۔ دوسرا فائدہ ہونے کا۔ ایک پھانسی کی سزا منسوخ ہونے کا سکون ہوتا ہے۔ دوسرا خزانہ ملنے کا۔ یہاں خزانہ ملنے کا سکون ہے۔

رابرٹ: ان میناروں کو چھو کر دیکھو۔ ایک ٹھنڈا ہے دوسرا گرم۔

تینوں: ہاں یار۔

مسرور نے ایک جگہ دیوار سے کان لگایا۔ کہا دیکھو۔ اندر بہت بڑا آبشار گرنے کی آواز آ رہی ہے۔

اقبال سنگھ: اس عمارت میں اتنا بڑا آبشار کہاں سے آیا ہوگا۔

رابرٹ: پرانے بادشاہوں کے راز، اب خدا جانے۔ لیکن آبشار تو ہے۔ چلو اُس بوڑھے چوکی دار سے پوچھتے ہیں۔

چوکی دار: (پانچ روپے وصول کرنے کے بعد) آپ دوبارہ کان لگائیے۔ یہاں سوراخ میں شہد کی چھوٹی چھوٹی لاکھوں مکھیاں ہیں۔ یہ انہی کی بھنبھنانے کی آواز ہے جو آبشار معلوم ہوتی ہے۔

تینوں دوست رابرٹ کو ڈانٹنے لگے "کیا ضرورت تھی اس چوکی دار کو پانچ روپیے دینے کی؟ آبشار سمجھ کر کتنا لطف آ رہا تھا۔ سارا مزا کرکرا کر دیا نا؟ پیسے خرچ کرنے کی بڑی عجلت رہتی ہے تم کو دنقل اتارتے ہوئے) لوکا کاجی —— پانچ روپے لو اور بتاؤ آبشار کہاں سے آیا۔

سردیوں کے دن ہیں رات اورنگ آباد کی ایک ہوٹل میں گزری۔ صبح روانگی سے قبل اقبال سنگھ نے کھوپرے کا تیل مانگا۔ پلاسٹک کی بوتل، مسرور نے رات ہی خالی کر دی تھی۔ اقبال سنگھ نے کہا۔ وہ دس منٹ تک تیل نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ڈھکن توڑ کر دیکھا اور غصے میں مسرور سے بولے "کر لیے نا عقل مندی؟"

"اور یے وقوفی ہمارے لیے چھوڑ دیئے۔" (مسرور نے اسی لہجے میں جملہ مکمل کیا)

ہوٹل کے لان میں ایک شوہر اپنے بچوں کے ساتھ فوٹو کھنچوا رہے ہیں۔ ان کی بیگم کے ہاتھ میں کیمرہ ہے لیکن وہ بڑی دیر لگا رہی ہیں۔ شوہر نے پریشان ہو کر زور سے کہا —— "کیسے بھی مارو۔ مگر جلدی مارو۔"

مسرور نے کہا "بابو جی —— گھر کی باتیں سب کے سامنے مت بولا کرو۔"

بیوی فی الحال، فوٹوگرافی چھوڑ کر بولنے والے کو تلاش کر رہی ہے لیکن مسرور نے چہرہ ایسا بنا لیا ہے جیسے بولنا تو در کنار اس نے تو کچھ سنا بھی نہیں۔

مہابلیشور پہنچ گئے ہیں۔ کچھ Points ایسے ہیں جنھیں دیکھنے کے لیے پہاڑی پر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ اقبال سنگھ اپنے بھاری بھرکم وجود سے پریشان ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔

"میں اس پہاڑی پر آخری بار چڑھ رہا ہوں۔"

مسرور: کیوں! چھلانگ لگانے کا ارادہ ہے؟

اقبال سنگھ: چھلانگ لگاؤں گا تو تم کو ضرور پکڑاؤں گا۔

گاڑی کا cassette player بار بار بگڑ جاتا ہے۔ مسرور بار بار ٹھیک کرتے ہیں۔ چوتھی دفعہ سدھارتے ہوئے بڑبڑا رہے ہیں ——

"اب معلوم ہوا تم لوگ مجھے کیوں ساتھ لائے ہو۔ تم لوگ تو سفر کے مزے لیتے رہو۔ میں سامان باندھتا رہوں۔ ٹیپ سدھارتا رہوں۔ گاڑی چلاتا رہوں۔ اگلی دفعہ کہہ کر دیکھو کوئی سے باہر چلنا ہے۔ ابے آؤں گا بھی تو پہلے کاغذ پر تم تینوں کے دستخط لوں گا کہ ہم تینوں مسرور کی خدمت کریں گے اور راستہ بھر کام کرتے رہیں گے۔

مسرور بڑبڑاتے ہوئے کام کر رہے ہیں اور یہ تینوں کافی کی تعریف کر رہے ہیں کہ "واہ کیا مزے دار کافی ہے مگر افسوس کچھ لوگ کام کر رہے ہیں۔ پی نہیں سکتے۔"

گاڑی اب پونے کے راستے پر ہے۔ رابرٹ اور اقبال سنگھ پیچھے کی نشستوں پر ہیں جب کہ مسرور اسٹیرنگ سنبھالے ہوئے۔ وجے نے مسرور کے کان میں کہا ہے کہ یار مجھے ایک نمائش کے لیے بے حد خوب صورت لڑکی کی تصویر بنانی ہے۔ خوب صورت لڑکیاں نظر آئیں تو ہلکے سے اشارہ کر دینا۔ دو تین دفعہ مسرور نے عین اس وقت اشارہ کیا جب لڑکیاں پاس سے گزر گئیں۔ وجے نے کہا اشارہ ذرا جلدی اور صاف۔ بس کیا لڑکی نظر آتے ہی مسرور وجے کو زور زور سے کہنیاں مارنے لگے کبھی کبھی clutch والا پیر وجے کے پیر پر بھی مارتے۔ مار کھاتے کھاتے وجے کی حالت خراب ہو گئی۔ رابرٹ اور اقبال سنگھ چپکے چپکے ہنس رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے کہ پونہ پہنچنے تک اس کے ہاتھ اور پیروں میں جگہ جگہ پلاسٹر بندھے ہوں گے۔ راستہ میں ایک مقام پر بازار میں رکے۔ کالج کی خوب صورت لڑکیاں۔ مسرور نے وجے کو سر، ہاتھ، پیر اور پیٹھ پر مارنا شروع کر دیا بلکہ زمین پر گرا دیا۔ لڑکیاں ان دونوں کے پاس ٹھہر گئی ہیں۔ وجے نے زمین پر پڑے پڑے ہی ہاتھ جوڑ کر کہا۔ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ مار بند ہو جائے گی۔ اصل میں میرا دوست مجھ سے یہی کہہ رہا ہے کہ دیکھو کتنی خوب صورت لڑکیاں آئی ہیں۔

پلنگ میں سوتے وقت مسرور مختلف بچوں اور خود اپنے بچپن کی شرارتیں سنا کر سب کو ہنساتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ہنستے ہوئے بولے ——

مسرور: سچ ہے۔ بچپنا بڑا خراب ہوتا ہے۔

وجے: تمھارا تو بڑھاپا بھی خراب ہے۔ (وجے دن میں مار کھانے کے سبب مسرور سے ناراض تھا)

وہ چاروں دوست ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ ایک بچّہ مسرور کا پیچھا کرتا ہے کہ بوٹ پالش کرالو۔ بہت چمکادوں گا
مسرور نے کہا بھیا! تم بھکاری کلاکار۔ میرا بوٹ میری صورت سے زیادہ خوب صورت اور چمک دار ہو گیا تو لوگ
مجھے دیکھیں گے ہی نہیں۔

مارے بچنے کے لیے وجے نے مسرور سے کہا۔ دیکھو اب ماربیٹ بند۔ لیکن تم خوب صورت لڑکی بتاؤ گے
تو میں تم کو دو روپے دوں گا۔ اس میں اقبال سنگھ بھی شامل ہو گئے کہ مجھے بھی بتا دیں [illegible] دوں گا۔ وجے
نے ایک نہایت خوب صورت گوری صحت مند لڑکی بتائی اور اقبال سنگھ سے کہا لاؤ دو روپے۔
اقبال سنگھ نے چار روپے خوشی خوشی دیئے اور کہا لڑکی بہت اچھی تھی جی خوش ہو گیا۔

وجے خوش ہوا کہ آج اچھی آمدنی ہو رہی ہے۔ اقبال سنگھ اداس ہو کر بولے اپنی قسمت میں تو موٹی اور
بھدّی ہی لڑکیاں لکھی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مسرور نے وجے کو ایک لڑکی بتائی۔ وجے نے صرف چار آنے
نکال کر دیتے ہوئے کہا بس اتنی ہی خوب صورت تھی۔ یونے سے گو پنجی (PANJI) پہنچے۔ سمندر کے
کنارے وجے نے مسرور کو گلابی کپڑوں میں ایک لڑکی بتائی اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلا دیا۔ لیکن مسرور
نے وجے کی کالر پکڑ لی اور کہا دو روپے الٹا تم ہی نکالو ـــــ ایسی بھیانک لڑکیاں بتا رہے ہو؟

شام کو سمندر کے کنارے مسرور اور اقبال سنگھ میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ پھر وہ دونوں مل کر
وجے کو خوب صورت چہرے بتانے لگے۔ وجے کی جیب میں ہاتھ ڈال ڈال کر پیسے وصول کرتے ہوئے یوں
طرح کے جملے کہنے لگے ـــــ

مسرور: مفت میں تھوڑا لے رہے ہیں۔ بڑی محنت کے پیسے ہیں بھائی!
اقبال سنگھ: اتنا اچھا چہرہ دکھانے کے صرف دو روپے؟ دو روپے اور نکال یار۔
انجونا بیچ (Anjuna Beach) پر سیر کر کے یہ چاروں تھک گئے ہیں۔ نیند آنکھوں میں اتر رہی ہے۔
پیسے دے دے کر وجے کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ خوب صورت لڑکی پر نظر پڑتے ہی گھبرا کر یا تو
آنکھیں بند کر لیتا ہے یا ریت میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت بھی مسرور اور اقبال سنگھ ان کے
پیچھے دوڑ رہے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے ـــــ

"میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ خوب صورت لڑکیوں سے نفرت ہے۔ میں ہر خوب صورت لڑکی کو سمندر
میں ڈھکیل دوں گا۔"
○○·

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

پچھلے برس

دوستو ہم نے بھی کیا کیا نہ کیا پچھلے برس
ہاتھ اپنوں ہی کو ابیس میں دیا پچھلے برس

کالے دھندوں کی بدولت ملی کالی دولت
کالا دھندا بھی چلا خوب چلا پچھلے برس

نشہ بندی ہوئی نافذ یہاں لیکن یارو
پینے والے نے پیا پی کے مرا پچھلے برس

جوڑے گھوڑے کی رقم لے کے ہی شادی کرنا
باپ نے بیٹے کو نعرہ یہ دیا پچھلے برس

جو فریج تحفے میں باہر کا ملا تھا ہم کو
وہ فریج سالے نے چٹ مار دیا پچھلے برس

زلزلے سے وہ تباہی کا بھیانک منظر
دیکھ کے ٹی۔وی پہ افسوس ہوا پچھلے برس

زلزلہ آتا ہے کیوں اور کہاں آتا ہے
ہم کو یہ راز بھی معلوم ہوا پچھلے برس

سستی شہرت ہی سہی مل تو گئی ہے یارو
مہنگی شہرت کا تصور ہی رہا پچھلے برس

آپ بھی شہر میں اب ہوگئے مشہور ظریف
آپ کا نام بھی پیپر میں چھپا پچھلے برس

رشید عبدالسمیع جلیل (حیدرآباد)

نہ ہوں گے ہم جو دنیا میں

نہ ہوں گے ہم جو دنیا میں شرارت کچھ تو کم ہوگی
چمن خوردی سخن دزدی حماقت کچھ تو کم ہوگی

ملک کے شاعروں کی صف میں پیدا اک خلا ہوگا
غلط اشعار پڑھنے کی روایت کچھ تو کم ہوگی

ہے شمع حسن دل افروز روشن ہر زمانے میں
رہے گی عاشقی قائم رقابت کچھ تو کم ہوگی

نظر ہم پہ پڑے جوں ہی بخار آتا ہے لوگوں کو
ہمارے بعد ممکن ہے حرارت کچھ تو کم ہوگی

ہمارے دم سے جاری ہیں قیادت کے لیے جھگڑے
ہمارا دم نکل جائے عداوت کچھ تو کم ہوگی

پڑوسی چین پائیں گے سکوں ہوگا محلے میں
نہ ہوگی جڑ فسادوں کی سیاست کچھ تو کم ہوگی

سنہرا دور ہے دورِ رواں باغی عناصر کا
جو ہم منظر سے ہٹ جائیں بغاوت کچھ تو کم ہوگی

بگڑتی جا رہی ہے دن بہ دن اولاد کیا کیجے
اٹھے گا سر سے جب سایہ جہالت کچھ تو کم ہوگی

نئی نسلیں ڈسپلن سے جلیل آراستہ ہوں گی
یقیں ہے عہدِ حاضر کی شکایت کچھ تو کم ہوگی

ہاتھوں کی باتیں

حلیمہ فردوس

ہاتھوں کے اشارے ہر دور میں جذبۂ اظہار کا بہترین ذریعہ رہے ہیں۔ کیوں کہ ہاتھوں کی زبان ایک عالمگیر زبان ہے۔ ماہر بشریات کا خیال ہے کہ زمانۂ قدیم میں انسان نے عجیب عجیب آوازوں کے ذریعہ پیغام سنانے کی کوشش کی لیکن جب اس نے ہاتھوں کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کیا تو فاصلے سمٹ گئے اور ہاتھوں کے پیار بھرے لمس سے بیگانگی یگانگت میں بدل گئی۔ آج بھی خوشی، غم اور غصّہ کا اظہار صرف ہاتھوں کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ خوشی سے تالی بجانا، غم کی حالت میں سینہ کوبی کرنا اور غصّہ میں تھپڑ لگانا صرف اور صرف ہاتھوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مصافحہ مہذب انسانوں کی شناخت ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنے ہم نفسوں سے زیادہ پالتو جانور سے ہاتھ ملانے میں خوشی محسوس کرتا ہے جب کہ جانور ہاتھوں سے محروم ہیں۔ مالک کے [illegible] پہنچنے پر جانور اپنی سعادت مندی [illegible] اپنا [illegible] مالک کے آگے بڑھا دیتا ہے۔

سائنس دانوں نے بڑی بڑی حقیقتیں ان ہاتھوں کے ذریعہ ہی ظاہر ہوتی ہیں۔ بندروں کو ڈالی ڈالی جھولتے اور درختوں سے پھلوں کو توڑتے دیکھ کر ڈارون کو ارتقائے انسانی کا راز سمجھ میں آیا اگر نیوٹن نے سیب کو زمین پر گرنے سے پہلے (کھانے کی لالچ میں) اپنے ہاتھوں سے تھام لیا ہوتا تو اس پر کشش ثقل کا راز کبھی نہ کھلتا۔

یہ بات آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے تو ہاتھ اس کی تلافی کرتے ہیں۔ دو فریقین کے درمیان لڑائی زبانی "تو تو میں میں" سے شروع ہوتی ہے۔ اگر اس پر بھی جی کا غبار ہلکا نہ ہو تو ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ ہاتھا پائی کا یہ نظارہ سب کو دعوت نظر دیتا ہے۔ اس لیے کوئی بیچ بچاؤ کرنے نہیں آتا۔ کیوں کہ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنے کا شوق [illegible] کو ہی ہوتا ہے۔ البتہ [illegible] جب دل کے [illegible] ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو کوئی بھی اس پر بڑی [illegible] سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ چاہے [illegible]

[illegible] ذرا سی گڑبڑ ہو تو بس زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلنے لگتے ہیں۔ اور اگر کوئی سیانا [illegible] [illegible] کے ہاتھ کی صفائی شروع ہو جاتی ہے۔ بیچارے وظیفہ یاب بزرگ (جو سماجی خدمت کی غرض سے [illegible] والے کا ٹھیکہ لے بیٹھے ہیں) ایسے تلخ تجربوں کی بدولت صبح کے بھولے کی طرح شام کے گھر نہیں لوٹتے بلکہ گھبراہٹ کے عالم میں کسی کار کی زد میں آکر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔

ہم نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی یقیناً دیکھا ہوگا بے شمار لوگ ہاتھ کی صفائی سے بچنے کی خاطر اپنے ہاتھ ہمیشہ جیبوں میں رکھتے ہیں تاکہ دال چاول خریدنے تک ان کی جیب صحیح وسلامت رہے۔ لیکن آب و دانے کی غرض سے بے پرواہ ہنی مون پر نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دونوں کی حرارت ان ہاتھوں کو علاحدہ نہیں ہونے دیتی۔ بیوی کے ہاتھوں کی یہ گرمی اور کشش صرف سال بھر یا پہلا بچہ ہونے تک ہی برقرار رہتی ہے۔ نوکرانی کی بے وقت چھٹی یا گھر کے سارے کاموں سے بی بی جی کے ہاتھ جب کھردرے ہو جاتے ہیں اور پالش سے محروم ناخن بلی کے پنجوں سے کم نہیں دکھائی دیتے۔ تب میاں جی ان ہاتھوں کے لمس سے ہی گھبرانے لگتے ہیں۔ اب ان ہاتھوں کا مصرف زلفوں سے کھیلنا نہیں بلکہ برتنوں کو پٹخنا اور بچوں کے کان مروڑنا ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سیانا مرد ہو تو صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اور ان ہاتھوں کا حسن برقرار رکھنے کے لیے جی جان سے گھر کے کاموں میں جٹ جاتا ہے۔ بی بی کی بیڈ ٹی سے لے کر بچوں کو ٹیکہ کرانے کی ذمہ داری وہ اپنے ہاتھوں سے نبھاتا ہے۔ اور اس کے ہاتھوں کی قربانی سے جہنم زدہ گھر جنت بن جاتا ہے ورنہ گھر کا نقشہ بگڑتے دیکھ کر پاس پڑوس کی بہنیں آگ لگانے سے نہیں چونکتیں۔

گھر کی خوش حالی میں سلیقہ مند بیوی اور سمجھدار شوہر کا ہاتھ ہوتا ہے جب کہ ملک کی ترقی غریب ہاتھوں پر منحصر ہوتی ہے۔ جیسے عالمی ہاتھ برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ روس کے ہنگامے ہوں یا ہماری معاشی پالیسی۔ کویت کی جنگ ہو یا فلسطینیوں کی دربدری ہر جگہ اس طاقت کا ہاتھ ہے جس کے آگے یو۔ این۔ او کے ہاتھ بھی کمزور ہیں۔ جناب! یہی تو ہاتھ ہیں جن سے آج کل ہر طرف دہشت گردی کا ماحول بنا ہوا ہے۔ ہاتھوں سے بم غباروں کی طرح چھوٹ رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی تباہی میں انسانوں کے ساتھ ساتھ اب قدرت کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

تاریخ ساز شخصیتوں کی شہرت میں کسی نہ کسی چیز کا ہاتھ ضرور رہا ہے۔ حاتم طائی کی شہرت میں سخاوت کا ہاتھ، ہٹلر کی شہرت میں جبریت کا ہاتھ، قلوپطرہ کی شہرت میں اس کے حسن کا ہاتھ اور مونا لیزا کی شہرت میں صرف اس کی ایک مسکراہٹ کا ہاتھ ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ جھولا جھلانے والے ہاتھوں نے حکومت بھی کی ہے۔ چاند سلطانہ اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو مسکرانے کی فرصت ہی نہیں تھی انھوں نے ہاتھوں میں تلواریں لے کر شہرت حاصل کی لیکن کرناٹک کی باہمت خاتون "اونکے اوبوا" نے موسل سے دشمنوں کا سر کچل دیا تھا۔

ہاتھوں کی کارستانیوں اور اس کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بڑا طویل ہے۔ اب دیکھیے نا فضائی آلودگی

یں ہمارے آرام پسندی کا ہاتھ شامل ہے۔ کاش انسان نے پہیئے ایجاد کیا ہوتا نہ لوگ موٹر گاڑیوں میں دندناتے پھرتے اور نہ ہی یہ فضا آلودہ ہوتی۔ افسوس صد افسوس کہ نرم نرم انسانی ہاتھوں نے کتنے تخریبی کام انجام دیے ہیں۔ انھوں نے شب و روز کی صورتوں کو بدل دیا اور معصوموں کے کھیلوں کو بدل دیا ہے۔ پہلے زمانے میں لڑکیاں جب چھنکا کے چلتیں تو بڑا مزہ آتا تھا۔ ہوا میں لہراتی چوٹیاں کھنکتے قہقہے ان کی معصومیت اور خوشی کی دلیل تھیں۔ خاک پڑے اس چھوٹے تہذیب پہ جس نے پیشے سے جان کر لیا۔ ان بچیوں سے معصومیت چھین لی۔ انھوں میں علم ادب کا ندھوں پر بوجھ لاد دیا ہے جس کی بدولت وہ مسکرانا بھول گئیں لیکن ٹی وی کا فیض ہے کہ ہاتھوں نے نئے نئے اشارے ایجاد کیے ہیں۔

میری پڑوسی فاقلہ باجی (جو عقل کی ذرا کچی ہیں) ہاتھوں میں مہندی رچانا اور گھر بیٹھے وی سی آر پر فلم دیکھنا جن کا محبوب مشغلہ ہے، پرسوں ہانپتے کانپتے میرے گھر آئیں اور کہنے لگیں۔ کتنا برا زمانہ آگیا ہے۔ دیکھو نا بہن! میرے بھائی کے چھ سالہ بیٹے نے میری چار سالہ بچی کو ہوائی بوسہ پیش کیا اور بچی نے بھی جوابا وہی حرکت کی۔ میں نے کہا اس میں برا کیا ہوا۔ انھوں نے توبہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ نا بابا اب تو میں بچوں کے سامنے کبھی فلمیں نہیں دیکھوں گی۔ تم نہیں جانتیں ان دونوں نے فلمی ہیرو اور ہیروئن کی طرح کمر مٹکا کر آنکھوں سے وہ اشارے کیے کہ توبہ بھلی۔ اس عمر میں یہ بچپن تو آگے کیا ہوگا۔ میں نے انھیں سمجھایا! ٹھیک ہے اس میں قباحت کیا ہے وہ لوگ تو آئیلو (I LOVE) کا مطلب سمجھ رہے ہیں۔ ہوائی بوسہ بازی کی بدولت تو وہ مہلک مرض ایڈس (AIDS) سے بچے رہیں گے۔ خوامخواہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ بچوں کی یہ چالاکی عالم گیر مسئلہ بن گئی ہے۔ شاید بچے کی کسی ایسی ہی چالاکی سے پریشان ہو کر پروین شاکر نے بہت پہلے شکایت کی تھی:

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

شعر سن کر فاقلہ باجی کا گلا اور بھی خشک ہو گیا۔ میں نے ایک گلاس شربت سے ان کی تواضع کرنے کے بعد کہا باجی یہ سچ ہے کہ لاتوں کے بھوت ہاتھوں سے نہیں مانتے لیکن نازک عمر میں غلط موقع پر ہاتھ اٹھانا بھی دانشمندی نہیں۔ ایسے ہی بچے آگے چل کر "کھل نایک" بن جاتے ہیں۔ آپ فہم نہ کریں میرے منے کا بھی یہی حال ہے۔ آئے دن بچوں کو پکڑ کر پیٹ دیکھتے دیکھتے وہ خود کو ظہیر الدین سمجھنے لگا ہے۔ گلی میں ایک پٹ بنا کر، کھڑکی کا شیشہ توڑ کر دوستوں سے ایسے ہاتھ ملاتا ہے جیسے ایک ننھا سا کھلاڑی اپنی فتح مندی کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ آج کل کھیل کے میدانوں میں فتح مندی کے اظہار کے لیے مخصوص طور پر ہاتھ ملائے جاتے ہیں اس کا مطلب سمجھا جائے ایسے [illegible]

کھلاڑیوں کے علاوہ سیاست دان بھی اپنے ساتھیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تصویر کھنچواتے ہیں جو ان کے باطنی نفاق اور ظاہری اتفاق کی دلیل ہوتی ہے۔ کیوں کہ آخر میں ہاتھ ملا کر بھی جانے والے [illegible] نہیں ہوتے۔ جہاں ہاتھ میں ہاتھ آیا تو بس سمجھیے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ ریت پرانی ہے کہ بیرونی ممالک کے وزیر [illegible] معاہدوں پر دستخط کر کے ہاتھ ملاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ ورنہ شدہ معاہدے کی تکمیل میں [illegible]

گینڈ گیری۔ ہر کرتوی سیاست کی پیداوری ہاتھوں سے کی جاتی ہے۔ وطن میں لاکھوں شہریوں کا خون بہا کر انسانی زندگیوں سے بنانا بگاڑنا ان کی دانش مندی ہے۔ انہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر تماشہ بننے والے یہ نہیں جانتے کہ ان کا پیدا ہوا ان کے ہاتھوں سے کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔

عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے حلف اٹھانا بھی ضروری ہے۔ عام انسان اپنے ضمیر کے سامنے حلف اٹھاتا ہے اور زندگی بھر ان اصولوں کی پابجائی کرتا ہے لیکن وزیر اور ڈاکٹر، اپنے حلفیہ بیان میں جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ ایک مجرم کٹہرے میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی باتوں کو دہراتا ہے اور انصاف کا مجسمہ آنکھوں پر پٹی باندھے ہاتھ میں انصاف کی ترازو تھامے منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ہاتھوں کے اشاروں سے کبھی کسی سیاست داں کی عزت بچ جاتی ہے تو کبھی ٹوپی۔ جنتا اپنے ہاتھوں سے گندے انڈے اور ٹماٹر پھینک کر احتجاج کرتی ہے تو منسٹر اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اور کسی جلسے میں طلبا گڑبڑ کرنے لگتے ہیں تو استاد اپنی عزت بچانے کی خاطر مہمانِ خصوصی کے پہلو میں بیٹھے پہلو بدل بدل کر منہ پر انگلی رکھ کے خاموشی کا سگنل دیتا ہے۔ دراصل منہ پر انگلی رکھنے کا یہ عمل ہر بچہ اپنے استاد سے سیکھتا ہے۔ جب وہ طالب علم سے استاد بن جاتا ہے تو .... شریر بچوں سے تنگ آکر یہی عمل دہراتا ہے۔ اردو مدارس میں استانیاں بچوں کے منہ پر انگلی رکھوا کر سویا کرتی ہیں لیکن انگریزی اسکول کی ٹیچرس ...... بچوں کو سلا کر اپنا میک اپ اور ساڑی ٹھیک کرنے میں لگی رہتی ہیں۔

ہاتھ اشاروں کی زبان ہے۔ اور اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔ حتیٰ کہ گفتگو میں بھی اس کا بڑا دخل ہے۔ ہاتھ بٹانے سے ہر کام آسان نہیں ہوتا۔ جیسے فوٹو گرافر کا عین موقع پر ہاتھ دینا آپ کو حواس باختہ کر دیتا ہے۔ ایسے موقع پر آپ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھتے بلکہ اسے ہاتھ جوڑ کر مناتے ہیں۔ تب بھی وہ راضی نہ ہو تو آپ کے ہاتھ پیر پھولنے لگتے ہیں۔ دل میں چاہے جس قدر بھی غبار ہو لیکن آپ فوٹو گرافر سے ہاتھ ملاتے چلے آتے ہیں اور گھر آنے کے بعد سارے افراد سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ دراصل وہ شخص سب پر اس لیے دھونس جماتا ہے کہ آپ جیسے کئی مجبور اور بے بس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ـــ ہاتھ مستقبل کا آئینہ ہے۔ تقدیر کے بنانے اور بگاڑنے میں ہاتھ کی لکیریں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں۔ یہ وہ شاہ راہیں ہیں جو آپ کی کامیابی کے راستے بناتی ہیں۔ ان لکیروں کا علم ہر زمانے میں اہم رہا ہے۔ آج ہر فائیو اسٹار ہوٹل کے کسی نہ کسی کمرے میں آپ کو ایک ماہر نجومی ضرور ملے گا۔ جو ہاتھ کی لکیروں کے ذریعہ مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ سنا ہے کہ لیڈر الیکشن لڑنے سے پہلے، فلم بنانے والے مہورت سے پہلے، خلائی سیارے چھوڑنے والے سائنس داں اپنے تجربوں کو شروع کرنے سے پہلے ماہر نجوم کے دربار میں حاضری دیتے ہیں۔ بسا اوقات ہاتھ کی لکیروں کی گڑبڑ سے لیڈر اپنی سیٹ کھو بیٹھتا ہے۔ مرچ مسالہ کے باوجود فلم فلاپ ہو جاتی ہے اور سائنس داں اپنے ملک کی چوبیس کروڑ کی رقم برباد کر دیتا ہے۔ جس سے ہمارے وطن میں چوبیس کروڑ بھکاریوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

رشید عارف (پٹنہ)

یوں موج ہم اڑائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر
چندہ کا مال کھائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

ڈائیلاگ ہم سنائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر
اور فلمی گانے گائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

لے کر برات آئیں گے ڈنکے کی چوٹ پر
گھونگھٹ ترا اٹھائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

ہم بن بلائے آئیں گے ڈنکے کی چوٹ پر
بھرپیٹ کھا کے جائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

بیٹا نہ ڈاکٹر ہے نہ انجینیئر تو کیا
ایم-پی اسے بنائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

بولیں گے جھوٹ اتنا کہ سچ مان لیں سبھی
فرقوں کو دو لڑائیں گے ڈنکے کی چوٹ پر

ٹی این راز (ہریانہ)

حسرتِ دل ان کے آنے سے جواں سی ہوگئی
بس ذرا چھونے کی خواہش امتحاں سی ہوگئی

مل کی چمنی صاف کرتے زندگی گزری مری
روٹی روزی کیا ہوئی ہستی دھواں سی ہوگئی

بیوی سے مانگا نمک گھر میں غدر سا ہوگیا
لے کے بیلن ہاتھ میں وہ رانی جھانسی ہوگئی

جھیل سی آنکھوں میں میں تو ڈوبنے والا ہی تھا
چھتری میرے دل رُبا کی بادباں سی ہوگئی

عشق کے اولے پڑے تھے سر پہ میرے رات بھر
پہلے نزلہ ہوگیا پھر مجھ کو کھانسی ہوگئی

اپنے نیتا جی کے دونوں لال با عزت ہوئے
ایک ڈاکو بن گئے دوجے کو پھانسی ہوگئی

یہ پکے پھل حسن کے چکھوں کہ یوں ہی چھوڑ دوں
کشمکش میں اپنی حالت باغباں سی ہوگئی

جگر نظام آبادی

سسرے کو گھمانے میں اب دیر نہیں کرنا
کچھ مال گلانے میں اب دیر نہیں کرنا

مذہب کا جنوں سارے بھارت کو ڈبو دے گا
بھارت کو بچانے میں اب دیر نہیں کرنا

آنے سے غرض ان کو پنڈال ہو کہ منڈپ ہو
نیتا کو بلانے میں اب دیر نہیں کرنا

اب فون پہ ہوتی ہے شادی بھی سگائی بھی
تم فون گھمانے میں اب دیر نہیں کرنا

لو جان لٹانے کا وعدہ ہے مرا جگر
تم غزلیں سنانے میں اب دیر نہیں کرنا

احمد عبدالعلیم اختر (ریاض)

شگوفہ کی سلور جوبلی پر

اک بات کہوں گا میں مرے یار شگوفہ
طنز اور مزاح کا ہے تو شہکار شگوفہ

چھپتی ہی نہیں تھی کبھی صنف ایک ہی تو
اب رب کے کرم سے ہے تو گلزار شگوفہ

پچیس برس سے ہے رواں راہِ ادب پر
چھاپے ہیں کئی لاکھ قلم کار شگوفہ

ہر گھڑی ہی تلخی کہ وفورِ غم و اندوہ
پر قہقہوں کی کرتا ہے یلغار شگوفہ

تیرا نام "شگوفہ" جو مناتا ہے ریاض آج
ہیں زیست کے آثار نمودار شگوفہ

یہ ہنسنے ہنسانے کا طریقہ ہے جاری
اور جاری رہے صدیوں یہ رفتار شگوفہ

جو ہنستے ہیں ہوتی ہے طویل عمر بھی ان کی
روتوں کا تو جینا ہوا دشوار شگوفہ

تھے چند ہی گنتی کے ترے چاہنے والے
ان گنت ہیں اب تیرے پرستار شگوفہ

ہے عابد و غوری کا تعاون تجھے حاصل
لازم ہے کہ ہو مائل پندار شگوفہ

کونپل سے بنا شاخ، بنا شاخ سے اک پیڑ
گزرے ہیں کئی تجھ پہ تو ادوار شگوفہ

اکرم کہ کمال آج سبھی تیرے ہیں شیدا
اختر کے سخن سے یہ ہوا آج ہویدا!

غزل

سوپر نرملی

یہ دنیا ہے یا فائیو اسٹار ہوٹل
یہاں دال روٹی بھی سستی نہیں ہے

یہاں کوئی سامان سستا نہیں ہے
شریفوں کے قابل یہ بستی نہیں ہے

یہ مانا ہے دنیا بہت مال والی
محبت مگر اتنی سستی نہیں ہے

نہیں کرتی جو محل کیسی جیت جس کی
محبت کے قابل وہ ہستی نہیں ہے

ہے ناگن بھی زہریلی لیکن اے سوپر
گرانی سے بڑھ کر تو ڈستی نہیں ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور (بہار)

خوشامدی

جس طرح چرند پرند پیدا ہوتے ہیں اسی طرح خوشامدیوں کی بھی پیدائش ہوتی ہے۔ دوسرے فن کاروں کی طرح ان کی فن کاری بھی مشہور ہے۔

چوں کہ ہر کوئی فن کار نہیں ہو سکتا اسی طرح ہر کسی کے بس میں خوشامدی ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے بھی جوہر کی ضرورت ہوتی ہے اور جوہر ریوڑی نہیں ہے کہ ہر کسی کے حصے میں آجائے۔ ریوڑیوں کی قیمت بھی تیس یا چالیس روپے کیلو ہے۔ جوہر تو جوہر ہے انمول!

خوشامدی بھی انمول ہوتے ہیں۔ میں انھیں اسی عقیدت اور احترام سے دیکھتا آرہا ہوں۔ عقیدت تو مجھے شہنشاہِ موسیقی بیتھوون سے بھی ہے۔ اور اپنی ریاست کے وزیر اعلیٰ سے بھی ہے۔ لیکن خوشامدیوں سے عقیدت کی بات جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

پہلے پہل خوشامدی [illegible] سے ان کی فن کاری کا [illegible]

[illegible] ہر [illegible] اسی طرح [illegible] فطرت [illegible] بن جائے گا اور بہادر، جیالا اور حوصلہ مند [illegible]

[illegible]

پیچھے چلنے والے طرح طرح کے کرتب دکھاتے رہتے ہیں۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹے کے امتحان میں پرچہ پہنچا کر مدد کرتا ہے۔ کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لیے ایک بزنس مین اپنی بیوی کو رات کی تنہائی میں اعلیٰ افسر یا بیوپاری کے یہاں بھیجتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اچھا بھلا ایکسپورٹر ملک سے غداری کرتا اور [illegible] کامیاب [illegible] ہے۔ چولی دامن پہ مجھے یاد آیا ہے کہ اب یہ محاورہ بچے بچے کی زبان پر ہے۔ مگر چولی دامن کو بیچ میں لانا ضروری نہیں ہے۔ معاملہ صرف چولی تک محدود ہے۔ ہمارے فلمی شاعر اب تصور کی دنیا میں نہیں جیتے بلکہ سائیڈ ہیروئنوں کے اندر جھانکنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہیروئن کے ظاہری خد و خال پر ہی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ولی، قلی قطب شاہ تک ہی نہیں میر، غالب اور فراق تک سبھی نے کپڑوں کے اندر ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن کو دیکھا تھا اور آج جب یہ صدی ختم ہونے کو ہے تو شاعر حضرات چولی کے اندر جو کچھ ہے اس کا ڈھنڈورا زور زور سے پیٹ رہے ہیں اور نابالغوں کو بد مستی پر مائل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے شاعر مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی روح، پاک روح کا گلا دبا کر اسی گروہ سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں جہاں خوشامدی پروان چڑھتے ہیں۔ ان پروان چڑھتے ہوئے خوشامدیوں کی وجہ سے ہی آج پاک صاف روح والے یا تو نوکری نہیں پاتے یا ملازمت میں پروموشن سے محروم رہ جاتے ہیں۔

خوشامدی کی ایک زبردست پہچان یہ ہے کہ چہرہ بدلنے میں اسے مہارت حاصل ہوتی ہے۔ ویسے بھی اس کا چہرہ اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ جب چاہے اس پر ہمدردی کی لیپا پوتی کر لے یا جب چاہے رحم دلی کے گل بوٹے کھلائے۔

خوشامدی کے لیے انسانی نفسیات کا ماہر ہونا لازمی ہے۔ جس کی خوشامد کرنی ہو اس کی ہر سانس سے واقفیت اور رطب اللسان ہونے کا ہنر آتا ہو اور خرگوش کی سرمئی آنکھوں کی طرح اپنی پر فریب نظروں کو ادھر ادھر گھماتا رہتا ہو۔ ایک بار ایک محترم اپنے ایک خوشامدی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یکا یک ٹی ٹی اسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ ان صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹکٹ نہیں ملا۔ بریف کیس میں دیکھ پھر ڈھونڈنے لگے۔ خوشامدی نے ٹی ٹی سے کہا۔ "جناب، کیا یہ شکل سے شریف نہیں لگتے؟ کیا بلا ٹکٹ چل سکتے ہیں۔ ان کے پاس ٹکٹ ہے اسے آپ مان لیں۔"

"ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں" اور ٹی ٹی دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہو گیا!

ایسے بے ضرر خوشامدیوں کی تعداد کم ہے۔ البتہ چالاک خوشامدیوں کی بہتات ہر جگہ نظر آتی ہے۔ کہیں بینڈ باجے کے ساتھ کہیں ہاتھ میں ڈفلی لیے اور کہیں صرف کاسہ لیسی [illegible] خوشامدی بھی ہوتے ہیں۔ ایک خوشامدی بہت دنوں کے بعد [illegible] گیا۔ وہ منسٹر صاحب کا [illegible] تھا۔ سرکاری طور پر وہ ملازم نہیں تھا۔ ہاں غیر سرکاری طور پر منسٹر صاحب کے ساتھ [illegible] میں اس کے ایک [illegible] نے پوچھا "کتنی تنخواہ مل جاتی ہے؟"

خوشامدی نے فخر سے کہا: "میری اور منسٹر صاحب کی تنخواہ ملا کر [illegible]

پر خوشامد و مدحت میں بہتے ہیں۔ اور اپنا کوئی ان رشتوں کو بننے لگنے کی فکر نہیں کرتے ہیں۔ ایسے ہی مقرر نے تقریر شروع ہی کی تھی کہ خوشامدی صاحب مجمع میں کھڑے ہوگئے اور لپکتے جھپکتے پنڈال سے نکل گئے۔ پھر چند منٹ بعد جب لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔ منتظمین میں سے ایک نے پوچھا "آخر ہوا کیا ہے؟"

"میں فلاں صاحب کو تلاش کر رہا ہوں جنھوں نے مجھے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ مقرر صاحب سے پہلے مجھے ان کے بارے میں چند منٹ بولنا ہے۔ مجھے یہ موقع نہیں دیا گیا اور مقرر صاحب تقریر کر رہے ہیں۔"

ایک طرف خوشامدیوں کی دوسری قطار نظر آتی ہے جو اپنے ممدوح کے یہاں سنترے کا پٹارا پہنچاتے ہیں اور موصوفہ کے لیے ان کا من پسند چاٹ لے جانا نہیں بھولتے۔

ایسے بھی خوشامدی ملتے ہیں اور وافر مقدار میں ملتے ہیں جو آفس جانے میں پابندی نہیں برتتے لیکن صاحب موصوف کے گھر پر ٹائم سے جاتے ہیں اور مکھن پالش سے لیس ہو کر جاتے ہیں۔

میرے ایک اچھے بھلے، پڑھے لکھے ادب سے دلچسپی و سنجیدہ دوست ابھی حال ہی میں اس لت کا شکار ہوئے ہیں۔ ہوا یہ کہ انھیں اپنے بھتیجے کے لیے ایک عدد نوکری کی ضرورت تھی اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج کے پُر آشوب دور میں سب کچھ مل سکتا ہے، سبھی کچھ، لیکن نوکری ملنی بے حد دشوار ہے۔ سنا ہے لوگ اس کام کے لیے ایک دوسرے کو زبردست طریقے سے پھانسا بھی دیتے ہیں۔ لیکن میرے دوست موصوف کا معاملہ کچھ جداگانہ ہے۔ انھوں نے مقامی اسکول میں ایک خالی جگہ کا اشتہار پڑھا۔ جگہ ماسٹر کی تھی اور کنڈیڈیٹ بلوائے گئے تھے۔ یعنی قبل سے کوئی درخواست نہیں دینی تھی بلکہ مقررہ تاریخ کو روبرو سکریٹری تک پہنچ جانا تھا۔ دوست موصوف کو اپنے بے روزگار بھتیجے کی بہت فکر تھی۔ وہ اس کی قابلیت کے چشیدہ تھے کیوں کہ ان کے لیے اکثر و بیشتر درخواستیں وغیرہ وہی لکھتا تھا اس لیے رشتے کی مجبوری اور اخلاقی تقاضے کی روشنی میں بھتیجے کے سیاہ بال میں اجالا پھیلانے کا فیصلہ انھوں نے کیا۔ "جن کے پاس صلاحیت کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ انھیں چانس مل جاتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" ایسی رائے میرے دوست موصوف رکھتے تھے۔ اس لیے وہ اسکول کے سکریٹری کے پاس پہنچے جو اتفاق سے میونسپلٹی کے پریسیڈنٹ بھی تھے۔ ان میں بڑے آدمی کی اکڑ کی ہر خوبی موجود تھی جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے سے کم رتبہ اور چھوٹے آدمیوں سے حقارت سے ملتے تھے۔ حالاں کہ میونسپلٹی کا ایک شعبہ ایسا ہوتا ہے جس میں صرف چھوٹے لوگوں کی ہی گنجائش ہوتی ہے اور جو پریسیڈنٹ کی مرضی سے صفائی کم کرتے ہیں اور گندگی کا ڈھیر زیادہ جمع کرتے ہیں۔ اس جھوٹ و تفریق کو جانتے کے باوجود میرے دوست موصوف سے ملنے گئے۔ اس وقت وہ [illegible] کرسیوں کا حساب لے رہے تھے۔ یہ کرسیاں ناجائز طور پر جنگل سے کاٹ کر منگوائی گئی تھیں [illegible] میرے دوست کو دیکھ کر پریسیڈنٹ صاحب نے کہا "آئیے [illegible]" [illegible]

[illegible] موصوف [illegible]

"آپ کی تعریف ؟" انھوں نے پوچھا۔

"آپ کے ہی شہر کا ایک باشندہ ہوں" میرے دوست اپنے ہونٹوں پر بمشکل مسکان لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے" پریسیڈنٹ صاحب تلخی سے بولے "اس شہر کا ہر آدمی شہری ہے جو اچکا، بدمعاش بھی ہو سکتا ہے اور شریف دیانت دار بھی۔ مگر آپ کون ہیں؟"

دوست کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس ادا سے ان پر حاوی ہوں۔ بڑے ہی بھونڈے طریقے سے انھوں نے اپنا نام بتا دیا۔

"کس کام سے آئے ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ایسے ہی تھوڑا۔۔۔۔۔" دوست موصوف بیچ میں اٹک گئے۔ ایک بار پھر کشمکش میں مبتلا ہو گئے کہ کس مٹھاس سے مدّعا بیان کریں۔ دراصل وہ کتابی کیڑے سے تھے۔ آفس وغیرہ کے چکر سے کوسوں دور رہے تھے۔ بابوؤں اور افسروں سے ان کا یالا شاذ و نادر ہی پڑا تھا۔ اختر شیرانی سے شاذ تمکنت تک وزیر آغا سے گوپی چند نارنگ تک، مظہر امام سے ماجد الباقری تک، بائرن، کیٹس اور ایلیٹ تک سے ان کا بالا روز پڑتا تھا بلکہ یہ سب ان کے بستر کی زینت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوست موصوف نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے لگتے تھے۔ میونسپلٹی کے پریسیڈنٹ نے ان کی ہکلاہٹ سے انھیں گاؤدی سمجھا اور انھیں گھورنے لگے۔ دوست موصوف کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو انھوں نے بھی باقاعدہ انھیں گھورنا شروع کر دیا۔ چند لمحے اسی گھورا گھوری میں قتل ہو گئے۔ آخر ان سے پوچھا گیا:

"کیا تانگے کا لائسنس رینیو کرانے آئے ہیں؟"

"جی نہیں، جی نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کر سوچ لیا۔ میں تو بھتیجے کو رینیو کرانے آیا ہوں" گھبراہٹ میں دوست موصوف بول گئے۔

"ایں۔۔۔۔۔" انھوں نے تقریباً چیخ کر سوالیہ نگاہ ڈالی۔

دوست موصوف کو اپنی غلطی کا احساس فوراً ہوا۔ نتیجے میں سدھار کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوا لیکن لاشعوری طور پر ان کی حرکتیں کراہ کی شکل میں ظاہر ہونے لگیں اور ماحول بے حد بھونڈا ہو گیا۔ یکلخت ایسی لگتی کہ ان کے منہ سے کچھ بھی صاف صاف نہیں نکل رہا تھا۔ پھر وہ یکایک بے حد سنجیدہ ہو گئے۔ اپنی ہیئت کذائی پر نادم بھی ہو گئے۔ اور بغیر آداب و سلام کے میونسپلٹی آفس سے باہر نکل آئے۔

لیکن انھیں چین نہیں ملا۔ رہ رہ کر انھیں دکھ ہوتا رہا کہ وہ ویسا کیوں نہیں بن سکے جیسا وہ چاہتے تھے۔ اپنے جیسا بنے رہنا ہی تو سب سے بڑی لعنت ہے۔ دوست موصوف سوچتے رہے کہ جائز طور پر مدّعا بیان کرنا کیا اتنا ہی مشکل کام ہے۔ سنجیدہ آدمی کے لیے مشکل کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر انھوں نے اپنے بھتیجے کے لیے کچھ کیوں نہیں کیا۔ ڈگری بدست بھتیجا یوں ہی بیکار کب تک رہے گا ـــــ کب تک رہے گا ـــــ سوچتے

سوچتے دوست موصوف کی حالت یوں ہوگئی کہ ایک دن انھوں نے چولا بدل لیا ، ایمان داری پر دنیا داری کا غلاف لپیٹ لیا اور بستر کی کتابوں کو جھاڑ کر عملی دنیا میں نکل پڑے ۔

کچھ عرصے بعد مجھ سے ملاقات ہوئی تو ان کا رہن سہن ، چال ڈھال دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ زبان قینچی کی طرح تیز چل رہی تھی :

" سینسیریٹی دراصل ڈسکوالی فکیشن ہے ۔ میں اپنے چہرے کو لے کر کب تک روتا رہتا آج میں ایم پی صاحب ، ڈائرکٹر صاحب ، ایم ایل اے صاحب ، چیرمین صاحب اور فلاں فلاں صاحب کے ساتھ ہوں "۔

" بھتیجے کو نوکری ملی یا نہیں ؟ "

" جلد ہی ملنے کی توقع ہے ۔ اونچے لوگوں کا ساتھ ابھی ابھی نیا نیا ہوا ہے "۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا —— ابھی خوشامدی نئے نئے بنے ہو بچو ! تم سے پرانے گھاگ اپنا الّو سیدھا کر رہے ہوں گے ۔ تمھیں وقت تو لگے گا ہی !

زمانہ جس تیزی سے بدل رہا ہے ، اسی تیزی سے خوشامدیوں کی تعریف بھی بدلتی جارہی ہے ۔ مجھے لگتا کہ نئی صدی شروع ہوتے ہوتے کوئی ایک فرد بھی اس لت سے محفوظ رہ سکے گا —— واللہ اعلم !!

م۔ آصف آروی

گریجویٹ

اے وطن کے گریجویٹ لڑکو سنو
کیا کرو گے رکھ کے ڈگری پھاڑ دو

مت کرو تم نوکری کی جستجو
غیر ممکن، ہو یہ پوری آرزو

دے کہاں تک بھی حکومت نوکری
دے بھی جتنی بانٹ لیں گے منتری

گرم رشوت کا بہت بازار ہے
اس پہ کوشش اس لیے بے کار ہے

باپ کی بھی جیب میں گرمی نہیں
دل میں افسر کے بھی کچھ نرمی نہیں

اس لیے بس ترک کر کے یہ خیال
کچھ کرو تم پیٹ کا بھی ہے سوال

ملک میں ایسے بہت ہیں گریجویٹ
پڑھ کے بھی جن کا نہیں بھرتا ہے پیٹ

اس کا مطلب یہ نہیں جاہل رہو
اپنے فیوچر سے ہی تم غافل رہو

ہے اگر میرٹ تو بس ٹیوشن کرو
اس سے اونچی اپنی پوزیشن کرو

گر نہیں میرٹ تو بیچو چاکلیٹ
یا سڑک کے اک کنارے آملیٹ

لے کے آلہ یا بنو تم ڈاکٹر
روگ کچھ ہو کچھ دوا دو بے خطر

یا ملا کر راکھ میں تھوڑا نمک
اصلی منجن کہہ کے بیچو بے جھجک

ایک بزنس اور بھی ہے کامیاب
جس میں دو طرفہ ہے انکم بے حساب

کھول کر دفتر کہیں یہ تم میاں
لو کمیشن اور کرا دو شادیاں

کرنا یہ بھی تم سے مشکل ہو اگر
پھر یہ سوچو کیا کرو گے بیٹھ کر

جیب کترے مت بنو تم، ہوشیار
چھین لیں گے مار کر سب تھانے دار

ہے اگر حسرت بنو فوراً امیر
مشورہ مانو مرا بیچو ضمیر

کام یہ تو آج کل آسان ہے
عیش و راحت کا ہی بس سامان ہے

اس میں ڈگری کا نہیں ہے کوئی کام
ایک گھوڑا بس یہی ہے بے لگام

سیکھ لو کیا ہے سیاست کا یہ فن
اور کرو کھادی کا کرتہ زیبِ تن

سیکھ جاؤ کچھ دغا بازی فریب
رات دن بھرتے رہو دولت سے جیب

یعنی ملک و قوم کے خنجر بنو
اُٹھو آصف اور اک لیڈر بنو

وحید اشرف

(دبئی)

فیشیانہ

ہمیں ابوظہبی میں ایک عزیز کے پاس دعوت میں جانا تھا۔ جو دبئی سے تقریباً ایک سو ساٹھ کلومیٹر دور ہے۔ صبح صبح نکلنے کا پروگرام تھا۔ آٹھ بجے والے تھے فاضل بھائی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سوچا چلو جاتے ہوئے ہی انھیں لے لیں گے۔ فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔

کراما میں ان کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہ منہ بسورے بیٹھے ہیں اگر بھابی کے چہرے پر بے ساختہ ہنسی آنے سے پہلے کے آثار نظر نہ آتے تو خیریت دریافت کرنا ضروری ہوتا۔ فاضل بھائی کے اب تک تیار نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوتے ہی ہم دونوں کے حلقوم سے ایک ساتھ قہقہہ پٹاخے کے پھٹنے کی آواز کے ساتھ چھوٹا۔ معلوم ہوا کہ صبح صبح ان کے بڑے صاحبزادے نے ان کی نئی پتلون جو آج پہن کر جانے والے تھے گھٹنوں میں سے بے دردی کے ساتھ پھاڑ کر ان کی چڈی بنائی، آستین والی بنیان کے ساتھ پہن کر جاگنگ کرنے جمیرا بیچ چلے گئے ہیں اور اسی بیچ پر ایک نیم سرکاری ادارہ کی طرف سے بونی ایم BONY-M گروپ کی عورتوں کو گھاگرا اور چولی اور مردوں کو پنجابی لنگی پہنا کر بھانگڑا ایمی کرایا جا رہا تھا۔ میں نے کہا دوسرا پتلون پہن لو۔ کیا پتلونیں اور نہیں ہیں۔ انھوں نے دکھ سے کہا کہ بات پتلون کے نقصان کی نہیں ہے اور امریکیوں کو قانون نے اور کو سمجھنے کے بعد اپنی تہذیب، تمدن، روایات، شرم و حیا کے تیزی سے ختم ہونے کا رونا رویا۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ عراق کویت

تعیش کے دوران یہاں پورے خلیج میں آنے والے امریکن (سپاہی) تمام اخلاقی پستیوں کا کھلے عام مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عجیب عجیب حلیوں اور شکلوں میں انھیں دیکھا جاسکتا ہے سر کے بال اس طرح سے تراشے جاتے ہیں کہ بالکل ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی پبلک گارڈن یا زوں میں چھوٹا سا چبوترے یا کوٹے کی طرح تراشیدہ کروٹن کا درخت ہو۔ یا بالکل شفاف لیکن بیچوں بیچ ایسا لگے کہ کوئی پالتو گلہری گردن کی طرف منہ کیے بیٹھی ہوئی ہو۔ دور سے دیکھو تو معلوم ہو کہ کوئی بازیگر ہے جس نے اپنے سر پر پالتو خارپشت جانور بٹھائے چلا جا رہا ہے۔ ایسے نوکیلے بال تراشنا بھی فیشن ہے۔ مائیکل جیکسن لٹ اور جھمکوں نے رنگین مزاجوں سے راستوں کو پک کر دیا ہے۔ سامنے سے دیکھو تو خشخشی اور پیچھے گھاس جیسے دراز بال۔ پیروں میں پلاسٹک کی دو پٹی والی چپل (سلیپر) جسم پر جیبیں تو بول جیسی بنیان اور گھٹنوں تک لاتی چڈی جس کا ایک پائنچا سادہ اور دوسرا پینٹ شدہ اکثر صورتوں میں جزیرہ ہوائی کا منظر نامہ رنگین تصویروں میں چھپا ہوتا ہے۔ بنیان بھی عموماً مطبوعہ دلچسپ ناد ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی بنیان کی پشت پر فالو می Follow me دیکھ کر پیچھے پڑنے کے بعد آگے پہنچ کر اپنی گردن کو گھومنے سے روک نہ سکے تو مارے شرم کے اپنے آپ پر لعنت بھیجتے ہوئے سرپٹ بھاگ لیں گے اور اپنے اندر والے کو خوب کوسیں گے کہ تیرے بہکاوے میں آ کر پلٹا۔ پشت تو زلفوں، چال اور جھٹکوں کی نسبت زنانہ ہی لگے اور آگے بغیر زلفوں کے جو صورت نظر آئے گی وہ پانچ اور سات کا درمیانہ ہوگا۔

فاضل بھائی کا موڈ بہت ہی خراب ہو گیا تھا۔ بھابی اشارہ کر کے وہاں سے اٹھ گئیں کہ کسی طرح ٹھیک کر دوں۔ میں نے کہا: "بس اب رہنے بھی دو فیشن نے ہر دور میں عاقبت کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ اپنا دور یاد کرو۔ اس وقت لڑکیوں نے ایسی دھوم مچائی تھی کہ والدین کے ہوش گم تھے تو نوجوانوں کے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ جسم سے چپکا ہوا۔ اتنا چست لباس پہنا جاتا تھا کہ جیسے جسم انسانی کو ڈیکو پینٹ کر کے گل بوٹے اتار دیئے ہوں اور اوڑھنی ایسی نکوڑی ہوئی تی کہ جیسے گلے میں رسّی کی مالا ڈال لی گئی ہو۔ ہم کو کیسا ہراساں اور حیران کیا تھا۔ ایسی حالت میں بھی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ اس کے جواب میں اپنے کالر کھڑے کر کے انھیں محاذ آرائی کے لیے للکارا تھا۔ اس حالتِ جنگ سے گھبرا کر ہمارے سرپرستوں نے ہمارے کالر گرانے کی کتنی کوششیں اور جتن کیے تھے وہ تو درزیوں اور ڈاکٹروں کا بھلا ہو کہ انھوں نے ہماری مدد کی۔ درزیوں نے کالروں میں پلاسٹک کی کاڑیاں دے کر مضبوطی سے Stand کر دیا تھا اور ڈاکٹروں نے یہ فتوٰی دیا تھا کہ کالر کھڑے رکھنے سے سن اسٹروک کا خدشہ نہیں رہتا۔ لُو لگ کر مرنے سے بچایا جاسکتا ہے اس جنگ کو جیت کر ہی کالر گرائے تھے۔ دوسرے حملے کے طور پر قدامت پسند خواتین کے غرارہ کو بیل باٹم پتلونوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس طرح ان کی سبکی اڑائی تھی۔" فاضل بھائی نے دہشت زدہ سر کو گھما کر آس پاس دیکھا اور اطمینان کی سانس لے کر مسکرا دیئے۔ میرے مثبت اظہارِ خیال سے انھیں یک گونہ سکون ملا کہ خواہ مخواہ اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ فیشن بھی چند روزہ ہوگا۔ ان کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ انھوں نے کہا" اور آج ایسا لگتا ہے جیسے اولمپک کھیلوں کا پرچم لہراتا ہوا کوئی بھاگ رہا ہو اتنا کپڑا جسم پر اور پیر کے انگوٹھے سے لے کر ایڑی تک دراز دوپٹہ اس طرح کاندھے پر ڈال لیا جاتا ہے جیسے دیہاتوں میں لوگ رومال کاندھے پر ڈال لیتے ہیں۔ پتہ ہے تمھیں نوجوانوں

نے خواتین کے اس فیشن کو دن دہاڑے ٹریفک کا نام دیا ہے" میں نے شہ دی: "اور سنو یہ دوپٹہ ہے جس کا کام کی چیز نہیں محض مقصدی ہے۔ ایک بار حیدرآباد میں تمھاری بھابی نے دوپٹہ استری کرکے رکھا ہی تھا کہ ہمارے سسر صاحب نے اس کو اچک لیا اور سر پر باندھ کر بازار چلے گئے۔ لیکن خواتین بھی بڑی حاضر اور تیز دماغ ہوتی ہیں۔ انھوں نے ایک نئی پرنٹیڈ سنگل بیڈ شیٹ اٹھائی اور کاندھے پر ڈال لی۔"

فاضل بھائی نے قہقہہ لگا کر کہا "اور یہ شوہروں کی کبھی کبھی لنگی بھی بن جاتا ہے۔"

بھابی ناشتہ چائے وغیرہ لے آئیں ہم لوگوں کو ہنستے دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا۔ میں نے موضوع کو سنجیدہ بنانا ضروری سمجھا۔ بصورتِ دیگر رو میں ان کی زبان پھسل جائے تو انھیں دوبارہ سنجیدہ ہونے سے روکنا مشکل تھا۔ "فیشن نے ہر دور میں قدامت پسندوں اور ترقی پسندوں کے درمیان معرکہ مچایا ہے۔ فیشن کے ذریعے عوام پر اچھے برے اثرات ڈالے جاسکتے ہیں۔ ہر دور میں عوام کی ایک بڑی اکثریت فیشنیانہ ہوئی ہے۔" بھابی نے حیرت سے پوچھا "یہ فیشنیانہ کیا ہے؟" "آپ کو یاد ہوگا کہ کسی زمانے میں فسطائی طاقتوں نے ساری ہندوستانی قوم کو ہندیانہ کردینے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہندوستانیوں نے ہندیانہ ہونے سے انکار کردیا تو ہندوانہ بنا دینے کی تحریک چلائی گئی۔ یہ بھی ناکام ہوگئی تو سیاست والوں نے اپنے طور پر ہندوستانیوں کو قومیانہ کرکے اس معرکہ آرائی کو ختم کرنا چاہا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔" فاضل بھائی نے بہت ہی خوب مشورہ دیا کہ ایسی تحریکیں چلانے والوں کو چاہیے کہ وہ فیشن ایجاد کرنے والوں کی خدمات سے استفادہ کریں۔ اس کی مثال بھی انھوں نے معقول پیش کی کہ ہمارے ایک فلمی نغمہ چولی کے پیچھے کیا ہے کے پیچھے بھی ہمارے قدامت پسند ایسے پڑ گئے کہ اسے گھسیٹتے ہوئے ملک کی سب سے بڑی عدالت میں لے گئے تاکہ اس بیہودہ گانے کو جکڑ کر قید کردیا جائے۔ لیکن یہاں بھی قدامت پسندوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بجائے اس کے کہ اس بیہودہ گانے کو ممنوع قرار دیا جاتا اسے حقوق نغمہ سرائی میں بے جا مداخلت سمجھا گیا۔ بالآخر مخالفین نے اس کو عامیانہ قرار دے کر صبر کرلیا۔ لیکن اسی عامیانہ گانے کو ہمارے پڑوسی ملک نے اپنی انتخابی مہم میں شامل کرلیا۔ اس کو اس جماعت نے بھی اچک لیا جس نے سارے پاکستانیوں کو اسلامیانہ کردینے کی قسم کھائی تھی۔ دو متحارب سیاسی جماعتوں نے اس کو استعمال کرکے برابر کا موقف حاصل کیا اور جمہوریت کو پروان چڑھایا۔ جس گانے کو ہمارے یہاں عامیانہ قرار دیا گیا اسی گانے کو ان جماعتوں نے گھر گھر پہنچا کر (عام) عامیانہ کردیا۔ یہی نہیں اس فیشن کی دوڑ میں مذہبی جماعتیں (بشمول جماعت اسلامی) بھی شامل ہوگئیں اور قومی گانوں کا سہارا لیا اور شکست کھائی کیوں کہ گھر کے گانے سُر بے اثر ہوتے۔

آج بلا قید و عمر، بلا تفریق مذہب، رنگ و نسل جسے دیکھو فیشن میں مبتلا ہو کر فیشنیانہ ہو چکا ہے۔ فیشن کے ذریعے عوام کی آئیڈیالوجی تبدیل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا حتیٰ کہ بات

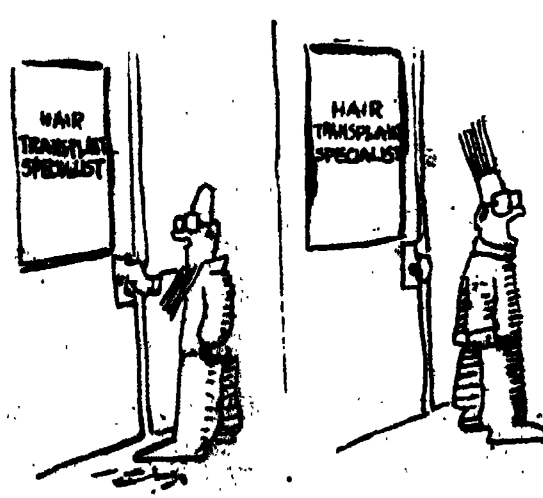
کو بھی فیشن کے تابع ہے ۔ فیشنیانہ عورتیں اتنا آہستہ بات کرتی ہیں کہ مذکر کو ان کی بات سننے کے لیے اپنے کان ان کے منہ تک لے جانا پڑتا ہے ۔ بات سمجھنے میں کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو پھر کان کی خیر نہیں ۔ دبلے (SLIM) ہونا بھی فیشن میں داخل ہے ۔ خود ساختہ فاقہ زدہ نوجوانوں کی کمی نہیں ۔ یہاں دبئی میں ہر صبح ہندوستانی و پاکستانی فربہ اندام بیویوں کا فرماں بردار شوہروں کے ساتھ WALK-ING / چہل قدمی کو نکلنا بھی فیشن میں داخل ہے ۔ کیوں کہ یہاں ان سماجی رشتہ داروں کی کمی ہے جو آپس میں ایک دوسرے کا خون جلایا کرتے ہیں ۔ نند ۔ دیورانی ۔ جیٹھانی وغیرہ ۔ سماجی جھگڑے مسائل ، کڑھن ، جلن ، فکر ، پریشانی نہ ہونے کے سبب جسم ہے کہ پھولتا ہی جاتا ہے ۔

ایک دن فاضل بھائی کے اسی فیشنیانہ صاحبزادے کو عبرہ (دبئی اور دیرہ کے درمیان پانی کی خلیج کو عبور کرنے والی موٹر بوٹ) میں مہذب و شائستہ حلیہ میں دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ ہمارے نوجوان صبح کے بھولے ہوئے ہیں جو شام ہونے سے پہلے لوٹ کر آجاتے ہیں ۔ اس نے نفیس سفید کرتا اور چھوٹی موری کے پائجامے کو زیب تن کیا ہوا تھا ۔ باریک تراشیدہ مونچھیں اور سلیقے سے جمے ہوئے بالوں میں اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوا کہ یہ چمتکار کیسے ہو گیا ۔ میرے سلام کا خالص دکنی انداز میں فرشی جواب دیا تو بڑی خوشی ہوئی ۔ اور جب شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرنے نزدیک گیا تو بڑی خوب صورتی سے اپنے سر کو بچا لیا ۔ میں نے اس کو اس حلیے میں دیکھ کر سراہا تو اس نے بتایا کہ دراصل یہ اہتمام AL. GURAIR الغریر میں ہونے والے اس غزل کنسرٹ کے لیے کیا ہے جس میں امیر محمد خاں اور طلعت عزیز کی غزلوں کا مقابلہ ہونے والا ہے ۔ دھت تیری ۔ گویا خود اپنے ساتھ تہذیب کو بھی فیشنیانہ کر دیا ہے ۔ اکثر دیکھتے ہیں کہ ارض البلد میں بھی لوبان و عود کے دھویں کی جگہ سگریٹ اور سگار کے کثیف دھویں سے بھرے نیم تاریک بند دیوان خانوں میں چہرے پر اداسی حزن و ملال ، مایوسی و ناامیدی کے تاثرات لیے نوجوان اسٹیریو پہ دھیمی آواز میں گھنٹوں غزلیں سنتے نظر آئیں گے ۔ اگر ان سے شعر لکھوایا جائے تو وہ جنگل کا شیر ہی لکھیں گے ۔ غزلیں سننے کے لیے اس اہتمام کی شرط لازمی ہے کیوں کہ یہ بھی فیشن کا ایک حصہ ہے ۔ اسی طرح خلیجی شہروں میں جہاں مشاعروں کا ایک موسم ہوتا ہے اور تمام موسم اپنی میعاد بغیر کسی ناغہ کے پورا کرتا ہے ۔ اس موسم میں کوئی نوجوان شیروانی و پائجامہ میں نظر آ جائے تو یہ نہ سمجھیے کہ وہ تہذیب میں پایا جا رہا ہے ۔ وہ یقیناً کسی مشاعرہ میں شرکت کرنے والا ہے ۔

فیشن میں بڑی کشش ہے جوان ، بوڑھے ، عورت ، مرد سب ہی کے لیے یہ کشش یکساں مقناطیسی قوت رکھتی ہے ۔ حتیٰ کہ کم سن اور تو تگو (یعنی نیا نیا بولنے والا) بچہ بھی اس کی زد و ضرب سے نہیں بچا ہے ۔ ایسے بچوں کو اپنے باپ اور خود سے بڑے ہر شخص کو انکل کہنا ان کا فیشن ہے چاہے وہ کوئی رشتہ ہی رکھتا ہو ماموں ، چچا ، خالو ، پھوپھا سب انکل کہلائے جاتے ہیں ۔ خلیج میں بیوی ساتھ ہو جائے [illegible] بچے ساتھ وغیرہ کچھ بھی [illegible]

ہو تبھی بیبی کہلائے گی اور کوئی صاحب بیوی اور بچہ دار اپنے ساتھ نہ رکھتا ہو تو بیچلر کہلائے گا۔ بعض حضرات محض بیچلر کہلائے جانے کی حسرت میں اپنے بیوی بچوں کو وطن بھیج دیتے ہیں۔

ایک دن صفا پارک میں بھابی اور بچوں کو دیکھا۔ دور ہی سے بعد سلام فاضل بھائی کو پوچھا۔ انھوں نے ہنستے ہوئے کروٹن کی قدِ آدم باڑ کے پیچھے اشارہ کیا۔ اسی اثنا میں ان کے سر نے مجھے دیکھا اور دبک گیا۔ میں بھی مخالف سمت سے ادھر بڑھا اور میری طرف پشت کیے جس حلیے میں دبکے بیٹھے تھے دیکھ کر بے ساختہ ہنسنے کو جی چاہا لیکن ان کی دانست میں میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کے نزدیک پہنچ کر دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو بند کرتے ہوئے مٹھی بنائی اور دونوں ہاتھوں کی اول انگلیوں کو سیدھا تان کر ان کی کمر میں گھسیڑ دیا۔ انھوں نے بے ساختہ ایک چیخ ماری اور حواس باختہ یوں اچھل پڑے جیسے کسی اسپرنگ دار تختے پر بیٹھے ہوں اور تخت سے لگے ہک نے ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ یہ تکنیک فلموں میں شوٹنگ کے دوران ویلن کو ڈراپ کک مارنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ میں نے انھیں امریکن چڈی اور پلاسٹک کی دو پٹی (سلیپر) میں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ آخر یہ بھی فیشن کی زد اور ضرب سے بچ نہ سکے۔ انھوں نے کھسیا کر کہا۔ "میرے پاس اور چڈیاں ہیں چاہو تو تم بھی پہن سکتے ہو۔ دیکھو تمھاری توند بھی باہر آرہی ہے۔"



غزل

روف رحیم
(حیدرآباد)

(عزیز قیسی مرحوم کی غزل سے متاثر ہو کر)

انھیں مذاق ہی لگتا ہے اپنا رونا بھی
ستم ظریفی ہے بے شک ظریف ہونا بھی

ادب ہے شاعری میری، ہے وہ کھلونا بھی
اسی کو پڑھ کے ہے ہنسنا بھی اور رونا بھی

بھلا نہ یاد تمہیں شاعری میں سونا بھی
ہوئی ہے رات بہت اب تو گھر چلو نا بھی

ہمارے باپ کی جاگیر ہے یہ شعر و ادب
ہے اوڑھنا بھی یہی اور یہی بچھونا بھی

ہم ایسے ہو گئے مایوس بدنصیبی سے
کہ ہم پہ چل نہیں سکتا ہے جادو ٹونا بھی

میں اُن کے گھر پہ جماؤں گا ایک دن قبضہ
اگر نصیب سے مل جائے اس کا کونا بھی

مری نظر میں ہے دہشت تمہارے رُخ کی سدا
ڈراؤنا سا لگے سپنا ہر سلونا بھی -

بہت دنوں سے پریشاں ہوں شادی کر کے میں
نصیب میں ہے پکانا بھی اور دھونا بھی

نہ صرف ریس نے گھر کو مرے بکایا ہے
بکانے جسم کے کپڑے بھی اور بگونا بھی

وہ مسندوں پہ صدارت کی بیٹھتا ہے رحیم
جسے نصیب نہیں گھر میں اک بچھونا بھی

منہ پھٹ ناگپوری

○

سمجھ کر سوچ کر آفت میں جاں کوئی نہیں دے گا
ہم ایسوں کو کرائے پہ مکاں کوئی نہیں دے گا

جوانو! اپنی اوچھی حرکتوں سے باز آجاؤ
وگرنہ تم کو اپنی بچیاں کوئی نہیں دے گا

نہ ہوگی امتحاں گاہوں میں گر کولر کی آسانی
تو اپریل اور مئی میں امتحاں کوئی نہیں دے گا

یہاں کھانا فری، کپڑا فری، دارو بھی، گانجہ بھی
کسی کو جیل سی آزادیاں کوئی نہیں دے گا

مصیبت میں سہارا بیکس و مجبور لوگوں کو!
فلاں ابن فلاں ابن فلاں کوئی نہیں دے گا

اگر دو چار دن اخبار سارے بند ہو جائیں
ہمارے لیڈروں کو گالیاں کوئی نہیں دے گا

محمد علی رفعت
(حیدرآباد)

○

اب گدھے بھی آم کھارئیں یا اخی
اور 'فرس' کاغذ چبارئیں یا اخی

مرغ، مچھلی اور لحم کو چھوڑ کر!
خان بابا 'اڈلی' کھارئیں یا اخی

کھلگے بھی سینگاں کٹا کو گھوم رئیں!
بچھڑوں میں ملنے کو جارئیں یا اخی!

چوکڑے کے زور پہ نانا حضت
گود کے نلیاں چبارئیں یا اخی

دعوتوں سے 'چاکنا' غائب ہوا
آلو اور پالک کھلارئیں یا اخی

ڈاکٹر اختر بستوی
(گورکھپور)

حسن اور ترکاری

آج میں نے اس ارادے سے قلم اٹھایا ہے کہ حسن اور ترکاری کو ایک ہی قبیل کی چیزیں ثابت کروں گا۔ میرے اس ارادے پر آپ نہ تو میرا مذاق اڑا سکتے ہیں اور نہ مجھ پر اعتراض کر سکتے ہیں، کیوں کہ اگر سائنس داں حضرات "بتی اور انسان" اور "ایٹم اور اخلاق" میں، شعرائے کرام "آئینہ اور کلی" اور "عصمت اور آبشار" میں اور مضمون نگار حضرات "موٹر اور مولوی" اور "ارہر کے کھیت اور پارلیمنٹ" میں مشترک خصوصیات ڈھونڈ سکتے ہیں تو "حسن اور ترکاری" میں مماثلت تلاش کرنے کی میری اس کوشش کو آپ محض ایک سعیِ لاحاصل کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ترکاری کی دکان دیکھ کر مجھے اردو شاعری کی روایتی حسینہ کا خیال آجاتا ہے تو آپ مجھے پاگل نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو آپ بھی گول گول اور سرخ سرخ ٹماٹروں اور شرمائی ہوئی حسینہ کے گالوں میں مشابہت دیکھ سکتے ہیں۔

سڈول پرورلوں کے دونوں کناروں کا متناسب خم آپ کو لمبی لمبی آنکھوں کے کونوں کی یاد دلا سکتا ہے۔ کدو کی کمان جیسی قاشیں دیکھ کر ابروئے خمیدہ کا اور لمبی لمبی چکنی چکنی ترکیاں دیکھ کر مرمریں باہنوں کا خیال آسکتا ہے۔ ذرا لوکیوں کا تصور کر دیکھیے۔ کیا ان کی چکناہٹ پر بھولے بھولے ہاتھ پھیرتے ہے آپ کے جذبات میں کچھ ویسی ہی لطیف لرزش نہیں محسوس ہوتی جیسی کہ مکھن سی ملائم باہنوں "پہ انگلیاں پھیرنے سے محسوس ہوتی ہے۔

یہ بات صرف اردو شاعری کی روایتی حسینہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ آج کل کی فیشن پرست لڑکیوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ایک بار میں ایک ترکاری کی دکان پر کھڑا ہوا تھا۔ میری بغل میں ایک نہایت حسین اور فیشن ایبل خاتون بھی کھڑی ترکاریاں خرید رہی تھیں۔ میرے ایک منچلے دوست نے مجھے اس حالت میں گرفتار کرلیا۔ اس دن تو وہ کچھ نہیں بولے، لیکن دوسرے دن شام کو جب مجھ سے ملنے آئے تو انھوں نے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا: "کہیے حضرت! کل ترکاری کی دکان پر کیا ہو رہا تھا؟"

میں نے بڑی سادگی سے جواب دیا: "ترکاریاں خرید رہا تھا۔"

وہ اپنا تبسم واپس لیتے ہوئے چونکے: "کیا مطلب؟"

میں نے کہا: "صحیح عرض کر رہا ہوں۔ ترکاریاں ہی خرید رہا تھا۔ مگر بے دام، اور ہاتھوں کے بجائے نظروں سے"۔۔۔۔ ان کی حیرت کو اور زیادہ بڑھتے دیکھ کر میں نے وضاحت کردی: "جناب! ایک خوب صورت عورت کو دیکھنے اور ترکاریاں خریدنے میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ حسن بھی ایک طرح کی ترکاری ہی ہے"۔۔۔۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ میرے اس جملے سے دوستوں کو ایک نئی اصطلاح ہاتھ آگئی۔ اب اگر کسی صاحب کو احباب کی توجہ کسی "جمالِ رہگزر" کی طرف مبذول کرانی ہوتی ہے تو وہ فرماتے ہیں: "یار ادھر دیکھو، ایک نئی ترکاری!"

آپ ذرا سڑک پر گھومنے والی لڑکیوں کو کبھی غور سے دیکھیے۔ وہ جب بن سنور کر نکلتی ہیں تو اچھی خاصی چلتی پھرتی ترکاری کی دکان نظر آتی ہیں۔ ان کے لپ اسٹک تھپے ہوئے گہرے سرخ ہونٹوں کو دیکھ کر چقندر کی قاشیں یاد آتی ہیں۔ ان کے عجیب عجیب اسٹائل کے بالوں کو دیکھ کر کبھی ہری دھنیا کی پتیوں کے بندھے ہوئے گچھوں اور کبھی مولی کے پتوں کا خیال آتا ہے۔ پیچ در پیچ دائروں میں لپٹے ہوئے جوڑے، علاوہ رنگ کے ہر طرح کی مشابہت گول کرم کلوں سے رکھتے ہیں۔ ایسی ہی اور بھی بہت سی تشبیہیں ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن اگر میں نے انھیں اسی طرح بیان کرنا جاری رکھا تو خوف اس بات کا ہے کہ آپ کہیں مجھے کوئی کنجڑا نہ سمجھ بیٹھیں۔ ویسے ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ جب یہ لڑکیاں چلتی پھرتی ترکاری کی دکان نظر آتی ہیں تو پھر تہذیب کے وہ فرزند کیا کہلائیں گے جو ان کو فخریہ سڑک پر لے کر نکلتے ہیں گویا پکار پکار کر کہنا چاہتے ہوں: "دیکھو میں ایسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ چل رہا ہوں۔"

جس طرح ترکاریاں خریدتے وقت لوگ خوب مول بھاؤ کرکے اور انھیں ہر ہر طرح سے دیکھ کر خریدتے ہیں کہ کہیں ٹماٹر داغ دار نہ ہوں، بھنڈیاں سخت نہ ہوں، ترئیاں موٹی نہ ہوں، تقریباً بالکل اسی طرح کسی حسین دوشیزہ کو ساری زندگی کے لیے خریدتے وقت بھی باقاعدہ مول بھاؤ کیا جاتا ہے، جہیز پر خوب خوب تکرار ہوتی ہے اور لڑکی کی خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کی جاتی ہے کہ گال بیٹھے ہوئے تو نہیں، بال کھردرے تو نہیں، ناک موٹی تو نہیں۔

اگر اس موضوع کا مطالعہ مارکسی نکتۂ نظر سے کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ایک ہی قسم کی ترکاریوں کا استعمال امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی رنگ اور روپ کے چہرے امیر اور غریب دونوں کو بیوی کی شکل میں یا کسی اور طرح مل سکتے ہیں اور جس طرح ہر ترکاری جب مہنگی ہوتی ہے تو صرف امیروں کے ہی استعمال کی چیز ہوتی ہے ۔ لیکن وہی جب سستی ہو جاتی ہے تو غربا بھی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
حسن جب محلوں میں جنم لیتا ہے اور جب اس کے دیکھوں تک پہنچے گے لیے خوب صورت کا رول عقیق کپڑوں اور بیش قیمت

جواہرات کی ضرورت ہوتی ہے تب وہ صرف امیرزادوں ہی کی چیز ہوتی ہے لیکن بالکل ویسا ہی حسن اگر جھونپڑوں کی تاریکیوں میں پیدا ہو تو وہ ایک فقیر کے حصے میں بھی آسکتا ہے۔ اگر ہم برہمچاریوں کی نظر سے دیکھیں تو حسن اور ترکاری باہم متضاد چیزیں نظر آئیں گی۔ ویجیٹیرین حضرات گوشت خوری کو تشدد کا باعث سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ترکاریوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں مگر برہمچاری دنیا کے موہ مایا جال کے الجھاؤں سے نکل کر نروان حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حسن کے خیال سے بھی دور بھاگیں اور پہاڑوں کی تاریک گپھاؤں کو زلفوں کی چھاؤں پر ترجیح دیں۔ اس طرح ترکاری تو ان کی پاک زندگی کا جزو لازم ہے مگر حسن کو وہ تقدس کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے ہیں۔ لیکن برہمچاریوں کی باتیں تو اب قصۂ ماضی بن چکی ہیں۔ اس لیے حسن اور ترکاری کو ایک ہی رشتے کی چیزیں سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔

اس طرح اصولی طور پر تو حسن اور ترکاری ایک ہی چیزیں ثابت ہوئیں۔ لیکن اب آئیے ذرا یہ دیکھیں کہ اس نظریے کو درست سمجھنے کا انجام عملی زندگی میں کیا ہوسکتا ہے۔ میں اس ضمن میں ایک چھوٹا سا مگر قابل غور واقعہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ نتیجہ آپ خود ہی اخذ کرسکتے ہیں۔

میرے ایک شاعر مزاج دوست تھے، جن کی بیگم خود انھیں کے بیان کے مطابق "نازک سی سانولی سلونی سی عورت تھیں۔ دوسرے لوگ تو خیر انھیں خوب صورت سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے مگر جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔ حضرت ان کے سانولے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کی تعریف اکثر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ساون کی جھکی ہوئی گھٹاؤں کی طرح مست پلکیں ان کے ذہن میں رنگینیوں کے دیئے جلا دیتی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ بیگم کو خود اپنے خوبصورت نہ ہونے پر احساس کمتری کبھی کبھی ستایا کرتا تھا۔ جناب کو بیوی کے علاوہ بھنڈی کی ترکاری بھی بہت پسند تھی، بشرطیکہ اسے پیاز کے ساتھ گھی میں خوب سرخ سرخ بھونا گیا ہو۔ ایک دن بیگم صاحبہ نے ان کی اسی طرح کی پسندیدہ ترکاری پکائی مگر وہ بھوننے میں ذرا زیادہ سرخ ہوگئی، اتنی کہ کچھ سیاہی مائل ہوگئی۔ شوہر نامدار جب گھوم گھام کر گھر پہنچے تو انھوں نے ڈرتے ڈرتے کھانا سامنے رکھا کہ دیکھیں انھیں ترکاری پسند آتی ہے یا نہیں مگر وہ ٹھہرے ہمارے ساتھی۔ انھیں اتنا ہوش کہاں کہ ترکاری زیادہ بھون دی گئی ہے۔ پہلے ہی لقمے کی لذت نے بیوی کی تعریف پر اکسایا۔ شامت اعمال، میں نے اسی دن انھیں حسن اور ترکاری کی مشترک خصوصیات بہت دیر تک سمجھائی تھیں۔ چناں چہ وہ دوسرا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے بولے۔" واہ واہ بیگم! خدا کی قسم ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیا شاندار ترکاری پکائی ہے! واللہ بالکل تمہاری ہی طرح ہے"۔ بیگم نے یہ سمجھا کہ ترکاری کے جل جانے پر طنز کیا جارہا ہے۔ عورت اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ اب بیگم کو حضرت کے تمام وہ جملے جو انھوں نے صدق دل سے ان کے حسن کی تعریف میں کہے تھے، طنزیہ اور استہزائیہ نظر آنے لگے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یعنی شوہر صاحب لاکھ روٹھی ہوئی بیگم کو کسی طرح نہ منا سکے اور میں اس نظریے کی تشہیر پر ان کے ہاتھوں پٹتے پٹتے بچا۔

۷۸

قلمی معاونین سے التماس

کاغذ کے ایک رخ پر سیاہی سے صاف و خوش خط تحریر فرمائیں۔ زیراکس کاپیاں نہ بھیجیں۔ مسودوں کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

مرزا مصطفیٰ علی بیگ
(حیدرآباد)

غزل

تو جو ہارا ہے الیکشن آل رائٹ
پیدا کر لے نیو کنکشن آل رائٹ

اونچے محلوں میں بھی ہے ذہنی فساد
جھونپڑا پٹی میں ٹینشن آل رائٹ

ہارٹ کا سا ڈر کرانے کے لیے
ان کی نظروں کا اٹینشن آل رائٹ

نت نئی فرمائشیں ہیں وائف کی
کیا کرے گا اب کرپشن آل رائٹ

ہیں منسٹرس اسّی اسّی سال کے
ہم کو اٹھاون میں پنشن آل رائٹ

ز میری کٹیا ان کا مینشن آل رائٹ
اپنا اپنا ہے سیلیکشن آل رائٹ

ان کو خط دینے سے پہلے نامہ بر
لے لیا اپنا کمیشن آل رائٹ

غم ملا آہیں ملیں آنسو ملے
ہے محبت کا یہ راشن آل رائٹ

گالیاں بھی سوئیٹ ہیں دلدار کی
اس کا لہجہ اس کا ڈکشن آل رائٹ

بولڈلی چیٹنگ کریں گے ہم مگر
کچھ بھی کر لو تم کرپشن آل رائٹ

میرے دل کے آپریشن کے لیے
ایک ہو یا دس ہوں سرجن آل رائٹ

ہارٹ کی یہ آرزو بھی ہے مگر
نرس کا بھی ہو اٹینشن آل رائٹ

ہر حسین چہرے کی واچنگ کے لیے
بن گیا ہوں واشنگ بیسن آل رائٹ

آدمی اک جسم اک اور جان ایک
خون کے قطروں میں ٹینشن آل رائٹ

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

میں بڑا کہ تو بڑا — وہی بڑا

(تمثیلی مکالمات)

فساد: (زلزلہ سے) اے کہ شہنشاہِ تباہیات! میں اپنا کام بہ حسن و خوبی انجام دے رہا تھا۔ آپ کیوں اور کہاں سے چلے آئے ــــ

زلزلہ: کیوں بکتا ہے واہیات! میں تیری کارکردگی سے نہ تھا مطمئن نہ شاد۔ مجھے نہیں تھا چین و قرار کہ تیرے کام کی رفتار تھی سست اور ناہنجار ــــ

فساد: انسانوں کی جان لیتے ہو انھیں تباہ و برباد کر دیتے ہو، نیند میں ہوں کہ لیٹے بیٹھے انھیں ان کے گھر میں دفن کر دیتے ہو۔ کچھ بولنا بتانا کچھ بھی نہیں۔ ؟ باؤلا اٹھا سر سے مسل لیجانا۔

زلزلہ: میں بولنے میں نہیں عمل میں یقین رکھتا ہوں۔ اشرف المخلوقات کو بتاتا ہوں کہ سب انسان برابر اور تم جیسے تباہی کے معمولی ٹھیکے داروں کو دکھاتا ہوں کہ کم وقت میں کہاں سے کہاں تک ہنگامہ برپا کیا جا سکتا ہے۔

فساد: میں معمولی ٹھیکے دار نہیں سیاستوں کی جرتوں میں پلا بڑھا اور اب میں سیاست دانوں کا استاد ہوں۔ پی ایم ہو یا سی ایم میرا نام سن کر سب سر جھکا لیتے ہیں

زلزلہ: تو ان کا استاد نہیں تو ان کا خوشامدی یعنی چمچہ ہے۔ سبق تو میں انھیں سکھاتا ہوں تو ان کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑا ان کا محض مہرہ ہے۔

فساد: معمولی مہرہ! دیکھتے ہی دیکھتے کرفیو لگا کے سارے شہر کی بانوں اور عظیم ہستیوں کو منظر عام سے غائب کر کے منظر خاص میں سب کاروں سے لگا دیتا۔ اور غنڈوں کو من مانی کرنے دیتا ہوں

وہ بلیوں اچھل جاتے ہیں۔ عید مناتے ہیں۔ خون کی ہولی رچاتے ہیں۔ کیا میں معمولی ہوں؟

زلزلہ: تیرے معمولی ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ تیرے کرائے کے بدکردار مٹی کے شٹوجنہیں تو غنڈے کہہ رہا ہے معصوم بچوں، ضعیفوں اور انجان عورتوں کا خون بہاتے ہیں تاکہ دیئے گئے ٹارگٹ کی تکمیل ہو کہ اتنے مرے اُتنے مرے۔ سلا کرفیو اس میں انسان بند ہو جاتے ہیں۔ پر دیکھ جب میں آتا ہوں تو مرنے والے آہ بھی نہیں کر سکتے۔ جو بچ گئے۔ گھر بار چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے اور وہ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ سب کو آزاد کھلی فضا میں بلاتا ہوں۔ عبادت، سخاوت میں منہمک کر دیتا ہوں۔ کرفیو میں تو آدمی شیطان بن جاتا ہے۔ بدنیتی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پیسہ بناتا ہے۔ ایک دوسرے کو لوٹنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ ہر طرح کے تنزل کا شکار نظر آتا ہے۔

فساد: کچھ میری بھی سنو گے۔ تم اپنی ہی ہانکے جا رہے ہو۔ یہ بھی سوچا کہ میں پولیس فوج کو سرگرم کر کے ان کو سستی اور کاہلی سے کھینچ لاتا ہوں اور عوام کی خدمت میں مصروف کر دیتا ہوں، رعایا کو یاد دلاتا ہوں ان کی موجودگی کا احساس پیدا کرتا ہوں، رعایا کو یاد دلاتا ہوں کہ قانون کیا ہے۔ عدالت کیا ہے۔ امداد کیا ہے، اتحاد کیا ہے، پھوٹ کیا ہے۔ قلت کیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر پولیس کو اچھی ہدایتیں نشر کرنے پر مجبور کرتا ہوں۔ مال داروں کو خیر خیرات پر اور با اعتماد اداروں کو فنڈز جمع کرنے میں منہمک کر دیتا ہوں۔

زلزلہ: عقل سے معذور فساد! تمھاری بچکانہ باتوں پر حیران ہوں، تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میں بتاتا ہوں کہ پولیس اور فوج کی وردی میں کوئی فرشتہ نہیں انسان ہوتا ہے۔ وہ بے نقاب ہو جاتا ہے جب مردہ خواتین کے جسموں سے ان کا زیور نوچ لیتا ہے۔ قانون انسان کے دماغ کی محض اپج ہے۔ اس نے احتیاطاً لکھ رکھا ہے کہ کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قانون بھول نہ جائے۔ ایسے قانون کی کیا حقیقت ہے جو ہرشد مہتا کو چھوڑ دے اور معصوموں کو ٹاڈا اور پاٹا کے تحت سزا دلائے۔ یاد رکھو کائنات کی سب سے بہترین اعلیٰ و ارفع عدالت خدا کی عدالت ہے۔ ان بندوں کو، کیا ہندو، کیا مسلمان ایک ساتھ کھڑا کر کے واحد خدا کا احساس دلاتا ہوں بغیر لاؤڈ اسپیکر کے کیا تم، کیا انسان، کیا تمہارے آقا، شیطان سب کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہوں سمجھے۔

فساد: لیکن لئے دانائی کے دعویدار کہتے ہیں۔ مندر مسجد توڑ دو لیکن دل کسی کا نہ توڑو۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہارے ظلم کا شکار عاشق بھی ہوتے ہیں محبوب بھی ہوتے ہیں حسن بھی ہوتا ہے حسن کا پرستار بھی ہوتا ہے۔ یہ عشق کے اعلیٰ منصب پر فائز بندے جنھیں خدا نے سوسائٹی کا ۱۲۰ بنایا ہے تم ان پر ظلم کی انتہا بن کر یلغار کرتے ہو۔ میں کہ جسے تم معمولی سمجھتے ہو اپنی سمجھ سے کام لے کر ان کے عشق کے بخار میں عارضی تعطل لاتا ہوں پھر سب بحال۔ پیار بھرے دلوں کو توڑتا نہیں جوڑتا ہوں اور تم عقل کے دشمن صرف اور صرف نری جہالت کا مظاہرہ کرتے ہو تو پلٹ کر دیکھتے تک نہیں کہ کیا سے کیا ہو گیا الاماں! زلزلے بھائی الحفیظ ——

چپ کیوں ہو گئے گز بھر کی زبان پر آدھے گز کا تالا لگ گیا۔ جواب دو۔ اے تباہیوں کی عظمت جتانے والے اشرف التباہیات، تیرے میرے بیچ اب یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ میں تم سے نہ صرف اچھا بلکہ عظیم ہوں میں ذرا جلدی میں ہوں کہ آج ایک لاکھ بچے جوان ہو گئے ہیں ان کے ذہنوں میں گھسنا ہے۔ برق رفتاری سے

ان کی تربیت کرنا ہے۔ تمھاری بکواس میں وقت ضائع کیا تو سنسار میں شرافت کا دور دورہ ہو جائے گا۔

زلزلہ: بند کرو یہ بکواس جی VIPS کی بات کر کے تم اپنی افضلیت جتا رہے ہو۔ اس بات پر غور کرو کہ میری ہی ایک دھکے سے ذہانت فطانت سے لمحوں میں انھیں ان کے مقصد اور منزل سے ان کو ہم کنار کر دیتا ہوں کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف چشم زدن میں لے آتا ہوں۔ فنا کے جو قائل ہیں انھیں فنا کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہاں بقا وہ جانیں، اوپر والا جانے۔ تم اپنے ساتھ پولیس فائرنگ بھی لاتے ہو اور گولی نا حق کے دل پر راست چلتی ہے۔ کہتا ہے دلوں کو جوڑتا ہے او ازلی حیوانیت کے پروردہ فرصت سے آنا بتاؤں گا کہ انسانیت کیا ہے شرافت کس کو کہتے ہیں؟

فساد: چلو مان لیتے ہیں تباہی و بربادی لانے میں تم مجھ سے افضل ہو لیکن میری قدامت مجھے تم سے آگے لے جاتی ہے کہ شیطان کا سجدے سے انکار کا دن میری سالگرہ کا دن ہے، حوا کا سیب کھانا جنت سے دھکے کھلا کے بے دخل کرنا میرے وجود کا کرشمہ ہے پھر ہابیل اور قابیل سے لے کر آج تک بلکہ ہر پیغمبر کے دور میں میری کارگزاری جاری و ساری رہی ہے اور آج بھی میں توانا اور تندرست ہوں، سدا بہار، پرشباب۔

زلزلہ: بوڑھے ضعیف فساد! عمر گزر گئی لیکن بچپن نہیں گیا، ذرا آئینے میں دیکھو! تمھارا بال بال سفید ہو چکا ہے لیکن تم بہت ناسمجھ ہو۔ اس بات پر تم نے آج تک غور نہیں کیا کہ ہر دور میں تم پر قابو آسان تھا تم قابل گرفت ہو بہت جلد تمھیں ٹھوک کر جھٹک دیا جاتا ہے۔ پھر بھی تم زندہ ہو، بے شرم، بے حیا، بے غیرت۔ مجھے دیکھو میں کسی کے قابو میں آنے والا نہیں، یوں آیا، یوں گیا۔ ساری دنیا میں عزت سے میرا ریکارڈ اٹھا کر رکھا گیا ہے سائنس نے کافی ترقی کر لی لیکن مجھے تسخیر نہ کر سکی، لاکھوں کروڑوں کے آلے نہیں بتا سکتے کہ میں کہاں ہوں کب آؤں گا، کب جاؤں گا کب جاؤں گا کہاں آؤں گا کتنی تباہی مچاؤں گا۔ پھر بھی کسی نے مجھ پر آج تک لعنت ملامت نہیں کی۔ میں اگر انسان کی گرفت میں آجاتا تو دس آنکھیں بیس ہاتھ مجھ میں جوڑ کر یہ آفت کے پجاری میری پوجا کرتے لیکن میں وقت سے بھی تیزی سے گزر جاتا ہوں کہ دیکھنے والے نے دیکھ لیا، پھر کسی کے بلانے پر بھی نہیں آتا چاہے اور تم۔ تمھیں تو قربانی کے بکرے کی طرح ہرا ایرا غیرا نتھو خیرا کان پکڑ کے جب جی چاہے تمھیں لا سکتا ہے اور تم ہمیشہ حاضر ہو۔ تمھیں بیچا، خریدا، تحفہ میں لیا دیا جا سکتا ہے۔ تمھیں دھویا پہنا، اتارا جا سکتا ہے۔ تمھیں لٹایا، بٹھایا اور طاق نسیاں میں رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میری بات سنو، ہوش کے ناخن لو۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔

فساد: میں مرنا نہیں چاہتا، اس کائنات میں کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ میں معمولی ٹھیکے دار معمولی مہرہ بن کر جیوں گا اور انسانوں کو نگنی کا ناچ نچاتا رہوں گا اور تم ہمیشہ زندہ رہو، ہمیشہ تیار رہو اُئی باپ --- میں اپنی غو نہیں بدل سکتا۔ تم عظیم ہو۔ میں حقیر ہوں۔ شیطان کا ادنیٰ سپاہی --- شیطان زندہ باد۔ شیطان زندہ باد۔

زلزلہ: آہاہا۔ جاؤ پھر ملیں گے۔ بائی۔

طوفان: (آندھی سے) بہنا! دیکھا ہے اناکی جنگ۔ تم بتاؤ کہ زلزلہ بڑا کہ فساد بڑا ---؟

آندھی: (غصے سے) مجھے پورے نام سے مخاطب نہیں کر سکتے صرف پریا ——— ؟

طوفان: اب ہم میں اَنا کی جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ بڑا کہ وہ بڑا ——— ؟

آندھی: (بہت تیزی سے) دہی بڑا ———!!

طوفان: دیپیا آندھی (چلاتا ہے)

آندھی: (مسکرا کے) تسلیمات!!! تباہی لانے میں ہم کسی سے کم نہیں ———

بجلی: (اچانک داخل ہو کر) دیدی! چھوٹی موٹی لیکن گپت تباہی لانے میں میرا بھی جواب نہیں۔ لیکن اے میرے بھائیو
ابر، اولوا ور منہ زور ہوا ذرا سچ سچ بتاؤ کہ آندھی دیدی بڑی کہ طوفان بھیا بڑا ——— ؟

سب ایک ساتھ: دہی بڑا۔

غزل

محبوب مانجھوی

(روحِ حسرت موہانی سے معذرت کے ساتھ)

آج تک ہم کو وہ کڑکی کا زمانہ یاد ہے
مسجدوں میں جا کے جوتوں کا چرانا یاد ہے

جوتیوں میں دال بٹنے کا زمانہ یاد ہے
جوتیاں کھا کر وہ اُن کا منہ پھلانا یاد ہے

طنز سے صیاد نے پوچھا اسیرو اب کہو
شاخِ گل پر بیٹھ کر وہ چہچہانا یاد ہے

میکدے میں روبرو ہم کو اچانک دیکھ کر
شرم سے زاہد کا یارو منہ چھپانا یاد ہے

گندی بستی سے کہیں بہتر تھی صاحب وہ جگہ
ہم کو اب تک وہ فضائے جیل خانہ یاد ہے

کرکے ایم اے ایک مدت نوکری کے واسطے
جوتیاں چٹخاتے پھرنا، دھکے کھانا یاد ہے

بھول سکتی ہے بھلا "نیتا" کو بھی جنتا کبھی
قول دے کر آپ کا وہ بھول جانا یاد ہے

لگ گئے محبوب بغلیں جھانکنے نیتا سبھی
میں نے جب پوچھا کہ کیا قومی ترانہ یاد ہے

مجیب الرحمٰن بزمی
(رانچی)

دُعا برائے لیڈر

○

یارب دلِ لیڈر کو بس ایسی تمنا دے
جو اپنی رذالت سے شیطان کو شرما دے
میدانِ سیاست میں گاما اسے بنوا دے
سنسد میں یہ جب پہنچے تو کرسیٔ اعلیٰ دے
بدکاری پہ جب اترے، چھوٹ اور بھی مولا دے
بھٹکے ہوئے بندے کو کچھ اور بھی بھٹکا دے
آثارِ مصیبت ہیں بس اتنا کرم فرما
اس بار الیکشن میں ایم۔پی اسے بنوا دے
نال پبلک کی خدمت کا احساس نہ ہو اس کو
اور خدمتِ پبلک کا تھوڑا سا سلیقہ دے
دولت کے لیے بیچے دن رات وطن اپنا
کر قلب سیہ اتنا کوئلے کو بھی شرما دے
اس حرص کے بندے کی اتنی سی دعا سن لے
تو بغض و عداوت میں استاد کا رتبہ دے

○

تمھیں دیکھا تو سارے دل کے ارماں جاگ اٹھے ہیں
اجازت ہو اگر جانم تو کچھ بیباکیاں کر لوں

یہی مدت سے خواہش ہے اگر مل جائے وہ بزمی
تو اس کے ساتھ چل کر میں بھی سیرِ گلستاں کر لوں

"الفاآف دی پلو" دراصل اے جی گارڈنر V.A.G.GARDINER کا قلمی نام تھا۔ وہ صحافی، سوانح نگار اور انشائیہ پرداز تھا۔ زیرِ نظر مضمون "A FELLOW TRAVELLER" کا ترجمہ ہے جو اس کے مجموعے "LEAVES INTHE WIND" سے لیا گیا ہے۔ الفاآف دی پلو کے فلسفیانہ مزاج سے قارئین ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

ہم سفر

عنوان: الفاآف دی پلو
ترجمہ: ڈاکٹر رؤف پاریکھ
(پاکستان)

مجھے نہیں معلوم ہم دونوں میں سے کون پہلے کوپے میں داخل ہوا بلکہ تھوڑی دیر تک تو مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ بھی کوپے میں موجود ہے۔ وہ لندن سے مڈلینڈ جانے والی آخری ٹرین تھی۔ جگہ جگہ رُک رُک کر چلنے والی ایک الٹی سست ٹرین جو آپ کو ہدایت کا مفہوم سمجھا دیتی ہے۔ ٹرین جب پہلے اسٹیشن سے چلی تو وہ قابلِ برداشت، حد تک بھری ہوئی تھی لیکن پیچھے جیسے وہ مضافاتی اسٹیشنوں پر رکی کئی مسافر ایک ایک دو دو کرکے اترتے گئے اور جب ہم لندن کے مضافاتی علاقوں سے نکل آئے تو میں اکیلا رہ گیا۔۔۔ یا یوں کہیے کہ میں اپنی دانست میں اکیلا رہ گیا۔ رات کے اندھیرے کو چیرتے شور مچاتے کوپے میں اکیلا ہونا ایک خوشگوار احساس کا حامل لیے ہوتا ہے۔ ایک ایسی آزادی جس میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو اپنے آپ سے اونچی آواز میں گفتگو کریں اور کوئی سننے والا نہ ہو۔ چاہیں تو اپنے ترتیب سے کی منتقلی کریں اور جو لگی مجھے ...

خطرناک بنا دیں۔ چاہیں تو سرے سے بلکو سے ہو جائیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو گا یا کسی اعتراض کا خطرہ مول لیے بغیر کھڑکی کھول دیں یا بند کر دیں۔ دل چاہے تو کوپے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیجئے یا دونوں بند کر دیجئے بلکہ جی کا نادی بنانے کے لیے آپ چاہیں تو سارے راستے کھڑکیاں کھولتے بند کرتے جائیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو گا جس نشست پر چاہیں بیٹھیں بلکہ باری باری تمام نشستیں آزمائیں۔ جی چاہے تو نشستوں پر باجے لیٹ جائیں سیٹوں پر پاؤں دھریں اور ریلوے کے قاعدوں اور قوانین کی کتاب کی دھجیاں اڑا دیں، ریلوے کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔

مگر اس رات میں نے ان میں سے کوئی حرکت نہیں کی۔ مجھے ان کا خیال ہی نہیں آیا۔ ہاں لیکن جب میرے ہم سفروں میں سے آخری شخص کوپے سے رخصت ہوا تو میں نے بہت عام سی حرکتیں کیں۔ یعنی میں نے اپنا اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے بازو اور ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی لی تھی۔ مغربی افق پر سورج کی ہلکی سی زردی کے آثار تھے پھر میں نے دوسری کھڑکی سے جھانکا ایک سگریٹ سلگایا اور دوبارہ اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کوپے میں ایک مسافر اور بھی ہے ..... میرا ہم سفر اچھا اور ...... آ کر میری ناک پر بیٹھ گیا۔ وہ ان پر دار، بہادر اور کاٹ کھانے والے کیڑوں میں سے تھا جنہیں ہم نے "مچھر" جیسا غیر واضح اور ناکافی قسم کا نام دے رکھا ہے۔ میں نے اسے ناک سے اڑایا۔ اس نے پورے کوپے کا دورہ کیا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی کا جائزہ لیا۔ دونوں کھڑکیوں کا معائنہ کیا۔ بتی کے اردگرد رقص کیا اور فیصلہ کیا کہ اس کوپے میں اس جیسے چھوٹے جانور سے دلچسپ شے کوئی اور نہیں جو کونے میں بیٹھا ہے اور پھر آکر میری گردن کو تاکنے لگا۔ میں نے اسے پھر اڑا دیا۔ وہ اچھل کر بھاگا۔ پورے کوپے کا ایک اور چکر لگایا اور آکر میرے سر کی پشت پر بڑی ڈھٹائی سے بیٹھ گیا۔

بس اب بہت ہو گئی، میں نے کہا "شرافت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں نے دو دفعہ تمہیں خبردار کیا کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں اور یہ کہ میری باوقار شخصیت اجنبیوں کی شوخیوں کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ اب میں منصف کی کرسی سنبھالتا ہوں اور تمہیں سزائے موت سناتا ہوں کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے تم اسی کے مستحق ہو اور یہ سزا تمہیں عدالت کی طرف سے دی گئی ہے۔ تمہارے خلاف الزامات کی فہرست بہت طویل ہے۔ تم ایک آوارہ گرد ہو، تم عوام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہو، تم بغیر ٹکٹ سفر کر رہے ہو، تمہارے پاس کسی قسم کے شناختی کارڈ موجود نہیں اور ایسے ہی کئی اور جرائم کی سزا کے طور پر تم اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو!"

یہ کہہ کر میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک تیز رفتار اور جان لیوا ضرب لگائی لیکن اس نے پینترا بدل کر اور بڑی بے حیائی سے یہ وار خالی کر دیا۔ میں نے اپنی سخت توہین محسوس کی اور اسے انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اسے میں نے اپنے ہاتھ سے مارنے کی کوشش کی، اخبار سے کام لیا، نشست پر کھڑا ہو گیا، اچھلا، بتی کے اردگرد بھی اس کا پیچھا کیا لیکن وہ مسلسل بچتا رہا۔ اب میں نے نیا حربہ سوچا، پہلے اسے ساکت ہونے دیا اور پھر ایک تیر بہدف چالاکی سے کام لے کر ایک خوفناک اور انتہائی تیز رفتار وار کیا لیکن سب بے سود، وہ مجھ سے کھیلتا رہا۔ وہ مجھے اتنے اطمینان اور مہارت سے جل دے رہا تھا جیسے کوئی تورانی دیو کسی مریل سے سانڈ سے مقابلہ کر رہا ہو اب

یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ اسے اس کھیل میں لطف آ رہا ہے اور وہ اسے مزید کھیلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ ایک ایسا کھیل جس میں ایک قیم شحیم جانور اس کا پیچھا کر رہا تھا جس کا خون پینے کا وہ متمنی تھا لیکن جو بالکل بے بس اور احمق تھا۔

اب مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ محض ایک کیڑا نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی اپنی ایک شخصیت ابھرنے لگی، ایک ایسی شخصیت جس کی ذہانت نے مجھے اس کوپے پر بلا شرکت غیرے قابض ہونے سے روک دیا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کے بھی مساوی حقوق ہیں اور اس احساس کے لیے میرے دل میں گرمجوشی پیدا ہونے لگی۔ میرا احساس برتری جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ بھلا میں اس مخلوق سے کیسے بالاتر ہو سکتا ہوں جس نے مجھے ایک مقابلے میں ابھی ابھی بڑی ہی مہارت سے شکست دی ہو؟

کیوں نہ میں عالی ظرفی کا مظاہرہ کروں؟ میں سوچنے لگا، عالی ظرفی اور رحم دلی انسانیت کی ارفع ترین خصوصیات ہیں۔ کسی کی عمدہ خوبیوں کا اعتراف کر کے ہم دراصل اپنی فراخ دلی اور شرافت کا اعلان کرتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ رحم دلی اور معافی کا مظاہرہ کر کے اعلیٰ اخلاقی اقدار پر آج کل کے کم ہوتے ہوئے اعتماد کو بحال کر وا سکتا تھا۔

آخر کار میں نے اس کی سزائے موت کا فیصلہ منسوخ کر دیا اور اسے مخاطب کیا "میں تمہیں قتل تو نہیں کر سکتا لیکن معاف کر سکتا ہوں، پس میں تمہیں معاف کرتا ہوں"۔

میں نے اخبار اٹھایا اور پڑھنا شروع ہی کیا کہ وہ اخبار پر آ بیٹھا۔ "احمق! تم نے خود ہی اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس اخبار کے دونوں صفحوں کے درمیان تمہیں چرمرکے رکھ دوں اور تم ان دو خبروں کے درمیان محض ایک لاش رہ جاؤ گے جن میں سے ایک امن کے دعووں پر مبنی ہے اور دوسری ایک سیاسی لیڈر کی دیانت داری کے بارے میں ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیوں کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور یہ لمبا چوڑا جانور جب کوئی وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ تمہیں مارنے کی کوئی خواہش میرے دل میں نہیں تمہارے لیے یکسا طرح کی محبت اور قدر پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ صلح کل اور انسانیت و محبت کے مسلک پر عامل کوئی صوفی تمہیں "برادر عزیز" کہہ کر مخاطب کرتا۔ اگرچہ کہ میں ہمدردی اور تواضع میں صوفیوں کی حد تک تو نہیں جا سکتا لیکن تمہارے ساتھ ایک دور پرے کی رشتہ داری ضرور مجھے یاد آ رہی ہے اور یہ کہ تم میرے ہم سفر ہو۔ اس سفر میں ہم دونوں اس دنیا کی مخلوق ہیں اور اس لحاظ سے ساتھی ہیں۔ زندگی ہم دونوں میں قدر مشترک ہے۔

میں اپنی دھن میں کہتا چلا گیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنے سفر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، مجھے کچھ کچھ پتہ ہے کہ میں بھی اپنی منزل سے بڑی حد تک ناواقف ہوں۔ اس لحاظ سے ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ ہم دو پرچھائیاں ہیں۔ ابھی ہیں ابھی ... نہیں ہیں۔ دونوں رات کی تاریکی میں سے نمودار ہوئے ہیں اور کچھ دیر روشنی دیکھ کر زندہ رہے ہیں، کچھ دیر بتی کے ارد گرد رقص کریں گے اور پھر تاریکی میں کھو جائیں گے ...

میں غالباً کچھ کہتا چلا جاتا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی "صاحب آپ کا اسٹیشن آ چکا ہے جی"۔ یہ ایک شناسا قلی تھا اور ایک گہری سنجیدگی سے ... میرا اسٹیشن آ چکا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ شاید مجھے اونگھ آ گئی تھی۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی ٹوپی اور ... اٹھائی اور قلی کے ساتھ ... تاریکی میں کھو گیا۔ اترتے وقت میں نے اپنے ہم سفر کی طرف دیکھا۔ وہ بتی کے ارد گرد رقص کر رہا تھا۔

دل مضطر کو سمجھایا بہت ہے

شریف اسلم
(صدر زندہ دلان جدہ)

حضرت فیضؔ نے کیا خوب کہا ہے:

چمک و ئے رنگ پہ تب اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدہم ہوا ہر ساز کا رنگ

دفعتاً ایک روز ہمارے دل نے لَے بدلی اور واقعی ہر ساز کا رنگ مدہم نظر آنے لگا۔ صاحبو! اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یکم اکتوبر کو ہمارے دل نے لَے بدلی ۱۷ اکتوبر کو سرجری (بائی پاس) ہوئی آٹھ ہفتے گھر پہ آرام کیا۔ خدا کے فضل و کرم سے بھلے چنگے ہو گئے۔ اب مکمل صحت یاب ہو کر پھر سے قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں کہ اپنی داستانِ دل سنائیں۔

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سنا ہے
سب ان کو سنانے کے دن آ رہے ہیں

شہرِ خوش نہاد، رشکِ قاہرہ و بغداد، عروسِ بحرِ احمر جدہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے پندرہ سال بیت گئے لیکن یہ پہلی دفعہ بالکل پہلی دفعہ تھا کہ اکتوبر کی پہلی تاریخ کو ہمارا دل دہل گیا۔ یوں لگا جیسے ہمارے سینے کے وسط میں کوئی خنجر گھونپ رہا ہو۔ بھلا ہو ہمارے کرم فرما، ہمارے ہمسایہ ڈاکٹر شمس بابر کا جو عین اسی وقت کہیں سے تشریف لائے، کار سے اترتے ہی ہمارا معائنہ کیا۔ اور بلا تاخیر بقشان ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں شریک کرا دیا۔

ایک ہفتہ بعد اس ہاسپٹل سے ہمیں آنجیوگرافی کے لیے جدہ کے سب سے مشہور عرفان ہاسپٹل سے رجوع کیا گیا۔ زندگی میں پہلی بار ہم ان مراحل سے گزر رہے تھے۔

مشہور کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر نبیل نے آنجیوگرافی کے لیے ہمیں آپریشن تھیٹر کے ٹیبل پہ لٹا کر ہمارے چہرے کا بغور جائزہ لیا، مسکرایا۔ ہمیں بھی مسکرانے کی ترغیب دی اور کہا "کچھ باتیں کرو تا کہ

یا پھر کوئی لطیفہ ہی سنا دو۔" ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! یہ بجائے خود ایک لطیفہ ہے کہ آپ ہمیں آپریشن تھیٹر میں ٹیبل پر لٹا کر لطیفہ سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔" یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے زیرِ لب تبسم فرمایا اور ہم اپنی تمام تر سادہ لوحی کے ساتھ فریبِ تبسم میں آ گئے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے جسم و جان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب خود یوں گویا ہوئے :

جنابِ والا! آپ کو کچھ محسوس ہوا کہ اس دوران ہم نے آپ کے دائیں ہاتھ کو بے حس کر کے کہنی کی سطح میں ایک باریک گہرا سوراخ کے ذریعہ ایک تار داخل کر کے آپ کے دل کی تصویر کھینچ لی۔ اس وقت ہمارے سینے کے اوپر دو بڑے بڑے کیمرے حرکت کر رہے تھے۔ اس تصویر کشی کے دوسرے روز ہمیں اور ہمارے ارکانِ خاندان کو لیب میں پروجیکٹر پر فلم دکھلائی گئی جس سے پتہ چلا کہ دل کو خون پہنچانے والی چار کے منجملہ تین شریانوں میں چھلی اور پربی رکاوٹیں ہیں۔

عرفان ہاسپٹل کے ہارٹ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ نامور انڈین کارڈیاک سرجن ڈاکٹر سیکر بھوانی نے بتایا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے سرجری لازم ہے۔ سرجری کا نام سنتے ہی ہمارے ہوش اڑ گئے لیکن انھوں نے فصیح اردو میں تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کے دل کو اک ذرا سا دھکا نہیں پہنچا ہے۔ آپ بالکل ابتدائی مرحلے میں رجوع ہو گئے ہیں۔" ڈاکٹر بھوانی کی جنم بھومی یوں تو تامل ناڈو (مدراس) ہے لیکن یورپ و امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے بعد وقفے وقفے سے ایک عرصے تک قیام کی بدولت انھیں اردو پر اچھا خاصا عبور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فصیح اردو میں کیا تسلی دی گویا ہمیں گرویدہ کر لیا۔ اگر وہ انگریزی میں تسلی دیتے تو شاید ہم ان کے قابو نہ آتے لیکن ان کی اردو دانی کام کر گئی۔

ڈاکٹر بھوانی کے مشورے پر آپریشن کی تیاری سے قبل ہم سے ایک ڈیکلریشن پر دستخط لی گئی کہ یہ عملِ جراحی ہمارے حکم پر ہوگا یعنی اس کے نتائج و عواقب کے ہم خود ذمہ دار ہوں گے۔ ہم نے :

سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے

کہتے ہوئے بلا چوں و چرا اس ڈیکلریشن پر اپنی دستخط ثبت کر دی۔ واقعہ یہ ہے کہ چوں و چرا کی یہاں گنجائش ہی نہیں تھی کیوں کہ ہماری کمپنی کے اربابِ مجاز نے اس گراں ترین آپریشن کے تمام مصارف کی فی الفور منظوری دے کر ہمیں تمام الجھنوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

آپریشن سے پہلے کی رات بڑی بھاری تھی۔ یہ رات جاگ کر گزاری، توبہ و استغفار کیا۔ بارگاہِ ربّ العزت میں گریہ و زاری کی کہ اے میرے مالک! اگر بلاوا آ گیا ہو تو ہمارا خاتمہ بالخیر کیجیے لیکن اگر حیاتِ مستعار باقی ہو تو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دیجیے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

آیئے پھر ایک بار آپ کو ڈاکٹر بھوانی سے ملائیں۔ اردو دانی کے ساتھ ساتھ ان کا حسنِ اخلاق اور بہ حیثیت کارڈیک سرجن ان کی مہارت سونے پر سہاگہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب تک دو ہزار سے زائد کامیاب آپریشن کر چکے ہیں اور ہر ہفتے دو سے تین چار آپریشن ان کا معمول ہے۔

میں نے سینے سے لگایا، پردہ اپنا ہو سکا
مسکرا کر تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا

آپریشن کے بعد ایک روز صبح سویرے ڈاکٹر بھاتی بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے کمرے میں داخل ہوئے پوچھا فرمائیے اب کیسے ہیں آپ؟ ہم نے کہا، ڈاکٹر صاحب خدا کا شکر ہے کہ اب پہلے سے اچھے ہیں لیکن ہمیں کچھ کہنا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بلاتکلف کہیں۔ ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے دل کا اور ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن آج تک اس سے کبھی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ نہ ہم نے اسے دیکھا نہ اس نے ہمیں مگر آپ ہیں کہ ہمارا سینہ چاک کرکے لگاتار چھ گھنٹے اسے دیکھتے رہے گمان غالب ہے کہ اس سے کچھ باتیں بھی ہوئی ہوں گی ورنہ اس نے ہمارے چال چلن کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہوگا۔

یہ سن کر ڈاکٹر بھاتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آپ کے چال چلن کے بارے میں آپ کے دل نے ہمیں جو کچھ بتایا وہ ایک راز ہے آپ اس راز کو فاش کرنے کے لیے اصرار نہ کریں۔ البتہ آپ کے دوست احباب نے آپ کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ یہ ہے کہ آپ بڑی دل چسپ شخصیت ہیں۔ اس مکالمے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے قدرے اپنائیت محسوس ہوئی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

بائی پاس سرجری کے بعد ہم ابھی ہاسپٹل ہی میں تھے کہ خبر آئی کہ جدہ کے کنگ فہد ہاسپٹل کے لیے ایسی جدید ترین مشینیں خریدی گئی ہیں جو لیزر انرجی کی مدد سے دل کو خون پہنچانے والی شریانوں کی رکاوٹیں آپریشن کے بغیر دور کردیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سینہ چاک کرنے اور چیر پھاڑ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ خبر سن کر ہمیں اپنے دل کی جلد بازی پر افسوس ہوا کہ اس نے یکم اکتوبر کو کیوں کروٹ بدلی؟ کاش مشینیں لگنے کے بعد یہ بدلتا تو ہمارا سینہ چاک کرنے کی نوبت نہ آتی۔

دل مضطر کو سمجھایا بہت ہے
مگر اس دل نے تڑپایا بہت ہے

مزاج پرسی کے لیے آنے والے ہمارے ایک کرم فرما سے جب ہم نے ان مشینوں کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا جناب! وہ دن دور نہیں جب اس دنیا میں جسم انسانی کے لیے زپ سسٹم رائج ہو جائے گا۔ یعنی میڈیکل سائنس ترقی کرتے کرتے اس منزل پر پہنچ جائے گی کہ آپ مناسب معاوضہ دے کر اپنے سینے پر زپ فٹ کرا سکیں گے۔ اس سے یہ سہولت ہو جائے گی کہ جب کبھی آپ کے اعضائے رئیسہ میں سے کوئی عضو مرمت کا طالب ہوگا۔ آپ زپ کھول کر بآسانی خود ہی اس کی مرمت کر سکیں گے۔۔۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بہر حال ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر پر چند ہفتے آرام کے بعد آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے ہم جدہ سے پانچ سو کیلو میٹر دور [illegible] سے آگے ایک پر فضا مقام کی سمت چل پڑے جو [illegible] کہلاتا ہے جو چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرے اس صحت افزا مقام پر عزیزی شاہ حسین اور ان کی بیگم حمیدہ بانو سعودی وزارت صحت کے تحت برسر کار ہیں۔ انھوں نے میزبانی اور مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔ اس دوران قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پرسکون ماحول میں قارئین کے لیے حال دل لکھا۔ دوست احباب کے خطوط کے جواب دیئے۔ کچھ وقت مطالعہ میں صرف کیا تھوڑی بہت سیر و تفریح کی اور پھر ایک ہفتے بعد لوٹ کر اپنی پرانی ڈگر پر گامزن ہو گئے۔

[illegible]

محمد اکرم (ریاض)

ریاض میں شام شگوفہ

اردو زبان کے منفرد طنزیہ و مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" نے مسلسل اور پابندی اشاعت کے پچیس سال، نومبر ۱۹۹۳ء میں مکمل کر لئے۔ اس موقع پر ریاض، سعودی عرب میں مقیم اردو داں طبقہ نے ۲۴ دسمبر ۱۹۹۳ء کو ایک محفل "شامِ شگوفہ" جناب عابد معز، ایڈیٹر اردو نیوز کے دولت کدہ پر منعقد کی۔ محفل کا آغاز قاری عبدالقدوس غوری کی قرأت کلام الٰہی سے ہوا۔ صاحبِ خانہ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور صدر محفل پروفیسر ستیہ پال آنند اور ناظم جناب سکندر علی خاں کا تعارف کروایا۔ جناب سکندر علی خاں، ادب دوست، ادب شناس اور شہر جدّہ کی مقبول شخصیت ہیں۔ حال میں ریاض منتقل ہوئے۔ انھوں نے نہایت خوبصورتی سے محفل کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ موصوف کی دعوت پر جناب سعید شوکت، ممبر اردو سنٹر کمیٹی نے شگوفہ کی پچیس سالہ تاریخ پر روشنی ڈالی۔ شگوفہ کی ادبی خدمات کا ذکر کیا اور معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ جناب سعید شوکت نے بتایا کہ شگوفہ کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ شگوفہ عہدِ حاضر کا واحد رسالہ ہے جو ربع صدی سے طنز و مزاح کی صنف میں قارئین کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ادب کے فروغ میں معاون ہے۔

جناب احمد عبدالعلیم اختر نائب صدر بزم اتحاد نے شگوفہ کو منظوم خراج پیش کیا۔ نظم پسند کی گئی اور اس دعائیہ شعر پر بھی نے آمین ثم آمین کہا ؎

اختر ہوں اس سے اور بھی محظوظ حاضرین
ہو جشنِ نصف صدی بھی مزید ارِ شگوفہ

جناب میر احمد علی نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے "شگوفہ" کو اجرأ کے وقت سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ شگوفہ نے ادبی معیار برقرار رکھا ہے جو طنز و مزاح میں ایک مشکل امر ہے۔ جناب سہیل فلکی نے ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کی ادارتی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی کاوشوں کو خراج پیش کیا۔

پروفیسر ستیہ پال آنند تعارف محتاج نہیں ہیں۔ وہ پچھلے چار دہوں سے اردو ادب میں مختلف اصناف کے ذریعہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے ہیں۔ پڑھاتے انگریزی ہیں لیکن لکھتے اردو میں ہیں۔ کئی اردو، انگریزی اور پنجابی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پچھلے ایک سال سے سعودی عرب کی منسٹری آف پوسٹ اینڈ ٹیلی کمیونیکیشن کے تربیتی کالج میں انگریزی نصاب مرتب کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اردو میں طنز و مزاح کے عنوان سے کلیدی خطبہ دیا۔ سامعین نے علمی اور معلوماتی صدارتی خطبہ کو غور سے سنا اور پسند

کیا۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ لفظ "مزاح" بطور اصطلاح ۱۹۳۰ء ۳۲ کے بعد سے استعمال میں آیا۔ اس سے قبل مزاح کو ظرافت کہا جاتا تھا ظرافت یا مزاح اردو کے شعری ادب میں پہلے آیا پھر نثر میں رائج ہوا۔ صنف مزاح اردو ادب کی معاشی پیداوار رہی ہے جبکہ دیگر اصناف غزل، ہجو، مرثیہ، نظم، ناول دوسری زبانوں سے اردو میں آئے ہیں۔ مزاح (جسے کسی وقت ٹھٹھا، ٹھٹھول یا پھبتی بھی کہا گیا) کو عوام عوامی زبان میں شروع کیا، پسند کیا اور فروغ دیا۔ مزاح کے برخلاف دیگر اصناف ادب خواص کی زبان یا ادب کی زبان میں تخلیق پاتے تھے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہو کہ اردو ادب میں مزاح کو وہ رتبہ میسّر نہیں ہوا جو اسے ایک صنف ادب کے طور پر ملنا چاہیے۔ مزاح کی عوامی مقبولیت اور قبولیت ہر دور میں رہی ہے۔ اردو کے زرّیں دور کے مشاعروں میں دو ایک ظریف شعراء ضرور مدعو کئے جاتے تھے۔

پروفیسر ستیہ پال آنند نے اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ انشائیہ کی آمد نے طنز و مزاح کے کینوس کو بے حد وسیع کیا۔ انشائیہ ۱۹۵۵ء سے اردو ادب میں رائج ہے۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں نثر میں طنز و مزاح کا مستقبل انشائیہ سے ہے۔ آنے والے دنوں میں انشائیہ کی صنف خوب ترقی کرے گی۔ پروفیسر نے شگوفہ کی خدمات کا ذکر اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

چائے کے وقفہ کا اعلان ہوا۔ شگوفہ کا سلور جوبلی کیک جناب عابد معز اور صدر محفل نے مل کر کاٹا۔ تالیاں بجیں شرکاء نے شگوفہ کی طویل عمر کے لئے دعائیہ کلمات کہے۔ کیک کے ساتھ پر تکلف ضیافت سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

آخر میں ایک مختصر شعری محفل منعقد ہوئی۔ نظامت کی ذمہ داری جناب میر فراست علی خسرو نے خوش اسلوبی سے نبھائی۔ شعری نشست کی انفرادیت یہ تھی کہ شعراء نے صرف نظمیں سنائیں اور خوب داد سمیٹی۔ جناب مرزا یوسف بیگ، جناب احمد عبدالعلیم اختر، جناب میر فراست علی خسرو اور صدر محفل پروفیسر ستیہ پال آنند نے نظمیں سنائیں رات ایک بجے اس با مقصد محفل کے اختتام کا اعلان ہوا۔

●●

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

اس مرتبہ سالنامہ ۱۹۹۳ء کو سلور جوبلی شمارہ کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ شمارہ ضخیم نمبر کی صورت میں آئے۔ لیکن ۲۵ سالہ شعری و نثری انتخاب بھی علٰحدہ علٰحدہ شائع ہونے والے ہیں۔ اس لیے ہم زیرِ نظر شمارہ کی ضخامت میں اضافہ نہ کرسکے تاہم تقریباً تمام نئے اور پرانے طنز و مزاح لکھنے والوں کو اس شمارے یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پچیس سال کے عرصے میں بعض قلمی معاونین ہم سے بچھڑ گئے۔ بعض راہ کو پُرخار دیکھ کر لوٹ گئے اور قابلِ قدر وہ ادیب و شاعر ہیں جو مسلسل لکھ رہے ہیں۔ اور جن کا تعاون شگوفہ کا اصل سرمایہ ہے۔

۲۵ سال کی شگوفہ کی فائلیں گواہ ہیں کہ ہم نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ نام سے زیادہ تخلیق کے معیار کو ملحوظ رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شگوفہ کے توسط سے بے شمار لکھنے والے روشناس ہوئے بلکہ طنز و مزاح کے ادب میں انھوں نے نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سلور جوبلی کے موقع پر نثر اور نظم کے کل ہند انعامی مقابلے کا اہتمام کیا گیا ہے ہمیں امید ہے کہ قلم کار اس مقابلے میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے کر اسے کامیابی اور معیار عطا کریں گے۔

سلور جوبلی کے موقع پر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اب شگوفہ صحرا میں بھی کھل رہا ہے اور دنیا کے اکثر ممالک میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے اور منفرد رسالہ تو تھا ہی اب اسے عالمی جریدہ کی بھی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایڈیٹر اوورسیز ڈاکٹر عابد معز اور ہماری اوورسیز کمیٹی کے ارکان کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اردو کی نئی بستیوں میں شگوفہ متعارف بھی ہوا اور پسند بھی کیا جا رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ربع صدی کے بعد بھی قلمی معاونین اور قارئین کی محبتیں، عنایتیں اور اعتماد ہمیں اسی طرح حاصل رہے تاکہ کاروانِ مزاح کے لیے ساتھیوں کی تازہ توانائیوں کے ساتھ اس منفرد رسالہ کو جاری رکھا جاسکے۔ آمین

[redacted]

ایم اعجاز علوی
مکتبہ

آسمان اور ہجر کے درمیان

مشتاق احمد یوسفی

یہ قطعی طور پر درست ہے کہ رشید احمد صدیقی اردو میں سنجیدہ معیاری طنز و مزاح کے خالق مجازی اور زیر لب تبسم کے بانی مانے جاتے ہیں۔ ان کے گدگدیاتے مچلتے ہوئے ثقیل الفاظ، اعلیٰ طنز اور کند چھریاں دکھاتی مزاح کی دلچسپی یا ان چھریوں سے بدن کے حساس گوشوں کو سہلاتا ہوا ان کا لغوی طلسم بعض اوقات عام لوگوں کے سروں سے کچھ یوں گزر جاتا ہے کہ معیار کی یہ زیادتی آئینہ دیکھ کر خود ہی اپنا سر پیٹتی رہ جاتی ہے۔ ایک مرثیہ، ٹیگ ستون، ایک اسکول جیسے مضامین میں وہ کہیں کہیں سنجیدہ عامیانہ اور [illegible] والا رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ یہ بات ان کے یہاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے لیکن وہ اس [illegible] جا سکتے۔ جبکہ مشتاق احمد یوسفی کے یہاں طنز کا لطف یکساں طور پر عوام و خواص دونوں سے خراج تحسین وصول کر کے کالی مرچیں ملی میٹھی چٹنی کی یاد دلاتا اور مزاح کا مسکراتا ہوا خلیہ دل و دماغ میں اطمینان اور مثبت سوچ پیدا کرتے ہوئے انھیں رہ رہ کر گدگداتا اور [illegible] ہوئے یکساں طور پر ایک ہی سا معیار برقرار رکھتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے اگر پطرس بخاری کے یہاں گلاب، الفاظ کے کھیتوں میں گلاب و زعفران دونوں کے پھول مسکراتے ہیں تو رشید احمد صدیقی کے الفاظ خود ہی عطر گلاب ۔ اور زعفران کی خوشبو سے مزین ہیں۔ اور صرف گلاب کے کانٹوں کا خیال ہی قاری کے تصور میں ہلچل پیدا کرتا رہتا ہے۔ لیکن مشتاق احمد یوسفی کے مسکراتے ہوئے زعفران زار میں گلاب کی تو طلوع اپنی کچھ ایسی آب و تاب سے جلوہ گر ہے جس کے کانٹے زخم نہیں لگاتے، شدید چبھن کا احساس ضرور پیدا کرتے ہیں ان پھولوں کی خوشبو دار مہک اس کی چبھن پر مرہم کا کام کرتی رہتی ہے۔ اس طرح طنز و مزاح کی جس [illegible] رشید نے صوف مانجھ کر چمکدار بنایا ہے، مشتاق نے اسے پیش کر کے مثل آئینہ بنا ڈالا۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں طنز و مزاح ذہانت کے [illegible] کی [illegible] ہوئے [illegible] دانشوری [illegible] اپنا سر کچھ اس طرح کاٹتے ہیں کہ [illegible] کر رہ جاتا ہے اور بعد میں مشکل ہی سے سنجیدگی اختیار کرتا ہے جبکہ مشتاق احمد یوسفی کے یہاں [illegible] کرتے ہوئے قاری کے ذہنی ابتذال یا سیت اور کمپلکس کو اپنی رو میں خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتے ہیں۔ اس لئے رشید احمد طنز و مزاح کا بایاں ہاتھ ہیں تو مشتاق داہنا۔ یوسفی کے یہاں طنز و مزاح .... لطافت اور شعریت سے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں شائستگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں الفاظ میں جو شگفتگی ہے لطافت اور شعریت ہے۔ صرف اس کا عکس ہی ہمیں دور سے محسوس کراتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں گذارش احوال واقعی منظور ہے تو ہم انھیں ماہ و انجم کے درمیان نیرّ تاباں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کے یہاں بڑی محنت و جانفشانی سے مسکراہٹ کی اب تک تین اولاد نرینہ تولد ہوئی ہیں۔ (۱) چراغ تلے ۱۹۶۱ء (۲) خاکم بدہن ۱۹۶۹ء (۳) زرگزشت ۱۹۷۶ء۔ ان کی اس مسکراہٹ کا پہلا عکس چراغ تلے کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس کا مجموعی تاثر ہمارے دماغوں پر "پڑیئے گر بیمار" تو نے پی ہی نہیں، یا دش بخیر، موزی، جنون لطیفہ، چارپائی اور کلچر، سنہ اور کا گھر میں رہنا، کرکٹ، صنف لاغر، موسموں کا شہر" وغیرہ تیرہ (تین تیرہ نہیں) مختلف اطوار سے پڑتا ہے لیکن اس میں انھوں نے جو "پہلا پتھر" ہم لوگوں کے رسید کیا ہے، اس کی چوٹ سے بچنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس کی یہ حالت ہونا یقینی ہے کہ

ع اس چوٹ پر ہنسے، جو نہ رو پائے اے خدا

یا

ع ان پتھروں سے کون نہ مرجائے اے خدا

آپ بھی ذرا گھٹی اینٹ کی عینک لگا کر دیکھیں، مریض کی عیادت کچھ اس طرح بھی کی جاتی ہے۔

"ایک بزرگ جو اسّی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک خیر و عافیت کی باتیں کرتے رہے ..... اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا ...... میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انھیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"۔ (پڑیئے گر بیمار ــــ مجموعہ چراغ تلے سے)

اسی مضمون میں وہ بیمار کی عیادت کے ایک اور مکالماتی جدید طریقہ پر لغوی تار ح سے کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں، جس میں ترقی پسندانہ جدت تو ہے، شمس الرحمن والی فاروقیانہ علامتی علالت وغیرہ نہیں۔

"ملاقاتی: ماشاء اللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے ــــ

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں کراراپن ہے۔

مولانا کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کر دیا ہے۔

ملاقاتی: (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر): بیگم! یہ صحت یاب ہو جائیں تو خدا انہیں پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے۔ (مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر یقین جانئے آپ کا شگاف تو بس دو تین انگل لمبا ہوگا۔ میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا

معلوم ہوتا ہے۔

مریض (کراہتے ہوئے) : مگر میں تو ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی (پینترا بدلتے ہوئے) : یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو ملیریا ہے۔

مریض : یہ پاس والی چارپائی جو خالی پڑی ہے' اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا۔

ملاقاتی : ارے صاحب مانئے تو' آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی (روہانسی ہو کر) : دو دفعہ دھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے"۔ (پڑئیے گر بیمار)

چارپائی کی چرچراہٹ بھی کس قدر مترنم ہوتی ہے کہ اگر اسے پیانو کا جدِ امجد کہہ دیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ ساتھ میں اس پرشائستگی اور بیہودگی سے بیٹھنے والوں کا تہذیبی اور ثقافتی جائزہ بھی پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

"میرا دعویٰ ہے کہ میں نے پیانو اور پلنگ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ دریافت کر لیا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پہلی بار بان کی کھری چارپائی کی چرچراہٹ' ادوان کا تناؤ دیکھ کر بعض نوواردسیاح اسے سارنگی کے قبیل کا ایشیائی ساز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ میرے نزدیک چارپائی کی دلکشی کا سبب وہ خوش باش لوگ ہیں جو اس پر اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہیں اس کے مطالعہ سے شخصی اور قومی مزاج کے پرکھنے میں مدد ملتی ہے"۔ (چارپائی اور کلچر)

آم' گلاب' سانپ اور عورت میں کتنی قسمیں یا قدریں مشترک ہیں' اس کا جائزہ کوئی دل جلا خوش مزاج مرد ہی پیش کر سکتا ہے۔ یوسفی دل جلے تو نہیں ہیں لیکن صنف نازک سے جل جانے کے خدشات کا تجزیہ پیش کرتے وقت وہ گھوڑوں کو بھی فراموش نہیں کرتے۔

"آم' گلاب اور سانپ کی طرح عورتوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آم اور گلاب کی قسم کا صحیح اندازہ کاٹنے اور سونگھنے کے بعد ہوتا ہے اور اگر مارگزیدہ مر جائے تو سانپ کی قسم کا پتہ چلانا چنداں دشوار نہیں۔ لیکن آخر الذکر' خالص مشک کی طرح' اپنی قسم کا خود اعلان کر دیتی ہے۔ ایک بزرگوار جنھوں نے اپنی عمر اور کمائی ریس کورس اور طوائف کوٹھے ملازمت میں گنوائی ہے' اکثر کہا کرتے ہیں کہ گھوڑا اور عورت کی ذات کا اندازہ' اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے۔۔۔۔ گھوڑے اور سانپ کے خصائل کی تصدیق یا تردید کا حق ویسے تو سلوتریوں اور سپیروں کو پہونچتا ہے یا پھر ان حضرات کو جو گھوڑے سے جا چکے ہیں یا دوستی کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔۔۔" (صنف لاغر)

"سگریٹ اور گھریلو مسائل کا حل" کے موضوع پر وہ بات سے بات ہی پیدا نہیں کرتے' لطیفے بھی بڑی بے ساختگی سے تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔

"مہینوں وہ یہ ذہن نشین کراتے رہے کہ سگریٹ پینے سے گھریلو مسائل پر سوچ بچار کرنے میں مدد ملتی ہے اور جب ہم نے اپنے حالات اور ان کی حجت سے قائل ہو کر سگریٹ پینا شروع کر دی اور اس کے عادی ہو گئے تو انھوں نے چھوڑ دی۔ کہنے لگے۔ بات یہ ہے کہ گھریلو بجٹ کے جن مسائل پر میں سگریٹ پی پی کر غور کیا کرتا تھا۔ وہ دراصل پیدا ہی کثرت سگریٹ نوشی سے ہوئے تھے"۔ (موذی)

اپنے دوسرے مجموعۂ خاکم بدہن میں ان کی شان کچھ اور بھی فزوں تر اور نرالی نظر آتی ہے۔ اس میں کسی نازک کنواری دوشیزہ کی سی تازگی ہے۔ بقول میر صاحب "نازکی اس بدن کی کیا کہیئے"' "اُف دستِ زلیخا کی دامن گیری ہے"' "ٹھنڈے پل اسٹیشن کی گرما گرم فلمی منظر کشی ہے"' "مرے رسوا ہو جانے کی داستان ہے"' بغیر خطوط کے چند تصویر بتاں ہیں۔ سیفی اینڈ سنس کا قدیم

دکان نما کتب خانہ ہے" آلو اور پوفیسر پر سیر حاصل اور مضحکہ خیز چٹخے فوارے ہیں" میز ر ماننا پڑا۔ اور مرزا کے نام پر قہقہوں کی برساتیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ابتداء "دست زلیخا" سے ہوتی ہے" اب یہ ہاتھ شفقت و محبت کا ہے یا جبر و ظلم کا" تحریر و تقریر کی سرپرستی کرتا ہوا ہے یا سرکشی کا مظہر" سر ڈھانکتے ہوئے مانگ میں افشاں بھرنے والا ہے یا مانگ اجاڑ تا ہوا" کسی کو قتل کر رہا ہے یا خودکشی کی جانب راغب" خود ہی ملاحظہ فرمالیں۔

" بابائے انگریزی ڈاکٹر سیموئل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے اس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلیے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے۔ بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہو جو ہم سمجھتے ہیں یعنی چیک بک یا رو کڑ بہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت از بس ضروری ہے کہ یہ کتاب کسی مالی یا الہامی دباؤ سے نڈھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جو اہل قلم ذہین ہیں وہ مشک کی طرح بولتے ہیں۔ جو زیادہ ذہین ہیں وہ اپنے کندھوں پر دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں جو خودکشی میں ہوتے ہیں یعنی تاریخ وفات، آلۂ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے اور تعزیرات پاکستان میں یہ واحد جرم ہے، جس کی سزا صرف اسی صورت میں ملتی ہے کہ مجرم ارتکاب جرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ء میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمداللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت تعلم خود نصیب ہو رہی ہے۔"

(دست زلیخا یعنی دیباچہ خاکم بدہن)

خاکم بدہن (میرے منہ میں خاک) میں یوسفی صاحب دست زلیخا پہ مر تو گئے لیکن " صبغے اینڈ سنس" کے دکان نما کتب خانے کو دیکھ کر تا پسند جنم لے بیٹھے اور دوسرا جنم انھیں اس شرط کے ساتھ عطا ہوا کہ وہ باقی بچے پھول اور کانٹے زخم و تبسم" آتش نم اور شعلہ شبنم یا شبنمی شعلے وغیرہ جو بھی ان کے احاطہ تحریر میں آنے سے رہ گئے تھے" انھیں بھی اپنی حد تک پہنچا دیں تو انھیں ۹۹ لاکھ یونیٹ یعنی جنم جنمانتر کے اس طویل مضحکہ خیز چکر سے چھٹکارہ عطا کر دیا جائے گا۔ صبغے اینڈ سنس کا یہ جناتی طنز اور ملکوتی تبسم خصوصیت سے آپ کے لئے ہی۔ ہے۔

" یہ اس پر امید زمانے کا ذکر ہے" جب انھیں کتابوں کی دوکان کھولے اور ڈیل کارنیگی کو پڑھے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے اور جب ان کے ہونٹوں پر ہر وقت وہ دھلی منجھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو آجکل صرف ٹوتھ پیسٹ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے.... ..... ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ نے دوکان میں قدم رکھتے ہی تمام ناپسندیدہ کتابیں اس خوش سلیقگی سے یکجا دیکھیں تو ایک دفعہ اپنی پرانی عینک پر بھی اعتبار نہ آیا اور جب اعتبار آ گیا تو الٹا پیار آنے لگا۔ اپنے مخصوص کھٹ مٹھے لہجے میں بولے " یار اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اسطرح نہ جاتے جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا ——— دونوں ہاتھ خالی"

" تاجرانہ تبسم سے بولے میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں...... کبھی کوئی خریدار ہلکی پھلکی کتاب مانگ بیٹھتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کو مڑ جائیے۔ پرلے نکڑ پر چوڑیوں کی دوکان کے پاس ایک لیٹر بکس نظر آئے گا۔ اس کے ٹھیک سامنے جو اونچی سی دوکان ہے، بچوں کی کتابیں وہیں سے ملتی ہیں۔" (صبغے اینڈ سنس)

سنجیدہ اصطلاحوں کا مضحکہ خیز اختراعی استعمال انھیں کا خاصہ ہے" وہ کتب فروش کم اور کتب نما زیادہ تھے" اور مرزا سگریٹ چھوڑنے کا فیصلہ جو از سر بار پیش کرتے ہیں وہ عام آدمی کے دماغ میں بغیر آپریشن کے نہیں گھس سکتا" یا " خدا مجھے ہزاروں برس تک زندہ رکھے تاکہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں گا" وغیرہ۔

ابّا تمہارے ہم سے خفا جانے کیوں ہوئے
حالانکہ ہم تھے وقتِ ملاقات ہوش میں
اتنا ضرور ہے کہ ہوا جب معانقہ
ہم نے دبا دیا تھا جوانی کے جوش میں

بیڑیاں ٹوٹیں، زمانہ ہوگیا
رُخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی ملی تھی رات میں
سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

لیڈروں سے آج تک پایا بھی کیا؟
اُن کے منصوبوں کا سرمایا بھی کیا
اُن کے وعدوں پر بھروسہ کیا کریں
ریت کی دیوار کا سایا بھی کیا!

جذبات دوستی کے نہیں ہیں تو کیا ہوا
آپس میں بات چیت کی راہیں کھلی رہیں
یہ سب سے اولین سیاسی اصول ہے
دل کے کواڑ بند ہوں باہیں کھلی رہیں

مصروفِ شغلِ ساغر و مینا رہا کروں!
یا روز و شب عبادت و ذکرِ خدا کروں
عمرِ دراز مانگ کے لایا تھا چار دن
دو کٹ گئے ہیں اور دو باقی ہیں کیا کروں

ایک محفل میں سُنایا میں نے جب اپنا کلام
ایک اک مصرعِ سخن کی آبرو ہونے لگا
میرے چہرے پر ٹماٹر بیک آنے لگے
دیکھتے ہی دیکھتے میں سرخرو ہونے لگا

اک یہی اہلِ سیاست میں کمال اچھا ہے
ہر الکشن میں نئے وعدوں کا جال اچھا ہے
اُن سے آجاتی ہے ارددوں کے بھی منہ پر رونق
ہم سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آئندہ برس

کبھی غصّہ میں وہ دیکھا نہ جائے
غرور اُن میں ذرا پایا نہ جائے
بہت ہی منکسر ہوتا ہے نیتا
کسی کرسی پہ جب تک آ نہ جائے

قوم کے قائد یہ فرماتے تھے کل تقریر میں
امن کا پیدا نمو پائے گا آئندہ برس
وہ ملا قرابت ہو، یا عقائد کا جنوں
ہر تعصب ختم ہو جائے گا آئندہ برس

اُن کے فرمانے پہ ہم بھی سر ہلاتے تھے مگر
دیکھنا ہے کس برس آئے گا آئندہ برس!

نمائش سوسائٹی

کل ہند صنعتی نمائش

مکرم جاہی روڈ، نمائش میدان۔ حیدرآباد۔ ۱

یکم جنوری تا ۱۵ر فروری

ملک کی سب سے طویل مدتی مقصدی نمائش اور جنوبی ہند کی واحد سب سے زیادہ دکانات سے آراستہ چھیالیس دنوں میں پچیس لاکھ سے زیادہ نمائش بینوں اور پندرہ کروڑ سے زیادہ کے لین دین کے ساتھ۔

ایک غیر منافع بخش ادارہ جو اپنی آمدنی کو تعلیم بالخصوص خواتین کی تعلیم کے لیے مالی امداد حسب ذیل اداروں کو مہیا کر رہا ہے۔

۱۔ کملا نہرو پالی ٹکنک برائے اناث حیدرآباد۔
۲۔ سروجنی نائیڈو ونیتا مہا ودیالیہ، حیدرآباد۔
۳۔ سردار پٹیل کالج، سکندرآباد۔
۴۔ لال بہادر کالج، ورنگل، ضلع ورنگل۔
۵۔ سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر ضلع نلگنڈہ۔
۶۔ سری ویکٹیشورا کالج، سوریا پیٹ، ضلع نلگنڈہ۔
۷۔ کستوربا گاندھی کالج برائے اناث۔ سکندرآباد۔
۸۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس۔ سکندرآباد۔
۹۔ وشویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، سکندرآباد۔
۱۰۔ راجیو گاندھی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نرمل ضلع عادل آباد۔
۱۱۔ روی نارائینا ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، پالیہ، ضلع نلگنڈہ۔
۱۲۔ شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول، حیدرآباد
۱۳۔ ایل۔ این۔ گپتا میموریل ڈسپنسری، نمائش میدان۔ حیدرآباد

تجارت اور صنعت وحرفت کی تشہیر اور نکاسی کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتا ہے۔
کل ہند صنعتی نمائش ایک سالانہ خصوصیت ہے اور ریاستی عوام کے لئے نئے سال کا ایک تحفہ۔

کے۔ نارائن راؤ
معتمد اعزازی

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد: ۲۷
شمارہ: ۳

مارچ ۱۹۹۴ء

سرورق: طالب خوندمیری

کتابت: محمود سلیم۔ محمد غالب اور فضل محمد۔

طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار۔

خط و کتابت کا پتہ:
۲۱ [illegible]
فون آفس 55776 [illegible]

فی پرچہ: ۶ روپیے
سالانہ: ۶۰ روپیے
بیرونی ممالک: [illegible]

سلور جوبلی کے موقع پر

ماہنامہ **شگوفہ** کی خصوصی اشاعت

۲۵ سال کا شعری انتخاب

اپریل ۹۴ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا

'شگوفہ' کی ۲۵ جلدوں کا نچوڑ ۔ منتخب مزاحیہ شعرا کی تصاویر اور مختصر تعارف

سرورق : طالب خوندمیری

مہمان مدیر : سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ

'شگوفہ' پبلیکیشنز کے زیر اہتمام

نامور مزاح نگار **یوسف ناظم** کی تازہ تصنیف

امریکہ ــــ میری عینک سے

(سفرنامہ)

صفحات ۱۱۲ [illegible]

قیمت ۵۰ روپے

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

یوسف ناظم

امریکہ میری عینک سے

تحقیقاتی مزاج

اعداد و شمار جمع کرنے کا تو یہاں اتنا شوق ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ سمندر میں ہر منٹ اسکینڈ میں کتنی لہریں کس رفتار سے ساحل سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہیں تو آپ کو یہ معلومات بھی مل جائیں گی ـــــ امریکہ میں چراغ تلے اندھیرا بھی بہت ہے۔ شہری زندگی کی گہما گہمی اور رونق کے پیچھے کتنی کٹھنائیاں ہیں ان کا اندازہ صرف وہ اعداد و شمار بتاتے ہیں جو ماہرین نے جمع کر رکھے ہیں۔ امریکہ میں فیڈرل قانون کے مطابق ۱۵ سے کم عمر لڑکیوں کا رات میں ۷ بجے کے بعد کام کرنا منع ہے لیکن اکثر لڑکیاں کام میں مشغول رہتی ہیں۔ اسکول جانے والی لڑکیوں میں ۶۶ فی صد لڑکیاں "جاب" کرتی ہیں جب کہ جاپان میں ایسی لڑکیوں کا [illegible] ہر لڑکی فی گھنٹہ پانچ ڈالر کماتی ہے اور ہفتے کے ۲۵ گھنٹے "جاب" پر ۸ گھنٹے گھر کے کام میں صرف کرتی ہے۔ یہ لڑکیاں [illegible] کو رات کے ۲ سے پہلے سوتی نہیں ہیں اور صبح ۶ بجے کے الارم پر "مرغِ وقت نما" کی طرح جاگ جاتی ہیں۔ دوسری طرف امریکی معاشرے میں ہفتے کے آخری دو دن ہنگامہ گذارنا اور بھی علی الاعلان اتنا ہی ضروری ہے جتنا سانس لینا۔ امریکی جوڑے بمع اہل و عیال (خواہ ان کے اپنے بچے ہوں یا سابقہ شادیوں کا نتیجہ) یہ دو دن اس طرح گذارتے ہیں۔ گویا یہ زندگی کے آخری دو دن ہوں۔ خیمے لگتے ہیں اور کھانوں کے ڈبے، مشروبات کی بوتلیں، مضمون سے بھرپور میگزین، کھیلوں کا ساز و سامان، تہہ ہو جانے والی کرسیاں، دریاؤں میں [illegible] کسی کی پیٹھ اور شانوں پر اس طرح نظر آتے ہیں گویا یہ حضرت و خواتین اور اطفال پیدائش ہی سے [illegible] رہے تھے۔ سبزہ زاروں میں ٹرانسسٹر، ساز اور آواز کے پروگرام سنے جاتے ہیں۔ داد تالیوں سے بھی دی جاتی ہے اور سیٹیوں سے بھی۔ نئے تعلق کے مظاہرے ہوتے ہیں لیکن دیکھتا کوئی نہیں [illegible] ملک اپنے آپ میں مگن رہنے والوں کا ملک ہے۔ یہاں کسی بھی چیز یا فن کی "نا قدر دانی" کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ادبی مشاعرے یہاں ہوتے ہیں۔ مراٹھی اور ہندی کے بڑے بڑے کنونشن اور سمینار یہاں ہوتے ہیں [illegible] کی ہر زبان کی کتابوں سے بھری الماریاں آپ کے ذہن میں حیرت [illegible] ہیں [illegible]

سامان بچھا رہنے پہ مجبور ہوتا ہے۔ کھانے کی اتنی اہمیت ہے کہ نفیس حضرات بھی ان ہی کے گھروں کو اپنی توجہ اور لطف کا مرکز بناتے ہیں۔ بلکہ جا کر ہلکے کھانے سے یہ کام انھیں آسان نظر آتا ہے۔ یہاں جیسے موسیقی کے جلسے یا محفلیں رقص کی منعقد ہوں مسلسل آمدنی کا ذریعہ یا اداروں کا۔ ستارہ دیوی اور برجو مہاراج اپنے گروپ کے ساتھ آئیں یا ہندوستانی نارمولا [illegible] بیوہ اور [illegible] لطف اٹھائیں، ہال لبریز ہو جاتے ہیں [illegible] رکھتا ہے۔ اگر وہ [illegible] اختتام تقریب کا وقت مقرر ہو تو جلسہ [illegible] ایک منٹ پر نشستیں [illegible] ہوتی ہے کہ امریکہ میں ایک کتھک جیسا مشکل فن سیکھنے کے بھی شوقین ہیں اور چند مسلسل سالوں سے بھی نمبر وار آ کر سیکھنے کے مشتاق۔ ہندوستانی موسیقی اور رقص کے جتنے بھی اساتذہ یہاں ہیں ان کی اپنی درسگاہیں یہاں قائم ہیں اور طالب علموں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ اپنی [illegible] جٹ کی رفتار سے بھاگنے والی تیز رفتار اور ۲۴ گھنٹوں میں سے [illegible] گھنٹے مصروف رہنے والی زندگی میں [illegible] لطیفہ کے ساتھ امریکیوں کا یہ عشق بجائے خود ایک لطیفہ ہے۔ یہ لوگ اپنی مصروفیت کا سلیقہ رکھنے کے لئے بھی مصروف رہتے ہیں ورنہ بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جہاں سستی اور پژمردہ رہنے کو شرافت کی نشانی اور آل [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کام پر بھی جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے "گویا یاد سے نکل کر" سوئے دار جا رہے ہیں ۔۔۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ہے کہ امریکہ میں مزاح کو بھی وہی درجہ دیا جاتا ہے جو سنجیدہ اور خشک مضامین کو دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں یہاں کے ایک مشہور رسالے میں "مزاح" کے موضوع پر یہاں کے اہل علم اور دانشوروں نے بہت سنجیدہ بحث کی اور یہ کہا کہ سرکاری دفاتر اور تجارتی اداروں میں بھی "مزاح" کا استعمال بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ سن کر میں تو حیرت زدہ رہ گیا اور میرا خیال تھا کہ مزاح کو لوگ صرف "مسخرگی" سمجھتے ہیں۔

داد و دہش

امریکہ مختلف اور متضاد تہذیبوں کا ایک سنگم ہے لیکن تہذیبوں کا تضاد کسی ٹکراؤ کا باعث نہیں ہوتا۔ تضادات کو یہاں مفردات سمجھ کر ان کی آمیزش سے مفرح اور حرارت بخش مرکبات تیار کئے جاتے ہیں۔ ایشیائی، یورپین، امریکن ہندوستانی سب [illegible] یہاں اکثر موجود اور فروٹ سلاد کی طرح پائی جاتی ہیں۔ موسیقی کے دلدادگان ہری پرشاد چورسیا کی بانسری بھی سنتے ہیں اور اسی کے ساتھ کسی ہسپانوی فن کار کی گٹار کی آواز پر جھومتے ہیں۔ ایک ہی اسٹیج پر چتریش داس کا کتھک رقص بھی ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ [illegible] کا فلیمنکو ڈانس بھی۔ سان رافیل میں استاد علی اکبر خاں کے کالج آف میوزک کی بھی وہی حیثیت ہے جو کسی دانش گاہ کی ہوتی ہے۔ چتریش داس نے جن کا اس وقت خود ایک کتھک رقص کا کالج سان فرانسسکو میں قائم ہے اس فن کو امریکہ میں اس طرح مقبولیت کے قطب مینار پر بٹھا دیا ہے۔ گویا یہ فن یہاں کے لوگوں کے لئے واجد علی شاہ کا تحفہ ہے۔ یہ فن ہندوستان کے "کوہ نور" کی طرح سرقہ مال نہیں بلکہ [illegible] حاصل کیا ہوا ہیرا ہے۔ یہ کوہ نور کی طرح کوئی بے جان اور بے مصرف دولت نہیں بلکہ "پا بہ پا" منتقل ہونے والا خزانہ ہے۔ چتریش داس نے یہاں ہر سال کتھک کے سرپرستوں اور [illegible] کی یاد میں ایک تقریب کا اہتمام کر رکھا ہے [illegible] کا یہ عالم ہے کہ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ رقص صرف اس کا فن نہیں اس کا مذہب ہے [illegible] علی اکبر خاں [illegible] سے ستار، شیو کمار شرما کے سنتور [illegible] خان

[illegible] کے مطلب کے جیتے جاگتے ہیں لیکن بد بو ہے جو صاف پانی کے اوپر بھی ملتا ہے۔ یہاں فن کی قدر [illegible] تعصب سے مبرا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی ملک کوثر و تسنیم سے دھلا نہیں ہوتا۔ امریکہ نے جتنی ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کی ہے اتنی ہی ترقی یہاں جرائم کے میدان میں بھی ہوئی ہے۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے کا مقولہ یہاں بھی مقبول ہے اور اسے روبعمل لانے میں یہاں بڑے خلوص سے کام لیا جاتا ہے۔ کمسن اور نوعمر لڑکے اس ضمن میں بڑوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں دوسروں کی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ امریکہ میں سب سے زیادہ مصروف عدالتیں وہ کمسن لڑکے لڑکیوں کی عدالتیں ہیں۔ یہاں کے بچے دنیا کو واقعی بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں۔ ۷، ۸ سال کی عمر کے بچوں کے قبضے میں آتشیں اسلحہ کا ہونا معمولی بات ہے۔ ان اسلحہ کا استعمال بھی وہ بخوبی جانتے اور اپنا ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اصلاح گھر (جیل خانے) کافی تعداد میں ہیں اور ان گھروں کے منتظمین کو جگہ کی قلت کی شکایت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان مجرموں کے لئے مزید بستروں کا انتظام کیا جائے۔ بالغوں کے جرائم کی رفتار بھی حوصلہ افزا ہے اور عورتوں پر جبر و ستم کی وارداتیں وظیفۂ حیات ہیں۔ اعداد و شمار کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ امریکہ میں ہر ۶ منٹ میں ایک عورت جبر کا شکار ہوتی ہے اور ان میں سے چند ہی ہیں جو عدالت کے دروازے پر دستک دیتی ہیں ورنہ جان کے خوف سے انہیں جس طرح مدد کے لئے آواز دینے سے روکا تھا اسی طرح بعد میں اس خوف نے انہیں مہر بلب رکھا۔ یہاں بھی وکلائے دفاع بھری عدالت میں مدعیہ کو مزید ذہنی کرب میں مبتلا کرنے اور فتح یاب ہونے کے عادی ہیں۔ لیکن ایسے ماہرین و فنکار بھی موجود ہیں جو اپنے پیشے کو صرف پیشے کے طور پر نہیں ایک مشن کے طور پر روبعمل لاتے ہیں۔ پچھلے ہی ایک مقدمے میں دفاع کے وکیل نے ملزم کو پاگل ثابت کرنے کی کوشش کی اور عدالت سے کہا کہ اس پر جنون کے دورے پڑتے ہیں۔ ممکن تھا کہ عدالت وکیل دفاع کی اس دلیل کو مان لیتی لیکن وکیل استغاثہ نے جس کی شہرت اس نوعیت کے مقدمات میں ایک ماہر قانون کی ہے عدالت سے درخواست کی کہ وہ وکیل دفاع سے دریافت کرے کہ ان کے موکل نے اس سے پہلے کہاں، کب اور کن کے ساتھ اپنی مجنونانہ ذہنیت اور کردار کا مظاہرہ کیا تھا — اس استفسار پر وکیل دفاع ششدر رہ گئے اور ان کا موکل کیفر کردار کو پہنچا — کسی شاہراہ پر آپ کی کار جواب دے دے تو کوئی آپ کی مدد کو آتا نہیں ہے اور جو آتا ہے اس پر بھروسہ کرنا کار کو کارآمد تو نہیں بناتا کار نشین کو البتہ بے کار و بے بس بنا دیتا ہے۔ قتل کی وارداتیں بھی اتنی ہی ہوتی ہیں جتنی ڈکیتی [illegible] ہوتی ہیں — امریکہ جاگنے اور بھاگنے والوں کا ملک ہے۔ صرف سونا جن کی عادت ہے سونا چاندی ان کے مقدر میں نہیں ہوتا — کچھ لوگ جاگتے بھی ہیں اور بھاگتے بھی ہیں لیکن ان کے جاگنے اور بھاگنے میں نیت کے فتور اور خلوص کے فقدان کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ تجارت کی نعمتیں ہر جگہ موجود ہیں۔ جہاں نعمتیں [illegible] جا سکتی ہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ انسانی ذہن کی ذہانت [illegible] پہچانتی ہے۔ لیکن ذہنیت [illegible] امریکہ کے ایک سابق صدر [illegible] بھولیں گے نہیں۔ ابھی ۳۳۶ ووٹ [illegible] ۶ مہینے [illegible] ۱۹۹۲ء کے صدارتی انتخابات کے بارے میں رائے عامہ کی [illegible] کی ابتدا ہو چکی ہے اور [illegible]

[illegible] صدر بش جیسے دیہاتی بن کر سامنے آئیں اور ٹیکسا سے چند کروڑ پتی کھڑے ہوگئے جب اقتدار کی ہوس ہے۔ امریکہ میں سیاسی تماشہ آج کل بھی ایک مستقل مشغلہ ہے۔ یہاں تو یہ خبر بھی گشت کرتی رہی کہ بش پارٹی نے سابق انتخاب میں عوام کی دلچسپی کا مظاہرہ صرف اس لئے کیا تھا کہ Ross Perot انھیں خطرہ تھا کہ بش پارٹی کے کچھ حلیف ان کے جھگڑوں پر اتر آئیں گے اور ان کی بیٹی کی شادی خطرے میں پڑ جائے گی۔
یہ بات میں صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہاں کی ان موشگافیوں کا کچھ احوال نمو انتقال پیش کر دیا جائے۔

امریکی اعداد و شمار نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی ۲۰۲۳ عیسوی میں ۵.۵ ملین سے بڑھ کر ۸.۵ اور ۲۰۵۰ عیسوی میں ۱۱.۶ بلین ہو جائے گی۔ ہمارے ہندوستان اور دیگر مشرقی ملکوں میں یہ بلین اور ملین والی اصطلاحیں عام نہیں ہیں۔ ہم لاکھ اور کروڑ اور ارب کے ہندسوں کے قائل ہیں۔ ادھر لاکھ کا ہندسہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اپنی سہولت کی خاطر معلوم کر لیا۔ (معلوم تو پہلے بھی تھا) کہ ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے اور ایک بلین دس ملین کا۔ اس حساب سے امریکہ کی آبادی ۲۵۰ ملین سے بڑھ کر ۲۸۳ ملین ہونے والی ہے لیکن اہل امریکہ اس سے پریشان نہیں ہیں بلکہ آبادی کو غیر اخلاقی طریقوں سے روکنے کے مخالف ہیں۔ غیر اخلاقی طریقوں سے مراد اسقاط ہے اور اس کے خلاف یہاں زبردست تحریکیں رواں دواں ہیں۔ ڈاکٹروں کے کلینک خطرے میں ہیں اور بعض صورتوں میں تو چند اسقاطی ڈاکٹروں کو راہ فرار بھی اختیار کرنی پڑی ہے۔ امریکی دماغ ہر قسم کے خیالات اور تحریکوں کی آماجگاہ ہے۔ قانون و قاعدے یہاں اسلئے بھی بنتے ہیں کہ ان کی پابندی کی جائے۔ یہ لاٹری بازیوں کی رونق بڑھانے کے لئے نہیں ہوتے۔ امریکہ کے ایک سابق صدر نے عالمی سطح کے ایک بینک کے صدر اور بینکنگ ڈائرکٹر کو اپنا مشیر معاشیات مقرر کیا تھا لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ موصوف نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرکے خلاف قاعدہ اپنے لئے بینک سے قرض حاصل کیا تھا تو صدر امریکہ نے موصوف کو فی الفور برطرف کر دیا۔ بینک کی صدارت الگ جاتی رہی — اور اہل امریکہ کی اس وقت زبردست پریشانی یہ ہے کہ کم عمر بچوں میں جرائم دن بہ دن مقبول ہوتے جارہے ہیں۔ چوری، نقب زنی، ڈاکے اور قتل بلکہ ان کے معذرتوں کے مشاغل ہوتے جارہے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ بچوں کے جرائم کی سزا بھی بچکانہ ہی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے وہ سزا ممنوع ہے جو بالغوں کو دی جاتی ہے۔ دوسرے کاموں میں یہاں سن بلوغ کی شرط نہیں ہے۔

قدرتی بحر طویل

بحرالکاہل (PACIFIC SEA) کی سیر کا معاملہ بھی یادگار معاملہ ہے۔ اس بحرالکاہل کو ہم نے پہلی مرتبہ دنیا کے نقشے میں اس وقت دیکھا تھا۔ جب ہم کو جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا (ویسے جغرافیہ کو منحوس بھی مانا جاتا ہے اور منحوس کو ہی ہونا چاہیئے) ہم اس وقت سے بحرالکاہل سے مرعوب تھے اور سوچتے دیکھ دیکھ کر آب آب ہو جایا کرتے تھے۔ دیکھنے کی تمنا تو نہیں تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بحر کے کنارے سے ہمارے خاموش اور [illegible] نے اس بحر کا نظارہ دکھائی جو ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب ہمیں بہت پہلا کر تحت الشعور [illegible] ہو گیا ہے۔

بحرالکاہل جادوئی سمندر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا پانی آدمیوں کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ صبح کو اسی رنگ سے کچھ ایک نیلا سا ہے اور پہر سے بھرے پہاڑ خود رو درختوں اور پھولوں کو اپنے آغوش میں لئے اس سمندر پر سایہ کئے ہوئے ہیں وہ سایہ نہیں جو کسی پر بوجھ بنتا ہے بلکہ یہ سایۂ عاطفت ہے۔ ان پہاڑوں سے جھرنے نکلتے ہیں۔ ان میں آب مصفا کہاں سے آتا ہے اور یہ کس طرح برخاب بنتا ہے پتہ نہیں ان جھرنوں کے پانی میں آدمی اپنی شکل دیکھ کر شرماتا ہے اور کچھ لوگ جنھیں غالب نے "صاحب" کے لقب سے یاد کیا ہے اس پانی میں اپنے آپ کو دیکھ کر دل تھام بیٹھتے ہیں۔ بحرالکاہل کا اہل امریکہ نے اتنا ہی احترام کیا ہے جتنا کہ وہ کولمبس اور اپنے پہلے صدر کا کرتے ہیں۔ اس کے ساحل کو انھوں نے سچ مچ سنوارا ہے۔ یہ ساحل اتنا ہی لامتناہی ہے جتنا کہ یہ سمندر۔ سمندر تو افق سے گلے ملتا ہے لیکن دو طرف نرم اور ریشمی ریت، ہیبت ناک کھائیاں، محیرالعقول پل، گھنے جنگل اور کہیں کہیں سحر انگیز ماحول سے محبت کرنے والوں کی خال خال آبادیاں اس سمندر کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔ اس سمندر سے ہماری محبت کا یہ عالم ہے کہ ہمیں اب بھی یاد ہے کہ اس سلسلہ کی لمبائی کتنے میل ہے اور گہرائی کتنے میل۔ زمین کا ایک تہائی حصہ تو اس سمندر نے گھیر رکھا ہے اور ہماری یادداشت کے مطابق اس کا گھیراؤ بعد طوالت اور گہرائی ۸۰ کروڑ مربع میل سے بھی زائد ہونا چاہیئے اور اس میں ڈوبنے والے کو بچانے والے بھی آسانی سے ڈوب سکتے ہیں۔ ڈوبنے والے شخص کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ساحل پر جگہ جگہ جلی حروف میں اعلانات مطبوعہ حالت میں نوشتۂ دیوار بنے موجود ہیں کہ اس سمندر سے دور رہو اس کی موجیں صرف شب کو نہیں ماتیں دن کے اجالے میں بھی حملہ کر دیتی ہیں۔ یہاں لوگ پانی کا صرف مشاہدہ کرتے ہیں مطالعہ نہیں کرتے مطالعہ کیا تو مطالعے میں غرق ہو جائیں۔ یہاں آدمیوں کے دریا برد ہونے کی وارداتیں نہیں ہوتیں نہ یہ نقش برآب ہوتے ہیں۔ سمجھدار لوگ ہیں۔ ڈوبتے تو یہ بھی ہیں لیکن جہاں یہ ڈوبتے ہیں۔ انھیں مقامات رنگ و رامش کہا جاتا ہے۔ قدرت کی فیاضیوں نے انھیں بہت ہنرمند بنا دیا ہے۔

بحرالکاہل کے ساحل کا نظارہ کرنے کہیں سے جائیے دو سو میل سے کم کا سفر نہیں ہوتا لیکن گھنٹوں کا یہ سفر نصف وقت میں اس لئے طے ہوتا ہے کہ یہاں کی سڑکیں شاہراہیں نہیں شہنشاہ راہیں ہیں ان پر موٹریں مجرموں کی رفتار سے بھاگتی ہیں۔ یہ شاہراہیں موٹروں کی صحت کے لئے مفید ہیں اور ان کی تندرستی میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے اعضائے جسمانی کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔ سڑکوں پر حادثے یہاں بھی ہوتے ہوں گے لیکن ان میں سڑکوں کا قصور نہیں ہوتا۔ یہاں کا محکمۂ تعمیرات سڑکوں پر گڑھے اور خندقیں نہیں بناتا۔ یہ فن ہے بھی ذرا مشکل۔ اس لئے سفر کو بالعموم ہر طرح کے ساز و سامان جس میں خورد و نوش کی اشیاء بھی شامل ہیں کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ کیمپر (camper) گاڑیاں کم ہیں لیکن نادر نہیں۔ ان میں باورچی خانے، نعمت خانے اور غسل خانے کے علاوہ بستر استراحت کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ ساحل پر جانے والے خیمے تک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پرانے ڈھنے کی چھولداریوں نے کتنی ترقی کر لی ہے۔

بحرالکاہل کی طوالت اور اس کی "زرخیزی" کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل امریکہ نے اس کے کئی بیچ بنا رکھے ہیں۔ جہاں آپ اطمینان سے بیٹھ کر مغرب یا مشرق میں ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر سکتے ہیں لیکن ان [illegible] [illegible] Topless یا sex [illegible] پہاڑوں کے دامن میں [illegible] کے [illegible] بنا رکھا ہے جہاں تفریح کنندگان اپنی موٹریں کھڑی کر سکتے ہیں (کرایہ [illegible]

[illegible] صحرائے نجد کی طرح کے جنگل میں بھی آدمی کو اس بات کی اجازت نہیں [illegible] کوئی نازیبا حرکت کرے حرکتوں کے لئے بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی اتنی [illegible] کہ آدمی خضوع و خشوع اور خلوص دل کے ساتھ اپنے [illegible] ہاتھ اٹھائے تو آسمان کے فرشتے دست بدست اس دعا کو وصول کر کے قبولیت کے لئے فوراً پہنچا دیں (یہ کام آدمی چاہے تو بالراست بھی کر سکتا ہے) قدرت شناس اور منظر [illegible] یہاں شب بسری کا بھی انتظام کر لیتے ہیں۔ رات میں کوئی ۸۰ اقسام کے جانور اپنی "روزی" کی تلاش میں یہاں گشت کو نکلتے ہیں۔ لیکن نہ تو یہ آپس میں دست و گریباں ہوتے ہیں اور نہ سفری خواب گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں پہاڑوں سے پانی کے جھرنے نکل کر بحر الکاہل کی فراخی اور وسعت میں اضافہ کرتے ہیں ایک جھرنے میں ہم نے اپنے پاؤں دھوئے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ 'پایاب' چشمہ کسے کہتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ پانی بحر الکاہل میں ردیف بن کر سخن فہموں سے داد حاصل کرے گا۔ (شاعروں کی نگاہ میں [illegible] بحر طویل سے بھی کہا جاتا ہے کہ بحر الکاہل کے ساحل پر ہر شخص بھی ایک رات گزارتا ہے، نیند دماغ اور [illegible] اسی کی ہو جاتی ہیں اور اس کی عمر میں ۱۰ سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ۵۰ سال کی عمر میں لوگ ٹینس اور گولف کھیلنا شروع کرتے ہیں (گولف کو اسپورٹس کے باب میں اس لئے جگہ دی گئی ہے کہ اس میں بھی ایک گیند ہوتی ہے ورنہ اصل میں یہ [illegible] سیاحتی اور تفریحی احباب اسی وحشت کی سیاحی میں اپنی کئی پشتیں خرچ کر دیتے ہیں) بحر الکاہل کے پانی کے پانچ رنگ [illegible] نیلگوں، سبز، گلابی، [illegible] فالسئی، سفید آبی اور دودھیائی ایف ایم حسین نے یہ منظر ضرور دیکھا ہوگا۔ ان کی مصوری بھی ایسی ہی خدا داد ہے اور گوناگوں رنگ غیب سے ان کے خیال میں آتے ہیں ۔۔۔ (ایک گمان یہ بھی ہے کہ ہمارے پنج سالہ منصوبے بھی ایسے ہی خوش رنگ ہوتے ہیں)

(باقی آئندہ)

فارم ۱۷ حسب قاعدہ 8

بابت "شگوفہ" حیدرآباد 500001

مقام اشاعت :- ۲۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

وقفہ اشاعت :- ماہنامہ

پرنٹر کا نام :- ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ، ۶۹۸ - ۶ - ۱۶ ڈبیر پورہ - حیدرآباد ۲۳ -

پبلیشر کا نام :- " " " "

اڈیٹر کا نام :- " " " "

مالک کا نام اور پتہ :- قیصر کمال ، ۶۹۸ - ۶ - ۱۶ ڈبیر پورہ - حیدرآباد ۲۳ -

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

مجتبیٰ حسین
(دہلی)

ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے

ایک زمانہ تھا جب میرا زیادہ تر وقت لائبریریوں میں گزرتا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ سماج میں جہلا ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں اور اونچی اونچی کرسیوں پر قبضہ جما چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ لعنت ہے ایسے علم پر جس سے علم کی پیاس تو بجھ ہی جائے لیکن پیٹ کی آگ نہ بجھنے پائے۔ ملک کی یونیورسٹیوں پر غصہ بھی آیا کہ اگر وہ علم کو پھیلانے کے بجائے جہالت کو ہی عام کرنے کا بیڑا اٹھا لیتیں تو آج ملک نہ جانے کتنی ترقی کر لیتا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے لائبریریوں کو خیرباد کہہ دیا اور پھر کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے باہر آکر جہالت کو سیکھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ سیاستدانوں کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوا کہ یہ ہستیاں جہالت کا سرچشمہ ہوتی ہیں لیکن یہ گُر نہ آیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ علم کی دولت آدمی کے پاس ایک بار آجاتی ہے تو پھر کبھی نہیں جاتی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے اندر یہ جو علم کا احساس ہے اسے کسی طرح سے باہر نکالوں اور اس کی جگہ جہالت کی دولت سے اپنے سارے وجود کو مالا مال کر دوں مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عرصہ تک علم سے ناتا اور مسلسل دور رہنے کی وجہ سے میں نے تھوڑی بہت ترقی ضرور کر لی۔

مگر پچھلے دنوں بات کچھ یوں ہوئی کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک ضروری کام یاد آگیا۔ اس نے کہا کہ وہ دو گھنٹوں میں واپس آجائے گا۔ تب تک میں یہیں کہیں اس کا انتظار کروں۔ سامنے ایک پارک تھا۔ سوچا کہ یہاں وقت گزار لوں لیکن اس عمر میں نوجوانوں کی عشقیہ مصروفیتوں اور ناگفتہ بہ حرکتوں میں مخل ہونا پسند نہ آیا۔ سامنے ایک ہوٹل تھا جس میں نہایت اونچی آواز میں موسیقی کے ریکارڈ لگا کر گاہکوں کو ہوٹل کے اندر آنے سے روکا جا رہا تھا۔ اب وہ پرانی لائبریری ہی رہ گئی تھی۔ جس میں، میں اپنے زمانہ جاہلیت میں نہایت ہی پابندی سے جایا کرتا تھا۔ خیال آیا کہ چلو آج لائبریری میں چل کر دیکھتے ہیں کہ کس طرح کس حال میں ہیں
[illegible]

افسوس ہے کہ اب بھی وہاں کچھ لوگ علم کی دولت کو سمیٹنے میں مصروف تھے، چونکہ علم کی دولت چرائی نہیں جا سکتی اس لیے یہ صاحب تھوڑی علم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے سارے گھوڑے بیچ کر کتاب پہ سر رکھ سو رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بہت دنوں بعد لسان العصر حضرت شیکسپیر، مصور فطرت علامہ ورڈز ورتھ، شمس العلماء حسن باسفوی، مصور غم جان کیٹس وغیرہ کی کتابوں کا دیدار کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا کہ ان کتابوں میں اب میرے لیے کیا رکھا ہوا ہے کچھ اردو کتابوں کی ورق گردانی کی جائے چنانچہ جب میں لائبریری کے اردو سیکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اَٹی ہوئی "کلیات میر" کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا "خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔ میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار، ابھی ابھی میں محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کا خاتمہ کر کے یہاں پہنچی ہوں۔ جس نے آب حیات پی رکھا ہے اسے تم کیا مارو گے۔ قاتل سے دبنے والے اسے آسماں نہیں ہم"

دیمک کے منہ سے اردو مصرعہ کو سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا "تم تو بہت اچھی اردو بول لیتی ہو بلکہ اردو شعروں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتی ہو"۔

بولی "اب تو اردو ادب ہی میرا اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا بن گیا ہے"

پوچھا "کیا اردو زبان تمہیں بہت پسند ہے"

بولی "پسند ناپسند کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں سب سے بڑی اہمیت آرام اور سکون کو حاصل ہے جو مجھے یہاں مل جاتا ہے تم جس سماج میں رہتے ہو وہاں آرام، سکون اور شانتی کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ امن و امان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ اب اگر میں یہاں آرام سے رہنے لگی ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے" میں نے پوچھا "کیوں ملکہ؟" بولی "ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے اب یہاں کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لیے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا ذخیرہ رکھی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ تم جو اب یہاں آئے ہو تو تم بھی کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آئے ہو۔ کہیں تم خود مصنف تو نہیں ہو؟"

میں نے حیرت سے پوچھا "تم نے کیسے پہچانا کہ میں مصنف ہوں"

بولی "میں تمہیں جانتی ہوں۔ ایک رسالے کی ورق نوشی کرتے ہوئے میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی بلکہ تھوڑی سی تصویر کھائی بھی تھی۔ ایک دم بدذائقہ اور کڑوی کسیلی نکلی۔ حالانکہ وہ تمہاری نوجوانی کی تصویر تھی۔ پھر بھی اتنی کڑوی کہ کئی دنوں تک منہ کا مزا خراب رہا۔ میں تو بڑی مشکل سے صرف تمہاری آنکھیں ہی کھا سکی تھی کیونکہ تمہارے چہرے میں کھانے کے لیے ہے ہی کیا۔ تم اردو کے مصنفوں میں یہی خرابی ہے کہ تصویریں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی چھپواتے ہو اور تحریریں بچپنے کی سی لکھتے ہو۔ اور ہاں خوب یاد آیا۔ تم نے سر سید احمد خاں کو داڑھی کے بغیر دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا تو "آثار الصنادید" کی وہ جلد دیکھو جو سامنے پڑی ہے۔ ایک دن خیال آیا کہ سر سید داڑھی اور اپنی مخصوص ٹوپی کے بغیر کیسے لگتے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے بڑے جتن کے ساتھ سر سید احمد خاں کی ساری داڑھی نہایت احتیاط سے کھا لی۔ پھر ٹوپی کا صفایا کیا

اب جو سرسید احمد خاں کی تصویر دیکھی تو معاملہ وہی تھا۔ قمیص کے تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔ اب یہ تصویر بھی آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مجھے تصویروں میں مسکراہٹیں بہت پسند آتی ہیں۔ مونا لیزا کی مسکراہٹ تو اتنی کھائی کہ اکثر بار بد ہضمی ہو گئی۔ زمانے کو اس کی مسکراہٹ آج تک سمجھ میں نہیں آئی مجھے اس کا ذائقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک کھٹ مٹھا سا ذائقہ ہے کھاؤ تو بس کھاتے ہی چلے جاؤ۔ بھلے پیٹ بھر جائے لیکن نیت نہیں بھرتی۔"

میں نے کہا "تم تو آرٹ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہو۔"

بولی "جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو وہ آرٹ اور کلچر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کیڑوں مکوڑوں کا پیٹ بھر جائے تو وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ تب احساس ہوا کہ انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ خیر اب تو تم لوگ بھی اپنی زندگی "حشرات الارض" کی طرح گزارنے لگے ہو۔"

میں نے کہا "اب جب کہ تم نے خاصے اردو ادب کو چاٹ لیا ہے تو یہ بتاؤ یہ تمہیں کیسے لگتا ہے؟"

بولی "شروع شروع میں یہ میرے پلے نہیں پڑا تھا۔ بڑا ریاض کیا۔ متقدمین کے دیوان چاٹے۔ مشکل یہ ہوئی کہ میں نے سب سے پہلے "دیوان غالب" پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ لہٰذا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی آسان اور زود ہضم نظمیں پہلے نوش جان کیں۔ پھر وہ کیا کہتے ہیں۔ آپ کے مفکر والے شاعر وہی جو پانی پت رہتے تھے مگر وہاں کی جنگوں میں شریک نہیں تھے۔ ارے اپنے وہی مولانا حالی۔ ان کی نصیحت آمیز شاعری پڑھی۔ شاعری کم کرتے تھے نصیحت زیادہ کرتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو آج تمہارے گلے میں بھی روایات کا ایک بوسیدہ سا مفلر ہوتا۔ اب تو خیر سے سارا ہی اردو ادب میری مٹھی میں ہے۔ سب کو چاٹ چکی ہوں۔ ایک بار غلطی سے جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی چاٹ لی۔ طبیعت میں ایسا بھونچال آیا کہ سارا دیوان پیٹ سے باہر ہونے لگا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے چار و ناچار جاں نثار اختر کی گھر آنگن والی شاعری پڑھنی پڑی۔ ویسے تو میں نے دنیا کی کم و بیش ساری ہی زبانوں کی کتابیں چاٹ لی ہیں لیکن اردو شاعروں میں ہی یہ وصف دیکھا کہ اپنے معشوق کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کوئی معشوق کے گیسو سنوارنا چاہتا ہے تو کوئی انہیں بکھیر دینا چاہتا ہے۔ کوئی وصل کا طالب ہے تو کوئی ہجر کی لذتوں میں سرشار رہنا چاہتا ہے۔ کوئی معشوق کو کوٹھے پر بلانے کا قائل ہے تو کوئی اس کا دیدار بھی یوں کرنا چاہتا ہے جیسے چوری کر رہا ہو۔ تم لوگ آخر معشوق سے چاہتے کیا ہو۔ اسے ہزار طرح پریشان کیوں کرتے ہو۔ اردو شاعری میں معشوق خود شاعر سے کہیں زیادہ مصروف نظر آتا ہے۔ یہ بات کسی اور زبان کے معشوق میں نظر نہیں آتی۔ اردو شاعروں کا عشق بھی عجیب و غریب ہے۔ عشق کرنا ہو تو سیدھے سیدھے عشق کرو۔ بھائی کس نے کہا ہے تم سے کہ معشوق کی یاد میں آسمان کی طرف دیکھ کر تارے گنتے رہو۔ اس کی یاد نے زور مارا تو اپنا گریبان پھاڑنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔ سوچو ہے کپڑا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ سیدھے سیدھے معشوق کے پاس جاتے کیوں نہیں۔ اپنے دل کا مدعا بیان کیوں نہیں کرتے۔ عاشق بزدل اور ڈرپوک ہو تو ایسے ہی چونچلے کر کے اپنے دل کو بہلاتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اردو ادب پر تمہاری گہری نظر ہے۔"

بولی "اب جب کہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تو سوچا کیوں نہ میں ہی نظر رکھ لوں۔"

پوچھا "دنیا دوسری کے کلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

بولی "ان کا کلام تو لے کے چکر میں اچھی خاصی بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ مجھے تو طبلہ اور سارنگی کے بغیر ان کا کلام سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اور بیچارے فانی بدایونی؟"

بولی "ان کے غم پر بے پناہ ہنسی آتی ہے۔ عجیب مضحکہ خیز غم ہے۔"

"اور مولانا آزاد؟"

بولی "زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اسے اردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اردو میں شاید ہی اتنی شہرت ملی ہو۔"

میں نے کہا "یہ بتاؤ تمہیں اردو کی کتابیں کیسی لگتی ہیں؟"

بولی "تمہارا جو ادب لیتھو گرافی کے ذریعہ چھپا ہے اسے کھاؤں تو یوں لگتا ہے جیسے باسی روٹی کے ٹکڑے چبا رہی ہوں۔ پھر جگہ جگہ کتابت کی غلطیاں کباب میں ہڈی کی طرح چلی آتی ہیں۔ لیکن جو کتابیں اردو اکیڈیمیوں کے جزوی مالی تعاون کے ذریعہ چھپنے لگی ہیں وہ بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ میں تو جزوی امداد کی چاٹ میں کل کتاب کو ہی کھا جاتی ہوں۔ ان میں ادب ہو یا نہ ہو کھانے میں لذیذ ہوتی ہیں۔ کیونکہ مفت خوری میں جو مزہ ہے وہ محنت کی کمائی میں کہاں۔ اعزازی زندگی گزارنے کی شان ہی جداگانہ ہوتی ہے۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ اردو کا مصنف اور شاعر اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بات بات پر اس قدر شکریے کیوں ادا کرتا ہے۔ پبلشر اور سرپرستوں وغیرہ کا شکریہ تو خیر پھر بھی برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اردو کا مصنف اس سائیکل رکشا والے کا بھی شکریہ ادا کرنے پر مجبور نظر آتا ہے جس میں بیٹھ کر وہ کتاب کی پروف ریڈنگ کرنے جاتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے سے تو یہی لگتا ہے کہ مصنف سائیکل رکشا والے کو کرایہ بھی ادا نہیں کرتا۔ تب ہی تو اتنا گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ کر ممنون ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ ایک شاعر نے اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کے لیے چمڑے کے ایک بیوپاری کا یوں شکریہ ادا کیا تھا جیسے چمڑے کا بیوپاری نہ ہوتا تو اردو ادب در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا اور وہ بھی ننگے پاؤں۔ بھیا چمڑے کا کاروبار اور چمڑی کا کاروبار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تم اپنی شاعری میں چمڑی کا کاروبار کرتے ہو۔ پھر چمڑے کے بیوپاری کو اس کی ساری خباثتوں کے ساتھ ادب میں کیوں لے آتے ہو؟"

میں نے کہا "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ اردو کے ادیب اور شاعر کسی کا شکریہ ادا نہ کریں؟"

بولی "شکریہ ادا کرنا اچھی بات ہے لیکن اصل میں جس کا شکریہ ادا ہونا چاہیے اس کا تو ادا کرو۔"

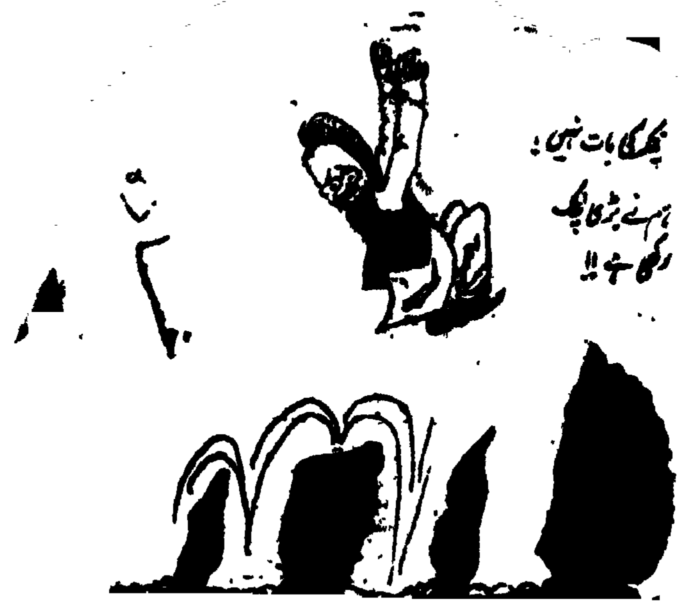
میں نے پوچھا "مثلاً کس کا؟"

شرما کر بولی "مجھے کہتے ہوئے لاج سی آتی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو تو اب میرے سوا کسی اور کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ آج کل اب میں ہی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں۔ ورنہ انہیں پوچھتا کون ہے؟"

دیمک کی ملکہ کی بات بالکل سچی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ اگلی بار اگر میری کوئی کتاب چھپی تو اس میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔"

ہنس کر بولی "اتنی ساری حماقت کے بعد بھی تم اپنی کتاب چھپواؤ گے۔ بڑے بے شرم اور ڈھیٹ آدمی ہو۔"

مرض الجہاری۔ وہ صبر و شکر پر ادا کرنے کے بجائے الٹا کہتا ہے کہ میرے نام منسوب کردہ تو کیسا رہے گا؟
یہ کہہ کر دیلکوں کی طرح کلیات میرؔ کی گہرائیوں میں کہیں گم ہو گئی۔ ادھر میں لائبریری سے باہر نکل آیا۔



اسرار جامعی (دلی)

دلی درشن

دلی نئی پرانی دیکھو
[illegible] شہر، حیرانی دیکھو
[illegible] کی سلطانی دیکھو
دھلی پر شروانی دیکھو

خون فساد اور دنگا دیکھو
بلا دیکھو رنگا دیکھو
دھن والا بھک منگا دیکھو
کپڑے پہنے ننگا دیکھو

راجاؤں کی رانی دلی
دنیا بھر میں مانی دلی
دن کو تو ہے دھانی دلی
رات کو ہے رومانی دلی

٥

[illegible] راجہ کے راج کو دیکھو
بھارت کے سرتاج کو دیکھو
منتری مہاراج کو دیکھو
الٹے سیدھے کاج کو دیکھو

بوٹ کلب پر دھرنا دیکھو
کچھ نہیں کرکے کرنا دیکھو
کہنا اور مکرنا دیکھو
ہمت کرکے ڈرنا دیکھو

اردو کا اقبال بھی دیکھو
اور اس کو پامال بھی دیکھو
اردو گھر کا حال بھی دیکھو
غالب کے گھر ٹال بھی دیکھو

٥

ایک سے ایک نظارے دیکھو
جھرنے اور فوارے دیکھو
دن میں چمکے تارے دیکھو
کاروں میں ناکارے دیکھو

شر پنڈت کٹھ ملا دیکھو
رام بھگت عبداللہ دیکھو
سوکھی گھاس کا پلا دیکھو
بے رس کا رس گلا دیکھو

اردو کا بازار ہے دیکھو
مجلس کا بیوپار ہے دیکھو
اپنا یہ کردار ہے دیکھو
غیرت کیا بیدار ہے دیکھو

٥

نیتاؤں کی مورت دیکھو
کالی کلوٹی صورت دیکھو
کوّے چیل کی خصلت دیکھو
بنتے ان کی درگت دیکھو

کالونی اور بستی دیکھو
اونچائی اور پستی دیکھو
دولت کی سرمستی دیکھو
عزت سب سے سستی دیکھو

بد ذوقوں کی دیکھو خصلت
آؤ دیکھو ذوق کی تربت
اس تربت کی دیکھو درگت
ڈوب مرو گر ہے کچھ غیرت

٥

[illegible] کے ساتھ [illegible] دیکھو
پیٹ کی مار کے مارے دیکھو
[illegible] بے چارے دیکھو
[illegible] دیکھو

شہنائی اور بینڈ بھی دیکھو
ڈنڈوت اور شیک ہینڈ بھی دیکھو
دلی میں انگلینڈ بھی دیکھو
سرونٹ کم ہسبینڈ بھی دیکھو

نیتا آئی جانی دیکھو
[illegible] دیکھو
مجرم سی نگرانی دیکھو
[illegible] میں [illegible] دیکھو

ووٹ بٹورنے والے
کرسی کی نیا کھینے والے
ہم سے سادہ بھولے بھالے
دو پل کا دکھ سہنے والے

اور لوگو! آ کر دیکھو
لوگوں کا بہکانا دیکھو
کھاتے سب کا تانا دیکھو
پڑھتے ہیں بے جا دیکھو

بھارت کے سیوک دیکھو
ہم سب [illegible] دیکھو
امریکی جاپانی دیکھو
تم ہو ہندوستانی دیکھو

o

ایم پی بکنے والے دیکھو
پی ایم بھی دل والے دیکھو
جو چاہے منہ والے دیکھو
نیتا بننے والے دیکھو

چکر خوب چلاؤ لوگو!
پوچھو سب کا بھاؤ لوگو
جو جا ہوئے جاؤ لوگو
یہ گھر مت بکھراؤ لوگو

گھر اُن کا یا نانا بھی یہاں کا
چھٹکل ان کا بابا ہے اُن کا
فوری سے پہچان بنی کا
جو کچھ ہے [illegible] ہے ان کا

o

نزلے سے [illegible] دیکھو
بے سر کی سرداری دیکھو
عیاری، مکاری دیکھو
کانٹوں کی پھلواری دیکھو

(ابھی دیکھا جا سکتا ہے)

لپ اسٹک

ایک دن میں نے کہا بیگم سے اے جانِ بہار
ہو گیا گھر کے بجٹ میں اب اضافہ بے شمار
بڑھ گئے ہیں گھر کے اخراجات کتنے آج کل
کیجیے للّٰہ آرائش میں کچھ تو اختصار
کس طرح گاڑی چلے گی گھر کی یہ تو سوچیے
جب کہ فیشن کا جنوں ہے آپ کے سر پر سوار
لاکھ سمجھایا کروں لیکن اثر ہوتا نہیں
آپ کے سر سے لپ اسٹک اور [illegible] کا خمار
بات جب نکلی لپ اسٹک کی تو بیگم نے کہا
صرف استعمال کے ہیں [illegible]!

[illegible] بہاری [illegible]

غزلیں

اعجاز الدین پاپولر میرٹھی

توبہ توبہ پیار کا اظہار ٹیلی فون پر
دوستوں سے کر نہ ذکرِ یار ٹیلی فون پر

چار عاشق کر رہے تھے تذکرہ معشوق کا
ایک جیسی گفتگو تھی چار ٹیلی فون پر

رابطہ قائم اگر کرنا ہے اہلِ حسن سے
راستہ پہلے کرو ہموار ٹیلی فون پر

شاعروں کے گھر پہ ٹیلی فون ہونا چاہئے
تاکہ دنیا سن سکے اشعار ٹیلی فون پر

تم ریسیور کو اٹھا لینا نہ بھولے سے کبھی
گالیاں بکتے ہیں یہ کردار ٹیلی فون پر

جب یہ عالم ہو تو کیا سمجھے حقیقت کو کوئی
سامنے انکار اور اقرار ٹیلی فون پر

کاش ایسا کارنامہ ہو کوئی سائنس کا
دیکھ لے ہر شخص حسنِ یار ٹیلی فون پر

پا گئی طے رات اک لڑکی سے لو میرج کی بات
ہو گئی قسمت مری بیدار ٹیلی فون پر

بلوے کی افواہ پھیلاتے ہیں اکثر شہر میں
چپکے چپکے ملک کے غدار ٹیلی فون پر

اس سے مل کر گفتگو کر لو اگر ہے پاسِ عشق
پاپولر اچھی نہیں تکرار ٹیلی فون پر

○

صابر بہاری رانچی

افرا تفری، بے بسی، آتنک وادی دور ہے
رب بھروسے کیوں ہے بھارت یہ کہانی پھر کبھی

اُلجھے رہیئے زن مریدی میں میاں شام و سحر
کیا ہے اپنی شوہریت یہ کہانی پھر کبھی

اس اہنسا اور گاندھی جی کے پیارے دیش میں
کیوں روا ہے قتل و غارت، یہ کہانی پھر کبھی

گھر سے گھر کی قربتیں بے شک بہت پُرکیف ہیں
دل سے دل کی کیوں ہے فرقت یہ کہانی پھر کبھی

حالت ہیں صابر بہاری کے سلامت پھر بھی کیوں
کھا رہے ہیں روز گھٹ یہ کہانی پھر کبھی

افتخار وصی، بتیا مغربی

اب کیا کرے یقین کوئی حق نواؤں پر
جھکتے سبھوں کو دیکھا ہے رشوت کے پاؤں پر

پنڈت نے سب کو بیچ کے گانجہ منگا لیا
لوگوں نے جو چڑھایا تھا پھل دیوتاؤں پر

اس نے قصیدہ گڑھ دیا پیپل کی شان میں
شاعر کو شعر کہنا تھا پیپل کی چھاؤں پہ

جب کچھ نہیں ملا اسے شاعر کی جیب سے
ڈاکو نے کان کاٹ کے پہونچایا گھاؤں پر

نیتا وطن کو بیچ کے کھانے پہ ہیں تلے
افراد بوجھ بن گئے ہے اپنی ماؤں پر

کام کچھ نہ آئیں پردہ داریاں
ہائے رے شوہر کی یہ بیماریاں

نوٹ: اس مضمون میں میری بیوی نے اپنے مشاہدات مجھ سے جوں کے توں قلمبند کروائے ہیں۔ میں نہ لکھتا تو کیا کرتا۔

عورتوں کی بہ نسبت مرد، ہمت، شجاعت اور قوتِ ارادی میں بہتر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ ساری صفات ان میں کنوارپنے تک ہی باقی رہتی ہیں شادی کے بعد دوسری صفات کے ساتھ ان میں قوتِ برداشت تو نام کو نہیں رہتی۔ بیوی پر برتری کا احساس کا بوجھ انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کرنے لگتا ہے اور اگر اتفاق سے بیوی قسمت سے زیادہ پڑھی لکھی ذہین اور خوب صورت بھی ہو تو پھر شوہر کی حالت نیم چڑھے کریلے جیسی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میرے شوہر خواہ مخواہ صاحب سے ملیے:

دوسری مردانہ صفات تو خیر سے ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں لیکن حسبِ مرضی جس وقت چاہے بسترِ علالت پر لیٹ جانے کی خصوصی صلاحیت ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ ہفتے کی شام کو دفتر سے واپسی کے فوری بعد بڑی باقاعدگی اور اہتمام سے بیمار ہونے لگتے ہیں۔ بسترِ علالت پر ہی لیٹے لیٹے اپنے سارے کام [illegible] کرتے ہوئے ان [illegible] کے حقوق [illegible] استعمال [illegible] کرنے کے [illegible] پھر بھی [illegible] خود [illegible] میں مبتلا [illegible] جان [illegible] آخر [illegible] شوہر [illegible] بیماری کا [illegible] تیمارداری کی [illegible] ہے۔ لیکن [illegible] وقت [illegible]

[illegible] مزاج پرسی و ہدایات پر مامور رہتے ہیں۔ دوپہر کے بعد ان کی خاطر ملاقاتیوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے [illegible]
کے لیے تیار کیے گئے چٹ پٹے اور مزے دار پکوڑوں، سموسوں اور سینڈوچیں وغیرہ سے خود مریض ۔ ۔ ۔ ۔ کی
بالا بالا احتیاطاً و احتیاطاً مستفید ہوتے ہیں۔ بالآخر شام کو جب تک مریض کی صحت دُہائی نہیں دیتی - یہ سلسلہ
ختم نہیں ہوتے بلکہ ٹالے جاتے ہیں۔ دکھ یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کا کوئی دوست بیمار کا خیال رکھتے ہوئے آداب
مزاج پرسی کے تحت اپنے ساتھ پھل یا جذبۂ خیر سگالی کے تحت پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ تک نہیں لاتا۔ بعض
احباب تو شکم سیری کے بعد لوٹتے ہوئے مرض یا مریض سے متعلق دلاسہ دینے کی بجائے سموسوں اور پکوڑوں
کے ذائقے کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ان سموسوں پکوڑوں کی بدولت ہی شام وا پس کے بعد بھی شام
اور رات ان حضرت کے صحت یاب ہونے کی مشق کو دانے چن کر گزر جاتی ہے یہی لیے کہ انھیں بہر صورت صبح
چاق و چوبند ہو کر دفتر جانا بھی ضرور ہوتا ہے۔ کیا مجال ہے جو ہر ہفتہ ان کے اس نظام الاوقات میں سر مو فرق آیا ہو۔
ـــــــ ہاں ! ہر ہفتہ بیماری کی نوعیت بدلتی رہتی ہے تاکہ مریض اور تیمار دار مرض کی یکسانیت سے اُوب نہ جائیں۔

ڈرامے کا دوسرا ایکٹ ملاحظہ فرمائیں:

ہفتے کی سہ پہر کو دفتر سے لوٹتے ہیں تو چہرے پر بیماری کے آثار کی جگہ بدحواسی طاری رہتی ہے (اداکاری
ہو تو ایسا ہی ہو) بال پریشان، ٹائی ڈھیلی، قمیص کی جگہوں سے پتلون سے باہر نکلی ہوئی- بریف کیس صوفے
پر پھینک کر جوتوں سمیت پلنگ پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اس عمل میں حسبِ مصلحت تبدیلی بھی ہوا کرتی ہے وہ اس طرح
کہ کبھی ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلنے کے بعد بیماری کا غلبہ شروع ہوتا ہے اور کبھی بیماری دفتر ہی میں سہ پہر سے
حملہ آور ہوتی ہے اور گھر پہنچنے تک انھیں فریش کر دیتی ہے۔ پلنگ پر آنکھیں بند کیے لیٹے ہیں۔ مکالموں کا آغاز
کچھ اس طرح ہوتا ہے:

"خیریت ہے۔ آج آپ جلدی آ گئے۔"
"ہاں بیگم! زکام اور اعصابی شکنی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"
"مگر صبح تو آپ کی طبیعت ٹھیک تھی۔"
"خاک ٹھیک تھی۔ صبح ہلکا ہلکا سر درد ہو رہا تھا۔ میں نے تم سے یہ سوچ کر نہیں کہا کہ تم خواہ مخواہ
پریشان ہو جاتی ہو پھر یہی خیال تھا کہ دفتر پہنچ کر چائے کے ساتھ ایک کروسین سے لوں گا تو ٹھیک ہو
جاؤں گا۔" "پھر آپ نے کروسین لی۔"
"ایک نہیں۔ دو۔ لیکن سہ پہر تک تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی۔"
"آپ نے ٹفن بھی نہیں کھایا ہو گا۔"
جھنک کر ـــــ "نہیں ٹفن تو کھانا ہی پڑا۔ تم اتنی محنت اور محبت سے تیار کرتی ہو۔ میں نے کہا کہ تم کا
کہا کرتی ہو کہ خالی پیٹ کوئی دوا نہیں کھانی چاہیے۔"

"پھر کیا! بس ٹفن کھانا غضب ہو گیا۔ بلکہ [illegible] [illegible] بیگم تم

فکر نہ کرو۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"پسینہ نکل رہا ہے، پنکھا بند کر دوں ۔۔۔؟"

"نہ نہ! پنکھا بند نہ کرنا۔ ایسی حالت میں پسینے کا جلد سوکھنا ہی بہتر ثابت ہوتا ہے۔"

"کافی بنا دوں ۔۔۔؟"

"ہاں! ٹھیک ہے۔ کافی بنا دو۔ شاید اعضا شکنی میں افاقہ ہو۔ کچھ بسکٹ یا ویفرز تو نہیں گے نا! اُف بہت درد ۔۔۔"

"آپ آرام کریں ۔۔۔ شام کو ڈاکٹر پٹھان کے ہاں چلیں گے۔ ایک انجکشن لے لیں تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میرے خیال میں ڈاکٹر کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں اور ڈاکٹر پٹھان تو پہلے انجکشن دیتے ہیں پھر طبیعت پوچھتے ہیں۔ تم کافی بنا دو۔ پینے کے بعد میری طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"دیکھیے! سردی زکام جیسی بیماری میں لاپرواہی کرنے سے مرض بڑھ جاتا ہے۔ آپ یوں بھی اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی بیماری آ گھیرتی ہے۔ شام کو ضرور ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلیں گے۔"

"تم ناحق پریشان ہوتی ہو۔ معمولی سا زکام ہے اور سچ پوچھو تو بیگم تم ۔۔۔ اور فکر سے میری صحت کا خیال رکھتی ہو تبھی میں بہت کم بیمار ہوتا ہوں ورنہ میرے ایسے دوست بھی ہیں جو محض اپنی بیویوں کی بے اعتنائی اور لاپرواہی جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو کر اپنی صحت برباد کر چکے ہیں ۔۔۔"

میں کچن میں کافی بنانے جاتی ہوں تو وہ عادتاً بڑے تواتر سے چھینکوں کے ذریعے زکام ہو جانے کی اطلاع مجھ تک پہنچانے سے نہیں چوکتے۔ کافی پینے کے دوران اُن کے چہرے پر، آنکھوں میں سرخی اور ناک سے پانی بہنے جیسے زکام کے معمولی آثار بھی نہ پا کر مجھے حیرت ہوتی اس کو چھپانے کے لیے مجھے کافی جتن کرنے پڑتے۔ پھر میں سوچنے لگتی کہ آخر ان حضرت کی تیمارداری کروں بھی تو کس طرح، جو یا تو اتنے بیمار ہیں کہ بستر سے اُٹھ نہیں سکتے اور جو اتنے بیمار بھی نہیں کہ ڈاکٹر کی دوا یا انجکشن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک دن پوچھنے لگے: "بیگم تم نے وہ میڈیکل رپورٹ دیکھی جو ایک ماہ قبل ڈاکٹر پٹھان نے دی تھی ۔۔۔؟"

مجھے دانستہ جھوٹ بولنا پڑا۔ اس لیے کہ وہ رپورٹ تمام امراض کی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہ تھی۔ اس رپورٹ میں ڈاکٹر پٹھان نے محض ان حضرت کا نفسیاتی علاج کرنے اور انھیں مطمئن کرنے کی غرض سے معمولی زکام سے لے کر دل، جگر، گردے، پھیپھڑے جیسے تمام اعضائے رئیسہ کے کمزور ہونے کسی وقت بھی متاثر ہو جانے کے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس رپورٹ کے ملنے کے دو روز بعد ہی جب انھوں نے حسب معمول درد [illegible] کی شکایت کی تو میں نے انھیں اطلاع دیے بغیر ڈاکٹر صاحب کو گھر بلا کر [illegible] صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے [illegible] سامنے کے لیے انجکشن [illegible] لیکن ان کو [illegible] کیا تھا۔

"آپ کا ایک گردہ کافی خراب ہو چکا ہے۔ اگر فوری آپریشن کے ذریعے نہ نکالا گیا تو دوسرا گردہ بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ فی الحال آپ یہ گولیاں کھالیں ان سے آرام ہو جائے گا۔ کل ہاسپٹل میں شریک ہو جائیے میں بھی رہوں گا۔ کل ہی آپریشن ہو جائے گا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ ایک گردے سے بھی آپ حسب معمول زندگی گزار سکتے ہیں۔"

لیکن اتوار کی صبح تک نہ صرف یہ کہ گردے کی تکلیف یکلخت جاتی رہی بلکہ آج تک انھیں پھر کبھی کسی گردے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس لیے میں نے احتیاطاً پوچھا۔

"آپ کو پہلے کی طرح گردے میں درد تو نہیں ہو رہا ـــــ ؟"

گھبرا کر بولے ـــــ "نہیں جی! بالکل نہیں۔ دراصل میں اس میڈیکل رپورٹ پر بالکل یقین نہیں کرتا ـــ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب نے کیسی تشخیص کی تھی۔ یعنی اچھے خاصے گردے کو نکال پھینک کر گویا مجھے بہ یک گردہ و دو پھیپھڑا یہ زندگی گزارنے پر مجبور کر رہے تھے اور اک تم ہو کہ ان کی تشخیص پر ایمان لائے بیٹھی ہو۔

گزشتہ ہفتے کی بات ہے۔ حسب سابق سہ پہر کو انھوں نے دفتر سے فون کیا۔ ڈائیلاگ سنیں۔

"بیگم! آج میری طبیعت پھر سے خراب ہونے لگی ہے ـــ"

"کچھ بتائیے بھی تو کیا ہو رہا ہے ـــ"

"صبح سے پیٹ میں رہ رہ کر ہلکا ہلکا، میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے ـــ"

"چکر بھی آ رہے ہیں ـــ ؟"

"ہاں! کبھی کبھی چکر سا آجاتا ہے۔"

"الٹی کرنے کو جی چاہتا ہے ـــ ؟"

"ہاں! الٹی کرنے کو جی تو چاہتا ہے لیکن الٹی نہیں آتی ـــ"

"آپ کا مطلب ہے۔ الٹی کرنے کو جی نہیں چاہتا پھر بھی اُلٹی آتی ہے"

"ہاں ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ـــ"

"منہ میں پانی آتا ہے ـــ ؟"

"ہاں! منہ میں پانی بھی آتا ہے ـــ"

"ہائے اللہ۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"اس میں خوشی کی کیا بات ؟ ـــ"

"اب تک آپ نے جو علامتیں بتائی ہیں۔ انھیں سن کر تو آپ کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے ـــ"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو ـــ ؟"

"ضرور! الٹی جیسا محسوس کرنا، چکر آنا، منہ میں پانی آنا، ان ساری علامتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ امید سے ہیں" ... یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ اس دن کے بعد سے انھوں نے پھر کبھی پیٹ میں درد کی شکایت نہیں کی۔

یہ سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے تو میں نے سوچا کہ ایک دن خود بیمار ہو کر دیکھوں تو سہی کہ ان تلوں میں کتنا تیل ہے ؟ تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ؟ ــــ سنیے

" دیکھیے ! رات سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سارا بدن ٹوٹ رہا ہے ۔ سر بھی بھاری ہے ۔ پلیز آج آپ دفتر نہ جائیں ــــ "

بولے ــــ " خدا کے لیے بیگم ایسا غضب نہ کرنا ۔ آج دفتر میں ایک اہم میٹنگ ہے ۔ تم یوں کرو کہ کروسین کھا کر آرام کرنا اور خدا کے لیے شام تک ٹھیک ہو جاؤ ــــ "

میں نے جواب دیا ــــ " جیسے آپ ہمیشہ صبح تک ٹھیک ہو جاتے ہیں ــــ "

کھسیانے ہو کر بولے ۔ " تم سمجھتی کیوں نہیں ۔ تم بیمار ہو جاتی ہو تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں ۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر پٹھان کو فون کر کے بلوالو ــــ میں دفتر جا کر تمھیں فون کروں گا ۔ اچھا ــــ بائی ــــ "

●●

غالب ثانی (حیدرآباد)

غزل

(علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ)

دعوت کا صلہ بھی کیا ملا ہے نصاب آخر — دیتے ہیں ہریس اوّل لاتے ہیں کباب آخر
ہیرے بھی کیا کرتے ہیں دیر سے ہم کرہی — لقمہ کی ہے ڈش اوّل بریانی کی قاب آخر
انداز قیادت پہ طوفانی کئی لیڈر — آتے ہیں شتاب اوّل جاتے ہیں شتاب آخر
اچھا پہ رہا ہے اب دو پل میں بری کمپیوٹر — چھپتی ہے کتاب اوّل ہوتی ہے خراب آخر
پلتے ہیں بس مرغن دنیا میں بھلے لیڈر — تمغہ ہے نہ شال اوّل البتہ خطاب آخر
اب نام عرق ہی سے بکتی ہیں شرابیں سب — ہے نشہ تو بند اوّل حاضر ہے شراب آخر
کھاتا ہے ستمگاروں سے زلزلے کا جھٹکا — ہوتے ہیں ستم اوّل آتا ہے عذاب آخر
طاغوت کا جلوہ بھی ٹی۔وی میں سدا دیکھا — طاؤس و رباب اوّل طاؤس و رباب آخر

غالب تری تحریر خوش خط کا کرشمہ ہے
گرویدہ ہوا تیرا وہ مست شباب آخر

غزل

سیّد علی شبنم کارواری

بھوک اک درد ہے دوا کیا ہے — پیٹ بھرتا نہیں ہوا کیا ہے؟
ذائقہ ہے نمک سے کھانے میں — یہ نہیں ہے تو پھر مزا کیا ہے؟
میں بھی سر میں دماغ رکھتا ہوں — کاش تم پوچھو کہ واقعہ کیا ہے؟
ایک چھوٹا ہے ایک موٹا ہے — بیل کیا چیز ہے گدھا کیا ہے؟
وقت بے وقت ڈٹ کے کھائیے — ہضم ہو جائے تو برا کیا ہے؟
ناک میں کیا گھسا کوئی مچھر! — یہ مسلسل تو چھینکتا کیا ہے؟
پیار سے کوئی دیکھتا بھی نہیں — پیار کا قحط پڑ گیا کیا ہے؟

آئینہ دیکھ اپنی صورت دیکھ
گھور کے ان کو دیکھتا کیا ہے

محمد خالد عابدی
(بھوپال)

بنام

بھگوڑی خانم

آج ایک فلم میں للیتا پوار کی عیاری و مکاری دیکھ کر تمہاری والدہ کی اور تمہاری یاد تازہ ہوگئی جنہیں کہ رہبری میں پابندی سے تمہاری سوت کے ہاں آرام کرتا ہوں، حسبِ معمول والد صاحب ہی کھانا پکاتے ہیں۔ والدۂ علیہ کا کلاسیکل رول کا ریاض برابر چل رہا ہے۔ امید ہے کہ تم مائکے میں رہ کر میری بچیوں کی صحیح پرورش کر رہی ہوگی جس طرح تمہاری پرورش ہوئی تھی۔ بات تو جب ہے کہ بچیاں اتنی اچھی تربیت حاصل کر لیں کہ تمہاری اور تمہاری والدہ کی لیاقت ان سے عیاں ہو اور خاندان تو کیا محلّہ، شہر اور ملک فخر کرے۔

وہ لڑکی جس کا نام "ش" سے شروع ہوتا ہے اور جس کی آمد سے تم جل بھن کر کباب ہو جایا کرتی تھیں (تم نے اس بیچاری پر جو سخت پابندیاں لگا دی تھیں اب وہ ایمرجنسی ختم ہو گئی ہے) میں تو ان کے یہاں نہیں جاتا لیکن ہاں البتہ وہ ضرور پابندی سے یہاں آتی ہیں اور میری والدہ کی علالت کا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔ میری والدہ کو اسی طرح کی بہو کی ضرورت تھی۔ وہ والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہاں بہو کی کمی پوری کر رہی ہیں اور مجھے بھی تمہاری کمی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم [illegible] سال تک اب واپس گھر نہیں آؤ گی [illegible] کہ جب تک میری [illegible] والدہ کی خوشخبری نہیں سن لو گی۔ تمہاری فرقت سے مجھے ایک [illegible] فائدہ ہوا ہے کہ [illegible] اور [illegible] گنے [illegible] ختم ہو گئی ہے۔ [illegible]

تم گھر جاتے وقت جس طرح گھر میں کچرا چھوڑ گئی تھیں اب اس میں اتنی برکت ہوگئی ہے کہ صدر دروازہ تک ایک خوب صورت کچرا گھر بن گیا ہے۔ اس پر شہر کے مشہور شاعر نے ایک مصرعہ نما ایک سطری اپنی آخری تحریر اس طرح منقش کردی ہے کہ "میں بھوکا ہوں سارے محلے کا کچرا مجھے کھلاؤ" در و دیوار پر مکڑی کے جالوں کو دیکھ کر تمھاری بہت یاد آئی۔

وہ جو تمھاری قدِ آدم تصویر ہے جس میں تم قہقہہ لگا رہی ہو۔ اس میں تمھارے خوب صورت بڑے بڑے دانت نظر آرہے ہیں۔ گھر کے کسی دہشت پسند بچے نے اس تصویر کے نیچے لکھ دیا "لیڈی ڈرا کلا" میں نے اس تحریر میں ذرا تحریف کردی ہے۔ لیڈی ڈراکلا کی جگہ "مس ڈرا کلا" کردیا ہے۔ امید ہے کہ تم اگر غلطی سے یہاں آؤگی تو دیکھ کر خوش ہوگی۔ ایک افسوس ناک خبر سن کر مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تمھاری تصویر کی نیلامی پر دو دکان داروں میں زبردست جھگڑا ہوگیا۔ ایک دانت کا ڈاکٹر تھا۔ دوسرا منجن بیچنے والا۔

وہ جو اگال دان مرادآبادی اپنی نامراد بیٹی کے لیے لایا تھا تم اپنے سامان کے ساتھ لے گئیں۔ میں مشقیہ کبھی کبھی اس میں تھوک دیا کرتا تھا۔ اب بتاؤ اس تنہائی میں، میں کس پہ تھوکوں گا اور آج کل تم بھی نہیں ہو۔ خیر اب کچھ ضروری ہدایات سن لو۔ بچیوں کے آرام کا بہت خیال رکھنا۔ میرے یہاں تو انھیں قید بامشقت تھی۔ بچیوں کو جلدی مت سونے دینا رات آٹھ نو بجے سو جانا شرفا کا کام نہیں ہے اور صبح فجر کے بعد چھ سات بجے اٹھنا بھی نحوست ہے۔ یقین ہے کہ بچیاں رات سونے سے قبل تم سے فرمائش کرتی ہوں گی کہ امی کہانی سناؤ اور تم اپنا مخصوص مستقل موضوع بھوت، پلید، خبیث اور پاگلوں کی کہانیاں انھیں ازبر کراتی ہوں گی۔ بچے اس سے اچھا تاثر قبول کرتے ہوں گے۔ ہاں یاد آیا ایک خیال رکھنا بچیوں نے میرے یہاں جو پابندی سے بریڈ اور مکھن کھایا تھا اور تم نے ایک بار غصے سے کہا تھا (جس دن مکھن ختم ہوگیا تھا) کہ ان فقیروں کے یہاں تو ایسا ہی رہے گا۔ یہ تمھارا تکیۂ کلام میں اکثر گنگناتا ہوں۔ کاش غالب خالو زندہ ہوتے تو وہ اس پر ضرور تضمین لکھتے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مسلسل مکھن کھانے سے بچیوں کا دماغ کمزور ہوگیا ہوگا۔ ان سے محنت، مشقت کا کام مت لینا۔

لڑکیوں کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہے۔ کوئی تم ہی نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ایک لڑکی پڑھے گی تو تمام خاندان تعلیم یافتہ ہوگا اور ہاں سرکار نے جو لڑکیوں کی فیس معاف کردی ہے تم کوئی اگلی کوچے میں تمام کسی پرائیویٹ اسکول میں داخل کرنا کہ بچیاں اپنی خالہ کے نقش قدم پر چلیں اور جعلی سرٹیفکیٹ بیچنے مل سکیں وہ سب لے لیں۔ ان اسکولوں کے پتے اور مقاصد سے تمھاری والدہ کو ازبر ہیں اور تمھارے بھائیوں سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اور کیا لکھوں؟ وہ کچرے صورت آئی تھی جو تمھاری ہم شکل و ہم مزاج ہے۔ وہ تمھارے یہاں جانے

بہت رکیک ہے۔ میں نے، والد صاحب نے اور پڑوس کی خواتین نے جب اس "ٹریجڈی" کا باعث جاننا چاہا تو اس نے کہا کہ صاب وہ جو یہاں کبھی رہتی تھیں وہ بیس کپڑے دے کر مجھ سے ایک اسٹیل نما برتن لیتی تھیں اب آپ سے اتنا سستا سودا نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کنجڑ صاحبہ وہ سب صفایا کر گئی ہیں۔ یہاں تک کہ جھاڑو کے ساتھ ساتھ ضعیف ولوٹا بھی لے گئی ہیں۔ کیوں کہ ہماری بیگم کا ہم سے پہلے ایک ایسی جگہ رشتہ ہو رہا تھا جہاں جہیز پر یا مہر پر بحث یا جھگڑا، تلوار بازی اور غنڈہ گردی نہیں ہوئی بلکہ اس بات پر سنجیدگی سے دادی یعنی ہماری دادی ساس سے بدمزگی ہوئی تھی کہ آپکے یہاں کا بیت الخلا کا لوٹا دکھاؤ۔ وہ لوگ بے چارے اتنے غریب تھے کہ ان کا اپنا ذاتی لوٹا نہیں تھا۔ غرض یہ کہ وہاں اس ذرا سی بات سے رشتہ ختم ہوگیا اور ہم سے جڑ گیا اور اب وہ جو لوٹا لے گئی ہیں ان سابقہ لوگوں کو ضرور دکھائیں گی کہ دیکھیے آپ کے یہاں رشتہ نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ ہم جہاں بیاہ کر گئے ہیں وہ لوگ ماشاءاللہ متمول اور صاحب جائداد لوگ ہیں کہ ان کا اپنا ذاتی لوٹا ہے۔" ہاں تو وہ کنجڑ صاحبہ کہنے لگیں کہ "اب بائی صاحبہ نہیں ہیں تو کیا ہوا' میں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی۔" میں نے کہا آپ سے ابھی ابھی ہم نے اپنے والد کے اشتراک سے گوش گزار کیا تھا کہ وہ ڈائن گھر کا سارا مال و متاع لے کر اپنے گھر یعنی اپنی والدہ کی آغوش میں چلی گئی ہیں۔ بس اب یہاں کوئی کپڑا اور پڑا نہیں ہے۔ ان کنجڑ محترمہ نے کہا — "بابو جی جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ یہ جو آپ چڈی بنیان پہنے ہو یہی دے دو نا۔ ہم غریب کا بھلا ہو جائے گا اس کے عوض برتن تو خیر نہیں ہاں دو بلیڈ دے دیں گے۔"

وہ تمھاری لگائی ہوئی بڑی بی آئی تھیں جو آپا کا لحاف اوپر چاندنی پر سکھانے ڈالنے لے گئی تھیں آج ایک زمانے کے بعد وہ واپس آئی ہیں۔ شاید لحاف کو انھوں نے اپنی جاگیر میں لکھوالیا۔

یوں تو لکھنے کو بہت کچھ ہے اب بقیہ خط کے اگلے ایڈیشن میں پڑھنا۔ تم سے کبھی پارک میں، کسی فلم کے بہانے ٹاکیز میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر خوابوں میں بھی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اب تم نے ملنے کی نئی جگہ نکالی ہے۔ وکیلوں کے چیمبر، عدالت کے گوشے، تھانوں کی بنچیں، قضیات کی چلمنیں —— خیر کہیں ملو، لیکن ملتی رہو۔

٥٥

[illegible] کریم [illegible]

غزل

پھر ہمیں اُلّو بناتے جائیے
وعدہ کر کے بھی گھماتے جائیے

زخم پر اک زخم کھاتے جائیے
شرط یہ ہے مسکراتے جائیے

آج کی اوندھی سیاست پر نیا
گیت کوئی گنگناتے جائیے

ذہن پر اک بوجھ ہے حالات کا
دو گھڑی ہنستے ہنساتے جائیے

ہے جنازہ ملک کے قانون کا
آپ بھی کاندھا لگاتے جائیے

خون کی ہے بو فضا میں چار سو
راہ میں بچتے بچاتے جائیے

قتل کے اک تازہ کارِ خیر میں
ہاتھ اپنا بھی بٹاتے جائیے

یہ بھی اک احسان ہوگا آپ کا
زخم آخر اک لگاتے جائیے

لوٹتے ہیں کس طرح مظلوم کو
ہم کو تھوڑا سا بتاتے جائیے

آج کل قاتل یہاں بیکار ہیں
کام پر ان کو لگاتے جائیے

شغل یہ فاقہ کشی کی جان ہے
کوئی گانا گنگناتے جائیے

پیٹ میں دانہ نہ ہو تو کیا ہوا
پان زردے کا چباتے جائیے

سام انکل سے یہ کہنا ہے ہمیں
گھر کے جھگڑوں کو چکاتے جائیے

ہندو مسلم ہو کہ سکھ عیسائی ہو
ان کو آپس میں لڑاتے جائیے

سامنے سے وار؟ یہ ہمت کہاں
پیٹھ میں خنجر لگاتے جائیے

کیا تواضع ہم کریں گے آپ کی
آنگنوں کا گھاس کھاتے جائیے

وار پیچھے سے کریں تو کس طرح
ہم کو بھی کچھ گُر سکھاتے جائیے

ایک ہی تو بچ گیا ہے شہر میں
آپ میرا گھر جلاتے جائیے

گولیوں کے کھیلنے کے دن نہیں
گولیاں سینوں پہ کھاتے جائیے

اُٹھ کے کوئی حق نہ مانگے آپ سے
تھپکیاں دے کر سُلاتے جائیے

دے کے کچھ خیرات اپنے فنڈ سے
دل دُکھوں کا دل دُکھاتے جائیے

ان سے یہ کہنا یہاں بے سود ہے
گھر جو ٹوٹا ہے بناتے جائیے

چھیڑ کر ہنٹر یوں ہی اس قوم کو
خواب غفلت سے جگاتے جائیے

منظور الامین
(حیدرآباد)

عزم اور ازم

یہ زمانہ عزم کا زمانہ ہے، جی ہاں! چاہے قوم ہو یا فرد، آج کے دور میں وہی آگے بڑھ سکتا ہے جو صاحبِ عزم ہو، اس موقع پر ہمیں ابراہیم لنکن کا ایک فقرہ یاد آیا جس نے کہا تھا۔

"گو میں آہستہ چلتا ہوں لیکن آگے کی سمت ہی بڑھتا جاتا ہوں پیچھے کی طرف نہیں چلتا"

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم صاحبِ عزم ضرور ہیں۔ لیکن ذہنی طور پر اپنے آپ کو کسی خاص ازم (Ism) سے مستقلاً منسلک نہیں کرتے ہیں، اس وقت ہمیں بے شمار ازم یاد آ رہے ہیں جیسے فاشزم، نازی ازم، کمیونزم، سوشلزم، نہلزم، امپریشنزم، کیوبزم، ایگزسٹنشیلزم، ہپیرزم، ہپناٹزم، مس ٹیسزم وغیرہ۔

جتنے سارے ازم کا ہم نے ذکر کیا ان میں ہمیں کسی حد تک مس ٹیسزم (Mysticism) پسند ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تصوّر کو دخل ہے ساتھ ہی غور و فکر کو بھی، تصوف یا طریقِ معرفت جس میں بندہ اپنے معبودِ حقیقی سے راست تعلق پیدا کرتا ہے، اس کا مطلب آپ یہ نہ نکالیں کہ ہم کوئی اس طرح کے صوفی ہو گئے ہیں جو صوفیانہ لباس پہن کر لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں ویسے صوفی سے تخاطب کرتے ہوئے کسی شاعر نے جو یہ شوخ شعر لکھا ہے وہ ہمیں پسند ہے۔

ہمیں صوفی صاف بتائیے نہ چھپائیے نہ چھپائیے
کہیں ہولی تم نے بھی کھیلی ہے جو رنگے ہیں کپڑے گلال میں

ہمارے ملک میں لوگ ہپناٹزم، مسمریزم وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہیں، علم باطن میں دلچسپی ہمارے اہلِ وطن برسوں سے لیتے آئے ہیں لیکن اس کے practitioners صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں اور ملک میں بھی پائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر نیلیا (Nelya) نام کی ایک روسی خاتون نے علم باطن میں وہ کمال پیدا کیا ہے کہ اگر وہ گھڑی کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ لے تو گھڑی تیزی سے چلنے لگتی ہے اور وہ جب چاہے تو گھڑی کی رفتار آہستہ ہو جاتی ہے اتنا ہی نہیں نیلیا جب بھی چاہے پنڈولم رک جاتا ہے اور گھڑی بند ہو جاتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ٹیلی پیتھی کی اس شکل پر آگے بات کی جائے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ جناب غریب بے جان گھڑی ہی کا کیا چارا تو خیر ہے عورت میں وہ قوت ہوتی ہے کہ اس کے ایک نظر دیکھنے سے ہی مرد کے دل کی کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے، وہ بڑے بڑے فقرا مرتدوں کی تپسیا بھنگ کر سکتی ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر ہی سہی بند گھڑی کے ذکر پر ہمیں یاد آیا ۔ دفتروں میں عام طور پر کام کم ہوتا ہے باتیں زیادہ کہا کیا جائے دفتری کلچر ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ کلرکوں کو اس سے منع کیا جائے تو وہ پوچھنے لگ پڑتے ہیں کہ اگر ہم باتیں نہ کریں تو [illegible] ہو گئے، بہرحال ایک دفتر میں برسوں سے ایک صاحب جن کا نام اسلم تھا، ملازم تھے اور وہ ایک ناکارہ ضعیف دار تھے، اتنے عرصے سے کہ لوگ انھیں ancient سمجھنے لگے تھے ان کے ریٹائرمنٹ کے موقع پر باس نے نوٹس نکال دی کہ اگلے دن صبح گیارہ بجے مسٹر اسلم کو الوداعی چائے دی جائے گی سب لوگ شریک ہوں، چائے کے بعد باس نے کسی جادوگر کی طرح پہلے تو جیب سے ایک بڑا لفافہ نکالا، اسے کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا، پھر پیکٹ کو کھول کر اس میں سے ایک خوبصورت سی ڈبیا نکالی اس ڈبیا کو کھول کر اس میں سے ایک گھڑی نکالی اور اسلم کو دیتے ہوئے بولے :-

"مسٹر اسلم، آپ کے وظیفہ یاب ہونے پر نایاب گھڑی ہم آپ کو تحفے میں دے رہے ہیں، واضح ہو کہ یہ گھڑی کام نہیں کرتی، سدا بند رہتی ہے، آپ نے بھی تو ساری عمر دفتر میں کام نہیں کیا تھا"

ٹیلی پیتھی کی پُراسرار، مخفی ذہنی صلاحیت کا انکشاف انسانی تاریخ میں پہلی بار نہیں ہوا ہے اس سے پہلے بھی اس طرح کے تجربے ہوتے رہے ہیں، مسمریزم اور ہپناٹزم کا عامل اپنے ذہن کی بے پناہ قوتوں کا استعمال کر کے معمول میں نیند کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ۔ یہ تو جانداروں کی بات ہے ۔ گھڑی اور پینڈولم تو بے جان چیزیں ہیں۔

لفظ پینڈولم پر خیال آیا کہ ایک زمانے میں گھرانوں میں پینڈولم والی گھڑیاں عام تھیں ۔ اکثر گھروں میں grand father clocks اور متحرک پنڈولم نظر آتے تھے، یہ وہ دور تھا جب گھروں میں نانا اور دادا بھی متحرک پینڈولم تھے جب لوگ اپنے بزرگوں سے بہت محبت کیا کرتے تھے اور ان کی عزت کیا کرتے تھے، نانا اور دادا کو ان کے نواسے، پوتے عزت اور تکریم سے رکھا کرتے تھے۔

حیف کہ زمانہ بدل گیا ہے آج کے نوجوان ان پنڈولموں کو گھروں سے باہر اٹھا کر پھینک دینے لگے ہیں کیونکہ نئی تہذیب کے انڈے گندے ہو گئے ہیں ان بزرگوں کی جگہ اب grand father cloks کو ترجیح دینے لگے ہیں اور یار دوستوں کو فخر سے دکھاتے ہیں کہ وہ گھڑی جو اس دیوار سے لگی ہے ۔ پشت ہا پشت سے چلی آ رہی ہے اور خاندان کے نوادرات (Family heirhooms) میں سے ہے۔

ٹیلی پیتھی کی صلاحیت کا تعلق اسی ازم سے ہے جسے Mysticism کہا جاتا ہے یہ انسانی ذہن کی اس کوشش کا نام ہے، جو چیزوں کے انتہائی جوہر کا احاطہ کرتی ہوئی ذاتِ مطلق تک پہنچ جاتی ہے، اہل باطن کے ذہن پر اسی بات کا تصور پوری طرح حاوی ہوتا ہے جو کائنات اور کائنات کی ہر شے میں سرایت کئے ہوئے رہتا ہے۔

انسانی ذہن کی صلاحیتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا ایک اندازے کے مطابق انسانی ذہن لاکھوں واقعات

محسوس کرسکتا ہے ۔ جس طرح ایٹم یا جوہر جیسی ننھی سی شئے کے اندر ایک قیامت بپا رہتی ہے اُسی طرح انسانی ذہن بھی بڑے بڑے ہنگاموں کی آماجگاہ ہوسکتا ہے ۔

آج کے جدید کمپیوٹر اور سپر کمپیوٹر انسانی ذہن کی صلاحیتوں کے معراج کہے جاسکتے ہیں جہاں تک تصوف کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہماری نظریں دیکھتی ہیں وہ ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جو وہ دیکھتی ہیں اس کے علاوہ ایک وسیع اور بسیط جہاں اور بھی ہے تو کیا عجب کہ وہ بزرگ معمر خاتون جو سڑک پر چل رہی تھیں بات کو کچھ اور سمجھ بیٹھیں ہوا یہ کہ ایک نوجوان سڑک کو پار کررہا تھا، اُس کے ہاتھ میں ایک بڑی grand father clook تھی جو خراب ہوگئی تھی اور جسے وہ اُٹھائے گھڑی ساز کے پاس ٹھیک کروانے جارہا تھا، اسی وقت وہ بزرگ خاتون بھی سڑک پار کرنے کے ارادہ سے پہنچیں یکایک ان کی ٹکر اس نوجوان اور اس کلاک سے ہوگئی اور وہ گر پڑیں اُنھوں نے غصے میں نوجوان سے کہا ۔

"اے برخوردار، وقت دیکھنے کا ایسا ہی شوق ہے تو کلائی کی گھڑی باندھ کر کیوں نہیں نکلتے"

●●

غزلیں

ظفر کمال
([illegible])

ہر ایک دل میں یہی بس خیال دیکھتے ہیں
کہ ایک دوجے کی پگڑی اُچھال دیکھتے ہیں

وہ بے حِس ہے کہ کھو کر شناخت بھی اپنی
نہ کوئی غم ہے، نہ کوئی ملال دیکھتے ہیں

پکڑ کے اُنگلیاں چلنا جنھیں سکھایا تھا
وہی ہیں آج جو میری مجال دیکھتے ہیں

محبتوں کی امانت تھی جن کے سینوں میں
اُنھیں کے بیچ جدال و قتال دیکھتے ہیں

نشہ سوار ہے ڈالر کا علم سے غافل
ترے عروج میں تیرا زوال دیکھتے ہیں

نئی نویلی دلہن مثلِ بیوہ ہند میں ہے
میاں سعودی عرب میں ریال دیکھتے ہیں

ادب کے نام پہ خیرات بٹنے والی ہے
ٹپک رہی ہے ہر اک منہ سے رال دیکھتے ہیں

متحرک رہتے ہیں وہ بوڑھے ہوں یا کہ ہوں بچے
ہر گھر میں ٹی وی کا ادنیٰ کمال دیکھتے ہیں

جو قدریں جان سے زیادہ عزیز ہوتی تھیں
قدم قدم پہ اُنھیں پائمال دیکھتے ہیں

اُبھار رہے ہیں جو اُنگلی ہمارے ماضی پر
کوئی بتائے وہ کب اپنا حال دیکھتے ہیں

میاں ظفر بھی عجب شئے ہیں اس زمانے میں
معاملے میں حرام و حلال دیکھتے ہیں

تنویر سیدآبادی

آپ کیا ڈاکٹر ہو گئے
اور بھی ڈینجر ہو گئے

میری بیوی تھی پیشنٹ تری
پھر سے ہم بیچلر ہو گئے

جن کے ہاتھوں میں دم ہی نہ تھا
نامور باکسر ہو گئے

جو دکان میں تھے نوکر مرے
آج وہ پارٹنر ہو گئے

ہم سے پہلے تنویر آپ تو
آسماں ٹرانسفر ہو گئے

سلیم مقصود

(جدہ)

ہمارا مشیر

جب ہمارے پاس منشیات اور اسمگلنگ کے کاروبار سے اچھی خاصی دولت جمع ہو گئی تو ہمارے ایک کرم فرما
[illegible] مشورہ دیا کہ ہم کسی سیاسی جماعت کے ممبر بن جائیں۔ چناں چہ ہم نے ایک بہت ہی نعرہ باز سیاسی جماعت
[illegible] رکنیت اختیار کرلی۔ اس جماعت کی رکنیت حاصل ہونے کے بعد ہمیں ایسا لگا جیسے ہم کسی بہت بڑی سپر
[illegible] لٹ میں سیلز مین مقرر ہو گئے ہوں۔ یہ سیاسی جماعت ایک ایسا ماڈرن کیسینو (Modern Casino)
[illegible] جہاں جو جتنا بڑا داؤں چلتا اتنا ہی روپیہ بناتا۔ بہت جلد ہم پارٹی کے ایک اہم ممبر تسلیم کیے جانے لگے۔ ایک دن
[illegible] ہمارے بے لوث مشیر نے بلا معاوضہ ایک اور قیمتی مشورہ دیا کہ ہم فوراً بیمار پڑ جائیں۔ ہم نے بے حد اچنبھے
[illegible] ورتے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کیوں بھائی! آپ کو کیا تکلیف ہے ہمارے صحت مند رہنے سے؟"
[illegible] حاتم صفت شخص نے سر جھکا کر جواب دیا: "میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ اس لیے یہ صلاح دے بیٹھا۔ جو سیاسی
[illegible] بیمار نہیں پڑتا اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کے بدخواہ سیاسی وارث کتنے ہیں اور اس کے خیر خواہوں کی کیا تعداد ہے"

ہم نے بھولپن کی طرح کہا۔ "پھر؟"

انہوں نے کان میں سرگوشی کی بلکہ اسی بہانے اچھی خاصی کانا پھوسی کرکے کہا۔ "کل [illegible]
[illegible]۔ کل کے اخبارات میں آپ کی بیماری کی خبر چھپنی چاہیے۔ پھر اس کے چند دنوں بعد کسی ملک کا [illegible]
[illegible] ہم نے [illegible] بیماری کا اعلان [illegible]
[illegible] عیادت [illegible] کہ ان میں سے اگرچہ چند حضرات [illegible] آپ [illegible] قدم

(...) ہونے کے سبب ہماری شادی کیس نہ کرتا۔ اور ہم اس طرح ننڈورے نہ رہ جاتے۔
چند دن بعد ہمارے ایک نیک سیرت صلاح کار نے (جناب ہمارا ہمہ وقت مشیرِ خاص بن چکا تھا) رائے دی کہ ہم کسی ترقی یافتہ ملک کے سفر کے لیے رختِ سفر باندھیں۔ ہم نے سمجھا شاید امام ضامن باندھنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس لیے فوراً جیب سے ایک کراری نوٹ نکالی۔ اس نے ہماری آبائی جہالت کا نوٹس نہ لیتے ہوئے کہا "یاد رکھو! سارے سیاسی بیمار ولایت جا کر ہی صحت یاب ہوتے ہیں۔" غرض ہم نے اعلان کروایا کہ ہمارے بائیں کان میں شدت کا درد ہے۔ دیسی ڈاکٹر دیسی گھی کی طرح بے کار اور بے مصرف ہیں۔ اس لیے ایک نہایت ہی ترقی یافتہ ملک جا کر اپنا علاج کروائیں گے۔ حزبِ مخالف کے ایک لیڈر نے لعن طعن کی تو ہم نے اس کا راز فاش کر دینے کی فون پر دھمکی دی کہ جس ملک میں اس کے بچے "زیرِ تعلیم" ہیں۔ اس ملک کے بینکوں میں اس کا کالا دھن اکٹھا ہے۔ یہ دھمکی اس قدر کارگر ثابت ہوئی کہ اسی رات وہ لیڈر مزاج پرسی کے لیے ہماری کوٹھی پر حاضر ہو گیا۔ اور لگا ہم سے معافی مانگنے۔ یہ ہماری پہلی سیاسی دھمکی تھی۔ اس دھمکی کے بعد پتہ چلا کہ سیاست میں دھمکی، دھن دولت سے بھی اہم ہے۔ اپنے ملک سے روانگی سے قبل ہم اپنے ہمدرد کو بھی ساتھ رکھنا نہ بھولے یہ ہمارا اپنے ملک سے باہر پہلا سفر تھا۔ جوں ہی ہم نے اس اجنبی ملک کی سرزمین پر قدم رکھا روشنی اس قدر تھی کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہمارے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہمیں ریسیو کرنے کے لیے کئی اجنبی چہرے وہاں موجود تھے۔ .... جن میں بعض چہرے بڑے حسین تھے۔ ہم نے مرعوب ہو کر اپنے ہمدرد سے پوچھا "کیا یہ سب آپ کے رشتے دار ہیں۔ اور آپ کے استقبال کے لیے آئے ہیں؟" اس نے پُراسرار مسکراہٹ کے درمیان جواب دیا۔ "یہ لوگ آپ سے بے حد متاثر ہیں۔ اور آپ کا خیر مقدم کرنے تشریف لائے ہیں۔ آپ کی شہرت اور مقبولیت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔" ہمیں بہت افسوس ہوا کہ ہماری جاہل قوم نے ہمیں اس طرح رخصت نہیں کیا بلکہ ہمارے کچھ سیاسی رقیبوں نے تو ہمیں اس سفر سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ ہماری سمجھ میں اب آیا کہ ہمارے ملک کے طلبا ولایت سے فارغ التحصیل ہو کر ڈگری کے ساتھ ساتھ اس سفر کی یادگار کے طور پر اپنے ہمراہ ایک میم صاحبہ کو کیوں لاتے ہیں اور بعض طلبا تو میم صاحبہ کی دل شکنی کے خیال سے وہیں رہ جاتے ہیں۔ کاش! ہم بھی اس مردم شناس اور محبتوں سے بھری سرزمین پر ہمیشہ کے لیے رک سکتے!

ایک دن ہمارا مشیرِ خاص کہنے لگا کہ یہیں ایک کالج چلتا ہے۔ ہم گھبرا گئے کہ کہیں کم بخت ہمیں یہاں کے کسی کالج میں داخلہ دلوا دے۔ ہم اپنی خاندانی جہالت سے دست بردار ہونے تیار نہیں تھے۔ ہمیں بعد میں اس نے بتلایا کہ ہمیں وہاں اپنے ملک کے سیاسی مستقبل پر لیکچر دینا ہے۔ بڑا مشکل مرحلہ تھا اور بہت مشکلوں سے حل ہوا۔ رستہ ایک دن ایک [illegible] میں جانے کا بھی جانا پڑا [illegible] ہمارے ملک کے [illegible] زندگی [illegible] ہے۔ ہم نے [illegible] کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کی تو ہمارے مشیر نے کہا۔

ہم بولے: "ٹھیک ہے اپنے وطن پہنچ کر یہی جو کام کرسکتے ہیں۔"

حیرت سے کہنے لگا: "پاگل ہو گئے ہیں آپ! ایشیا کے [illegible] بننے ہیں۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہاں؟"

اس کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے [illegible] وضاحت کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ہمارے ہاتھوں میں ملک کا مستقبل سونپا جانے والا ہے۔ ہمارے ہاتھ قوم کے مستقبل کی گرانباری سے کانپنے لگے۔ ہم نے کسرِ نفسی سے جواب دیا: "بھائی کوئی ہمیں کسی دفتر کا چپراسی بنانے تیار نہیں اور آپ ہمیں قوم کا سردار بنانا چاہتے ہیں۔"

اس نے یقین کے ساتھ کہا: "یہ بات طے ہو چکی ہے۔"

ہم نے کہا: "آپ کیوں ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟"

وہ آدمی غصے سے بولا: "ہم قوموں کا مذاق اڑاتے ہیں افراد کا نہیں۔"

★

واحد انصاری
برہانپوری

پیروڈی

یہ کہ کر شکل طبیبوں کی جب آتی ہے ہنسی — "وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"
جیب خالی ہو تو پھر شہد لگے زہر ہمیں — "ہم میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے"
خوش ہو اے دل کہ ملے گی تجھے دولت غم کی — "اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"
کوئی احمق ہی نہ مانے گا، اگر میں یہ کہوں — "ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے"
کہہ دو افیون کے ہر اسمگلر سے واحد — "کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے"
صحبتِ حور ملے یا نہ ملے ہم کو، مگر — "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

مناجات

یارب میری بگڑی ہوئی تقدیر بنا دے — دس بیس مریدوں کا مجھے پیر بنا دے
جتنا بھی مرید اپنی مشقت سے کمائیں — اس میں سے تو آدھا میری جاگیر بنا دے
ایسا نہ ہو پھندے سے نکل کر کوئی بھاگے — حلقے کو میرے حلقۂ زنجیر بنا دے
دنیا میری اعجاز نمائی کی ہو قائل — دلیے کو اگر میری نظر کھیر بنا دے
تسلیم! کہ میں ننگِ جہاں ہوں میرے معبود — لیکن تو مجھے صاحبِ توقیر بنا دے
ذرہ ہوں مگر دے تو مجھے وسعتِ صحرا — تنکا ہوں مگر تو مجھے شہتیر بنا دے
سب کچھ ہے میرے قبضۂ قدرت میں الٰہی — تو چاہے تو گوڑر کو بھی انجینیر بنا دے
تو چاہے بہشتی کو ملے تختِ ہمایوں — تو چاہے تو دھوبی کو جہانگیر بنا دے
مجھ واحدِ بے نور کی سن لے میرے مولا — ہستی کو میری مرکزِ تنویر بنا دے

تضمین۔ واحد + غالب

دھمکی سے دکھائے وہ ٹھینگا
لاکھ کوشش کے گھر نہیں آتی
کیسے اس کو مناؤں یارب
"کوئی صورت نظر نہیں آتی"

ہنس رہا ہے تو میری حالت پر
یہ گھڑی کس کے سر نہیں آتی
تجھ سے پوچھوں گا بعد شادی کے
"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"

شام غم کا نہ جس پہ سایہ ہو
ایسی اپنی سحر نہیں آتی
ہو جو امید سے اگر بیوی
"کوئی امید بر نہیں آتی"

بولی بیوی نے اپنے شوہر سے
اپنی غلطی نظر نہیں آتی
کھا رہے ہو کمائی عورت کی
"شرم تم کو مگر نہیں آتی"

دے نہ طعنے جو اپنے میکے سے
ہاتھ خالی اگر نہیں آتی
شرم آتی تھی پہلے مجھ کو بہت
"اب کسی بات پر نہیں آتی"

ڈاکٹر جاوید وشسشٹ

بلا بوغما

[ڈاکٹر جاوید وشسشٹ کا یہ مضمون ہمیں دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ملا تھا۔ ادھر چند دن قبل شمالی ہند کے اخباروں میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہوئی جسے پڑھ کر بے حد ملال ہوا۔ ڈاکٹر جاوید وشسشٹ بنیادی طور پر محقق و نقاد تھے لیکن کبھی کبھار شگوفہ کے لیے مزاحیہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ اردو کے وہ استاد تھے، ہریانہ اکیڈمی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے خطوط کے ہر ہر لفظ سے مہر و محبت اور انکسار ٹپکتی تھی۔ افسوس ہے کہ اردو کا یہ خدمت گزار آج ہم میں نہیں ہے۔ شگوفہ کو موصولہ ان کا یہ آخری مضمون نذر قارئین ہے۔۔۔]

بلا بوغما کی شکل و صورت اور ہیئت کذائی کو دیکھ کر آپ اس مغالطے میں نہ رہیے گا کہ یہ عربی یا فارسی لفظ ہے۔ یہ خالص اردو ہے اور خواتین اردو کی اختراع ہے۔ البتہ بلا بوغما کا ملغوبہ عربی و فارسی الفاظ سے ہی تیار کیا گیا ہے۔ 'بلا' عربی ہے، جو صفت کے طور پر لفظ کی سیرت میں شدت پیدا کرنے کے لیے فارسی لفظ بوغما سے قبل جوڑا گیا ہے۔ بوغما گھوڑوں کی ایک بیماری ہے جس میں تمام اعضا سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔ بوغما خود بلا کی بیماری ہے۔ اسی لیے تو تمام منفی صفات اور خیالات اس کے دامن سے بندھ کر رہ گئے ہیں۔

خواتین اسلام کی داد دیجیے کہ ان کا ذہن کتنا زرخیز ہے۔ انھوں نے اپنی اختراعی صلاحیتوں کا مظاہرہ بلا بوغما کی تخلیق میں خوب کیا ہے اسی لیے بلا شرکت غیرے اس پر صرف ان کا قبضہ ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ بھدی اور بد شکل عورت بلا بوغما ہے۔ ہر الم غلم، ہر الا بلا اصطلاحاً بھی بلا بوغما کے ذیل میں آتی ہے۔ [illegible] بھی اسی خانے میں آتی ہے۔ [illegible] کہ ان کا نشانہ بننے سے نہیں بچ سکتے۔ خاص طور پر اپنی چربیلی [illegible] سانس [illegible] [illegible]

مشاہدہ ہے تو اس کا سب کچھ ہی ہے "یہ بلابوغا کیا بک رہا ہے!" اس کے پڑھنے میں ساس بہو کا مہا بھارت آراستہ ہوتا ہے۔

بلابوغا خالص عربی و فارسی ترکیب سے خالص اردو لفظ coin کیا گیا ہے اور اس کو اردو معانی و مفاہیم عطا کیے گئے ہیں۔ اب اس کا دعا یا سراغ ہو چکا ہے یا اسے اردویایا جا چکا ہے۔ عربی و فارسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ صورت میں یہ عربی و فارسی ضرور ہے مگر سیرت میں ایک دم اردو ہے۔ جملہ خطابات جو خواص اردو نے بلابوغا کو بخشے ہیں الف سے ی تک منفی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں صنفِ نازک نے بلابوغا کو کثیف ترین خلعتیں زیبِ تن کرادی ہیں۔

بلابوغا وہ صفت ہے، جس میں کوئی صفت نہیں بلکہ جو نا صفت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر بیہودگی، نکما پن، ناکارہ پن ایک بلا کی طرح بلابوغا کے سر پر سوار ہے۔ ہر بلابوغا بدشکل، بدہیئت، خراب، بھونڈا یا بھونڈی ہے۔ گویا بلابوغا کے ساتھ منفی صفات کا جم غفیر ہے۔ وہ تذکیر و تانیث دونوں کے ساتھ ایسے چپک جاتا ہے کہ اشیا زمن ولو کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔

بلابوغا کی تذکیر و تانیث دونوں سے بے نیازی کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مخنث ہے، وہ بے جان بھی نہیں، بہت جان دار ہے۔ البتہ روشنی کے بجائے تاریکی کا ضامن ہے۔ بلابوغا منفی صفات کے بلیک بورڈ کی طرح ہے، جس پر مثبت صفات کے چاک کی لکیر واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ بلابوغا نا من کی طرح ہے جو رام کو رامائن کا ہیرو بناتا ہے۔ بلابوغا شر کے مانند ہے، جو خیر کو اجاگر کرتا ہے۔ بلابوغا ہر حسین و جمیل، رنگین و شیریں، لطیف و نرم و نازک منظر کے لیے پس منظر کا کام کرتا ہے۔ گویا بلابوغا کے تناظر میں ہی مطلع نظر ابھرتا ہے۔ بلابوغا پرند کا ایک پر و بازو ہے جو پرواز کے لیے لازم و ناگزیر ہے۔

انسانی سماج کا ہر بیہودہ شخص، ہر نکما آدمی اور ہر ناکارہ فرد بلابوغا ہے۔ بلابوغا فیملی پلاننگ کا قائل نہیں بلکہ اس کے برعکس "ہم دو ہمارے دو" کے بجائے "ہم ایک ہمارے انیک" کا قائل ہے لیکن یہ ایک کا انیک ہونا یقیناً انسان کو چونکاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب وہ ایک ہے تو وہ انیک بھی ہو سکتا ہے۔ اسے کون روک سکتا ہے انیک ہونے سے؟ لیکن ہندو درشنی فلسفیوں نے اس کو ایک انوکھے انداز سے "ایک" تو کہہ کر "دو دو نہیں ہے" کہا ہے۔ بڑا گہرا اور شاعرانہ بات ہے۔ ظاہر ہے جو دو نہیں ہے، اسے ایک تو ہونا ہی پڑے گا لیکن ایک اگر اسے کہا تو اسے انیک ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ہم بلابوغا سے بہت دور نکل آئے ع

بات پہنچی تری جوانی تک

بلابوغا کثیف، اکثیف بلکہ کثیف ترین ہے مگر یہی کثافت، لطافت کو پیدا کرتی ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

بلابوغا کی کثافت کے کوکھ ہی لطافت کا نزول ہوتا ہے۔ ہمیں اس کے بالا ہے

جو لطافت کے کنول سے کھلتے ہیں اس ایوان حسین و نفیس کو بنیاد دیتا ہے جس کے بغیر ایوان لطافت کی تعمیر اور اس کا وجود ناممکن تھا۔

اس بلا بوغا کو برا ہونے کے یا وجود بُرا نہ سمجھیے۔ کیوں کہ اس کی برائی سے ہی اچھائی جنم لیتی ہے۔ غالباً اسی کو مشیت ایزدی کہتے ہیں۔

بلا بوغا کے اس منفی کردار اور تضاد سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ تضاد کے بغیر تخلیق ممکن ہی نہیں۔ اچھا ہونے کے لیے اس کے بیک گراونڈ کے لیے بُرا ہونا ناگزیر ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ سماج اور معاشرے کے ہر طبقے میں بلا بوغا اپنے مخصوص رنگ میں پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً ارباب سیاست میں یہ بلا بوغا اسی سیاسی نیتا کی طرح ہے جو غنڈوں، بدمعاشوں بلکہ ڈاکوؤں کی سرپرستی کرتا ہے۔ آتنک واد بھی اسی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ہر مافیا اس بلا بوغا سے وابستہ ہوتا ہے۔

فرقہ پرستوں میں بلا بوغا وہ کٹر پنتھی ہوتا ہے جو بلا ضرورت مذہبی جذبات کا اشتعال دلا کر ایک مذہبی آتنک پھیلاتا ہے۔ مذہبی بلا بوغا، سیاسی بلا بوغا سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

بلا بوغا فطرتاً "تامسی" ہوتا ہے جو کاہلی، بسیار خوری اور غوب سونے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس لیے بے ضرر ہوتا ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا کیوں کہ وہ اتنی زحمت اٹھا ہی نہیں سکتا کہ کسی کو پریشان کرنے کی پریشانی بھی گوارا کرے۔ معاشرے کی اکثریت اسی آرام طلب بلا بوغا کو پسند کرتی ہے۔ جو آرام اور آسائش کے علاوہ کسی انقلاب کو لبیک نہیں کہتا۔

ایک بلا بوغا "راجسی" فطرت کا ہوتا ہے۔ وہ نہ چین سے بیٹھتا اور نہ چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، اسٹالن وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرلطف بات یہ ہے کہ ہٹلر نہ سگریٹ پیتا تھا، نہ شراب پیتا تھا۔ وہ گوشت بھی نہیں کھاتا تھا۔ یعنی "ساتوک" تھا۔ مگر اس نے ایک کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

بلا بوغا محققوں میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے حیدرآباد میں ایک کتب فروش کے یہاں پانچ ہزار مخطوطے دیکھے۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنے مخطوطے؟ بعد میں معلوم ہوا کہ بلا بوغا محققوں کا ایک گروہ [illegible] کے ذریعے سے کاغذ کو ہزار سالہ پرانے میں مہارت تامہ رکھتا ہے اور ایسی ہی روشنائی تیار کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس گروہ سے وابستہ کچھ خوش نویس بھی ہیں جو کسی بھی زمانے کی تحریر کی ہو بہو نقل کرنے میں دبیر نگک سے کم نہیں۔ گویا مصنوعی، غیر مستند، فرضی اور جھوٹے مخطوطات بنانا ایک فن ہے مگر یہ فن کار بھی بلا بوغا سے کم نہیں۔

ایک بلا بوغا کا یہ بیان حیرت انگیز انکشاف ہے اور بیانی [illegible] طلب بھی۔ وہ کہتا ہے کہ [illegible] لوگ "رام راجیہ" رام راج چلاتے ہیں کبھی جو رام راج [illegible] ہے۔ کرنے کا کام [illegible]

نہیں ہوسکتا! عقل اس کے پیچھے پاس کا دامن چلتا ہے۔ ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق بلکہ اشارۂ چشم و ابرو سے ہو جائے گا۔ کالا دھن بھی بلا بوغما ہے۔ ایسے ہی رشوت کا مال ہے بلکہ کالے دھن کا آدھا ہے۔ رشوت۔ رشوت جو بالائی آمدنی بھی کہا جاتا ہے۔ تنخواہ سے کئی گنا بڑی ہوتی ہے۔ تنخواہ تو صرف عہدے پر لٹکائے رکھنے کا کھونٹا ہے، ورنہ اصل دھندا تو رشوت سے چلتا ہے اور خوب چلتا ہے۔

مشاعروں کے بلا بوغما بڑے مہذب، نستعلیق، تراشیدہ اور مکھن کی طرح ملائم ہوتے ہیں۔ معاوضہ کی کوری رسید پر شاعر سے دستخط کرا لیتے ہیں۔ دیں گے پانسو، لکھیں گے پانچ ہزار۔ شاعر بھی خوش، مشاعرہ ساز بھی خوش۔

بلا بوغما کے بغیر دنیا کا وجود ناممکن ہے بلکہ اس کے ہی دم سے دنیا میں چہل پہل، اور رونق ہے۔ یہ نہ ہو تو اللہ ہی اللہ ہے۔ تسبیح، درود، وظیفہ، سرد اور خشک فضا، سپاٹ لق و دق صحرا، نہ سبزہ نہ گل۔ بلا بوغما کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے اپنے دم پر کھیل کر دنیا جہان کو رہنے کے قابل بنا دیا۔ رس پیدا کر دیا۔ یہاں گناہ ہے مگر بالقوت۔ گناہ کے بغیر بشر کا تصور ممکن ہی نہیں کیوں کہ فطرتاً وہ شر سے عبارت ہے اور بلا بوغما تو اس کی نصف بہتر ہے۔

بلا بوغما کا جہاں سایہ پڑ جاتا ہے، وہیں گل کھل جاتا ہے۔ اگر آپ بلا بوغما ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی تو سخت ضرورت ہے دنیا کو، سماج کو، فرد کو۔ بلا بوغما کا اپنا مقام ہے۔ اپنی اہمیت ہے۔ آخر اس کو بھی خالق دو عالم نے کسی مصلحت سے ہی پیدا کیا ہوگا، بے مصرف تو نہیں! بلا بوغما کا یہی مثبت پہلو ہے کہ وہ بھی پھول کے ساتھ کانٹے کی طرح بہار کا پروردہ ہے۔

آج تک عادکرا اگر ہم بلا بوغما داد، کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ہر تخریب کا اگوا بلا بوغما ہوتا ہے۔ وہ ہر انقلاب میں "خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد"، کا دامن تھامے، اپنا الو سیدھا کرنے کی تاک میں رہتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو سمجھیے وہ بلا بوغما نہیں، ڈپلیکیٹ ہے۔ جاسوسوں کا گروہ تو بلا بوغماؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بگڑا جاسوس بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اسے دشمن سے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ بنا ہوگا عیش تجمل حسین خاں کے لیے، اب تو ہر عیش پر بلا بوغما کا نام لکھا ہے۔ ماجد صافی میں نام نہاد "چمچے"، بلا بوغما کی ناجائز اولادیں ہیں۔

سادھو سنتوں اور ننگے سنیاسیوں میں بڑے مقدس بلا بوغما ہوتے ہیں، مندروں، مسجدوں، مٹھوں میں یہ خوب پہنچے ہیں۔

فلمی جگت میں چوکی دار سے لے کر ڈائرکٹر اور فنانسر تک بڑے رنگ رنگیلے، چمک دمک والے فلمی بلا بوغما بستے ہیں بلکہ وہ اکثریت میں ہیں۔ اب تو دوردرشن پر جرائم میں بلا بوغماؤں کا اژدہام ہوتا ہے۔ انھوں نے جنسی وقت نشے سارے قدیم ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ غرض گھر سے باہر نکلتے ہی ہر گلی کے موڑ پر کوئی نہ کوئی بلا بوغما ہونے کا احساس کہیں کہیں تو آپ بھی بلا بوغما ہو سکتا ہے نظر آئیں گے۔

نظر برنی
(نئی دہلی)

چنگیز خاں معلوم ہوتی ہے

یہ باطن ٹھوس لیکن ناتواں معلوم ہوتی ہے
کمر محبوب کی ہم کو کماں معلوم ہوتی ہے

کبھی بیٹی پہ غرّاہٹ کبھی داماد سے جھگڑا
ہماری ساس تو چنگیز خاں معلوم ہوتی ہے

یہ "فیشن" کا کرشمہ ہے یا ہے سنگھار کا جادو
کہ ہر بڈھی سے بڈھی بھی "جواں" معلوم ہوتی ہے

حقیقت میں سبھی پکوان پھیکے ہیں سیاست کے
جو ظاہر میں "اونچی دکاں" معلوم ہوتی ہے

ہوئے دفتر کی اسٹینو پہ عاشق ہم اسی دم سے
نگاہِ دوستاں بھی بدگماں معلوم ہوتی ہے

◯

محبوب مانجھوی
بلاسپور (ایم پی)

اُردو اور ٹی۔وی

اُردو کو نئے ڈھنگ سے اپناتا ہے ٹی۔وی
ہر روز نئے اس پہ ستم ڈھاتا ہے ٹی۔وی

ہیں لفظ "غذائی" کو "کھذائی" یہاں کہتے
"غالب" ہے پہ "گھالب" اسے فرماتا ہے ٹی۔وی

"خالی" کو یہاں شان سے کہہ جاتے ہیں "کھالی"
"خالہ" کو یہاں "کھالہ" ہی بتلاتا ہے ٹی۔وی

"خاموش" کو "کھاموش" پڑھا جاتا ہے حضرت
"گل خان" کو "گل کھان" ہی دہراتا ہے ٹی۔وی

"گھالب کی گھزلیں" کہہ کے سناتا ہے جو غزلیں
غالب کی مگر روح کو شرماتا ہے ٹی۔وی

"ظاہر" ہے مگر لفظ تو بن جاتا ہے "جاہر"
"غالیچہ" کو "کالیچہ" ہی دکھلاتا ہے ٹی۔وی

دکھلاتا ہے دریائے فصاحت کے وہ جوہر
روحِ ادب و شعر کو شرماتا ہے ٹی۔وی

اغلاط سے گر واقف ہے ؟ حضرت محبوب
اُردو ہی کے احسان سے دبا جاتا ہے ٹی۔وی

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/C سکینڈ فلور گلشن اسٹیٹ - عابڈز - حیدرآباد 1.

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دی جاتی ہیں۔

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت 10,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لئے جیسے کرانہ اسٹور [illegible] ٹیلرنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لئے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کیلئے قرض جات دیئے جاتے ہیں اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اسکو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے اور باقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے۔ اور اس اسکیم میں درخواست گذار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

(2) خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کیلئے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین سیلائی، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹورس وغیرہ وغیرہ کے لئے قرض جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۱۹۹۳ء تک 47210 افراد میں 8,52,16000 روپے مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 36,44,81,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 161000 لاکھ روپے مارجن منی قرض جنکی جملہ لاگت 4,04,68,000 روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔ اسطرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985 سے اب تک 50104 افراد میں 9,53,33,000 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 40,49,49,000 روپے ہوتی ہے۔ جاری کرچکا ہے۔

اسکے علاوہ کارپوریشن گذشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گذشتہ سال 12 لاکھ روپیے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اسکو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور، اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئیگا۔ جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں 13 ہنر سکھانے کیلئے اس سال 348 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 35 کو کمپیوٹر 28 کو ٹائپ رائٹنگ 100 کو ویسٹ موٹر ڈرائیونگ 10 کو لیب ٹیکنیشن 7 کو بیوٹیشن 10 کو شارٹ ہینڈ 10 کو الکٹریشن 5 کو ٹیلرنگ 13 کو ویڈیو گرافی 5 کو فیبریکیشن 4 کو ریڈیو موٹر ڈرائیونگ 5 کو ہیرے تراشنا 6 کو کارپینٹری کی تربیت دی جائے گی گنٹور میں 121 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

خواہشمند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد فاروق علی خان ([illegible])

رزّاق اثر شاہ آبادی

پہلوانِ سخن

جب سے فری اسٹائل کشتیوں کا دور آیا ہے گزشتہ دور کے پہلوانوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی پہلوانی کو بھی لوگ بھولتے جارہے ہیں۔ کہاں وہ مہینوں کی تیاری کے بعد لنگوٹ کس کر پہلوانوں کا اترنا اکھاڑے میں اور کہاں یہ سیٹی بجتے ہی اچھلتے کودتے میدان میں کودنا۔ کہاں وہ ڈیل ڈول اور پہاڑ جیسے بدن اور کہاں یہ مچھر پہلوان بہت فرق ہے کل میں اور آج میں جناب۔

اب سے پچاس سال پہلے کی بات ہے صاحب! کہ ایک پہلوان اپنے استاد (خلیفہ) کی نگرانی میں پوری طرح تیاری کرکے ڈنڈ بیٹھک لگا کر لنگوٹ کس کر جب میدان میں کشتی لڑنے کے لیے اترتا تو اس کے بازو اور پٹھوں کی چمک دار مچھلیوں کو دیکھ کر کتنے ہی نوجوانوں کے دل میں پہلوان بننے کا شوق چرّاتا تھا۔ اور "دلِ ناتواں" میں یہ حسرت پہلوانی انگڑائیاں لے کر اٹھتی تھی کہ اے کاش ہم بھی پستہ و بادام کھا کر اور سیروں دودھ پی کر ڈنڈ بیٹھک لگا کر اپنے جسم کو ایسا سنوارتے کہ ہماری طرف دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے اور دیکھنے والیاں غش پر غش کھا کر مرتے مرتے رہ جاتیں اور "رقیبِ روسیاہ" ہماری طاقت اور بازوؤں اور پٹھوں کی مچھلیوں کو دیکھ کر دُم دبا کر شہر سے بھاگ جاتا۔

رستم، سہراب، گاما، دارا سنگھ، سندھا، [illegible] اکرم وغیرہ جیسے پہلوانوں کا نام کس نے نہیں سنا۔ اب بھی [illegible] نسل سے ایسے لوگ زندہ ہوں گے جنھوں نے ان نامور پہلوانوں کی کشتیوں کا [illegible] اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اگر دیکھا نہیں تو سنا ضرور ہوگا۔ کیا ہندوستان کیا [illegible]

یہ دونوں ملک کا پہلوان کے نام کا ڈنکا ۔ ہر پہلوان جب پہلی بار کشتی لڑنے میدان میں اترتا تو پہلے اللہ، بھگوان یا گاڈ (GOD) کا نام لے کر رستم زماں کو یاد کرتا اور میدان میں اترتا ہے اگر یقین نہ آتا تو ایسی کشتی ضرور جا کر دیکھیے!

لیکن جب سے بھارت میں راجاؤں اور نوابوں کا دور ختم ہوا ہے ان پہلوانوں کی اور اکھاڑوں کی سرپرستی کرنے والے بھی ختم ہو گئے۔ آزادی کے بعد بھی کچھ راجاؤں اور نوابوں نے اپنی آن اور شان خاطر ان اکھاڑوں کی سرپرستی جاری رکھی لیکن جب خود انھیں دن میں تارے نظر آنے لگے اور آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا تو انھوں نے بھی اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ پہلوان یتیم بھی ہو گئے اور بیچارے

اب یہ بے چارے پہلوان کرتے بھی تو کیا کرتے۔ کچھ نے تو بھینس پال کر دودھ بیچنا شروع کیا۔ پیٹ بھرنے کے لیے پان بیڑی کی دوکانیں کھول لیں اور جو زیادہ چالاک تھے انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کود کے اکھاڑے سے سیدھے سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑے اور لیڈر کم اور چنبل وادی کے ڈاکو زیادہ نظر آنے لگے۔ خدا بھلا کرے دور درشن والوں کا جن کی دوربین نگاہوں نے کیمرے کی آنکھ سے ہمیں پارلیمنٹ کی سیر کروائی اور کون کتنے پانی میں ہے بتا دیا۔ دور درشن کی وجہ سے ایک فائدہ پارلیمنٹ کا یہ ہوا کہ لمبے شور کرانے لگے خاص طور پر خواتین ساتھ ہی پارلیمنٹ میں آ کر سونے اور خراٹے لینے کا سنہرا دور ختم لیکن لڑ جھگڑ کر اپنی بات منوانا — پھر اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔

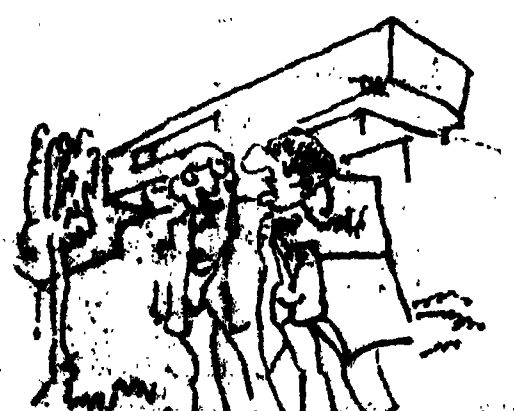
مگر صاحبو! میں آپ سے ان لنگوٹ بند پہلوانوں کے بارے میں نہیں بلکہ دنیائے ادب کے پہلوانوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گا اگرچہ کہ ایسے پہلوان اب خال خال ہی نظر آتے ہیں لیکن ایسے ہی پہلوانوں کی وجہ سے اس دور ناشناس میں اردو کی ناک آج تک نہیں کٹی بلکہ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح آج بھی اپنی جگہ صحیح سلامت برقرار ہے۔

میر تقی میر کے بعد سے خداوند سخن کہلانے کی جرات کسی کو بھی اس لیے پیش نہیں آئی کہ اس درجہ کا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہاں پہلوان سخن کی دعویداری کرنے والے شاعر بہت سے آئے اور گئے لیکن ناسخ کے بعد سے اب تک صحیح معنوں میں پہلوان سخن پیدا نہ ہو سکا۔

اس الکٹرانک دور میں یہ بات بہ ہوش و حواس بلا جبر و اکراہ قسم کھا کر کہتا ہوں (حالانکہ سند ہے) صدی کے چوتھے سے ساتویں دہے کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ایک ایسا شاعر اس دور میں پیدا ہو چکا تھا کہ جسے بلاشبہ نہیں ڈیل ڈول پٹھانی قد و قامت اور گرج دار آواز کی بنا پر پہلوان سخن کہلانے کا شرف حاصل ہوا [illegible] اپنا حق اس نے منوا لیا! میرا اشارہ قبلہ پٹھان حضرت جوش ملیح آبادی کی طرف ہے۔ کوئی نئی بات نہیں جناب آنکھیں دیکھی کہہ رہا ہوں۔ جب میں پہلی بار [illegible]

ہمیں ایک شاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہر شاعر ہانپ رہا تھا۔ ایک پہلوانِ سخن نے اپنی گرج دار آواز میں جب "کیا شکل دی ہے ——" والی غزل شروع کی تو سامعین تو سامعین ہیں شعرائے کرام سخن نے بھی لہک لہک کر ساز میں اپنی آواز ملا کر کورس کی شکل میں یہ مصرعہ لطیف پڑھا تھا۔ یقین ہے کہ اب بھی ایسے سامعین اور عمر رسیدہ ہوں گے جنہوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔

آج کا دور تو صاحبو پلاسٹک جنریشن کا دور ہے۔ فرٹی لائیزر سے پیدا کی گئی ترکاریاں اور اناج۔ ٹیری رم کا دودھ، دھویں، گیس اور بدبو سے مالا مال زہریلی ہوا میں سانس لے کر کس کی شامت آئی ہے کہ پہلوان بننے کی ہمت کرے۔ آج کا شاعر تو دوسرے شریف انسانوں کی طرح دال روٹی کے چکر میں پڑا ہے، ادب خدمت سے پہلے بیوی بچوں کے پیٹ کی خدمت کو جو ترقیب دیا ہے سر کے بل بھاگ رہا ہے۔ وہ کہاں ملاو ندر سخن یا پہلوانِ سخن بننے کی سوچے گا۔ ویسے آج کل وہ شاعری کا میاب شاعر ہے جو جی پیا کے آواز یا پیار کی میٹھی غزل سنائے۔ ایسے شاعر کو ہی once more please "کیا اچھا گایا ہے" جیسے توصیفی فقرہ سننے کو ملتے ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے صاحبو کہ شاعر نے پبلک کے ڈیمانڈ کو قبول کر لیا ہے۔ اسی لیے آج شاعر کاغذ قلم لے کر چولہی کے پیچھے پڑا ہے۔ خدا شاعری کو (چاہے وہ کسی بھی زبان کی ہو) نظرِ بد سے بچائے اور ایسا دانشِ سخن اس صدی کو عطا کرے جو شاعری کو صحیح سمت دے۔



مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ
ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک بڑا کمپیوٹر ہوتا ہے۔

قاسم ندیم
([illegible])

ڈگری

مرزا کریم نہ جانے کیوں آج ہمارے گھر میں بڑبڑاتے ہوئے داخل ہوئے۔ نہ انھوں نے شریفوں کی طرح دروازے پر دستک دی اور نہ ہی حسبِ معمول سلیک کا سہارا لیا۔ آج وہ بالکل بے سہارا سے لگ رہے تھے۔ غصے سے چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ بال سر پر ہری بھری فصل کی طرح الف کی صورت کھڑے تھے۔ وہ دھم سے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ کہنے لگے "نہ جانے کہاں کہاں سے ڈگریاں خرید لیتے ہیں۔ ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ ہولڈروں کا تو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ معمولی سوال بھی کیجئے تو چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے درسگاہوں میں پروفیسروں کے ساتھ فاختائیں اڑاتے رہے ہوں۔ سب فضول ہے، بکواس ہے۔"

ہم نے پہلی بار لب کشائی کی، "مگر ہوا کیا؟"

"مگر مگر چھوڑو۔ ایک اچھا سا تنقیدی مضمون لکھ مارو۔ ایسے نکھٹوؤں پر، ذرا عقل ٹھکانے آ جائے۔ [illegible] کر کے اور پروفیسروں کی اولاد یا نانی پوتی کی شادی بیاہ میں ہنڈی ڈوئی ہلا کر اور پلیٹیں صاف کرنے کا مظاہرہ کر کے ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے ادب کے ساتھ کھلواڑ کرتے رہتے ہیں۔"

"مگر آپ ادب اور ڈگری ہولڈروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟" ہم نے سوال کیا۔

انھوں نے بغور دیکھا، جیسے بارعب شخصیت کا پہلی بار سامنا کر رہے ہوں۔ پھر سوالیہ سی شکل بنا کر کہنے لگے، "مجھ سے سوال مت کیجئے۔ ہمارے موڈ کا تیا پانچا سوال کی بدولت ہی ہوا ہے۔ وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب ہم نے پڑوسی سے اخبار مانگ لیا۔ خبریں تو ہمیشہ کی طرح باسی ہی تھیں جو ہم آزادی کے بعد سے مسلسل سنتے اور پڑھتے آ رہے ہیں۔ اور کسی سنسنی خیز خبر کو پڑھ کر بھی ہم چونک نہیں پاتے۔ آج کی خبروں میں وہ دم خم کہاں جو ہمیں چونکا دے۔ خبروں اور اشتہاروں سے جب نظر [illegible] تو ایک کام کی چیز مل گئی۔"

ہم نے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اخبار میں کام کی چیز؟"

فرمانے لگے۔ واللہ بھی اپنے مرکار آمد چیز۔ اب ہمیں ایک پیسے تک ورزش اور یوگا کی ضرورت نہیں اپنا نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے
بیٹھے بٹھائے پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ میرا مطلب ہے تندرستی قائم ہے۔

ہم نے کہا۔ مرزا صاحب ہمیں بھی وہ نسخہ تندرستی بتا دیجئے۔

کہنے لگے۔ کیوں تم نے آج کا اخبار نہیں خریدا۔ کمال ہے کب سے اتنے بے ادب ہو گئے ہو۔ ہماری زبان، ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب کا کیا ہوگا؟ تم جیسے جیالے لوگ بھی اگر اخبار خریدنا بند کر دیں گے تو ہماری زندگی کا مزہ ہی بگڑ جائے گا۔ ایک تو ہماری زبان ویسے بھی بے یار و مددگار ہے۔ دوسرے آپ جیسے لوگ اسے غریب الوطنی پر مجبور کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی سیاست میں جانا چاہتے ہو؟ زبان کا سہارا لیکر ووٹ بٹورنا چاہتے ہو۔ نیتاؤں کی طرح وعدے وعید کر کے ہمیں بہلانا پھسلانا چاہتے ہو۔ آج کل کے اوکالی عشاق اور نیتاؤں میں تل برابر بھی فرق نہیں۔ اگر تل بھی درمیان میں آجائے تو یہ اس کا بھی تیل نکال کر بازار میں فروخت کر دیں۔ کوئی خریدنے والا دستیاب نہ ہو تو کم از کم گروی رکھ دیں۔

ہم نے قطع کلام کے لئے معذرت چاہی۔ مرزا صاحب آپ اصل موضوع سے ہٹ رہے تھے۔ بات پڑوسی کے اخبار سے شروع ہوئی تھی اور سیاست اور ریاستی دربار کی حدود سے بھی تجاوز کر گئی۔

فرمانے لگے۔ جس طرح پارہ کو گرمی میں ساکت و جامد کرنا آسان نہیں۔ اسی طرح پارہ صفت زبان کو خاموشی کا قفل لگانا ناممکن ہے۔ ہمیں جو جو نظر آئے گا وہ ہم بیان کرتے رہیں گے۔ ہمارے جمہوری نظام میں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی ہے۔ وہ چاہے کتابی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔

"مگر آپ تو ہماری دل آزاری پر اتر آئے ہیں۔"

اجی حضرت! دل آزاری اور آہ و زاری ہے کس بلا کا نام؟ ہم سے پوچھئے کہ ہمارا دل خون کے آنسو بہا رہا ہے؛ آج کے حالات اور ماحول کو دیکھ کر دل سے آہ نکلتی ہے۔ کبھی کبھار دھواں سا بھی اٹھتا ہے۔ ایسے کے لئے بھی بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی اشد ضرورت ہے۔

ہم نے دیکھا کہ مرزا صاحب کا غصہ آہستہ آہستہ دھوئیں کی طرح کافور ہوتا جا رہا ہے اور ذہن پر فلسفہ طاری ہے۔ جب سے ہمارے دوستانہ مراسم قائم ہوئے ہیں تب سے ہم برابر مرزا صاحب کی فطرت کا مشاہدہ کرتے آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آپ کسی ایک ڈھرے پر نہیں چلتے۔ ساری مخلوق ان کی نظر میں حقیر ہے۔ ان کے پاس علم و حکمت کا ہمیشہ پلندہ ہوتا ہے جو بنا مانگے ہر کس و ناکس میں برابر تقسیم کیا جاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کسی درگاہ کی ایسی دیگ ہے کہ جتنی تقسیم کرتے ہیں۔ برکت اس سے دگنی آجاتی ہے۔ موصوف کے مشاغل موسموں کی صورت بدلتے رہے ہیں۔ جس وقت جیسا موڈ رہا۔ شغل اختیار کر لیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے فرمایا۔

"دیکھو اب تم نے شعر کو تمہارا یات سے آگے نہیں بڑھایا۔ اس لئے اب تم ترقی یافتہ دور میں سب سے پیچھے ہو۔ ہمارے دیس کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے ہو۔ ہماشما تیرے شعر پڑھ کر وہ جاپانی اور چینی تمہارے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے ہوتے۔ مگر ہائے وہ قسمت! ہاتھ ملتے ہی رہ گئے

کہتے ہیں کہ جب تک کھانا [illegible] تھوڑے لوگوں کا یا خود تین ہاک کا دورہ نہ کر لیں بھوک نہیں لگتی۔

تھوڑی دیر مجھے تھوڑا تعجب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ مگر سناٹے کی فضا میں ان کی زبان کی دھار کے آگے کب تک ٹکتی۔ وہ بھی تنکوں کی طرح بکھر گئیں۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ عزیزم اتنی دیر سے تمہارے آگے بک رہا ہوں۔ مگر تم ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ارے اخلاقاً ہی کھانے پینے کے بارے میں پوچھ لیا ہوتا۔

ہم نے کہا مرزا صاحب یہ بھی کوئی کھانے کا وقت ہے ؟

کہنے لگے، یار ہم ہندستانی دوپہر اور سہ پہر کی جکڑ بندیوں سے کب آزاد ہوں گے۔ برطانیہ میں دیکھو وہاں چار چار بار ڈٹ کر کھانا کھاتے ہیں۔ بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر اور نہ جانے کیا کیا ؟ اسی لئے اتنے گورے چٹے ہوتے ہیں۔ اور ہم فاقہ کشی کرتے کرتے خود کشی تک پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے اس دور کشاکش سے چھٹکارا دلاؤ اور جو بھی گھر میں بنا ہوا ہے لے آؤ۔

ہمارے کھانے کا انتظام کرنے تک مرزا صاحب نے صوفے کو ترک دیا اور گھریلو لائبریری کی کتابوں پر یلغار کر دی۔ آناً فاناً میں گھر کے فرش پر کتابوں کا دوسرا فرش نظر آنے لگا۔ الماری میں ہاتھ ڈالتے بے دردی سے کتاب کھینچتے اور [illegible] پا کر فرش پر پھینک دیتے۔ گویا ہماری سہما خستہ کتابوں پر اترنے لگا۔ ہم اندر ہی اندر کڑھتے رہے۔ بنا بنایا خون یہ منظر دیکھ کر خشک ہو تا رہا۔

ہم نے مرزا صاحب کے لئے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ وہ اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کتابوں کے ڈھیر سے اٹھے۔ اور کرسی پر جم گئے۔

ہمارے ذہن پر تو خوف طاری ہو ہی گیا تھا کہ کہیں مرزا صاحب کھانے کے آداب، لذت، کام و دہن، حسیاتین، وٹامن، سنت، فرمل وغیرہ وغیرہ پر اپنی مدلل بحث نہ شروع کر بیٹھیں۔ اور رہا سہا دماغ بھی نہ چٹ کر جائیں۔ اور ہمارے حواس خمسہ میں سے دو تین حواس کم از کم سماعت جیسی اہم حس سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ آج جب کہ ہر انسان خود کو اعلیٰ مفکر، فلسفی، ادیب و شاعر کے روپ میں پیش کرنے کی سعی مسلسل کر رہا ہے۔ تو ایسے بڑے وقت میں ہم جیسے سامعین کی قلیل تعداد اپنے نحیف کندھوں پر ادب کا بار گراں اٹھائے ہوئے ہے۔ اگر ہم جیسے خاموش لب سامعین کی سماعت بھی متاثر ہو جائے تو ادبی نشستیں، مشاعرے، مباحثے، مذاکرے، سمینار اور سمپوزیم کا کیا ہوگا ؟ کیا یہ دنیا کے فنا ہونے سے پہلے ہی ملک عدم سدھار نہیں جائیں گے ؟

مگر صد شکر اللہ کا کہ مرزا صاحب کو کھانے کے دوران مختلف النوع عنوانات پر اپنے قیمتی خیالات پیش کرنے کی حاجت نہ ہوئی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ان سے پوچھا " مرزا صاحب " اب تو بتا دیجئے کہ وہ نسخۂ کیمیائے تندرستی کیا ہے !

انھوں نے ہمیں کچھ دیر تحقیر آمیز نگاہوں سے گھور کر دیکھا پھر کہا " اب تم پوچھتے ہو تو [illegible] بتا دیتا ہوں۔ مگر یہ راز افشا نہ ہو۔ کیوں کہ یہ بہت ہی سیکریٹ معاملہ ہے۔

ہمارا تجسس اور بڑھ گیا۔ ہم نے کہا مرزا صاحب [illegible] دیجئے۔ وہ راز [illegible] ہے کا۔ [illegible]

سکتے ہو کہ میں راز فاش کر دوں گا۔

انھوں نے کہا - یہ امید تو ہم اپنے آپ سے بھی نہیں رکھتے۔ بے جا امیدیں بہت ٹھیس پہنچاتی ہیں - ہم نے کہا مہربانی فرما کر آپ وہ راز بتا دیجئے - میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔

انھوں نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا - وہ ایک معمّہ ہے - سمجھنے کا بھی اور سمجھانے کا بھی۔

ہم نے کہا - مرزا صاحب پہیلیاں نہ بجھائیے - پہلے ہی ہم بہت الجھے ہوئے ہیں۔

انھوں نے کہا اب اس میں کونسی الجھن والی بات ہے ؟ عزیزم ! آج کے اخبار میں ایک ادبی معمہ شائع ہوا ہے ، اور اس کے تحت روزانہ اخبار میں ایک سوال شائع کیا جائے گا۔ مسلسل تیس دن تک تیس سوالوں کے جوابات تلاش کرنے میں کس قدر جانفشانی ہوگی - تم اس سے واقف نہیں ہو - تیس دنوں تک جتنی بھاگ دوڑ ہوگی - کتابوں کا مطالعہ ہوگا - اسی سے جسمانی اور ذہنی ورزش ہوگی - یہی نسخۂ تندرستی ہے ۔

مرزا صاحب کا یہ جواب سن کر تجسّس کا جو دیا ہمارے دل میں اٹھا تھا وہ بھبھک کر بجھ گیا۔

●●

راوی: بیرسٹر سردار علی خاں
تحریر: سید طالب حسین زیدی
(رائچور)

ہائیڈ پارک لندن میں

حیدرآبادی نوجوان لڑکوں کی شرارت

ایک دن چند منچلے زندہ دل نوجوان طالب علم ہائیڈ پارک میں خوش گپیاں کرتے ہوئے سیر کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے ان کا گذر پارک کے ایک گوشہ میں ایک بنچ کے قریب سے ہوا جس پر ایک بوڑھا انگریز چمچماتے سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں چھتری (WALKING STICK) لیے ہوئے بیٹھا سستا رہا تھا۔ اس کا [illegible] چہرہ اور نشست کا وہی لاٹ صاحب والا انداز دیکھ کر لڑکوں کی رگ شرارت پھڑک اٹھی سب اس کے قریب آگئے اور اشارے کرکے بظاہر آپس میں باتیں کرنے لگے لیکن اُن کی اُن باتوں کا اصل مخاطب وہی فرانٹ بوڑھا انگریز تھا۔ اُن دنوں ہندوستان نیا نیا آزاد ہوا تھا اور انھوں نے اپنا موضوع گفتگو اسی کو بنایا (گفتگو ٹھیٹ حیدرآبادی اُردو میں ہو رہی تھی)

ایک نے بات یوں شروع کی۔ سو۔ دو سو برس تک بڑے ٹھاٹ سے ہم پر حکومت کرتے رہے اور ہم کو لوٹ لوٹ کر یہاں لندن میں محل چوبارے اٹھا رہے تھے اب جب جی بھر کے جوتے پڑے اور گردن میں ہاتھ دے کر نکالے گئے تو یہاں ہائیڈ پارک میں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کھا رہے ہیں۔ دوسرے نے کہا جیسوں کو اب معلوم ہوئینگا آنے والا [illegible] بڑی اکڑ دکھاتے تھے ہم سے بولتے تھے "ول تم کالا آدمی ہندوستان کا حکومت نہیں چلا سکتا۔ ہم تم کو سکھلائے گا۔ پڑھلائے گا۔ آدمی بنائے گا۔" اس کے بعد ایک اور لڑکے نے یوں ٹکڑا لگایا۔ جب ہماری جوتیاں کھا کر تالو پر ایک بال بھی نہیں رہا تو سر پر جوتے رکھ کر بھاگ آئے سب سکھلانا دکھلانا بھول گئے۔ کسی نے کہا یہ بڈھا بھی [illegible] کا ایک معلوم ہو رہا ہے (اور پھر خود اس کی طرف اشارہ کرکے) ذرا دیکھو تو ٹیشن (دیکھو) رنگ لال لال [illegible]۔ کیا تن کر بیٹھا ہے قطب صاحب کی لاٹ!

ان باتوں کو سن کر کچھ دیر [illegible] ہوئے [illegible] میں بوڑھا مسکرا کر ٹھیٹ انگریزوں کی طرح سر کو ہلا ہلا کر

اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا جا رہا تھا۔ اس پر ایک لڑکے نے جل کر کہا۔!

ابے بوڑھے (پاگل)! اے بے غیرت! شرم نہ آتی؟ تیری شان میں کیا ہم لوگاں قصیدے پڑھیں؟ گرگٹ کے ویسا منڈی کا ٹیکو بلا رائے!

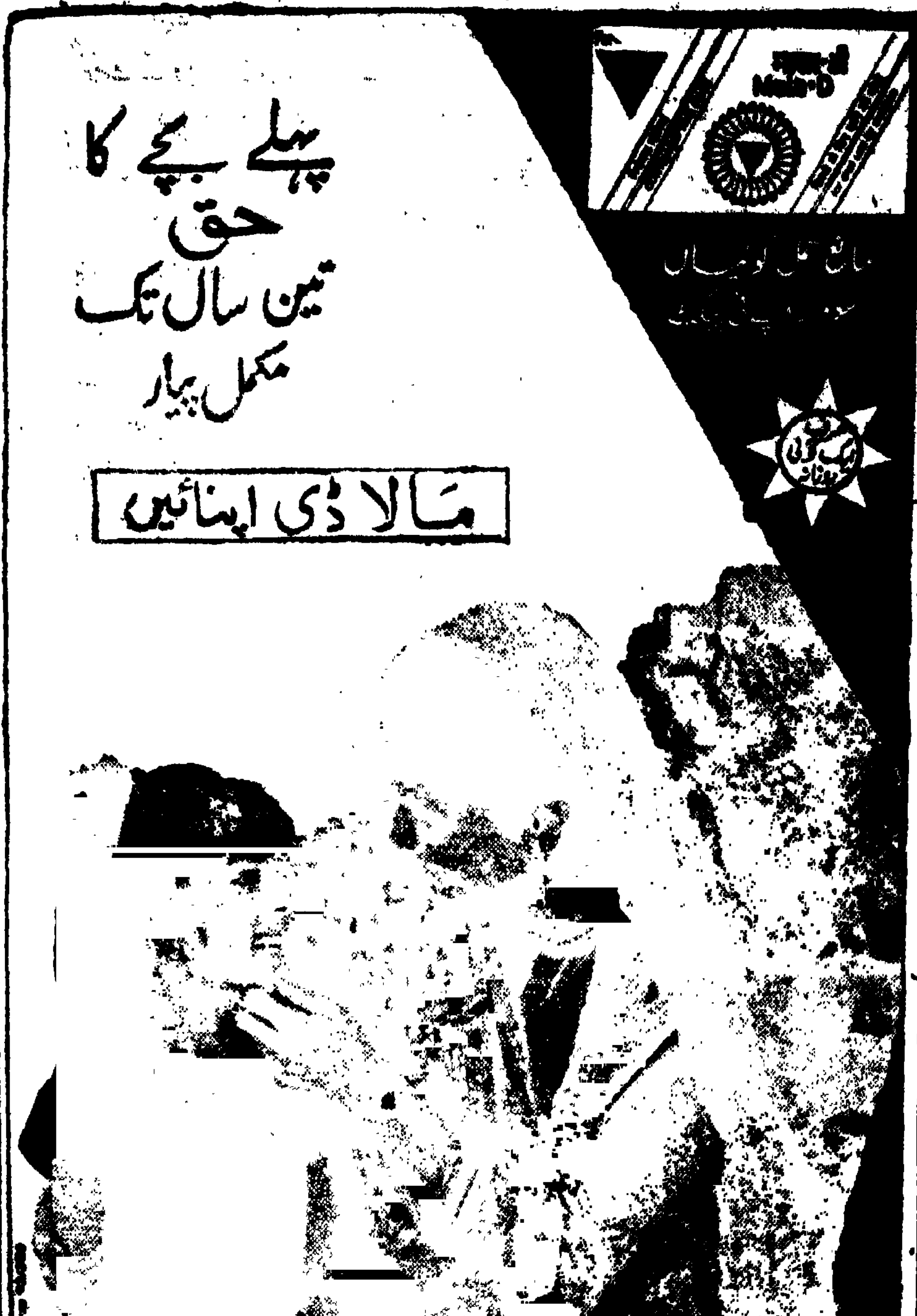
الغرض! یہ اور اس طرح کی ملبوس و غیر ملبوس بے شمار مغلظات اور صلواتوں سے اس کی تواضع کی گئی اور اپنے دل کی بھڑاس خوب نکال کر جب تھک گئے اور اس بوڑھے انگریز پہ اپنی باتوں کا کوئی اثر اور کوئی ردِ عمل ہوتے نہ دیکھا تو تھک ہار کر وہاں سے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ چلو یار دیسے کے کچھ پلے نئی پڑا۔ اور تھوڑی دور جا کر ایک بنچ پہ بیٹھ گئے اور ہنسی مذاق میں مشغول ہوگئے۔ دس پندرہ منٹ نہ گزرے تھے کہ انھوں نے دیکھا..... ! کہ وہی بوڑھا انگریز آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتے ہوئے ان کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ سب لڑکے اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کچھ گھبرا گئے اور سراسیمگی کے عالم میں کھڑے ہوگئے۔ ایک لڑکے نے ذرا سنبھل کر کہا! معلوم ہوتا ہے۔ بے غیرت کا ابھی پیٹ نئی بھرا شاید اور سننے کے واسطے چلا آرا ہے) اَوَر بیٹا آداب اچھی طرح تمھارا پیٹ بھریں گے۔ اتنے میں وہ ان کے بالکل قریب چلا آیا اور اپنے سر سے ہیٹ اتار کر تعظیماً ذرا سا خم ہو کر بی بی سی والے مارک ٹلی کے لہجے میں گلابی اردو میں ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

پشاور میں تین سال، ڈلہی (دہلی) میں پانچ سال اور لکھناؤ (لکھنؤ) میں چار سال پورے بارہ سال انڈیا میں رہ کر آیا ہے۔ آپ۔ کا۔ شوک۔ ریا۔ (شکریہ) باہوٹ شوک۔ ریا۔

شریروں کے پسینے چھوٹ گئے۔ پیروں تلے زمین نکل گئی اور ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سر پر پیر رکھ کر وہاں سے سب جو سرپٹ بھاگے ہیں تو پلٹ کر بھی نہیں دیکھے اور ہائیڈ پارک کے گیٹ کے باہر آکر ہی دم لیا۔

ان کی یہ درگت بنا کر شریف بوڑھا انگریز بہت دیر تک آکسفورڈ کی انگریزی میں قہقہہ مار کر ہنستا رہا اور مزے لیتا رہا......!

اس واقعہ کے راوی مخلص دوست جناب جسٹس سردار علی خاں بیرسٹر ہیں جو خود بھی کیے از طفلان ہنگامہ آرا تھے......!



پہلے بچے کا
حق
تین سال تک
مکمل پیار
مالا ڈی اپنائیں

ایم جمال علوی
(لکھنؤ)

(دوسری قسط)

آسمان اور تجبر کے درمیان

مشتاق احمد یوسفی

الفاظ کو کٹھ پتلیوں کی مانند نچاتے ہیں اور موضوع یا مواد ان کے ہاتھوں میں اصطلاحوں کے جدید ا ... اور موقع واقعہ کی پُرمذاق شمولیت کے ساتھ، موسیقی کی طرح خود ہی نَے اٹھتا ہے۔ وہ بات سے بات پیدا نہیں کرتے، بات خود بخود پیدا ہو کر خود رو بیل کی طرح اپنے آپ پروان چڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ "ہائی نوکل" قسم کی شے آپ بہرحال دو عدسوں والا چشمہ لگائے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بطریق دیدۂ پُرشوق اس پوری تحریر کا ایک تفصیلی جائزہ ملاحظہ فرمائیں۔ اگر اس "ہائی نوکل کلب" کی مترنم تحریر کے مختلف اجزاء میں آپ کو ... نہ آئے تو دام واپس ظاہر ہے کہ وہ شاذ و نادر ہی ایسے جملے لکھتے ہیں جو طنز یا مزاح سے قطعاً خالی ہوں۔

یوسفی ایک ایسے مزاح نگار ہیں جن کے ہر لفظ، ہر جملے اور پیراگراف میں طنز و مزاح کوٹ کوٹ کر (بلا مبالغہ ... نہیں) بھرا ہوا ہے۔ ان کی ایک اور مزاحیہ تحریر "ہائی نوکل کلب" کی چیر پھاڑ کرتے ہوئے اس تحریر کے بہت سے اقتباسات پیش خدمت ہیں جن سے قلبی گدگدیاں لگائے جا سکیں گی وہ موضوع، مواد، الفاظ، محاوروں اصطلاحات اور ... سے مزاح پیدا کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔

" اسی زمانے میں ابا جان یوکلپٹس ادری کے لئے ایک سنہری رنگ کا جزدان لائے جسے کم نظر آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دادا کو کتنے کو وہ نظر نہیں آتا ... تھے۔ ہماری ڈیوٹی یہ لگی ہوئی تھی کہ دو فریقین کو ایک دوسرے کے حلق گزرنے ... بالخصوص مغرب کے وقت۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ہماری غفلت سے وہ وضو کر کے ہرن کی کھال سے کرپائے کے کتے پر بیٹھ جاتے اور ... اور الله اکبر کہ بھونکنے لگتا تو ... راقم الحروف پر چیخنے کر اندھا ہو گیا ہے کیا ... عینک لگا کر بھی آنکھ ... نہیں آتا"

حکیم صاحب موصوف اپنی ذات علم بیاض پر کامل ... سمجھتے تھے ... ان ... جالینوس تے بھی ... حکیم جالینوس نابینا اور کبیر العمر ... تھے ... ہوئے ... نبض چھوکر بیماری ... بتا دیتے تھے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غلط نبض پر ہاتھ ڈالا ہو ... جالینوس نے ہماری نبض، زبان ... قاعدہ ... کے ... کہ ... کا ... فرمایا ... کے ... ہوئے فرمایا کہ دست ...

مقام راحت پر موجود ہے، درد میں جو چبک ہے، چپک میں جو ٹیس ہے اور ٹیس میں جو کسک رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے — وہ یہاں ہے۔ بقول مرزا یہ تشخیص نہ تھی، ہمارے مرض کی توہین تھی۔۔۔ پھر فرمایا، تمہارا علاج یہ ہے کہ باقی فوکل بنوالو۔۔۔"

ذرا ان مکالموں پر بھی ایک نظر ڈالیں اور یہ مصرعہ بھی پڑھتے جائیں۔ ع "اس معصومیت پہ کون نہ مر جائے اے خدا"

"ہم نے کہا مرزا، تین چار مہینے سے ہمیں تکیے پر صبح درجنوں سفید بال پڑے ملتے ہیں۔ فرمایا، اپنے تکیے پر؟ عرض کیا ہاں! شرلاک ہومز کے مخصوص جاسوسی انداز میں چند منٹ گہرے غور و خوض کے بعد فرمایا، غالباً تمہارے ہوں گے۔ ہم نے کہا ہمیں بھی شبہ ہوا تھا۔ بولے بھائی میرے! تم نے تمام عمر ضبط و احتیاط سے کام لیا ہے۔ اپنے جنی جذبات کو ہمیشہ شرعی حدود میں رکھا ہے۔ اسی لئے تم ۲۰، ۲۲ سال کی عمر میں گنجے ہو گئے ہو۔"

"جھل ایجنٹ کہ بجز پیری کوئی علاج نہیں، ہاں تنگ دستی اور تصوف سے تھوڑا بہت آرام آجاتا ہے۔ ہمارے یہاں سن بلوغ کے دے کے دو ہی مشغلے ہیں۔ عیاشی — اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو — تصوف! اور قوالی ان دونوں کا عطر فتنہ ہے — اور تمہارا علاج ایک عدد فوکل اور جمعرات کی قوالی!"

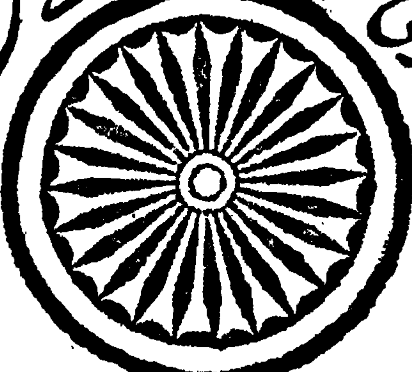
"اب مزاروں پر گاتی ہے یا ریڈیو پاکستان سے۔۔۔۔۔ گانے والی کی صورت اچھی ہو تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔۔۔۔ مرزا ہمیں لینے آئے۔ نتھنے پھڑکاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج تم میں سے جنازے کی سی بو کیوں آرہی ہے؟ ہم نے گھبرا کر اپنی نبض دیکھی دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو ہم نے اقرار کیا کہ گرم شیروانی دو سال بعد نکالی ہے۔ کافوری گولیوں کی بو بری طرح بس گئی تھی۔"

مُردوں کے پھیکے دلوں پر قلم اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنے لطیف طنز و مزاح کی خوشبو سے ہمارے قلب و نظر اور روح و جگر وغیرہ کو طبلۂ عطار بنا ڈالا ہے۔ ان کے یہاں مزاح میں طنز اور طنز میں مزاح حلول کرتا صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

یوسفی کے طنزو مزاحیہ مواد کو جب ہم ادب کی چھلنی میں چھانتے ہیں تو ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی تحریر کنکر پتھر کی آمیزش سے بڑی حد تک مبرا ہے۔

یوسفی کا قلم مزاح میں ادب کی آبرو بن کر، طنز میں صاحب موضوع کی آبرو ریزی کر بیٹھتا ہے ان کی تحریر زمین میں موجود خشکی کی طرح سطحی بھی ہے اور سمندر کی گہرائیوں جیسی وسعت اور کشادگی کی غماز بھی۔ یوسفی ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ایک ایسے ورثے کے امین ہیں۔ جس نے اردو ادب میں ہمیشہ اضافے کرتے ہوئے ہمارے یہاں موجود اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرنے کی بیحد کامیاب کوشش کی ہے جس سے ہمارا طنزیہ و مزاحیہ ادب نہ صرف بین الاقوامیت حاصل کر گیا ہے بلکہ خود یوسفی کو ہمارے ادب کی ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی عزت و آبرو بنا گیا ہے — اپنے ادب سے یوسفی کو ہٹا کر دیکھئے، کم مائیگی اور پستی کا احساس خود بخود آپ کے اپنے گوشہ قلب میں کروٹیں لیتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ موضوع، مواد، الفاظ، محاورے، منظر کشی، اصطلاحات اور صورت واقعہ کے محتاج قطعاً نہیں، الفاظ خود بخود کسی بھی موضوع پر ان کے قلم سے نکلنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسلم فرخی "خود کو ان سے کھو کر ایک طرح کی طمانیت اور افتخار محسوس کرتی ہے۔"

ری جمہوریت کے ستون



نصاف

آزادی

برابری

بھائی چارہ

ذہبی غیر جانبداری

[illegible] کے خط

مراسلے

محترم شاکر صاحب۔

السلام علیکم۔ کافی طویل وقفے کے بعد "شگوفہ" ملا۔ ماہنامہ "شگوفہ" کی سلور جوبلی مبارک ہو۔ اسی مہینے میں جب اس کا اعلان پڑھا اور خصوصی اشاعت دیکھی تو اندازہ ہوا کہ آپ نے یہ سبب یاد نہیں کیا۔ یہ دراصل حسن طلب ہے۔

جشن سیمیں کی ایک بار پھر بھرپور مبارک باد۔ آج کے دور میں ایک رسالے کا پچیس سال تک حریفوں اور حاسدوں کے سینے پر مونگ دلنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کے لیے حسن یوسف، دم عیسیٰ اور ید بیضا چاہیے درکار ہوں لیکن بہت ساری ہمت، ڈھیر ساری توانائی اور ڈٹ جانے کے لیے پوری بھر بھر روپیہ ضرور چاہیے ع

آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

——— اللہ کرے زور قلم اور زور پریس بہت ہی زیادہ۔ ساری دعائیں۔ انشاء اللہ اس جنگ میں آپ ہیں پیچھے نہیں پائیں گے۔

(مطلب یہ کہ جب مڑ کر دیکھیں گے تو ہم نہیں ہوں گے۔ خدا نہ کرے)

رؤف پاریکھ کراچی

برادرم گرامی قدر مصطفیٰ کمال صاحب۔ خلوص و نیاز

شگوفے کی سلور جوبلی مبارک ہو! ع

تو زندہ باد شادمان و کامران و جاوداں!

وجاہت علی سندیلوی

شگوفے کی سلور جوبلی مبارک۔ آپ واقعی قابل ستائش ہیں کہ آپ نے شگوفہ کو زندہ رکھنے کے لیے اسے واقعی اپنا خونِ جگر دیا ہے ورنہ اتنے دور میں اچھے اچھے رشیئے پرچے بھی دم توڑتے نظر آ رہے ہیں۔

شاغل ادیب حیدرآباد

پیارے بھائی مصطفیٰ کمال صاحب!!

شگوفہ کا سلور جوبلی نمبر قدرے تاخیر سے ملا۔ دل خوش ہو گیا۔ بھائی آپ لوگوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ ہزاروں دقتوں کے باوجود اتنا خوب صورت اور عمدہ نمبر اتنی کم مدت میں نکال دیتے ہیں اور یہ آپ ہی لوگوں کے دل گردے کا کام ہے۔ بھائی مجتبیٰ حسین کا خراج عقیدت یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی کے موقع پر لا جواب اور بےمثال ہے۔ ایسے اعلیٰ ظرف کے لوگ اب کہاں ہیں جو خود دوسروں کی عظمت کے گن گائیں۔ جیلانی بانو، مسیح انجم، عابد معز، عاتق شاہ کی چیزیں پسند آئیں۔

انوار انصاری، رانچی

شگوفہ سلور جوبلی نمبر کی شاندار اجرائی کی رپورٹ اخبارات میں پڑھ کر آپ کو مبارک باد دینا ہی چاہتا تھا کہ شگوفہ کا سلور جوبلی نمبر نظر نواز ہو گیا۔ یہ نمبر بھی حسب روایت جامع اور وسیع ہے۔ تاہم چند معروف قلم کاروں کی تخلیقات میں طنز و مزاح برائے نام ہے۔ خشک اور سنجیدہ تحریریں بھی بعض وقت شگوفہ میں شاید اس لیے جگہ پاتی ہیں کہ ان تخلیقات کے خالق معروف اور ممتاز مزاح نگار کہلاتے ہیں۔ اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ شگوفہ نے نئے فن کاروں کی جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا آپ کے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی۔ شگوفہ کے ۲۵ سالہ جشن کے لیے بہت بہت مبارک باد۔

منظور وقار، گلبرگہ

مکرمی، خوب صورت اور ضخیم سوونیر کے بعد سلور جوبلی شمارہ ملا۔ اب شاید شعری انتخاب آنے والا ہے۔ اس قدر پابندی سے آپ دل چسپ شمارے شائع کر رہے ہیں، جس کی صحافت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب شگوفہ [illegible]

[illegible]

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

۲۵ سالہ شعری انتخاب

مہمان مدیر: سید عبدالقدوس

مدیر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد: ۲۷
شمارہ: ۴
اپریل ۱۹۹۴ء

ایڈیٹر اوورسیز: عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (جدہ)
سعید شوکت (ریاض)
ایس۔ایم۔حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

مجلس ادارت:
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین کمیتی

سرورق: طالب خوندمیری
کتابت: محمود سلیم۔ محمد غالب اور فضل محمد
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار
خط و کتابت کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فی پرچہ: ۱۵ روپیہ
سالانہ قیمت: ۸۵ روپیہ
بیرونی ممالک سے: ۲۰ ڈالر

فون آفس: 595716 مکان: 521064

نیک تمناؤں کے ساتھ

آندھرا پردیش وقف بورڈ

رزاق منزل، باغِ عامہ نام پلی حیدرآباد

محمد لائق علی خاں
اسپیشل آفیسر

میر کمال الدین علی خاں
معتمد

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

(سلسلہ...)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا...

(اداریہ)

'شگوفہ' کی ۲۵ سالہ فائلوں سے شعری انتخاب پیش ہے۔ ۹۰ سے زائد شاعروں کا کلام اس خصوصی شمارہ میں شامل ہے۔ بعض نام یقیناً چھوٹ گئے ہیں۔ لیکن ضخامت میں اضافہ سے بیرونِ ملک ترسیل کا مرحلہ دشوار ہوجاتا، اس لیے زیرِ نظر انتخاب پر اکتفا کرنا پڑا۔ منتخب شعراء کا کلام ۲۵ سال کے مختلف شماروں میں پھیلا ہوا ہے۔ ان شعرا کی شخصیت و فن تمام تر کوشش کے باوجود مواد جمع نہ ہوسکا۔ یہ مناسب نہ تھا کہ صرف چند شعرا کا تفصیلی تعارف شائع کیا جاتا۔ ہمارا خیال ہے کہ آئندہ ہر شمارہ میں کسی ایک مزاح نگار کا تعارف منتخب تخلیق کے ساتھ شائع کریں تاکہ تخلیق کاروں کے تعلق سے کچھ تفصیلات محفوظ ہوسکیں۔

'شگوفہ' کا یہ شعری انتخاب ہم عصر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے مزاج کا غماز ہے۔ طنز و مزاح نگاروں نے تمام اصناف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا ہے۔ نظمیں کم لکھی گئیں لیکن سنجیدہ شاعری کے مقابلے میں مزاحیہ نظم نگاری کا پلّہ مزاحیہ غزل سے بھاری نظر آتا ہے۔ گھسے پٹے موضوعات پر شعر کہنے کے الزام کو رَد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سماج کی بے شمار برائیوں اور بے اعتدالیوں کی نشان دہی کے فرض سے مزاحیہ شاعر غافل نہیں۔ موضوعات میں تنوع تو ہے لیکن نئے شعرا، موثر، فصیح اور دل کو چھونے والی زبان کے استعمال پر قادر نظر نہیں آتے۔ زبان کی خوبی اور فنِ شعر سے زیادہ صرف مزاح پیدا کرنے پر اُن کی توجہ مرکوز ہے۔ شگوفہ کا یہ انتخاب یقیناً طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ارتقا پر بحث کا دروازہ کھولتا ہے۔ شگوفہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ہم قارئین کی خدمت میں یہ دلچسپ انتخاب پیش کرتے ہوئے ازحد خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس شمارہ کے مہمان مدیر جناب سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود ۲۵ سالہ فائلوں کا جائزہ لے کر انتخاب کی اشاعت میں اپنا حصّہ ادا کیا۔

— روزنامہ 'منصف' کے مدیر اعلیٰ جناب محمود انصاری کا پچھلے ہفتہ ریاض میں بعارضۂ کینسر انتقال ہوگیا۔ محمود انصاری کو بچپن سے اردو زبان اور صحافت سے لگاؤ تھا۔ بی۔ٹیک کی تعلیم چھوڑ کر اردو صحافت کے خار دار میدان میں وہ کود پڑے تھے۔ بڑے خلوص و لگن کے ساتھ انھوں نے اردو صحافت میں اپنی راہ الگ نکال لی تھی۔ ادیبوں، فن کاروں اور شاعروں کے وہ عاشق تھے۔ 'شگوفہ' سے انھیں خاص دلچسپی تھی اور ہمیشہ اس رسالہ کی ترقی کے وہ متمنی رہے۔

— ممتاز مزاحیہ شاعر بگڑ رائچوری کا گزشتہ مہینے انتقال ہوگیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے کامیاب شاعروں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ جب بھی حیدرآباد آتے 'شگوفہ' کے دفتر پر کچھ وقت ضرور گزارتے تھے۔

خدا سے دعا ہے کہ مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ENTRANCES

M COM MCA MBA MA

LFJC & APRJC

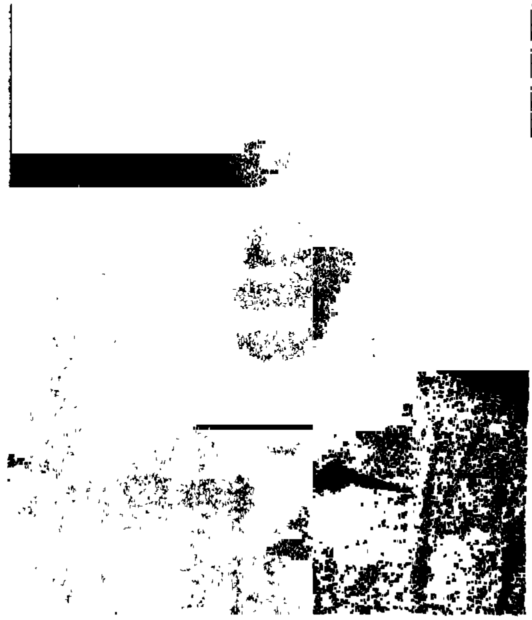
MBBS (DESCRIPTIVE TYPE) Mt GANDHI INSTITUTE OF MED Sc
[LAST DATE 10 APR.]

KCET PAYMENT SEAT ENG 7433 MBBS 1361
BDS 1075 PHARM 1055 NURSY 245

EAMCET FROM 11th APRIL
ENG / Tel Media Oral / Postal Coaching

RAO'S TUTORIALS

BANK STREET, HYDERABAD - 195
Ph. 590577 / 43859



رضا نقوی واہی

سلیمان خطیب



میر گیان چند

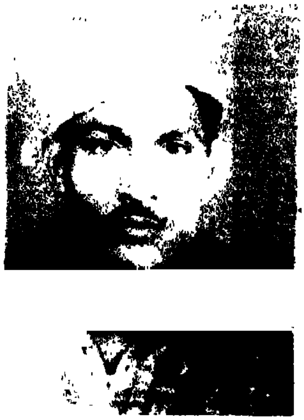




گلی نلگنڈوی



مصطفیٰ علی بیگ



بلال سیوہاروی

اشرف خوندمیری



بگڑ رائچوری



گڑبڑ حیدرآبادی





خالد عرفان



رشید سمیع جلیل



پاگل عادل آبادی



فیض الرحمن فیض



بمباٹ حیدرآبادی



بوگس حیدرآبادی



دلیپ سنگھ



ڈاکٹر محبوب راہی مفلس

برق آشیانوی



ناظم انصاری

اسمٰعیل ظریف





سرپٹ حیدرآبادی



نرگس سہسوانی



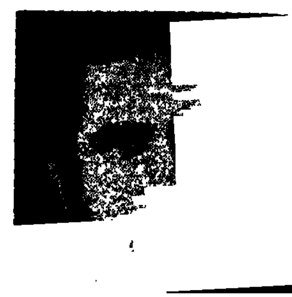
طالب خوندمیری



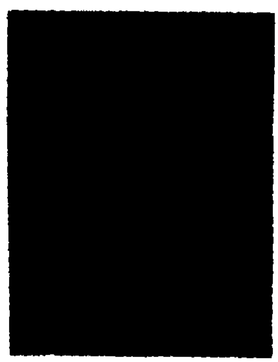
خواہ مخواہ



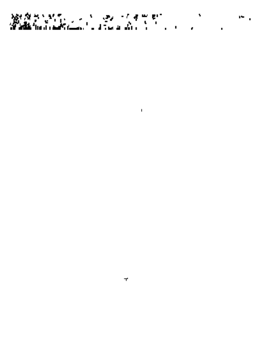
اعجاز الدین پاٹلہ



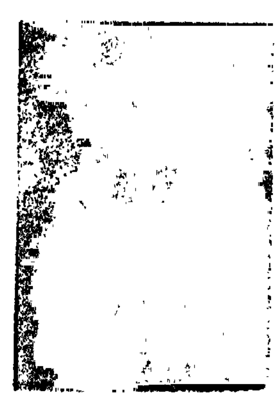
مقرب حسین



جگر نظام آبادی



ڈاکٹر راہی قریشی



یونس اعجاز



اقبال شانہ



اقبال ہاشمی



حمایت اللہ

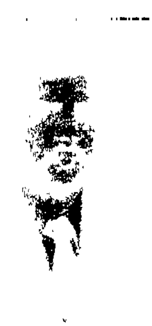


نسیم سحر

مرزا سلطان بیگ



سراج منیر



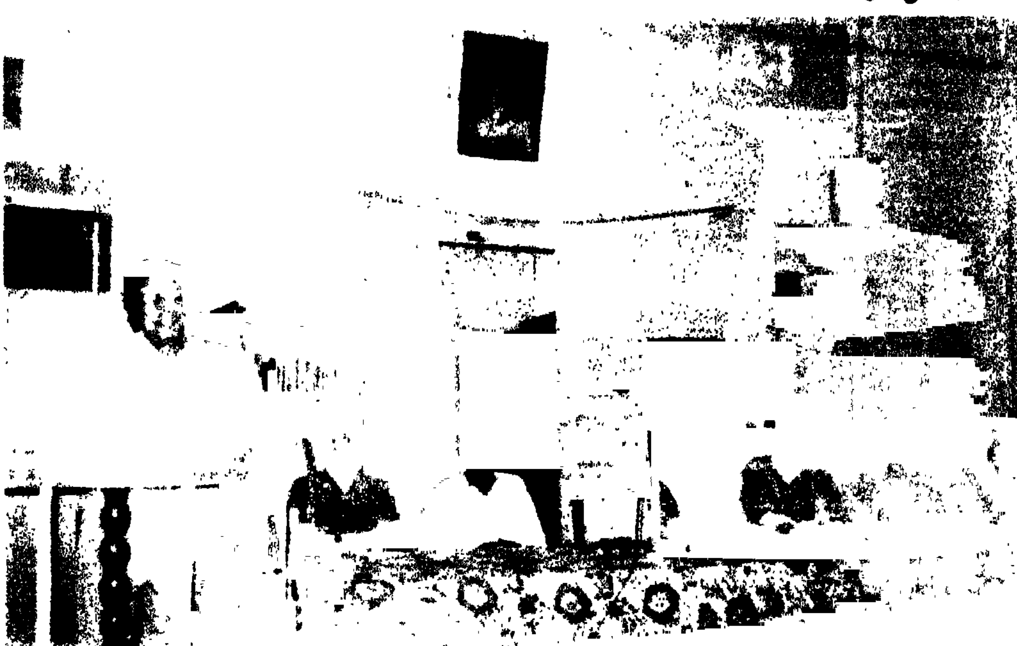
روف رحیم



مشتاق شاد



شگوفہ کی سلور جوبلی پر ریاض میں شام شگوفہ تقریب کا انعقاد (دائیں سے بائیں) جناب محمد عاقل جناب عبدالقدوس غوری، جناب سہیل فلکی، جناب احمد عبدالعلیم اختر، جناب ستیہ پال آنند، جناب سکندر علی خاں۔ جناب محمد اکرم جناب عیسیٰ خاں



شگوفہ کے سلور جوبلی شمارہ کی رسم اجرا۔ (دائیں سے بائیں) عابد معز، جناب سید رحمت علی صدر اردو اکیڈیمی جناب نریندر لوتھر، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، پروفیسر غیاث متین اور مائک پر طالب خوندمیری

آندھرا پردیش اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/C سیکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ - عابڈز - حیدرآباد - 1

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرضہ جات دو اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت 10,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لئے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لئے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کیلئے قرض جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اسکو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے۔ اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

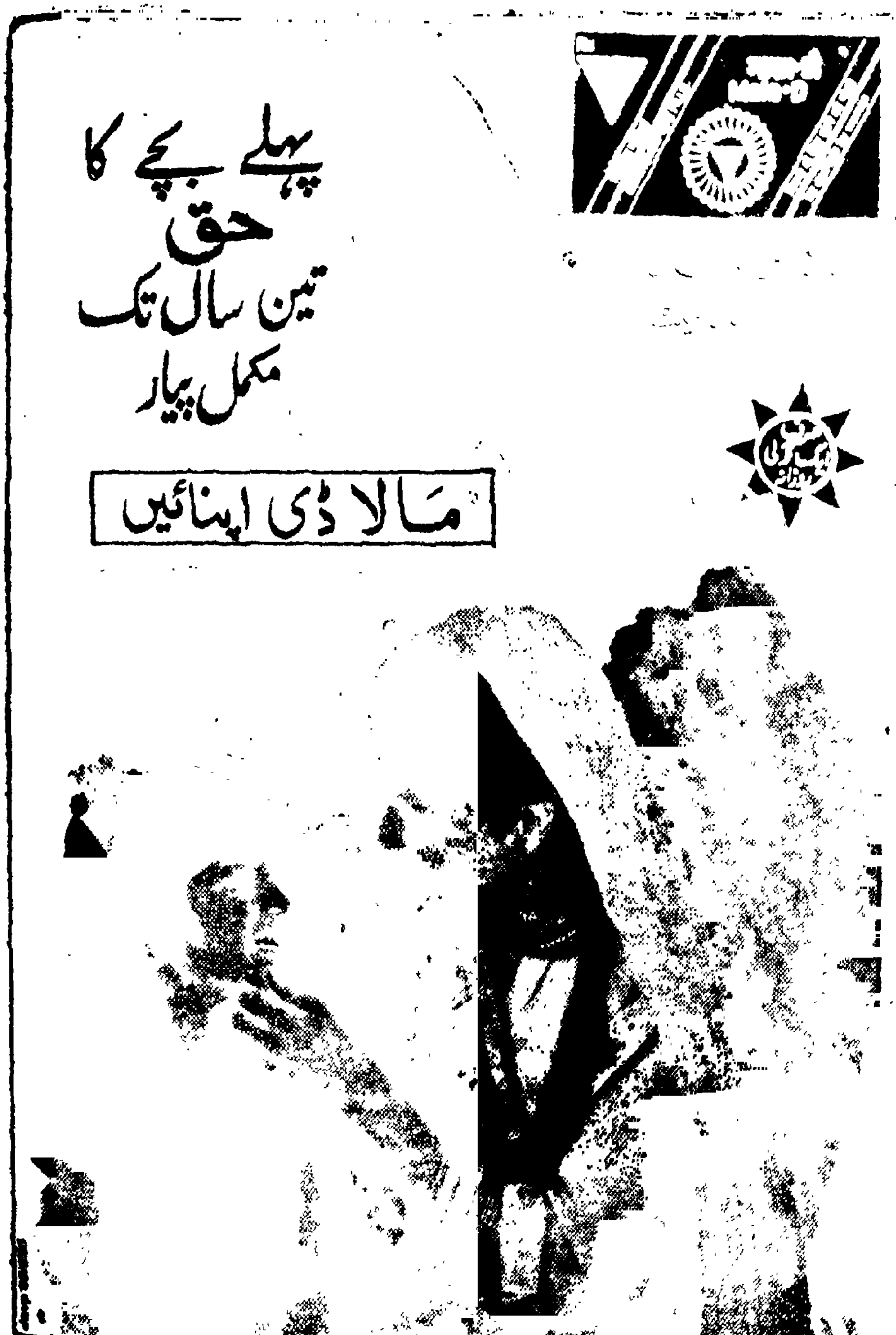
(2) خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کیلئے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کیلئے آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹورس وغیرہ وغیرہ کے لئے قرض دیئے جاتے ہیں اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۱۹۹۳ء تک 47210 افراد میں 8,52,16,000 روپئے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 36,44,81,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 61,000 لاکھ روپے مارجن منی قرض جسکی جملہ لاگت 4,04,68,000 روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔ اسطرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 85ء سے اب تک 50104 افراد میں 9,53,33,000 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 40,49,49,000 روپے ہوتی ہے۔ جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گذشتہ سال سے اقلیتی طبقے کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گذشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اسکو اس سال توسیع دے کر نظام آباد گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئیگا۔ جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے حیدرآباد میں 13 ہنر سکھانے کے لئے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر 28 کو ٹائپ رائٹنگ 100 کو لائٹ موٹر ڈرائیونگ 11 کو لیب ٹکنیشن 7 کو بیوٹیشن 11 کو شارٹ ہینڈ 10 کو الکٹریشن 5 کو ٹیلرنگ 13 کو ویڈیو گرافی 15 کو فیبریکیشن 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ 5 کو ہیرے تراشنا 6 کو کارپنٹری کی تربیت دی جائے گی - گنٹور میں 218 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح اس سال جملہ 1186 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

● خواہشمند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں -

محمد لائق علی خاں (مینجنگ ڈائرکٹر)


پہلے بچے کا
حق
تین سال تک
مکمل پیار
مالا ڈی اپنائیں

پروفیسر گیان چند
(دکن)

منظوم شگوفے

اِنسان کی جہاں اور بہت سی تعریفیں ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہنسنے والا جانور ہے۔ انسان کے علاوہ اور کوئی جانور خندہ نہیں کرتا۔ ہاں میں نے اس سے ملتا جلتا بے صدا حیوانی اظہار نشاط دیکھا ہے۔ مچھلی کی ایک قسم ڈولفن (DOLPHIN) ہوتی ہے۔ امریکہ میں پانی کے بڑے ٹینک میں اس کے تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ چار پانچ فٹ کی ڈولفن طرح طرح کے کرتب دکھاتی ہے۔ پانی کے اوپر بندھی رسّی کو پھلانگتی ہے، ٹینک کے کنارے پر کھڑے ناظرین میں سے کسی لڑکی کے رخسار کا بوسہ اچھل کر لے لیتی ہے اور جب تماشائی ہنس کر تالیاں بجاتے ہیں تو ڈولفن بھی ٹینک کے باہر کنارے پر بیٹھ کر اپنے دو اگلے ہاتھ جیسے پاؤں سے، بالکل اسی طرح تالیاں بجاتی ہے جیسے انسان۔ گویا وہ بھی اپنے طریقے سے ہنستی ہے۔ امریکہ کے مختلف مقامات پر میں نے یہ شو بارہا دیکھا ہے۔ بے زبان حیوانوں میں ایسا زندہ دل بلکہ مسخرہ جانور دوسرا نہیں دیکھا۔

گرونانک نے کہا تھا، نانک دُکھیا سب سنسار۔ ہر زمانے میں آدمی کو کشمکش، کشاکش، مسابقت، مزاحمت، ہزیمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن موجودہ شہری صنعتی تہذیب میں کھنچاؤ اور ذہنی تناؤ کچھ زیادہ ہی ہے۔ مجھ جیسا انسان جو ہر قسم کی تشویشوں اور پریشانیوں سے مبرّا ہے۔ وہ بھی صبح کو جب اخبار پڑھتا ہے، ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں سنتا ہے تو خواہ مخواہ کی اُلجھن اور پیچ و تاب مول لیتا ہے۔ نفسیاتی تناؤ کے تدارک کے لیے مزاحیہ ادب سے بہتر دوا نہیں۔ یہ نسخہ کم خرچ و بالانشیں ہے۔ گاہے گاہے مزاح کی بارہ دری میں تشریف لاتے رہیئے۔ مزاحیہ نثر ہو کہ شاعری اسے محض ہنسنے ہنسانے کی چیز نہ سمجھیئے، یہ ہم عصر زندگی کا آئینہ ہے۔ تنقید و تبصرہ ہے لیکن یہ تبصرہ ہوتا ہے۔ میٹھی چھری کی طرح کہ اس سے خلش نہیں ہوتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب میں مزاحیہ شاعری، مزاحیہ نثر سے پہلے آئی۔ دکنی شاعری میں ریختی میں شگفتگی و شوخ بیانی ملتی ہے۔ تلاش کرنے پر غزلوں میں بھی کچھ ایسے شعر مل سکتے ہیں جو زیرِ لب تبسم کو اُکسا سکیں لیکن دکنی نثر بسم اللہ کے گنبد میں بند رہی اور اس گنبدِ بے در میں طنز و مزاح کا گذر نہیں۔ شمالی ہند میں کند چھری سے کاٹ کرنے والا طنز و مزاح کا پہلا شاعر جعفر زٹلی ہے۔ پہلی مزاحیہ نثر شاہ حاتم کی "نسخۂ مفرّح الضحک" ہے۔ زٹلی ہی کے دو شاگردانِ معنوی اٹل مارنول اور خواجہ عطا بانکہ ہیں۔ ان کے بعد اور اکبر الٰہ آبادی سے پہلے ذیل کی اصنافِ سخن میں طنز و مزاح کے وافر نمونے ملتے ہیں۔

۱۔ ہجو جس میں سودا، میر ضاحک، انشا اور مصحفی وغیرہ ممتاز ہیں۔
۲۔ ریختی جس کے اہم شاعر رنگین، انشا اور جان صاحب ہیں۔
۳۔ غزل میں شیخ و زاہد اور رقیب کا استہزا۔ غالب نے تو نہ صرف محبوب سے بلکہ خدا تک سے شوخی کی ہے۔
۴۔ ہزل مثلاً دیوانِ چرکیں
۵۔ ہرشیہ جو مرثیے کی ہزلیہ شکل ہے، اس میں دشمنانِ اہلِ بیت کی ہجو کی جاتی ہے۔
۶۔ فحش نگاری۔ ان میں فحش عناصر سے قطع نظر مزاح کا عنصر بھی ہوتا ہے مثلاً رفیع احمد خاں لکھنوی کا غیر مطبوعہ کلام، شمال کے ریختی گویوں کی فحاشی۔
۷۔ حالیہ اینٹی غزل

یہ سب ستزاد ہیں باضابطہ مزاحیہ شاعری پر جس کے صاحبقراں اکبر الہ آبادی اور نائب امیر المومنین ظریف لکھنوی ہیں۔ ان کے مقلدین میں سید محمد جعفری، ضمیر جعفری، مجید لاہوری، رضا نقوی واہی، دلاور فگار اور ہلال سیوہاروی ممتاز ہیں لیکن کسی ایک مرکز سے اتنے مزاح نگار نہیں اُگے جتنے بلدہ فرخندہ بنیاد سے، جو زندہ دلان حیدرآباد کا دارالخلافہ ہے۔ نومبر ۱۹۶۸ء کیا مبارک مہینہ تھا کہ اس میں زندہ دلان نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا اور اُسے نام بھی "شگوفہ" دیا۔ یہ شگوفہ تب سے شگفتہ ہو رہا ہے لیکن کھلتا نہیں، فلمی دنیا کے بعض سدا بہار ہیروؤں کی طرح تروتازہ ہے۔

اردو کے مزاحیہ رسالوں میں صرف دو تاریخ ساز ہیں: "اودھ پنچ" اور "شگوفہ"۔ جس طرح چھتنار درخت کے سائے میں چھوٹے پودے نہیں پنپتے، اسی طرح شگوفہ نے مزاح کے میدان میں وہ اجارہ داری کرلی ہے کہ ہند و پاک میں کوئی دوسرا قابلِ ذکر مزاحیہ ماہ نامہ ہے ہی نہیں۔ اس کے مدیر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کا یہ کمال ہے کہ انھیں رسالہ کا سلور جوبلی نمبر نکالنے کا موقع ملا۔ نس بندی کے اس فرخ دور میں ۲۵ سال تک تخلیق کرتے کراتے رہنا کوئی معمولی اکتساب نہیں۔ اردو کے رسالوں میں طفلانہ وفات کاری کی شرح بہت اونچی ہے۔

ہندو روایات میں مثالی عمر کو چار ادوار میں بانٹا گیا ہے جن میں پہلے ۲۵ سال برہمچاریہ کے اور اگلے ۲۵ سال گرہستی کے ہوتے ہیں۔ مجرد گاہ کے اکلوتے نے برہمچاریہ کا عہد تو خوش اسلوبی سے پورا کرلیا۔ امید کہ اگلا دور بھی ایسا ہی بارآور ہوگا۔ میں پروفیسر راہی قریشی کی آواز میں آواز ملا کر کہتا ہوں:

سائے میں مصطفےٰ کے یہ مصطفےٰ ہو راہی
جاری رہے شگوفہ اکیسویں صدی میں

'شگوفہ' کی فہرستِ عنوانات خوش طبعی کا سب سے دل نشین اظہار ہے۔ کسی اور رسالہ کو یہ نہ سوجھی ہوگی کہ فہرستِ مضامین کو بھی ادب پارہ بنا دے۔ معلوم نہیں یہ اصطلاحیں کس زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں:

اڑیں گے پرزے   یعنی خاکہ

مالِ مفت	انشائیے
مالِ مسروقہ	ڈائجسٹ
دخل در نامعقولات	ڈرامہ
قاضی جی دُبلے	رپورتاژ
ایسی کی تیسی	تنقید
بال کی کھال	تبصرہ
جُگدرن	نظمیں
خرافات	مراسلے
پھر ملیں گے اگر خدا لایا	اداریہ

حیدرآباد میں مولوی وحیدالدین سلیم نے وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ لکھی تھی۔ شگوفہ نے وضع اصطلاتِ مزاحیہ میں گُل کھلائے۔ آڑیں گے پُرزے، بال کی کھال، ایسی کی تیسی اور قاضی جی دُبلے کی داد کو کہاں سے الفاظ لاؤں۔ شگوفہ خرافات (مراسلوں) کی ہمت افزائی نہیں کرتا لیکن زندگی میں اور رسالے میں قدرے خرافات بھی چاہیئے۔ اداریئے کو سب سے آخر میں بٹھانا بھی شگوفہ کی جدت ہے تاکہ حرفِ آخر پہ اس کا حق محفوظ رہے

مزاح نگاری، سنجیدہ تخلیق سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ غزل کہنا آسان ہے، مزاحیہ غزل کہنا، ناکوں چنے چبانا ہے اور وہ بھی لوہے کے۔ مزاحیہ غزل میں دو تین شعر اِنشراحِ صدر کرسکیں گے تو بقیہ اِنقباضِ طبع کا باعث ہوں گے۔ آپ جانیں نہ جانیں، میں جانتا ہوں کہ قبض اُمّ الامراض ہے۔ مزاح نگار شاعر اگر باچھیں زیادہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ابتذال کے مین ہول (MAN HOLE) میں نہ گر پڑے جہاں دیوانِ چرکین کا وِرد کرنے کو مجبور ہونا پڑتا ہے۔

شگوفہ نثری مزاح میں جس بلند معیار کو چھو سکا ہے، شعری مزاح میں اِتنا نہیں۔ قصور رسالے کا نہیں سخنوروں کا ہے۔ پورے اردو ادب میں، نثر میں جتنے جغادری طنز و مزاح نگار ہوئے ہیں، نظم میں نہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد ہی میں دیکھ لیجئے، ایک سے ایک بین الاقوامی شہرت کا انشائیہ نگار بھرا پڑا ہے لیکن شاعر اُس معیار کے کہاں؟ شاید میرے اس شکوے کو شگوفہ کا ۲۵ سالہ شعری انتخاب باطل کردے۔ میں اشتیاق کے ساتھ ڈالیے کے لیے چشم بہ پھاٹک ہوں۔ ویسے مجھے یہ ماننے میں کوئی تکلف نہیں کہ شگوفہ کے ہر شمارے میں کافی مزاحیہ اشعار ایسے دکھائی دے جاتے ہیں جو مزاح کے منتخب گلدستے میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔

میری تمنا ہے کہ شگوفہ کا مزاحیہ شاعری کا انتخاب اس صنف کا معیاری انتخاب ثابت ہو۔

۸۸

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

"شگوفہ" — سلور جوبلی پر ایک جائزہ

"اودھ پنچ" سے لے کر "شگوفہ" تک طنز و مزاح سے علاقہ رکھنے والے بلاشبہ کئی رسائل اور جرائد شائع ہو چکے ہیں اور بعض ان میں بلا مبالغہ اونچی حیثیت بھی رکھتے ہیں لیکن اردو کے تعلق سے ہمارے معاشرہ میں جو عمل اور ردِ عمل جاری ہے اس سے صحافت بھی متاثر ہو رہی ہے۔ سرکاری سطح پر اردو کے تعلق سے جو سلوک کیا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں اردو روٹی روزگار سے منسلک نہیں رہی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ خود اردو والے اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے دور رکھتے جا رہے ہیں۔ نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب —— اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں غریب غرباء کے بچے ہی زیادہ شریک ہوتے ہیں۔ یہاں ان حالات کا تجزیہ کرنا میرا مقصود نہیں، عرض کرنا صرف یہ ہے کہ ان پیچ و خم کا صحافت پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔ اردو روزناموں کی اشاعت کم ہے۔ ہفتہ واروں کا بھی یہی حال ہے اور ماہنامے تو بہت کم ہیں۔ سنجیدہ اور ادبی ماہناموں کا حال تو آپ ہم سب جانتے ہیں، پابندی سے شائع ہونے کا کیا سوال؟ یہ کبھی کبھی شائع ہو جائیں، یہی بہت ہے اور ہو بھی یہی رہا ہے۔

"شگوفہ" طنز و مزاح کا جریدہ ہے لیکن ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال اس کو بڑی سنجیدگی سے شائع کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور نہایت پابندی کے ساتھ! —— یہ کہنے میں مجھے ذرہ برابر بھی تکلف نہیں اور نہ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ ہے کہ "شگوفہ" انگلیوں پر گنے جانے والے ان چند جرائد میں شامل ہے جو ہر ماہ نہایت پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ اردو صحافت کی کساد بازاری کے اس دور میں یہ بہت بڑی بات ہے۔ "شگوفہ" کا پہلا شمارہ، نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا اور اس (۲۵) سال کے عرصہ میں حیدرآباد میں جانے کتنی مرتبہ فسادات ہوئے۔ کتنی مرتبہ کرفیو کا نفاذ ہوا اور کیا کچھ ہنگامے رہے لیکن "شگوفہ" کی اشاعت میں (چند ایک دنوں کی دیر سویر ہوئی ہو) ایسا کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری بات ایک اور: ہمارے ہاں بعض اخبارات ایسے بھی ہیں جو شروع میں روزنامے تھے بعد میں ہفت روزہ کے بطور شائع ہونے لگے، ماہنامے، سہ ماہی ہو گئے اور ان دنوں جرائد کے سہ ماہی اور ششماہی کا تو رواج سا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے مالی دشواریاں، کاغذ کے حصول میں مشکلات اور پھر مواد کی فراہمی وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو اخبارات اور رسائل کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن "شگوفہ" کے تعلق سے صورتحال اس کے بالکل برعکس رہی۔ "شگوفہ" کی ابتدا دیڑھ ماہی اساس پر ہوئی تھی لیکن

اس کو جلد ہی ماہنامے میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اظہار ہے اس امر کا کہ "شگوفہ" نے جہاں پڑھنے والوں میں مقبولیت حاصل کی طنز و مزاح نگاروں میں بھی لکھتے رہنے کے جذبات کو فروغ دیا۔

آج طنز و مزاح نگاروں پر نظر ڈالئے۔ وہ طنز و مزاح نگار جو آج اگلی صفوں میں یا پیچھے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں ان میں کئی ایسے ہیں جنھوں نے یا تو "شگوفہ" سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا یا کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی کو نکھارنے اور ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں "شگوفہ" نے امتیازی اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میرا مقصود فہرست سازی نہیں لیکن اس سلسلے میں چند ایک نام ضرور لیتا چلوں گا۔ پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم، سرور جمال، طالب خوندمیری، فیاض احمد فیضی، حلیمہ فردوس، حبیب ضیاء، لئیق صلاح، اسرار جامعی، عابد معز، لطف الرحیم اور منظور وقار وغیرہ۔!

قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ "شگوفہ" کو اپنے عہد کے صفِ اول کے لکھنے والوں کا ادبی تعاون حاصل رہا ہے۔ اس سے "شگوفہ" کے غیر معمولی ادبی معیار، اس کے وقیع اور وزن و وقار کے حامل ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ "شگوفہ" کی مجلس ادارت میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جیسی دیو ہیکل ادبی شخصیات شامل ہیں۔ بلا شبہ یہ وہ اصحاب ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ میں گرانمایہ حصہ ادا کیا ہے اور جہاں تک قلمی تعاون کا سوال ہے ان دو اصحاب کے علاوہ اور بھی ایسی شخصیات نے "شگوفہ" میں لکھا ہے جن کو اردو طنز و مزاح کی آبرو کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً کنہیا لال کپور، یوسف ناظم، دلاور فگار، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، رضا نقوی واہی، سید ضمیر جعفری، عطاالحق قاسمی، ہلال سیوہاروی، ساغر خیامی وغیرہ۔ دینر گیان چند جین، جیلانی بانو، قمر رئیس، سہیل عظیم آبادی، نظیر صدیقی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، اور رفیعہ منظور الامین وغیرہ نے بھی "شگوفہ" کے لئے لکھا۔

"شگوفہ" نے نہ صرف ایسے صف اول کے اہل قلم افراد کی تحریریں حاصل کیں بلکہ برصغیر کے دیگر جرائد سے ڈائجسٹ کرتے ہوئے طنز و مزاح کے معیاری فن پاروں کو اپنے قارئین تک پہنچایا۔ اس خصوص میں پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو اپنے صفحات پر جگہ دیتے ہوئے "شگوفہ" نے گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ یہ بات اس پس منظر میں اور اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ بوجوہ پاکستان کے رسائل اور کتب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ ایسے پاکستانی فنکاروں میں مشتاق احمد یوسفی، ابراہیم جلیس، کرنل محمد خان، ضمیر جعفری، شفیق الرحمٰن اور ابنِ انشا وغیرہ کی تخلیقات "شگوفہ" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

خاص نمبروں کی اشاعت بھی میرے نزدیک "شگوفہ" کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ ان دنوں جب کہ اردو جرائد اپنے عام شمارے ہی جوں توں شائع کرتے ہیں۔ خاص نمبروں کی اشاعت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ "شگوفہ" بلا شبہ ان دو، تین ہندوستانی جرائد میں ہے جو اپنے خاص نمبر نہایت آن بان کے ساتھ اور ظاہری معنوی طور پر غیر معمولی معیاری شائع کرتا ہے۔ "شگوفہ" کا پہلا خاص نمبر "حیوانِ ظریف غالب نمبر" ہے جو مارچ۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی جو دعوت طنز و مزاح دیتے ہیں۔ اسی طرح "شگوفہ" نے ادھر اپریل ۱۹۸۶ء میں اکبری اقبال کو متعارف کراتے ہوئے اپنا "اقبال نمبر" شائع کیا جس میں اقبال کی حیات اور شاعری کے شگفتہ اور طنز و مزاح کے حامل گوشوں پر مختلف اصحاب قلم نے روشنی ڈالی۔

پیروڈیاں، اردو میں لکھی گئی ہیں، نظم اور نثر دونوں میں بہت زیادہ، لیکن صنفِ پیروڈی پر فنی زاویے سے اور اردو میں پیروڈیوں پر بہت کم کام ہوا ہے۔ سبب کچھ بھی ہو حقیقت یہی ہے۔ "شگوفہ" نے آج سے (۱۹) سال قبل ستمبر ۱۹۷۲ء میں "پیروڈی نمبر" شائع کیا۔ یہ پیروڈی نمبر اپنے طور پر انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ جس میں

طبعزاد اور غیر طبعزاد پیروڈیوں کا انتخاب اور پیروڈیوں پر مضامین وغیرہ ہیں۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا بے مثال کام ہے۔ اسی طرح جنوری، فروری ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ "شگوفہ" کا ڈرامہ نمبر بھی اپنا جواب آپ ہے اور اردو دنیا کو ایک خوبصورت تحفہ۔ اس ڈرامہ نمبر کے مہمان مدیر ساگر سرحدی رہے ہیں۔ اس خصوصی اشاعت میں ہندوستانی اور بیرونی مختلف زبانوں میں ڈرامہ نگاری مختلف زبانوں کے ڈراموں کا انتخاب، ان کا تنقیدی جائزہ اور ڈرامہ کے تعلق سے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مواد دیکھا جاسکے گا۔ یہی حال ہندوستانی مزاح نمبر کا ہے جس کے مہمان مدیر یوسف ناظم ہیں۔ یہ دستاویزی نمبر جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جس میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں، پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ، عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ، منتخب مزاحیہ مضامین اور مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی وغیرہ وغیرہ ہے ـــــ ہندوستانی مزاح نمبر، اردو دنیا کو شگوفہ کی دین کہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں نومبر ۱۹۷۷ء میں تخلص بھوپالی نمبر ابراہیم جلیس کے انتقال پر مئی ۱۹۷۸ء میں ابراہیم جلیس نمبر جنوری ۱۹۸۱ء میں کنہیا لال کپور نمبر اور نومبر ۱۹۸۷ء میں مجتبیٰ حسین نمبر اپنی اپنی نوعیت کی بھرپور اور دلکش خصوصی اشاعتیں ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ ہمارے کتب خانوں کی زینت رہیں گی۔ مزید برآں مارچ ۱۹۷۷ء کا شمارہ بیاد کرشن چندر، نومبر ۱۹۷۸ء کا شمارہ بیاد سلیمان خطیب، دسمبر ۱۹۸۰ء کا شمارہ بیاد سرور ڈنڈا اور جنوری ۱۹۸۵ء میں "گوشہ راجندر سنگھ بیدی" کی اہمیت کبھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال جب بھی کسی خصوصی اشاعت کا ارادہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ اولاً وہ اشاعت کے موضوع کی مناسبت سے عنوانات طے کرلیتے ہیں اور پھر ان عنوانات پر ایسے افراد کو دعوتِ تحریر دیتے ہیں جن کو ان پر ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی سبب ان کے خاص نمبر نہ صرف ظاہری طور پر دلکش اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں بلکہ علمی و ادبی سطح پر بھی اونچی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر حلقہ میں قبولیت عام پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال جنوری میں شائع ہونے والے سالنامے تو اپنے طور پر ممتاز مقام کے حامل ہوتے ہی ہیں۔

"شگوفہ" کے عام شماروں میں بھی طنزیہ و مزاحیہ شعری و نثری تخلیقات اور طنز و مزاح پر فکر انگیز مضامین ان کے وزن و وقار میں افزونی کا باعث ہوتے ہیں ـــــ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جب بھی موقع ہو ملک کے مختلف علاقوں (اور کبھی کبھی تو بیرون ملک) میں منعقد ہونے والی طنز و مزاح کی کانفرنسوں تقریبات اور ایسے ہی اجتماعات کی رپورٹیں "شگوفہ" میں شائع ہوتی رہتی ہیں اس طرح ہم قومی و بین قومی پیمانے پر طنز و مزاح کی رفتار سے باخبر رہتے ہیں۔

"شگوفہ" کا دفتر اپنے طور پر کسی ادبی تحقیقاتی مرکز سے کم نہیں۔ کم از کم جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جو طنز و مزاح کے فنکاروں اور موضوعات یا طنز و مزاح کے کسی پہلو پر کام کرتے ہیں "شگوفہ" کے دفتر میں ان کے لئے اتنا زیادہ مواد اور ایسی آسانی سے دستیاب ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے کام کا بڑا حصہ یہیں سے حاصل کرلیتے ہیں۔ "شگوفہ" کی خدمات اور اس کے ادبی معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے "شگوفہ" کی ادبی خدمات پر ایم فل کا مقالہ لکھا جاچکا ہے۔ عزیز ابرار نے خاصی محنت اور توجہ سے یہ مقالہ تسوید کیا تھا۔ انھیں ڈگری مل چکی ہے نیز حیدرآباد میں طنز و مزاح یا ایسے ہی کسی موضوع پر کام ہو "شگوفہ" کے بارے میں ایک آدھ باب یا کم از کم چند صفحات ضرور مختص کئے گئے ہیں۔ یہ بھی "شگوفہ" کو خراج تحسین ہے۔ اور اب تو یہ اور ایسے ہی کارناموں کی وجہ "شگوفہ" ایک جریدہ نہیں، ایک ادارہ بن چکا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں "نگار" "نقوش" اور "ادب لطیف" وغیرہ جیسے جرائد اردو ادب کی تاریخ کا جز بن چکے ہیں "شگوفہ" نے بھی اپنی ایک تاریخ بنائی ہے اور اب اردو ادب کا وہ بھی ایک گراں بہا

اسمٰعیل آذر (کلک)

کیا مذاق ہے

شیطاں کو دے غلانے بشر کیا مذاق ہے
لاحول بھی پڑھے ہے ادھر کیا مذاق ہے

آتے ہیں وہ تو اس طرح آنا بھی کیا ہوا
ہیں چوکیدار ان کے پدر کیا مذاق ہے

کچھوے کی چال چلتی ہے گھنٹے میں آدھ میل
سرکاری بس پہ کرنا سفر کیا مذاق ہے

مجھ سے کتاب مانگ کے جانے کہاں گئے
آئی نہ رفتگاں کی خبر کیا مذاق ہے

پھٹ جائے رگ دماغ کی سن کر جدید نظم
رکھنا بچا کے اینٹ سے سر کیا مذاق ہے

دیکھیں جو آپ غور سے بندر ہیں آپ بھی
میری ہی دُم پہ کیوں نظر کیا مذاق ہے

آذر سا ہی کلام پہ ہے زعم آذری
پھوڑا ہے سر تو توڑی کمر کیا مذاق ہے

ستمبر ۸۷ء

دانتوں کی خصوصیات

سمجھو نہ سبھی دانت چبانے کے لیے ہیں
ایسے بھی ہیں ان میں جو دکھانے کے لیے ہیں

شفاف و چمک دار دکھانے کے لیے ہیں
جو میلے کچیلے ہیں چھپانے کے لیے ہیں

کچھ کھانے چبانے میں ہی مصرف نہیں ان کا
سردی کے زمانے میں بجانے کے لیے ہیں

کوکر ہی پریشر سے گلائیے نہ غذا کو
دانتوں کی یہ داڑیں بھی گلانے کے لیے ہیں

دو تین کے گرنے سے جو کھل جاتی ہیں راہیں
وہ راہیں فقط رال بہانے کے لیے ہیں

طوفاں کی طرح اٹھتی ہوئی دل کی ترنگیں
دانتوں میں زباں رکھ کے دبانے کے لیے ہیں

عاشق کو کھڑا دیکھ کے ڈیوڑھی پہ یہی دانت
معشوق کی انگلی کو دبانے کے لیے ہے

ملتے ہوئے دانتوں سے چنے تو چبیں گے
یہ دانت تو تاکوں ہی چبانے کے لیے ہیں

نقلی بھی زمانے میں بڑی چیز ہیں پیارے
ہوئے جو بڑھاپا تو ہنسانے کے لیے ہیں

آذر تو سمجھتے تھے انھیں نیل کٹر ہی!
رخسار پہ نرمی سی جمانے کے لیے ہیں (اکتوبر ۸۷ء)

○

اپنی کمزوری کو دشمن پر نہ ہونے دو عیاں
ڈرتے ڈرتے ہی سہی دیتے رہو مونچھوں پہ تاؤ

نسخۂ مکھن سے جب پھسلے نہ پائے التفات
تو لگا کیلے کے چھلکوں کا بنا کر آزماؤ

عدو کے قصّے تو چلتے ہی رہیں گے عمر بھر
یار جانے بھی دو ان کو لاؤ اک بیڑی پلاؤ

اپنا کلا بھی الکشن جیت لے گا دیکھنا
سوئے جنتا پارٹی ہے اب کی جنتا کا جھکاؤ

منہ پہ انڈا مار کر میرے کوئی چلا اٹھا!
واہ وا کیا نظم ہے آذر اسے پھر سے سناؤ (دسمبر)

احمد سلطان (حیدرآباد)

دعوتیں پہلے اور اب

کوئی [illegible] میں جب بلاتا ہے — عہد ماضی کا یاد آتا ہے
[illegible] کیسے انساں تھے — ایک دل تھا ہزار ارماں تھے
[illegible] کا لمان کرا جاں — جا کے ہر گھر بلاتے تھے مہماں
آمد [illegible] پہلے آ کے جھکتے تھے — میز بانی میں گھر بھی بکتے تھے
دعوت یہ رہتی تھی نام ہو جائے — پورا شادی کا کام ہو جائے
سننی پڑتی تھی نانی دادی کی — لاکھ رسمیں تھیں ایک شادی کی
ہوتی دعوت برائے خاص و عام — شرکت عقد اور اس پہ طعام
صبح سے شام تک جو بکتا تھا — اس کو کھانے سے کون تھکتا تھا
ایک کے بدلے چار آتے تھے — بے حیائی سے ڈٹ کے کھاتے تھے
کیسے دن تھے وہ کیسی راتیں تھیں — ہر گھڑی دعوتوں کی باتیں تھیں
نا ذیہ کے شباب کی باتیں — ہو گئیں اب تو خواب کی باتیں
اب تو چھپتے ہیں رقعے ہی خالی — پینے ملتی ہے چائے کی پیالی
لوگ کم ہوں تو پوری پیالی ہے — ورنہ سمجھو کہ آدھی پیالی ہے
خوب صورت ڈزائن رقعہ کا — اور مضمون فائن رقعہ کا
خط کا مضمون ہے لفافے میں — اور کٹتی ہے رات فاقے میں
لسٹ میں جس کا نام ہوتا ہے — اسپیشل انتظام ہوتا ہے
خوب ان کو تپا کے رکھتے ہیں — یعنی پہروں بٹھا کے رکھتے ہیں
جب بہت لوگ ہوتے ہیں رخصت — تب کہیں ان کو دیتے ہیں زحمت
جب کہ ہو جاتے ہیں سبھی بیزار — پہلا دعوت کے ہوتے ہیں آثار
کیک بسکٹ مٹھائی اور کھارا — ہے پلیٹوں میں بس یہی سارا
صدقہ تھوڑا بہت سے شیطاں ہیں — یوں تو کہنے کو سب ہی انساں ہیں
ٹوٹ پڑتے ہیں سب پلیٹوں پر — جیسے بچے لڑیں سلیٹوں پر
جو ملا ہاتھ میں وہی گھٹ ہے — آنکھ کیا جھپکی سمجھو سب چٹ ہے
رسم بد تھی کی یا ولیمے کی — رہ گئی ہے جہاں کہیں باقی
رنگ رقعوں کا کچھ بدلتے ہیں — کارڈ چھوٹا سا اس میں رکھتے ہیں
کارڈ کی جس کو دید ہوتی ہے — اس کی دعوت میں عید ہوتی ہے

اسرار جامعی (دہلی)

اربابِ جدید

یہ دوست دوستی کے قابل نہیں ہے اب — جو بات ہم کہیں گے اس کی نفی کریں گے
ہوٹل میں بیٹھ کر یہ گپ بازیاں کریں گے — اس سے ملے کی فرصت تو شاعری کریں گے
شامی کباب کھانے کی ہوگی جب بھی خواہش — نو واردانِ ہوٹل سے دوستی کریں گے
اوڑھے رہیں گے ہر دم دانش کا یہ لبادہ — شعر و ادب نہیں تو تنقید ہی کریں گے
محفل میں گر بلایا تو جائیں گے اکڑ کر — مدعو کئے نہ جائیں تو عاجزی کریں گے
گز بھر بڑھا کے زلفیں باشانِ ہپیانہ — فرہاد اور مجنوں کی پیروی کریں گے
دو چار نوجوانوں کی انجمن بنا کر — جب بھی ملے گا موقع یہ لیڈری کریں گے
ان کی بڑی چہیتی انگور کی ہے بیٹی — اس کو گلے لگا کر یہ عاشقی کریں گے
اندازِ شعر خوانی بھی ان کا ہے نرالا — جب بھی پڑھیں گے غزلیں تو گا کے ہی پڑھیں گے
سگریٹ ہو کہ بیڑی جو مفت ہو میسر — پی پی کے بے تحاشہ یہ شاعری کریں گے
گھر پر منسٹروں کے جاتے رہیں گے اکثر — اور دوستوں کی اپنے کچھ پیروی کریں گے
دن بھر کیا کریں گے یہ سائیکل سواری — پھیرے بغیر مقصد ہر ہر گلی کریں گے
گر راستے میں کوئی مل جائے گی حسینہ — فقرے کسیں گے اس پر اور دل لگی کریں گے
گھر میں رہیں گے جب تک خادم بنے رہیں گے — بیگم کے کپڑے دھو کر یہ استری کریں گے

گو خود جدیدیوں کے زمرے میں آ گئے ہیں
اسرار جب کریں گے باتیں کھری کریں گے

(دسمبر ۷۶ء)

O

بعد از فساد

بعد از فساد بولے کیا کیا ہمارے رہبر
گرچہ تھے اس سے پہلے وہ سب نہاں تو کیا ہے
اسرارؔ جامعی جی! موقع ہے یہ غنیمت
چھپ جائے آپ کا بھی گر اک بیان تو کیا ہے

(جنوری ۹۳ء)

انسان پی رہا ہے انسان کا لہو اب
اور دیکھتا ہے سب کچھ یہ آسماں تو کیا ہے
خوش نام ہو رہے ہیں اپنے وطن کے لیڈر
بدنام ہو رہا ہے ہندوستان تو کیا ہے
بہرِ فساد زدگان چندے کی اس رقم سے
بن جائے آپ کا بھی گر اک مکان تو کیا ہے
سارے فتنی لیڈر مسرور ہو رہے ہیں
اسرار جامعی ہیں محوِ فغاں تو کیا ہے

اسلم عمادی

(حیدرآباد)

پیروڈیاں

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم بجا تو کیا ہے
جا کے ایک رکھوں گا یہ گفتگو کیا ہے

میں بھاگتا ہوں ذرا احتیاط کی خاطر
دگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

ہوئے ہیں عشق میں بے روزگار ملے لوگو!
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں جیب جل گئی ہوگی
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

مجھے تو صرف ہے تاڑی کا شوق اے ساقی
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار دیکھ کر پولس
سوائے بچ کے نکلنے کی آرزو کیا ہے

(مارچ اپریل ۶۹ء)

○

ہم نے مانا کہ مداری کا کمال اچھا ہے
پھر بھی سرکس میں حسینوں کا جمال اچھا ہے

جیب خالی ہو تو کہتے ہیں فقیروں سے یہی
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

کالے بازار میں ہے دھوم وزیروں کی بہت
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

جانتے سب ہیں پلاننگ کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

فیاض افسوس

(اکولہ)

غزلیں

نت نئے سینکڑوں اشعار کہاں سے لائیں
وقت اتنا بھلا بیکار کہاں سے لائیں

سوچے سمجھے ہی بنا داد جو دیتے جائیں
ایسے باذوق سمجھ دار کہاں سے لائیں

حشر قربانی کے بکروں کا بہت دیکھ چکے
لوگ اب جذبۂ ایثار کہاں سے لائیں

ٹمٹماتے سے دیئے کو ہی غنیمت جانو
روشنی کا کوئی مینار کہاں سے لائیں

حکم بیگم کا ہے کچھ اور بزرگوں کا نہیں
حوصلہ ہم پئے انکار کہاں سے لائیں

مانا بے تاب زلیخائیں بہت ہیں لیکن
ہیرو یا مصر کا بازار کہاں سے لائیں

سر ہمیں اپنے رقیبوں کا قلم کرنا ہے
دور ایٹم کا ہے تلوار کہاں سے لائیں

(جولائی ۸۰ء)

○

جلنے لگتی ہے تو پھر کچھ بھی جلا لیتے ہیں لوگ
غیر کے چولھے پہ دال اپنی گلا لیتے ہیں لوگ

تیل اور ماچس کے پیسے اب بچا لیتے ہیں لوگ
گھپ اندھیرا ہو تو اپنا دل جلا لیتے ہیں لوگ

عیب ہو گر آنکھ میں تو یوں چھپا لیتے ہیں لوگ
رات میں بھی دھوپ کا چشمہ لگا لیتے ہیں لوگ

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہیں بے غیرتی
آج کے اس دور میں بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

ہر طرف بس خیریت ہی خیریت ہے ان دنوں
پوچھ کر پھر خیریت کیوں بددعا لیتے ہیں لوگ

حیرت و افسوس ہے کہ آدمی ہوتے ہوئے
شکل اپنی ریچھ کی سی کیوں بنا لیتے ہیں لوگ

(اگست ۸۹)

اشرف خوندمیری (حیدرآباد)

جھمک جھکا

بس گے بولو سن گے آپا سن گے رانی بولوں — جھمک جھکا کھیلی تھی سو اپنی کانی بولوں
ہنس کے بولوں یا انکھیاں میں لاکو پانی بولوں — میری ان کی ہوتی تھی سو آنکھ مچانی بولوں
بیتے باتاں یاد آرئیں تو دل ہو رائے موچکا
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

سیلیاں سیلیاں مل کو اک دن موسٰی ندی آئے — ٹھنڈی ٹھنڈی چھیوں میں جھمک جھکا کھیل رچائے
میں من ماری دور کھڑی تھی منڈی کو لٹکائے — کلثم پوچھی کیوں گے بتو تو کتّیکو شرمائے
کلثم کے باتاں میں آکو کھا گئی کیسا جھپکا!
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

اللہ میاں کسّ پو بی ایسے گھڑیاں نہ لائے — کلثم کے ہاتھاں چھٹ گئے ہم سو توں ڈھلکیاں کھائے
ڈھلکی کھا کو دور گری یا داں میں موچاں آئے — گرتے گرتے میرے انکھیاں لڑ گئے ان سے ہائے
چنداسا مکھڑا دیکھی تو رہ گئی ہرکا بکا
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

طوفاناں کے باراں کے موقاں کو موڑ کو تھامے — رستے میں جو بی چیزاں تھے ان کو توڑ کو نہائے
کھڈوں میں گرتے پڑتے بس گھٹتے پھوڑ کو نہائے — منجے گرتا دیک کو اپنے چپلاں چھوڑ کو نہائے
کوئی بی نئیں تھا ان کے سر کیا دل کا چور اُچکا
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

بولے سیّاں اب تو گوری روز ملتے رہیں گے — اپنے دل میں اُلفت کے پھولاں بی کھلتے رہیں گے
ڈرنا نئیں لوگاں تو ہم پو بہوت کلتے رہیں گے — سر پو لاکھوں طوفاناں کے ڈھیراں پلتے رہیں گے
پھر بی اپنے پیار پو گوری چھٹیں گا سب کا چھکا
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

چدر گھاٹ کے محورم کے ہر میلے پو ہم ملتے — محمودین صاب[1] کے جاگنے کے ٹھیلے پو ہم ملتے
عیدلاری سالے[2] کے طبیلے پو ہم ملتے — عنبر پیٹھ کے گایاں کے کمیلے پو ہم ملتے
ہم بی چھانیں چپّہ چپّہ پیار کی ہر سڑک کا
ہائے اللہ میں کتّیکو کھیلی ایسا جھمک جھکا

[1] محی الدین [2] عبداللہ ،سالا

دنیا کے نظراں سے بچ کو بیٹھتے تھے سوب گھاتاں — دن عیداں تھے بھوروآتاں ہوتے تھے شب براتاں
ہلو ہلو ہنستے بیٹھتے بیٹھتے کٹ گیوں راتاں — میری ان کی بیت پلی ہاتاں میں ہے کرواتاں

دونوں کے دل کی ہنڈی میں دیکھیں جمتا تھا چکا
ہائے اللہ میں کٹ گیو کھیلی ایسا جھٹکا جھٹکا

ماٹی میلے طوفاناں نہ جانے کاں سے آئے — گوداں میں بھرکو تم کے شیطانوں کو بی لائے
خالی پیلی ترس کو ستیاں پیت مری ٹھکرائے — رامی دھوبن کے تلکاں میں دل اپنا اٹکائے

منجے نیئی مالوم تھا میرے دل کو لگیں گا دھکا
ہائے اللہ میں کٹ گیو کھیلی ایسا جھٹک جھٹکا (نومبر دسمبر ۷۳ء)

دو گرگٹوں کے موں کو چٹا لگا کو چھوڑیں

(تین بند)

گھس گھس کو ایلوے کا پیچھے چٹا کو چھوڑیں — تالو سلا سلا کو ڈھینڈ گھما کو چھوڑیں
اوپر سے ہلو ہلو ڈوپہ پیٹا کو چھوڑیں — نیچے سے ہلو ہلو گنگا بہا کو چھوڑیں

بیٹھے بٹھائے سب کا کونیہ ڈبا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے مُنڈوں کو چٹا لگا کو چھوڑیں

بس ہو رہے شوسلے کا مال ان کا ہے کارنامہ — "ایونا کشنا کشنا ' ایونا رامارا ما راما
باتاں بنا بنا کو باتاں بچیا نچیا کو — ڈی سیلاگ بی گھما کو کرنے لگیں ڈرامہ

ہولوں پو ایکٹنگ کا سکہ جما کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چٹا لگا کو چھوڑیں

چٹا انوں بی ڈل دئیں اُتا انوں بی ٹل گئی — مکھنا ہیتی کے بھایاں بی بن کو دونوں جل رئیں
گھایاں دکھا دکھا کو باتاں انوں دلا رئیں — بارہ سوں بیچ آ کو دونوں بی خوب بچل رئیں

دونوں کو سب ماریں بھگا بنا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے بھیا نہ چٹا لگا کو چھوڑیں

٥

(نومبر ۱۹۸۷ء)

اشرف مالوی
(لکھنؤ)

محقق کے انتقال پر

اس سے پہلے میں بکوں اپنی طرف سے اول فول
عرض کر دوں پیش بندی کے لیے دلچسپ قول

گر بزرگوں پر کسی کا کوئی بھی احسان ہو
جب ملے موقع چکا دے، چاہیے اخلاد ہو

لکھ رہا ہوں میں بزرگوں کے انھیں محسن کا حال،
تھے جو ناقد باشعور اور اک محقق باکمال

زندہ فن کاروں سے تھی حضرت کو ازلی دشمنی
مشغلہ ان کا مردہ فن کار اور خصوصاً شاعری

چلتی رہتی تھی کدال ان کی سدا تحقیق کی
جب بھی مرجاتا کوئی شاعر انھیں ہوتی خوشی

کیوں کہ یہ ان کے لیے تشہیر کا ساماں ہوا
نام چھپنے اور اجرت کا بھی کچھ امکاں ہوا

چار پائی بھی تو واپس آئی قبرستان سے
اک رسالے میں چھپا زریں مقالہ شان سے

جیسے تھا تیار پہلے سے مقالہ شاندار
تھا فقط موصوف کے مرنے کا ان کو انتظار

یوں لکھا کہ وہ فرشتوں سے زیادہ پاک تھے
جنگِ آزادی کے ہیرو تھے، نڈر بےباک تھے

داغ کے شاگرد تھے اور ذوق کے استاد تھے
میر سے تھی ان کی چشمک، خانماں برباد تھے

حضرتِ غالب دکھاتے تھے انھیں اپنا کلام
اور گھوڑے سے اتر کر سودا کرتے تھے سلام

جانشینِ جوش میں کرتے تھے سب ان کا شمار
مصحفی شاگرد ہوں گے کم سے کم چھپن ہزار

طرز کے اپنی وہ موجد، اور خاتم بھی وہی
ہوتے اکبر کے چپ کرتی وفا گر زندگی

درد کے اشعار چھپائے ہیں ان کے نام سے
کام یوں لیتے رہے اپنے خیالِ خام سے

جتنی باتیں کچھ نہ کچھ اس میں نظر آیا تضاد
جو فقط اطفال کا عادی ہو اسے کیا ہوگا یاد

زندگی بھر چاہے اس کی شکل بھی دیکھی نہ ہو
پھر بھی جگری دوست لکھا آپ نے مرحوم کو

الغرض اس طرح سے ادبی ستم ہوتا رہا
مرنے والوں پر ہی الطاف و کرم ہوتا رہا

خیر صاحب ہو گیا دنیا سے ان کا انتقال
ان کی شخصیت پہ کچھ کہنا ہے اک ٹیڑھا سوال

ان کے فن پہ اب کوئی زندہ لکھے تو کیا لکھے
ہے تقاضہ اب یہی انصاف کا مُردہ لکھے

کوئی زندہ ملتفت ان کی طرف ہوتا نہیں
اور کسی مردے نے اب تک اُن پہ کچھ لکھا نہیں

کہ انھیں شرمندہ ہونا چاہیے زیرِ مزار
کیوں نہ دنیا میں روش کی تھی کچھ ایسی اختیار

جس سے خوش ہوتے ہمیشہ حاضر و غائب سبھی
کیوں نہ کچھ گم نام فن کاروں کو شہرت بخش دی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہرگز نہ تھا پہلوئے ذم
زندہ گم ناموں کی خاطر ان کا گر چلتا قلم

یہ کوئی قانونِ قدرت ہے جو ٹل سکتا نہیں
کیا محقق کا قلم زندہ پہ چل سکتا نہیں

اشرف ان کا کچھ بزرگوں پر غلط احسان ہے
اس لیے یہ نظم ان کی وفات پر تبریانہ ہے (تبرہ)

اعجاز وارثی سنبھلی

جاہل کے ہاتھوں اردو کی گاڑی الٹ گئی

اک بوڑھا اپنے بیٹے پہ تھا بات خشمگیں ۔۔۔ کہتا تھا میری جان کا لیوا ہے یہ لعیں
چاروں طرف ہجوم تماشائیوں کا تھا ۔۔۔ سب کو سنا کے کہنے لگا بوڑھا ماجرا
میرا نصیب دیکھیے ناکارہ ہے پسر ۔۔۔ پھرتا ہوں میں تلاش میں روٹی کی در بدر
میری یہ آرزو بھی کہ پڑھ جائے نابکار ۔۔۔ لیکن نہ پاس کر سکا بدبخت درجہ چار
لے دے کے ہو گیا تھا یہ چپراسی عارضی ۔۔۔ رشوت ہی ہضم کر گیا تحصیل دار کی
تھانہ میں آنا جانا تھا دلالی کے لیے ۔۔۔ لیکن وہ ففٹی ففٹی نہ راس آسکی اسے
پکڑا گیا معاملہ اک گول مال کا ۔۔۔ وہ دن ہے اور بھاؤ ہے بس آٹے دال کا
سوچا تھا کچھ نہیں ہے تو نیتا ہی بن سکے ۔۔۔ محنت کشوں، غریبوں کا آقا ہی بن سکے
ممکن ہے شاید اس کی سیاست کا ہو خمیر ۔۔۔ بن جائے ایک روز یہ پردیش کا وزیر
لیکن ملا دماغ نہ نیتاؤں کا اسے ۔۔۔ واقف نہ "ٹکٹ" سے نہ پیتر داؤں کا اسے
پہلے ہی روز پیچھے سے تکرار ہو گئی ۔۔۔ کھدر کی یونیفارم بھی بے کار ہو گئی
احمق کسی طرح نہ وطن میں ابھر سکا ۔۔۔ چندے کا دھندا عام ہے وہ بھی نہ کر سکا
جو کام بھی کیا وہ بد انجام ہی رہا ۔۔۔ اسمگلروں کے ساتھ بھی ناکام ہی رہا
دیکھا تھا شاعروں کو کہ اردو کے نام پہ ۔۔۔ نوٹوں سے اپنی جیبوں کو بھرتے ہیں بے خطر
طے یہ ہوا کہ شاعروں کا پیشہ سیکھ لے ۔۔۔ آواز اس کی اچھی ہے کچھ گانا سیکھ لے
محسوس کم ہی ہوتی ہے تعلیم کی کمی ۔۔۔ دو پیشوں میں، لیڈری ہو یا کہ شاعری
اور پھر میں لے گیا اسے استادِ فن کے پاس ۔۔۔ جو آبروئے شعر بھی تھے اور گلو شناس
حضرت نے ٹسٹ لے کے کہا قصہ مختصر ۔۔۔ شاعر بنا تو دیں گے مگر نصف نصف پر
جو کچھ کما کے لائے گا یہ بزم شعر سے ۔۔۔ اس میں ہمارے نصف اور اتنے ہی آپ کے
استادِ "شعر پیشہ" نے بعدِ معاہدہ ۔۔۔ سمجھایا اس کو کیا ہیں ردیف اور قافیہ
پھر کی عطا حسین سی رنگین بیاض اسے ۔۔۔ غزلوں کا رفتہ رفتہ کرایا ریاض اسے
آخر مشاعرہ میں بلایا گیا یہ کل ۔۔۔ مقطع تھا اس کے نام کا استاد کی غزل
نسوہ کو نغمہ اور شعف کو شفا پڑھا ۔۔۔ الو نے بزم شعر کا نقشہ بدل دیا
کہتے ہیں یہ نظام ہے لیل و نہار کا ۔۔۔ جو کچھ نہ بن سکا اسے شاعر بنا دیا

کیا کر سکے گا کوئی بھلا اور سنگار
شاعر بھی یہ نہ بن سکا اس پہ خدا کی مار

(دو مہر، جنوری ۹۱)

شکوۂ شاعر

پیروڈی

اعجاز وارثی

کیوں منی کار بنوں، فورڈ فراموش رہوں   پلائے تحقیر میں کیوں صورتِ پاپوش رہوں
سامعیں ہوٹ کریں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہمنوا! میں بھی کوئی گُر ہوں کہ خاموش رہوں
جراُت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوۂ بے رخیٔ اہلِ وطن ہے مجھ کو

ہے بجا، عرضِ ہنر کے لیے مشہور ہیں ہم   ساغرِ مے ہے اگر شعر، تو انگور ہیں ہم
کرتے ہیں عسل ادب جمع، وہ زنبور ہیں ہم   قدرداں کوئی نہیں ملتا تو رنجور ہیں ہم
دوستو شکوۂ اربابِ سخن بھی سن لو
خوگرِ داد سے، روداد محن بھی سن لو!

ہم سے پہلے تھا کہاں لوح و قلم کا یہ ڈھچر   زیر، بالا تھا کہیں اور کہیں پست، زبر
کوئی جادہ تھا نہ منزل تھی، نہ کوئی رہبر   گویا آساں نہ تھا الفاظ و معانی کا سفر
خدمتِ قافلۂ لفظ و بیاں کی ہم نے
اور آرائشِ ایوانِ زباں کی ہم نے

جمع غنچوں کے تبسم سے کیا رس ہم نے   ایک ایک لفظ کو پیکر دیئے دس دس ہم نے
غیر ٹکسال کے قائم کیے مجلس ہم نے   لکھ دیئے شکوہ و آشوب و مسدس ہم نے
سعیِ فن کار تغافل کی مگر نذر ہوئی!
قدرداں مل بھی گیا کوئی تو کیا قدر ہوئی!

شعر پڑھنے سے کبھی بزم میں ہم آئے نہ باز   حد یہ ہے، ٹال گئے سن کے اذاں کی آواز
رحمتِ حق پہ کیا تکیہ، قضا کر دی نماز   اور جاری رہا رقصِ غزل عشوہ طراز
ہم وہ ناداں ہیں سخن دستِ نگر کو سمجھا
سجدہ ریزی سے سوا عرضِ ہنر کو سمجھا

جیبوں میں رکھے بیاضیں، سحر و شام پھرے   مے اشعار کو لے کر صفتِ جام پھرے
فاعلاتن کا لیے ہر جگہ پیغام پھرے   تم ہی انصاف سے کہہ دو، کبھی ناکام پھرے
شہر تو شہر ہیں دیہات نہ چھوڑے ہم نے
کوہ اور دشت میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

(سلسلہ ----)

شعر گوئی کے لوازم سے ہمیں پیار رہا — کم سے کم، ہم میں سبھی کا ہر تیرا سے خمار رہا
وضع ہپی سی رہی، دل عشق کا بیمار رہا — "ہیپی ہیں"، "فرشتے ہیں"، یہ شیوۂ گفتار رہا

عرض جب شعر پہ لے خاطرِ احباب کیے
کسی لوفر نے کیا ہوٹ تو آداب کیے

چائے خانوں میں سنائیں کبھی غزلیں ہم نے — کبھی چوراہوں پہ برپا کیں نشستیں ہم نے
"شعر سازی" کے لیے کھولیں دکانیں ہم نے — نام پر "بزمِ ادب" کے لڑیں جنگیں ہم نے

فن کے دل دادہ ہیں، بعض کی گھر کار نہیں
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ قلم کار نہیں

لب پہ آ ہی گیا بد ذوقیِ سامع کا گلا — کوئی سنتا ہی نہیں تحت میں کب کس نے پڑھا
شعر وہ شعر نہیں، جو ہو ترنم سے جدا — قابلِ داد اگر ہے تو گلا شاعر کا

چند خوش فکرِ سخن داں ہیں جو قسمت والے
متشاعر بھی ہیں "آل انڈیا" شہرت والے

اہلِ فن کا کوئی اب چاہنے والا نہ رہا — ماہتاب آج بھی موجود ہے، ہالا نہ رہا
شمعِ تشبیہ و [illegible] کا اجالا نہ رہا — دہنِ شعر کی قسمت میں نوالا نہ رہا

کچھ تو دراصل سخن فہموں کا فقدان ہے آج
اور شاعر بھی ہر اک "صاحبِ دیوان" ہے آج

غالبِ خستہ کے ہم کب ہیں طرفدار مگر — بات انصاف کی کہنے میں ہے کیا خوف و خطر
متشاعر کے ترنم کو ملیں لعل و گہر — اور بے چارے سخن ور کو فقط وعدۂ زر

ہم نے مانا کہ نہیں شعر کی قیمت کوئی
پھر بھی کیوں کرتا ہے شاعر کی اہانت کوئی

(فروری ۸۵ء)

قطعہ

خود نمائی میں رہا کرتے تھے مرزا پیش پیش
لیکن ان کا عقد جب اک شاعرہ سے کر دیا
اس قدر بدلے کہ ہر موقع پہ ہر تقریب میں
آپ پیچھے رہ گئے بیوی کو آگے کر دیا

(جولائی ۸۷ء)

نیتا

نیتاؤں سے ہشیار یدآثار ہیں نیتا
بھارت کے لیے کوکبِ دُم دار ہیں نیتا

دریوزہ گرِ محض ہیں، دورانِ الیکشن
مسند پہ قدم رکھتے ہی سرکار ہیں نیتا

معصوم نظر آتے ہیں گو صورتِ علام
باطن میں مگر ضیغمِ خوں خوار ہیں نیتا

اسمگلری کی ڈھال ہیں، سٹے کے محافظ
بدوضع عناصر کے طرف دار ہیں نیتا

ہو منفعت اپنی تو کھٹکتے رہتے ہیں ہر روز
اور زحمتِ بیجا ہو تو اقرار ہیں نیتا

معبد میں بھی حاضر ہیں بہ اندازِ تفاخر
میخواروں کی محفل میں قدح خوار ہیں نیتا

مطلب نہ ہو تو ہر کس و ناکس کے مخالف
مطلب ہو تو غالب کے طرف دار ہیں نیتا

گھر کھائیں تو پاجامے کی مانند کفایت
دعوت ہو تو پیشاوری شلوار ہیں نیتا

غیروں کے لیے موسمِ گرما کی تمازت
اپنوں کے لیے سایۂ دیوار ہیں نیتا

جلوت میں سوئے ماہ وشاں رخ نہیں کرتے
خلوت میں حسینوں کے پرستار ہیں نیتا

حاصل یدِ طولیٰ ہے انھیں چندے کے حق میں
جب دیکھیے جھولی لیے تیار ہیں نیتا

کھدر کا لباس اس کے لیے خلعتِ شاہی
اک فوجِ طمع کے سپہ سالار ہیں نیتا

ریشم کے چھپا بنتے ہیں تقریروں میں لیکن
میدان میں ٹوٹی ہوئی تلوار ہیں نیتا

ہر صبح بدل جاتے ہیں مانندِ کیلنڈر
دنیائے سیاست میں وہ غدار ہیں نیتا

وابستہ ہوں مسند سے تو ہر گام پہ "ڈیل کم"
مسند سے اتر جائیں تو بیکار ہیں نیتا

ان شعبدہ بازوں کی قیادت! ارے توبہ
بنتا ہے جو اس پار تو اس پار ہیں نیتا

گفتار کے غازی ہیں یہ ناکامِ سیاست
اک بربطِ بوسیدہ کی جھنکار ہیں نیتا

نیتاؤں سے ہشیار! یدآثار ہیں نیتا
بھارت کے لیے کوکبِ دم دار ہیں نیتا

(جنوری ۷۵)

قطعہ

آج بھی دیش کے ہزاروں سپوت
بھوکے مر مر کے ایم اے کرتے ہیں
لیکن ان کے نصیب وائے نصیب
ایم اے کر کے بھی بھوکے مرتے ہیں

(جولائی ۱۹۸۷ء)

یونس اعجاز (ریاض)

گھر کا نہ گھاٹ کا...

پیوند اس کو کہتے ہیں ریشم میں ٹاٹ کا
شادی کرے گا میم سے فرزند جاٹ کا

وابستہ ان لبوں سے بھی کیا کیا نہ تھے مزے
لیکن تھا لطف اور ہی گالی کی چاٹ کا

دھمکی بھی بات بات پہ دیتا ہے جیل کی
کرتا ہے ہم سے پیار بھی سالا وہ لاٹ کا

سنتے ہیں اس کو آٹھویں شوہر کی ہے تلاش
پانی تو ہم نے بھی ہے پیا گھاٹ گھاٹ کا

قسطیں طرح طرح کی ادا کر رہا ہوں میں
مالک مگر نہیں ہوں کسی اک پلاٹ کا

سچ پرچ بھی آ نہ جائے سسر دیکھنے مجھے
یارب بھرم کھلے نہ کہیں ٹھاٹ باٹ کا

منزل کی آرزو بھی کروں کس گھمنڈ پر
دھوبی کا کتا گھر کا رہا ہے نہ گھاٹ کا

اعجاز تیغ و تیر کے زخموں کا ہو علاج
مرہم کوئی دکھائیے تو لفظوں کی کاٹ کا

لوگ

آئے دن ہی اک نئی شادی رچا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی سہرے سجا لیتے ہیں لوگ

کھانا پینا ، رہنا سہنا ، تو نا جانا مفت کا
سب کی سب تنخواہ چپکے سے بچا لیتے ہیں لوگ

بیوی بچوں کا انہیں ویزا ملے یا نہ ملے
کام اپنا سو طریقوں سے چلا لیتے ہیں لوگ

یا تو ابا سے بھی کرتے ہیں گدھوں جیسا سلوک
یا گدھے کو باپ ہی اپنا بنا لیتے ہیں لوگ

میرے بیمہ کی رقم پر ہر کسی کی آنکھ ہے
میرے مرنے پر ہی جینے کا مزا لیتے ہیں لوگ

ان کے بے ہنگم خراٹوں کی شکایت کیا کروں
جب بھی سوتا ہوں مجھے فوراً جگا لیتے ہیں لوگ

عمر کافی ہے تیرے اعجاز نے فٹ پاتھ پر
رات بھر میں کوٹھیاں بنگلے بنا لیتے ہیں لوگ

غریب الدیار

چسکے ہمیں کچھ ایسے پڑے ہیں ادھار کے
جب دیکھیے کھڑے ہیں ہتھیلی پسار کے

اب دن کہاں تھے ان کے بناؤ سنگھار کے
نکلے ہیں پھر سے پانچویں عدت گزار کے

کس طور سے حجاب میں جھنجھلا رہے تھے وہ
کس درجہ شادماں ہوئے برقعہ اتار کے

بس دیکھیے کہ وقت پہ ملتا رہے ڈرافٹ
احوال پوچھیے نہ غریب الدیار کے

پیری میں بھی تو پیار کے قابل رہیں گے ہم
کیا کیا ہیں واہمے دلِ ناکردہ کار کے

اولاد اپنے باپ کو پہچانتی نہیں
اعجاز کیسے کیسے ہیں دولت کے پیار کے

(اکتوبر ۹۲ء)

ان پڑھ بھونگیری

غزلیں

پھر مریدوں میں شادمانی ہے
کیوں کہ مرشد کا عقدِ ثانی ہے

وہ ہیں میکے میں اور یہاں میری
صبح دلکش ہے شب سہانی ہے

دل نہیں صرف ایک پر مائل
اک نئی ہے تو اک پرانی ہے

بن بیاہی ہیں لڑکیاں لاکھوں
گھوڑے جوڑے کی مہربانی ہے

جان دیتا ہوں اس لیے تم پر
ایک دن جان میری جانی ہے

ایک فرلانگ چل نہیں سکتے
نوجوانوں کی کیا جوانی ہے

دودھ میں مینڈکیں بھی پلتی ہیں
ڈیری والوں کی مہربانی ہے

کاریں پھر رہے ہیں مولانا
یہ تو چندے کی مہربانی ہے

مطمئن ہوں نماز میں اب کے
میری چپل بہت پرانی ہے

کچھ تو سامانِ آخرت کر تو
ایک دن جان اپنی جانی ہے

یہ فسادات آئے دن ان پڑھ
دورِ جمہور کی نشانی ہے

○

ممی ڈیڈی کو مارئیے نون
بیچ میں یہ دیوار نکّو نا

ڈاکٹر کو دکھائیے فوراً
ہجر کا یہ بخار نکّو نا

جو لگاتے ہیں رات دن چکّے
ایسے مطلب کے یار نکّو نا

ایک عاشق سے دل لگاؤ نا
اِتّی لمبی قطار نکّو نا

دشمنوں کو گلاب کے ہاراں
مجھے جوتوں کا ہار نکّو نا

نقد کچھ تو خریدیئے ان پڑھ
مال سارا ادھار نکّو نا

(دسمبر ۷۷ء)

○

اتوں دے رہیں پھر سے رقیبوں کو دعوت
پڑوسی کا مرغا چرائے سریکا ہے

ابھی مہندی ہاتھوں کی اُتری نہیں پر
رہن سارے زیور رکھائے سریکا ہے

(اگست ۷۶ء)

○

ہم نے خون بہایا تھا کیا صلہ ملا ہم کو
بچ گئے تھے گوروں سے لٹ رہے ہیں کالوں میں

آکے ہم نمائش میں کھوئے کھوئے رہتے ہیں
گورے گورے گالوں میں کالے کالے بالوں میں

اس طرح شبِ جلوہ اپنی کٹ گئی ان پڑھ
ہم رہے جوابوں میں وہ رہے سوالوں میں

ان پڑھ جونگیری

..... جیسا ہے

اب کھلائے نہ کھائے جیسا ہے
پورا سسرال آئے جیسا ہے

سینڈھی خانہ بسائے جیسا ہے
جھاڑو گھر میں پھرائے جیسا ہے

نانی مہندی لگائے جیسا ہے
نانا باڑوں میں لائے جیسا ہے

چھوکرا اپنے واسطے لے کر
چھلّہ ان کو دلائے جیسا ہے

جبسے آیا ہے . دیکھو گھر داماد
گھر کے ہنڈیاں پکائے جیسا ہے

چال اکڑی ہے پھر کو ہے گردن
جاکو دوبئی کو آئے جیسا ہے

پہلے پھندے سجا کو سڑکوں پہ
ہم کو مرغا بنائے جیسا ہے

نئی چھتیک تو لے کو رکھا ہوں
روڈ پر کیا چلائے جیسا ہے

کالے دھندے میں پھانس کر مجھ کو
منہ کو کالک لگائے جیسا ہے

روز نوٹے نکال کر جی اد!
سب کو لمبا سلائے جیسا ہے

جان بکو غزل کی بیٹھے ہیں
اب غزل کیا سنائے جیسا ہے

ان کی انکھی میں پھول کھلنے کو
موتیا بیچ آئے جیسا ہے

ایسا نکلا ہے بڈّھا بن ٹھن کے
نوی دلہن کو لائے جیسا ہے

داغ دوزی میں ہو گئے بے دم
کیا نیا گھر بسائے جیسا ہے

کھڈّے لوگاں کے واسطے کھودا
سامنے میرے آئے جیسا ہے

جن کو آسیب سب مرے خایاں
آنگ لیو ان کے آئے جیسا ہے

لڑکھڑا کو وہ گر کو پڑتے ہیں
تاڑ بن جا کو آئے جیسا ہے

ہچکیاں آ رہی ہیں تھم تھم کر
آج ہم کو بلائے جیسا ہے

میری بیگم بھی بن گئی شاعر
ناک میری کٹائے جیسا ہے

چھین کو بستہ لکھنے پڑھنے کا
مجھے جاہل بنائے جیسا ہے

اپنا عاشق بنا کے وہ مجھ کو
سوکھی کھجلی لگائے جیسا ہے

علی صائب کے بعد دکنی میں
کون شعراں سنائے جیسا ہے

آج ان پڑھ بھی شعر کہتا ہے
فن کو چکلے لگائے جیسا ہے

(فروری ۹۴ء)

غزل

برق آشیانوی
(حیدرآباد)

الطاف و عنایت ہے مگر ایک بٹہ چار
اخلاص و محبت ہے مگر ایک بٹہ چار

صورت پہ ملاحت ہے مگر ایک بٹہ چار
حوروں پہ ملاحت ہے مگر ایک بٹہ چار

لیکچر میں حلاوت ہے مگر ایک بٹہ چار
لہجے میں صداقت ہے مگر ایک بٹہ چار

اقرار کی امید تو اُن سے نہیں لیکن
انکار میں لذت ہے مگر ایک بٹہ چار

مہنگائی کے بھتے میں اضافہ تو ہوا ہے
تنخواہ میں برکت ہے مگر ایک بٹہ چار

بیمارِ محبت کو جو دیکھا تو یہ بولے
بچنے کی تو صورت ہے مگر ایک بٹہ چار

رکھنے کو تو رکھتے ہیں سند بی اے کی لیکن
صاحب کی لیاقت ہے مگر ایک بٹہ چار

مانا کہ انھیں مجھ سے محبت تو نہیں ہے
البتہ مروت ہے مگر ایک بٹہ چار

کچھ وضع کے پابند ابھی لوگ ہیں باقی
دنیا میں شرافت ہے مگر ایک بٹہ چار

پوچھا کہ میں آسکتا ہوں محفل میں تمھاری
بولے کہ اجازت ہے مگر ایک بٹہ چار

جب برق سے پوچھا کہ ہے شعر و ادب کیا؟
بولے کہ حجامت ہے مگر ایک بٹہ چار

(ستمبر ۱۹۸۶ء)

عاشقوں کی کانفرنس

ملک میں ہونے لگیں جب کانفرنسیں پے بہ پے
تو کیا اک روز سب عشاق نے مل کر یہ طے

کانفرنس عشاق کی بھی ایک ہونا چاہیئے
اپنا رونا ایک دن ہم کو بھی رونا چاہیئے

اک بیاباں کا کیا سب عاشقوں نے انتخاب
شہ نشیں اک بن گیا کانٹوں کا مسند لاجواب

ملک کا اک عاشقِ خرانٹ بلوایا گیا
صدر کے مسند پہ لا کر اس کو چپکایا گیا

ہار اس کے واسطے گُل ہائے خود رَو کا بنا
اور سنگِ آستانِ یار کا تکیہ بنا

طبع میں آوارگی، تعلیم میں جاہل تھا وہ
لیکن اپنے وقت کا اک عاشقِ کامل تھا وہ

اور اک عاشق بنا اس کانفرنس کا معتمد
خانۂ ویرانہ میں اُلّو، شکل و صورت اک چغد

عاشقانِ چند رکنِ انتظامی بن گئے
سینکڑوں عشاق رکنِ عام کی صف میں رہے

صورتوں پر سب کی وحشت، جسم پر گرد و غبار
بال سر کے خاک آلودہ، کپڑے تار تار

دل میں دھڑکن، چشم پُرنم، لب پہ آہیں سرد سرد
جس کو دیکھو وہ نظر آتا تھا اک تصویرِ درد

(سلسلہ....)

یوں نظر آیا کہ شعرا کانگریشو ہیں یہ سب ۔۔۔ شاعروں کے دور کے گویا ریلیٹو ہیں یہ سب
معتمد نے جب پڑھا اک خطبۂ استقبالیہ ۔۔۔ کھینچ ڈالا عاشقوں کا ایک نقشہ حالیہ
ریزولیوشن پاس سب عشاق نے مل کر کیا ۔۔۔ اولیں منزل کو گویا کانفرنس کی سر کیا
سب سے پہلے قیس اور فرہاد کا ماتم ہوا ۔۔۔ ہیر رانجھا اور ششی پنوں کا رنج و غم ہوا
ہو گئے استادہ منائی دو منٹ کی خامشی ۔۔۔ اک اداسی دیر تک محفل پہ طاری سی رہی
پھر بتایا ۔ ہیں بہت مشکل مراحل سامنے ۔۔۔ عاشقوں کے رکھے پیچیدہ مسائل سامنے
کیا بیاں کیجے زباں سے عاشقوں کا حالِ زار ۔۔۔ عاشقانِ باوفا ہیں ملک کے بے روزگار
کچھ توجہ عاشقوں کے حال پر فرمائیے ۔۔۔ چوتھے منصوبے میں ان کے بھی مسائل لائیے
انفرادی طور پر جاری وظیفے کیجئے ۔۔۔ نام پہ عشاق کے بھاری وظیفے کیجیے؟
تاکہ یہ پورا کریں سب اپنا فرضِ منصبی ۔۔۔ اور زوروں پر چلائیں کاروبارِ عاشقی
ہم جمیع عشاق کی یہ مشترک اک بانگ ہے ۔۔۔ غور کر کے دیکھئے، یہ رائٹ ہے یا رانگ ہے
دفعہ ۲۷ سی کو فوراً کالعدم کر دیجئے ۔۔۔ کتنی ہے توہین اس میں عاشقوں کی دیکھئے
راہ میں محبوب کو ہے چھیڑ لینا کیا بُرا! ۔۔۔ چھیڑ گویا نام ہے اک حسرتِ ناکام کا
چھیڑ غالب نے کہا ہے حسرتِ شامِ وصال ۔۔۔ وصل گر ہوتا نہیں تو لیجئے حسرت نکال
کالجوں میں عام ہو طلبا میں رسمِ عاشقی ۔۔۔ حیثیت اس کی رہے کمپلسری سبجکٹ کی
طالبانِ علم درسِ عاشقی میں طاق ہوں ۔۔۔ ملک میں سارے فقط عشاق ہی عشاق ہوں
عزت و عظمت میں ان کو دیجئے جائز مقام ۔۔۔ نام پر عشاق کے رکھوائیے سڑکوں کے نام
جیسے شیریں پارک، مجنوں روڈ، لیلیٰ اسٹریٹ ۔۔۔ ہیر رانجھا مارگ، رومیو کراس، جولیٹ مارکٹ
ملک چاہے بھوک اور غربت کے دوراہے پہ ہو ۔۔۔ ایک اسٹیچو ہر اک عاشق چوراہے پہ ہو
ان کا مستقبل درخشاں اور تابندہ بھی ہو ۔۔۔ پارلیمنٹ میں عاشقوں کا اک نمائندہ بھی ہو
سب سے اونچا عاشقوں کا اک پلیٹ فارم بھی ہو ۔۔۔ مرکزی اک انجمن عشاق کی قائم بھی ہو
زخمِ دل کے واسطے مرہم بھی ہونا چاہیئے ۔۔۔ عاشقوں کا اپنا اک پرچم بھی ہونا چاہیئے

آؤ اک نعرہ لگائیں عاشقانِ نامراد
"اے محبت زندہ باد" اے عاشقی پائندہ باد"

(جنوری/فروری ۷۳ء)

★

برق آشیانوی

مرحوم شوہر کی تصویر دیکھ کر

تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

میں گالیاں دوں گی تو وہ خاموش رہے گی
بیلن سے جو ماروں تو وہ کچھ نہ کہے گی
گھر سے جو نکالوں تو کہیں جا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

پکچر مجھے ہر روز وہ لے جا نہ سکے گی
ساڑی نئی ہر ماہ مجھے لا نہ سکے گی
کھانے مرے ہاتھوں کے پکے کھا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

نخرے نہ سہے یہ نہ مرے ناز اٹھائے
غمزوں پہ مرے یہ کبھی قربان نہ جائے
شوہر مرا ہونے پہ، یہ اِترا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

ٹکڑوں پہ مرے باپ کے یہ پل نہ سکے گی
نوکر کی طرح پیچھے مرے چل نہ سکے گی
بازار سے سودا یہ کبھی لا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

بٹھلاؤں تو بیٹھے نہ اٹھاؤں تو اُٹھے گی
ہر دم نہ اشاروں پہ مرے ناچ سکے گی
ہر وقت قصیدے یہ مرے گا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

کپڑے یہ صفائی سے مرے دھو نہ سکے گی
نیچے یہ مسہری کے مری سو نہ سکے گی
بچے مرے روئیں گے تو بہلا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

بھولے سے جو خوشنودی کا اظہار کروں گی
غلطی سے وفاؤں کا جو اقرار کروں گی
تعریف کروں گی تو یہ شرما نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

تصویر میں خوبی ہے تو بس ایک یہی ہے
یہ شعر و سخن کی تو نحوست سے بچی ہے
اشعار سُنا کر مرا سر کھا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکی گی

(فروری ۹۳ء)

قطعات

جب میں کنوارا تھا تو پریشان تھا بہت
احباب طعنہ دیتے تھے شوہر نہیں ہوں میں
شادی ہوئی تو میں نے اکڑ کر یہ کہہ دیا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

شب کو بس اسٹانڈ پہ اک نوجواں نے یہ کہا
صبح دم آیا تھا یہیں شب کا اندھیرا ہوگیا
ایک مرد پیر نے یہ سن کے فرمایا میاں
میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہوگیا

سیکس ایجوکیشن شریکِ درس ہونا چاہیئے
لیکن اس میں احتیاط اس بات کی فرمایئے
جس قدر تعلیم ہو اسکول ہی میں دیجئے
ہوم ورک اس کا مگر بچوں سے مت کروایئے

(ستمبر ۱۹۸۶ء)

★

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

غزلیں

جیب میں موٹی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
پیٹ کا درد بھی کم ہو تو غزل ہوتی ہے

مرغ و بریانی سے اے دوست نہیں کچھ ہوتا
ہاتھ میں ساغرِ جم ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف اک چولھا جلانے سے غزل کیا ہوگی
آنکھ دھوئیں سے بھی نم ہو تو غزل ہوتی ہے

یہ حقیقت ہے نہیں اس میں تصنع بزمی
کوئی رسوائی نہ غم ہو تو غزل ہوتی ہے

(جنوری ۷۲ء)

○

پاس ہو جب مال و زر تو پھر ہنسی اچھی لگے
اس کے عارض کی چھلکتی چاندنی اچھی لگے

شہر میں جب خوب محشر خیز ہنگامے ہوئے
بند کمرے کی مجھے یہ خامشی اچھی لگے

رہنما یہ پوچھتا ہے مجھ سے جب بعدِ فساد
کیا ہوا کیسے ہوا یہ سادگی اچھی لگے

پاس آؤ بیٹھ جاؤ، کون ہو کیا چاہیے
یہ تری قاتل ادا دل کو بڑی اچھی لگے

نت نئے رستوں سے ہو جب رشوتوں کی بارشیں
تیسرے درجے کی بھی پھر نوکری اچھی لگے

یہ جہاں ہے فتنہ پرور جانیے بزمیؔ میاں
[illegible] انھیں مظلوم آنکھوں میں نمی اچھی لگے

○

بستی، بستی، قصبہ قصبہ نفرت کی بیماری جی
کوچہ کوچہ شہروں میں بھی لاشوں کے بیوپاری جی

حق کی بات کرو تو بھیا زنداں اور زنجیریں ہیں
مظلوموں پہ اور مظالم شیوہ ہے سرکاری جی

○

سوز خواں ہوں گے کبھی قوال بن جائیں گے ہم
روئیں گے خلوت میں محفل میں غزل گائیں گے ہم

چشمِ ساقی کا اشارہ جس گھڑی پائیں گے ہم
محتسب کو ساتھ لے کر خم میں گھس جائیں گے ہم

جنگ بازوں کا یہ کہنا ہے کہ اک دن دیکھنا
آگ میں ایٹم کے بھٹے بھون کر کھائیں گے ہم

(اپریل ۷۹ء)

گرمی میں

شبِ وصال کا مت پوچھ حال گرمی میں
وبالِ جان ہے دل کا اُبال گرمی میں

نہ گرم باہوں کے حلقے میں لیجیے مجھ کو
کہ دور رہ کے ہوں آسودہ حال گرمی میں

رئیسِ شہر کا کتا پیئے میاں لسی
غریب کو تو ہے پانی محال گرمی میں

نہیں ہے فین تو زلفوں کی ہی ہوا دیجے
خدارا کیجیے کچھ تو خیال گرمی میں

ہوا بھی صبح سے چلتی ہے تمتمائی ہوئی
ہے آفتاب کا اس پر جلال گرمی میں

ہے سر پہ چھت نہ کوئی سائبان آنچل کا
غرور [illegible] کا بوجھ نہ تھا [illegible] گرمی میں

آم چھو

بگڑ رائچوری

آم چھو، املی چھو کالا رے بنگالہ چھو
جس پر میرا چلے نہ جادو، اُس کے مُنہ پہ آخ تھو

ماں کے تیور پھول کی ڈالی، باپ کا غصہ ٹھنڈی آگ
کیا کرے گا قاضی بچارا جب راضی ہیں، میں اور تو

سوتیلی ماں سر والا ہے، ماں مرے تو باپ چچا
وقت پڑے تو گدھا بی کاکا، بی جمالو کس کی بُو!

تن کے اُجلے، من کے کالے، مل کو نکلیں راکھو بھبوت
چیلاں بی اب مُرشد بن کو ہر دم کرتیں ' اللہ ہُو '!

ہپّی بن گئیں بھائی ہمارے اُن سے گوشہ پیدا کیا
چاندنی راتاں میں آ بہلی بل کو کھیلیں بگڑی چھو

آم چھو، املی چھو کالا رے بنگالہ چھو ــــ!
جس پہ میرا چلے نہ جادو، اُس کے مُنہ پہ آخ تھو

(مئی ۱۹۷۲ء)

نظم

لنگڑی گھوڑی لگام توڑی
بچھاڑے جا کو بدنا پھوڑی
واہ رے واہ کیسی ہے جوڑی
راجہ گونگا رانی بوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

ناچو کودو تگڈم تگڈم!
رتنا لے پو سا ہے دھم
اُلٹا سیدھا ہے اب سرگم
بھاگیسری پہ میاں کی توڑی
لنگڑی گھوڑی ......

سینما کا اثر ہے ایسا
پیار کیا تو ڈرنا کیسا
بھاگ گئے لے کو گھر سے پیسا
ایک بھگوڑا ایک بھگوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

بادشاہوں کو خادموں کو
عالموں کو جاہلوں کو
اچھے اچھے معصوموں کو
موت یہ ظالم کس کو چھوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

آج کی تفریح جھوٹا جھگڑا
جھگڑا پھر تگڑے سے تگڑا
جاں بھی دیکھو رگڑم رگڑا
توڑم توڑی پھوڑم پھوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

رنگ دکھارے یہ دھن کا
لٹیاں سے ہے گھر میں اُجالا
ہر سالن میں گرم مسالا
چانول کھاریں روز پھوپڑی
لنگڑی گھوڑی ......

غربت جب پاؤں پھیلائی
رشوت پہ نیت للچائی
غیرت میرے آڑے آئی
عزت دے دی کان مروڑی
لنگڑی گھوڑی ......

قدرت سے کریں اب جنگ
فیملی پلاننگ کا ہے رنگ
دیکھ کو دُنیا ہو رہی ہے دنگ
بچے ہو رہیں جوڑی جوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

پنڈلیاں منگ کو کب تک پینا
پھٹے کپڑے کب تک سینا
مشکل ہے بگڑ کا جینا
خرچہ بڑھ کو تنخواہ تھوڑی
لنگڑی گھوڑی ......

(اکتوبر ۱۹۷۶ء)

غزلیں

بُلبل کاشمیری
(لندن)

○

تجھے کس طرح تیز رفتار کھانسی — کہ اک دم میں آتی ہے سو بار کھانسی
مکرّر مکرّر یہ تکرار کھانسی — پہ پیچھے جاتی ہے وار پہ وار کھانسی
وہ بولے کہ بادل گرجتے ہیں باہر — میں بولا کہ اندر ہے سرکار کھانسی
وہ خلوت میں باتیں کریں بھی تو کیسے — مخل ہو گئی موسلادھار کھانسی
یکایک جو بیت الخلا کھٹکھٹایا — تو اندر سے آئی گرجدار کھانسی
کسی کو بلانا ہو ہلکا سا کھانسو — مبادا ہو اُس پر گراں بار کھانسی
مزے سے تھے سوئے ہوئے بال بچّے — تو بڑھیا کو آئی لگاتار کھانسی

(اگست ۱۹۹۲ء)

○

معتدل ہو کر رہو ماہ ستمبر کی طرح — سرد مہری نہ دکھاؤ تم دسمبر کی طرح
بن کے گاندھی جی جو تھے بالکل تشدد کے خلاف — اب تشدد پر اُتر آتے ہیں ہٹلر کی طرح
اُن کا گنجا پن ہے یا پیری میں کم نظری مری — اُن کا سر لگتا ہے مجھ کو سنگِ مرمر کی طرح

پیر و مرشد ملتے ہیں سب پرندے اب مجھے
سیرت و صورت میں بُلبل ہے قلندر کی طرح

(مارچ ۱۹۹۳ء)

○

یہ بڑا دن ہے مقدس ہے کرسچن کے لیے — تکتے تکتے سال گزرا ہے اسی دن کے لیے
آج گرجے میں گئے ہم بھی عبادت کے لیے — حضرتِ عیسیٰ کے سارے نام گن گن کے لیے
ہیں یہ تحفے جو کرسمس کے درختوں کے تلے — میں بتاتا ہوں سجائے ہیں یہ کن کن کے لیے
دور شہروں سے چلے آئیں گے وہ سارے عزیز — ان چراغاں کی سجاوٹ کی ہے جن جن کے لیے
یہ محبت کے تحائف بانٹ دیں گے سب میں ہم — کوئی جولی کے لیے ہے کوئی رابن کے لیے
ہے یہ رم ان کے لیے آئیں جو رم کھاتے ہوئے — منتظر ہیں ہم انہی کے جن یہ ہے جن کے لیے
اتنی پی لیں گے کہ ہر پتھر سے ٹکرائیں گے ہم — سال بھر پتھرا گئیں آنکھیں اسی دن کے لیے
مے سے دامن تر بھی ہو تو آج کے دن ہے روا — عید ہے اِک خشک تقویٰ مردِ مومن کے لیے

کیا بنائے گا کرسمس کے شجر پر آشیاں
اُڑ رہا ہے آج بُلبل چونچ میں تنکے لیے

(جنوری ۱۹۹۲ء)

مےرَم (RUM)   مےجن (GIN)

صبغۃ اللہ تمباٹ (حیدرآباد)

آئینہ

گھر میں داخل ہوا تو بیگم نے   یوں کہا اضطراب سے مجھ کو
آپ کے دوست جو ریاض ہیں نا   اُن سے فوری یہ بات جاکے کہو
وہ نہ سلطانہ سے کریں شادی   مل سکے گا کبھی نہ سکھ اس کو
ویسے تو جاہل ہے اور پھوہڑ ہے   دوسرے بد دماغ بھی ہے وہ
اک پل سوچ کر کہا میں نے   روکوں اس کو نہ ہوگا یہ مجھ سے
اس نے روکا تھا کب مجھے بیگم   جب کہ گھر لا رہا تھا میں تم کو

(اپریل ۷۵ء)

○

میرے دل کے بینک کا اک دم دوالہ ہوگیا   تابہ گوں کے آنکھ کھولا تو اجالا ہوگیا
مدتوں سے گھر کے کونے میں پڑا ہوں دیکھیے   میں تمھارے عشق میں مکڑی کا جالا ہوگیا
کیوں جفا کی سِل پہ تم نے پیس ڈالا میرا دل   قلبِ عاشق گویا بیگن کا مسالا ہوگیا
"لیلیٰ مجنوں" کے ٹکٹ میں نے خریدے تھے بلیک   آپ کو ممی کا ڈر اور میرا گھٹالا ہوگیا
عشق میں تمباٹ ان کی نوکری بھی چھٹ گئی   ٹھوکریں کھا کر جو سنبھلا، پان والا ہوگیا

(مارچ ۷۵ء)

لباس کا انتخاب

یہ طے ہے سلمیٰ کی شادی ہے ہم کو جانا ہے   مگر بتاؤ کہ ہم سب کو کیسا پہننا ہے
کہا یہ پہلی نے "پہنوں گی چاکلیٹی لباس   کہ رنگ بالوں کا ان کے تو چاکلیٹی ہے
تو دوسری نے کہا "اس کے مطابق یہ ہوں گے   پہنوں گی بھورے اجلی سلک کی ساری کہ
کہ ان کے بالوں میں اب چاندنی جھلکتی ہے
بڑی ٹھسک سے کہا "تیسری سہیلی نے   کہ ہم تو آئیں گے بنو، سیاہ جوڑے میں
سیاہ بال ہیں ان کے سیاہ چہرہ ہے   مگر تمھاری قسم دل کا وہ کھنڈلا ہے
جھجک کے چوتھی سہیلی نے زیرِ لب یہ کہا   ہمارے وہ جو ہیں ان کی تو صاف چندیا ہے
میں سوچتی ہوں کہ میرا لباس کیا ہوگا!

(جون ۷۳ء)

بوگس حیدرآبادی

"ظلم غزل" کی غزل پر غزل

کون سا وقتِ ملاقات کسے پیش کروں
دل کسے پیش کروں رات کسے پیش کروں

ہر حسیں ہے مرضِ ہجر کا بیمار یہاں
دل ہے اک زندہ طلسمات کسے پیش کروں

کوئی سنتا نہیں دیوان لیے پھرتا ہوں
اپنی بکواس خرافات کسے پیش کروں

دل پہ آشنا کی نظر جیب پہ رویا کی نظر
سوچتا ہوں کہ حوالات کسے پیش کروں

گھر میں بیگم ہے تو دفتر میں ہے افسر ہم
میں پریشان ہوں کہ خدمات کسے پیش کروں

دل ہے صرف ایک مگر اس کے طلبگار ہزار
آپ فرمایئے حضرات کسے پیش کروں

رنگ پکا ہے یہ کہہ کر مجھے دھتکار دیا
ایسے ارمانوں کی بارات کسے پیش کروں

(مارچ، اپریل ۷۳ء)

○

جب پھینک دیا میں نے بھی اک مطلع اٹھا کے
ہونے لگے تعریفوں کے محفل میں دھماکے

کر دیتے ہیں میری شبِ فرقت کو شبِ وصل!
خود پیاس بجھا جاتے ہیں وہ خواب میں آ کے

میں جس کو لگا دوں وہی جنت میں چلا جائے
لایا ہوں نیا جوتا میں مسجد سے چرا کے

اس دل کی خوشی یاد ہے جب مجھ سے ملے تھے
اک روز چنبیلی کے وہ منڈوے تلے آ کے

کرتی نہیں چالان حسینوں کا پولس کیوں؟
جب ڈالتے ہیں یہ بھی دل و جان پہ ڈاکے

اک غنڈے کے ہمراہ روانہ ہوئے لندن
دو تین برس تک وہ مجھے گول پھرا کے

تعریفوں کے پل باندھ دیے زندہ دلوں نے
بوگس نے سنائی جو غزل بزم میں آ کے

○

جو لڑتی ہے وہ محبوبہ فلاں بنتِ فلاں کیوں ہو
"کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو"

اگر سچی محبت ہے تو پھر بکواس کیا معنی
"نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو"

وہ روٹھی ہیں تو روٹھیں ان سے اچھی دیکھ لیں گے ہم
"سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو"

غلط تعمیر دیکھیں اور نہ توڑیں بلدیہ والے!
"تو پھر اے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"

کوئی بھڑوں کا اڈہ یا جوئے خانہ کوئی ہوگا
"گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو"

ملاوٹ بھی گرانی بھی ہے اور بے روزگاری بھی
"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

یہ مانا مہرباں نام ہے اس کا مگر بوگس!
"ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو"

(اپریل ۷۴ء)

اعجاز الدین پاپلر

اُمیدوار میں بھی ہوں

میں بے قرار ہوں مدت سے ممبری کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے
میں ایک عمر سے ہوں مفلسی کی چادر میں نہیں ہے روکھی بھی روٹی میرے مقدر میں
مرا سفینہ ہے آلام کے سمندر میں
میں ایک بوجھ ہوں خود اپنی فیملی کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

ٹکٹ کے واسطے غیرت بھی بیچ سکتا ہوں میں خاندان کی عزت بھی بیچ سکتا ہوں
کہے تو اپنی شرافت بھی بیچ سکتا ہوں
مجھے سکون ہے درکار زندگی کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

نواز دو صرف مجھے مہربانی فرما کر میں وعدہ کرتا ہوں اک ایک سے قسم کھا کر
کہ پانچ سال سے پہلے یہاں کبھی آ کر
بنوں گا باعثِ زحمت نہ میں کسی کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

میں سنگ ریزے سے گوہر بنا دیا جاؤں میں ایک قطرہ سمندر بنا دیا جاؤں
عجب نہیں کہ منسٹر بنا دیا جاؤں
میں ہر طرح ہوں مناسب منسٹری کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

ہر ایک طرح کی تگڑم سے آشنا ہوں میں جو رہزنوں سے نہیں کم وہ رہنما ہوں میں
ملی جو کرسی تو پھر دیکھنا کہ کیا ہوں میں
ہزار راہیں ملیں گی شکم پری کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

ہنسو نہ اس پہ کہ امیدوار گنجا ہے کہ سخت میرے خیالات کا شکنجہ ہے
جو چلنے دے نہ کسی کی وہ میرا پنجہ ہے
میں اچھا شخص ہوں ہر اچھے آدمی کے لیے ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

ہنر پرست ہوں ہر صاحبِ ہنر کی قسم فراقؔ و جوشؔ کی اصغرؔ کی اور جگرؔ کی قسم
ہلالؔ و ناظمؔ و شہبازؔ و پاپلرؔ کی قسم
میں کام آؤں گا شاعر برادری کے لیے
ٹکٹ مجھے بھی دلا دو اسمبلی کے لیے

(دسمبر ۵۸ء)

پاگل عادل آبادی

○

بن گئے رہبر شکاری وہ خدا خیر کرے
جو نہیں جانتے کیا چیز ہے گن باپ رے باپ

دام کیوں کر نہ بچھے کیوں نہ ہوں بھٹکے بکرے
دال سب چھوڑ کے کھاتے ہیں مٹن باپ رے باپ

وقت کہتا ہے گدھوں کی بھی بڑائی نہ کرو
کہیں کہنا نہ پڑے مصلحتاً باپ رے باپ

سنتے ہیں شیخ نے کل پی کے جو کی تھی گڑبڑ
نام پر اس کے بھی نکلا ہے سمن باپ رے باپ

پہن کر پھولوں کا بش شرٹ جو چلتے ہیں پاگل
نظر آنے لگے ہیں وہ بھی چمن باپ رے باپ

○

جہاں دیکھتا ہوں جدھر دیکھتا ہوں
سبھی کو میں ٹکنی کلر دیکھتا ہوں

کچھ ایسے بھی اب جونیئر دیکھتا ہوں
جنھیں باپ سے سینیئر دیکھتا ہوں

شکر مل رہی ہے یا خیرات لوگو
جو کیو میں کھڑا گھر کا گھر دیکھتا ہوں

ذبح ہونے بکرے چلے آ رہے ہیں
دعاؤں میں اپنی اثر دیکھتا ہوں

مرے نام جائیداد ساری جو لکھ دے
میں دل والا ایسا خسر دیکھتا ہوں

ذہن میں ابھرتا ہے کمرے کا نقشہ
ستمگر کی جب بھی کمر دیکھتا ہوں

ہر اک شے پہ کنٹرول ہے میرے ہمدم
یہ سوشلزم کا اثر دیکھتا ہوں

یوں کہنے کو ان کی کئی ڈگریاں ہیں
مگر ان کی نالج صفر دیکھتا ہوں

میسر نہیں ہے مجھے چلو پانی
مقدر میں ان کے ڈنر دیکھتا ہوں

ہر اک گھر میں جاری ہے دن رات شوٹنگ
میں فلموں کا ایسا اثر دیکھتا ہوں

بھروسہ کسے ہے کہ پلٹیں سلامت
میں خطرے سے پر ہر سفر دیکھتا ہوں

ہے کچھ تو تعلق ترا افریقہ سے
جو ڈانبر سے کالا کلر دیکھتا ہوں

لگے اب تو مرغے بھی کرنے غٹرغوں
ملاوٹ کا شاید اثر دیکھتا ہوں

کفن بھی لگے سلنے اب چھینٹ کے ہی
میں مردے بھی ٹکنی کلر دیکھتا ہوں

ستم ہے کہ چوری کے ہر مال میں اب
میں پولس کو بھی پارٹنر دیکھتا ہوں

ٹرانسفروں کے تصدق میں پاگل
شب ہجر کو مختصر دیکھتا ہوں

(جنوری ۸۸ء)

○

ستم بیگم کا میری یہ زمانے سے نرالا ہے
کبھی گردن کا قفل اس نے مرے ہونٹوں پہ ڈالا ہے

ذرا سا گنگنانے کی اجازت بھی نہیں مجھ کو
مگر اس کا سدا "چالو" [illegible] ملا ہے

○

گملوں میں ایک ایسا بھی گملا دکھائی دے گنجوں کے ہاتھ میں مجھے کنگھا دکھائی دے
واعظ کے گھر میں خود مجھے لفڑا دکھائی دے گڑ کا پرہیز گلگلے کھانا دکھائی دے
بچے یتیم خانے کے مرچل ہیں سب مگر منشی یتیم خانے کا بھینسہ دکھائی دے
نیرنگیٔ حیات کے قربان جائیے مرغی کے بدلے انڈوں پہ مرغا دکھائی دے
دعوت بغیر کیسے گھسوں جب کہ گیٹ پر ہاتھوں میں میزبان کے ٹھینگا دکھائی دے
باوا کی جب نماز جنازہ پڑھی گئی مسجد سے دور بیٹا ٹہلتا دکھائی دے
بیگم کی گود میں مجھے ہر سال ایک تحفہ منّی دکھائی دے کبھی منّا دکھائی دے
چہرے پہ جس کے ناک ہے گز بھر کی دوستو دیکھو جو غور سے اسے نکٹا دکھائی دے
جو تیس مار خاں ہے وہ دادا ہے شہر کا وہ بھی تو گھر میں جورو سے ڈرتا دکھائی دے
ہے بالغوں کی فلم مگر جا کے دیکھیے نابالغوں کا ہال پہ قبضہ دکھائی دے
سروس کے انتظار میں پاگل کا تھوبڑا
گٹھلی بغیر آم کا چھلکا دکھائی دے

(نومبر ۸۷ء)

ڈبے کا دودھ پی کر بچے جو پل رہے ہیں وہ سب جوان ہو کر بڈھے نکل رہے ہیں
تنہائی کے بہانے مجنوں پھسل رہے ہیں لیلیٰ کی سہیلیوں پر نیت بدل رہے ہیں
جو لوگ بلدیہ کے دفتر میں پل رہے ہیں گھر بیٹھے مفت کی وہ تنخواہ نگل رہے ہیں
جا پیر سمجھ کے یارو تم سے یہ تل رہے ہیں سسرال والے مجھ کو کچا نگل رہے ہیں
اس دور ڈالڈا کا یہ بھی اثر ہو شاید شیراں دبک رہے ہیں گیدڑ اچھل رہے ہیں
تم شوق سے کراؤ فیملی پلان پھر بھی مانند کھٹملوں کے بچے ابل رہے ہیں
دادا گری میں باوا کچھ کم نہیں تھے لیکن باوا سے بڑھ کر چالو بیٹے نکل رہے ہیں
فیشن کے ریس میں اب لونڈوں کی بات چھوڑو خرانٹ بڈھے گھوڑے سرپٹ نکل رہے ہیں
ان بیبیوں کو شاید یہ بھی خبر نہیں ہے زلفوں کے گھونسلوں میں بلبل بھی پل رہے ہیں
مرغوں کی بات چھوڑو دیکھو بچھڑے چھوڑ لیڈر بکرے بھی بن کے ڈکارتے نکل رہے ہیں
کیا بات ہے کہ پاگل اس دور ارتقا میں
تہذیب نو کے انڈے گندے نکل رہے ہیں

(اپریل ۹۴ء)

پریم وار برٹنی

شادی کے بعد

گھر میں آئے گی کوئی حورِ ارم شادی کے بعد — اس تمنا نے بہت ڈھایا ستم شادی کے بعد

یہ سراپا ہے ترا یا گوشت کا کوئی پہاڑ — آئینہ تو دیکھ لے میرے صنم شادی کے بعد

زندگی آخر کوئی پھانسی کا پھندا تو نہیں — کیوں گھٹا جاتا ہے ارمانوں کا دم شادی کے بعد

گالیاں دینے سے پہلے بند تو کرلے کواڑ — کم سے کم اتنا تو کر مجھ پر کرم شادی کے بعد

مفلسی میں قافیہ جب تنگ، ہوتا ہی گیا — کر دیا میں نے قلم کا سر قلم شادی کے بعد

میرا کمرہ اور ہے، بیگم کا کمرہ اور ہے — وصل کی شب بھی نہیں ہوتے بہم شادی کے بعد

پہلے پیتے تھے برانڈی اِک سے اِک بڑھیا برانڈ — اب تو ٹھرا بھی نہیں وہسکی سے کم شادی کے بعد

ایک تو کیا دو جڑواں چاند پیدا ہوگئے — چلنے پائے تھے ابھی دو ہی قدم شادی کے بعد

جس کے سالے ہوں بہت اور ایک بھی سالی نہ ہو — وہ بشر کس سے کہے رودادِ غم شادی کے بعد

عمر بھر رہتے کنوارے اور جیتے ٹھاٹھ سے — کاش ہم لے سکتے دوبارہ جنم شادی کے بعد

کار تو کیا ہے تمہیں لے دوں گا ہیلی کوپٹر — لاٹری آجائے بس تیری قسم شادی کے بعد

وہ تو اپنا لنچ کھالیتی ہیں آفس میں مگر — گھر میں چولھا پھونکتے رہتے ہیں ہم شادی کے بعد

اب تو لے آؤں گا میں بھی پندرہ پیسوں میں پتی — کر دیا ہے ناک میں بچوں نے دم شادی کے بعد

ساتھ جینے اور مرنے کی وہ قسمیں کیا ہوئیں — کھل گیا بیوی کی باتوں کا بھرم شادی کے بعد

نیل پالش، پاؤڈر، بندی، کریم اور لپ سٹک — کب تلک دیں گے انہیں لا لا کے ہم شادی کے بعد

میں نے سمجھا تھا اسے ننھی سی نازک پھلجھڑی — بن گئی جو ایک پُراسرار بم شادی کے بعد

کر دیا اس نے تو بیگم کے تشدد کو بھی مات — ساس نے ڈھایا ستم پر جو ستم شادی کے بعد

میں پتی بھی ہوں پتا بھی، جاؤں تو جاؤں کہاں — یعنی میرا دو شکنجوں میں ہے دم شادی کے بعد

شادی کرنا ہے تو ترکِ شاعری کر دیجیے — مشورہ میرا ہے یہ اہلِ قلم شادی کے بعد

پریم صاحب ہوگئی پہلے ہی دن اپنی طلاق
چل دیئے پھر اپنے اپنے گھر کو ہم شادی کے بعد

(جون ۱۹۷۳ء)

تنگ عنایت پوری (سیوان)

وفادار بندر

گاندھی جی ایک رات مجھے خواب میں ملے
چلتے رہے سوال، جوابوں کے سلسلے

کہنے لگے کہ تنگ کہو خیریت تو ہے
اپنے وطن میں امن و اماں عافیت تو ہے

میں نے کہا حضور دعائیں ہیں آپ کی
میں جائیداد بیچ کے کھاتا ہوں باپ کی

پڑھ لکھ کے لختِ دل مرا بے روزگار ہے
اس پر بھی بھوت شعر و سخن کا سوار ہے

جو خوب چل رہا تھا وہ ہے مندا کاروبار
بنیوں کی مہربانی ہے کھاتا ہوں میں ادھار

وہ کاروبار کیا ہے جو آج آیا کل گیا
اس آسری پہ مجھ کو بھروسہ نہیں رہا

داروغہ جی کو ٹیکس تو ہر ماہ دیجیے
رشوت کی شکل میں انھیں تنخواہ دیجیے

وہ تو خدائے پاک کا احسان ہے جناب
تیزی پہ شاعری کی یہ دوکان ہے جناب

کہنے لگے کہ دیش کا کچھ حال تو کہو!
کیا تینوں بندروں کے ہیں اعمال تو کہو

میں نے کہا کہ آپ کے بندر مزے میں ہیں
سرکار کے اصول کے اندر مزے میں ہیں

جو بہرہ تھا وہ رہتا ہے لیڈر کے ساتھ ساتھ
جو اندھا تھا وہ چلتا ہے افسر کے ساتھ ساتھ

جو گونگا تھا وہ دورِ سیاست میں ہے مہان
مقبول ہو گیا ہے وہ جنتا کے درمیان

یہ بندر آج کل تو سیاست کی جان ہیں
اکیسویں صدی کے یہ تینوں مہان ہیں

(جنوری ۹۰ء)

جدا رکھنا

تم ظلم و تشدد کی مسموم فضا رکھنا
اس ملک کے ہندو کو مسلم سے جدا رکھنا

جنتا کو جو نفرت کی دلدل میں پھنساتا ہو
اسٹیج پہ بھاشن کی جوشیلی ادا رکھنا

نکلا ہوں سفر پر میں اس دور میں کب کیا ہو
گھر لوٹ کے آنے تک محفوظ خدا رکھنا

تقریر تو واعظ کی اس دور میں ہے جیسے
سرمایہ دار کی بستی میں سیلون کھلا رکھنا

استاد سے سنی ہو اچھی جو غزل کوئی
دو چار حسینوں کو تم سامنے لا رکھنا

استاد تجھے دیں گے غزلیں تو بہت لیکن
اے تنگ تو محفل میں پڑھنے کی ادا رکھنا

(دسمبر ۹۱ء)

خوب صورت مشورہ

اک جواں جوڑا ہوا اک روز کشتی میں سوار ... جھومتے تھے پانی کے دھارے فضا تھی خوش گوار
شوہر و زن کے بغل میں جلوہ گر تھی بوڑھی ماں ... نیچے تھا بہتا سمندر اور اوپر آسماں
بات میں مصروف تھے بیٹا بہو، ماں تھی خموش ... اس جواں جوڑے کے دل میں آرزوؤں کا تھا جوش
آگے بڑھتی جا رہی تھی کشتی اک انداز سے ... شوہر و زن جھومتے تھے مستیوں میں ناز سے
پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور بھی کچھ کشتیاں ... تھے سواراں کشتیوں پر سیکڑوں بوڑھے جواں
یک بہ یک موسم کا جادو کشتیوں پر چل گیا ... یعنی وہ بہتا سمندر آندھیوں میں ڈھل گیا
اس جواں جوڑے کی کشتی بیچ میں تھی بے اماں ... جانبِ کشتی بڑھی آتی تھیں اندھی آندھیاں
کھاتی تھی ہچکولے اس جوڑے کی کشتی بار بار ... موت کے آغوش میں تھے اس سفینے کے سوار
بچنے کی صورت نہ تھی کیوں کہ کنارا دور تھا ... کیسے کشتی کو بچاتا ناخدا مجبور تھا
اتنے میں اس بوڑھی ماں کے دل میں آیا یہ خیال ... آندھیوں کی زد سے اس کشتی کا بچنا ہے محال
اس نے بیٹے سے کہا لے کر بہو کو کود جا ... تیر کر اپنی دُلھن کی زندگی بیٹا بچا
میں تو بوڑھی ہوں مرا کیا ڈوب کر مر جاؤں گی ... مرتے مرتے میں بہو بیٹے کے کام آ جاؤں گی
ساس کا یہ مشورہ سُن کر بہو بولی "نہیں" ... آپ کے اس مشورے سے رائے ہے میری حسیں
آج بوڑھی ماں کو بیٹے کا سہارا چاہیے ... بچ نکلنے کے لیے ہمت کا دھارا چاہیے
اس نے شوہر سے کہا ماں کو بچانا فرض ہے ... اس کٹھن لمحے میں ماں کے کام آنا فرض ہے
تیر کر اب آپ بوڑھی ماں کو لے کر جائیے ... آپ میرے واسطے مطلق نہیں گھبرائیے

ایک کو آواز دوں گی تو کئی آجائیں گے
میں جواں ہوں مجھ کو تو لاکھوں بچانے آئیں گے

(نومبر ۸۷ء)

ο

سب کی نظروں میں رہا جو تیرے شوہر کی طرح
اس کو سمجھا ہے ترے باپ نے نوکر کی طرح

ڈالیاں توڑ کے رکھ دی ہیں غزل کی اس نے
مجھ کو لگتا ہے وہ شاعر کسی بندر کی طرح

ο

قطعات

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(اسلام آباد)

ٹیلی فون

عشق ٹیلی فون پر بیوپار ٹیلی فون پر
کیا نہیں ہوتا مرے سرکار ٹیلی فون پر
حد تو یہ ہے رات آپریشن کرا کے چل بسا
ڈاکٹر صاحب سے اک بیمار ٹیلی فون پر

مہمانانِ گرامی

گھر پہ آن اُترے ہیں مہمان خدا خیر کرے
سخت مشکل میں ہے پھر جان خدا خیر کرے
صرف مہمان جو ہوتے تو کوئی بات بھی تھی
ہاتھ میں ان کے ہیں دیوان خدا خیر کرے

کانٹے

پیار میں جان ہار کر پیارے
ہم نے پھولوں کے ہار بانٹے ہیں
میرے پاؤں اور اُن کے کانوں میں
مختلف قیمتوں کے کانٹے ہیں

یک نہ شد دو شد

کیوں نہ اس کو میں حضورم یک نہ شد دو شد کہوں
یہ ستم کچھ کم نہیں ہے دل دُکھانے کے لئے
چور صاحب دو عدد ٹی وی اڑا کر لے گئے
ایک اپنے واسطے اور ایک تھانے کے لئے

(اگست ۱۹۹۲ء)

علم کا رعب

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے جو تم نے ایم اے تو
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

خرگوش

نہیں کچھوے کا اس میں دوش کوئی
کہ سوتا ہی نہیں خرگوش کوئی
میاں! اینٹی سلیپنگ پلز کھا کر
ہو کیسے خواب میں مدہوش کوئی

ڈاکٹر

اک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یُوں
آسان راہ کرتا ہے دشوار کس لئے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہُوا ہے تُو بیمار کس لئے

ملازم

ملازم گھر پہ رکھ لیں آپ ہم دونوں کو صاحب جی
کرو اِن حال میں ہم اُتریں گے پورے آزمانے پر
میں باورچی ہوں فنِ شعر پر ہے دسترس مجھ کو
یہ مالی ہے مگر پیدا عبور اس کو ہے بجانے پر

تعلیم

کیوں پریشاں ہو زوالِ علم کے اسباب پر
میں بتاتا ہوں تمہیں یہ آجکل کے چھوکرے
اپنے بستے میں کتابوں کی جگہ لاتے ہیں کیا
اک سیاست کا کریٹ اور عشق کے دو ٹکے

(ستمبر ۱۹۹۰ء)

میرا بٹیر ★

میرا بٹیر بننے کو ہے رہنمائے قوم! پنہاں [illegible] اس کی چونچ میں اندیشہ ہائے قوم
تنہا ہی خود کو جانتا ہے وہ بجائے قوم وہ دعوتیں اُڑاتا ہے لیکن برائے قوم

جیتا ہے اور مرتا ہے نیشن کے واسطے
تیار ہو رہا ہے الیکشن کے واسطے

وہ اپنے ہی بٹیروں کا حلقہ بنائے گا وہ ان کو اپنی چال کے اوپر لگائے گا
وہ لات مارنے کا انہیں فن سکھائے گا اپنے ہر ایک چمچے کو آگے بڑھائے گا

اپنی گلی میں رہ کے لڑے گا وہ پالیاں
دے گا لپیٹ کر وہ دوشالے میں گالیاں

میرا بٹیر پنجرے میں جب تک کہ بند تھا وہ سوشلسٹ اور ترقی پسند تھا
تھا مبتلائے حبِ وطن دردمند تھا ایمان اور کفر کی زد سے بلند تھا

لیکن وہ جب سے قید سے آزاد ہو گیا
پہنچا جہاں، فرشتوں کا استاد ہو گیا

وہ پھونک کر بٹیروں کو اپنے کھلائے گا [illegible] اپنی ہتھیلیوں پہ پھر ان کو کودائے گا
پھر چونچ مارنے کا سلیقہ سکھائے گا پھر رفتہ رفتہ اپنا الیکشن لڑائے گا

لڑتا رہے گا کفر اور اسلام کے لئے
اسلام کے لئے کبھی اصنام کے لئے

لائے گا اس قماش کے وہ ڈھونڈ کر وزیر جو جا کے غیر ملکوں میں بن جائیں گے فقیر
وہ نورتن کہ جن کی نہ ہو گی کوئی نظیر شمشیر در نیام مگر شوخ و چِچھ گیر

لٹو کی طرح گھومیں گے جو شاخسار میں
لیکن نہ ہوں گے اپنے ہی وہ اختیار میں

میرا وطن بٹیروں کی آماجگاہ ہے! جمہوریت کا ناچ ہے اور واہ واہ ہے
سنتا ہوں غیر ملکوں سے بھی رسم و راہ ہے جو ہیں شریف زندگی ان کی تباہ ہے

یہ کیا کریں کہ ہم کو ہے چسکا لگا ہوا
بازو پہ ہے بٹیروں کے مسکا لگا ہوا

سید محمد جعفری

★ پاکستان کے سیاسی حالات پر ایک طنز

(اکتوبر، نومبر ۶۲ء)

رشید عبدالسمیع جلیل (حیدرآباد)

می رقصم

وہ جھانسہ دے کے غائب ہے سرِ بازار می رقصم
بھروسہ کرکے دھوکے باز پریے کار می رقصم

سناتا ہوں میں ہر محفل میں اکلوتی غزل اپنی
نہیں ملتی اگر کچھ داد تو سو بار ہی رقصم

کیا کرتے تھے اوور ٹیک جا وا پر حسینوں کو
ہوئی آلوڑ کی وہ ٹکر کہ آخر کار می رقصم

وہ رکشے پر گزرتی ہے میں پیدل ٹاپ لیتا ہوں
خیالوں میں پکڑ کر دامن دلدار می رقصم

کیا تھا اس نے اک وعدہ اشاروں میں کبھی مجھ سے
نہ جانے کب وفا ہوگا پس دیوار می رقصم

نشہ اترا تو بتلایا مجھے لوگوں نے آ آ کر
بہت اچھلم بہت کودم برہنہ وار می رقصم

بہ خالِ اُردو دَش بچشمِ ٹماٹر اور بیگن را
وہی پی پی کے زیرِ خنجرِ خوں خوار می رقصم

طرم خاں کیوں نہ ہو بیوی کے آگے دب ہی جاتے ہیں
مجھے تو آٹھ بچے ہیں تبھی ناچار می رقصم

مری آواز کا سونا بہت سستا ہے دنیا میں
رہا زیبِ گلو پھر بھی ذلیل و خوار می رقصم

جہاں بجتی ہے شہنائی جلیل اکثر یہ دیکھا ہے
ادھر پتلون می رقصم اُدھر شلوار می رقصم

(جنوری ۸۹ء)

○

محبت کر کے ہم پچھتا رہے ہیں
وہ ہم کو اور ہم ان کو کھا رہے ہیں

جوانی کو ملا ہے عہدِ پیری
ہم اپنی قبر خود کھدوا رہے ہیں

انھیں جب تیسری منزل پہ دیکھا
ہر اک منزل پہ ہم منڈلا رہے ہیں

گرانی بڑھ گئی حد سے زیادہ
ترقّی کا صلہ یوں پا رہے ہیں

علاقہ چھوڑ کر بھاگو برادر
یہ مچھّر بھی ہمیں دھمکا رہے ہیں

چھچھوندر، چھپکلی، مکڑی و چیونٹی
شریکِ زندگی کہلا رہے ہیں

ادارے شہر میں اردو کے محدود
جو ہیں آپس میں سر ٹکرا رہے ہیں

چلو سو جاؤ نا لوگو سویرے
جلیل اب شاعری فرما رہے ہیں

○

بیگم کی حکومت ہے انجام نمی دانم
کیا حکم بجا لاؤں جب کام نمی دانم

دن رات فقط نخرے آرام نمی دانم
کب گھر میں سحر آئی کب شام نمی دانم

شادی کا دہی اک دن پھر آج کا یہ دن ہے
فالودہ نمی نوشم با دام نمی دانم

پہنا تو دیئے کنگن آں چہرہ نمی بینم
ہر روز ڈھلے برتن حمّام نمی دانم

خلوت میں بھی محفل، محفل ہوئی تنہائی
ترسیل کا موسم ہے ابہام نمی دانم

مصری کے ڈھلتے ہی آغازِ نظر بندی
اے عدلِ جہاں گیری النام نمی دانم

بگڑی ہوئی کچھ سطریں پھیلے ہوئے کچھ نقشے
مکتوب پرانا ہے پیغام نمی دانم

تولید میں ایم فل ہوں تقلید میں پی ایچ ڈی
ہر ڈگری ہے ترغیبی اکرام نمی دانم

بلّی بھی ہے کتا بھی، چوہا بھی تماشا بھی
ہے کون نگراں میں گلفام نمی دانم

زلفوں کی درازی پہ سمجھو نہ مجھے شاعر!
من بندہ ہپّی ام، حجّام نمی دانم

ہر شعرِ جلیل اپنا لوکل یہ ولادت ہے
از آندھرا پردیشم، خیّام نمی دانم

جنوری ۷۸ء

○

حریرہ پی کے لکّھی ہے غزل ہم نے بڑے بھائی
تبھی تو اس میں ٹپکی ہے ظرافت کی یہ چکنائی

شگوفہ کے ایڈیٹر نے غزل شاعر سے جب مانگی
زمیں شعروں تلے نکلی ردیف اڑتی نظر آئی

ادب کا ذوق قائم ہے نہ شعری ارتقا جاری
گزشتہ چند برسوں سے نحوست سر پہ ہے چھائی

دماغی الجھنوں سے ہم حقیقت میں پریشاں ہیں
ذرا کچھ سوچنا چاہا تو آفس میں بھی نیند آئی

ترنم ہم بھی سیکھیں گے ترنم باز شاعر سے
بہت سوں کو شکایت ہے غزل اب تک نہیں گائی

غزل کہتے ہیں ہم لیکن غزل پڑھنا نہیں آتا
بناسپتی نہیں اپنا لب و لہجہ ڈرامائی

کوئی مصرعہ کھٹکتا ہے کہیں کچھ حرف دیتا ہے
وہی اصلاح کی سوچے ہو پیشہ جس کا آبائی

○

شعر کہتے ہیں، حماقت بھی کیا کرتے ہیں
لوگ چاہیں تو وضاحت بھی کیا کرتے ہیں

لیڈری ہاتھ جو آئی ہے وراثت میں انھیں
کس صفائی سے حجامت بھی کیا کرتے ہیں

جانے کیوں لوگ سمجھتے ہیں حقیقت میں شریف
وہ جو اظہارِ شرافت بھی کیا کرتے ہیں

بزدلی فطرتِ ثانی ہے ہماری گویا
کبھی اظہارِ شجاعت بھی کیا کرتے ہیں

دوست احباب جو کترا کے نکل جاتے ہیں
ہم پہ درپردہ عنایت بھی کیا کرتے ہیں

دعوتیں یوں تو اڑاتے ہیں نفاست سے جلیل
[illegible]

بیباک جوگی گورکھپوری

نام کرو

تم نہ دفتر میں کوئی کام کرو
صرف حکام کو سلام کرو

موٹا مُرغا نظر جو آئے کہیں
اُس کو فی الفور زیرِ دام کرو

لو اکیلے میں بے دھڑک رشوت
سامنے سب کے "رام رام" کرو

چاہتے ہو جو دھوم سے پینا
محتسب کو شریکِ جام کرو

"باس" کو خوش تمہیں جو رکھنا ہو
اُن کی "ڈالی" کا انتظام کرو

تم کو "فیوچر" ہو گر عزیز اپنا
جھک کے نیتاؤں کو سلام کرو

لو فقط احتساب مفلس سے
اہلِ زر سے نہ کچھ کلام کرو

قیس کی طرح بن کے صحرائی
تم بھی آوارگی میں نام کرو

حُسن کو "قیدِ عقد" میں لاکر
عشق کو فائز المرام کرو

آنے والے ہیں حضرتِ واعظ
مرغ و ماہی کا اہتمام کرو

یوں اُچھالو نہ بزم میں پگڑی
شیخ کا کچھ تو احترام کرو

منعقد کر کے روز بزمِ سخن
نیند ہر ایک کی حرام کرو

دے کے شعراء کو دعوتِ شیراز
تاڑ کے رس سے شاد کام کرو

طنز کے تیر روک لو جوگی
اور یہ ہزل اب تمام کرو

(جولائی، اگست ۸۱ء)

یہ جبّہ و دستار دکھانے کے لئے ہیں

ابّا میاں مر مر کے کمانے کے لئے ہیں
اور لختِ جگر صرف اُڑانے کے لئے ہیں

ہم شیخ کی رنگین مزاجی سے ہیں واقف
یہ جبّہ و دستار دکھانے کے لئے ہیں

ہے اس بتِ کافر کی رقیبوں پہ عنایت
ہم تو فقط ناز اٹھانے کے لئے ہیں

یہ شوخ ہنسی اور یہ بیباک نگاہیں
عشاق کی تعداد بڑھانے کے لئے ہیں

ہنس ہنس کے سرِ بزم یہ اغیار سے باتیں
عاشق کے کلیجے کو جلانے کے لئے ہیں

"صاحب" کے یہ سب ٹھاٹھ ہیں رشوت کی بدولت
تنخواہ کے پیسے تو دکھانے کے لئے ہیں

ہے قوم کی خدمت تو فقط ایک بہانہ
اصل میں لیڈر تو کمانے کے لئے ہیں

جوگی! یہ حقیقت ہے کہ نیتاؤں کے ووٹ
جنتا کو فقط "فول" بنانے کے لئے ہیں

(دسمبر ۸۱، جنوری ۸۲ء)

مظفر حسین جوہر سیوانی

آدھا اِدھر آدھا اُدھر

بمبئی میں ملا، سمجھے میں سر آدھا ادھر آدھا اُدھر
ہیں شیخ جی دو ناؤ پر آدھا ادھر آدھا اُدھر

معمولی جمپر دیکھ کر بیگم کو غصہ آ گیا
پھینکا زمیں پر پھاڑ کر آدھا ادھر آدھا ادھر

دو بیویوں کے بیچ میں الجھے ہوئے ہیں شیخ جی
رکھیں گی ان کو بانٹ کر آدھا ادھر آدھا ادھر

تجھ سے مرا مجھ سے ترا کرتا ہے شکوہ اے صنم
دونوں طرف ہے نامہ بر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

بیگم کو میری چھوڑ کر دو سالیوں کو لکھ دیا
میرے خسر نے اپنا گھر آدھا ادھر آدھا ادھر

پکچر گئی ہیں اہلیہ چھ بچے لے کر اپنے ساتھ
چھ بچے گھر پر چھوڑ کر آدھا ادھر آدھا ادھر

اک اہلیہ پنجاب ہے اور دوسری آسام ہے
یوں بٹ گیا ملّا کا گھر آدھا ادھر آدھا ادھر

نتھیا بنا کر شوق سے ناتھا ہے اپنی ناک میں
بیگم نے اک مرغی کا پر آدھا ادھر آدھا ادھر

تہذیبِ نو کی شان ہے شانے پر اپنے لڑکیاں
نکلیں دوپٹہ پھینک کر آدھا ادھر آدھا ادھر

شانوں پہ یوں لٹکی ہے سلوٹ جیسے کوئی دھوبی چلے
لادی گدھے پہ لاد کر آدھا ادھر آدھا ادھر

وہ مال اسمگلنگ کا جو پکڑا گیا چیکنگ میں کل
بانٹا گیا چیک پوسٹ پر آدھا ادھر آدھا ادھر

جوہر سے ہوتا ہے اگر جھگڑا کبھی سسرال میں
رہتی ہے گڈو کی مدر آدھا ادھر آدھا اُدھر

(فروری ۷۶)

غزل

ان کے سر پر سہرا سہرا ہو، یہ ضروری تو نہیں
اور ہو بھی تو خبر ہو، یہ ضروری تو نہیں

خوب ہوتی ہے یہ سرکار کے راشن کی دکاں
ساتھ گیہوں کے شکر ہو، یہ ضروری تو نہیں

وہ جو روتی ہیں تو آتا نہیں ہے اشک نظر
وقتِ غم آنکھ بھی تر ہو، یہ ضروری تو نہیں

بزمِ شعرا میں ہے بیٹھا کہ کسی ہوٹل میں
اس کی شاعر کو خبر ہو، یہ ضروری تو نہیں

اُن کو سجدے سے ہے مطلب جو ادا ہوتا ہے
اُن کے سر پر منبر اسر ہو، یہ ضروری تو نہیں

وصل میں سب کو نہیں ہجر میں ملتا ہے مزہ
عشق میں دردِ جگر ہو، یہ ضروری تو نہیں

موڈ آتا ہے تو کرتی ہیں وہ سر کی مالش
یہ کرم شام و سحر ہو، یہ ضروری تو نہیں

میں تصور کی فضاؤں میں اڑا کرتا ہوں
ذہنِ آزاد کو پر ہو، یہ ضروری تو نہیں

دودھ میرے لیے رکھا تو گیا ہے لیکن
اس پہ بلّی کی نظر ہو، یہ ضروری تو نہیں

چپکے چپکے وہ چلی جاتی ہیں پکچر ہاؤس
اس کی جوہر کو خبر ہو، یہ ضروری تو نہیں

(ستمبر ۷۵)

جوہر سہانی

کہہ دوں؟

دیش آزاد ہے آزاد بھی کیسا کہہ دوں کس قدر دیش میں بدحال ہے جنتا کہہ دوں
کیوں بشر آج نظر آتا ہے ننگا کہہ دوں کیوں گراں پانی ہے کیوں خون ہے سستا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

کیسے نیتاؤں نے جنتا کا اتارا ہے لنگوٹ بند ہوتی نہیں کیوں ڈاکہ زنی لوٹ کھسوٹ
لوگ ہنس ہنس کے سہا کرتے ہیں مہنگائی کی چوٹ کس نے اس دیش کو کنگال بنایا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

آپ نیتا ہیں بھلا آپ کو فرصت ہے کہاں رات دن قوم کی خدمات سے مہلت ہے کہاں
بس وفادارِ وطن آپ ہیں حجت ہے کہاں کہیے آپ سے ناراض ہے جنتا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

جو نہ سلجھائے کبھی الجھی ہوئی زلفِ غزل دلی کے لال قلعے کو جو لکھے تاج محل
گوبھی کا پھول جسے آئے نظر کھلتا کنول ایسے شاعر کو نہ کیوں آنکھ کا اندھا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

ہپیوں نے تو طبیعت ہی بدل ڈالی ہے اچھی پوشاک تو ہے جیب مگر خالی ہے
وہ جو لڑکا نظر آتا ہے مری سالی ہے دل تو کہتا ہے کہ سالی کو بھی سالا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

زلفِ دلگیر یا رشکِ چمن کے گیسو میاں ملا جی کے ہیں یا صاحبِ فن کے گیسو
یوں سنوارے نہیں جاتے ہیں دلہن کے گیسو آج کیوں لڑکی نظر آتی ہے لڑکا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

درس گاہوں میں تو استاد ملیں گے سوتے لڑکے [illegible] قسمت سے ملیں گے روتے
ماسٹر لڑکیوں سے یوں ہی نہیں جھگڑے ہوتے دل میں آتا ہے کہ مکتب کو اکھاڑا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

شیخ کعبہ میں نہ پنڈت ملے بت خانے میں [illegible] گزار دیں جو تھے ذکر میخانے میں
دو تو دیکھے گئے بیٹھے ہوئے میخانے میں جوہر ان آنکھوں نے جو کچھ بھی ہے دیکھا کہہ دوں
آپ ہی کہیے کہ خاموش رہوں یا کہہ دوں

(جولائی ۶۹ء)

شعرائے بہار — بہ نظرِ اغیار

چرخ عظیم آبادی

اک دوست سے یہ بحث سرِ راہ کل ہوا
اردو کا ہے بہار میں شاعر بڑا کوئی

کہنے لگے بہار میں شاعر نہیں رہا
جس کا کہ دور دور بھی ہوتا ہو تذکرہ

عظمت کا جس کی سارا زمانہ ہو معترف
اوصاف شاعرانہ سے جو بھی ہو متصف

دیکھو اٹھا کے نظم دلاور فگار کی
ہے اس میں شخصیت کوئی شامل بہار کی

میں نے کہا کہ ہوش و خرد سے تو کام لو
بولے بہار کے کسی شاعر کا نام لو

میں نے کہا جمیل ہیں یکتائے روزگار
بولے کہ ان کے فن پہ ہے تنقید کا غبار

میں نے کہا عطا تو بہت کہنہ مشق ہیں
بولے کہ وہ کتاب نویسی میں غرق ہیں

میں نے کہا بلیغ ہیں اشعار اجتبیٰ
بولے بجھا بجھا سا ہے وہ شعلۂ نوا

میں نے کہا کہ خوب ہیں عبدالمجید شمس
بولے کہ ان کی نظم میں ہے جعفری کا درس

میں نے کہا عظیم ہے اختر کی شاعری
بولے کہ رکھتے ہیں وہ حسینوں سے دوستی

میں نے کہا کلیم تغزل میں فرد ہیں
بولے ہزار رنگ گلستاں کی گرد ہیں

میں نے کہا کلام ہے محسن کا لاجواب
بولے کہ نفسیات نے ان کو کیا خراب

میں نے کہا کلام [illegible] عدیل ہے
ہنس کر کہا مگر قد و قامت طویل ہے

میں نے کہا کہ شعر کی اختر بہار ہیں
بولے بہت دنوں سے وہ گنگا کے پار ہیں

میں نے جو ذکر شعر کا دانش سے پھر کیا
بولے کہ ان کی تنگ ہے پرواز کی فضا

میں نے کہا کلیم کی نظمیں ہیں شاہکار
بولے کہ اپنے شعر کا کرتے ہیں وہ شمار

میں نے کہا کہ جذبہ ہے دراتی کی واہیات
بولے کہ وہ فگار سے کھائے ہوئے ہیں مات

میں نے کہا کہ شہرت عاجز ہے [illegible]
بولے کہ ہاضمے میں ہے ان کے بہت نقود

میں نے کہا جواں ہیں ملک پور کے ادا
بولے کہ صبح نو کے ہیں چندے میں مبتلا

میں نے کہا اضافہ کی غزلیں نفیس ہیں
بولے کہ وہ تو شہر کے نسخہ نویس ہیں

میں نے کہا کہ قوت مجبور ہے حسین
بولے کہ جس جگہ وہ تھے کل آج ہیں وہیں

میں نے کہا کہ [illegible] واقف کا نام ہے
بولے کہ ان کا اس کے سوا کون کام ہے

میں نے کہا عروج پہ مظہر امام ہیں
بولے کہ ریڈیو میں مگن صبح و شام ہیں

پہلو بدل کے نام جو سرمد کا لے لیا
بولے کہ شاعری سے انہیں واسطہ ہی کیا

میں نے کہا ظفر تو کہا ڈاکٹر ہیں وہ
میں نے کہا کہ روحی کہا بے خبر ہیں وہ

میں نے کہا حفیظ تو بولے بنارسی
میں نے تقی، تو کہا حسن کے شاہ جی

میں نے کہا حمید تو بولے کہ وقت کش
میں نے کہا کہ جہتی تو ہنس کر کہا کہ ہش

القصہ بحث کا یہ فیصلہ ہوا
شاعر نہیں بہار میں کوئی بڑا ہوا

چکر نظام آبادی

غزلیں

اجنبی جان کے مجھ کو نہ وہ بھونکا ہوتا
مجھ سے واقف جو مرے یار سا کتا ہوتا

آپ کے سر میں ذرا سا بھی جو بھیجہ ہوتا
آپ سے بے ہوش بالوں کا یہ گچھا ہوتا

دے دیا ہاتھ میں بلوا کے وہ لا کر سہرا
آپ نے خط کسی پاگل سے نہ بھیجا ہوتا

شادی کروا تی اگر آپ کو جوڑے کیلئے
لڑکی والوں سے سوا لاکھ تو مانگا ہوتا

شعر سن کر وہ مرے داد جو دیتے چکر
رات کو کیس لئے اُن سے مرا جھگڑا ہوتا

(اکتوبر ۸۵ء)

اپنے ماموں جان سے مجھ کو بھی کچھ امید ہے
گوشت اور ترکاری اُن کے گھر کی لانے دیجئے

آپ کو چائے پلائی ہے بڑے اخلاص سے
کم سے کم دس بارہ غزلیں تو سنانے دیجئے

کوششوں پر کوششیں کیں نوکری ملتی نہیں
داوا بننے دیجئے چاقو چلانے دیجئے

شعر سننے اور سمجھنے والے باقی ہیں کہاں
مجھ کو فلمی گیت محفل میں سنانے دیجئے

لوگ دیوانہ کہیں، پاگل کہیں کچھ بھی کہیں
اُن کے کوچے میں مجھے چکر لگانے دیجئے

(جون ۸۵ء)

غزل - چکر + کیف بھوپالی - چکر نظام آبادی

میرے بچوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

اے خدا دشمن کی بھی قسمت میں لکھ
دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

شام غم ہم لیتے لیتے تھک گئے
کروٹیں، بے تابیاں، انگڑائیاں

اُن کے ساتھ آ آئی ہیں اکثر گھر مرے
وحشتیں، گھبراہٹیں، پرچھائیاں

آج کل کے دور میں اک خواب ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

جاتے جاتے سب چرا کر لے گئے
حکمتیں، آگاہیاں، دانائیاں

ہر جوان پیکر کی قسمت میں ہیں یہ
خوبیاں، زیبائیاں، رعنائیاں

کرتے کرتے تھک گئے آخر میں ہم
الجھنیں، فکریں، قیاس آرائیاں

تم بھلے آؤ نہ آؤ، آئیں گی
بولیاں، برکھا رتیں، پروائیاں

کس کے کام آئیں گی ہمارے آئیں گی
نیکیاں، قربانیاں، سچائیاں

رات دن کی دوست ہیں چکر مری
لغزشیں، ناکامیاں، پسپائیاں

(نومبر ۸۵ء)

ناکارہ ہوگیا دل اور جگر بھی تو خطر کیا
بازار میں بکتے نہیں دل اور جگر کیا

سیکل مری بکنے کا بہت آپ کو غم ہے
نیلام نہیں ہوتے کبھی لعل و گہر کیا

یہ سوچ کے بیٹھا ہوں تری بزم میں ساقی
لیتا ہے مرا نام کوئی بار دگر کیا

(اگست ۸۵ء)

پروفیسر حفیظ بنارسی (گورکھپور)

اغوا

اس دور میں بڑھ گئی ہیں اغوا کی وارداتیں
دیتے ہیں روز خبریں اخبار اور ٹی وی
لڑکا کسی کا غائب لڑکی کسی کی غائب
Kidnapping اچھا خاصا بیوپار ہو گیا ہے
منہ مانگی مل رہی ہے اغوا کی اب تو قیمت
نیتا کے ساتھ ان کے دلبر بھی پھنس رہے ہیں
ہیں ڈاکٹر بھی قیدی انجینیر بھی قیدی
میوزک سے ہوں گے خائف گانے سے بھی ڈریں گے
بزم مشاعرہ میں شاعر کو ہوگا خطرا
اب مولوی ڈریں گے مسجد کی رہ گزر سے
بچوں کا ہوگا اغوا اسکول کی گلی سے
جاتے ہوئے ڈرے گی کالج کو اب حسینہ
منصف کا ہوگا اغوا انصاف کی ڈگر سے
V.C. کو لے اڑیں گے کچھ بدمعاش لڑکے
مفتی ہوں یا کہ سوامی گھر میں رہیں گے چھپ کر
میداں سے گول ہوں گے فٹ بال کے کھلاڑی
جو لوگ عشرتی ہیں ان کا بھی ہوگا اغوا
بے سود ہر دعا ہے ہر سعی بے اثر ہے
اغوا جو کر رہے ہیں ان کی بھی ہے جماعت
پیسے کے بل پہ سب کچھ انجام پا رہا ہے
ناداں نوجواں کو بہکا کے لا رہے ہیں
اغوا بھی ہے کرپشن کی ایک شکل تازہ
ہوگا نہ ختم جب تک بے کاری کا فسانہ

دہشت زدہ ہے انساں وہ دلی ہوں یا کراچی
شوہر کسی کا گم ہے، گم ہے کسی کی بیوی
بڑھتے ہی جا رہے ہیں چاروں طرف مصائب
خنجر کھنچا ہے ایسا تلوار ہو گیا ہے
لاکھوں ہیں اس میں شامل کیا بند ہو یہ صنعت
دامِ بلا میں ہر سو افسر بھی پھنس رہے ہیں
کیا ذکر راہ رو کا ہیں راہبر بھی قیدی
لوگ اب سنیما گھر میں جانے سے بھی ڈریں گے
ایسا نہ ہو کہ کوئی ان کا بھی کر لے اغوا
پنڈت بھی ہوں گے خائف مندر کے بام و در سے
گھر والے ان کی خاطر گزریں گے اپنے جی سے
اغوا کے ڈر سے اس کو آ جائے گا پسینہ
کانپے گی خود پولس بھی اب قاتلوں کے ڈر سے
منوائیں گے وہ اپنی ہر بات لڑ جھگڑ کے
کیا جانے کس بہانے آ جائے ان کا نمبر
ہاکی کے بدلے ہوگی اب ہاتھ میں کلہاڑی
جو مکھیہ منتری ہیں ان کا بھی ہوگا اغوا
اب لگ رہا ہے ایسا یہ روگ کینسر ہے
اب ہو گیا ہے یارو یہ کام بھی سیاست
اغوا جو کر رہا ہے انعام پا رہا ہے
کچھ کھوٹے لوگ ہیں جو اغوا کرا رہے ہیں
پیشانیٔ وطن پہ ہے یہ سیاہ دھبہ
ناچاقیوں کا چکر، زرداری کا فسانہ

جب تک رہیں گی باقی یہ چھل کپٹ یہ گھاتیں
جاری رہیں گی یوں ہی اغوا کی وارداتیں

(دسمبر ۹۱ء)

حمایت اللہ

کانٹوں پر زباں رکھ دی

(سیماب اکبرآبادی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

یہ کس نے شاخِ گُل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی — کہ میں نے شوقِ گُل بوسی میں کانٹوں پہ زباں رکھ دی
سمجھ میں صاف نہیں آیا تو پوچھا شاخِ گُل کیا ہے — یہ گُل بوسی کتو کیا ہے قریبِ آشیاں کیا ہے
تو بولے شاخِ گُل بولے تو پھولوں کی ڈگالی ہے — یہ گُل بوسی بولے تو پیار پھولوں سے شیغولی ہے
قریبِ آشیاں کا بھی اُنوں مطلب بتا دالے — زبردستی یہ منہ بند تھا سو وہ منہ کو کھلوا دالے
ارے کیا شاعری ہے دیکھ رہیں واہ واہ رے واہ رے واہ — ادھر لوگاں بھی واہ واہ بولریں واہ واہ رے واہ رے واہ
مگر ایک بات رہ رہ کو میرے دل میں کھٹک رئی ہے — سُنا ہوں جب سے یہ شعراں میری عقل بھٹکا رئی ہے
جدھر منگس ہے واں پو سانپ رہنا بہوت مشکل ہے — خزاں رئی سو جگہ بلبل کا رہنا بہوت مشکل ہے
جدھر گُل ہے ادھر بلبل بھی رہتے ان کے گھر ریتے — جدھر بھی چاندنی رہتی چکوراں بھی ادھر ریتے
چمن میں سو جگہ پو گھر بنایا کون بولا تھا — وہ بلبل تھا کیا کوّا تھا وہ بچو تھا کیا کولا تھا
چلو پت جھڑ کا موسم ہوئینگا یہ مان لیتوں میں — خزاں ہوئینگی چمن برباد ہوئینگا مان لیتوں میں
خزاں میں پھر یہ شاخِ گُل کدھر سے کون لایا رے — یہ اُبلیوں کو ڈبا کو پھرے پانی پو ترایا رے
سنوں میں قیس کو ہر چیز میں لیلیٰ نظر آئی — نظر ڈالا انے جاں بھی اسے لیلیٰ نظر آئی
تو ہوئینگا ان بھی شاخِ گُل کا دیوانہ زمانے سے — جبی تو شاخِ گُل سُکّی ڈگالی پو نظر آئی
نہ کانوں سے کوئی دیکھا نہ آنکھوں سے کوئی سُنتا — یہ گُل بوسی میں بوسہ ہے تو بوسہ ہونٹ سے ہوتا
انے تو شوقِ گُل بوسی میں کانٹوں پو زباں رکھا ہے — کیا اس کے ہونٹاں پھٹ گئے تھے جو کانٹوں پو زباں رکھا رے
زباں سے چاٹتے تئیں چکتیں مزا اور منہ چڑاتے ہیں — حکم دیتیں زباں سے اور اسی سے گڑگڑاتے ہیں
اگر چاٹن کی عادت ہے تو چاٹو، اپنا کیا جاتا — لکھے تو یوں رکھو وہ شعر کو مطلب بھی صاف آتا

یہ کس نے شاخِ گُل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گُل چاٹی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

(جنوری، فروری ۱۰ء)

نانی ماں سے

ہم کب بھی نیں دیکھے یہ کیسے باتاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نیں کی

ابے کیسے لیڈر تھے نانی تمہارے — فکر کر کو جنتا کی مرگئے بچارے
ہمارے بھی لیڈر ہیں گبرو نرالے — ڈبا ڈالے جنتا کو خود ہیں کنارے
جنتا کے سیوک کے شاہی مزاجاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نیں کی

الکشن میں آنے پلاناں بنا ریں — پلاناں بنا کو فساداں کرا ریں
فساداں کرا کو کمیٹیاں بٹھا ریں — کمیٹیاں بٹھا کو دلوں کو ملا ریں
مرگئے سو مردے کے کریں علاجاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نیں کی

اسے میری بھارت کے دن کیسا بگڑے — ذرا ذرا سی باتوں پو دن رات جھگڑے
زبانوں پو جھگڑے علاقوں پو جھگڑے — دلوں کے بھی ٹکڑے ملک کے بھی ٹکڑے
سستا لہو ہے تو مہنگے اناجاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نیں کی

تمہاری پولس تو پکڑتی تھی چوراں! — بڑے خوش تھے انصاف سے جیب کتراں
پکڑتے ہیں قندیل دن میں جو اناں — جو کچھ بھی بولو بتاتے ہیں داواں
ساداں تو کاں گئے کی چوراں کے لاجاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نیں کی

(جولائی اگست ۹۸ء)

○

سپولے کاٹے کو تخیل پو میرے سامنے آئے
اسی سپیل کے نیچے آکو مرجاتا تو اچھا تھا
خدا بجلی گرا کی تو انوں ڈر کو لپٹ رہے تھے
وقت اب زندگی کا پورچ سے جاتا تو اچھا تھا
انوں لپیٹیں سو دھوتی کا دھواں بن کا رہے لٹکو
میں ان کی ناک سے دل میں اترجاتا تو اچھا تھا
وصیت پو پہلے کاٹ کو انکھیاں رکھیں کھلے
صنم اپنا خدایاں سے گزر جاتا تو اچھا تھا

(دسمبر ۹۸ء جنوری ۹۹ء)

آئی رے

حمایت اللہ

رہتے رہتے چپ جھگڑنا، آئی رے
دل مرا اک دم اکھڑنا، آئی رے
کھیل چھپنے کا کبھی کھیلے تو ہم
چپ کا چپ آ کر پکڑنا آئی رے
میں تڑپ کر بھاگ بکو آ توں لگو!
ڈھونگ کا کرنا، الٹ گڑنا آئی رے
رُس کو گئے تو میں بلا توں سوچ کر
جاتے جاتے ان کا مڑنا، آئی رے
منت ال کر کو بلایا آ گئے!
اس تمبرا ترا کو اکڑنا آئی رے
غصہ کرتے کرتے جب آئی ہنسی
ہونٹ دانتوں میں سکڑنا آئی رے
سہیلیوں کے بیچ میں چھیڑا تو میں
منہ میں منہ میں ان کا گڑنا آئی رے

میں تو تھا اب تو ہوا بھی پیچھے تھا
جھک کر ساڑی کو پکڑنا آئی رے
قسمتوں سے بچے اتوں اک دن ملے
ان کی اماں کا اجڑنا آئی رے
کیا مزا رہیں گا، دکھا دے رے خدا
ان کی اماں جی کا گڑنا آئی رے
چھت پو اب آتیں کی جب آتیں کو
ناچتے بجلی میں کھڑنا آئی رے
ہٹ شٹ پو بھر کو انگڑائی لیے
گنڈیوں کا ٹوٹ کو جھڑنا آئی رے
بات شادی کی کبھی چھیڑا تو میں
ان کا شرمانا سکڑنا آئی رے

(مئی ۴۳ء)

الٰہی یہ لیڈر سمجھ پا سکے گیا
خرافت کے رستے انھیں بھا گئے کیا
جدھر دیکھیے حق میں اردو کے لیکچر
الکشن کے دن پھر قریب آ گئے کیا

سوال اپنا بھی پورا ہو نہیں سکا کیا ہے کی کیا نئی کی
یہ بندے کو کبھی مشکل پڑی ہے کی کیا نئی کی
از شعراللہ کو معشوقہ دنیا میں چھوڑ اڈالا
مرے بندے جہاں دیکھیں لا کیا ہے کی کیا نئی کی

(دسمبر، جنوری ۴۳ء)

خالد عرفان
(کراچی)

ہوٹلوں میں شاعری

ہوٹلوں میں شاعروں کا شور کرنا عام ہے
ہوٹلوں میں خدمتِ شعر و سخن ہونے لگی
ہوٹلوں میں شب گذاری شاملِ آداب ہے
میں یہاں آیا ہوا ہوں اک ضروری کام سے
ہو گیا کل ایک ہوٹل میں ہمارا بھی گزر
لوگ سمجھے میں غزل اپنی سُنانے آگیا
میزباں فن کار مجھ کو ویلکم کہنے لگے
کیا خبر تھی رات اتنی مختصر ہو جائے گی
چاہتے سب تھے کہ یہ مُرغا ہمارے پاس آئے
میں بہ مجبوریٔ ادب کے اس گڑھے میں دھنس گیا
حاضرینِ بزم میں کچھ برہمی ہونے لگی
ایک صاحب تو بہت ہی خوش مزاجی سے ملے
اپنے پہلو میں مجھے تشریف رکھنے کو کہا
آپ اس محفل میں آئے ہیں تو کچھ کھائیں حضور
آپ بسکٹ لیجئے نمکین لینا فرض ہے
ہو گئے اسٹارٹ پھر وہ مطلع فرمانے کے بعد
وہ مری نازک سماعت پر ستم ڈھاتے رہے
ہم بطورِ داد اُن کے شعر دہراتے رہے
بوریت سے آ گئے تھے میری پیشانی پہ بَل
بالآخر جب وہ ہوٹل کی فضا پر چھا گئے
سب ذخیرہ کر چکے جب ختم وہ استادِ فن
بولے کچھ تم بھی سناؤ شاعر دامن ہی.

غیر شاعر کو یہاں بھی بور کرنا عام ہے
سطحِ ناہموار پر تعمیرِ فن ہونے لگی
شاعری کل وقت کا یہ پارٹ ٹائم جاب ہے
ایک مصرعہ ذہن میں اٹکا ہوا ہے شام سے
اور ہم آدابِ محفل سے مکمل بے خبر
اپنا لیٹر پوسٹ کرنے ڈاک خانے آگیا
آج کی محفل کا صدرِ محترم کہنے لگے
ایک ہی شاعر سے ملنے میں سحر ہو جائے گی
وہ سمجھ بیٹھے تھے گویا مجھ کو قربانی کی گائے
چند شاعر خوش ہوئے لو ایک سامع پھنس گیا
شاعروں کے درمیان سامع کشی ہونے لگی
تاکہ وہ جاری کریں شعر و سخن کے سلسلے
پھر مخاطب ہو گیا مجھ سے ادب کا اژدھا
چائے بسکٹ پان کافی شوق فرمائیں حضور
میں نے جب بسکٹ لیا بولے کہ مطلع عرض ہے
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد
شعر کے جوڈو کراٹے مجھ پہ برساتے رہے
شاعرِ شیریں بیاں کا ہم نمک کھاتے رہے
اور وہ گنگناتے رہے تھے اپنی پندرھویں غزل
داد دینے کے لئے ہوٹل کے بیرے آگئے
پیٹ میں میرے بھی چوہے دوڑنے لگے حدِ سخن
گر نہیں تازہ غزل کوئی رباعی ہی سہی

وقت کافی ہو چکا ہے آپ جلدی کیجئے
میں نے جب مطلع پڑھا، بولے اجازت دیجئے

غزلیں

جی ایم احمد خواہ مخواہ
(بمبئی)

اہلِ چمن تو جشنِ بہاراں منا چکے
ہم اپنا آشیانہ سجانے میں رہ گئے

درسِ خودی کو اُن کے سبھوں نے بھلا دیا
اقبال صرف قومی ترانے میں رہ گئے

اپنے شکستہ گھر کی نہ لی ہم نے کچھ خبر
دیوار دوسروں کی گرانے میں رہ گئے

واعظ گئے تھے مے کدہ پینے سے روکنے
رِندوں کے ساتھ پینے پلانے میں رہ گئے

چھت بھی ٹپکنے لگ گئی بارش میں اور ہم
اشکوں سے دل کی آگ بجھانے میں رہ گئے

الزام جن کے سر تھا ضمانت پہ ہیں رہا
ضامن ہوئے تھے جو وہیں تھانے میں رہ گئے

رہنے کو گھر نہ تھا تو نکاح اُن سے کرلیا
داماد بن کے اُن کے گھرانے میں رہ گئے

باروزگار تھے تو وہ مردوں کے ساتھ تھے
بے روزگار ہو کے زنانے میں رہ گئے

دعوت میں ہم نے چھیڑ دیا ذکرِ شاعری
ہم کھا گئے وہ شعر سنانے میں رہ گئے

کوئی تو مغفرت کی مری مانگتا دُعا
چہلم میں سارے دعوتی کھانے میں رہ گئے

میک اپ تمام کرکے وہ تیار ہوگئیں
بالوں میں ہم خضاب لگانے میں رہ گئے

آیا نہ راس شاعری کرنا بھی خواہ مخواہ
بدنام ہو کے سارے زمانے میں رہ گئے

(نومبر ۱۹۸۷ء)

○

کبھی میں سچ کہوں بھی تو حماقت نام ہو جائے
اگر وہ جھوٹ بھی بولیں صداقت نام ہو جائے

علالت میں مری اے کاش ایسا وقت بھی آئے
وہ پُرسہ دینے آئیں اور عبادت نام ہو جائے

حسینائیں شبک رہنے کو کرلیتی ہیں جب فاقے
نقاہت حد سے بڑھ جائے نزاکت نام ہو جائے

بدل جاتے ہیں اکثر لفظ کے معنی سیاست میں
محافظ جان سے مارے حفاظت نام ہو جائے

دھڑلے سے جو حق تلفی کرے وہ بن گیا لیڈر
ہم اپنا حق اگر مانگیں بغاوت نام ہو جائے

علمبردارِ گمراہی بنے ہیں قوم کے نیتا!
تباہی قوم پہ لائیں قیادت نام ہو جائے

کسی سازش میں زندہ بچ گئے تو بن گئے غازی
مریں دنگے فسادوں میں شہادت نام ہو جائے

خدا کو ماننے والے بنے ہیں خود غرض اتنے
کریں ایمان کا سودا سیاست نام ہو جائے

خدا کے ساتھ بھی چلنے لگی ہے اب ریاکاری
کریں سجدہ دکھانے کو عبادت نام ہو جائے

نہیں ہے فرق کچھ بھی خواہ مخواہ لفظوں کا چکر ہے
حماقت میں صداقت ہو ظرافت نام ہو جائے

اگست ۱۹۹۳ء

خواہ مخواہ

غزل

کتّا کتّا آڑلایا میں شادی نئیں کرتوں کرکو
قلفی گلا گھٹنے تو دھوبی رسی لے کو آیا تھا
بچّے بہوت ہیں نام سے نیں نمبر سے پکارو بولوں مگر
پوری تنخواہ لا کو دیتوں پھر بھی روز کی کھٹ کھٹ ہے
عزت اور ناموس کے دشمن خون میں ہاتھاں رنگے لے کو
پہلے بھی اردو کے حق میں تقریراں کرلو بھول گئے
جن کا دعویٰ تھا کہ قوم کا بیڑا پار لگائیں گے
ہاتھ میں لکڑی آنکھوں پہ ہے آخری نمبر کا چشمہ

سہرا بن کو ڈھول بجائیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
شاستر یہ سنگیت سنائیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
دس کے آگے گن سکے نیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
پنشن لینے کے دن آئیں، کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
امن و اماں کے باتاں کرّیں، کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
اب پھر اردو کے گن گائیں، کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
خود اُن کی کشتی ہے بھنور میں، کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
نقلی دانت بھی ہل رئیں اُن کے کیا کرتیں کی کیا نئیں کی

(جنوری ۹۴ء)

تجریدی شہکار

دکھا کر اپنی اک تصویر تجریدی مصوّر نے
مری تصویر کا عنوان بتلائیں تو جانوں میں
جواباً یہ کہا " عنوان کوئی کیا بتاؤں میں

یہ پوچھا خواہ مخواہ جی! آپ کو کیا کچھ نہیں آتا
کچھ آتا ہے سمجھ میں یا نظر میں کچھ نہیں آتا
نظر آتا بہت کچھ ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا

(اگست ۹۳ء)

پنشن یافتہ

نہ اب میں پیار کر سکتا ہوں اور نہ ڈانٹ سکتا ہوں
جو مل جائے اسی پر اکتفا کرنا ہی پڑتا ہے
ہوا ہوں جب سے پنشن یافتہ یہ حال ہے میرا

جو باقی رہ گئے ہیں دن انھیں بس کاٹ سکتا ہوں
کوئی شے اپنی مرضی سے نہ اب میں چھانٹ سکتا ہوں
نہ کوئی قرض دیتا ہے نہ پنشن بانٹ سکتا ہے

یہی توفیق کیا کم ہے کہ روتوں کو ہنسا کر میں
دکھوں کا بوجھ کم کرنے غموں کو بانٹ سکتا ہوں

(جنوری ۹۴ء)

دلیپ سنگھ (دہلی)

غزلیں

جو رلائے گا تو شرمندہ کرے گا' جان رکھ
شرم سے بچنے کو گھر میں قیمتی سامان رکھ

لڑکیوں کو خط جو لکھتے ہوں تو کام آئے گا وہ
اس لیے کہتا ہوں گھر میں داغ کا دیوان رکھ

عاقبت میں کام آئے گا خدا کو دل میں رکھ
لیکن اس دنیا میں اپنے ساتھ تو شیطان رکھ

کیا پتہ کب دل بدل کر دشمنوں سے جا ملے
ووٹ جب دینے لگے اس بات کا بھی دھیان رکھ

رشتے اپنے آپ آئیں گے تو اک کوٹھی بنا
پھول آئیں گے تو اپنے پاس اک گلدان رکھ

عشق کا اپنے ڈھنڈورا دوستوں میں پیٹ تو پر
اپنی بیوی کو مگر اس عشق سے انجان رکھ

اب جو تجھ کو گالیاں دیتی ہے کیوں روتا ہے تو
اپنے گھر میں اپنی ساس کو مہمان رکھ

ہم کو لیڈر کہہ رہے ہیں لوگ سترہ سال سے
تیری حالت بھی سدھاریں گے تو اطمینان رکھ

تو کہے گا اور کچھ ناقد سمجھ لے گا کچھ اور
اپنے شعروں کی زباں آساں سے آساں رکھ

(اکتوبر ۱۹۸۷)

○

یہ چلن ٹھہرا کہ ہر کام پہ شمشیر کریں
دل معشوق کو بندوق سے تسخیر کریں

دل میں خواہش ہے کہ ہم بھی کبھی اندر جا کر
پارلیمنٹ میں بے معنی سی تقریر کریں

رات یہ خواب نظر آیا کہ ہم پکڑے گئے
کیوں نہ اس خواب کی اس طرح سے تعبیر کریں

ہتھکڑی بن کے جکڑے ہیں گجرا تیرا
اور تری زلف کو اپنے لیے زنجیر کریں

عاشقی کو کسی بابو نے کہا "صبر طلب"
کیوں کہ یہ لوگ ہر اک کام میں تاخیر کریں

سب کو معلوم ہے انعام ہیں ملتے کیسے
تم کو لینا ہو تو پھر ویسی ہی تدبیر کریں

تم ہو گر نور جہاں تو یہ کبوتر تھا مو
تاکہ ہم خود کو گھڑی بھر کو جہانگیر کریں

وہ رلانے کو لکھیں اور میں ہنسانے کو لکھوں
کیا ضروری ہے کہ میں وہ کروں جو میر کریں

لاکھ ڈھونڈا کہیں ملتی نہیں ممتاز محل
جس کے دفنانے کو ہم تاج کی تعمیر کریں

ہم سے بڑھ کر کوئی شاعر ہی نہیں اردو میں
اس حقیقت کی نہ کیوں آپ بھی تشہیر کریں

(نومبر ۱۹۸۷ء)

○

راہی قریشی (گلبرگہ)

راہی + غالب

مجھ کو اسے ڈاکٹر ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پھر نئے سال اک نئی اولاد
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گھر میں بیگم ہی جب نہیں موجود
"پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"

ایک روٹی دے یا لنگوٹی دے
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے انگلش میں پائی ہے تعلیم
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

اب تو لڑکے سے پوچھیے کہ میاں
"غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے"

میری ہر جیب میں ہے ایک سند
"کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"

کس نے جغرافیہ پڑھا جو کہے
"ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟"

وہ وفا پر لکھیں گے اک تھیسس
"جو نہیں جانتا وفا کیا ہے"

چائے کیسی بھی ہو مگر راہی
"مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"

(اکتوبر ۱۹۷۵ء)

پیروڈی

کھول آنکھ یہ گھر دیکھ اور اس گھر کی فضا دیکھ
ہر کمرے میں اولاد کا اک سلسلہ سا دیکھ

پھر بیگم بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
اور اس کی محبّت کا ثمر دیکھ عطا دیکھ

بے تاب نہ ہو اپنے کیے کی یہ سزا دیکھ

کیوں ہیں ترے حصے میں پڑوسی کی بلائیں
ہنگاموں سے معمور ہیں کیوں ساری فضائیں

کر خفیہ ملاقات کے بارے میں دعائیں
رکھ پیش نظر ویسے پڑوسن کی ادائیں

آئینے میں لیکن ابھی بیگم کی ادا دیکھ

سمجھے گا محلہ ترے پوشیدہ اشارے
ہمت یہ مگر کس کی، جو تجھ کو کبھی مارے

محدود نہیں تیری شرارت کے کنارے
بھاگیں گے ترے خوف سے احباب بچارے

لے ہاتھ میں ڈنڈا، اٹھا نعرہ ذرا دیکھ

لوگوں کی ہیں سب قیمتی چیزیں ترے گھر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے "ہنر" میں

بچتی نہیں محدود سی تنخواہ نظر میں
دولت تری پنہاں ہے، ترے اپنے ہی شر میں

اس جہد مسلسل کی عطا دیکھ، جزا دیکھ

نالندہ ترے بچوں کا ہر تار ازل سے
اور تو کہ پڑوسن کا پرستار ازل سے

گھر ہے ترا وابستۂ اسرار ازل سے
بیگم ترے حق میں ہے دل آزار ازل سے

ہے اس کی رضا میں ہی مگر تیری رضا دیکھ

(اکتوبر ۱۹۸۹ء)

راہیؔ + غالبؔ

مجھ سے شادی کی اگر خواہش ترے دل میں نہ تھی
"تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے"

تو خفا، ڈیڈی خفا، ممی خفا، انکل خفا
"ایک دل اس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے"

قرض کی ہر رقم واپس مانگتے ہیں یار لوگ
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ان کی ترچھی آنکھ کا ہر تیر ضائع ہو گیا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

میکدے کے آگے نالی میں برآمد ہو گیا
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

راہیؔ چاروں عقد تو نے ہم سے پوشیدہ رکھے
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

(جنوری ۱۹۷۶ء)

○

کبھی "مڈ ٹرم الکشن" نہ کراؤ یارو
اپنی اسٹیٹ پہ جھاڑو نہ پھراؤ یارو

نوکری ڈھونڈ کے کچھ کھاؤ کماؤ یارو
کوچۂ یار میں چپل نہ گھساؤ یارو

"ایجی ٹیشن" بھی کرو، جیل بھی جاؤ یارو
اپنے ماں باپ کی باتوں میں نہ آؤ یارو

اس الکشن میں تو ہم سب کے ٹپا نٹ بھی گئے
چین کی بنسری اب گھر میں بجاؤ یارو

کالجس بند ہیں لیکن سنیما بند نہیں
فیس کی رقم یہیں کام میں لاؤ یارو

امتحانات سے کچھ پہلے ہمیشہ کی طرح
شہر میں پھر کوئی ہسٹر تال مچاؤ یارو

ٹیکس گھٹ جائیں گے اک روز مگر شرط یہ ہے
ورلڈ کی جنتا نہ بے بھاؤ بڑھاؤ یارو

"صدر کے راج" میں عہدوں کی تمنا کیسی
اے مرے دوستو درخواست گزار دو یارو

یہ منجم جو بتاتا ہے مقدر سب کو
ایک دن اس کو ذرا "ہاتھ" بتاؤ یارو

پہلے شاعر کے بڑے بال ہوا کرتے تھے
اب تو ہپی "بنو اور بال بڑھاؤ یارو

محفلِ شعر و سخن میں ہیں "مہیلائیں" سب
اب غزل پڑھنے سے بہتر ہے کہ گاؤ یارو

ایک L.I.C کی شاخ وہاں بھی کھولو
چاند کی مٹی کا پھر بیمہ کراؤ یارو

پارٹی راہیؔ کے کہنے سے بدل لو اپنی
عین ممکن ہے کہ ہر دن جلد جاؤ یارو

(مارچ اپریل ۱۹۷۱ء)۔

ساقف رحیم

غزلیں

شاعری کی بزم سے آگے نہ جانا ہے مجھے
ہاتھ رکھنا کان پر اور شعر گانا ہے مجھے
الٹے سیدھے شعر کہنا داد پانا ہے مجھے
آئینے سے پھوڑ کر پتھر بتانا ہے مجھے
شاعری میں کچھ نہ کچھ جدت دکھانا ہے مجھے
چاند دن میں، رات میں سورج اگانا ہے مجھے
اک نئے انداز سے چکر چلانا ہے مجھے
"انجمن" کے نام سے چندہ کمانا ہے مجھے
شاعری میں سر کھپانا، دل جلانا ہے مجھے
یہ مرض ہائے ڈاکٹر صاحب پرانا ہے مجھے
داد کے بدلے میں ہوٹنگ پا کے آنا ہے مجھے
کیا رحیم اس شاعری میں سر کھپانا ہے مجھے

(جولائی ۱۹۸۱ء)

●

یہ انٹرویو میں پوچھا مجھی سے
سفارش لائے ہو کیا تم کسی سے
پدر رکھتا ہوں اب تک بھی پسر کو
کیا ہے میں نے ایم اے فارسی سے
نہیں آمادہ کوئی قرض دینے
بڑا نقصان ہے یہ شاعری سے
مگر مچھ جان کر خوابوں میں اکثر
میں ڈرنے لگ گیا ہوں چھپکلی سے
نظر ڈالوں میں کیسے دوسری پر
پریشاں ہوں میں اب تک ایک ہی سے
بڑی مشکل سے بکرا اک پتی وہ
نظر آنے لگے ہیں لکھ پتی سے
ہوا یہ فائدہ شادی سے ہم کو
ہوئے آگاہ رسم خودکشی سے
ہم آزادی کا مطلب آج سمجھے
ہے چٹنی دو قدم آگے گھی سے

(جولائی ۱۹۹۳ء)

★

رانگ نمبر پہ عشق کر بیٹھا
ہاں! مزہ ایسی گفتگو میں ہے
سانس میں تھی کبھی جو طراری
آج کل وہ ہر اک سبو میں ہے
دور کر دے خدا یہ موٹاپا
بڑی مشکل مجھے وضو میں ہے
منتظر ناشتے کے ہم ہیں مگر
چائے کی پیشکش گلو میں ہے

(جون ۱۹۹۳ء)

★

گستاخی معاف

بد نظر، بد نما، کج سر، شیخ جی
کیوں ہیں نظروں میں پھر معتبر شیخ جی
ٹانگیں معذور ہیں، آنکھیں بے نور ہیں
پھر بھی رکھتے ہیں قلب و جگر شیخ جی
حسن سترہ برس، عشق ستر برس
کیا نبھائیں گے اب عمر بھر شیخ جی
کچھ تفاوت ہے عمر مابین میں
اب تو جھکنے لگی ہے کمر شیخ جی
حسن واقف ہوا آپ کے ظلم سے
اب یہ اڑنے لگی ہے خبر شیخ جی
کیا بھروسہ ہے اب یہ ڈیمہ کے بعد
جانے آئیں گے کب لوٹ کر شیخ جی

★ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)

روشن پٹیالوی

ماڈرن غزل

مضمونِ دل چرا کے ستم گر نکل گیا
خالی کتاب رہ گئی میٹر نکل گیا

نکلا جو گھر سے قیس تو لیلیٰ پکار اٹھی
رستہ تڑا کے پالتو ڈنگر نکل گیا

دل کی نہ آج تک مری کھیتی ہری ہوئی
ٹکڑا زمینِ عشق کا بنجر نکل گیا

مجھ کو خیال تل کا تھا رخسارِ دوست پر
دیکھا جو پاس جا کے تو مچھر نکل گیا

میت پہ میری آ کے وہ کہتے ہیں ناز سے
اب ناز کون اٹھائے گا نوکر نکل گیا

سائیکل ہماری زیست کا آگے نہ بڑھ سکا
دیکھا جو ہم نے غور سے پنکچر نکل گیا

دیکھی جو سرفروشوں کی مقتل میں بھیڑ بھاڑ
خوش ہو کے اپنے جامے سے خنجر نکل گیا

کوڑے لگا رہی ہے مجھے یادِ زلفِ دوست
چوٹی کا جس پہ شک تھا وہ ہنٹر نکل گیا

گھر بیٹھے بیٹھے جب ہوا دل مرا اداس
لاٹھی اٹھا کے جانبِ دفتر نکل گیا

مجھ سے ملا سکا نہ تیرا عکس آئینہ
اس میں بھی فرق بال برابر نکل گیا

بت سے بھی کچھ امیدِ شفاعت بروزِ حشر
وہ بھی میرے نصیب سے پتھر نکل گیا

مرنے کے بعد میرے اٹھا شور دہر میں
روشن جو شاعروں کا تھا لیڈر نکل گیا

(۱۰ اکتوبر، نومبر ۷۲ء)

ہوائے مغرب

ہوا مغرب کی کھا کر، ہو گئی اتنی سمجھ موٹی
بجائے دودھ گھی کھانے لگے ہم بھی ڈبل روٹی

نہ جانے کیسی قسمت لے کے آیا ہوں میں دنیا میں
کہ سننی پڑ رہی ہے مجھ کو ہر اک کی کھری کھوٹی

دیارِ عشق میں لوٹے گئے ہم بے طرح اے دل
ہمارے پاس باقی رہ گئی کھدر کی لنگوٹی

یہ شاعر ہے کہ کوئی رہبرِ اعظم کہ عاشق ہے
نہ اس کے تن پہ کپڑا ہے نہ اس کے پیٹ میں روٹی

سراپا کیا لکھوں محبوب کا طرفہ قیامت ہے
کہ اس کا قد پستہ آنکھ چھوٹی ناک ہے موٹی

مقدر کے ہے بس میں چال یہ خود چل نہیں سکتا
بساطِ دہر پہ انسان ہے شطرنج کی گوٹی

کسی قیمت پہ بھی چلتا نہیں سکہ صداقت کا
یہ سچ ہے آج کل دنیا میں ہر اک جنس ہے کھوٹی

لگے گی آگ دیدِ فصلہ رو سے میں نہ کہتا تھا
میرے دل کی تمنا سرخ انگارہ پہ جا لوٹی

ہمارے دیش کی جہلاؤں کی جدت کوئی دیکھے
ہوئیں ہم مردوں میں شامل وہ کٹا کر سب اپنی چوٹی

خرامِ نازنیں کا کم نہیں ... شورِ محشر سے
نگاہ و فتنہ پرور اک قیامت ہے مگر چھوٹی

عنایت اور محبت کس قدر پیار کرتا تھا
مزے سے بیٹھ کر پیتے تھے ہم اور آپ دال روٹی

نصیحت یہ کرو عورت نما مردوں کو اے روشن
کہ گھر میں بیٹھ کر آرام سے کھائیں ڈبل روٹی

(۶ دسمبر ۱۹۷۲ء)

ساغر خیامی (نئی دہلی)

اگر جنگ ہوگئی

ابر ہوگا نہ سمندر نہ زراعت ہوگی دھرتی ہوگی نہ ہوا، اور نہ حرارت ہوگی
بم جو برسیں گے خلاؤں سے قیامت ہوگی عالمی جنگ سے دنیا کی یہ حالت ہوگی
قیس دکھلائی نہ دیں گے کہیں چھونے کے لیے
ہاتھ آئیں گی نہ لیلائیں نمونے کے لیے
گیس بن جائے گا ہر پھول چمن زاروں میں بھر لیا جائے گا انسان کو غباروں میں
بیٹھ کے دوسو رفتار کے طیاروں میں بھاگ جائیں گے بڑے لوگ تو سیاروں میں
بھوت رہ جائیں گے مردوں میں سمانے کے لیے
مولوی ہوں گے نہ یٰسین سنانے کے لیے
جرأتیں دیکھ کے لگتا ہے یہ فرزانوں کی شمع بجھ جائے گی اس بھیڑ سے پروانوں کی
باتیں سچی کبھی ہوا کرتی ہیں دیوانوں کی مونچھیں گدّی میں نکل آئیں گی انسانوں کی
وقت سے پہلے قیامت کے، قیامت ہوگی
استروں سے نہیں توپوں سے حجامت ہوگی
خار پیوست مرے دل سے نکل سکتے ہیں جو ہیں مفلوج رہِ شوق میں چل سکتے ہیں
عالمی جنگ کے خطرات بھی ٹل سکتے ہیں چند مٹی کے کھلونوں سے بہل سکتے ہیں
صاحبو، وقتِ مدد ہے، مری امداد کرو
عشق کرنے کے طریقے نئے ایجاد کرو
اس سے پہلے کہ زمانے میں قیامت ہو جائے گورے، کالوں سے ملیں سانولی رنگت ہو جائے
عالمی جنگ کے خطرے سے بھی راحت ہو جائے پوری دُنیا میں اگر عام محبت ہو جائے
اس سے پہلے کہ جدا سارے کمکشن ہو جائیں
ایک دُنیا کی حکومت ہو الکشن ہو جائیں

(نومبر ۱۹۸۷ء)

نسیم سحر (جدہ)

غزلیں

بابو نہیں آئے، یہاں افسر نہیں آیا
کرکٹ کی خوشی میں کوئی دفتر نہیں آیا

بیگم نے جو غصے میں طلب کر لیا ان کو
شوہر تو چلا آیا ہے، نوکر نہیں آیا

جو اپنے مفادات سے آگے کی بھی سوچے
ایسا تو کوئی مرد قلندر نہیں آیا

اک روز میں ٹپ دینا اسے بھول گیا تھا
ٹیبل پہ مری پھر کبھی ویٹر نہیں آیا

حوروں کے تعاقب میں رہا خواب میں شاید
مسجد میں جو وہ صبح کو اکثر نہیں آیا

مدت سے نسیم ان میں ہوئی دشمنی ایسی
ملا جہاں آیا وہاں مسٹر نہیں آیا

○

تنہائیوں سے اتنا ڈری ۔ ساتھ لے گئی
محبوب کو بھی جب وہ مری ساتھ لے گئی

شوہر پہ کہیں بھی یہ چلایا اسی نے تھا
جج نے کیا جب اس کو بری ساتھ لے گئی

چمٹوں کی پھکنیوں کی ضرورت نہیں رہی
بیگم فنِ سپاہ گری ساتھ لے گئی

تا عمر مرنے والی کو مجھ پر شبہ رہا
اب اپنی ساری دیدہ دری ساتھ لے گئی

اندھی فقیرنی کو ملی تھیں چونیاں
کھوٹی گرا دیں اس نے کھری ساتھ لے گئی

خود تو جہیز لائی ہی کب تھی دولہن مگر
دولہا کو بھی اٹھا کے بری ساتھ لے گئی

قلاش کر کے لائے گی میرے رقیب کو
اچھا ہے گر وہ اس کو مری ساتھ لے گئی

وہ تو بلا سے جاتی مگر یہ غضب ہوا
بچوں کو بھی وہ بھاگ بھری ساتھ لے گئی

عینک یہیں پہ چھوڑ کے وہ فوت ہو گئی
اور صرف اپنی بے بصری ساتھ لے گئی

ماضی سے وہ میاں کا تعارف کرائے گی
صندوقچی خطوں سے بھری ساتھ لے گئی

قالین کہہ کے گھر میں اسے وہ بچھائے گی
لنڈے سے جو پرانی دری ساتھ لے گئی

سلسلہ صفحہ

اب غمِ جدائی کے ٹانکے سیے گا کون — وہ جانِ جاں تو بخیہ گری ساتھ لے گئی
جاگا تو اک چڑیل کو پایا ہے ہم سفر — دیکھا تھا میں نے خواب پری ساتھ لے گئی
بس اک مجھے ہی چھوڑ گئی ہے وگرنہ وہ — جو چیز تھی جہاں بھی دھری ساتھ لے گئی

اس نے نسیم پچھلا زمانہ بھلا دیا
جس دوست کو بھی نام وری ساتھ لے گئی

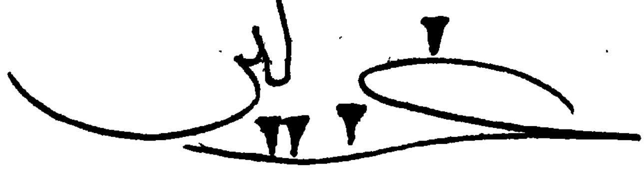
○

دے جاؤ جو اک دن مجھے دیدار وغیرہ — کیا خوب ہو جل جائیں سب اغیار وغیرہ
کہتا ہے وہی ہم کو گنہ گار وغیرہ — ہم سے ہے زیادہ جو خطا کار وغیرہ
چھن جائے اگر شیخ کی دستار وغیرہ — پھٹ جائیں گے سب حاشیہ بردار وغیرہ
جس کو ہے گماں، وہ ہے اداکار وغیرہ — صورت سے تو لگتا ہے چڑی مار وغیرہ
چھپ چھپ کے میں کرتا ہوں اسے پیار وغیرہ — ڈرتا ہوں نہ سونپے کوئی بیگار وغیرہ
شاعر کی غزل میں ہے بہت تذکرہ جس کا — رشتے میں وہ چچا ہے کوئی بیکار وغیرہ
ڈرتا ہوں کہ رقیب اسے جیت ہی لے گا — دے کر اسے سونے کا کوئی ہار وغیرہ
کر دیتے ہیں عشاق کو قتل ایک نظر میں — بت ہاتھ میں رکھتے نہیں تلوار وغیرہ
کون اتنا سمائے مری نظروں میں کہ میں نے — دیکھے ہیں وہ زلف و لب و رخسار وغیرہ
صحرا کا مسافر بھی یہ دریافت کرے ہے — رستے میں ہے کیا سایۂ اشجار وغیرہ
یہ شربتِ دیدار ہے، وہسکی تو نہیں ہے — پیتے ہوئے مانو نہیں مقدار وغیرہ
احمق ہیں وہ سب لوگ جو گنتے ہیں ستارے — پڑھتے ہیں شبِ غم میں ہم اخبار وغیرہ
اب کھول کے بیٹھے ہیں لغت ہم کہ وہ اک دن — غصے میں ہمیں کہہ گیا حمار وغیرہ — گدھا
کھا جائیں گے کیا ہم تمھیں؟ پاس آ کے تو بیٹھو — سن لو نا ذرا ہم سے بھی اشعار وغیرہ

نفرت ہے اسے مجھ سے نسیم اور میں چاہوں
کہہ دے مجھے اک روز وہ دلدار وغیرہ

(جون ۹۱ء)

●



سراج زملی

تجھ کو فیسر ولد خاں نہیں معلوم اوز زینت اماں نہیں معلوم
کس قدر ویک ہے تری نالج تجھ کو سنجے کی ماں نہیں معلوم
جاؤں میں اب کہاں نہیں معلوم ہے کہاں کارواں نہیں معلوم
کس لیے ہیں تمہارے لہجے میں اس قدر تلخیاں نہیں معلوم
فوڈ منسٹر کے ٹور پر کتنی کٹ گئیں مرغیاں نہیں معلوم
چھوڑ کر کیوں وہ پانچ سو پچپن پی رہا ہے بیڑیاں نہیں معلوم
کس لیے نان سٹاپ تو مجھ کو دے رہی گالیاں نہیں معلوم
پی کے مدہوش ہو گیا تھا میں کیسے آیا یہاں نہیں معلوم

(مارچ ۱۹۸۳ء)

★

دعوت میں آکے آپ یوں شرمایئے نہیں مہنگائی کا زمانہ ہے کم کھایئے نہیں
جو ہو گیا سو ہو گیا، سب بھول جایئے ماضی کے واقعات کو دہرایئے نہیں
گھر میں سکوں رہے گا، بچت بھی تو ہو گی کچھ میکے کو جا کے، جلد پلٹ آیئے نہیں
ہو گا نہ کچھ بھی آپ کو، جاں میری جائے گی یوں میرے سر کی جھوٹی قسم کھایئے نہیں
پڑھنی ہیں تم کو صرف کتابیں نصاب کی فلمی رسالے، ناول و انشایئے نہیں
تنگ آچکے ہیں ہم تو غلامی کی لائف سے اب آپ جیسی وائف ہمیں چاہیئے نہیں
ہم جانتے ہیں، صرف یہ میک اپ کی دین ہے بیوٹی پہ اپنی اس قدر اترایئے نہیں
مہمان ہوں، تواضع مری کچھ تو کیجئے مجھ کو سراج! دال پہ ٹرخایئے نہیں

(جنوری ۱۹۸۶ء)

★

بل کیا، بل کیا، بل کیا، بل کیا چل دیا، چل دیا، چل دیا، چل دیا
وائف کی لائف انشور کروا کے دے سنکھیا، سنکھیا، سنکھیا، سنکھیا
لاکے مرغی کا سالن ہمیں دے دیا شکریہ، شکریہ، شکریہ، شکریہ
انڈیا سے گیا، گلی ڈنڈے میں ہار زامبیا، زامبیا، زامبیا، زامبیا
پھٹ گیا وہ بھی تھا ایک اکلوتا جو بوریہ، بوریہ، بوریہ، بوریہ
تھی گھڑی وہ تو منحوس جبکہ تجھے دل دیا، دل دیا، دل دیا، دل دیا
میرے معشوق کو لے کے کل ہی سراج چل دیا، چل دیا، چل دیا، چل دیا

(جولائی ۱۹۸۳ء)

سرپٹ حیدرآبادی

غزل

اپنی محفل کا یہ دستور بنا دے ساقی
جو بھی اونگھے اسے اک دھول جما دے ساقی

معجزہ اپنی کرامت کا دکھا دے ساقی
کھارے پانی میں کبھی دال گلا دے ساقی

میں ہوں بیمار گر پینے کا شفا دے ساقی
کچھ نہیں چاہیے دو گھونٹ پلا دے ساقی

جستجو میں تری بھٹکا کریں کب تک میکش
جو جہاں رہتا ہے اس گھر کا پتا دے ساقی

تیرے کہنے پہ بھی جو پینے سے انکار کرے
راستہ اس کو جہنم کا دکھا دے ساقی

کم سے کم اتنا تو ہو پینے پلانے کا اثر
بادہ نوشوں ہی کو آپس میں لڑا دے ساقی

وہ بلانوش جو ہوں حرص و ہوس کے بندے
خالی پیمانے ہی ایسوں کو تھما دے ساقی

راہ مے خانے کی جو بھول کے گمراہ ہوئے
راستے میں اسے نالی میں گرا دے ساقی

تیری اولاد کی اولاد کے ہاتھوں سے پیوں
اتنے دن تک مجھے جینے کی دعا دے ساقی

سالہا سال سے بے ہوش پڑا ہے سرپٹ
ہوش میں لانے اسے تو بھی پلا دے ساقی

(نومبر ۷۶ء)

پیشین گوئیاں

رنگ لائے گی حسینوں کی جفا اب کے برس
جوتیاں کھائیں گے ارباب وفا اب کے برس

ہوگا ہر سمت زمانے میں علامت کا رواج
ہوں گے یک جا نہ کبھی پیٹ پتا اب کے برس

دیئے جائیں گے خطاکاروں کو انعام اکرام
جو نہ مجرم ہوں وہ پائیں گے سزا اب کے برس

چوٹیاں حسن کی ہو جائیں گی نذر فیشن
پھر نہ لہرائے گی یہ کالی گھٹا اب کے برس

سایہ پڑ جائے گا اس پر کسی حبشن کا فرد
کالا ہو جائے گا یہ رنگ حنا اب کے برس

لازمی ہو کے رہے گا یہ گرانی کا اثر
بادہ کش ہوں گے گٹر ہی پہ فدا اب کے برس

گلشن دہر پہ ہو جائیں گے قابض کوے
نہ ملے گا کہیں بلبل کا پتا اب کے برس

منتقل چاند میں ہو جائیں گے سب اہل زمیں
سونی ہو جائے گی دنیا کی فضا اب کے برس

جھوٹی باتوں میں شب و روز بسر ہونے لگے
سچ نہ کہنے کا ارادہ ہے مرا اب کے برس

بات یہ اب کے برس ہوگی یقیناً سرپٹ
ہر بھلائی کا صلہ ہوگا برا اب کے برس

(نومبر دسمبر ۶۹)

سرپٹ حیدرآبادی

غزل

جہاں جہاں میں رکا راستے میں ستانے
وہاں وہاں ہوئے قائم نئے مدک خانے

خوشی سے آپ مجھے روز گالیاں دیجے
خدا نے مجھ کو بنایا ہے جھڑکیاں کھانے

مذکروں میں نہیں ہے علامتِ تذکیر
بنے ہیں رو کشِ تانیث آج مردانے

نہ لیلیٰ مجنوں تھے کوئی نہ شیریں و فرہاد
مرے خیال میں سب من گھڑت ہیں افسانے

اسی کی ملتی ہے تنخواہ یہی پولس کا ہے کام
پھر اور کیا کرے وہ گر کرے نہ جرمانے

سمجھ میں آگئی صورت رئیس بننے کی
جو بار بار نکالا دوالہ بر لانے!

تھی داڑھی لاپتہ اب تو نہیں ہیں مونچھیں بھی
زنانی شکل میں رہنے لگے ہیں مردانے

نہ صبر و شکر میں وہ بھی قبول کر لوں گا
ملیں اگر مجھے فی شعر صرف پانچ آنے

سنا ہے حضرت سرپٹ ہیں سارق اشعار
حقیقت اس کی ہے واصل کیا خدا جانے

(ستمبر اکتوبر ۷۲ء)

رواج کتنا بدلتا ہے یہ خدا جانے
طعام شب کی جگہ رہ گئے ہیں عصرانے

کرے جو آدمی دن رات کام من مانے
رہے وہ ہر گھڑی تیار جوتیاں کھانے

ہے کام شمع کا جلنا جلے گی محشر تک
ہیں بے وقوف جو مرتے ہیں جل کے پروانے

تواضع اور مدارات خوب ہی ہوگی
زنانے میں کبھی گھس آئیں گے گر مردانے

مچلتے روٹھتے ہیں، ایڑیاں رگڑتے ہیں
بڑھاپے میں بھی ہیں حرکات ان کے بچکانے

کھلا ثبوت ہے یہ میری عقل مندی کا
مری نظر میں سوا میرے سب ہیں دیوانے

نکالی جیب سے پی لی جہاں بھی پیاس لگی
قدم قدم پہ بنائے ہیں میں نے مے خانے

کہیں سر اس کا منڈانا پڑے نہ میرے بعد
ابھی میں زندہ ہوں زلفِ غزل کو سلجھانے

اگر رہی یہی الٹی روش زمانے کی
بنائے جائیں گے سرپٹ فلک پہ تہ خانے

سگار لکھنوی (بھوپال)

عقدِ شاعرہ

کروں گی پیار اسی سے جو خوش خصال بھی ہو
اسی کی دال گلے گی جو مالا مال بھی ہو

کل ایک مشاعرہ میں مجھ سے کہہ رہی تھی سگار
نہ پوچھیے مرا ماضی تو عرض حال بھی ہو

میں چاہتی ہوں سنور جائے میرا مستقبل
یہ آرزو ہے کہ بہتر مرا مآل بھی ہو

مریض دل ہیں مری والدہ بھی والد بھی
بس اس سے قبل کہ دونوں کا انتقال بھی ہو

دعائیں کرتی ہیں ممی کہ میرے پھول کھلیں
شگوفہ کاریٔ باغیچۂ وصال بھی ہو

بس اب تلاش شریکِ حیات ہے مجھ کو
کہ بعد عقد ذرا سیر نینی تال بھی ہو

مگر اک ایسے گلے باز خاں کی طالب ہوں
کہ تان سین نما جس میں سُر بھی تال بھی ہو

وہ ٹوٹے تال کو جوڑے تو اس طرح جوڑے
کہ جوڑ توڑ میں آپ اپنی ہی مثال بھی ہو

نہ بوم و چغد ہو ایسا کہ سب کہیں بھونڈو
نہ خر دماغ ہو ایسا کہ خر خصال بھی ہو

سب ارنا بھینسا کہیں ہو نہ ڈیل ڈول ایسا
نہ چھچھوندر موئی کی مانند خستہ حال بھی ہو

برائے خدمت زوجہ کرے جو وقف حیات
اٹھا کے جوتیاں بیوی کی وہ نہال بھی ہو

میں ڈانٹ دوں تو کھڑا کا کھڑا ہی رہ جائے
نہ یہ کہ مجھ سے وہ مائل بہ قیل و قال بھی ہو

ہزار ہیں متشاعر بہ صورت شاعر
یہ اور بات ہے گھورے میں کوئی لال بھی ہو

ہر ایک ملتے ہیں خانہ بدوش شعر و ادب
کروں گی عقد اسی سے جو خوش خصال بھی ہو

جمال سے ہے مرا اس کا حسن فن کاری
سخن وری میں نمایاں یہ خط و خال بھی ہو

ہے ایسے شاعر پختہ شعور کی خواہش
نہ جس پہ خام خیالی کا احتمال بھی ہو

نہ یہ کہ "ع "گرا تا رہے بہر اوزان
فکار جس سے دلِ صاحبِ کمال بھی ہو

کرے تلفظ و معنی کا یوں نہ بنٹا دھار
جو اس کو صحتِ الفاظ کا خیال بھی ہو

نہ توڑ موڑ کے انگلش کے لفظ نظم کرے
کہ شاہراہِ ادب جس سے پائمال بھی ہو

یہ سن کے میں نے کہا شاعرہ سے میں سمجھا
نہیں پسند وہ شیشہ کہ جس میں بال بھی ہو

تجھے پسند نہیں ایسا کوئی بھی شاعر
کہ جس کے شعروں میں لفظوں کا گول مال بھی ہو

تجھے پسند نہیں ایسا ایک بھی مصرعہ
اور عنقریب اسے امیدِ انتقال بھی ہو

(سلسلہ ص ۸۷ پر)

نظر نہ میں کوئی آئے جو قطعہ سائی   تو کیوں نہ شعروں میں اس کے جمال جمال بھی ہو
نہیں ہے شہر میں اور ایسا ایک بھی فن کار   جو تیرے واسطے موزوں بہ ایں خیال بھی ہو
تلاش کر وہ ملے گا مشاعروں میں تجھے   گڑی ہوئی تری آنگن میں جس کی نال بھی ہو
مراد مل کے رہے گی تری کبھی نہ کبھی   مگر یہ شرط ہے سختی سے دیکھ بھال بھی ہو
برائے رشتۂ ثانی سگار حاضر ہے   یہ قید ہو نہ اگر ہے عیال و آل بھی ہو
نہ ہے شرف زہے عزت اگر قبول افتد   کھلے یہ غنچۂ دل عقد با وصال بھی ہو
قبول ہو تو میں آجاؤں مولوی لے کر   کہ اس سے قبل ترے حسن کا زوال بھی ہو
بنی تو میری بنی میں بنوں بنا تیرا   بنا بنی میں محبت بہ اعتدال بھی ہو
پھر اس کے بعد وہی ہو جو ہوتا آیا ہے   کہ تیری گود بھرے گھر میں نونہال بھی ہو

او میرے چاند ہنی مون کے لیے آجا
بکارِ نیک یہ تعجیل خوش مآل بھی ہو

مارچ ۷۸ء

سگاریات

بے وصل محبت میں مزا آ نہیں سکتا   میں اس سے زیادہ تمہیں سمجھا نہیں سکتا
جو ناک ترے عشق میں کٹوا نہیں سکتا   سچ کہتا ہوں عاشق کبھی کہلا نہیں سکتا
یہ دار و رسن ہے یہاں دیوانے ملیں گے   نیتا کوئی بھولے سے ادھر آ نہیں سکتا
یہ کہہ کے حوادث نے قدم چوم لیے ہیں   دنیا میں کوئی آپ سے ٹکرا نہیں سکتا
کوچے میں ترے جیب کٹی بزم میں گردن   اب تیرے لیے ناک تو کٹوا نہیں سکتا
آ جائے نہ ہم پہ ہی بڑا بول نہ بولو   کہتے ہی نہ رہ جائیے کہ دل آ نہیں سکتا
وہ توپ کے گولوں میں بھلا کیسے ملے گا   اک مرغی کا انڈا جو کبھی کھا نہیں سکتا
اے چارہ گرو دیکھو کہ بیمارِ محبت   جز ان کے کسی سے بھی دوا کھا نہیں سکتا
سلجھائے گا وہ زیست کے الجھے ہوئے گیسو!   جو اپنی ہی زلفیں ابھی سلجھا نہیں سکتا
اس خوف سے کٹ جائے نہ سوتے میں کہیں جیب   سسرال میں آرام بھی فرما نہیں سکتا
موجود ہے جب تک ترا اسپیشل اے دوست   کوچے میں ترے کوئی نظر آ نہیں سکتا
اقرار ہے ہر جرم محبت میں کیا ہے   ہر جرم کی تفصیل تو فرما نہیں سکتا
اس شعر کو یوں سا بھرا ایک شیری بھولو   جو شعر کسی مدح کو گرما نہیں سکتا
ہم نے جو کہا جاتا ہوں میں بزم سے تیری   کہنے لگے 'جانا' تو کبھی جا نہیں سکتا
خلوت ہی میں گھس جانے کی دیجیے اجازت   گر آپ کی محفل میں سگار آ نہیں سکتا (دسمبر ۷۶ء، ۷۷ء)

مرزا سلطان بیگ
(ریاض)

غزلیں

○

۱

اس قدر ہوگئے گراں انڈے
سارے جذبات ہوگئے ٹھنڈے

وہ زمانہ بھی خوب تھا یارو
جب مناتے تھے رات دن سنڈے

جیتے جی تو ہماری قدر نہ کی
لائے ہو اب مزار پہ جھنڈے

لب شیریں ہو یا ہو وعدۂ وصل
ہیں خطرناک دونوں ہتھکنڈے

ان کو چیزیں پسند ہیں فارن کی
جارہی ہیں وہ آج پھر لنڈے

پیار کی مار سب ہی سمجھتے ہیں
چاہے پتلے ہوں چاہے مسٹنڈے

اس نئی نسل کے جو ہیں انداز
گاڑ دے گی بڑے بڑے جھنڈے

خاک سب کو لپیٹ لیتی ہے
خاک میں ہم بھی جائیں گے ونڈے

○

عشق کرشمہ ساز نے کیا کیا بنا دیا
ہم اچھے خاصے لوگوں کا بھیجا ہلا دیا
میری تو کوئی بات بھی وہ مانتے نہیں
اللہ نے مجھ کو کیوں نہیں شرطہ بنا دیا
میں نے کہا کہ دال پلائی ہے آج پھر
اتنی سی بات پہ مجھے مرغا بنا دیا
کیوں ہنس رہے تھے خواب میں اور جان کون تھی
اچھا یہ میں تھا، آپ کو ناحق جگا دیا
"سوری رہوگی ناشتہ پانی کبھی تو دو
سب کچھ کچن میں ہے مجھے رستہ بتا دیا
میں ہنس رہا تھا وقت کی گھڑیال نے مجھے
کچھ ایسی بات یاد دلائی رلا دیا

○

کیا ضروری ہے وطن سے ہی محبت کرنا
اس سے افضل ہے وزیروں کی ضیافت کرنا
اور جلسوں میں بصد شور خطابت کرنا
تھا مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

○

خواب لگتا ہے جوانی کا زمانہ مجھ کو
یہ کشش میٹھے گنا ہوں کا فسانہ مجھ کو
وقت پیری ہے نہ اب یاد دلانا مجھ کو
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ تھا اس رہ پہ چلانا مجھ کو

پاؤ حکیم

سلیمان خطیب

رکے پیچھے جدید قبریں ہیں
بھی ان کا ہی کارنامہ تھا

جن کا خفیہ علاج ہوتا تھا
یہیں وہ خوش نصیب ہوتے تھے

یا کہیں خود حکیم صاحب بھی
لہ امراض کا نمونہ تھے
تی دیوار جھڑتی ہوتا تھی
نہ سوکھا ہوا پدینہ تھے

چال ایسی کہ ہلت مغلر تھے
دانت ویسے بھی گرتی کٹ گرتے
لمانسی اٹھتی تھی سیٹی بجتی تھی!
نوں آنکھوں کی لائٹ مدھم تھی

اک دکان کفن فروشاں تھی
واں شفا خانہ کھول رکھا تھا
ا کے بازو یتیم خانہ تھا
بھی قدرت کا کارخانہ تھا

بندہ، بندے سے یاں نہیں ملتا
سب کو بندے سے یہ ملاتے تھے

روزی جنھیں ستاتی تھی!
نا کو آرام سے سلاتے تھے
کیا امیری ہے کیا غریبی ہے
فرق دونوں کا یہ مٹاتے تھے

کس قدر باکمال انساں تھے
قومی یکجہتی سے کام لیتے تھے
ہندو مسلم ہو، سکھ یا عیسائی
ایک گولی سے مار دیتے تھے
گھر پہ کوئی فقیر آپہنچا

فقیر:
مرنے والوں کے نام پر دے دو
تاکہ حق میں دعا کرے کوئی
حکیم صاحب: روز کتنے فقیر آتے ہیں
کس کی حاجت روا کرے کوئی
تم نکمے ہو اور نالائق
ہم بھی محتاج ہیں مریضوں کے
کیا کسی کا بھلا کرے کوئی
فقیر: گولی کھاتے ہی لوگ مرتے ہیں
بل بھی کیسے ادا کرے کوئی
تم بھی میرے ہی ساتھ آجاؤ
گھر میں بے کار کیا کرے کوئی
حکیم: تندرستی کی فکر کرنا دان
تندرستی ہزار نعمت ہے
فقیر: تنگ دستی اگر مسلسل ہو!
تندرستی کو کیا کرے کوئی!
دکھ ہے دنیا میں صرف روٹی کا
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
روٹی کتنا ذلیل کرتی ہے
ایسے کب تک جیا کرے کوئی

(دسمبر ۷۵ء)

ہمارے بچے

سلیمان خطیب

شاعر: فرمائیے نا صاحب! بچّوں کا حال کیا ہے؟
کچھ تو پڑھایا ہوگا، آگے خیال کیا ہے؟

کسوو پنڈت: صاحب غلام زادے سب طاق ہو چکے ہیں
بستی کی کس گلی سے نسبت نہیں ہے ان کی
ڈرتے ہیں یوں بڑوں سے پاسِ ادب ہے، اتنا
دو چار دن سے گھر میں صورت نہیں ہے ان کی

دکنی خالہ: اُجڑ دے، اجاڑ پیٹے سب کو کھیا کو نکلیں
جٹ بھر کے ہیں کی نیں کی چٹّا لگا کو نکلیں
پھلاں کے پہنے بش شرٹ پودے چمن بنے ہیں
آپا کا جیسے ہیرو جمپر دبا کو نکلیں
سب دوستاں کو لے کو ہوٹل میں جا پیے ہیں
باوا کے جیب میں سے پیسے تڑوی دیے ہیں

مسٹر لا برٹ بائی گاڈ، اپنا جانی پرفیکٹ ہو گیا ہے
اک دم ہے فور ٹونٹی، پپا سے فائیٹ کرتا
سچّے کو رانگ کرتا، جھوٹے کو رائٹ کرتا

خان صاحب: واللہ! امارا بچّہ ہے گل کے یار مافک
گاتا ہے فلمی گانے بلبل کے یار مافک
اڑتا ہے چاندنی میں ظالم چکور مافک
"یا ہو" پکارتا ہے شمّی کپور مافک

ہم نے کبھی نہ سوچا اپنے وطن میں یارو
ایسی چلے گی آندھی ویران باغ ہوگا
اولاد ہی کے ہاتھوں منہ پر لگے گی کالک
آنکھوں میں اشک ہوں گے سینے پہ داغ ہوگا
بچّوں کو میرے یارب جینے کا تو ہنر دے
آنکھیں تو دی ہیں تو نے آنکھوں میں کچھ نظر دے
بیٹی ہو اندرا سی، بیٹا ہو نہرو جیسا
ورنہ تو میرے مالک ماؤں کو بانجھ کر دے!

(دسمبر ۱۹۷۵ء)

چمچے!

بے بات کی ہر بات اڑا دیتے ہیں چمچے
آپس میں شریفوں کو لڑا دیتے ہیں چمچے!
یہ ان کی عنایت ہے، نوازش ہے کرم ہے
ہر گھر میں نئی آگ لگا دیتے ہیں چمچے!

کفگیر تو کر دیتی ہے دیگوں کا صفایا
مشتاق کٹوروں میں پھرا کرتے ہیں چمچے
چمچے کی نہیں قید وہ چھوٹا کہ بڑا ہو
ہر کام ڈبونے کا کیا کرتے ہیں چمچے!

(سلسلہ ۱۹۸۱ء)

دنیا میں بڑی چیز ہے یہ چمچہ گری بھی
ہر کام کو مل جاتے ہر دام کے چمچے
دنیا کو نچا دیتی ہیں امریکی پلیٹیں
رسوائے زمانہ ہوئے ورلڈ نام کے چمچے

سرکار تو پشتوں سے گنہ گار رہے ہیں
کچھ بار گنہ اور بڑھا دیتے ہیں چمچے
ہر وقت ڈٹے رہتے ہیں دفتر کے بلا وڈ
اور سیٹھ کے جینے کی دعا دیتے ہیں چمچے

اک نار جہنم ہیں کہ اولاد شمر ہیں
شبیر کے خیمے کو جلا دیتے ہیں چمچے
کوئی ہیں دغا باز ہیں ظالم ہیں شقی ہیں
پیاسے کو سمندر پہ کٹا دیتے ہیں چمچے

(اکتوبر، نومبر ۶۹ء)

ایک کلرک کی موت

(۲۸ر تاریخ کو)

موز لڑ لڑ کو جاں کھا کھا کو
اچھا جنگل میں سو گئے آکو!
منڈی کاٹی کو پہلے مرنا تھا
لے کو مٹھی میں جان بیٹھی ہے
ایسا مرنا بھی کئیکا مرنا جی!
گھر میں بیٹی جوان بیٹھی ہے
کتے لوگاں کے پاواں پڑ پڑ کو
گھر سے میت کو میں اٹھائی ہوں
جینا مرنا تمھارا قرضے کا
آج پھولاں ادھار لائی ہوں
اتنا احسان ہم پو کرنا تھا
تنخواہ لینے کے بعد مرنا تھا

یاد

یاد بولے تو بچپن میں چھوڑے سو گاؤں
جیسے پنگھٹ کے پانی میں ادھا کی چھاؤں
یاد بولے تو تکیے میں گجرے کی باس
جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس
یاد بولے تو انکھیاں جھکانے کا نام
ایک نقشہ بنا کو مٹانے کا نام
یاد بولے تو ریتی پو ہلکی لکیر
جیسے بارسے میں اڑتی سو ہلکی لکیر
یاد بولے تو دل میں چھپانے کی بات
چپ ذرا سوچ کو مسکرانے کی بات

(اپریل ۷۰ء)

مشتاق شاد (ریاض)

غزلیں

○

جاگتے ہی جست کو فولاد کرکے چل دیئے
گھر سے جب نکلے تو پیتل یاد کرکے چل دیئے

سلوریں آنکھوں میں سارے رتجگے تانبے کے تھے
جو مرے سپنوں کو لوہا زاد کرکے چل دیئے

اس نے چاندی کے کٹورے میں دیا پارے کا رس
اور ہم سونے کا رم برباد کرکے چل دیئے

بانٹ کر شیشے کے تیشے آپ سب عشاق میں
عاشقوں کو صورتِ فرہاد کرکے چل دیئے

تم سے اک سیسے کی اک دیوار بھی گرتی نہ تھی
لوگ جب اتنے ستم ایجاد کرکے چل دیئے

لگ گئی جب ان کے چہرے پر بھی نکل کی پلیٹ
وہ بھی خود کو چاند کا ہمزاد کرکے چل دیئے

ویگ کے لوہے کی صورت بھربھرا تھا تیرا پیار
نمک تھے ہم ریت سے فریاد کرکے چل دیئے

دل پرانا تھا اسے قلعی سے اجلا کرلیا
وہ اسے بھی زنگ سے برباد کرکے چل دیئے

غم پیتے ہیں وہ کانس کی پتیلی بھر کے شاد
اس لیے ہم اپنا دل ناشاد کرکے چل دیئے

(اکتوبر ۹۳ء)

○

دم اٹکا ہے یوں بیوی کی تکرار کے نیچے
جی کرتا ہے آجائیں کسی کار کے نیچے

عادات سے مجبور ہے اس دور کی لڑکی
پتلون پہن لیتی ہے شلوار کے نیچے

صد شکر کہ بیگم مری خبریں نہیں پڑھتی
معشوق کی تصویر تھی اخبار کے نیچے

اس آس میں ہم لوگ پہنچ جاتے ہیں اوپر
بھاؤ نہیں گرتے کبھی بازار کے نیچے

گھبراتے ہیں ہم بارِ محبت سے تو یوں ہے
ڈرتے ہیں کہ دب جائیں نہ انبار کے نیچے

ہر حسن کی آنکھوں میں بسا ایک بلا کو
ہر عشق دبا فتنۂ تاتار کے نیچے

لگتا ہے خلاؤں میں کھڑی رہتی ہے پگڑی
ہوتا ہی نہیں سر کسی دستار کے نیچے

اس جرم میں کھولا گیا ہم پر درِ زنداں
ہم بیٹھے تھے محبوب کی دیوار کے نیچے

زانو نہ سہی، اینٹ اٹھا لیئے کوئی
تکیہ تو لگا دیجیے بیمار کے نیچے

اس شوق نے آنکھوں میں اس انداز سے دیکھا
جیتے ہوئے ہم بیٹھ گئے ہار کے نیچے

آج اس نے اٹھایا ہے ہمیں تخت سے اے شاد
کل ہم بھی گرا دیں گے اسے مار کے نیچے

○

کمپیوٹر

اقبال شانہ

غلطیاں کر رہا ہے کمپیوٹر — آدمی بن گیا ہے کمپیوٹر
اک پری چہرہ آپریٹر سے — عاشقی کر رہا ہے کمپیوٹر
ان کی جرمن ہماری اردو کا — ٹرانسلیٹر بنا ہے کمپیوٹر
ہے یہ واقف امورِ خانہ سے — بیویوں سے بھلا ہے کمپیوٹر
بات دل کی سمجھ نہیں سکتا — ہر زباں جانتا ہے کمپیوٹر
ذکرِ کمپیوٹر ان ہوا شاید — خوش بہت ہو رہا ہے کمپیوٹر
مائیکرو چپ "خراب ہے یارو — اس لیے سو رہا ہے کمپیوٹر
جو مسلسل سنائے ہے غزلیں — آدمی ہے وہ یا ہے کمپیوٹر

ہے یہ انجنیئر کا گھر شانہ
ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے کمپیوٹر

(اکتوبر ۹۱ء)

○

○

○

گرانی ، ناتوانی ، تنگ دستی اور فاقہ ہے
ہماری زندگی افکار کا دائرۃ المعارف ہے
جہیز جو ماں کے گھر سے لے کے آئی تھیں مری بیگم
وہ سب سامان آثارِ قدیمہ کا اثاثہ ہے
ابھی میں نے جو تم کو چھ ورق پڑھ کر سنائے ہیں
یہ میری مختصر تقریر کا زرّیں خلاصہ ہے

○

(مئی ۸۲ء)

ٹاپ پر جب بھی لیڈری آئی
ہاتھ باندھے منسٹری آئی
اس نے جب پیار کی قسم کھائی
مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی
چار گھنٹے سے گم ہیں میک اپ میں
کہہ رہے ہیں مگر ابھی آئی
گھپ اندھیرا تھا میرے کمرے میں
آپ آئے تو روشنی آئی
دوستی ہو گئی پتنگوں سے
جب مرے گھر میں چھپکلی آئی

اقبال شانہ

(حائل، سعودی عرب)

غزلیں

بس دو ہی تین شعر کی غزلیں سنائیے ... لیٹسٹ شاعری کا طریقہ بنائیے
بے چارے سامعین پہ کچھ رحم کھائیے ... مطلع کے ساتھ ساتھ ہی مقطع سنائیے
صاحب نے نوکری سے نکالا ہے آپ کو ... گھر جا کے "میم صاب" کو مسکہ لگائیے
جوتے کھلا کے پیار سے کہتے ہیں وہ مجھے ... اب زندگی میں جو بھی ہوا بھول جائیے
نعروں سے کچھ بنے گا نہ اردو زبان کو
شانہ لنگوٹ باندھیے میداں میں آئیے

(جولائی ۹۰ء)

○

زندگی معشوق کی چوکھٹ پہ مرجانے کا نام ... موت ہے ڈیڈی کا ان کے بام پر آنے کا نام
جارج واشنگٹن بھی تھا فلسفی یونان کا ... ہے سکندر دوستو لیلیٰ کے دیوانے کا نام
کس طرح سمجھاؤں یارو کیا ہے بیگم کا جلال ... فارسی سے یک بہ یک اردو میں آجانے کا نام
ہم سمجھتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کا ہے راز ... صبح کے بارہ بجے تک مست سو جانے کا نام
پھینک دو کشتی کنارے پر پڑے سوتے رہو ... بے وقوفی ہے میاں طوفاں سے ٹکرانے کا نام
شیخ صاحب اللہ اللہ آج کیسے میرے گھر ... کس نے لکھا میرے دروازے پہ میخانے کا نام
ہم نہیں ڈرتے کسی سے اپنی بیگم کے سوا ... ہے سماعت سے ہماری دور گھبرانے کا نام
اور کیا دوں اب سیانے پن کا میں اپنے ثبوت
کہہ رہا ہے ہر کوئی شانہ ہے دیوانے کا نام

(اکتوبر ۹۲ء)

○

پھاڑ کر دامن سر بازار پاگل ہو گئے ... ہو گیا ان کا ہمیں دیدار پاگل ہو گئے
پائلوں کی جب سنی جھنکار پاگل ہو گئے ... آئی لیڈی ڈاکٹر بیمار پاگل ہو گئے
وہ جو آئے میرے گھر اک زلزلہ سا آ گیا ... دیکھ کر ان کو در و دیوار پاگل ہو گئے
عشق میں جو کے ہماری ہو گئیں زلفیں سفید ... ان کی شادی کا ملا جب تار پاگل ہو گئے
عقد شانہ کر دیا ہے ایک دیوانی کے ساتھ
[illegible] پاگل ہو گئے

شمسی مینائی (لکھنؤ)

روٹی نہیں تو کیا؟

سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

عالم بڑے بڑے ہیں تو رہبر گلی گلی
بارش ہے افسروں کی تو دفتر گلی گلی
شاعر ادیب اور قلم در گلی گلی
سقراط دربدر ہیں سکندر گلی گلی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

ہر دھرم اور دین کا جھگڑا یہاں پہ ہے
دنیا کی ہر مشین کا جھگڑا یہاں پہ ہے
ہر فن کے ماہرین کا جھگڑا یہاں پہ ہے
اتر میں فوجِ چین کا جھگڑا یہاں پہ ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

ہر شوق ہر امنگ ترقی پہ ہے یہاں
سنگیت، ناچ رنگ ترقی پہ ہے یہاں
گانجا، شراب، بھنگ ترقی پہ ہے یہاں
آپس میں پھر بھی جنگ ترقی پہ ہے یہاں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

ہر راستے میں فلمی نگینہ جڑا ہوا
ہر موڑ پہ جوان سپاہی کھڑا ہوا
ہر شے پہ انتظام کا پردہ پڑا ہوا
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

بولی میں وہ مٹھاس کہ بجتے ہیں ساز بھی
ہر سر میں ہے غرور تو ہر دل میں ناز بھی
بنتے ہیں اپنے گھر میں ہوائی جہاز بھی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر در پہ ہر مقام پہ آثارِ حسن بھی
حاصل قدم قدم پہ ہے دیدارِ حسن بھی
انکارِ حسن ہے کہیں اقرارِ حسن بھی
اپنے نگر نگر میں ہے بازارِ حسن بھی
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

رنگینیٔ مزاج ہے رنگین شب تو ہے
ہر شہر کی یہ شان کہ انگلش کلب تو ہے
حبِ وطن نہیں ہے مگر اور سب تو ہے
خوفِ خدا نہیں ہے خدا کا غضب تو ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر قسم کی جدید عمارت ہمارے پاس
ہر ایک پردہ دار تجارت ہمارے پاس
اپنوں کو لوٹنے کی بھی ہمت ہمارے پاس
کھیلوں میں ہارنے کی مہارت ہمارے پاس
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

حاکم ہیں ایسے دیس کا قانون توڑ دیں
رشوت ملے تو قتل کے مجرم بھی چھوڑ دیں
ایسے وکیل اپنے موکل کو پھوڑ دیں
سرجن ہیں ایسے پیٹ میں اوزار چھوڑ دیں
نگراں جو ملزموں کی آنکھیں بھی پھوڑ دیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

وعدہ لپیٹ لو جو ....

سرحد پہ اپنی چین کا قبضہ بھی ہو گیا
کشمیر اپنے دیس کا حصہ بھی ہو گیا
ڈھاکہ سے ظالموں کا صفایا بھی ہو گیا
ریشم کا نور دار دھاکہ بھی ہو گیا
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ہر کام چل رہا ہے یہاں پر امان سے
سرکار کے ستون کھڑے ہیں شان سے
قرضہ تو مل رہا ہے ہمیں ہر دکان سے
خیرات آ رہی ہے بڑی آن بان سے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

یہ دور کا نہیں تو سیاہی کا طور ہے
ہر جھوٹ، ہر گناہ کا ہم کو شعور ہے
دنیا کے اور دیسوں کو دھن کا غرور ہے
فنِ گداگری پہ ہمیں بھی عبور ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ذہنوں میں کشمکش ہے بدیسی کے واسطے
سڑکوں پہ کتنا رش ہے بدیسی کے واسطے
بھارت میں سارا کش ہے بدیسی کے واسطے
بوسوں کی پیشکش ہے بدیسی کے واسطے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

بھارت میں آج کون وفادارِ قوم ہے
ٹوٹی جگہ جگہ سے جو دیوارِ قوم ہے
ہر ملک کا سفیر خریدارِ قوم ہے
ہر دل کہیں بکا ہے اداکارِ قوم ہے

سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو ....

نفرت کی دھوم، نانک و چشتی کا دیس ہے
ہر ظلم آس پاس یہ تلسی کا دیس ہے
ہر سمت مار کاٹ، یہ گاندھی کا دیس ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

ٹھاکر ہیں، برہمن ہیں، مغل ہیں، پٹھان ہیں
میدانِ جنگ کے لیے کڑیل جوان ہیں
اہلِ زبان، اہلِ ادب، اہلِ شان ہیں
ہل بیل ہیں، زمین ہے، بڑھیا کسان ہیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

دنیا کے اعتبار سے بلماج تو نہیں
مانا کہ ہم زمانے میں سرتاج تو نہیں
قبضے میں اپنے دھن تو نہیں تاج تو نہیں
دکھ درد میں کسی کے بھی محتاج تو نہیں
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

چیونٹی کا ذکر کرتے ہو ہاتھی کے سامنے
وردھا کا نام لیتے ہو دلی کے سامنے
مٹی کی بات کرتے ہو چاندی کے سامنے
روٹی بھی کوئی شے ہے ترقی کے سامنے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

جنتا سے کہہ دو شور مچانا فضول ہے
تکلیف کا بیان سنانا فضول ہے
شاہانِ قوم کو تو ستانا فضول ہے
سوتے ہیں میٹھی نیند جگانا فضول ہے
سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لو جو لنگوٹی نہیں تو کیا

(جون ۸۱ء)

صابر بہاری پانچی

اینگلو انڈین غزل

کوئی اسمارٹ کہتا ہے کوئی کہتا ہے آئیڈیل ہے
زبانِ یار سے خود کو سمجھنا سخت مشکل ہے

نہ جانے کس طرح ملکِ عدم کا طے سفر ہوگا
نہ موٹر ہے نہ ٹمٹم ہے نہ رکشہ ہے نہ سائکل ہے

دعائیں لاکھ ہیں ڈسپنسری میں آپ کی مانا
مریضِ عشق کی خاطر کوئی اسٹیچر ہے یا پل ہے

ترس حالِ پریشاں پر ذرا بھی کیوں نہیں کھاتے
کہ دل ہے آپ کے سینے میں یا جانِ جہاں سل ہے

مہذب کس طرح بنتے ہیں دنیا میں ریا والے
کہیں "پیسے" سے زیادہ آج ان کا مستقل بل ہے

سجائے ہیں وہ اس انداز سے زلفِ پریشاں کو
گماں ہوتا ہے جیسے سر پہ ان کے مرغے یا بل ہے

چلے آتے ہیں نمبر وار بچے اک تسلسل سے
خدایا کیوں نہیں دیتا وہاں بچے جہاں نل ہے

گلی ہے آپ کی وہ یا کوئی قصاب خانہ ہے
قدم کوئی کہاں رکھے جدھر دیکھو ادھر دل ہے

چلے جاؤ گے تم بھی اس جہاں سے ایک دن صابر
سکندر ہے نہ پورس ہے نہ ہٹلر ہے نہ چرچل ہے

جولائی ۷۷ء

کنواری کی دُعاء

یارب مرے دل کو وہ دوشیزہ تمنا دے
جو عشق کو تڑپا دے جو خود مجھے شرما دے

دنیائے محبت میں جھنڈا مرا لہرا دے
چہرے پہ وہ رونق دے آنکھوں میں وہ نشہ دے

وہ جوششِ جوانی دے وہ چال وہ مکھڑا دے
لڑکوں میں رقابت کی جو آگ کو بھڑکا دے

ہاں غازہ و پوڈر کا وہ شوق وہ چسکا دے
جو میری طبیعت میں اک برق کو لہرا دے

تاخیر زباں میں وہ مجھ کو مرے مولا دے
بھائی کو جو دھوکا دے ماں باپ کو چکما دے

جس سمت نکل جاؤں گلزار وہ رستہ ہو
ہاں میرے سراپا کو گلشن کا سراپا دے

سکھلا دے مرے داتا کچھ ایسی ہنرمندی
پیسے سے جو الفت لے، الفت سے جو پیسہ دے

القصہ تو جاسی کی اک یہ بھی دعا سن لے
شوہر مجھے دے مالک جس عقل کا اندھا ہو

دسمبر ۸۱ء

غزلیں

○

اس دورِ سیاست میں وہ لیڈر نہیں ہوتا
جو شخص کہ اک بار بھی "اندر" نہیں ہوتا

دفتر میں جو حاضر رہے پابندی سے ہر دن
چپراسی ہی ہوتا ہے وہ افسر نہیں ہوتا

جو شخص بناتا ہے سکوٹر کے پنکچر
اس شخص کا اپنا کبھی پنکچر نہیں ہوتا

اس بس کے کنڈکٹر کی تو ہو جاتی ہے چاندی
جس بس میں کوئی ایک بھی چیکر نہیں ہوتا

شاپنگ کے لیے جائے بھی بیگم تری کیسے
گاڑی نہیں ہوتی کبھی شوفر نہیں ہوتا

مقروض مرا آگئے ہیں اس کے ہوں پیچھے
گھر پر نہیں ہوتا کبھی دفتر نہیں ہوتا

کچھ یاد تو ہے ہم کو سبق عشق کا اب بھی
طوطے کی طرح اب تو وہ فر فر نہیں ہوتا

اس کار کا ٹکر سے کیا ڈر ہی تو ہوگا
جس کار کے آگے کوئی بمپر نہیں ہوتا

لنڈے سے خریدا ہے ضیا تو نے جو یہ کوٹ
بے کار ہے، اس کوٹ میں استر نہیں ہوتا

(جنوری ۸۶ء)

○

لیا تھا سوٹ لنڈے سے کہ ترڑ پاؤں گا اپنوں کو
مری قسمت ہی پھوٹی ہے کہ سردی ہی نہیں آتی

مرے احساس کی دنیا پہ اتنی برف باری ہے
وہ غصہ بھی دلاتے ہیں تو گرمی ہی نہیں آتی

مرے مدقوق چہرے پر پیلاہٹ ہی پیلاہٹ ہے
میں غازہ بھی لگاتا ہوں تو سرخی ہی نہیں آتی

مرغن سب غذاؤں سے مجھے رغبت تو رہتی ہے
مگر اس جسمِ لاغر پہ تو چربی ہی نہیں آتی

بڑی ہی انکساری سے میں ان سے بات کرتا ہوں
مگر اس بت کے لہجے میں نرمی ہی نہیں آتی

مرا محبوب آیا ہے مجھے ملنے تو بصرہ سے
مگر یہ مجھ میں خامی ہے کہ عربی ہی نہیں آتی

اندھیرے ہی میں لکھتا ہوں ہزل ہو۔ یا غزل کوئی
بٹن جب بھی دباتا ہوں تو بجلی ہی نہیں آتی

بڑے تعویذ کروائے ہیں میں نے اپنے پیروں سے
بڑھاپے پر مرے پھر بھی جوانی ہی نہیں آتی

سنا ہے ہچکیاں لگتی ہیں بھر کر پیٹ کھانے سے
میں اک مانا ہوا پیٹو ہوں پر ہچکی ہی نہیں آتی

بڑی کوشش کری میں نے بگاڑوں اپنے یاروں کو
مگر ان دھیٹ لوگوں میں خرابی ہی نہیں آتی

(اپریل ۸۵ء)

ضمیر جعفری (اسلام آباد، پاکستان)

ضمیریات

اساس

حصول علم کا ہے گر، مدام لکھ مدام پڑھ — چھٹانک علم کے لیے حروف سو گرام پڑھ
مگر کوئی نظام فکر و تربیت ہے لازمی — نہ یہ کہ تو سیام جاکے حافظ و خیام پڑھ

عارضی مستقل

خیام ہی میں قیام کا پہلے عارضی انتظام کرنا — پھر اپنے خیموں میں میرے شہروں کا انضمام کرنا
تمہارا طرز جہاں رسائی "سپر" معاً ہو سمجھ گئے ہم — مصافحے میں سلام کرنا، معانقے میں غلام کرنا

پیمانۂ امروز

جب کہ انگریزی میں ہو سب عاشقی کے کاروبار — درمیاں پھر اپنی اُردو رائیگاں کیوں کر کریں
وہ یہ بولی "عشق ویری گڈ" مگر اسے ڈارلنگ — زندگی کا یہ سفر کتنے "کیلو میٹر" کریں

(جولائی ۸۸ء)

○

کھیت کھودے ہیں خندقوں کے لیے — شہر خالی ہے راکٹوں کے لیے
ان کو دکھ ہو کوئی خدا نہ کرے — ہم جو زندہ ہیں جرمنوں کے لیے
لوگ ننگے رہیں تو رہنے دو — سوٹ سلوائے تو گزوں کے لیے
کر کے اونچی دلوں کی دیواریں — پل بناتے ہیں رابطوں کے لیے
"لبرل اسپورٹ" کا زمانہ ہے — قد بھی منگواؤ قامتوں کے لیے
آدمی کے سمیت اب بھی ہیں — باربرداریاں گدھوں کے لیے
اپنی جمہوریت میں آتے ہیں — کچھ گھرانے منسٹروں کے لیے
خود مکینوں سے معتبر ہیں کہیں — میز اور کرسیاں گھروں کے لیے
زرگروں کے محل سے کیا ڈرنا — چند شیشے ہیں پتھروں کے لیے

(سلسلہ پیشاپیش)

نقشہ گھر کا جدید بن تو گیا / اب جگہ ڈھونڈیے گھڑوں کے لیے
یہ جہاں ہے بڑا کشور ضمیر / جی جلوں اور دل ڈروں کے لیے

(مئی ۸۹ء)

○

کیک سے "برگر" اچھے ہیں / گھوڑوں سے خچر اچھے ہیں
انڈے بھی ہوں گندے اچھے ہی / جس مرغی کے پَر اچھے ہیں
اس گھر کی دلہن خوش قسمت / جس گھر کے "دیور" اچھے ہیں
وہ جب پیاری ہے تو اس کے / سارے "اگر مگر" اچھے ہیں
اپنے ملک کی کیا پوچھے ہو / شہر خراب ہیں گھر اچھے ہیں
قومیں بھٹک گئی ہیں سب کی / سب کے پیغمبر اچھے ہیں
انگریزوں کا دل جیسا ہو / "ریزر" اور "لیزر" اچھے ہیں

لندن، پیرس سے ہیں اپنے
سکھر اور بھکر اچھے ہیں

اگست ۹۳ء

○

سب لوگوں سے یاری کیا / اتنی دنیا داری کیا
مسجد کے منبر پر بھی / شیخ کے گلے درباری کیا
آنکھوں میں تو شرم نہیں / سر پر آنچل بھاری کیا
حقے اور پگڑی کے بغیر / خالی نمبرداری کیا
سب ہیں طبعاً حسن پرست / نوری کیا اور ناری کیا
"جمہوریت" کی دم کے ساتھ / اپنی گدھا سواری کیا
جس میں کوئی کتاب نہیں / صندل کی الماری کیا
کٹ گئیں مہمل باتوں میں / راتیں پیاری پیاری کیا

جولائی ۹۱ء

○

ماسیاں، بے سرخیاں، بے چاریاں / عورتیں مہنگائیوں کی ماریاں
حسن کچھ میراث محلوں کی نہیں / جھونپڑوں میں بھی شکلیں پیاریاں
ملک ہو یا قدر، چل سکتی نہیں / مفلسی کے بیچ نمبرداریاں
بھوک سے لاچار تھے جو اب انہیں / لگ گئیں خوراک کی بیماریاں
کالجوں میں عام بچوں کو نہ ڈھونڈ / لوگ ہلکے اور فیس بھاریاں
ناروے کی برف میں یاد آ گئیں / جھنگ اور جہلم کی کیسر کیاریاں
ڈھونڈتا [illegible] / [illegible] پھلواریاں

(مئی ۹۴ء)

طالب خوندمیری
(حیدرآباد)

آرکیٹیکٹ غالب

ایک دن اک اجنبی غالبؔ سے بیٹھک میں ملا
آپ نے بھی مسکرا کر یہ سوال اس سے کیا
نام کیا ہے آپ کا کہیے کہاں سے آئے ہیں؟
کیا کوئی پیغام جاناں کی گلی سے لائے ہیں؟
اجنبی: نام تو عبدالغنی ہے قدرداں ہوں آپ کا
ویسے میں اکلوتا مالک ہوں کرانہ شاپ کا
میں یہاں آیا نہیں نامہ بری کے واسطے!
یا کسی معشوق کی سوداگری کے واسطے:
غالبؔ: اوہ! غصّہ تھوکیے مطلب مرا کچھ اور تھا
میں زمینِ شعر کے بارے میں محوِ غور تھا
خیر یہ فرمائیے کیوں آپ کا آنا ہوا؟
کس لیے اس بے نوا کو یاد فرمانا ہوا؟
اجنبی: میں نے سُن رکھا ہے غالب آدمی ہیں کام کے
گھر کے نقشے بھی بنا سکتے ہیں سستے دام کے
غالبؔ: ہاں میاں! ہم بھی کسی دن واقعی تھے کام کے
مقبرے بھی ہم بنا دیتے تھے خاص و عام کے
عشق نے لیکن ہمیں یکسر نکما کر دیا!
مبتلائے دردِ دل، مصروفِ دعا کر دیا
ہاتھ میں رعشہ ہے کوئی کام کر سکتا نہیں
ضعف اتنا ہے کہ اپنا جام بھر سکتا نہیں
اجنبی: خواہ کچھ ہو یہ مکاں تو آپ سے بنواؤں گا
آپ سے نقشہ ہی لے کر اب یہاں سے جاؤں گا
غالبؔ: آپ کی ضد ہی چلو، ہو کر رہے گی کامیاب
بن تو جائے گا کوئی نقشہ، مگر پہلے جناب

(ق)
فیس میں کچھ بوتلیں وہسکی کی منگوا دیجیے
ساتھ کوئی ساقیِ نوخیز بُلوا دیجیے
غالبؔ: آم کا موسم ہے، مغویے بہت مرغوب ہیں
ٹوکرے ان کے فقط دس بیس ہی مطلوب ہیں
اب ذرا فرمائیے نقشہ میں کیا کیا چاہیے؟
کون سی تعمیر ہو، کیسا نمونہ چاہیے؟
اجنبی: دیکھیے قبلہ! مجھے کچھ ایسا نقشہ چاہیے!
جس کو سب اہلِ جہاں حیرت سے دیکھا چاہیے!

(ق)
ہاں! مگر اتنا رہے ملحوظ قبلہ ہوش مند
بے در و دیوار کا گھر میں نہیں کرتا پسند
یہ زمیں پر ہو، ہوا کے دوش پہ ہرگز نہیں
ورنہ پھر یہ خواب ہو سکتا ہے گھر ہرگز نہیں
میرے گھر کو اینٹ گارا اور چونا چاہیے
التفات اس کے لیے قبلہ کا دونا چاہیے
خوب گنجائش رہے دیوان خانے کے لیے
اک کشادہ ہال ہو میرے زنانے کے لیے
کم سے کم حمام دو رکھیے نہانے کے لیے
کچھ کھلا حصّہ رہے زلفیں سکھانے کے لیے
چار ہوں بیڈروم، کیوں کر چار کے قبضے میں ہوں
میں اکیلا لشکرِ جرّار کے قبضے میں ہوں
ہو اگر اسٹور میں بھی ایک کھڑکی خوب ہے
کیوں کہ بازو کے مکاں والوں کی لڑکی خوب ہے

پچھلے حصّہ میں کہیں اک "چور دروازہ" رہے
بس مری محبوب تو کو اس کا اندازہ رہے
میں نے اک موٹر بھی قسطوں سے خریدی ہے جناب
دیکھیے دیجیے مجھے گیراج ایسا لاجواب
کار کے ہمراہ جس میں اس کا شوفر بھی رہے
آٹھ بچّے، ایک بیوی اور دختر بھی رہے
غالب: ٹھیک ہے! اب آپ تھوڑی دیر ٹھہریے گا یہاں
میں ابھی موزوں کیے دیتا ہوں کا فذ پر مکاں

○

اور پھر غالب زمینِ فکر چمکانے لگے
ایک گھنٹہ بعد ہی پھر اس سے فرمانے لگے

○

غالب: لیجیے صاحب! مکاں یہ آپ کا تیار ہے
ہر سہولت اس میں ہے جو آپ کو درکار ہے
پرسپکٹیو ہے یہ میری شوخیِ تحریر کا
آر-سی-سی پیرہن ہے پیکرِ تصویر کا
اس طرف بھی دیکھیے یہ آپ کا بیڈروم ہے
خوبیاں کیا کیا ہیں اس میں آپ کو معلوم ہے
میں نے رکھی ہے جگہ اس میں ڈبل بیڈ کے لیے
خوب گنجائش ہے اوپر آپ کے ہیڈ کے لیے
یہ علاقہ ہے تمھاری بیویوں کے واسطے!
اک نیا زنداں ہے گویا قیدیوں کے واسطے!
سیڑھیاں بالائی منزل کی ہیں مثلِ کہکشاں
مثلِ دل محراب ہیں پلکوں کے جیسی کھڑکیاں
ایک پائیں باغ ہے جشنِ بہاراں کے لیے
ایک سوئمنگ پول، حسنِ نیم عریاں کے لیے
اب ذرا سا غور باتوں پر مری فرمائیے
میں جو کہتا ہوں ڈیکوریشن وہی کروائیے
سبزہ شاداب کی شطرنجیاں بچھوائیے
چوبِ صندل کی بنی سب کھڑکیاں لگوائیے
گیسوئے پرپیچ و خم کی چلمنیں ڈلوائیے
سرخیِ لب کی یہاں ڈسٹمپرنگ کروائیے
شب کو دیواروں پہ داغِ دل لگایا کیجیے
پھول بھی زخموں کے میزوں پر سجایا کیجیے
ایرکنڈیشنڈ ہوں کمرے تو ایسا کیجیے
پھیپھڑے عشّاق کے سیلنگ سے لٹکا دیجیے
ایک دن میں دو دفعہ کیجیے برش حمّام کو
کیجیے گا سیلِ گریہ سے فلش حمّام کو
مین ٹیننس میں کبھی غفلت یہاں کوئی نہ ہو
ورنہ پھر ایسی جگہ رہیے جہاں کوئی نہ ہو

قطعات

فیصلہ خود آپ ہی کر لیجیے!
کون کلچر کس قدر پامال ہے
شیکسپیر کا مکاں ہے میوزیم
حضرتِ غالب کے گھر میں ٹال ہے

○

بیڑیاں ٹوٹیں زمانہ ہو گیا
رُخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی ملی تھی رات میں
سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

○

جذبات دوستی کے نہیں ہیں تو کیا ہوا
آپس میں بات چیت کی راہیں کھلی رہیں
یہ سب سے اوّلین سیاسی اصول ہے
دل کے کواڑ بند ہوں بانہیں کھلی رہیں (مئی ۸۸ء)

کھٹملوں کی فریاد

ایک دن ایک جونک سے کچھ کھٹملوں نے یہ کہا
دیجیے خالہ ہمیں بھی کوئی ایسا مشورہ

اب بجائے خون کوئی اور ہی شے پی سکیں
آدمی سے دور رہ کر ہم خوشی سے جی سکیں

کیوں کہ اس میں خون اب کم کم ہی پایا جائے ہے
اب نہ چوسا جائے ہے اس کو نہ چاٹا جائے ہے

اس کی شریانوں میں یوں تو خون ملتا ہی نہیں
مل بھی جاتا ہے تو اس میں ذائقہ کچھ بھی نہیں

اس میں سرخی سے زیادہ ہے سفیدی آج کل
خوں کی صورت ہو گئی ہے دودھ کی سی آج کل

کون جانے کیا بلا کھانے لگا ہے آدمی
کس ملاوٹ کی غذا کھانے لگا ہے آدمی

اک زمانہ تھا کہ ہم نے خوں کے دریا بھی پیے
آج گھنٹوں چوستے ہیں ایک قطرے کے لیے

کیا کریں خالہ! ہماری پیاس بجھتی ہی نہیں
اس سے پہلے یہ گرانی خون کی تھی ہی نہیں

اب حسینوں کی رگوں میں بھی 'لہو' باقی نہیں
ان کی محفل میں بھی کوئی خوں بھرا ساقی نہیں

پہلے ان کا خوں ہوا کرتا تھا مانند شراب
یوں مہکتا تھا رگوں میں جیسے گلشن میں گلاب

چوستے ہی ان کو' اپنا بھی نکھرتا تھا شباب
اک نئی کروٹ بدلتا تھا بدن میں اضطراب

بوئے خوں سے مست ہو کر جھومنے لگتے تھے ہم
اپنی اپنی "کھٹملی" کو چومنے لگتے تھے ہم

ہو گئے ہیں آج کل وہ نوجواں بھی بد مزہ
جن کی شریانوں میں بہتی تھی کبھی جوئے طلا

جن کا خوں پیتے ہی اکثر موج میں آتے تھے ہم
منہ لگاتے ہی جنھیں سرشار ہو جاتے تھے ہم

اب انھیں کو چوس کر بیمار پڑ جاتے ہیں ہم
سوکھ جاتے ہیں سکڑ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں ہم

اب کہاں تک ہم کریں اپنے غموں کا تذکرہ
کچھ دنوں پہلے ہمارے ساتھ ایسا بھی ہوا

پھوٹ نکلی تھی ہمارے جسم سے گانجے کی بو
پی لیا تھا بھول کر ہم نے جو ہپی کا لہو

کیا کہیں کیا کیا بلا، کیا قہر ان کے خوں میں ہے
"ٹک ٹوئنٹی" سے زیادہ زہر ان کے خوں میں ہے

جس میں ہوتا تھا کبھی خالص غذاؤں کا مزہ
آج ملتا ہے اسی خوں میں دواؤں کا مزہ

اپنی ساری چاشنی کھونے لگا ہے آدمی
ہائے کتنا بے مزہ ہونے لگا ہے آدمی

آپ ہی کہیے کہ ہم خالص لہو پائیں گے کیا
آدمی کے ساتھ رہ کر ہم نہ مر جائیں گے کیا

سن چکی جب کھٹملوں کی داستانِ تشنگی
اک ادائے خوں چکاں سے جونک یہ کہنے لگی

آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہو
اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہو

اب تو میرا بھی گزارا ہے انھیں کے خون پر
مے کشی ہے شغل ان کا، "خوں کشی" میرا ہنر

سیر ہو کر روز پیتی ہوں کسی نیتا کا خوں
کیا مزے ہیں آج کل کام و دہن کے کیا کہوں

ان کی ہر شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا
ایک اک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا

ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پا جائے گا
اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزہ آ جائے گا

(اپریل ۷۴ء)

غزلیں

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

ملازم پر جو مصیبت آپڑی ہے
یہ سب اعمال کی اپنے تڑی ہے

نہ چوڑی ہے نہ مسّی کی دھڑی ہے
لپ اسٹک ہے کلائی پر گھڑی ہے

بنا ہے سادھنا کٹ جبکہ فیشن
یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

یہی تلوار بن جاتی ہے اکثر
یہ چوٹی میں جو پھولوں کی چھڑی ہے

کسی سے کرکے وعدہ بھول جانا
یہ چھوٹی بات بھی کتنی بڑی ہے

کلاک اتنی بڑی زاہد کے گھر میں
کسی مسجد کی شاید یہ گھڑی ہے

خلائی دور ہے یہ شیخ صاحب
یہ غصہ آپ کا باسی کڑی ہے

ہوئے برباد سٹّہ میں نہیں غم
ابھی سسرال میں اک دھن گڑی ہے

تمہاری شاعری بھی کیا غضب ہے
ظریف ہر شعر گویا پھلجھڑی ہے

(اپریل ۷۵ء)

○

ہے جرم ملاوٹ تو سزا کیوں نہیں دیتے
اب آپ ہمیں اصلی غذا کیوں نہیں دیتے

مر مر کے جیا کرتا ہے بیمارِ محبت
بے چارے کو مغرب میں بلا کیوں نہیں دیتے

لڑکوں کو تو دیتے ہو جوانی کی دعائیں
بوڑھوں کو جوانی کی دعا کیوں نہیں دیتے

جو آس لگا بیٹھا ہے جوڑے کی رقم کی
اس لڑکے کو لیڈی ہی بنا کیوں نہیں دیتے

چپل جو چرایا کوئی مجبور ہی ہوگا
اک جوڑ نئی اس کو دلا کیوں نہیں دیتے

کرتا ہے غذا اور دوا میں جو ملاوٹ
پھانسی کی اسے آپ سزا کیوں نہیں دیتے

بے کار ہے بیمار جو اب اٹھ نہیں سکتا
بیچارے کو پیچھے سے ہلا کیوں نہیں دیتے

سجدے میں اگر اونگھنے لگ جائے مصلی
بے ساختہ اک ڈھول بجا کیوں نہیں دیتے

دوزخ سے جنہیں آپ ڈرا لیتے ہو واعظ
جنت بھی ہتھیلی میں بتا کیوں نہیں دیتے

کب تک ہے ابھی اور ٹہلنے کا ارادہ
اب چائے کے وقفے کی صدا کیوں نہیں دیتے

محفل میں ظریف آپ کو جو داد ملی ہے
سب لوگوں کو وہ راز بتا کیوں نہیں دیتے

(فروری ۷۴ء)

قطعات

اسمٰعیل ظریف

بہت خوشحال نظر آتے ہو
رغ البال نظر آتے ہو
ب غزل آپ سُناتے ہو ظریف
رسے قوال نظر آتے ہو

انگور تھوڑے چپکے سے آپا کو دے دیا
کل ہی اُتر کے آئے تھے جو اپنے باغ سے
مُنّے نے اپنی آئی کو سب کچھ بتا دیا
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(دسمبر ۶۸، جنوری ۶۹ء)

یسے نہ اِدھر ہے نہ اُدھر یک جہتی
، ڈھونڈ رہا ہوں، ہے کدھر یک جہتی
، ایک جگہ دیکھئے منظر میں نے
غانے میں آتی ہے نظر یک جہتی

وقت کافی گزر چکا ہے ظریف
اب ملازم بھی چل دیا ہوگا
جلد محفل سے لوٹئے ورنہ
گھر میں اجلاسِ بلدیہ ہوگا

(فروری ۱۹۷۶ء)

غزل

بیوی جب تک گھر نہیں آتی
کوئی اُمید بر نہیں آتی
چالو اولاد کے سُدھرنے کی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
سب کی خبریں ریڈیو سے آتی ہیں
"کچھ ہماری خبر نہیں آتی"
یہ تو پھر مائک کی خرابی ہے
"میری آواز گر نہیں آتی"
میکدہ سے قریب رہتا ہوں
پر طبیعت اُدھر نہیں آتی
کچھ گناہ اور بھی تو کر لیجئے
"عمر بارِ دگر نہیں آتی"
پہلے لڑنے پڑوسن آتی تھی
"اب کسی بات پر نہیں آتی"
سوچتا ہوں کہ بعض ہوٹلوں کو
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہم تو بکواس کے نہیں قائل
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
شعر لکھوا کے پڑھ رہے ہو ظریف
"شرم تم کو مگر نہیں آتی"

(پیروڈی نمبر)

ظفر چکدینوی

غزلیں

ہر بات میں من مانی، لاحول ولا قوۃ — گھر والی ہے دیوانی لاحول ولا قوۃ
سسرال میں بھی عمدہ کھانوں کو ترستا ہوں — نہ مرغ نہ بریانی، لاحول ولا قوۃ
اک کان کی عورت کو کیوں کہتے نہیں کانی — یک چشم ہے جب کانی لاحول ولا قوۃ
جو دودھ پلاتی ہیں مائیں کبھی بچوں کو — وہ دودھ بھی ہے پانی لاحول ولا قوۃ
اک روزہ کبھی اس نے بھولے سے نہیں رکھا — اور نام ہے رمضانی لاحول ولا قوۃ
سمجھا تھا کہ میچی ہے آنکھ اس نے محبت سے — کیا علم تھا، ہے کانی لاحول ولا قوۃ
ٹھٹ ہاتھ پہ رہتی ہے پیشے سے بھکارن ہے — ہے نام مگر رانی، لاحول ولا قوۃ
ہم فلم میں آئے تھے بننے کے لیے ہیرو — اور مل گئی دربانی، لاحول ولا قوۃ
ہر شب مرے خوابوں میں آ آ کے ستاتی ہے — شیطان کی اک نانی لاحول ولا قوۃ
پھر والف کو ڈالا ہے مذہ ائف کی چکر میں — پھر ہو گئی نادانی لاحول ولا قوۃ
فیشن کا ستم دیکھو ہر چیز نمایاں ہے — کپڑوں میں بھی عریانی لاحول ولا قوۃ
بیوی مری مونچھوں سے یوں ڈر کے ظفر بھاگی — صورت بھی نہ پہچانی لاحول ولا قوۃ

(ستمبر ۷۸ء)

○

اب ٹیڑھی انگلیوں سے نکلتا نہیں ہے گھی — ہاں گھی نکالنا ہو تو مکھن لگائیے
حاجت روائی کے لیے ہر در پہ ہم گئے — ہر ایک گھر سے آئی صدا "آگے جائیے"
ہے الوّوں کا سارے گلستاں پہ اقتدار — بلبل اگر ہیں آپ کہیں اور جائیے
پھر آ گئی ہے باڑھ مقدّر سے آپ کے — کچھ بانٹیے ریلیف تو کچھ آپ کھائیے
پھولوں کے ہار کو تو لگاتے ہیں سب گلے — کانٹوں کو بھی کبھی تو گلے سے لگائیے

(مارچ ۷۷ء)

○

آنکھیں نہ کرو تم ہی جب، چار کہاں جائے — پینے کو شراب آخر مے خوار کہاں جائے
دنیا سے تو اکتا کر سب جاتے ہیں جنت میں — ہو جائے جو جنت سے بیزار کہاں جائے
جو عقل سے کورے ہیں بنتے ہیں ظفر عاقل
دیوانوں کے جمگھٹ سے ہشیار کہاں جائے

(جولائی ۷۷ء)

ظفر کمالی (پٹنہ سٹی)

غزلیں

اپریل ۹۲ء

گفتگو کرتا ہوں شب بھر دل کے ٹیلی فون سے
عشق جب سے ہو گیا اک سر پھری خاتون سے

جو غلاظت دل میں ہے وہ دور ہو گی کس طرح
گندگی تو جسم کی دھوتے ہو تم صابون سے

کیجئے یادِ خدا مرنے کے دن آئے قریب
آ نہیں سکتی جوانی لوٹ کر معجون سے

ایک پاگل کہہ رہا تھا جس کی لاٹھی اس کی بھینس
کون ڈرتا ہے یہاں پر کاغذی قانون سے

مولوی کا جریدہ بھی لکھنا ہو اگر مضمون مجھے!
بات کا آغاز کرتا ہوں میں افلاطون سے

دورِ نو کی کچھ عجب تشنہ لبی ہے اے ظفر
پیاس جب بجھتی ہے اس کی تو ہمارے خون سے

(اگست ۸۷ء)

•

وہی لیڈر کی عیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی جنتا کی دشواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

انھیں فرصت نہیں ملتی کبھی مرغِ مسلّم سے
مری قسمت میں ترکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ترقی کر گیا ہے کنٹری لیکن غریبوں کی
وہی آہ و بکا زاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

نہیں کچھ نعدادتی کا نہ میں کچھ بول سکتا ہوں
فقط بیگم کی سرداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

کہا اک مسخرے نے مجھ سے کل، چینی نہیں ملتی
وہی شوگر کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

جو ہیں قاتل وہ آزادی سے سڑکوں پر ٹہلتے ہیں
شریفوں کی گرفتاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی دھینگا وہی مشتی ہے میدانِ سیاست میں
وہی مارا وہی ماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

کریں کیسے اطاعت باپ ماں کی آج کل لڑکے
وہی تعلیم سرکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

بہت الفت ہے بیگم کو ظفر تنخواہ سے میری
مری صورت سے بیزاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

(دسمبر ۸۱ء)

•

خواہ غلّہ ہو کہ سبزی نہیں ارزاں کوئی
آج سے آئے نہ اب گھر مرے مہماں کوئی

بیچنے کے لئے پھرتا ہوں میں شہروں شہروں
چار آنے میں ہی لے لے مرا دیوان کوئی

ہو گی وہ اور ہی دنیا جہاں بستے ہوں گے
اس زمیں پر نہیں ملتا مجھے انساں کوئی

مسجدیں ہو گئیں سنسان تو اس کا کیا غم
سینما ہال تو رہتا نہیں ویراں کوئی

ہے مفادین کے قزاقوں کا ہر گام پہ سے ہے
کیسے محفوظ رکھے دولتِ ایماں کوئی

لوگ کرنے کو نصیحت تو چلے آتے ہیں
دیکھتا اپنا بھی اے کاش! گریباں کوئی

بینک بیلنس بڑھانے کے لئے آج یہاں
کوئی گیتا لئے پھرتا ہے تو قرآں کوئی

عین ممکن ہے کہ دل کو وہاں راحت مل جائے
چل کے آباد کریں شہرِ خموشاں کوئی

لکھیئے تو کس کے لئے پڑھیئے تو کس جا پڑھیئے
اب تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا سخنداں کوئی

شاعری کر کے نہیں ملنے کی روٹی تم کو
شہر میں کھولو ظفر پان کی دوکاں کوئی

ظہیر ابن قدسی

غزلیں

شاعر جو غزل گائے تو لگتا ہے کہ تم ہو — آداب بجا لائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب کالی گھٹا چھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو — اور چاند جو گہنائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
مجنوں کی طرح پھاڑ کے جامہ گریباں — اس شہر میں چکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
دو تین بجے رات کے سناٹے میں اکثر — اُلّو کوئی چلّائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
وعدہ وفا کرنے کے لیے جب کوئی لیڈر — ہنس ہنس کے قسم کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
ناصح جو کبھی آئے نصیحت کی غرض سے — اور ہاتھوں کو لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
کالج کا کوئی لڑکا جو زلفوں کو سجا کر — سڑکوں پہ ہے اٹھلائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
مل کر بھی سرِ راہ اگر کوئی شناسا — کترا کے گزر جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
گاتے ہوئے غالب کی غزل جب ظہیر حضرت — آوازِ رقیب آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

(اگست ۷۵ء)

○

شہروں میں چلے کوچہ و بازار وغیرہ — لیکن نہ ہوا کوئی گرفتار وغیرہ
راشن میں ملا کرتا ہے بس اتنا ہی غلّہ — رمضان میں جیسے ملے افطار وغیرہ
جیتے جی جہنم میں چلے عابد و زاہد — مر کر گئے جنّت میں گنہ گار وغیرہ
محبوب ہے اب چاند سے شرمندہ و نادم — ڈھونڈے سے لگے سب سے کہ وہاں غار وغیرہ
اشکوں ہی کے سیلاب ہیں اب سوکھی زمیں پر — بارش کے نہیں دور تک آثار وغیرہ

○

ہمدردی

ہوٹل میں کسی میز پہ تنہا — شاعر تھا کوئی اداس بیٹھا
آیا تھا یہاں کہ شعر اس کے — سن لیتا کوئی نہ کوئی بیچارہ
کسی کے شاعر کی آہ و زاری — اک شخص پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو شعر پڑھیے — شاعر ہوں میں بھی چھوٹا موٹا
کیا غم ہے مبتدی اگر ہوں — استاد سے بڑھ کے داد دوں گا
لیکن خدارا اس کے بدلے — میرے بھی دو چار شعر سننا
شاعر ہیں جہاں میں اچھے — سنتے ہیں جو شعر دوسروں کے

(دسمبر ۶۸ء)

علی صاحب میاں

چوکے

لڑیاں ٹوٹتے تلک تو ایٹیاں کراتے رہے
گنڈوں کی بات آئی تو پھرکیاں پھراتے رہے
عمر تمام یہونچ کٹی علی صاب کی!
اماں کا کھائے ماموں کی بکریاں چراتے رہے

مجنوں عشق کی لاج تلک نیں بچا سکا
لیلیٰ کو اپنے دل میں اُنے نیں رچا سکا
کتے کے سر کا بھوکتا جنگلے جنگل پھریا
عشق کی کھیر پی گیا پن نیں بچا سکا

عشق وہ بھی شرط کے ساتھ تھُو ہے
نہر کھو دیا کتے دن رات تھُو ہے
اسے فرہاد عشق میں راتی بدو تندی
مریا سر پھوڑ کو کم ذات تھُو ہے

آنگ میں سوٹ، منہ میں جھوٹ ہے دیکھے
بھائی بھائی میں پھوٹ ہے دیکھے!!
جس کو دیکھو ہے مطلبی بندہ
دنیا کتی پلوٹ ہے دیکھے

گمی ترئی، املی کے بوٹاں لگ گئے انجیر کو
ایک گلہری بن لیے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب بول رہیں نوّے قسم کی شاعری
ایک مصرعہ تیر کو تو ایک مصرعہ میر کو

ڈنل بازی، ظلم کو، کاں چلے گئے روکنے والے
کدھر چھپ گئے مصیبت کے وقت خم ٹھونکنے والے
فقط تقریراں جھاڑیں گے کریں گے جھوٹے دوڑ سب
یہ مسئلہ ہے پرانا کاٹتے نئیں بھونکنے والے

سیاست میں گھس کر حماقت کرے نا
ہمیں زندگی اپنی غارت کرے نا
الکشن میں جن جن کو کھانا دیے تھے
انوں خود ہماری حجامت کرے نا

تھپکنا کت ہوں میں لوگوں کی تالو
جسے دیکھو بختا ہوا، ہور چالو
مد صرتی کے سوؤں سے سالے تو ہوتیں
بگڑتی کا کوئی نہ چھپّا نہ تالو

(اپریل ۸۱ء)　　(اپریل ۹۲ء)

عنایت علی خان (حیدرآباد سندھ-پاکستان)

پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

میاں ہے یہ پڑھائی کی منزل کٹھن   بھلا یہ دماغی مرض اور یہ رسن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن   کوئی کام رکھتا ہے تعلیم بن
کرو یوں نہ توہینِ عہدِ شباب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

جو پڑھ لکھ گئے کچھ تو پچھتاؤ گے   مشقت کے کاموں سے شرماؤ گے
رہو گے جو اَن پڑھ کما کھاؤ گے   کمیٹی کے ممبر تو بن جاؤ گے
اُٹھاؤ گے ٹھیکے بنو گے نواب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

میاں مشورہ ہم سے انمول لو   دو بیچ کے لیے تم بھی پر تول لو
کسی مس تی سے دو بول ہی بول لو   چلو کیسٹوں کی دکاں کھول لو
کرو خلق کو خوش کماؤ ثواب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

بنو بیٹس مین اور بالر بنو!   میاں داد و عمران و قادر بنو
الیکشن میں جیتو منسٹر بنو!   اگر ہار جاؤ گورنر بنو!
ترقی کے چوپٹ کھلیں تم پہ باب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

چلو اور اک مشورہ مان لو!   کسی سیٹھ پر مادرِ زر تان لو
مگر اس کی ہرگز نہ تم جان لو   فقط آٹھ دس لاکھ تاوان لو
پولس کو بھی لیکن کرو خوش جناب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

میاں زہر ہے جس کو سمجھے ہو قند   ہیں عالم سے جاہل کے درجے بلند
جو سنتے نہیں پھر بھی تم حرفِ پند   تو کر دیں گے ہم سارے اسکول بند
شرارت کا کرنا تو ہے مستجاب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

ابو جی مرے ابو جی

جی مرے ابو جی !
ی جی سے ڈر ابو جی !

سب پر رعب جماتے ہیں
اُمی سے گھبراتے ہیں
سب کو آنکھ دکھاتے ہیں
اُن سے آنکھ چراتے ہیں
کپڑے بھی سلواتے ہیں
شاپنگ بھی کرواتے ہیں
زیور تک بنواتے ہیں
اپنی شرٹس اور پتلونیں
لنڈے سے لے آتے ہیں

ابو جی مرے ابو جی !
امّی جی سے ڈر ابو جی !

(جنوری ۹۱ء)

٥

مصرعوں کے ارتباط کا اعجاز دیکھیے

اکبر کی فکرِ پیر کو کیا کر دیا جواں

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں

تھی جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

(مئی ۹۳ء)

اپریل ۹۲ء
(خمار صاحب کی ردیف سے معذرت کے ساتھ)

غزل

ان سے نظر ملائے زمانے گزر گئے
گویا ادھار کھائے زمانے گزر گئے

پوچھی جو وجہِ وحشتِ دل ہم نے قیس سے
بولا مجھے نہائے زمانے گزر گئے

ہر چیز آ رہی ہے امارات سے مگر
شوہر کو گھر پہ آئے زمانے گزر گئے

اس سیم تن کی ناف ہے اب تک ٹلی ہوئی
حالاں کہ گدگدائے زمانے گزر گئے

بلبل کو باؤلے کو تو رونے سے کام ہے
کلیوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

سوچو تو یار کب سے اکشن نہیں ہوا
یعنی فریب کھائے زمانے گزر گئے

اس چشمِ پُر فسوں میں بھی اترا ہے موتیا
ہم کو بھی خط بنائے زمانے گزر گئے

تنخواہ مل رہی ہے عنایت کو مفت کی
محنت کی اس کو کھائے زمانے گزر گئے

(فروری ۹۲ء)

غالب ثانی (حیدرآباد)

"دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی"
دیدارِ تھانے دار سے لیکن سنبھل گئی

مثلِ رقیب اصل میں اُبھرا تھا تھانے دار
ایسی سمائی سر میں طبیعت نکل گئی

تھا کوتوال حضرتِ غالب کا جو رقیب
بے وجہ اس کی حضرتِ غالب سے چل گئی

تھا ان کا کوتوال، رقیب اپنا تھانے دار
حسبِ مراتب ایسی ہی صورت نکل گئی

لاکپ میں دونوں ہی کو بہت آگیا مزا
دل اپنا بہلا، اس کی طبیعت بہل گئی

سیکھے تھے فارسی جو وہ اب بیچتے ہیں تیل
زیست اُن کی آج تیل میں تلہن میں تل گئی

جس کے سمائے سینگ وہیں جا کے پھنس گیا
جس کی جہاں بھی دال گلی اُس کی گل گئی

ہے شان اک فقط گئیں اُن کی نوابیاں
رسّی کے بل وہیں رہے، رسّی تو جل گئی

یہ عاشقوں کی قوم بھی ہے، یوگیوں کی قوم
جو کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گئی

بچہ نہیں یہ قوم کہ گھٹنوں کے بل چلے
یہ ہر جگہ جہاں بھی گئی سر کے بل گئی

کلیا میں گڑ پھوڑتے "والے ہی بات کے کام
میری اک ایک بات بہ بانگِ دُہل گئی

تاثیر اک گزتا ہے باہر کے مال میں
باہر کا مال کھایا تو ہیئت بدل گئی

سیکھے تھے سو ہنر تو کبھی غالب آپ نے
آخر کتابت آپ کی قسمت میں ڈھل گئی

رمضان میں

چار سُو اللہ ہُو کا غلغلہ رمضان میں
سحری و افطار کا ہے ہمہمہ رمضان میں

چاند ہوتے ہی سروں پر آگئی ہیں ٹوپیاں
ٹوپیاں ہی ٹوپیاں ہیں جابجا رمضان میں

غرۂ شوال پر ہو جائے گا منظر یہ ختم
پھر کوئی دیکھے نہ یہ منظر جو تھا رمضان میں

سائرن اور لاؤڈ اسپیکر کی اذاں کے شور سے
ہو گیا ہنگامۂ محشر بپا رمضان میں

سال بھر کر کے عرق ریزی کما اپنی کمائی
بے محابا دے اُسے غسلِ صفا رمضان میں

یوں جگانے کے لیے سحری کو فقرا کی ہے بوم
رَت جگے پر ہیں کمر بستہ گدا رمضان میں

ہے چٹورا پن فزوں، سحری ہو یا افطار ہو
مانگتا ہے ہر کوئی عمدہ غذا رمضان میں

روز افزوں کھادگی ہے! الاماں والحفیظ
دُونی ہو جاتی ہے اکثر اشتہا رمضان میں

بچّوں کو ماں پیٹ کر، باوا گھرکوں کو چھوڑ کر
روزہ بہلاتے ہیں دونوں برملا رمضان میں

ہر طرف عربی غذائیں کیا حلیم اور کیا ہریس
مل گئے ہیں نسخہ ہائے کیمیا رمضان میں

یہ غذائیں ہیں پروٹین اور وٹامن سے بھری
ان کو کہتے ہیں کمر گھٹ کی غذا رمضان میں

روزہ داروں سے زیادہ پیٹو ملک کی ہے دُھوم
ایسے ہی اشخاص ہیں سب باوفا رمضان میں

[illegible] اللہ [illegible] کر نہ دے تجھ کو کہیں
عشرۂ اوّل میں سب کپڑے سِلا رمضان میں سلسلہ ص ۱۱۲

عید کے دن دُودھ کا لانا ہے جُوئے شِیر کا — دودھ کو اوّل ہی اوّل ٹھیک کر رمضان میں
کھانے کی حاجت نہیں ہے تنگیٔ افطاری کے بعد — پھر سحر کو کھانا تو ہرگز نہ کھا رمضان میں
گرمیٔ بازارِ رمضاں سے ہے وہ کھانا ہُوا — غالبِ ثانی کے ہیں اوسان خطا رمضان میں

غالب ثانی

آدھی صدی اُدھر کے جھروکے سے

اتنی نہیں تھی خلق میں اَن بن جگہ جگہ — جھگڑے کے منہ نہ آتے تھے بیلن جگہ جگہ
سر پر تھی کج کُلاہ تو اَچکن جگہ جگہ — کھڑکی پہ پردے دَر پہ تھی چلمن جگہ جگہ
چولھوں سے گیاس کے نہ تھی اُن بن جگہ جگہ — جلتا تھا لکڑیوں ہی کا ایندھن جگہ جگہ
آدھی صدی اُدھر کے جھروکے سے جھانکیے — نادِر ملے گا رنگ سے روغن جگہ جگہ
ہیئت میں برقعے ہوتے بڑے خوف ناک تھے — اُن میں جو چیز تھی وہ مزیّن جگہ جگہ
آتی تھی دُور ہی سے مہک زعفران کی — لقمی، کباب، مرغ، مُتنجن جگہ جگہ
شکرام ہی میں پھرتے حسینانِ وقت تھے — رشکِ پذیرِ میانہ تھی دُلہن جگہ جگہ
بیرونِ در ہی دھوبی رہا کرتا منتظر — ہر گھر میں ہو کے آتی تھی دھوبن جگہ جگہ
صابن کہاں کہ وہ تو ہے ایجاد بعد کی — مل مل کے سب نہاتے تھے بیسن جگہ جگہ
'چرکن' تھا جس کا نام وہ مقبول کھیل تھا — خورد و کلاں میں عام تھی چرکن جگہ جگہ
ہوتی تھی بارہ بجتے ہی توپوں کی گھن گرج — یوں تھا نظامِ وقتِ مُعیّن جگہ جگہ
ہر صبح منہ میں نیم کی ہوتی تھیں کاڑیاں — ہوتا تھا کوئلے ہی کا منجن جگہ جگہ
تھے نوک دار مونچھوں پہ لیموں کھڑے ہوئے — دیتے تھے اُن کو تاؤ مرودڑ جگہ جگہ
مونچھوں کا رعب داب قیامت کی چیز تھی — مونچھیں نہ ہوں تو چلتا تھا بیلن جگہ جگہ
سڑکوں پہ رَش تھا اور نہ بسوں کا ہجوم تھا — ہوتی نہیں تھی جیب کی کترن جگہ جگہ
ہوتی نہیں تھی نثر کی مجہول شاعری — تھی بحر کی ردیف نہ سوکن جگہ جگہ
اسٹیل کا رواج نہ ہی تھا پلاسٹک — تھے دستروں پہ کانچ کے برتن جگہ جگہ
طاقت میں نوجواں تھے افراسیابِ وقت — رستم جگہ جگہ تھے تہمتن جگہ جگہ
جا تو مگر چلاتے نہ تھے پھر کے گو یہ تو — جا تو چلانے کا نہ تھا فیشن جگہ جگہ
غالب رہا نہ کوئی کتابت میں اہلِ فن — اِس فن میں بھی گھس آئے ہیں پُرفن جگہ جگہ

"دو وقت کا ہے خرچ یہ دُنیا مرے آگے" — دَم بھر میں پر نچے ہوا مُرغا مرے آگے
اب اپنے پیٹ کے ہی پکڑ لیتا ہے وہ کان — ڈاٹا ہے بہت آج کا بچّا مرے آگے
برقع میں جو شے تھی ہوئی خود آپ سے باہر — اب جز و تماشہ ہوا برقع مرے آگے
بنکوں میں ڈکیتی کا ہُنر روز ہے افزوں — دن دھاڑے بھی ہو جاتا ہے سرقہ مرے آگے
گھیرے ہوئے اطراف تھے مُنہ چاٹنے والے — ہر گام پہ [illegible] تھا مُرغا مرے آگے
[illegible] کی ہے بھوک مجھے اور یہ دنیا — [illegible] ہے وہ تماشا مرے آگے

دلاور فگار
(کراچی)

عشق کا پرچہ

مجھ حیرت ہے کہ وہ سیٹر تھا کتنا باکمال
عشق کے بارے میں جس نے پوچھا پرچہ میں سوال

ایسے ہی سیٹر اگر کچھ اور پیدا ہو گئے
بھائیوں کو دیکھنا بہنوں پہ شیدا ہو گئے

عام ہو گی عاشقی کالج کے عرض و طول میں
لیلیٰ و مجنوں نظر آئیں گے ہر اسکول میں

عاشقی کو علم میں پرفیکٹ سمجھا جائے گا
عشق اک کمپلسری سبجیکٹ سمجھا جائے گا

عشق کے آداب لڑکوں کو سکھائے جائیں گے
غیر عاشق جبریہ عاشق بنائے جائیں گے

امتحاں ہو گا تو پوچھے جائیں گے ایسے سوال
لیلیٰ اور مجنوں کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال

مادرِ لیلیٰ نے تو لیلیٰ نہ بیاہی قیس کو
تم اگر لیلیٰ کی ماں ہوتے تو کیا کرتے لکھو؟

وصل کی درخواست پر کس کی سفارش چاہیئے
عشق کے پودے کو کتنے انچ بارش چاہیئے

کچھ مثالیں دے کے سمجھاؤ یہ قولِ مستند
دردِ دل اول، دل معشوق پیدا می شود

کیا تعلق طب یونانی کو ہے رومان سے
کمپیر فرہاد و مجنوں کو کرو لقمان سے

آج اپنے ملک میں عاشق ہیں کتنے فیصدی
مبتدی کتنے ہیں ان میں اور کتنے منتہی

ایک تحقیقی مقالہ لکھ کے سمجھاؤ یہ بات
شاخ آہو پر ہی کیوں رہتی ہے عاشق کی برات

ایک عاشق ایک دن میں چلتا ہے انیس میل
تین عاشق کتنے دن میں جائیں گے اڑتیس میل

چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھو ذیل کے ٹاپکس پر
شامِ غم، شامِ جدائی، دردِ دل، دردِ جگر

آپ کر سکتے ہیں ان میں سے کوئی بارہ سوال
بدخطی کے پانچ نمبر ہیں، رہے یہ بھی خیال

مندرج بالا سوالوں کا نہ دے گا جو جواب
امتحانِ عشق میں رہ جائے گا ناکامیاب

تین شعر

ناپ کر دیکھا تو کچھ قد میں درازی آگئی
تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی اشرف المخلوق ہے
آدمی کو دیکھ کر شیطان آدھا رہ گیا

چودھری صاحب آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر
یہ بھی لیتے جایئے جو سامان آدھا رہ گیا

(جون ۱۹۷۶ء)

دلاور فگار

غزلیں

ہوٹل میں ناچ گھر میں کلب میں وی آئی پی
حد ہو گئی کہ بزمِ ادب میں وی آئی پی

وی آئی پی کے ساتھ جو رہتے ہیں آئی پی
ان کو بھی مل ہی جاتی ہے کچھ اس کی کھا ئی پی

وی آئی پی نے جو بھی کہا قول بن گیا
میں بات کہہ کے قابلِ لاحول ہو گیا

(فروری ۱۹۷۶ء)

○

اک دوات ایک قلم ہو تو غزل ہوتی ہے
جب یہ سامان بہم ہو تو غزل ہوتی ہے

مفلسی، عشق، مرض، بھوک، بڑھاپا، اولاد
دل کو ہر قسم کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

بھوت، آسیب، شیاطین، اجنہ، ہمزاد
ان بزرگوں کا کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

شعر نازل نہیں ہوتا کبھی لالچ کے بغیر
دل کو امیدِ رقم ہو تو غزل ہوتی ہے

تندرستی بھی ضروری ہے تغزل کے لیے
ہاتھ اور پاؤں میں دم ہو تو غزل ہوتی ہے

پونچھ کتے کی جو ٹیڑھی ہے تو کچھ بھی نہ بنے
اور تری زلف میں خم ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف ٹھرّے سے تو قطعات ہی ممکن ہیں فگار
ہاں اگر وسکی و رم ہو تو غزل ہوتی ہے

(فروری ۱۹۷۶ء)

انگلش غزل

دی نیشن ٹاکس ان اردو دی پیپل فائٹ ان اردو
ڈیر ریڈرس وہیٹ از وہائی آئی رائٹ ان اردو

وہ ہو جب ہارٹ ان دی چیسٹ تو پھر ٹنگلنگ ہی اٹیکنگ یو
ٹو بیوٹیفائی دس لائف تھرو سم لائٹ ان اردو

جیوڑی کی نشستیں کلچرل شو ہی سہی لیکن
پلیز اے صاحبانِ دل مجھے انوائٹ ان اردو

مری نظموں کا یہ مجموعہ ہے پبلشڈ اردو میڈ
دیر فور آئی وڈ لائک اسے کاپی رائٹ ان اردو

دیر شڈ بی یقیناً نو ملاوٹ ان دی لٹریچر
دیر فور آئی نیور کال شب کو نائٹ ان اردو

فگار اس نظم میں تیری زبان اردو ہے انگلش
مگر لکھے ہیں تو نے قافیے کیا ٹائٹ ان اردو

(دسمبر ۱۹۷۵ء)

فیض الرحمٰن فیضؔ

تری ناک میں رسّی

کیوں شعر چُراتا ہے تری ناک میں رسّی
محفل میں سُناتا ہے تری ناک میں رسّی

اوروں سے لکھاتا ہے تری ناک میں رسی
کیا شان دکھاتا ہے تری ناک میں رسّی

غمّاز ہے دل کی تری وزنِ بیہدہ لگا ہی!
کیوں آنکھ چُراتا ہے تری ناک میں رسّی

حجّام نے ہپّی کو جو دیکھا تو کہا یہ
کیوں بال بڑھاتا ہے تری ناک میں رسّی

واعظ کا ہے مے خانہ میں بگڑا ہوا حلیہ!
اور ٹھرّا اُٹھاتا ہے تری ناک میں رسّی

سامع مجھے کہتا ہے ترنّم سے سنانے
شاعر کہیں گاتا ہے تری ناک میں رسّی

چیلوں سے مرمت ہوئی جا نوٹوں سے ٹھکائی
اکڑے ہوئے آتا ہے تری ناک میں رسّی

چھینکے ہوئے سگریٹ کو پیتا ہے چھپاکر
مرغولے بناتا ہے تری ناک میں رسّی

دمڑو کے بہانے دیا آمیزۂ وہسکی
دھوکے سے پلاتا ہے تری ناک میں رسّی

مطلب کی کہوں بات تو کرتا ہے تجاہل
باتوں میں اڑاتا ہے تری ناک میں رسّی

دل دھاڑے پڑوسن کی ترڑی دے دیا مرغی
کیا ناک دکھاتا ہے تری ناک میں رسّی

عمّامہ و جبّہ کا تجھے پاس نہیں ہے!
کھا کر لیے جاتا ہے تری ناک میں رسّی

(ستمبر ۱۹۷۷ء)

سب غلط

دل پر نہ ہو جس کا اثر، ایسا کلام بے اثر
لکھنا غلط پڑھنا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

آکر اچانک میرے گھر ایک پل نہ ٹھیرے چل دیئے
آنا غلط جانا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

مجھ پر وہ جب ہنسنے لگے آنکھوں میں آنسو آگئے
ہنسنا غلط، رونا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

رشوت نہ ہرگز لیجیے، رشوت نہ ہرگز دیجیے
لینا غلط دینا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

جوئے میں جیتی جو رقم ہیں کے لنڈھا خم پہ خم
پانا غلط پینا غلط یہ بھی غلط وہ بھی غلط

سسرے سے لٹھے رو ٹھ کے آکر سڑک پر سو گئے
اٹھنا غلط، سونا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

ہم عشق بھی کرتے رہے اور جوتیاں کھاتے رہے
کرنا غلط کھانا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

مل جائے جو بھی مفت میں کرتے ہیں سب زیرِ حلق
کھانا غلط پینا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

اے فیضؔ تم اس دور میں ناصح نہ بنتا بھول کر
کھانا غلط ہنسنا غلط، یہ بھی غلط وہ بھی غلط

بچہ بازار وہ بقّال پہ ٹوپی ڈالو
دیکھتے کیا ہو مفت لال پہ ٹوپی ڈالو

پارچہ زیور و برتن کی اگر خواہش ہے
پھر تم دختر غسّال پہ ٹوپی ڈالو

کیفیت "حال" کی طاری ہے بھری محفل میں
خوب موقع ہے قوال پہ ٹوپی ڈالو

([illegible])

قاضی سلیم ۔ بشر نواز

ایک دُعائیہ

سخن میں آج خدایا نیا کمال رہے
دُعائیہ جو لکھیں ہجو کی مثال رہے
وہ شاہکار بنے فن کا، لازوال رہے

کبھی دماغ نہ اس کھوپڑی میں جڑ پائے
کوئی بھی ہولے پنے میں نہ اس سے بڑھ پائے
حماقتوں کے چمن میں سدا نہال رہے

اِک ایک شعر میں ہنگامہ بے پناہ کریں
ہو ایسی طرزِ اَدا لوگ واہ واہ کریں
طبیعت ان کی بڑی دیر تک بحال رہے

فروغ پاتی رہیں عیب داریاں اُس کی
سبھی کو یاد رہیں خام کاریاں اُس کی
یہ آرزو ہے کہ تاریخ میں مثال رہے

مغلظات کریں جمع ڈھونڈھ کر ایسی
سُنے جو کوئی تو ہو جائے اُس کی ایسی تیسی
زباں میں صدیوں تک گالیوں کا کال رہے

ملے نہ اہلِ زمانہ کو اس سے چھٹکارا
مَرے جو شرم سے پیدا ہو پھر وہ دوبارا
اَبد تلک یہ نحوست رہے وبال رہے

خوشا نصیب ہے ممدوح پھر الف ب ت
ہُوا ہے آج بھی مذبوح پھر... ... ...
ہے آگے حدِّ ادب، دوست کا خیال رہے

کلام پیار کا چھپوائے اور پھانسے
دیا کرے یونہی ہر چھوکری کو وہ جھانسے
ہو کوئی عمر بھی، اس کی گرہ میں مال رہے

غنیمت آج سمجھتے ہیں ہم اِسی دَم کو
قلندری کا یہ بہروپ ہے عزیز ہم کو
سراب ہو کہ یہ دھوکا ہو لازوال رہے

مگر عجیب یہ بدبخت ہے، نقاب اُلٹا
تو دیکھا ہم نے ہمارا ہے سارا خواب اُلٹا
اُسے تو فکر تھی، بس روٹیوں پہ دال رہے

اگر کسی سے مِلے اِس کو نقد نارائن
ادب کو دے دے طلاق اور طلاق بھی بائن
نظر میں اس کی نہ ماضی رہے نہ حال رہے

لکھی ہے ہجو کہ قائم ہو حیثیت اس کی
ہزار صدیاں بھی گزریں تو بوریت اس کی
زمانہ یاد کرے، روئے اور نڈھال رہے

(جنوری ۱۹۷۵ء)

آبلہ پا

قلندر بدمست

اس دور میں سب چپ ہیں ادا چپ ہے حیا چپ
اب حسن کی ہر بات ہے فیشن کے سوا چپ

ہے کون جو اس شوخ کو روکے گا جفا سے
ہم چپ ہیں، حکم چپ ہے، صنم چپ پہ خدا چپ

روداد سفر دشت بلا کون سنائے
ساتھوں کی زباں خشک تو ہر آبلہ پا چپ

ہو کس کو یقیں اس جگہ ڈوبا ہے سفینہ
ساکت ہے ہر اک لہر، ہر اک موج ہوا چپ

ہم آئے تو اس بزم میں ہنگامہ اٹھا ہے
ساقی ترا مے خانہ تو رہتا تھا سدا چپ

کیا بگڑے گا تم ظلم کرو گے جو کسی پر
یا چیخ کے مر جائے گا ہو جائے گا یا چپ

(اگست ستمبر ۱۹۷۰ء)

لاٹری

آدمی سے ملو آدمی کی طرح
ہاں گدھے سے ملو تو اسی کی طرح

پہلے گھر کے اندھیرے میں پابند تھیں
اب وہ آزاد ہیں روشنی کی طرح

کتنے معنی نکلتے ہیں اک بات کے
بات کرتے ہیں وہ شاعری کی طرح

موٹی مرغی ہیں واللہ سنا آپ کے
ہم سے مل جائیے لاٹری کی طرح

ہر گلی میں شہیدوں کے انبار ہیں
ہر گلی اب ہے ان کی گلی کی طرح

تم قلندر غٹاغٹ نہ کرتے رہو
ڈھنگ سے مے پیو شیخ جی کی طرح

ہاتھا پائی

بھائیوں سے جو لڑائی کی
جورو نے بڑی دانائی کی

سو کام کئے پکڑے نہ گئے
حسرت ہی رہی رسوائی کی

لاحول ولا - یہ قیمت ہے
اے حسن تری انگڑائی کی

ہم نے بس پاؤں سے کام لیا
نوبت تھی ہاتھا پائی کی

گر جائیں تو کیسے خبر بھیجیں
اس کھائی کی گہرائی کی

ہے پیار تو پھر سیوا کیجے
کچھ بہنوں کی کچھ بھائی کی

بس یار قلندر رہنے دے
چلنے کی نہیں یہ کھائی کی

(اکتوبر نومبر ۱۹۷۰ء)

قمرالزماں قمر (رانچی)

محبوب جغرافیہ کے آئینے میں

جی چاہتا ہے ان کا میں جغرافیہ لکھوں　　کچھ حال مدّ و جزرِ رُخِ دل رُبا لکھوں
گرچہ نظامِ شمسیِ محبوب کا ہوں نجم　　کتنا ہوں ان سے دور میں کیا فاصلہ لکھوں
زلفوں کو ان کی موجِ خلیجِ عرب کہوں　　چہرے کو ان کے ایک جزیرہ نما لکھوں
ابرو کو گر ہلال کہوں، لب کو جام مے　　نظرِ دل کو ان کی تیرو سناں بے خطا لکھوں
گالوں کو سیبِ سرخ تو آنکھوں کو جامِ شہد　　گردن کو کچھ نہیں تو صراحی نما لکھوں
اشکوں کو ان کے بارشِ آسام گر کہوں　　خود اپنے دل کو اس میں ڈوبتا ہوا لکھوں
ناک ان کی ہے سرنگ اگر بانیہال کی　　ماتھے کو سطحِ مرتفع وندھیا لکھوں
بندیا کا جو مقام ہے ایورسٹ نام ہے　　اپنے کو میں جہاتِ ایر انڈیا لکھوں
گیسو کو لوگ کالی گھٹا کہتے آئے ہیں　　میں اس کو جنگلات کی کالی گھٹا لکھوں
سلجھا سکے نہ مومن و غالب بھی پیچ و خم　　میری بساط کیا ہے کہ پیچوں کو وا لکھوں
سر ہو سکیں نہ کوہ نوردوں سے جو کبھی　　ان چوٹیوں کی دوریاں کتنی ہیں کیا لکھوں
آتش فشاں کا رُوپ کہوں ان کے غیظ کو　　چینِ جبیں کو ان کے خطِ استوا لکھوں
ان کے غضب کو دشتِ صحارا سے دوں مثال　　ان کی ہنسی کو نغمۂ موجِ صبا لکھوں
قطرے نمی کے عارضِ رنگیں پہ دیکھ کر　　شبنم کے موتیوں سے بھرا گل کدہ لکھوں
گر سخت گرم و خشک ہے انکار کی ہوا　　بہتر ہے اس کو حسن کی رنگیں ادا لکھوں
انگڑائی ان کی دیکھ کے یہ سوچتا ہوں میں　　عاشق کے واسطے اسے اک زلزلہ لکھوں
حیران تھا مزاج کو تشبیہ کس سے دوں　　آئی سمجھ میں بات کہ "آب و ہوا" لکھوں
سینے کی حد سے آگے نہیں سرحدِ خیال　　میں بے ادب نہیں ہوں کہ اس سے سوا لکھوں

اپنی سمجھ میں آئی نہ پھر بھی قمرؔ یہ بات
جغرافیائی سطح پہ میں ان کو کیا لکھوں

(ستمبر ۹۲ء)

٥

حسینوں کی نزاکت، حسن کا بازار ٹھنڈا ہے　　محبت کی دکانیں بند کاروبار ٹھنڈا ہے
قمرؔ میں بھی پڑا ہوں ٹھنڈا اس گرمی کے موسم میں　　ادھر اظہار ٹھنڈا ہے، ادھر اصرار ٹھنڈا ہے

(مارچ ۱۹۹۳ء)

عشقیات میں ڈاکٹریٹ

(قمرالزماں قمر)

اک محقق نے مقالہ لکھ کے ڈی ۔ لٹ کیا لیے — عشق کے سبجکٹ پہ جو وہ طبق روشن کیے
صاحبِ تحقیق نے ایسے نکالے ہیں نکات — مثلِ آئینہ چمک اٹھا ہے فنِ عشقیات
ابتدائے عشق کا مرکز ہر اک اسکول ہے — جو نہ سمجھے اس حقیقت کو وہ اک دم فول ہے
مبتلا اٹھانوے پرسینٹ ہیں اس کھیل میں — نورِ چشم و نورِ چشمی سب ہیں قید اس جیل میں
عشق جب سے ہو گیا سبجکٹ اک کمپلسری — لڑکیوں میں بڑھ گئی ہے دل ربائی دلبری
اس محقق نے سہولت کے لیے ایسا کیا — ملک کا نقشہ بنایا اور اس پر لکھ دیا
سیکڑے چالیس ہیں مومن عشق میں ہیں مبتدی — رہ گئے باقی جو بس ان کو سمجھیے منتہی
نقشۂ ہما میں دے کر روس و کابل کی مثال — کوچۂ جاناں کی سرحد کو دکھایا بال بال
دے کے براہین و دلائل اس نے سمجھائی یہ بات — "شاخ آہو پہ ہی کیوں رہتی ہے عاشق کی برات"
فارسی کا یہ مقولہ آج بھی ہے مستند — عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
عشق دونوں میں ہے وہ سائنس ہے یا آرٹ ہے — یوں سمجھ لیجے کہ بس اک دوسرے کا پارٹ ہے
ذیل کے مرقوم ٹوپکس عشق کے ہیں فیکٹر — "شامِ غم، شامِ جدائی، دردِ دل، دردِ جگر"
پہلے شامِ غم کی لمبائی ہزاروں میل تھی — اور چوٹائی شبِ ہجراں کی بے تمثیل تھی
اب مگر یہ فاصلہ گھٹ کر ہے اک نقطہ سے کم — اب شبِ فرقت کی کہانی ہے فقط دو اک قدم
از روئے تحقیق اب معلوم ہوتا ہے یہی — قیس اور فرہاد تھے اس فن میں بالکل مبتدی
دورِ موجودہ میں الفت کی نئی تعریف ہے — پہلے جو کچھ بھی رہی ہو اس میں اب تحریف ہے
ماہرِ الفت کا ہے ڈنکے کی چوٹ ایسا بیاں — عشق اک سگریٹ ہے جلتا ہوا اور بے دھواں

جیسے ہی دو اجنبی مل جاتے ہیں فٹ پاتھ پر
وصل کی درخواست ہو جاتی ہے فوراً کنسیڈر (دسمبر ۱۹۸۱ء)

کباب (علیگ)

پیٹ منت کشِ غذا نہ ہوا — "یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"
شیخ صاحب سے اپنی بیوی کا — "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"
کیسے تم نے کھلائے آج کباب — ذائقہ مُنہ کا چٹپٹا نہ ہوا"

(شین شعر :

عزیز قیسی

او دیس سے جانے والے سن

اُو دیس سے جانے والے سن   "کس حال میں ہیں یارانِ وطن"

پہلے تو یہ سن لے گھر تیرا   کس رنگ میں ہے کس حال میں ہے
اب کتنا دودھ ہے پانی میں   اور کتنا کالا دال میں ہے
پھر سننا یاروں کی منڈلی   کس سر میں ہے کس تال میں ہے

کیا تجھے بتائیں گھر تیرا   اب کس صوبے میں آیا ہے
دالان تو تیرا اپنا ہے   لیکن بڈ روم پرایا ہے
دو صوبوں نے آنگن پہ ترے   کہتے ہیں کہ حق جتلایا ہے

اب سارے نواب اور شہزادے   سوشیل ورکر کہلاتے ہیں
جو مرغ لڑایا کرتے تھے   اب مرغے انھیں لڑاتے ہیں
دکھ سہہ کے دیتے تھے جو انڈے   وہ انڈے کوّے کھاتے ہیں

اب تیری گلی کا ہر بالک   اسکول کے باہر رہتا ہے
جیبوں میں پٹاخے رہتے ہیں   اور ہاتھ میں پتھر رہتا ہے
اولاد کے ہاتھوں کا سایہ   ماں باپ کے سر پر رہتا ہے

اب غم میں نگر کے ڈھلنے کے   ہر ماں چھپ چھپ کے روتی ہے
اب بیٹا بھائی کہلاتا ہے   اور بیٹی سسٹر ہوتی ہے
دن اُٹھ کر وہسکی پیتا ہے   شب گولی کھا کر سوتی ہے

لیڈر چوروں کے ساجھے میں   ووٹوں کی تجارت کرتے ہیں
ہر روز نئے اک ریزر سے   جنتا کی حجامت کرتے ہیں
زندوں سے ہر اک کو نفرت ہے   مُردوں سے محبت کرتے ہیں

کچھ لوگ یہاں بازاروں سے   داماد خرید کے لاتے ہیں
اور ان کو ریسرچ کی خاطر   لندن وندن بھجواتے ہیں
اکثر بے چارے بیٹی کو   اب تک زندہ دفناتے ہیں

(دسمبر ۱۹۷۰ء)

قیسی قمر نگری (کرنول)

غزل

دیکھ کر راہِ وفاداری میں انساں کا چلن
ہم کو اصحابِ کہف کا ہم سفر اچھا لگا

سن رسیدہ شیخ ہی کیا کم تھا ڈھلتی عمر میں
صبر کو تنہائیوں میں ہر ثمر اچھا لگا

اشتہارِ جلسہ سیرت بھی دیواروں پہ تھا
پھر بھی ہم لوگوں کو فلمی پوسٹر اچھا لگا

تحفتاً اک کار اور بنگلہ خسر نے دے دیا
تب کہیں دلہا کو دلہن کا کلر اچھا لگا

سر پہ پڑتے ہی میں اُس کے دشمنوں سے مل گیا
جب کہ یہ گلدان قیسیؔ! میز پر اچھا لگا

● اگست ۹۳ء

قطعات

مری شادی کے دن خویش واقارب بےشمار آئے
مبارک باد کے پیغام والے ساٹھ تار آئے
مگر میرے کسی دشمن نے اپنے تار میں لکھا
"تمہاری زندگی میں آج کا دن بار بار آئے"

★

میں نے بیگم کو بتایا، وقت ضائع مت کرو
ایک کتے کا سدھرنا غیر ممکن بات ہے
سن کے میرا مشورہ بیگم نے غصے سے کہا
"تم سدھر سکتے ہو تو کتے کی کیا اوقات ہے"

تصوّر

(ایک مدت بعد وطن لوٹتے ہوئے)

جواں ہو کر وہ قد میں ڈھائی میٹر ہو گئے ہوں گے
سیہ تو تھے ہی پہلے اب سیہ تر ہو گئے ہوں گے

کئی عاشق گلی میں ان کی چکر کاٹتے ہوں گے
کئی عشاق کے سیکل تو پنکچر ہو گئے ہوں گے

خدا جانے کہ ان کے باپ کی حالت ہے اب کیسی
شرابی سے وہ اب مٹکے کے خوگر ہو گئے ہوں گے

بہن اُن کی کئی بچوں کی اماں ہو گئی ہو گی
اور ان کے بھائی اب غنڈوں کے لیڈر ہو گئے ہوں گے

کئی امرا فقیروں کے مماثل ہو گئے ہوں گے
کئی فقرا مقدر کے سکندر ہو گئے ہوں گے

ہمارے گاؤں کے سرپنچ تھے جو دشمنِ اردو
یقیناً آج اردو کے منسٹر ہو گئے ہوں گے

جنھوں نے گاؤں کی درگاہ سے چادر چرائی تھی
وہ اب درگاہ کے اصلی مجاور ہو گئے ہوں گے

وہ جن کو عورتوں کے نام سے بھی سخت نفرت تھی
یقیناً آج تابعدار شوہر ہو گئے ہوں گے

وہ بچے جو ہمارے سامنے ننگے پھدکتے تھے
وہی بچے کئی بچوں کے فادر ہو گئے ہوں گے

میاں قیسیؔ بھلے انساں سے شاعر ہو گئے ہوں گے
جھگڑ کر اہلِ گھر سے وہ بے گھر ہو گئے ہوں گے

(جولائی ۱۹۸۹ء)

کرگس سہوانی

غزلیں

حالِ دلِ بیمار وہی ہے
"پیپے" ہے وہی گھر بار وہی ہے

آنے سے تو کتراتے ہیں
وعدوں کی بوچھار وہی ہے

تیری طبیعت اللہ اللہ
نخروں کا طومار وہی ہے

جو ہے تیری آنکھ کا تارا
میری نظر کا خار وہی ہے

ہاتھ بھی جوڑے پیر بھی پکڑے
اُن کا مگر انکار وہی ہے

لاکھ پڑھا لاحول کا منتر
بھوتوں کا آزار وہی ہے

گو ہے ہر جا فیشن تازہ
بیگم کی شلوار وہی ہے

مجنوں کو جو روگ لگا تھا
مجھ کو بھی آزار وہی ہے

غیروں سے چاہت کی باتیں؟
میرے لیے دھتکار وہی ہے

دُھن پر جو نوشاد کی گالے
آج بڑا فن کار وہی ہے

فرق نہیں کچھ نس بندی سے
بچوں کی بھرمار بہت ہے

آج ہر اک بازارِ وفا میں
جسموں کا بیوپار بہت ہے

حق کے چرچے بند مگر ہیں
"نیوز" وہی اخبار وہی ہے

دھرم کے ٹھیکے دار وہی ہیں
مذہب کی دیوار وہی ہے

کام نہ آئے وہ ہے دشمن
کام جو آئے یار وہی ہے

"گینگ" وہی ہے کرگس والا
غنڈوں کا سردار وہی ہے

(ستمبر ۱۹۸۷ء)

○

سنبھل کر چلو چال اے حسن والو
وگرنہ کہیں ایکسیڈنٹ ہوگا

جو جیتے گا کشتی وہ پلٹے گا ان کو
ضیا پر "ٹورنامنٹ" ہوگا

رقیبوں کی قبریں تو کچی بنیں گی
چلو میری تربت پہ "سیمنٹ" ہوگا

یہ کیا کہہ رہے ہو محبت نہیں ہے؟
چلو آج ہی "ایگریمنٹ" ہوگا

سمجھ سوچ کر میں نے کی ہے محبت
کہ نقصان تو سینٹ پرسینٹ ہوگا

نہ ہوگا اگر چارۂ دردِ پنہاں
تو کرگس بھی ٹی بی کا "پیشنٹ" ہوگا

گڑبڑ حیدرآبادی

کرسی

مہ لقا طرح دار ہے کرسی — یعنی سولہ سنگار ہے کرسی
سب یہ کہتے ہیں کرسی مجھ کو ملے — سب کے دل کی پکار ہے کرسی
بوڑھے بیٹھیں، جوان ہو جائیں — واقعی گلبہار ہے کرسی
جان دیتے ہیں حسن والے بھی! — تجھ پہ دنیا نثار ہے کرسی
زرپرستوں میں تیری پوجا ہے — کس قدر زرنگار ہے کرسی
رعب غالب ہے اس کا دنیا پر — عظمتِ عہدہ دار ہے کرسی
غنڈے، قاتل سلام کرتے ہیں — واہ کیا رعب دار ہے کرسی
زعمِ کرسی میں لوٹیے دولت — خوب خدمت گزار ہے کرسی
بیٹھ کر اس پہ جو بھی چاہیں کریں — عیب کی پردہ دار ہے کرسی
ایک ادنیٰ کو کرتی ہے اعلیٰ — شانِ پروردگار ہے کرسی
نتھو خیرے بھی کرتے ہیں تقریر — بلبلِ صد ہزار ہے کرسی
چمچے ملتے ہیں تیرے ملنے سے — تیرے دم سے بہار ہے کرسی
تیرے جاتے ہی چل دیے چمچے — تیرا کیا اعتبار ہے کرسی
اپنے اچھوں کو کاٹ دیتی ہے — تو تو خنجر کٹار ہے کرسی
تجھ پہ قربان دھرم بھی ایماں بھی — تو لٹیروں کی یار ہے کرسی
تو ہی لاتی ہے انقلابوں کو — مرکزِ اقتدار ہے کرسی
تیری خاطر ہی جنگ ہوتی ہے — تجھ سے ہی خلفشار ہے کرسی
تیرے پائے میں دفن ہیں لاکھوں — تو وہ زندہ مزار ہے کرسی
قتل گاندھی سے ہو گیا ظاہر — سازشوں کا شکار ہے کرسی
رام گوتم نے دی تجھے زینت — حق کی آئینہ دار ہے کرسی
ٹیپو، اکبر، ظفر بھی بیٹھے ہیں — وجہِ صد افتخار ہے کرسی
شانِ بخشی ہے نہرو، اندرا نے — اس لیے شان دار ہے کرسی
بیٹھنے والے سوچ لیں گڑبڑ — پھول بھی ہے تو خار ہے کرسی

یہ بھی بیگم سے کم نہیں گڑبڑ
سب کے سر پر سوار ہے کرسی

گُگّی نلگنڈوی

منسٹر کی موت پر چمچوں کا مرثیہ

باوا رے، داتا رے، کہاں کی جاتا رے جاتا رے
تیرے دم سے زندہ تھے سارے کے سارے مر گئے جانے رے
اماں باوا، جورو بچے زندہ مر گئے، ہائے رے
اب کس کی ڈشس میں کھانا رے

باوا رے....
تیری جھوٹی فارن کی وہسکی پیتے تھے اب کیا پینا رے
جھوٹا گڑمبا بھی نیں ملا تو بول رے کیسا جینا رے
ساقی کا تھا مے خانہ تھا، جمشید کا تھا پیمانہ رے

باوا رے....
تیرا تھا ایک اپچ بیٹا، اللہ میاں کی گائے اُن
ہمارا کیا کلیان کرے گا پورا ہے برہمچاری اُن
شیطان کے پیٹ میں ولی کے جیسا بن کو ہمارے پیارے

باوا رے....
کون سا الکشن لڑنے جارائے خواب میں آکو بتلا دے
سب کو دھوکا دیئے سر کیا ہمنا تکو دھوکا دے
جینا تیرا دھوکا تھا، یہ مرنا بھی ہے کیا دھوکا رے

باوا رے....
بغیر سیکوینس رمّیوں پو رمّیاں، گھپلوں پو گھپلے کرتے تھے
جوکر کہاں کی رہتا تھا، پیارے اپنا دھندا کرتے تھے
تاشش کے باون پتّوں میں تو یکّوں میں تھا یکّہ رے

باوا رے....
اسمگلنگ اور بلیک مارکٹ ایک دم سے بند ہو جائیں گے
تیرے ٹیبل کے پیچھے بول بتا پھر کیا کھائیں گے
سونے کا انڈا دیتا تھا سو تھا اصلی مرغا رے

باوا رے....
تیرے الکشن کی گڑبڑ میں کتے قتل ہم کر ڈالے
تیرے دم سے چپ تھی سی آئی ڈی اب کیا کرتی کیا رے
گلے میں جلدی پڑنے کو دکھ رائے پھانسی کا سندر پھندا رے

باوا رے....
تیرے بجائے چمچوں میں سے چمچوں کے بچے مرنا تھا
چمچوں کے بچے بھی نیں مرے تو چمچوں کے سنگے مرنا تھا
تیری بلا سے کیوں نیں مرا رے چمچوں میں سے کوئی بچارے

باوا رے....
تیرے آدمی ہم کو سمجھ کو سارے لوگاں ڈرتے تھے
شہر میں جتنے بھی تھے طائفے جھک کو سلاماں کرتے تھے
ہارمونیم بند ہو گئی ہے بجتا ہے غم کا ڈھپڑا رے

باوا رے....
کار میں تیری تن کو پھرے تھے دنیا کو منہ کیا دکھلائیں گے
قبر میں تیری جگہ ملی تو بازو تیرے سو جائیں گے
دسواں، بیسواں نیں تو نئیں، کون دیں گا قل کا ڈھیلا رے

باوا رے....
کل تک رائل ٹھاٹ تھا اپنا آج فقیر بن گئے ہم
اماں بھی تو تھا، باوا بھی تو تھا، یتیم یسیر بن گئے ہم
بنسری بجا کو گلی گلی بھیکے مانگو چندا رے

باوا رے....

باوا رے.... (سلسلہ ص ۱۲۶ پر)

کیا کرنا دل گھٹ کریں گے تجھ کو ہم دفنا دیں گے
تیری قبر کے اوپر گنبد بھی ایک بنا دیں گے
تربت کے اوپر چھپ بیٹھیگا کوئی اک سجادہ رے

باوا رے....

کولی سے ہاتھوں سے اب تجھ کو بول نہیں دفنا رے
پہلا ممی تھا' یا ہیں تھا' تو مٹی میں کیسے ملانا رے
میوزیم میں اب رکھو کو جنازہ سب کو ٹکٹ سے دکھانا رے

باوا رے....
تازہ قتل اور اغوا کے پھر تیرے بن گئے یکساں تھے
دلّی میں اک بنک لٹا سو ہم پہ بھی الزامات تھے
بگلی کے سر پکا اڑتے تھے کیسا' ڈنڈوں کا تھا تو ڈنڈا رے

باوا رے.... (مئی ۱۹۷۴ء)

غزلیں

پچّھے انوں شٹنگ کرائے سریکا ہے
شرارت کا سگنل گرائے سریکا ہے
مجھے کیا تمیں اب نبھائے سریکا ہے
تم بھی زری ماموں چڑھائے سریکا ہے
مروّت میں کمپ ڈبائے سریکا ہے
ملاحظہ میں مرغا کھلائے سریکا ہے
ندی کے کنارے پو خوشبو مہک رہی ہے
گلابوں کی ملکہ نہائے سریکا ہے
انوں میری لنگی بیبی کو نکل رئیں
منجے اپنی ساڑی پنہائے سریکا ہے
مرے دیش کا ہے غریبی مقدر
انوں کیا غریبی ہٹائے سریکا ہے
منجے فون کر کو جو ہلو ڈیر کہہ رئیں
انوں رانگ نمبر ملائے سریکا ہے
بہت لیڈراں جھک کو کرریں سلاماں
الکشن کے دن پھر کوائے سریکا ہے
انوں چائے پو جائے منجے پلا رئیں
انوں پھر بلاّیاں لگائے سریکا ہے
جدھر دیکھو گلی کے مٹوں پو دا غاں
انوں دھر کو ڈنڈا بجائے سریکا ہے (مئی ۷۴ء)

آنکھ رکھو کو بھی میں اندھا اور دیوانہ سکتے
اُن کی تڑپتی انکھیاں نرگس اور پیمانہ کتے
میرا کھانا پینا اُن کے باپ کا ٹکا نا کتے
گھر پو میں سسرال کے جھنڈے کو لہرانا کتے
زندگی زندہ دلی ہے دل کو بہلانا کتے
آٹھ دن سے فاقہ کر کو شعر فرمانا کتے
عاشقی میں ایک دم سگنل گرا' گاڑی رکی
وہ بدل ریں لائین میں جنکشن پہ رک جانا کتے
کام بننے تک میں ان کا پرسنل سکریٹری ہوں
کھاتے پیتے وقت میں ہلک پھسل جانا کتے
لیڈراں تو ڈنر ولی پو ڈنراں دے ریں تڑی
میں فتح میدان کی ٹھنڈی ہوا کھانا کتے
غیر کی گلیوں میں گھس کو تار کر ریں وہ مجھے
میں گڑ میاں کی کو ان کے غم کو بھل جانا کتے
وصل کی شب ان سے میری کٹ گئی تکرار میں
اوڑھنا میں ان کا گھونگھٹ اور شرمانا کتے
صرف اسٹیٹوں کی چکر میں بچھڑ گئے دو دلاں
آندھرا ان کا کتے' میرا تلنگانہ کتے
کیا بتاؤں مل گئے کیسے قدرداناں مجھے
شعر بھی پڑھنا کتے' مطلب بھی سمجھانا کتے
دیکھ کو فلماں نوے اب مدرسے وہ بول ریں
بن کو میں راجیش کھنہ خواب میں آنا کتے
شال میں دے دوں لپیٹ کو کیا سمجھ ریں کی انوں
بول ریں بگلی مکرّر پھر کو فرمانا کتے

○ (مارچ اپریل ۷۲ء)

جواب پرچۂ عشق

(دلاور فگار کی نظم "پرچۂ عشق" کا منظوم حل)

س: اپنے اندازے سے طولِ شامِ تنہائی بتاؤ
صرف تخمیناً شبِ ہجراں کی لمبائی بتاؤ

ج: ایک خط مشرق سے مغرب تک زمیں پر کھینچیے
دو سروں کے درمیانی فاصلے کو ناپیے
شامِ تنہائی کی لمبائی اسی کو مانیے
ایک رسّی کے سرے کو ہجراں کے صحن میں
دوسرے کو دامنِ محشر میں سمجھو، ذہن میں
دو سروں کے درمیانی فاصلے کو جانچیے
ان کی زلفِ خم سے اک پٹری بنا کر ناپیے
اور شبِ ہجراں کی لمبائی اسی کو جانیے

س: انڈیا کا ایک نقشہ اور کاپی پر بناؤ
اور پھر اس میں حدودِ کوچۂ جاناں دکھاؤ

ج: کوچۂ جاناں کی دھن میں باندھ کر رختِ سفر
نکلا تھا جس گام سے میں پہنچا پھر اس گام پر
ساری دنیا میں سراغِ کوچۂ جاناں نہیں
انڈیا کے نقشہ میں کیا خاک دکھلاؤں تمھیں!

س: ایک عاشق ایک دن میں چلتا ہے اتنے میل
کتنے عاشق کتنے دن میں جائیں گے اتنے میل

ج: یہ نصابِ عشق میں تم نے پڑھایا ہی نہیں
بے سبب چلتا ہے کیوں عاشق بتایا ہی نہیں
یہ سوال ایسا ہے کہ کچھ آدھے نہ تا دے ہے!
شکر گنج میں پوچھتے ہو مرچ کا کیا بھاؤ ہے؟

س: وصل کی درخواست پر کس کی سفارش چاہیے
عشق کے پودے کو کتنے انچ بارش چاہیے

ج: عشق کی درخواست آپ ایسے سجا کر بھیجیے
حضرت شیطان کو قاصد بنا کر بھیجیے
عشق کا پودا جو دل ہے عرض ہے اپنا جناب
ان کے یہ ابرِ کرم سے نم تو ہے عزت مآب
عشق کے پودے کو بارش کیا ضیا بھی چاہیے
لگ رہے گا ہے ان کے دامن کی ہوا بھی چاہیے

س: چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھو ذیل کے ٹاپکس پر
شامِ غم، شامِ جدائی، دردِ دل، دردِ جگر

ج: شامِ غم، شامِ جدائی، بہنیں ہیں چھوٹی بڑی
ایک چنگاری ہے تو ہے دوسری آتش بڑی
دردِ دل، دردِ جگر کا ذکر کرنا پاپ ہے
ایک ایٹم بام ہے اور ایک اس کا باپ ہے

س: مادرِ لیلیٰ نے تو لیلیٰ نہ بیاہی قیس سے
تم اگر لیلیٰ کی ماں ہوتے تو کیا کرتے بتاؤ

ج: واہ رے استاد کیسے کیا بنا ڈالا مجھے
خوب سوجھی مادرِ لیلیٰ بنا ڈالا مجھے
گھر کے اس داماد کے حق میں دعائیں دیتی یوں
لے کے برخوردارِ مجنوں کی بلائیں کہتی یوں
تو سلامت اور تیرا حوصلہ پائندہ باد
"عشق تیرا زندہ باد و زندہ باد و زندہ باد"

(نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء)

رگلی ننگلسنڈوی

برخوردار جمشید کے نام

ڈاکٹر گیان چند

(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کسی رئیس کے گھر میں قیام پیدا کر
دیارِ عشق میں اونچا مقام پیدا کر

مجاورین کے لیے صبح و شام روغنِ قاز
جو کوئی کام نہ ہو تو یہ کام پیدا کر

شجر کے نیچے ترنم سے شعر پڑھ کر جا
حجابِ حسن میں اپنا مقام پیدا کر

کسی وزیر کی لڑکی جو ہم سبق ہے تری
تو اس سے راہ و سلام و پیام پیدا کر

جہاں سے جا نہ سکے گر پڑے ہوسٹل کے بیچ
بلند اور بلند ایسا بام پیدا کر

ترے طمانچے سے لڑکے بھی ماسٹر بھی ڈریں
اسمبلی کے الیکشن میں نام پیدا کر

یقیں ہو جیسے ہی اب وارڈن نہ آئے گا
پسِ کتب سے تو مینا و جام پیدا کر

بہ شغلِ ویڈیو، راتوں کو جاگ دن کو سو
نئی صدی میں نئے صبح و شام پیدا کر

چرس میں ڈال لے تھوڑا سا آبِ ہیروئن
چلم کے واسطے تازہ قوام پیدا کر

خمار گر نہ ملے، گرد میں نیلا تھوتھا گھول
کشید کر کے مے نیلی فام پیدا کر

(اپریل ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر گیان چند (لکھنؤ)

دوغزلہ

آپ حضرات جسے علم کا گھر کہتے ہیں
ہم خطا کار اسے چاند نگر کہتے ہیں

گھور کر دیکھتے ہیں میرے قبیلے کی طرف
رات دن جو متعلم مجھے سر کہتے ہیں

طالبِ فلم کو اب کہنے لگے طالبِ علم
بے زباں شخص کو سب لیکچرر کہتے ہیں

نقل کر کے طلب فرسٹ ڈویژن لائے
ہم اسے اپنی ریاضت کا ثمر کہتے ہیں

میری آنکھوں میں سدا دھول ہی جھونکی اس نے
اہلِ ارشاد جسے نورِ نظر کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ مادر سے محقق صاحب
دیجیے کچھ سندِ نامِ پدر کہتے ہیں

ہائے رے شوقِ پی ایچ ڈی کہ ہمارے نگراں
ڈھونڈ کر لائیے چہ سیر تسکر کہتے ہیں

کرلی اک بیر نے تسخیرِ قمر کہتے ہیں
اے ارسطو ہم اسے قوتِ زر کہتے ہیں

روس و امریکہ نے چھوڑے تھے جو دو سیارے
اہلِ تنجیم انھیں شمس و قمر کہتے ہیں

میں نے اک عین دیا دی تھی کسی مصرعہ میں
چھڑ گیا "قصہ رجلیت و شرر" کہتے ہیں

شاہ حاتم نے جو باندھے تھے نرالے مضموں
ہم وہی بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں

شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے محمد فاضل
میر و غالب سے کٹھن اشعار مگر کہتے ہیں

شرح بھی ساتھ میں چھپوایا کریں بندہ نواز
آپ الجبرا نے کے اشعار اگر کہتے ہیں

آئیے سرخ مثلث کو کریں سرخ سلام
مارکس کی دین ہے یہ برگِ شرر کہتے ہیں

ماچس لکھنوی

مثل گکڑی کے بڑھو گے مجھے معلوم نہ تھا....

بے وفائی پہ تُلو گے مجھے معلوم نہ تھا
نام سے میرے چڑھو گے مجھے معلوم نہ تھا
گالیاں کوستے دو گے مجھے معلوم نہ تھا
یوں مری قدر کرو گے مجھے معلوم نہ تھا

کیا کہوں میں نے محبت کی جہالت کیوں کی
کیا کہوں طرزِ تغافل کی شکایت کیوں کی
کیا کہوں عرضِ تمنا کی حماقت کیوں کی
یہ سوالات کرو گے مجھے معلوم نہ تھا

بات ہے کل کی کہ پہنے ہوئے چھوٹی سی فراک
پونچھ دیتے تھیں کھلائی جو ٹپک پڑتی تھی ناک
آج یہ ڈیل یہ ڈول اور یہ لمبی ناک
مثل گکڑی کے بڑھو گے مجھے معلوم نہ تھا

یاد ہے یاد ہے بچپن کا وہ عالم کہ نہیں
نت نئے کھیل ہوا کرتے تھے باہم کہ نہیں
چھوکھوں تختوں پہ رہتی تھی دھما دھم کہ نہیں
بڑھ کے اس طرح کھنچو گے مجھے معلوم نہ تھا

ایک ہی مولوی صاحب سے پڑھا کرتے تھے
ایک سے ایک شرارت میں بڑھا کرتے تھے
کھیلتے کودتے کوٹھے پہ چڑھا کرتے تھے
بات بھی اب نہ کرو گے مجھے معلوم نہ تھا

گھر سے پیسے بھی چرا کر تمھیں دے جاتا تھا
بے تمھارے نہ کوئی چیز کبھی کھاتا تھا
تم جو روتے تھے میں ساتھ میں رلواتا تھا
میرے رونے پہ ہنسو گے مجھے معلوم نہ تھا

راہ پر لگ کے بھی ہتھے سے اکھڑ جاؤ گے
گرمیِ عشق کے موسم میں اکڑ جاؤ گے
اس طرح منزلِ انکار پہ اڑ جاؤ گے
ایک قدم بھی نہ بڑھو گے مجھے معلوم نہ تھا

حسن اور عشق میں رہتے ہیں ازل سے جھگڑے
ہاں مگر تم سے فسادی کبھی دیکھے نہ سنے
مار خالی بھی دیے ہاتھ کبھی جھاڑ دیئے
اس طرح جم کے لڑو گے، مجھے معلوم نہ تھا

تھی خوشی اس کی کہ تم میرے بنو گے محسن
بیٹھ کے ہاتھ سے خود اپنے سیو گے اک دن
اسی امید پہ پھاڑا تھا گریباں، لیکن
سوئی تاگا بھی نہ دو گے مجھے معلوم نہ تھا

مختصر یہ ہے کہ جس کی کوئی امید نہ تھی
وہی آنکھوں سے مقدر نے دکھائی تھی گھڑی
آخری وقت بھی تم بیٹھ کے بالیں پہ مری
مکھیاں تک نہ جھلو گے مجھے معلوم نہ تھا

تم کہاں ہو یہ میں کیا کرتا ہوں تم سے شکوا
ہائے مجھ کو تو جدائی نے سڑی کر ڈالا
یہ خبر ہوتی تو واللہ میں پہلے مرتا!
مجھ سے تم پہلے مرو گے مجھے معلوم نہ تھا

(جولائی ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر مجید بیدار (حیدرآباد)

سنبھل جا

شرافت کی حد سے نکل جا نکل جا
جو مل جائے دولت بدل جا بدل جا
اگر تجھ کو بننا ہے جنتا کا لیڈر
تو کر پورے وعدے سنبھل جا سنبھل جا
ہو جا شی تو رشوت پہ غصہ دکھانا
ملے گرچہ رشوت بہل جا بہل جا
ملے گرچہ موقع تو کرسی کی خاطر
بڑے لیڈروں کو نگل جا نگل جا
فسادوں کی ترغیب جاری رہے پر
قیام امن پہ مچل جا مچل جا
غریبی ہٹاؤ کا نعرہ لگا کر
غریبوں کے ارماں کچل جا کچل جا
اگر لیڈری کو جگانا ہے مقصد
صحافت کو لے کر اچھل جا اچھل جا

(مئی ۱۹۹۳ء)

غزلیں

وہ اس کا فعولن بھتیجا فعولن
کیا کیا فعولن، تماشا فعولن
دیا اس فعولن نے دھکا فعولن
لگا دل فعولن کو جھٹکا فعولن
بشارت فعولن، ملی تھی فعولن
کہ تائی فعولن نے تاکا فعولن
چھنا چھن فعولن چھما چھٹ فعولن
تماسر فعولن، بجے گا فعولن
حکیموں فعولن، کی کوشش فعولن
کہ نکلا فعولن، جنازہ فعولن
پری خا فعولن، نہ دل ہے فعولن
سناتے فعولن، ہیں بیگم فعولن
نے مارا فعولن، ہے چانٹا فعولن

ہوئی گھر میں ارتھی فعولن فعولن
دلہا ہو کر دلہن فعولن فعولن
نوازش سے بیگم کی حالت ہوئی یہ
پٹے سارے برتن فعولن فعولن
سکوں گھر کے کاموں سے بیوی کو دینے
وہ لائے ہیں سوکن فعولن فعولن
چمکا چمک ہوئی روشنی کیمرے کی
پہ لیڈر کے درشن فعولن فعولن
وہ اسٹیج پر آ کے بھرّایا ایسے
کہ دے جیسے بھاشن فعولن فعولن
اگر اس کو اتنا کری نہ ملے تو
وہ کھائے گا کھرچن فعولن فعولن
بھکاری ہے روٹی طلب کر کے دیکھو
منگائے گا سالن فعولن فعولن

(دسمبر ۱۹۹۰ء)

پانی

دیکھتے دیکھتے یوں ہو گیا عنقا پانی
ہے دکھانے لگا کربل کا نظارا پانی

جھوم کر ابر اٹھا پھر بھی نہ برسا پانی
ہم گنہگاروں سے شاید کہ ہے روٹھا پانی

پانی مانگا جو پڑوسی سے تو جل کر بولا
میں یزیدی ہوں، کسی کو نہیں دوں گا پانی

خوب نیتا نے کہا جب نہیں ملتا پانی
ناریل کا میں پیا کرتا ہوں ٹھنڈا پانی

اک صراحی بھی لبالب نہ بھری لعنت ہے
نل سے دو بوند ہی بس نام کو ٹپکا پانی

ہائے پانی کی یہ قلت کہ کھڑی دعوت میں
ہم نے چمچوں کو دیا ایک ہی چمچہ پانی

اب عدو کوئی ہمارا ہے نہ کوئی رقیب
اٹھ گیا ان کا جہاں سے نہ ہو دانا پانی

قلتِ آب کا پبلک نے جو رونا رویا
ہنس کے نیتا نے کہا چھوڑ دیں پینا پانی

ایک بوند کو اس سال بھی ترسے گاؤں
جم کے برسا بھی تو شہروں میں ہی برسا پانی

آپ کا گاؤں نہیں ہے یہ ذرا دھیان رہے
شہر بمبئی ہے یہاں بکتا ہے بھیا پانی

کون ان لوگوں کے دکھ درد کو سمجھے ہے یہاں
جن کو ملتا نہیں پینے کا مصفا پانی

کرکے وعدہ جو مکر جاتا ہے اس لیڈر کو
کیوں نہ کوسے ہے پی پی کے یہ جنتا پانی

خون مل جاتا ہے سڑکوں پہ کنویں خالی ہیں
لیجیے خون سے بھی ہو گیا مہنگا پانی

بات گھبرا کے پڑوسی نے لجاجت سے کہا
قرض حسنہ سہی دے دیجیے تھوڑا پانی

دیش ہے یوں بھی تباہی کے دہانے پہ کھڑا
حال کیا ہوگا جو اس بار نہ برسا پانی

آپ کس کھیت کی مولی ہیں جناب محبوب
اچھے اچھوں کو میاں ہم نے پلایا پانی

(۲ جون ۱۹۹۲ء)

نیتا

بھاشن ہو اگر دینا تو تیار ہے نیتا
"جو کام پہ جانا ہو تو بیمار ہے نیتا"

لگتا ہے کہ ہے جاہلِ مطلق وہ سراسر
الٹا جو لیے ہاتھ میں اخبار ہے نیتا

کیا قوم کی بربادی کا احساس ہے اس کو
کیا دیش کی حالت سے خبردار ہے نیتا

بس وعدے ہی وعدے ہیں دلاسے ہی دلاسے
لگتا ہے فقط غازیِ گفتار ہے نیتا

گھپلا ہو تو کر بیٹھے کروڑوں کی رقم کا
میدانِ سیاست میں وہ بنیے کا ہے نیتا

پھر جا کے پانچ برس بعد مرے گاؤں ہے آیا
پھر دیکھیے ووٹوں کا طلب گار ہے نیتا

بچے کی طرح کیوں نہ رہیں ساتھ میں اس کے
بچپن کا پرانا جو مرا یار ہے نیتا!

کرسی صدارت کی، قلم دانِ وزارت
اس کے لیے لڑ مرنے کو تیار ہے نیتا

(۶ جنوری ۱۹۸۷ء)

مختار یوسفی (مالیگاؤں)

ضرورت رشتہ

میرے سالے کا کئی شہروں میں کاروبار ہے
خوبصورت خوش مزاج اور کام میں ہشیار ہے

تین بھائی پانچ بہنیں' والدین اور بھابیاں
ساتھ ہی رہتے ہیں اس کی ساری بہنوں کے میاں

ہے سیاست میں بھی اس کی ایک اچھی مارکیٹ
ہر الیکشن میں کھڑا کرتا ہے اپنا کینڈیڈیٹ

گاہے گاہے وہ خلیجی ملک کا کرتا ہے ٹور
ٹیپ، وی سی آر، ٹی وی لے کے آتا ہے ضرور

اک جوا خانے کا مالک ہے کماتا خوب ہے
افیون اور شراب کا بیوپار بھی محبوب ہے

گیت اور سنگیت کا بھی اس کو بے حد ذوق ہے
ناچ نوٹنکی کا رسیا اور رمی کا شوق ہے

دھر لیا جاتا ہے جب بھی وہ کسی کے خون میں
جھٹ سے پاتا ہے رہائی ایک ٹیلی فون میں

ہے شریف النفس بھی وہ اور اپٹوڈیٹ بھی
کالے دھندوں کا ہے اک خاصا بڑا اسٹیٹ بھی

اس کی نسبت کے لیے نوخیز لڑکی چاہیے
نیک سیرت خوب صورت صاف ستھری چاہیے

فاقہ کرکے رات دن جو خوش ہمیشہ رہ سکے
ظلم گھر والے کریں بھی تو خوشی سے سہہ سکے

یہ شرائط ہوں اگر منظور تو دے کر جواب
وہ بنائے زندگی کو خوش گوار و کامیاب

ریل کے سترہ ٹکٹ بھی ساتھ خط کے بھیج دے
اور سب کی میزبانی کا شرف حاصل کرے

سارے اہل خانہ لڑکی دیکھنے کو آئیں گے
تین دن تک غور کرکے فیصلہ فرمائیں گے

اپنا مستقبل بنانے کا جو ہو اس کو خیال!
وقت کم ہے دیدے منظوری بجائے قیل و قال!

○

کسی صاحب کو چسکا لگ گیا تھا شعر گوئی کا
انھوں نے سوچ کر اپنا تخلص رکھ لیا ابّا
ہوئے مشہور پبلک میں مگر مشکل یہ آ پہنچی
انھیں کہتی ہیں سب کے ساتھ ان کی اہلیہ ابّا

—

میری بیوی غائب ہے پچھلے جمعہ سے
خبر اس کے ملنے کی جو کوئی دے گا
قسم کھا کے کہتا ہوں میں اپنے رب کی
اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا

غزلیں

مصطفیٰ علی بیگ
(حیدرآباد)

ہم پہ ہے مہربان ونڈر فل
اُن کا ہر پاسبان ونڈر فل

لائٹ کا کیوں بریک ڈاون نہیں
وہ ہیں جب میہمان ونڈر فل

بڑھ گئی ہے سچ ہے اس زمانے میں
جھوٹی ہر داستان ونڈر فل

ڈیلی گارڈن میں دیکھنے ان کو
ہم بنے باغبان ونڈر فل

جان تجھ میں نہ ہو تو غم مت کر
ڈال شعروں میں جان ونڈر فل

کتنے معصوم ہیں جلا کے کہیں
جل گیا آشیان ونڈر فل

(اپریل ۱۹۷۵ء)

★

محبت میں اگر پیدا ہو ٹینشن
تو اکثر ٹوٹ جاتا ہے کنکشن

کریں جب آپ اپنی اگزبیشن
ہمیں بھی دیجئے گا اِنویٹیشن

گدھا کہہ لیجئے آئی ڈونٹ مائنڈ اِٹ
مگر ظاہر نہ ہو اپنا ریلیشن

کرپشن کرنے والے کررہے ہیں
برائے نام ہے اینٹی کرپشن

سگِ لیلیٰ کی شہرت تو بہت ہے
مگر وہ ہاونڈ تھا یا آل سیشن

ہے لیڈر کو فقط دولت کی چاہت
کہاں کی کنٹری اور کیسی نیشن

کھلے جاتے ہیں وعدوں کے فلاور
چلی آتی ہے پھر فصل الیکشن

اِدھر ہے لَوْ مرا آتش فشانی
اُدھر جذبات کا ریفریجریشن

تباہی اور پریشانی ، پاورٹی
ہمیں لَوْ میں ملا ہے یہ ڈونیشن

بلیک ہسبنڈ ہے اور وائف گوری
یہ اینگلو اردو کا ہے کومبنیشن

بھلا کیا پرنٹ ہو اردو زباں کا
کہ الیوری ورڈ ہیز این انسپریشن

(دسمبر ۱۹۷۸ء)

قطعہ DEMANDS

مجھ کو ڈوری میں فریج اور ڈنر سٹ دیدو : DOWRY
ساتھ بنگلے کے سوا لاکھ روپے نٹ دیدو
آپ دلوائیں گے بے شک نئی اکوڑ بھی
وُوڈ بی پیا مجھے ایڈوانس میں پلٹ دیدو WOULD BE

(نومبر ۱۹۸۶ء)

غزلیں

مصطفٰی علی بیگ

دردِ دل کی ہر دوا کرفیو میں ہے
آج کل دارالشفا کرفیو میں ہے

احتجاجاً پھول اب کھلتے نہیں
کیوں کہ اب بادِ صبا کرفیو میں ہے

اک ہیلی کا پٹر مجھے دیدے خدا
ان کے گھر کا راستہ کرفیو میں ہے

ہنس رہا ہوں میں سیاست کی ہنسی
میرے دل کا قہقہہ کرفیو میں ہے

اب رقیبوں سے مجھے خدشہ نہیں
کیوں کہ میری دِلربا کرفیو میں ہے

شور ہے چمگادڑوں کا رات بھر
صبح کوئل کی صدا کرفیو میں ہے

مِل رہی ہے سب کو اک جیسی سزا
جیل سے جو بچ گیا کرفیو میں ہے

ہیڈ پہ اُن کے ٹائیٹ جوڑا ہیں لگے
جیسے اک کالی گھٹا کرفیو میں ہے

دار پہ خنجر کے پابندی نہیں
ہاں مگر دستِ دُعا کرفیو میں ہے

اُس صنم کا ساتھ اور یادِ خدا
دونوں عالم کا مزا کرفیو میں ہے

اِس لیے ٹینشن میں ہے میری غزل
شعر کا ہر قافیہ کرفیو میں ہے

(جنوری ۱۹۹۱)

★

کنٹی نیوس رُلا گیا پانی CONTINUOUS
سب کو آنسو پلا گیا پانی

نل سے ٹپکا نہ ڈراپ واٹر کا DROP
ساری بستی بہا گیا پانی

لیڈروں کا یہ بن گیا ٹاپک TOPIC
اب سیاست پہ چھا گیا پانی

پانی بھرتے ہیں ڈیلی اُن کے گھر DAILY
دال اپنی گلا گیا پانی

ہو کے سیلاب بھوکی بستی کو
صرف پانی پلا گیا پانی

میرے پیاسے اِمام کے صدقے
اہمیت کتنی پا گیا پانی

گھر مرا جل کے راکھ راکھ ہوا
راکھ کو پھر بہا گیا پانی

خون پی پی کے پیاسی پبلک کا PUBLIC
منہ پہ لیڈر کے آگیا پانی

بھاری بھرکم وجود کا اُن کا
ریزہ ریزہ بہا گیا پانی

وَنس اِن اے ویک نیوز سُنتے ہیں ONCE IN A WEEK
آج پھر نل میں آگیا پانی

عاشقوں کا ہجوم ہے نل پر
دل کی دُنیا بسا گیا پانی

(دسمبر ۱۹۹۰)

مصطفیٰ علی بیگ

غزلیں

وہ بے وفا تھے راہ کی TURNING میں رہ گئے ہم تو اکیلے LIFE کی BURNING میں رہ گئے
خالہ تو TIGHT گرل ہیں رمضان کی عید میں افسوس اب کے خالو ہی PENDING میں رہ گئے
یاں کام نکلا کرتے ہیں سب BACK ڈور سے دیوانے MAIN ڈور کی WATCHING میں رہ گئے
شادی کے بعد وہ کئی بچوں کی ہوئیں MOTHER غافل تھے ہم جو عشق کی LEARNING میں رہ گئے
سب کی ٹرینِ عشق تو منزل پہونچ گئی ہم انتظارِ یار کی SHUNTING میں رہ گئے

○

اُن سے اسٹاپ وار ویری گڈ روز آئے بہار ویری گڈ
چغلیاں شیخ نے اتنی کھائیں آئی کھٹی ڈکار ویری گڈ
اپنے نزلے کا یہ ری ایکشن ہے اُن کو بھی ہے بخار ویری گڈ
عشق میں کیش کی ضرورت ہے نہیں چلتا اُدھار ویری گڈ
زخم کچھ مندمل ہوئے ہی تھے آئی فصلِ بہار ویری گڈ

○

ساون کی یہ گھٹائیں اللہ پلیز نکّو یہ ہارٹ کی وبائیں اللہ پلیز نکّو
رستے پہ اُن کو لائیں اللہ پلیز نکّو ہم خود بھٹک نہ جائیں اللہ پلیز نکّو
ہے واچ مین گھر پہ، خونخوار ایک کتا کیوں ان سے ملنے جائیں اللہ پلیز نکّو
قسمت سے اُن کا بھائی ہے ہیوی ویٹ چیمپئن لَو کس طرح جلائیں اللہ پلیز نکّو
میرے رقیب کو وہ اپنا کزن بتا کر یوں انٹروڈیوس کرائیں اللہ پلیز نکّو
وِگ سر سے گر نہ جائے، چندیا چمک نہ جائے گنجے کو کیوں ستائیں اللہ پلیز نکّو
ہے شیخ کی ضعیفی اُس پر یہ شوق اُن کے طاقت کی یہ دوائیں اللہ پلیز نکّو

رہبر میں راہزن میں، ہے فرق کرنا مشکل
اب کس کے ساتھ جائیں اللہ پلیز نکّو

INTRODUCE ۱ WIG ۲ COUSIN ۳ LOVE ۴ WATCHMAN ۵ HEART ۶

مظفر مجاز (حیدرآباد)

کہہ مکرنیاں

(تتبع حضرت امیر خسروؒ)

تن من میں اک آگ لگا دے
آنکھیں، گال، بدن دہکا دے
ڈھیلے کردے انجر پنجر
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی فیور!

o

جیون کے سب بھید وہ کھولے
بستر میں بھی ساتھ وہ ہو لے
ہاتھ نہ چھوڑے نیند آنے تک
اے سکھی ساجن؟
نا [illegible] پیسٹک!

o

گال چومے، پیشانی چومے
لپٹا لپٹا ساتھ ہی گھومے
ساتھ نہ چھوڑے اک پل اک تل
اے سکھی ساجن
نا سکھی آنچل

o

خسب بھر جلے اور جگائے
کانوں میں کچھ کہتا جائے
سونے دے پل بھر کو نہ شب بھر
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی مچھر!

o

پہنچا پکڑے، ہاتھ مروڑے
پکڑے ہاتھ تو ہاتھ نہ چھوڑے
دکھ دکھ جائے کلائی پاپن
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی کنگن!

(ستمبر ۱۹۸۲ء)

●

ناگ پھنیوں کی مچی دھوم! چنا جور گرم
بیٹھتی جاتی ہیں آوازیں کہ سناؤں کیسے
غالب و میر و یگانہ و انیس و اقبال
گل ہوئے باغ سے معدوم! چنا جور گرم
مچ گئی چار طرف دھوم چنا جور گرم
جیتے جی ہو گئے مرحوم! چنا جور گرم

(۱۹۸۹ء)

حکیم لقمان کی نصیحت

(اپنے شاعر فرزند کے نام)

مضطر مجاز

ملے تجھے نہ ملے سر، کلاہ پیدا کر
کتاب بعد میں لکھ، پہلے رسمِ اجرا کر

غزل کہے گا بھلا کیسے قافیے کے بغیر
لغت سے ڈھونڈ کے کچھ قافیے اکٹھا کر

پری کو شعر کی پھر قافیے کے شیشے میں
اتار اور ردیفوں کو چھوڑ چپکا کر

بنا صنائع بدائع کا اک طلسم کدہ
کہیں سے ڈھونڈ کے تشبیہیں نت مہیا کر

بڑا سہارا ہے تیرا ضلع جگت بیٹا
اسی سے شعر کے جن کو جکڑ کے رکھا کر

پکڑ کے لفظوں کو کٹھ پتلیوں کا ناچ دکھا
سخن کی ڈور پہ نٹ کا کوئی تماشا کر

پھر اس کے بعد ترنم کے زور پر چھا جا
ہلا کے رکھ دے زمیں آسماں کو چلا کر

ہے بنتا کچھ تو چوکڑی مار بن تخیل کا
ستارے توڑ کے لا آسماں پہ جا کر

زمیں پہ گھاس ہے، کیڑے ہیں سانپ بچھو ہیں
زمیں پہ چلنے سے پرہیز سخت بیٹا کر

اگرچہ بحر میں تو شعر پڑھ نہیں سکتا
مگر رسالوں میں شعر اپنے چھوڑ چھپوا کر

ہر ایک شعر میں بھر ریت دھوپ یہ سراب
یہ شاعری کے لوازم ہیں، ان کو پورا کر

سفر سرابوں کا تیرے لیے ضروری ہے
ملے نہ ریت تو پھر تو جیئے گا کیا کھا کر

پھر اس کے بعد مدیروں کی جوتیاں بھی اٹھا
اور اپنے پیٹ کو بھر ان سے گالیاں کھا کر

تب اپنے وقت کا ٹھہرے گا میر و غالب تو
فراق و فیض تو اور افتخار جالب تو!

یہ کیا ضرور کہ سب ٹھیک ٹھیک شعر کہو
مشاعروں کے لیے کچھ رکیک شعر کہو

رسالے، ریڈیو، ٹی وی سبھی سے پینگ بڑھاؤ
ہر اک سے رکھ کے علیک و سلیک شعر کہو

ہمیشہ کرتے رہو فکر و فن کی ناک میں دم
ادب کو جب تلک آئے نہ چھینک شعر کہو

اگر یہ وقت تمھیں ڈسٹ بن میں پھینکے گا
سمجھ کے خود کو مگر والمیک شعر کہو

علاج زہر کا ہوتا ہے زہر سے بھی کبھی
کہ شعر سے جو کبھی آئے ہیک شعر کہو

لکھو کہانیاں LATIN میں تاکہ سمجھے نہ کوئی
اسی طرح بہ زبان گریک شعر کہو

تمھارا شعر ہے یا کاسۂ گدائی ہے
ہر اک سے داد کی مانگو نہ بھیک شعر کہو

(جنوری ۱۹۸۹ء)

مفلس فاروقی (ابن شاکی)

شوہر مبارک (پہلا رخ)

نئے کپڑے، نئے برتن، نئے زیور مبارک نئی میزیں، نیا صوفہ، نیا بستر مبارک
خسر اور ساس، نندیں، جیٹھ اور دیور مبارک نئے رشتے، نیا آنگن نیا اک گھر مبارک
اری وہ جو ہے اس بازی کا بازی گر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

مری بنّو، مری پیاری سہیلی، میری مونا مزے سے بیٹھ کر باتوں کی تو مالا پرونا
ترا شوہر ترے ہاتھوں میں ہوگا اک کھلونا تو بارِ خانہ داری اس کے سر پہ رکھ کے سونا
تجھے ہر بار برداری کا یہ خچر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

نصیحت پر خسر کے کان تو ہرگز نہ دھرنا نہ دینا ساس سے اپنی نہ تو نندوں سے ڈرنا
کبھی پرواہ اپنے جیٹھ، دیور کی نہ کرنا اداؤں سے تو اپنی دل میں ساجن کے اترنا
ترے دل کے لیے اے دلربا دلبر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

نظر رکھنا ہر اک پہلی کو تو ہر ماہ اس کی مسلسل دیکھنا اس روز گھر میں راہ اس کی
بڑھانا خوب دل میں پیار اس کا چاہ اس کی کہ گھر آئے نہ جب تک سب کی سب تنخواہ اس کی
کھلے جو خود بخود ایسا تجھے لاکر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

رہے مدہوش جو آٹھوں پہر چاہت میں تیری جو تڑپے ماہیِ بے آب سا فرقت میں تیری
نظر آئیں جسے دونوں جہاں صورت میں تیری رہے مصروف جو شام و سحر خدمت میں تیری
بعنوانِ دگر اک باوفا نوکر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

تو اپنے روپ کا اس پر سدا جادو چلانا کبھی بھولے سے جھانسے میں نہ ہرگز اس کے آنا
وہ بدھو ہے اسے تو اور بھی بدھو بنانا تو اپنی انگلیوں پر ہر گھڑی اس کو نچانا
مری پیاری مدارن تجھ کو یہ بندر مبارک
مبارک میری ہمجولی تجھے شوہر مبارک

کبھی پھٹکار کو تیری نہ جو پھٹکار سمجھے — تمہارے نفرت بھرے برتاؤ کو جو پیار سمجھے
ترے انکار کو بھی جو ترا اقرار سمجھے — تری خود غرضیوں کو جو ترا ایثار سمجھے
تجھے احساس کی دہلیز کا پتھر مبارک
مبارک میری بھولی تجھے شوہر مبارک
صبح ہو شام ہو یا رات ہو یا دوپہر ہو — ہر اک پل نت نئی تقریر میں تیری بسر ہو
تری حرکات کی مطلق نہ کچھ اس کو خبر ہو — ترا ہر عیب بھی اس کی نگاہوں میں ہنر ہو
فدا ہو جان و مال و زر سے جو تجھ پر مبارک
مبارک میری بھولی تجھے شوہر مبارک ہو (اکتوبر ۱۹۸۱ء)

شادی مبارک (دوسرا رخ)

مبارک ہو تجھے گھوڑے پہ چڑھنا — مبارک عقد کے دو بول پڑھنا
مبارک درد کی منزل پہ بڑھنا — مبارک کرب کی سولی پہ چڑھنا
تری نیندوں کی بربادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
خدا رکھے تری بانکی جوانی — نیا اب موڑ لیتی ہے کہانی
پلائے گی تجھے دن رات پانی — کرے گی اب جو تجھ پر حکمرانی
تجھے اک ایسی شہزادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
نواسوں کو مبارک تیری نانی — مبارک بھانجوں کو اک ممانی
بہن اور بھائیوں کو بھابی جانی — بھتیجوں کے لیے چچی سہانی
ترے پوتوں کو ہو دادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک
اکڑ تیری نہ اب ہرگز چلے گی — نہ کوئی بات بیگم کی ٹلے گی
نہ گھر میں دال اب تیری گلے گی — تری ہر شام رو رو کر ڈھلے گی
تجھے ہر صبح فریادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

(سلسلہ ص۱۵۱)

تو اب فرمائشوں سے تنگ ہو گا — دکھوں سے زرد تیرا رنگ ہو گا
جو تجھ کو دیکھ لے گا دنگ ہو گا — جواب ہے وہ نہ تیرا ڈھنگ ہو گا
گیبرڈین کی جگہ کھادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

کہاں پہلی سی اب وہ تیز گامی — کہاں ہو گا یہ طرزِ خوش کلامی
بنے گا ہر بشر اب تیرا حامی — مبارک ساس کی تجھ کو غلامی
خسر کی تجھ کو دامادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

بہن اور بھائی اور ماں باپ چھوٹے — جو رشتے تھے پرانے سب وہ ٹوٹے
مقدر ہائے پیارے تیرے پھوٹے — تُو اب روئے کہ سینہ اپنا کوٹے
تجھے ہر لمحہ فریادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

بجیں گے خوب تیرے گھر میں بچے — ہر اک محراب، ہر اک در میں بچے
ہر اک صندوق، ہر بستر میں بچے — کبھی گھر میں کبھی دفتر میں بچے
مبارک ایسی آبادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

(اکتوبر ۱۹۸۱ء)

غزل

عاشقی میں کون اب پرفیکٹ ہے — پیار تو بس ایک بزنس ٹیکٹ ہے
باقی سب ہے آپشنل اپنے لیے — عشق اک کمپلسری سبجیکٹ ہے
ہم جو کہتے ہیں غلط ہے، رانگ ہے — آپ جو کہہ دیں ریل ہے فیکٹ ہے
شیخ کرتے ہیں پریمیسو بھی اٹنڈ — اور ساقی سے بھی ان کا پیکٹ ہے
ایک ٹریجڈی ڈرامہ ہے حیات — اور ٹیئرفل جس کا ہر اک ایکٹ ہے
وصل کی جب ہم نے کی اس سے ڈیمانڈ — کر گیا وہ ٹوٹلی ریجیکٹ ہے
میں کھٹولا کیوں مسند پہ تو کیوں ٹاٹ پر — یہ تو ڈیرا اپنا اپنا ٹیکٹ ہے
پرسنل لائف ہم اپنی کیا کہیں
ایک اک پل جس کا نو آبجیکٹ ہے

(جنوری ۱۹۷۸ء)

مقرب حسین مقرب

نیک مشورہ

حسینو! تمھیں مشورہ دے رہا ہوں
کہ تم شاعروں کی نہ باتوں میں آنا
یہ کرتے ہیں تعریف بے جا تمھاری
نہیں ان کی تعریف کا کچھ ٹھکانا
وہ کیا بات جو ہو حقیقت سے خالی
کہ تعریف بے جا سے بہتر ہے گالی

یہ شاعر ہیں تم ان سے بچ کر ہی رہنا
یہ جب چاہیں رائی کا پربت بنا دیں
یہ جب چاہیں قطرہ کو دریا بنا دیں
یہ جب چاہیں دریا کو قطرہ دکھا دیں
کبھی یہ ہمالہ کے اوپر کھڑے ہیں
کبھی پی کے بوتل گٹر میں پڑے ہیں

ہر اک فلسفہ شاعروں کا نرالا
نہیں جھوٹ اس میں کوئی ایک رتی
یہ کہتے ہیں مت اتنا دل کو جلاؤ
بھلا ان کا دل ہے کہ ہے موم بتی
کہ جب جی میں آیا تو فوراً جلا دی
جو دیکھا اجالا تو فوراً بجھا دی

یہ شاعر تمھیں رات دن پوجتے ہیں
بتاتے ہیں خود کو یہ عاشق تمھارے
یہ کہتے ہیں محبوب، گر ان سے کہہ دے
یہ آکاش سے توڑ لائیں گے تارے
نرے قابلِ رحم ہیں یہ بچارے
اداؤں کو سمجھے ہیں سلمہ ستارے

یہ شاعر ہیں ہاتھوں میں پیالے نہیں ہیں
تو پھر یہ لگا ہونٹوں کو پیتے ہیں کیسے؟
یہ لکھتے ہیں دل دے دیا ہے کسی کو
اگر دل نہیں ہے تو جیتے ہیں کیسے؟
یہ شاعر کا کرتب ہے کیسا نرالا
بغیر آپریشن کے دل کو نکالا

یہ شاعر ہیں ان کا بھروسہ نہیں ہے
خدا جانے کب کیا کرشمہ دکھائیں!
یہ دیکھا ہے گٹی سے بنتی ہیں سڑکیں
یہ کہتے ہیں ہم اپنی نظریں بچھائیں
یہ پوچھو کہ نظریں بچھائیں گے کیسے
پھر ان پر یہ ساجن چلائیں گے کیسے

کوئی کہہ رہا ہے نہ اتنا ستاؤ
کوئی کہہ رہا ہے کہ کب دید ہوگی
کسی کی یہ منطق ہے سب سے نرالی
کہ وہ چھت پہ آئیں گی جب عید ہوگی
اگر وہ محرم میں آئیں گی چھت پر
یہ سمجھیں گے روزوں نے باندھا ہے بستر

جہاں تم نے ہاتھوں میں مہندی لگائی
یہ کہہ دیں گے مٹھی میں دل ہے ہمارا
بھلا ان کا دل ہے کہ چڑیا کا انڈا
ذرا شاعروں سے تو بچو خدارا

(سلسلہ صفحہ ۱۴۲ پر)

یہ جب چاہیں زلفوں میں دل کو پھنسا دیں
یہ جب چاہیں پھر اس کا ملّا بنا دیں

جہاں تم نے آنکھوں میں کاجل لگایا
وہیں موت کا ان کی پیغام پہنچا
مگر اے حسینو، ذرا یہ بتانا!
کبھی کوئی دیکھا بھی ان کا جنازہ
یہ جو بات کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں
یہ ہیں ایسے عاشق جو مرتے نہیں ہیں

اگر زلف کھولوگی تم اے حسینو!
یہ کہہ دیں گے کالی گھٹا چھا رہی ہے
اگر زلف باندھی تو کہہ دیں گے شاعر
یہ ناگن ہے کاندھوں پہ بل کھا رہی ہے
ہر اک بات میں ہے حسینوں کی شامت
جو کھولیں تو آفت جو باندھیں تو آفت

مری بات کی تم بھی تصدیق کرنا
حسینو! جہاں تم نے اک پان کھایا
تو پوچھیں گے شاعر کہ جانِ تمنّا
یہ ہونٹوں پہ کس کا لہو ہے لگایا
یہ کیسا کرشمہ یہ ہے کیسا کرتب
ادھر پان کھایا ادھر مر گئے سب

اگر کوئی گالوں پہ تل ہو تمھارے
سمرقند دے دیں یہ دیدیں بخارا
مگر ان سے کوئی ذرا یہ تو پوچھے
سمرقند تھا بھائی کب سے تمھارا
تمھیں کس نے آخر بخارا دیا تھا
سمرقند تم نے کہاں سے لیا تھا

جہاں پھول زلفوں میں تم نے لگایا
یہ کہہ دیں گے دیکھو چمن جا رہا ہے
چمن جس کو کہتے ہیں رہتا ہے قائم
کہاں جا رہا ہے کہاں آ رہا ہے
ذرا شاعروں کی تو دیکھو بھلا تکبیر
کہ کیسے چمن کی لگا دی ہیں ٹانگیں

حسینو! مقرّب ہے خود مجھ کو حیرت
کہ شاعر کی بھی کیا عجب کھوپڑی ہے
اگر تم اٹھا کر جھکا دو گے نظریں
یہ کہہ دیں گے بجلی کوئی گر پڑی ہے
اگر نظرِ جاناں میں بجلی نہاں ہے
تو شاعر سے پوچھو، سوئچ پھر کہاں ہے

بہت اس نے ناپا تمھاری کمر کو
ذرا ناپ ان کی کمر کا تو پوچھو
یہ بوڑھے ہیں پھر بھی ہیں عاشق تمھارے
ذرا غور سے ان کی شکلیں تو دیکھو
جو سچ بات ہے یہ بتاتے نہیں ہیں
یہ شاعر ہیں ہفتوں نہاتے نہیں ہیں

کبھی بھول کر ان کے پالے نہ پڑنا!
تمھیں بور کر دیں گے، غزلیں کہیں گے
اگر تم کہوگی کہ آٹا نہیں ہے
بچارے یہ تارے ہی گنتے رہیں گے
خدا کے لیے اُن کی حامی نہ بھرنا
جو شاعر ہو تم اس سے شادی نہ کرنا

(مئی ۱۹۷۵ء)

•○•

نازش پرتاب گڑھی

آج کا مشاعرہ

کچھ ناز کچھ انداز کی حاجت ہے یہاں
ہلکے سے کسی ساز کی حاجت ہے یہاں
مہکی ہوئی غزلوں کو رکھو تہہ کر کے
لہکی ہوئی آواز کی حاجت ہے یہاں

کچھ اور بھی بل کھا کے ذرا لہراتا
پر رنگِ ادب اور بھی دل کو بھاتا
گا گا کے غزل سنا رہا ہے شاعر
سازندے بھی ہوتے تو مزا آجاتا

صرف ایک ہی شاعرہ بدل ہے سب کا
یہ فلتۂ حاضرہ بدل ہے سب کا
قوالی و مجرا ہو کہ نوٹنکی ہو
اک بزم مشاعرہ بدل ہے سب کا

بینائی یہاں جرم ہے اندھا بن جا
کیوں مرغ پچھی بنا ہے کوّا بن جا
چومے گی قدم دولت و شہرت بڑھ کر
تو بھی بھگلے باز غزل گا بن جا

ہر طرح خوشامد بھی ہے بیعانہ بھی
مرغا بھی ہے اور ساغر و پیمانہ بھی
جتنا ہی زیادہ ہے خوش آواز کوئی
اتنا ہی بڑا اس کا ہے نذرانہ بھی

پہچان سکیں کوئی گمک اور نہ تھاپ
پلّے میں نہ ہے تال نہ سر ہے نہ الاپ
پھر بزم سخن وراں میں آئے کیوں ہیں
پوچھے کوئی تو کس کھیت کی مولی ہیں آپ

کیوں بزم مشاعرہ میں آیا شاعر
یہ شامتِ اعمال کا مارا شاعر
بیٹھے ہیں گلے باز بڑے ٹھسے سے
اسٹیج پر اک سمت ہے چپکا شاعر

اک لمبے سفر کا تھکا ہارا شاعر
بے رحمیٔ فکر و فن کا مارا شاعر
دیکھے متشاعروں کے نخرے شب بھر
گوشے میں دبا ہوا بچارا شاعر

دانائی کے پردے میں حماقت دیکھی
ملبوس میں علم کے جہالت دیکھی
محفل میں سبھی تھے میرؔ و غالبؔ سے بڑے
ہم نے بھی اک احمقوں کی جنّت دیکھی

آواز تو کانوں میں ہے لب غائب ہے
حاصل تو ہے موجود سبب غائب ہے
محفل تو ہوئی نام ادب پر برپا
یہ بات الگ ہے کہ ادب غائب ہے

جو بزم سخن کو جانتے ہیں دنگل
کس ٹھاٹھ کے ساتھ الاپتے ہیں داخل
ہر سمت ہے بدمذاقیوں کا دلدل
اے عظمتِ شعر! اے محفل سے نکل

ناظر خیامی

مجھ کو افسوس نہیں تم جو برا کہتے ہو
میں نے مانا، میں شرابی ہوں، بجا کہتے ہو
لیکن اک بات ہے، اس کو بھی بتاتے جاؤ
خونِ انساں جو پیے تم اسے کیا کہتے ہو؟
(اگست ۱۹۷۹ء)

شاداب ادائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
مخمور فضائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
جوڑے کو ترے دیکھ کے آیا یہ خیال
ساون کی گھٹائیں بھی سمٹ سکتی ہیں

نہلا رہا تھا سردی میں بلی کو ایک شخص
میں نے کہا کہ سردی میں مر جائے گی یار
کہنے لگا کہ جاؤ کرو اپنا کام تم!
سُن کر یہ بات ہو گیا موٹر میں میں سوار
لوٹا جب اپنے کام سے تو دیکھتا ہوں کیا
بلی مری پڑی ہے، وہ بیٹھا ہے سوگوار
رُک کر کہا یہ میں نے کہ آخر کو مر گئی
سُن کر یہ بات بولا مرا ہو کے بے قرار
یہ ہے غلط کہ سردی سے بلی گزر گئی
میں نے اسے نچوڑ دیا، اس سے مر گئی
(مئی ۱۹۷۳ء)

اوروں کے لیے کچھ اور جی لوں تو چلوں
میں دامنِ صد چاک کو سی لوں تو چلوں
بس بس ملک الموت فقط اتنی دیر!
جو جام میں باقی ہے وہ پی لوں تو چلوں
(مئی ۱۹۷۳ء)

کیا گنہ گار پہ ہو سکتی نہیں ہے رحمت
کیا کبھی بر نہیں آسکتی ہے دل کی حسرت
جس کو تو چاہے گا وہ جائے گا بتلا ناصح!
کیا ترے باپ کی بنوائی ہوئی ہے جنت
(مئی ۱۹۷۳ء)

ہم کو شرابی کے مسلماں بنانے والے
جال میں حور کے رندوں کو پھنسانے والے
ہیں اگر ہم جو گنہ گار سزا دے گا خدا
تم بھلا کون ہو ٹانگ اپنی اڑانے والے
(مئی ۱۹۷۳ء)

صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجئے

ناظم انصاری (ناگپور)

کب یہ کہتا ہوں کہ کرسئ صدارت دیجے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجے

سینکڑوں میل کی دوری پہ ہے میرا گاؤں
چل کے آیا ہوں بمشکل یہاں پاؤں پاؤں
دھوپ ہی دھوپ تھی اب آنے دو تھوڑی چھاؤں
جیب خالی ہے مری پھر بھی نہ اجرت دیجے

صرف دو شعر...

ٹھیک سے ملتا نہیں وقت پہ کھانا پھر بھی
سر چھپانے کو نہیں کوئی ٹھکانا پھر بھی
قابلِ رحم ہے میرا یہاں آنا پھر بھی
بائی گاڈ آپ مجھے کوئی صلہ مت دیجے

صرف دو شعر...

اوپننگ چاہیں تو مجھ سے بھی کرا سکتے ہیں
شاعروں کے لئے ماحول بنا سکتے ہیں
مجھ سے شاعر کو بہ آسانی کھپا سکتے ہیں
بولڈ ہو جاؤں گا ناچیز کو زحمت دیجئے

صرف دو شعر...

فلمی دھن میں بھی غزل اپنی سنا سکتا ہوں
اور قوالی کے لہجے میں بھی گا سکتا ہوں
ایک ہی تان میں اس چھت کو اڑا سکتا ہوں
اس کلاکار کو اک موقع تو حضرت دیجئے

صرف دو شعر...

اے ڈی ویژن کے نظر آتے ہیں فنکار یہاں
ایک سے ایک سنائیں گے جو اشعار یہاں
کچھ تو کر دیجئے ناظم کا بھی پرچار یہاں
ہٹ ہو جاؤں گا اس کی نہ ضمانت دیجئے

صرف دو شعر...

غزلیں

میں حیران و بیکل وغیرہ وغیرہ
وہ شوخ اور چنچل وغیرہ وغیرہ

خدا جانے کیا مجھ کو سمجھے ہوئے ہیں
ترے باپ۔ انکل وغیرہ وغیرہ

شبِ ہجر اکثر مرے کام آئے
یہ مچھر یہ کھٹمل وغیرہ وغیرہ

رُخِ یار ہے آج کیسا سادہ سادہ
نہ مسّی نہ کاجل وغیرہ وغیرہ

کہاں شیخ صاحب دبا کر بغل میں
یہ ساغر یہ بوتل وغیرہ وغیرہ

وہ ہاتھی ہیں بھینسا اور جانے کیا کیا
میں کمزور و مریل وغیرہ وغیرہ

●

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں
کرنی جو ہوتی اُن سے تو کر لیتا کچھ نہ کچھ
اُن کے پتا سے بات ارے باپ کیا کروں
کھائی تھی میں نے جینے کی جن کے لئے قسم
وہ پا گئے وفات ارے باپ کیا کروں
بیٹھے ہیں کر کے وہ بھی مجھے جن پہ ناز تھا
ترکِ تعلقات ارے باپ کیا کروں
سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی کہ پھر
ہے اُن کا التفات ارے باپ کیا کروں
ناظم میں ان سے مل کے کشتی میں پڑ گیا
اک زنگیت وارداتِ ارے باپ کیا کروں

نذیر دہقانی

غزل

بیٹھے بیٹھے ظالم سے آنکھ لڑ گئی ناجی — ہور بی مصیبت میں جان پڑ گئی ناجی
خالی باتاں باتاں میں بات بڑھ گئی ناجی — بات بنتے آئی تھی یوں بگڑ گئی ناجی
لگ کو بیٹھو بولے تو اُٹھ کو کھڑ گئی ناجی — یوں مرے منانے پو ہور بگڑ گئی ناجی
ایک دم نظر رخ پو اس کے پڑ گئی ناجی — اب ہٹائے ہٹتے نیں وائچ گڑ گئی ناجی
وہ نقاب رخ پو کا اک ادا سے سرکایچ — روشنی چراغاں کی ماند پڑ گئی ناجی
ہنستے ہنستے محفل میں نام ان کا پوچھا تھا — آخر دھو کو اس دن سے پیچھے پڑ گئی ناجی
ایک وہ بھی عالم تھا یاداں دھو کو پیتی تھی — پیار سے بلایا تو سر پو چڑھ گئی ناجی
آخری وقت مجھے دیکھنے بلائی تھی — شگن کو پوچھے پوچھے لگ سانس اکھڑ گئی ناجی
ڈھیلے ڈھالے کپڑے تے ڈھنگ سلا کو پینی ہے — ہلو ہلو فیشن میں خود جکڑ گئی ناجی
روج روج کی شاپنگ روج روج کے جھگڑے — عاشقی میں دہقانی کھال اُدھڑ گئی ناجی

○

مارچ، اپریل ۹۲ء

میرے ہر شعر میں "ہو سکتا" ہے — گا کو پڑھنے سے عیب ڈھکتا ہے
نکتہ چیں میرے منہ کو تکتا ہے — بڑبڑاتا ہے، کیا کی بکتا ہے
اس کی حالت پو مسکرا دیتا ہوں
ایک تازہ غزل سنا دیتا ہوں
رات بھر محفلوں میں گاتا ہوں — گھر کو پیدل اکیلے جاتا ہوں
میں غزل گانے جب بھی کھڑا ہوتا ہوں — پھر تو جھنڈے کے سر کا گڑ جاتا ہوں

○

ڈاکٹر دل کا حال دیکھیا تو — سٹے پڑ گئے سوگال دیکھیا تو
اُلجھے رگاں کا جال دیکھیا تو — دھیمی ناڑی کی چال دیکھیا تو
اس کا خود ہارٹ فیل ہو جاتا ہے
ایک جادو کا کھیل ہو جاتا ہے

غزلیں

محمود نشتر
(حیدرآباد)

دید کو جن کی ہم ترستے ہیں
وہ گلی میں عدو کی بستے ہیں

درزی حجام ہو گئے مہنگے
بی اے ایم اے بہت ہی سستے ہیں

نقلی چہروں کا گرم ہے بازار
اصلی چہروں کو ہم ترستے ہیں

لوگ اڑنے لگے خلاؤں میں
پیر اپنے زمیں میں دھنستے ہیں

ان کے وعدوں کو کیا کہوں نشتر
دیکھیں یہ ابر کب برستے ہیں

(نومبر ۸۰ء)

★

وہ تیر لگے ہے نہ تو تلوار لگے ہے
اُس کی نگہِ شوخ تو بھرمار لگے ہے

اُس نے جو کیا پیر کو اتوار کا وعدہ
اُس روز سے ہر دن مجھے اتوار لگے ہے

گردن کو ہلانے کی ادا بھی ہے نرالی
اقرار لگے ہے نہ تو انکار لگے ہے

میکپ سے جو چہرہ نظر آیا تر و تازہ
حالات سے گرتی ہوئی دیوار لگے ہے

سب ہاتھ میں اُس کے ہے بنائے کہ بگاڑے
لیڈر تو مجھے قوم کا اوتار لگے ہے

کم بخت مری جیب سدا رہتی ہے خالی
شاپنگ کو ہر وقت وہ تیار لگے ہے

یکساں ہے مرے واسطے پستی کہ بلندی
پیتا ہوں تو سب کچھ مجھے ہموار لگے ہے

ظاہر میں ولی جو ہے وہ باطن میں ہے شیطان
ہر شخص یہاں مجھ کو اداکار لگے ہے

سمجھا تھا کبھی عشق کو میں وادیٔ کشمیر
اب تو وہ مجھے وادیٔ پُرخار لگے ہے

نشتر کوئی مشکل نہیں معشوق سے ملنا
ماماہی مگر بیچ کی دیوار لگے ہے

(جنوری ۸۲ء)

⊙

کچھ خرد کی جو سُن لیا ہوتا
حشر کیوں قیس کا بُرا ہوتا

نسل اپنی بڑھا لیا ہوتا
جو نہ فرہاد سر پھرا ہوتا

کوئی تجھ سا جو دوسرا ہوتا
میں ترے در پہ کیوں پڑا ہوتا

نفس کی بات میں اگر سُنتا
میرا گھر بھی بھرا بھرا ہوتا

فرق کیا بیئر اور گڑمبے میں
شیخ سے پوچھ ہی لیا ہوتا

ہم جو کر لیتے وقت پر شادی
آج اپنا بھی پوترا ہوتا

چمچہ گیری کا فن اگر آتا
آج نشتر تو کیا سے کیا ہوتا

(اگست ۸۰ء)

نظر برنی

جب پٹائی کی

اپنی بیوی نے جب پٹائی کی — رات بھر ہم نے پھر سینکائی کی
ان کو لڑکی ملی ہے اسمگلر تو — اب نہیں خیر پارسائی کی
چار گھنٹے میں وہ ہوئے تیار — اس پہ ہو گئی صفائی کی
لیڈروں کی چلم بھرو ہر دم — "بات اس میں ہے، بڑائی کی"
ہائے اس در سے ہم کو کچھ نہ ملا — "منتقل جس پہ جبہ سائی کی"
شادی ہوتے ہی ہو گیا معلوم — شکل ممکن نہیں رہائی کی
روز میکے نہ جا شریکِ حیات — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

وہ پولس میں ہوا ہے جب سے نظر
کوئی حد ہی نہیں کمائی کی

(جنوری ۱۹۷۲ء)

غالب / برنی

لیڈری کا مجھے خیال کہاں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں
میں ہوں فکرِ معاش میں غلطاں — "ذوقِ نظارۂ جمال کہاں"
مفلسی سے ہوا ہے یارانہ — شورِ سودا سے خط و خال کہاں
ہر گھڑی ہے خیال بچوں کا — "اب وہ رعنائیِ خیال کہاں"
پیس کر رکھ دیا زمانے نے — "دل میں طاقت جگر میں حال کہاں"
جب سے ہم نے رچائی ہے شادی — "وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں"
کوچۂ مہوشاں میں کیا جائیں — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جوتی چٹخاتے پھرتے ہیں اسدؔ
"وہ فراق اور وہ وصال کہاں"

(المورخ ۱۹۷۶ء)

○

میری رسوائی کا بہانہ ہوا — "ایک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا"
جھاڑ تا در پھونک سے شفا پائی — "دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا"
کھا کے رشوت بھی کہہ رہا ہے وہ — "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"
اب بٹھائیں گے کس جگہ ان کو — "آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا"
میسیٹ کہتا ہے باس کا چمچہ — "گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا"
بلس کے آگے ہی لیٹ جاتے تھے — "تھے [illegible] خنجر آزمانہ ہوا"

نیاز سواتی (پاکستان)

غزلیں

نہ سردی نہ ٹھنڈی ہواؤں نے مارا
اسے ڈاکٹروں کی دواؤں نے مارا

بھروسہ بہت جی پہ وہ کر رہا تھا
اسے ہاں انہی آشناؤں نے مارا

نہیں آتا بیگم کو کھانا پکانا
اسے ہوٹلوں کی غذاؤں نے مارا

ہمیں راس شہر کراچی نہ آیا
ٹریفک کی ہم کو صداؤں نے مارا

سکول ہم نے بھیجا تھا پڑھنے کو بچے
وہاں ٹیچروں کی سزاؤں نے مارا

بہت ناز تھا اس کو طاقت پہ لیکن
بڑے باز کو فاختاؤں نے مارا

انھیں فائدہ تو نہ ان سے ہوا کچھ
نیاز! ان کو چکنی غذاؤں نے مارا

مئی ۸۹ء

○

کھلے گا بعد میں تجھ پہ کہ شادی کا مزہ کیا ہے
ابھی تو ابتدا ہے تو ابھی سے سوچتا کیا ہے

پڑوسی کو پڑوسن ڈانٹتی ہے ایک ہفتے سے
نہ جانے شوہرِ مظلوم کی آخر خطا کیا ہے

معطل کر کے ایک ماتحت کو افسر نے فرمایا
میاں روتے ہو کیوں تم اس قدر آخر ہوا کیا ہے

زباں میں اس کی لکنت ہے اور ہم بھی اونچا سنتے ہیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ ہم سے بولتا کیا ہے

خدا مختار ہے مرضی ہے اس کی جس طرح چاہے
خدا بندے سے کیوں پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(اگست ۸۹ء)

○

مکاں اپنا جو تھا جوئے میں اس کو ہار بیٹھے ہیں
اور اب نقل مکانی کے لیے تیار بیٹھے ہیں

سمجھتے ہیں وہ ان کی راہ میں بے کار بیٹھے ہیں
ہم اپنے دل میں لے کر حسرتِ دیدار بیٹھے ہیں

کلرکی بھی اگر مل جائے ہم اس پر بھی راضی ہیں
ہم ایم اے پاس کر کے گھر میں اب بے کار بیٹھے ہیں

وہ یوں بزمِ سخن میں خامشی سے شعر سنتے ہیں
کہ جیسے منہ میں اپنے ڈال کر نسوار بیٹھے ہیں

سمجھتے ہیں ادھر ماں باپ پڑھتے ہیں سبق بچے
لگا کر وہ ادھر بیٹھک میں وی سی آر بیٹھے ہیں

نہیں آتی ہے ان کو پیش دقت کچھ بھی رشتے میں
جو سروس کے لیے جا کر سمندر پار بیٹھے ہیں

غلط سمجھے ہو جو سمجھے ہو، ہمسایوں کے بچے ہیں
ہمارے چار سو اپنے ہی برخوردار بیٹھے ہیں

اگست ۸۹ء

○

(سلسلہ ص ۱۴۸)

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

غزل اور کثرتِ اولاد

ایک ناقد نے دیا ہے شاعروں کو مشورہ
تاکہ اردو شاعری کی جان چھوٹے ضیق سے
بوجھ آبادی کا بڑھتا جا رہا ہے جس طرح
حد تو یہ ہے ایک املا بھی نہیں جس کا درست
کر چکا ہے اپنا مجموعہ مرتب آج وہ
ایسے مجموعوں کا بالآخر یہی ہوتا ہے حشر

کم سے کم دس سال تک توڑو غزل سے رابطہ
ہے مسلّط قوم کے اعصاب پر یہ کافرہ
یوں ہی گردش میں مسلسل ہیں ردیف و قافیہ
رات دن غزلوں پہ غزلیں لکھ رہا ہے مسخرہ
ختم جس نے کل کیا اردو کا پہلا قاعدہ
گھر میں بنیوں کے بنا کرتا ہے ان کا مقبرہ

اس لیے اے شاعرانِ تیز گام و بے لگام
اپنے ہاتھوں خود کرو غزلوں کی نس بندی کا کام

جس طرح ہے ناک میں دم صنعتِ اشعار سے
شاید اس تیزی سے راکٹ بھی نہ پہنچے چاند تک
ماہرِ تخلیق ہے ہر فرد اپنے ملک کا
ایک ہی راہِ عمل ہے جس پہ سب ہیں تیز گام
کوئی گھر ایسا نہیں جو مرغی خانے سے ہو کم
کیا کرے سائیس گھوڑے ہی اگر ہوں بے لگام
فیملی منصوبہ بندی پر عمل جب تک نہ ہو

ذہن خائف ہے یونہی بچوں کی پیداوار سے
بڑھ رہی ہے خلقتِ اولاد جس رفتار سے
منسلک ہے نسل سازی کا جو کاروبار سے
کوئی پیدل چل رہا ہے کوئی موٹر کار سے
روح کیوں لرزے نہ پیدائش کے اس آزار سے
کنبہ بندی کی توقع صرف کیوں سرکار سے؟
قوم کی کشتی نکل سکتی نہیں منجدھار سے

کثرتِ اولاد ہو، یا ہو غزل کا انتشار
قوم کے حق میں ہیں یہ دونوں ہی میعادی بخار

(فروری ۱۹۸۱ء)

(سلسلہ ص ۱۵۱)

رضا نقوی واہی

لے دہی

سرکار کی عنایت و بخشش سے جب بنی
یوپی میں ... اور بہار میں اردو اکادمی

روزِ ازل سے قسمتِ شاعر جو بند تھی
اک زوردار جھٹکے سے فی الفور کھل گئی

استاد و بندی و عطائی و تک فروش
اکثر کو بہرِ طبع و اشاعت رقم ملی

چالاک ان میں جو تھے رقم ہضم کر گئے
اوروں نے جیسے تیسے کتاب اپنی چھاپ لی

پٹنہ سے لکھنؤ تلک آنے لگے نظر
اک اک گلی میں صاحبِ دیوان کئی کئی

ہر صاحبِ کتاب نے آخر ترنگ میں
مقدور بھر ضیافتِ احبابِ خاص کی

اجرا کے جشن تک تو رہی خوب دھوم دھام
مجموعہ جن کو مفت ملا اس نے داد دی

اجرا کے بعد آیا نکاسی کا مرحلہ
ہر اک کتب فروش کی چھانی گئی گلی

لکھے گئے عزیز و اقارب کو بھی خطوط
اخبار میں نکالا گیا اشتہار بھی

سعیِ بلیغ پر بھی نہ بر آئی آرزو
دو ایک جلد بھی نہ کتابوں کی بک سکی

بنیوں نے کی بجا معل کی تھوڑی مدد ضرور
ردّی کے بھاؤ لے لیں کتابیں کبھی کبھی

ٹھونگا بنانے والے بھی کچھ لے گئے کلام
شاعر کے خونِ دل کی کھپت یوں بھی کچھ ہوئی

گھر والیوں نے پھاڑ کے اوراق گاہ گاہ
چولھے جلائے گرم کی سالن کی دیگچی

اولادِ شاعروں کی تھی اردو سے نابلد!
قدر ان کے دل میں ہوتی بھلا کیا کلام کی

گلدستۂ سخن سے بنائی گئی پتنگ
چھوڑی گئی [illegible] میں کاغذ کی ناؤ بھی

ہوتا رہا یہ حشر نگاہوں کے سامنے
ہمت نہ ہاری اہلِ سخن نے مگر کبھی

جیسے دہی فروش لیے سر پہ ٹوکرا
بازار میں پکارتا پھرتا ہے لے دہی

اب یوں ہی اپنے دوش پہ لادے ہوئے کتاب
پھرتے ہیں صبح و شام سخنور گلی گلی

واہی بھی باوجود ضعیفی ہے ان کے ساتھ
گٹھری ہے اس کے کاندھوں پہ کلیات کی!

رشوت

رشوت کو برا کہتے ہیں اربابِ حماقت
کلجگ میں نہیں اس سے بڑی کوئی صداقت

ہے آج یہی طرّۂ دستارِ زمانہ
ہے آج یہی زینتِ کرسیِ سیاست

حل ہوتا ہے رشوت سے ہر اک عقدۂ مشکل
اکثر اسی کنجی سے کھلا بابِ اجابت

جو کام کھٹائی میں پڑا رہتا ہے برسوں
اک آن میں ہو جاتا ہے رشوت کی بدولت

دن رات بناتا ہے جو پیسوں کی اٹھنی!
پوچھے کوئی اس سیٹھ سے رشوت کی فضیلت

قاتل کو بچا لیتی ہے پھانسی کی سزا سے
اللہ کی رحمت ہے یہ اللہ کی رحمت

انصاف کا پلّہ یہ جدھر چاہے جھکا لے!
مٹھی میں لیے رہتی ہے میزانِ عدالت

آزادی جو انسان کا حقِّ ازلی ہے
مجرم کو عدالت میں عطا کرتی ہے رشوت

وہ شام کو ناگاہ بنا ریشۂ خطمی!
جو صبح کو تھا مستقل اک کوہِ امانت

اکڑیل سے اکڑیل بھی چوں کر نہیں سکتا
جب کان پکڑ لیتی ہے مخدومۂ رشوت

اعجاز سے اعجاز ہے رشوت کا اشارہ
اللہ رے اللہ رے رشوت کی کرامت

رشوت سے ٹھہر جاتی ہے دریا کی روانی
رشوت سے بدل جاتی ہے شعلہ کی طبیعت

آہن سے ٹپک پڑتا ہے خونِ دلِ عاشق
پتھر سے نکل آتا ہے مکھن بہ سہولت

سونے کا کلس مسجدِ جامع پہ چڑھے گا
سنتے ہیں کہ اک سیٹھ نے مانی ہے یہ منّت

یہ سچ ہے تو رشوت کی رسائی ہے وہاں تک
یہ سچ ہے تو اللہ بھی ہے بندۂ رشوت

(دسمبر ۱۹۷۶ء)

چمچے

نیتا ہیں اگر ایک تو دو چار ہیں چمچے
چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار ہیں چمچے

نیتا تو اضافی ہیں، یہ ہے آج کے رسل
گدّی کی محبت میں گرفتار ہیں چمچے

گرداب میں پھنس جائے جو کشتیِ قیادت
اک جست میں اس پار سے اس پار ہیں چمچے

بہتی ہوئی گنگا سے کرپشن کی جبیں پر
لیڈر ہیں اگر ناؤ تو پتوار ہیں چمچے

ہے ہاتھ میں آقا کے قلم دانِ وزارت
در پردہ مگر مالک و مختار ہیں چمچے

[illegible]
ہر کوٹ میں دو آنے کے حق دار ہیں چمچے

ہر جوڑ کے ہر توڑ کے ہر فتنہ و شر کے
نیتا ہیں اگر دائرہ، پرکار ہیں پیچھے

کر دیتے ہیں بھنگ اہلِ مخالف کی سبھا کو
اربابِ سیاست کے وہ ہتھیار ہیں پیچھے

بالو کو بھی متھ دیں تو نکل آتا ہے مکھن
وہ پردہ در و واقفِ اسرار ہیں پیچھے

جنتا کی لنگوٹی بھی تصرف میں ہے ان کے
ہنستے ہوئے ٹھگ رہزنی ہشیار ہیں پیچھے

وہسکی کا ڈبل پگ تو پئیں ان کے خداوند
بوتل ہی فقط دیکھ کے سرشار ہیں پیچھے

ملنا ہو وزیروں سے تو خوشنودی کیجیے ان کو
خدامِ در و حاجبِ دربار ہیں پیچھے

لیلیٰ پہ ہوا ہوگا نہ مجنوں بھی فدا یوں
جس طرح وزیروں کے پرستار ہیں پیچھے

نکلیں جو ٹہلنے کو دمِ صبح وہ حضرات
ہمراہ ادھر چار، ادھر چار ہیں پیچھے

وہ بیتِ خلا میں ہوں کہ ٹیبل پہ ڈنر کے
لوٹا لیے در در پہ کھڑے تیار ہیں پیچھے

چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار ہیں پیچھے

(جولائی ۷۴ء)

تحقیقی مقالوں کی دکان

پیش رفت اردو ادب کی تیز کرنے کے لیے
خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لیے

ملک میں دو نمبری دھندوں کی برکت دیکھ کر
اور تھیسس کی اپنی قدر و قیمت دیکھ کر

جامعہ کے چند استادوں کو سوجھی دور کی
منچلوں نے کھول ڈالی ایک نئی انڈسٹری

اس نئی انڈسٹری میں تھیسسیں ڈھلنے لگیں
اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں

ایسے ایم اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی
اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی

ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لیے
خود مقالہ لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے

فیس استادوں نے رکھی فی مقالہ دس ہزار
جس پہ سودا پٹ گیا پھر تو ہوا جھٹ پٹ نباہ

دے کے پیسے ختم ہو جاتا ہے شاگردوں کا کام
حضرت استاد کرتے ہیں بقیہ انتظام

اکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسس گئی
پیروی جا جا کے خود گائیڈ نے اسکے گھر پہ کی

وائی وا کے واسطے آیا جوں ہی اگزامنر
ہوٹلوں میں اس کو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر

ہو کے ممنونِ کرم اس کو وہی کرنا پڑا
حضرت استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا

جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی
کینڈیٹس کی شاخ میں گویا کلی سی کھل گئی

تیل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اردو فارسی
مل ہی جائے گی کسی کالج میں اس کو نوکری

اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دہرا فائدہ
ایک کو اجرت ملی اور ایک روزی سے لگا

نسلِ نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر
کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پہ ڈالے اک نظر

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون [illegible] جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

جیب استادوں کی اچھا ہے [illegible] بھرتی رہے

سیّد عبدالولی قادری انجینئر (حیدرآباد)

نذرِ شمع

سونے دیئے نہ آج بھی مچھر تمام رات
"جاگے تمام رات جگائے تمام رات"

تارے دکھائی دینے لگے مجھ کو دن تمام
"کیا جانے کس کو خواب میں دیکھا تمام رات"

دل اپنا پھینکتے رہے ہر جلوہ گاہ میں
"جلوہ تمام رات تماشا تمام رات"

کیا رہ گیا تھا اور لٹانے کو اپنے پاس
"لٹتی رہی خیال کی دنیا تمام رات"

چیخ و پکار سن کے جب انجان ہو گئے
"خاموشیوں نے تم کو پکارا تمام رات"

ننھا ننھو کے چار بلب لگے تھے چہار سمت
"تھا میری انجمن میں اُجالا تمام رات"

تھی رات کے ڈنر میں ہر اک شئے بڑی لذیذ
"آتا رہا خیال تمہارا تمام رات"

ڈائرکٹ لے لیا تھا کنکشن، اسی لیے
"روشن رہی ہے شمع تمنا تمام رات"

جا کر سنا کرو اور کہیں راگ مچھرو!
"سنتا ہے کون ایک فسانہ تمام رات"

تازہ غزل شگوفہ کو دینی تھی صبح دم
مالِ شمع ہم نے گلایا تمام رات

(سالنامہ ۱۹۹۱ء)

غزل

بھروسہ کیا ہے اپنی نوکری کا
ارادہ کیجیے جمعہ گری کا

کیے وہ کارنامے جیب بھر کے
لقب ہم کو ملا پدماشری کا

میں بولوں آم وہ کہتا ہے املی
ملا بڈھا ہمیں بھی کر کری کا

نہ بچوں کی پڑھائی کی ہے فکر اب
نہ کرتا ہے ٹھکا نہ چھوکری کا

وہ چکر میں الکشن کی پڑا ہے
ہوا ہے شوق اس کو لیڈری کا

کسی کو ماننے والا نہیں ہے
بہت چالو ہے الٹی کھوپڑی کا

ادھر کھانے کو کھانا بھی نہیں ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا

ادارہ ہے اقلیت کا صاحب
نہ ہو کیوں داخلہ ہم کو فری کا

فرشتوں کے معلم کے ہیں چیلے
کریں دعویٰ نہ کیوں پیغمبری کا

ولایت ہے نہیں تو اور کیا ہے
جو چرچا ہے ولی کی شاعری کا

(نومبر ۸۹ء)

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

علامہ سے بھی لڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں
وہ خود پہ بگڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

میں نے جو کبھی آپ کے ماضی کو کریدا
ہنستے سے اکھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

کچھ روز ہی چلتے ہیں یہ مینڈھے مرے پیچھے
پھر خود ہی اکڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

گمنامی میں رہتے ہیں تر و تازہ جو جیسے
شہرت سے وہ سڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

سڑکوں پہ لگی فلمی تصاویر جو دیکھوں
پاؤں وہیں گڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

زلفوں کی درازی کے جو روغن ہیں انہیں سے
گیسو جو مرے جھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

ہاتھوں کے علاوہ وہ کبھی پاؤں بھی دھو کر
پیچھے مرے پڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

ہنسنے میں کشادہ ہوئے جاتے ہیں جو چہرے
غصے میں سکڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

دم دار ستارے سے نظر آتے ہیں اب وہ
ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

مذہب کی سمجھ ہاشمی جو کچھ نہیں رکھتے
ہٹ دھرمی پہ اڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

(جنوری ۸۶ء)

○

فجر کے بعد سے پکوان کی تیاری ہے
منہ میں روزہ ہے مگر آنکھ میں افطاری ہے

ٹکٹکی باندھ کے بیٹھا ہوں میں چولھے کی طرف
کام کا کام ہے بیکاری کی بیکاری ہے

ہے سفر بس کا بھلا آنکھ لگے تو کیسے
نیند کی نیند ہے بیداری کی بیداری ہے

مسئلہ ہے تو فقط گاؤ چرن کا ہے وہاں
اصل میں کوئی مہاجر ہے نہ انصاری ہے

آپ کی بات پہ سب لوگ یقیں کیسے کریں
ہاشمی آپ کا انداز تو اخباری ہے

○

ہوتی ہے جیسے فلمی کہانی برائے نام
نکلا ہمارا دورِ جوانی برائے نام

باہر چنبیلی، موگرا مہکے ہیں رات بھر
مہکی ہے گھر میں رات کی رانی برائے نام

رشوت ترا بھلا ہو کہ اس دور میں ہمیں
محسوس ہو رہی ہے گرانی برائے نام

گاہک ادھر چلے جہاں پانی میں دودھ تھا
ڈالا تھا ہم نے دودھ میں پانی برائے نام

ہکلا رہے تھے آپ کے اشعار ہاشمی
اب آ رہی ہے ان میں روانی برائے نام

(اکتوبر ۹۳ء)

الٰہی مجھے تو نظر سے بچا لے — وہ گننے کو بیٹھا ہے پھیرے نوالے
مساجد کے چندے ہیں تیرے حوالے — تو جی بھر کے ان سے منافع کما لے
خدا کو مکاں کی ضرورت نہیں ہے — دھڑلّے سے اپنا مکاں تو بنا لے
ابھی گاہکوں کی لگیں گی قطاریں — دکاں ہی تو ہے تم اگر تو سجا لے
اگر تجھ کو طوفاں اٹھانے کی ضد ہے — تو چائے کی پیالی میں طوفاں اٹھا لے
ادب میں ترا نام روشن رہے گا — اگر تو بھی گھوڑے پہ سورج اگا لے
تجھے لوگ استاد کہنے لگیں گے — چبائے ہوئے لفظ تو بھی چبا لے
لجاجت سے لیتا ہے وہ قرض لیکن — تقاضا کروں تو وہ دیدے نکالے

کہاں ہاشمی جا بیاں اس نے رکھ دیں
لبوں پر لگا کر علی گڑھ کے تالے

(نومبر ۹۰ء)

غالبوں نے آم سارے کھا لیے — ہم سمیٹے جا رہے ہیں گٹھلیاں
شاعری کے نام پر نا شاعرو! — تم نے پیدا کر دیں کتنی ردّیاں
ہم نے ماتحتوں میں بانٹ دیں — باس نے جو ہم کو دی تھیں گالیاں
سر کڑھائی میں نہیں تو کیا ہوا — رشوتوں میں تر ہیں اپنی انگلیاں
دعوتوں میں ساتھ رکھنا دوستو — ہاضمے کی کھٹی میٹھی گولیاں

آج کل چوہے سنا ہے ہاشمی
دے رہے ہیں بلّیوں کو دھمکیاں

لیڈروں کا فرمان (حواریوں کے نام)

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

اٹھو ابھی سوئے ہوئے سندھیوں کو جگا دو — مسلک کی زمیں زورِ خطابت سے ہلا دو
گرماؤ مسلماں کا لہو سوزِ بیاں سے — ہر بات پہ ہندو کو مسلماں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا ہے گو یہ زمانہ — جو نقش گراں مایہ نظر آئے مٹا دو
جس کھیت میں اگتی ہو فراوانی سے گندم — اس کھیت میں بیلوں کے لیے گھاس اگا دو
کیوں عاشق و معشوق میں حائل رہیں پردے — پردے کا چلن ہر گلی کوچے سے اٹھا دو
کاخِ امرا خوب منور کرو لیکن — بوسیدہ مکانوں کے چراغوں کو بجھا دو
بیزار ہوں میں واحد و بدرنگ مکاں سے — میرے لیے خوش رنگ مکانات بنا دو
تہذیبِ نوی ہاشمی تنہا نہیں ممکن — ہر فرد کو تخریب کے آداب سکھا دو

ہرفن لکھنوی (کراچی)

غزل

تمہاری بد دعاؤں میں اثر پروردگار آئے
ملے غیروں سے جس دن تو الٰہی دل سے بخار آئے

مؤجل کے معانی ہر لغت میں جب اُدھار آئے
تو اپنی زندگی بھر مؤجل پر گزار آئے

کسی کے ہاتھ میں بلا کسی کے ہاتھ میں ہاکی
ذرا میری گلی میں گردشِ لیل و نہار آئے

فقط تم ہی نہیں دس بیس حوریں اور پالی ہیں
دل ایسا اصطبل ہے جس میں اونٹوں کی قطار آئے

پڑوسی کی ذرا سنیے وہ اک مرغی کو روتا ہے
اگر موقع ملے انسان کو ہاتھی ڈکار آئے

شراب ایسی بنا پیرِ مغاں جس میں یہ ٹیکنک ہو
پئیں گر اہلِ ثروت ہم غریبوں کو خمار آئے

نہ گلشن کی ملے یارو تو فلمی ہی بلا لیتا
کسی بھی شکل میں ہو میرے کمرے میں بہار آئے

شکن آلود بستر کی طرح جب ہو گیا چہرہ
وہ پہنچے بیوٹی پارلر بڑھاپے کو سنوار آئے

(مارچ ۸۹ء)

خوں بہا

ایک خبر میں نے پڑھی اخبار میں باغ و بہار
حادثے میں مرنے والوں کی ہے قیمت دس ہزار

کس قدر رنگین کتنی خوب صورت ہے خبر
ایک معمولی سا انساں اور قیمت اس قدر

اس خبر پر روز اک دو آدمی مرنے لگے
جو ہیں زندہ موت کی تیاریاں کرنے لگے

ایک بیوی نے کہا مجھ پر کرم فرمائیے
عشق ہے مجھ سے میاں تو روڈ پر مر جائیے

میری غربت سے جو روٹھے ہیں وہ اب من جائیں گے
آپ کے مرنے سے میرے کام سب بن جائیں گے

ایک صاحب بس کے نیچے آ گئے دے کر یہ دلیل
مختصر سی جانِ انساں نوٹ کی تھپی طویل

موت کے بدلے ملے موٹی رقم درکار ہے
طفل، نو مولود مرنے کے لیے تیار ہے

آپ خود ہی دیکھیے دولت میں کیا اعجاز ہے
باپ سے پہلے پسر آمادۂ پرواز ہے

زردیٔ غربت پر خوشی کا رنگ گہرا آ گیا
مرنے والوں کے لیے موقع سنہرا آ گیا

خرچ کرنا زر دوا دارو پہ اب بے کار ہے
حادثے کی نذر کر دو گھر میں جو بیمار ہے

شائقینِ خودکشی کو یہ خبر پہنچائیے
شوق گر مرنے کا ہے تو بس کے نیچے آئیے

اس خبر سے فائدہ سب کو اٹھانا چاہیے
موت بستر پر نہیں سڑکوں پہ آنا چاہیے

آؤ سکھاؤں تمہیں دولت کمانے کے ہنر
گھر میں جو معذور ہو تو پھینک آؤ روڈ پر

ایک بیٹے نے دیا یہ مشورہ حسرت آپ کو
[illegible] کے لاش چاہیے پھینک آ باپ کو

(جون ۸۸ء)

ہلال رضوی رامپوری

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا

میں تھا جدید شاعری کرنے کے موڈ میں ذہن رسا سے رات تخیل اڑا رہا
مفہوم کے بغیر ہی کہنے لگا میں شعر مفہوم شعر ایک طرف کو پڑا رہا
آیا مری زباں پہ نہ فعلن مفاعلن چھوٹا رہا کوئی، کوئی مصرعہ بڑا رہا
تھا میں اُدھیڑ بُن میں کہ کچھ آئیں شاعرات جن کا قدیم رنگ میں جھنڈا گڑا رہا
یعنی کہا کہ کچھ کہو رنگِ جدید میں سُن کر یہ ان کا روئے سخن فق پڑا رہا
پھر پھڑ پھڑا کے رہ گئیں بے چاری شاعرات پائے خیال اپنی جگہ پر اڑا رہا

بزمِ جدید میں نہ گئیں شب کی مرغیاں
"سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا"

(جولائی، اگست ۷۹ء)

کہہ دوں

اب تو سامانِ خور و نوش ہے سستا کہہ دوں اب تو ننگا ہے کوئی اور نہ بھوکا کہہ دوں
اب تو مسرور ہے خوش حال ہے جنتا کہہ دوں مان لے گی مری اس بات کو دنیا کہہ دوں
کہیے کہیے کہ میں خاموش رہوں یا کہہ دوں
فرض کیجے مجھے مہمان کیا آپ نے اب میز پانی کا مری بار کیا آپ نے اب
وہ کہوں نا کہ جو کھانے کو دیا آپ نے اب یا جو بینگن کا ہے بھرتہ اسے حلوہ کہہ دوں
کہیے کہیے کہ میں خاموش رہوں یا کہہ دوں
بے وقوفی یہ نہ حیرت مری فرمائیں گے لوگ صفِ اوّل کا نہ پاگل مجھے ٹھہرائیں گے لوگ
میری تحقیق پہ بے ساختہ ہنس جائیں گے لوگ میں جو تربوز کو ایک بھینس کا انڈا کہہ دوں
کہیے کہیے کہ میں خاموش رہوں یا کہہ دوں
کتنے آرام سے کٹتے ہیں یہ دن رات کہوں جس میں سچ کا نہ شبہ کوئی ہو وہ بات کہوں
مجھ پہ بے طور جو گزریں نہ وہ حالات کہوں آپ بیتی نہ سناؤں کوئی قصّہ کہہ دوں
کہیے کہیے کہ میں خاموش رہوں یا کہہ دوں

(جولائی، اگست ۷۰ء)

ہلال سیوہاروی

خون کی مانگ ہے...

خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لیے
لیکن ارباب حکومت سے بھی کہنا ہے مجھے
ان غریبوں کا لہو بہہ چکا بن کے پانی
خشک ڈھانچوں سے نچوڑو نہ لہو کی بوندیں
جن کے چہروں سے چمکتا ہے غریبوں کا لہو
ان کے مے خانوں میں جاؤ تو کبھی رات ڈھلے
مودی و ٹاٹا و برلا کے ٹھکانے دیکھو
ان خزانوں میں مروّت کا لہو پاؤ گے
کسی دوشیزہ کی عصمت کا لہو بھی ہوگا
سستے داموں جو لیا ہے وہ لہو ان سے لو
پونجی والو بڑا احسان کیا ہے تم نے
وقت کی نبض کو پہچان لیا ہے تم نے
اب رہا خون تو وہ اہلِ جنوں دے دیں گے
آج ہر ایک کے آگے ہے بھیانک انجام
اپنی پونجی سے بنائے رکھو جنتا کو غلام
تم تو ماحول پہ چھائے ہو لہو کیوں دو گے
سرفروشی کے تقاضوں سے گزرنے والے
شان سے نیفا و لداخ میں لڑنے والے
کوئی چنگاری نہیں ہے جو سلگ جاتی ہے
برف پر خون کی بوندوں کا جما ؤ دیکھو
دیکھنا ہے تو ذرا رنگ ملاؤ دیکھو
گرم ہو کر جو ذرا رنگ نکھر آئے گا

میرے نزدیک یہ قربانی ہے چھوٹی دے دو
جن سے خوں مانگ رہے ہو انھیں روٹی دے دو
زندگی ہے کہ بہر حال لیے بیٹھے ہیں
خون لو اُن سے کہ جو خون پیے بیٹھے ہیں
جن کی آنکھوں میں چھلکتا ہے غریبوں کا لہو
ان کے ساغر سے چھلکتا ہے غریبوں کا لہو
خون بھی خون ہے تم ان کے خزانے دیکھو
کسی فن کار کی محنت کا لہو پاؤ گے
کسی بیوہ کی امانت کا لہو پاؤ گے
ان کے شیشوں میں بھرا ہے وہ لہو ان سے لو
قوم کا دامنِ صد چاک سیا ہے تم نے
آج سونے کا بڑا دام دیا ہے تم نے
سونا دینے کو نہ ہوگا تو یہ خوں دے دیں گے
زر پرستو تمھیں ناموسِ وطن سے کیا کام
تم اشاروں پہ نچاتے رہو دنیا کا نظام
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لیے
موت کے سامنے جانے سے نہ ڈرنے والے
ہم غریبوں کے سوا کون تھے مرنے والے
پیٹ کی آگ ہی بارود میں لگ جاتی ہے
اپنے ہاتھوں سے وہ قطرات اٹھاؤ دیکھو
اپنے سونے کی سلاخوں کو تپاؤ دیکھو
ہم غریبوں کا لہو صاف نظر آئے گا

خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لیے

(سلسلہ ص ۱۶۲ پر)

دیکھو وہ سامنے مزدور چلے آتے ہیں
سخت محنت سے بدن چور چلے آتے ہیں
عیش و راحت سے بہت دور چلے جاتے ہیں
گئے رنجور تھے رنجور چلے آتے ہیں
خون تو خون پسینہ بھی نہیں لاتے ہیں
وہ بھی دامن میں مشینوں کے بہا آئے ہیں
تم نے ان گردش کے ماروں سے لہو مانگا ہے
جنھیں سنسار میں دو دن کی بھی راحت نہ ملی
ان کے خون کی کوئی قیمت ملے ممکن ہی نہیں
آج تک جن کے پسینے کی بھی قیمت نہ ملی
جذبہ ایثار کا تا حدِ یقیں ہے ان میں
جسم رکھتے ہیں مگر خون نہیں ہے ان میں
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لیے

جب خبر تھی کہ اچانک یہ ضرورت ہوگی
تم نے بے وجہ بہا ڈالا فسادات میں خون
جاؤ لاہور و نواکھالی کی سڑکیں دیکھو
جہاں سر پیٹتا پھرتا تھا مذاہب کا جنوں
کبھی ہولی کے بہانے تو کبھی عید کے دن
تم نے اس خون کا اک جشن منایا برسوں
آج انساں کے اسی خون کی ضرورت ہے تمھیں
تم نے جس خون کو سڑکوں پہ بہایا برسوں
جاؤ ان فرقہ پرستوں کو جھنجھوڑو جا کر
ان کے دامن میں لہو ہے تو نچوڑو جا کر
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لیے

(اپریل ۲۰۰۲ء)

٥

یوسف یکتاؔ

غزل

غم میرے سب بھلا دیجیے
تھوڑی وسکی پلا دیجیے
دام بریانی کے ہیں بہت
صرف اڈلی کھلا دیجیے
کام منٹوں میں بن جائے گا
نوٹ اوری دکھا دیجیے
کام تو آپ سے ہیں ہمیں
ہم کو ان سے ملا دیجیے
کون سنتا ہے پوری غزل
صرف مقطع سنا دیجیے

چوّا

کیوں ہے وہ بدگماں نہیں معلوم
کون ہے درمیاں نہیں معلوم
مرغ و ماہی کے بعد بھی یکتاؔ
آئیں کیوں ہچکیاں نہیں معلوم

(ستمبر [illegible])

ماہنامہ

شگوفہ

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

حیدرآباد

Vol. 27(5)

جلد: ۲۷
شمارہ: ۵ ۸
مئی ۱۹۹۴ء

سرورق، تصویروں میں:

جدہ میں عابد معز کی کتاب "واہ حیدرآباد" کی رسم اجراء

دائیں سے بائیں، جناب شریف اسلم (مائک پر)
جناب حیات اللہ خاں، ڈاکٹر عابد معز اور ڈاکٹر شمس بابر (صدر جلسہ)

کتابت: محمد غالب اور فضل محمد
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔ ۲

فی پرچہ: ۷ روپے
سالانہ قیمت: ۸۵ روپے
بیرونی ممالک سے: ۲۰ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ:

۱۳۔ بیچلرس کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس: 595718 مکان نمبر: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

اڑیں گے پرزے (خاکے)

مال مفت (انشائیے)

چوٹ (منظومات)

بہ یاد بھارت چند کھنہ

—•—

جدہ میں مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز کی کتاب کی رسم اجرا

جدہ۔ شہر علم و دانش جدہ میں مقیم طنز و مزاح کے شیدائیوں ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کے منتخبہ اجتماع میں ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز کے مجموعہ مضامین " واہ حیدرآباد " ۔ کی رسم اجرا انجام پائی ۔

جناب حیات اللہ خاں وائس پرنسپل انڈین ایمبیسی اسکول جدہ نے تالیوں کی گونج میں یہ رسم انجام دیتے ہوئے اپنے شاگرد رشید ڈاکٹر عابد معز کو خراج تحسین پیش کیا کہ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہوئے سماج کی ناہمواریوں کی بڑے سلیقہ کے ساتھ نشان دہی کی ہے ۔

پچھلے دنوں جدہ کے عزیزیہ ڈسٹرکٹ میں جناب محمد سرفراز احمد و میڈم شاہین سرفراز کے دولت کدہ پر سجائی گئی اس پر لطف ادبی محفل کی صدارت ڈاکٹر شمس بابر صدر بزم اردو جدہ نے کی ۔

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی نمائندگی کرنے والے ادب نواز مرد و خواتین نے لگا تار ڈھائی گھنٹہ تک طنز و مزاح سے لطف اندوز ہوتے ہوئے صاحب کتاب کی بڑی فراخ دلی سے پذیرائی کی ۔

جناب شریف اسلم صدر زندہ دلان جدہ کے ابتدائی کلمات کے بعد داعی محفل نواب سکندر علی خاں نے بطور خاص اس تقریب میں شرکت کے لیے ریاض سے آئی ہوئی سات ممتاز شخصیتوں بشمول ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا حاضرین محفل سے تعارف کرایا ۔ قاری صدیقی حسین صاحب کی قرات کلام پاک سے محفل کی کارروائی کا آغاز ہوا ۔ جناب محمد باقر معتمد انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے اپنے خیر مقدمی خطاب میں جدہ کے ادب دوستوں اور ادب نوازوں کی جانب سے صاحب کتاب ڈاکٹر عابد معز اور ان کے رفقائے کار کو خوش آمدید کہا اور اعلان کیا کہ ان کی انجمن حیدرآباد دکن میں اس کتاب کی رسم اجرا کی تقریب کا اہتمام کرے گی ۔ سرکردہ دانشور، ادیب، شاعر و نقاد جناب مصلح الدین سعدی اور جناب محمد طارق غازی منیجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ نے ڈاکٹر عابد معز کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے شگفتہ انداز تحریر، سلیس زبان گہرے مشاہدے اور منفرد انداز بیان کی بھرپور ستائش کی ۔ جناب شریف اسلم نے دل چسپ پیرائے میں کارروائی چلائی ۔

مہمان خصوصی ممتاز مزاحیہ شاعر جناب خواہ مخواہ (جناب غوث محی الدین احمد) نے ادبی و دکنی زبان میں اشعار اور قطعات سنا کر قہقہوں کی دولت لٹائی ۔ شاعر و ادیب جناب نسیم سحر اور نواب سکندر علی خاں نے خاکے پیش کیے ۔ جناب عبدالعلیم اختر اور جناب اقبال شانہ (تبوک) نے منظوم تہنیت پیش کی ۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے طنز و مزاح کے موضوع پر عالمانہ خطاب کیا ۔ محترمہ نور جہاں طارق غازی (نائب صدر زندہ دلان جدہ) نے " واہ حیدرآباد " کے مختلف مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک شگفتہ مضمون سنایا اور داد پائی ۔

صاحب کتاب ڈاکٹر عابد معز نے اپنی کتاب سے دو مضامین سنا کر محفل کو دلیوار قہقہہ بنا دیا ۔ جناب ضیاء الرحمن کی زیر صدارت محفل لطیفہ گوئی کا آغاز ہوا جس میں علاوہ دوسروں کے محمد ارشد غازی، شریف اسلم، محمد باقر، ناظم الدین مقبول نے حصہ لیا ڈاکٹر اوصاف احمد، الحسن جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ (حیدرآباد) جناب لیئق اللہ خاں اور جناب عبدالباری انجم (جدہ بیلدیہ) جناب روح الامین (عرب نیوز) اور جناب نعیم بازید پوری بطور مہمان خصوصی شرکت کی ۔ جناب رؤف حسین نے ویڈیو گرافی ، [illegible] نے فوٹو گرافی کی ۔ (رپورٹ : شریف اسلم)

ڈاکٹر صغرا مہدی
(دہلی)

مظفر حنفی

تیری بات روکھی تیری چال ٹیڑھی

بے حد دبلا جسم (جواب فربہی کی طرف تیزی سے مائل ہے) سرو قد (انھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ سرو قد ایسے ہوتے ہیں)، خالص ہندوستانی تپا ہوا رنگ عینک کے پیچھے سے جھانکتی ذہین آنکھیں روشن پیشانی سر پر گھنگھریالے بالوں کا جھوا، جن میں سن بھی شامل ہو رہا ہے۔ صاف ستھرا لباس، اکثر کفوں کے بٹن نادارد یا ہوں تو ان کو بند کرنے کی زحمت سے بے نیاز — پتلون اور شرٹ میں ملبوس جن کے رنگ صوفیانہ، مگر جاڑوں میں گہرے رنگ کے سوٹ نکال لیتے ہیں، یہ ہیں ہمارے مظفر بھائی جو اب ایک عرصے سے مظفر حنفی ہیں معلوم نہیں کیوں؟

میری ان سے باقاعدہ ملاقات اُس وقت ہوئی۔ جب جنوری ۱۹۷۶ء میں میں نے شعبہ اردو (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں بحیثیت لکچرر کام کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے ان کو جامعہ میں دیکھا تھا مجھے یہ خیال تھا کہ یہ حضرت کچھ سیدھے سادے بے ضرر قسم کے انسان ہیں شاید تھوڑے بور بھی اس لئے شعبے میں ہم ان سے الگ الگ اور کٹے رہے۔ پھر ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان پر ہمارے اس رویئے کا کوئی رد عمل نہیں ہے نہ کوئی احساسِ زیاں، تو ان کی اس ادا نے (جو انھوں نے کوشش کر کے اپنائی نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت کا حصہ ہے) ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کے شگفتہ فقرے، چبھتے ہوئے جملے، ان کا احساس مزاح اور بے تکلف انداز یہ سب ہمیں بہت بھایا اور ان کی ہماری دوستی ہو گئی۔

اس وقت تو دوستی کے فوری اسباب یہی تھے اس کے بعد ان کی دوسری خصوصیات اور ان کے ہمارے مزاج کی ہم آہنگی نے ہمیں بہت قریب کر دیا اور اس طرح یہ شخص جو نہایت درجہ کا صاف گو ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو کھری کھری سنانے سے بھی باز نہیں آتا — جسے مظفر حنفی کہتے ہیں اس سے ہماری دوستی ہو گئی۔ اور یہ بات ہم آپ کو بتائیں کہ آج تک ہم اس دوستی پر پچھتائے نہیں۔ ہمارے ان کے درمیان اختلاف بھی ہوئے۔ اختلاف رائے بھی اور بحثیں بھی مگر دوستی پر کبھی حرف نہیں آیا، وہ شاد عارفی کے شاگرد ہیں، انھیں اس پہ فخر بھی ہے اور وہ

صاف بات کہنا بھی جانتے ہیں اور سننا بھی اور جہاں ان کو اپنی کمی کا احساس ہوتا ہے اس کا اعتراف کرتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ انداز میں نہ معذرت ہوتی ہے نہ منمناہٹ یہ انداز بڑے آدمیوں کا شیوہ ہے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا اور اس اعتراف میں بھی کر ٹل اور اکھڑ پن ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ مظفر حنفی پر خود غلط ہیں پھر تو ان کی یہ بات بہت پسند ہے کہ انھوں نے اپنے گرد بناوٹ، تصنع، دانشوری، بے نیازی، فلسفیانہ استغراق کے پردے نہیں لٹکائے ہیں اس لئے ان کو یہ خوف نہیں ہوتا کہ اگر ان کی اصلی شخصیت کہیں سے لوگوں کو نظر آگئی تو کیا ہوگا اس لئے ان کے انداز میں بے فکری ہے۔

مظفر حنفی اچھے دوست بھی ہیں اور دوست نواز بھی ایک دوست کی خاطر دوسرے دوست سے بچھڑ جانے میں بھی ان کو کوئی عار نہیں ہے چاہے اس کی وجہ سے برسوں کے یارانے چلے جائیں! اپنے شاعر و ادیب ہونے کے احساس سے بھی وہ ہر وقت دبے نہیں رہتے، نہ ان کو ہر شخص کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہے نہ ہر کس و ناکس کو اپنے شعری مجموعے دینے کا شوق ہے ان کو عام شاعروں کی طرح زمانے کی ناقدری کا گلہ بھی نہیں شاید اسلئے کہ ان کی بے قدری ہوئی ہی کب؟ ان کو اس کی فکر بھی کچھ زیادہ نہیں کہ ناقدین ان کی شاعری کو کس طرح آنکتے ہیں اور اگر نہیں آنکتے تو کیوں؟ مگر جب کوئی منہ ہی لگنا چاہے تو موصوف پھر آپ اپنی شاعری کی قدر و قیمت پر وہ لمبا لکچر جھاڑیں گے کہ اگلے بندے کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے یا پھر ڈر کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ پہلے کے فعل پر وہ خوش ہوں گے اور دوسرے سے پھر نہایت ملائم لہجے میں معذرت کریں گے کہ معاف کیجئے میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ مگر ان کے تیور یہ کہیں گے کہ جو مرد ہو وہ آئے اور ہم سے بھڑے۔

مذہب کے ان کے نزدیک دو معنے ہیں ایک تو بندے اور خدا کا تعلق، یہ بہت ذاتی معاملہ ہے اس کا ذکر بھی برسرِ عام انھیں پسند نہیں ہے۔ وہ اس کی پردہ داری اس طرح کرتے ہیں جیسے اردو شاعروں نے اپنے فرضی یا اصلی مجازی محبوب کی کی ہے۔ دوسرا حصہ وہ اقدار ہیں جو ہر مذہب کی جان ہوتی ہیں، ان سے وہ محبت بھی کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں ان کو برتتے بھی ہیں۔ ہمارے مذہب، ہمارے ملک، ہماری تہذیب میں خاندان کا جو وسیع تصور ہے۔ اسی پر ان کا عقیدہ ہے۔ وہ ان کے نزدیک اس قدر نارمل اور نیچرل ہے کہ اس کی اہمیت اور افادیت پر کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور شہروں سے انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدا کی ایک عرصے تک دہلی میں رہے اور اب جہانگر کلکتہ میں قیام پذیر ہیں لیکن انھوں نے اپنی وضع نہیں بدلی، بدلی بھی تھی تو اس حد تک جس حد تک تبدیلی ناگزیر تھی اور اپنا رشتہ ہندوستان کی قصباتی تہذیب سے جوڑے رکھا۔ یہ رشتہ ان کے لئے صرف موضوعِ شاعری یا موضوعِ گفتگو نہیں ہے۔

مظفر حنفی استاد ہیں ایسے استاد جو صرف علم و فضل کے بوجھ سے دبے نہیں ہیں، بلکہ انھیں اپنے طالب علموں سے انس بھی ہے۔ مگر ایک فاصلے کے ساتھ وہ کلاسیں پابندی کے ساتھ لیتے ہیں اور ہم جیسے لوگ جو کلاس نہ لینے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور ہر وقت طلبا کی نالائقی اور بے شوقی کا رونا روتے ہیں ان کی سرزنش کرنے

سے بھی نہیں چوکتے اکثر زہر قند سے کبھی شگفتگی سے۔ جب یہ ہمارے شعبے میں تھے تو بڑا عجیب لگتا تھا کہ ایک ترقی انسان اور جس طالب علم کو دیکھو مظفر حنفی کا فیض ــــــ !

موصوف نے افسانے بھی لکھے ہیں، کتابیں بھی ایڈٹ کی یا تنقیدی مضامین بھی رقم کئے ہیں اور شاعر تو کی ہی ہے انھیں افسانہ نگار ماننے سے تو ہم قطعاً منکر ہیں کتابیں اچھی ایڈٹ کی ہیں ان کا تنقیدی اسلوب بھی ہمیں پسند ہے کیونکہ اس میں دو ٹوک بات کہنے کا انداز ہے اور تیکھا پن مگر ہمارے نزدیک وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ہمیں ان کی وہی حیثیت تسلیم ہے۔ اس میں ان کی انفرادیت ہے۔ یہی ان کا اصلی میدان ہے مگر صنف نازک کی طرف ان کا رویہ نہایت غیر شاعرانہ ہے یہاں تک اس کی شاکی ان کی بیوی عاصمہ بھی ہیں جن سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہے۔ ایک دن ہم سے کہنے لگیں "یہ کیسے شاعر ہیں نہ کسی پر عاشق ہوتے ہیں نہ کسی کے دام میں پھنستے ہیں، ہر ایک سے ٹیڑھی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں سمجھایئے نا یہ خدائی فوجدار تو ہیں نہیں" واقعی عجیب بات ہے کہ اپنے یہاں تو شاعروں کا یہ معاملہ ہے بقول یوسف ناظم عشق دوسری خواتین سے کرتے ہیں مجموعے کا انتساب رفیقِ سفر کے نام کر دیتے ہیں۔ اور اپنے یہ بھائی عشق بھی بیوی سے کرتے ہیں، طرفہ تماشہ بھی ان ہی سے کرتے ہیں لڑتے بھی ان ہی سے ہیں اور شعری مجموعوں کا انتساب بھی ان ہی کے نام کر دیتے ہیں یا پھر ان کے بیٹوں کے۔ اس معاملے میں مظفر حنفی شاعروں کے ماتھے کا کلنگ کا ٹیکہ ہیں مگر یہ چاہے کلنگ کا ٹیکہ ہوں یا کاجل کا۔ ہیں بہت پیارے دوست، کھرے انسان اور اچھے انسان ــــ اور جو بھی ہیں وہ اصلی ہیں۔

انھیں کسی کا یہ قول بہت پسند ہے کہ بڑے آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اس کے پاس سے مل کر جب آپ اٹھیں تو آپ کو اپنا قد اونچا معلوم ہونے لگے۔ مگر ٹھہریئے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ خدانخواستہ ہم ان کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں یا بڑا آدمی منوانے کی فکر میں ہیں۔ جی ہرگز نہیں مظفر حنفی تو بس مظفر حنفی ہیں۔

ڈاکٹر محبوب ماہی (پارسی ناگلی)

ہمارے مخالفین

بیگم کے میکے والے ہمارے خلاف ہیں
یعنی ہمارے سالے ہمارے خلاف ہیں

تلواریں نیزے بھالے ہمارے خلاف ہیں
سب تیز دھار والے ہمارے خلاف ہیں

دونوں کو ساتھ ساتھ دکھایا جو آئینہ
گورے ہیں حق میں کالے ہمارے خلاف ہیں

رام اور رحیم ایک ہیں ہم نے جو کہہ دیا
رام اور رحیم والے ہمارے خلاف ہیں

جب سے ہوئے ہیں زلفِ سیہ کے اسیر ہم
رخساروں کے اجالے ہمارے خلاف ہیں

ماما د روکھی سوکھی سے اپنا پیانا ہے
بچپن سے تر نوالے ہمارے خلاف ہیں

پانی کو ہم نے پانی کہا - کیا غلط کیا
اس بات پہ گوالے ہمارے خلاف ہیں

ججوں نے نوٹ دیکھے عدالت خرید لی
سب حیلے سب حوالے ہمارے خلاف ہیں

اس بات پر کہ ہم نے سلامی انہیں نہ دی
اونچی حویلی والے ہمارے خلاف ہیں

کھلتے نہیں ہیں ہم پہ سخی ہاتھ کی طرح
الماریوں کے تالے ہمارے خلاف ہیں

گھس آتے ہیں ہمارے گھروں میں بلا دریغ
سب ندیاں اور نالے ہمارے خلاف ہیں

پالا ہے ہم نے دودھ پلا کر جنہیں سدا
وہ آستیں کے پالے ہمارے خلاف ہیں

ماہی کریں تو شکوۂ حالات کیوں بھلا
حالات ہی تو سالے ہمارے خلاف ہیں

قطعات

○

اتراتا پھلتا ہے سسرال کے ٹکڑوں پر
بل کھاتا اچھلتا ہے سسرال کے ٹکڑوں پر
لیے طائر لاہوتی کچھ اس کے بھی بارے میں
وہ شخص جو پلتا ہے سسرال کے ٹکڑوں پر

○

خود گھڑا پھوٹے گا اس کے باپ کا
پیٹ کیوں دکھتا ہے ناحق آپ کا
کوئی عاشق جوتے کھاتا ہے اگر
کیا بگڑتا ہے کسی کے باپ کا

●

فسادی ہے کمینہ ہے، شرابی ہے جواری ہے
کہ انساں آج کا ہر بات میں شیطان پہ بھاری ہے
بنا رکھا ہے اس دنیا کو اک آتش کدہ جس نے
وہ خاکی ہو کے [illegible] نہ نوری ہے نہ ناری ہے

○

جو کرتے رہتے تھے غنڈہ گردی
کبھی سڑک پر، کبھی گلی میں
وہ ووٹ ہم احمقوں کے پاکر
پہنچ گئے ہیں اسمبلی میں

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

کیا ہم احسان فراموش ہیں

نعوذ باللہ ہزار بار نعوذ باللہ ـــــ ہم اور احسان فراموشی۔ دنیا نے ہم پر بے شمار الزامات تراشے ہیں، یہ الزام بھی سہی لیکن یہ الزام ایسا ہے کہ جس پر اگر ہم اپنی وکالت آپ نہ کریں اور اپنی صفائی میں زبان نہ کھولیں تو ممکن ہے اہلِ دنیا واقعی ہمیں احسان فراموش سمجھے اور واقعی احسان کی طرح ہمیں فراموش کر دے۔

مذہب، اخلاق میں احسان فراموشی کفر کے مترادف ہے۔ احسان جتانا گیا ہے یہ مفتیانِ خلق فکر دار جانیں ویسے جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے خود کو احسان فراموش سے زیادہ احسان پرور ہی پایا ہے۔ ماں کا احسان باپ کا احسان، اساتذہ کا احسان، اصحاب کا احسان، پڑوسیوں کا احسان، اہلِ قرابت کا احسان، بیوی کا احسان، بیوی کے بچوں کا احسان، لیڈروں کا احسان، ملک و ملت کا احسان، حکومت کا احسان، ان سب کے علاوہ احسان جتانے والوں کا احسان۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ لوگوں کے احسان جتانے سے پہلے ہی احسان تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے احسان جتانے کا فیشن کچھ اس درجہ عام ہو گیا ہے کہ ابھی ہم احسان ماننے کی تمہید باندھ ہی رہے ہیں کہ لوگ احسان جتانے پر تل جاتے ہیں، بلکہ یہ کہ جان بوجھ کر صاف کر کے احسان جتاتے ہیں تو کتنا کچھ چھوڑ دیے کر احسان جتاتا ہے اور ہم ہیں کہ سرِ تسلیم خم۔ جو مزاجِ یار میں آئے کہتے ہیں۔

ماں باپ کا احسان سر آنکھوں پر بلکہ جسم کے بال بال پر۔ انھوں نے ہمیں فیملی پلاننگ کے ماحول میں جنم دیا۔ خوف اخلاق کو شوق اولاد پر قربان کر دیا۔ حالانکہ انھیں خوب علم تھا کہ فیملی پلاننگ کرنے والا کامیاب نسلوں کا جائز قتل ہے جس کی جزا قانونی طور پر مختلف انعامات کے علاوہ اعزازات مستحسنہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

شکر ہے ہمارے ماں باپ نے دودھ کے ڈبے کا نہیں پلایا البتہ تعلیم سرکاری دلوائی۔ کسی ہوٹل میں "باہر والا" پر نہیں رکھوایا بلکہ فائنز میڈیٹ کروایا اور تو اور سِن بلوغ سے قبل شادی کرادی۔ گویا ابھی دانت بھی نہ نکلے تھے کہ لال لگام شادی۔ بغرض ماں باپ کے بہت بہت احسانات ہیں ہمیں چاہیے کہ ان کا ہر حکم بہ طیبِ خاطر بجا لائیں۔ سوائے جہیز کے مطالبے کے ہیں چاہیے انھیں سکھ پہنچائیں سوائے ابدی [illegible]۔ ہمارا یہ کام ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے عقدِ ثانی کا حکم دیں فوراً کر گزریں۔ ایسے جذباتِ لطیف اور احساساتِ عفیف کے باوجود اگر لوگ ہمیں والدین کا احسان فراموش سمجھتے ہیں تو آپ خود فرمائیں کہ یہ خود بجائے کم فہمی کے مترادف ہے یا نہیں!

بیوی ــــ کیا ہم اپنی بیوی کا احسان نہیں مانتے۔ آپ غور کیجیے۔ اگر بیوی جیسی عجیب الخلق شے نہ ہوتی تو اولاد جیسی نادر الوجود شے کیسے وجود میں آتی۔ اگر بچے [illegible] ولادت وتجربات پر سائنس دانوں کا رحم وکرم کچھ اس حد تک ہو رہا ہے کہ کانچ کے رحم میں بے رحم انسان ارتقا کی منزل طے کر رہا ہے تو تربیت کیسے ہوتی۔ ہمارے بچے جو ہمارے سامنے سگریٹ نہیں پیتے یہ ان کی ماں کی تربیت ہے ہمارے بچے جو ہمارے زندہ رہنے تک ہماری بادشاہت کے لیے جھگڑ نہیں رہے ہیں یہ ان کی ماں کی تربیت ہے یہ بیوی ہی تو ہے جس نے ہمیں جوانی سے بڑھاپے تک کسی غلط کام کا رہنے نہ دیا بلکہ کسی کام کا رہنے نہ دیا۔ ممکن ہے اگر بیوی نہ ہوتی تو کہیں آرام سے گزر جاتی خواہ سنٹرل جیل ہی میں کیوں نہ ہو۔ یہ بیوی ہی تو ہے جسے دیکھ کر ہم اپنے سارے غم بھول جاتے ہیں کیوں کہ ہر بڑا غم دوسرے چھوٹے غموں کو بھلانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ جب ہم تھک تھکا کر دفتر سے گھر لوٹتے ہیں تو بیوی کی صورت دیکھتے ہی ساری تھکن کافور ہو جاتی ہے۔ حد جذباتِ لطیف جو کبھی کبھار ہی برانگیختہ ہوتے ہیں۔ انگڑائی لینے کی تمہید پر ہی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ آج جو ہماری صحت اس درجہ اچھی ہے وہ ہماری بیوی ہی کا طفیل ہے۔ ہم اپنی قسمت پر جب مسکراتے ہیں تو وہ سمجھتی ہیں کہ ہم انھیں دیکھ کر باغ باغ ہو رہے ہیں۔ بیوی کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں اگر ہم اپنی بیوی کا احسان چکانا چاہیں تو واجب الادا مہر دے کر بھی نہیں چکا سکتے۔ جب تک ہم گھر نہیں لوٹتے وہ کھانا نہیں کھاتیں تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ کہیں ہم نے کسی ہوٹل میں تو کھانا نہیں کھایا ہے۔ ہمارے سونے تک وہ جاگتی رہتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہیں ہم کسی کی یاد میں تو نہیں جاگ رہے ہیں۔ جب ہم باہر نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں ہمارا پرس ضرور دیتی ہیں خواہ وہ خالی ہی کیوں نہ ہو۔ الغرض بیوی کے احسانات تلے ہم دبے ہوئے ہیں مگر سالے ہمیں بیوی کا احسان فراموش سمجھتے ہیں۔

پڑوسی تو آپ کے بھی ہیں ــــ ہمارے بھی۔ ان کے بھی جن کا کوئی پڑوسی نہیں۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے بہت احسان مند ہیں، ممنون ہیں، شکر گزار ہیں۔ جو وہ کھا نہیں سکتے وہ ضرور بھیج دیتے ہیں اور شکریہ میں ہمارے تحفے وصول کرتے ہیں۔ پہلے جھانکتے ہیں پھر سلام کرتے ہیں۔ آنا کہہ کر چلے آجاتے ہیں تاکہ ہمیں اجازت دینے کے لیے اپنی زبان کو زحمت دینا نہ پڑے۔ ہم بیمار پڑتے ہیں تو عیادت کے لیے ضرور آتے ہیں۔ لیکن اموات کے واقعات کفن کی مہنگائی، گورکنی کی مزدوری، قبر کی کھدائی، نیازت کا سوم، چہلم کا خرچ جیسے موضوعات پر اتنا سیر حاصل مواد دیتے ہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد ہر آنے والے شخص کی پرچھائیں پر حضرت ملک الموت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بیشک ہمیں وقت پر قرض ضرور دیتے ہیں لیکن جب وصول کرنے پر آتے ہیں تو بعض اوقات [illegible] جاتی

ہے۔ ہمارے اخبار کو یہ ہمارے ہاتھ لگنے نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ ملک و قوم کے پیچیدہ حالات کے سبب وہ ہم سے پہلے پریشان ہونا چاہتے ہیں اور اس طرزِ عمل کو وہ فدویانہ روش پر محمول کرتے ہیں اگر انھیں کوئی شبہ ہو کہ کسی چیز کو انھوں نے بہت مہنگا خریدا ہے تو وہ چیز یہ کہہ کر ہمیں قیمتاً گزران دیتے ہیں کہ رستے کا مال سستے مل رہا تھا۔ آپ کے لیے بھی خرید لایا ہے۔ پیسوں کی کوئی جلدی نہیں

اساتذہ کا ہم احسان نہ مانیں تو گنہگار ٹھہریں۔ اتنا پڑھایا کہ پڑھانے کے علاوہ کسی کام کے نہیں رہے۔ حساب کو اتنا سمجھایا کہ آج ہم طولِ شبِ فرقت کے علاوہ وصل کی گھڑیوں تک کو بہ آسانی گن سکتے ہیں۔ خواہ اس کوشش میں زندگی کی آخری گھڑیاں گننے کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے۔ جغرافیہ ایسا پڑھایا کہ دنیا کے کونے کونے سے واقف ہیں اور اسی واقفیت نے مشکوک کر دیا ہے کہ کیا .... واقعی دنیا گول ہے۔ تاریخ کے مولوی صاحب کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے قصے ہی نہیں ازبر کروائے بلکہ جمہوری اقدار کے جراثیم بھی ہمارے ذہن میں انجکٹ کیے۔ اور بات ہے کہ ان کی سمجھائی ہوئی جمہوریت اور موجودہ حکومت میں وہی تضاد نظر آتا ہے جو تاریخ اور جغرافیہ کے مابین استوار ہے۔ سائنس کے استادِ محترم کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے ہماری شخصیت کے وہ انوکھے پہلو اس حقیقت بیانی سے واضح فرمائے کہ اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ اردو کے استاد کا کیا احسان مانیں کہ لفظ ہی نہیں ملتے کہ بیان کر سکیں۔ آج جو ہم میں عاجزی، انکساری، کم گوئی، غربت، افلاس اور کم آمیزی ہے وہ اردو کے استاد کا طفیل ہے۔ فانی پڑھا کر فنائیت کا احساس دلایا تو غالب پڑھا کر مغلوب کر دیا۔ اقبال کچھ اس طرح پڑھایا کہ خواب میں تک شاہین، ممولے اور باز اڑ اڑ کر آنے لگے اور طائرِ لاہوتی کے دیدار کی تمنا نے تو دیوانہ بنا دیا ... آج جو ہم قدرے مجذوب نظر آتے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز دکھائی دیتے ہیں وہ صرف اور صرف استادِ اردو کی مہربانیاں ہیں۔

ہمارے شباب بلکہ شباب نما ضعف پر کچھ ہمارے محبوب کا بھی کم احسان نہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ ہم نہ پوچھتے کیا عرض کریں کہ اس کا کیا احسان ہے بلکہ احسانات ہیں۔ ہمیں اپنے شباب کی تصویریں دکھا کر خضاب زدہ زلفوں کا اسیر بنا ڈالا۔ اپنی شان میں قصیدے سنے تو کہا سننا اس لیے ہے کہ شاعر کی ہمت افزائی ازبس ضروری ہے۔ ہماری شان ہجو میں کہیں تو دلیل دی کہ اس سے ظرف میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اپنے میک اپ کا اس درجہ دیوانہ بنایا کہ ہمیں ہر اچھی صورت بری معلوم ہونے لگی۔ اپنی ہر خواہش کی تکمیل یوں کروائی ما قبل از مقصد و اجبات سے ہو۔ اپنے جمال خرواں آثار کا اس شدومد سے دیوانہ بنایا کہ شریفہ کے بیج جیسی آنکھوں کو چشمِ غزال کہتے ہیں تو ذرا بھی جھوٹ کا احساس نہیں ہوا۔ بازاری چیتھڑے کو ہم نے شب دیجور کہا۔ کمرہ جیسی کمر کو ہم دیکھنے سے قصداً معذور ہے۔ پوڈر کی تہہ کو ہم نے چاند کی سطح سے تشبیہ دی جھریوں سے مملو رخسار کو گلاب کہا۔ غرض جھوٹ بولنے کی جو خو ہم میں آج ودیعت ہے وہ ہمارے محبوب کی نوازش ہے۔ جس دن سے ہمارے محبوب کے احسانات کا سلسلہ اکالی بارش کی طرح شروع ہوا گو نہ پورا آتا پارہ پارہ ہو گیا۔ یہ ہمارے محبوب کی نوازش ہی تو ہے جو ہماری ریش مبارک ایک بالشت سے ایک انگل رہ گئی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے: بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ یہ اسی کافرہ کا کرم ہے جو ہم تہجد کے وقت رومانی شعر کہہ رہے ہیں۔ یہ اسی ظالم کی مہربانی ہے کہ خانہ خدا کے طواف کے بعد خانۂ معشوق کے طواف میں مشغول ہیں۔ مذہبِ عشق کا دستور بہرحال نرالا ہوتا ہے اور جس کو الفت کے اسباق یاد ہو جاتے ہیں انھیں اتوار کے دن بھی چھٹی نہیں ملتی۔ منہ اٹھائے کوچۂ یار کی جانب نکل پڑتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ کوئے یار سے نکلتے

بھی سوئے دار چلنے کی آرزو ہر عاشق نامراد کا نصیب ہوتا ہے۔ ایک اتوار جو خانۂ یار پر حاضری دی ان کی تیز و طرار خادمہ نے دکنی لہجے میں کہہ دیا کہ بی بی گھر پہ نہیں ہیں۔ ہم نے اسے پاس تنتے مرحوم شوہر کی محبت کا واسطہ دے کر حقیقت حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسٹار ۷۔ ۳ پر کوئی اہم پروگرام دیکھ رہی ہیں۔ ہم کلاسیکل عشق کے قائل ہیں ماڈرن محبت میں جو گریز کی گنجائش ہے وہ ہمارے بس کی چیز نہیں۔ جب عشق اپنی معراج کو پہنچا اور قصیدہ نوائی اور غسل سرائی میں جب پورے دس جز کی کتاب تیار ہوگئی تو رسم اجرا کے روز کہہ دیا میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہم دونوں ہی تے دو دو دفعہ اس کھیل کو آزما لیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم شاعری کرنے کی بجائے تھوک، بلغم، خون اور پیشاب کے معائنے کا ہنر سیکھ لو۔ اندر کی یہ تمام چیزیں باہر بڑی قدر سے دیکھی جاتی ہیں۔ آج جو ہمارے پاس کوٹھی اور کار نظر آ رہی ہے۔ وہ انہی اشیائے کم عیار کا طفیل اور ہمارے محبوب کے مفید مشورے کا سبب ہے۔

آخر میں اگر ہم اپنی حکومت کے احسانات نہ گنوائیں تو شاید یہ بہت بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ سوچتے ہیں کہ حکومت کے کس احسان کا جائزہ لیں۔ کس مہربانی کا شکریہ ادا کریں۔ یہ موجودہ عزت مآب حکومت ہی کی نوازش ہے جو ملک میں ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات ہے۔ مہاتما گاندھی نے جو خواب دیکھا تھا اسے شرمندۂ تعبیر کرنے میں ملک کا ملک جتا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر خواب کی تعبیر کی طرح اگر مہاتما کے خواب کی تعبیر بھی الٹی ہوگئی تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے۔ یہ تو اس خواب کا قصور ہے جو انھوں نے دیکھا تھا۔ اب یہی دیکھیے حکومت کس شد و مد سے شراب پر پابندی لگائی ہے۔ اس کے باوجود شراب نوشی میں کوئی فرق نہیں آیا اور سڑکوں پر مدہوش ہندوستانیوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی ہے تو اس میں حکومت کا کیا قصور۔ رشوت ستانی کے سدباب کے لیے حکومت نے ایک محکمہ کھول رکھا ہے تاکہ کوئی کسی کا استحصال نہ کرے۔ یہ حکومت کا احسان ہے۔ اب اگر خود اینٹی کرپشن کے محکمہ میں کرپشن بام عروج پر پہنچ جائے تو اس میں حکومت کا کیا قصور ہے۔ چوری غنڈہ گردی، ڈکیتی، قتل اور بے حرمتی جیسی سیاہ کاریوں پر قدغن لگانے کے لیے ہی حکومت نے محکمہ پولیس کے دروازے وا کیے ہیں یہ اور بات ہے کہ پولیس والوں کے دروازے فریاد کے لیے ضرور کھلتے ہیں لیکن انصاف کے لیے نہیں کیوں کہ انصاف جب جھوٹی شہادتوں کے طفیل عدالتوں سے صاف ہو رہا ہے تو پولس والوں سے اس کی توقع بجائے خود حمق ہے۔ پولیس پر بھی الزام بعینہٖ لگانا اخلاق سے گری ہوئی بات ہے دس پندرہ فی صد پولیس والے بہر حال غیر سماجی عناصر میں نہیں گنے جا سکتے۔ اگرچہ بظاہر حکومت کی نااہلی اخبار کے ہر صفحے بلکہ ہر سطر سے چودھویں کے چاند کی مانند عیاں ہے لیکن ہم حکومت پر کیچڑ نہیں اچھال سکتے بلکہ اس امر پر شکریہ بجا لانا چاہیے کہ فی زمانہ ہر قتل کے بعد قاتلوں کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ ہر طرح کی بے حرمتی کے بعد مفرور قاتلوں کی تلاش کا اعلان ضرور کرتی ہے۔ ہر ظلم و استبداد کے خلاف ایوان گونجتے ہیں۔ ہر ناروا سلوک کے بعد عوام کے آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر ان کے رخساروں تک نہیں پہنچتے کہ کھادی کی اجلی دستیوں میں وہ جذب کر لیے جاتے ہیں۔ یہ حکومت کا سب سے بڑا احسان ہے۔ اگر اب بھی کوئی حکومت کا احسان فراموش سمجھے تو اس نوطبقی کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

———

انیس سلطانہ
(بھوپال)

ہم نے مقالہ پڑھا

کہاں ہم جیسے مرنجان مرنج انسان اور کہاں تحقیقی و تنقیدی مقالہ کا پڑھا جانا۔ مگر جب آدمی کے برے دن آتے ہیں تو وہ ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اگر خود اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے تو احباب چارہ ساز اور دیوانہ بنادیتے ہیں۔

سو وہ ایک ایسے ہی دن کا واقعہ ہے جب ہم بزعم خود آلامِ روزگار سے بے فکر ہو کر تماشا دیکھنے گئے اور خود تماشا بن گئے ہر چند کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم اپنے آپ کو سامعین کی صف میں شامل کرنا ہی چاہتے تھے کہ اشارۂ غیبی ہوا اور ایک تنومند، ذی وقار نیز پر مغز مقالہ ہمیں تھما دیا گیا جسے پڑھنا بھی ہمیں کو تھا اور اگر مائک ساتھ دے تو سننا بھی صرف ہمیں کو تھا۔

لیکن خیر اللہ نے کرم کیا اور بجلی گھر والوں نے ہمارے خلاف قطعی سازش نہ کی، سو ہم بآواز بلند (مائک کی مدد سے) مقالہ پڑھتے رہے اور سچ ...... تو یہ ہے کہ بے سمجھے بوجھے پڑھتے رہے۔ صاحب مقالہ نیا دانہ کھانے اور نیا پانی پینے سے صاحب فراش ہو چکے تھے۔

اللہ اللہ آج بھی سامعین کا ظرف اس غضب کا ہے آدھے گھنٹے یعنی کہ مکمل تیس منٹ تک سوئی پٹک خاموشی کے ساتھ مقالہ سنتے رہے ادھر کیمرہ مین ایک "خاتون گویا" کو دھڑا دھڑ مختلف زاویوں سے نہایت تصویر سے آراستہ کرتے رہے کہ اس کے بعد پھر یہ موقعہ ملنے والا نہ تھا۔ حاضرین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

نہیں معلوم ہم نے کیسے کیسے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھایا۔ ٹھیک ٹھیک کہہ دمیاں مقالہ ان گنت اشعار

بھی پڑھے۔ اسرارِ خودی کی تہیں کھلتی رہیں اور ہم بے خود ہوتے ہوئے اپنے سامعین باوقار کی سمع خراشی کرتے رہے جو گناہ انھوں نے کیے بھی نہیں اس پر شرمندہ کرتے رہے۔

مگر آخر کو ہمیں بھی خاموش ہونا ہی تھا۔ مقالہ ختم ہو رہا تھا...... اور دنیا کی ذرا ختم ہو گیا۔ ہم نے اپنی سانسیں درست کیں...۔ حواس درست کرنے سے اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس لیے انھیں بدستور رہنے دیا کہ پاسبانِ عقل کو تنہا چھوڑ دینے ہی میں عافیت تھی اور یوں ہم بھی اپنے کو سامعین کی صف میں پہنچا سکے۔

بلا مبالغہ تحقیقی و تنقیدی مقالوں کی بھیڑ نے ہمیں آج تک مرعوب کر رکھا تھا۔ آج اس میں شرمندگی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ یہ طول طویل مقالے اظہارِ علمیت ہی نہیں خراجِ عقیدت کے بوجھ سے بھی آراستہ تھے۔ سوئیاں کسی کے پاس نہ تھیں وگرنہ پھینک کر دیکھ لیتے۔ لکھنؤ کی بھول بھلیاں میں البتہ گائیڈ ایک سرے پر ماچس جلاتے ہیں اور دوسرے سرے پر .... آواز سنائی دیتی ہے کہ جس میں فن کی چابک دستی اور خموشی کی ہنرمندی دونوں کو ہی دخل ہوتا ہے۔ یہاں بھی خموشی اور نا ہنری نے مل جل کر عجب سماں پیدا کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی بے ساختہ کوئی عاشقِ جگر چاک و سینہ فراغ مقالے کے دوران پڑھے جانے والے اشعار کو دہراتے، کبھی دل ریش و سینہ فگار صوفیانِ پاک باطن عالمِ وجد میں بھی آجاتے..... لیکن جلد ہی ان کی بے خودی انھیں ہوشیاری کی منزل سے کھینچ لاتی اور وہ بیٹھے وہاں رہ جاتے۔

اس دن ہمارے ستارے عروج پر تھے اور ہم دل ہی دل میں عروجِ آدمِ خاکی سے ستاروں کو سہما ہوا دیکھ رہے تھے۔ دن کے دو بج چکے تھے۔ ستارے سہم سہم کر کب کے روپوش ہو چکے تھے اور ناقدینِ کرام کی مدبرانہ تقریریں و تحریریں اپنا فرض ادا کر چکی تھیں۔

بایں تن و توش ہم اپنے کو بڑا سبک محسوس کر رہے تھے کہ اچانک ایک بڑی تعداد نے ہمیں گھیر لیا۔ ہم گھبرائے مگر اپنی گھبراہٹ پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالے رہے۔ ہر طرف سے ہمیں مقالہ پڑھنے پر مبارکباد دی جا رہی تھی۔

کسی نے پڑھنے کے انداز پر بے اندازہ داد دی۔ ہم نے یوں قبول کرلی کہ اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔

کسی نے دبی زبان سے کہا مقالہ تو اچھا تھا مگر ذرا لمبا تھا۔

قائل ہو گئے ہم بھی اس مروت کے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری پیٹھ پھیرتے ہی یہ بور ہونے کی نوید دیں گی اور مقالہ کے بکواس ہونے کی بشارت بھی ——— لیکن ہائے اپنی تہذیب اور کہ جسے رکھ رکھاؤ بھی کہتے ہیں۔ سامنے کوئی بہانہ کہے گا

ایک جانب سے مشورہ آیا کہ اشعار بہت اچھے تھے لیکن آپ کے پڑھنے سے نظم اور نثر کا فرق ہی سمجھ میں نہ آسکا

قائل ہو گئے ہم ان کی صاف بیانی اور اپنی کج مج بیانی کے۔ جہاں تک ہمیں یاد تھا ہم نے دورانِ مقالہ خوانی بیشتر اشعار حذف ہی کر دیے تھے۔ کہتے کہتے ہمارا سینہ چھلنی ہوا جا رہا تھا کہ وہ مقالہ ہمارا نہ تھا۔ ہمیں تو بس پڑھنا تھا۔

کہیں سے سرگوشیوں میں آواز آئی: "چلو دانشوروں کے بیچ انھیں بھی نمایاں ہونے کا شوق چرایا"

اللہ اللہ یہ ہم اور یہ محفل اور یہ مقالہ خوانی۔ شاید ہمارے تو صرف خوانی کرنے پر کسی کو اتنا اعتراض نہ ہوتا جتنا دوسرے سے یوں مقالہ پڑھنے پر اہلِ علم کو شکوہ رہا۔

—o—

سلطان زاہد محی الدین
(حیدرآباد)

مجھے میری بیوی سے بچاؤ

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اپنے دشمنوں سے بچنے کا انتظام انسان خود ہی کر لیتا ہے۔ البتہ دوستوں سے بچنا محال ہے اور اپنی رفیقۂ حیات سے بچنا ناممکن! تاہم اس صدی میں بہت سے ناممکن کام ممکن ہو گئے ہیں۔ انسان کے لیے بجلی کو زنجیروں میں جکڑنا اور طوفانوں کو رستیوں میں روکنا آسان ہو گیا حتیٰ کہ اپنے پہلو میں دھڑکتے دل کو بدل لینا بھی ممکن ہو گیا لیکن کسی دکھی دل کے درد کا مداوا کرنا ابھی تک آسان نہیں ہو سکا۔ کسی کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنا آج بھی دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سات پشتوں سے سپہ گری کرنے والے شاعر غالب کی آنکھ بھی بھر آتی ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

آج عاشقانِ صادق کا کام آنسو بہانا اور فریاد کرنا نہیں بلکہ بزمِ ناز میں ہنس ہنس کے آبلوں کو چھپانا، مسکرانا اور گنگنانا ہے، مردوں کی مسکراہٹ میں مونالیزا کی دلآویزی تو نہیں ہوتی لیکن کیسنجر اور کلنٹن کی ڈپلومیسی ضرور ہوتی ہے، اکبرِ اعظم سے اکبر الہ آبادی تک یہ حقیقت روشن رہی کہ اکبر ہیں نہیں کسی سلطان کی فوج سے۔ لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے!

اقبال کے جوشِ جنوں کی حکایتیں آسمانوں میں گونجتی ہیں لیکن جب وہ بزمِ ناز میں ہوں تو تابِ جنوں بھی نہ ہو کہ وہ پوچھتے ہیں!

عالم جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

مردوں کی ساری عقل و حکمت فرزانگی اور دیوانگی بیگم کی ایک جنبشِ ابرو کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے عہد میں بیویوں کو شوہروں سے شکایت ہو تو فیض کو کہنا پڑتا ہے کہ

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

عقلمندوں نے کہا ہے کہ مردوں کو جس قدر ممکن ہو شادی سے بچنا چاہیے اور عورتوں کو جس قدر جلد ہو سکے اس قلعہ میں داخل ہو جانا چاہیے گویا شادی عورتوں کے لیے پروانۂ آزادی ہے اور مردوں کے لیے طوقِ غلامی۔ ایک پرانی مثل ہے کہ شادی ایک پھل ہے جو اسے کھایا وہ پچھتایا اور جو نہ کھایا وہ بھی پچھتایا۔ اکثر مردوں کی رائے یہ ہوتی ہے کہ جب پچھتانا ہی انسان کا مقدر ہے تو بہتر ہے کہ کچھ کرکے پچھتاؤ۔ شادی سے پہلے ہماری بھی یہی رائے تھی جو اب بدل چکی ہے۔ شادی کے بعد ہر چیز بدل جاتی ہے! بعض ادیبوں نے لکھا ہے کہ شادی اچھی چیز سہی لیکن ہم سے ہمارے اچھے دوست چھین لیے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک سماجی جبر ہے۔ ارسطو کے نزدیک دو جسموں اور روحوں کے اتحاد کا نام شادی ہے! ہم یہ کہیں گے کہ یہ پھل شہد سے زیادہ میٹھا بھی ہے اور شہد کی مکھیوں سے زیادہ خطرناک بھی! اس میں راحتِ روح اور عیشِ زندگی بھی ہے سامانِ موت بھی:

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے!

اس طرح کسی نے خوب کہا کہ موت انسان کو دو قسطوں میں آتی ہے۔ پہلی قسط اس وقت وصول ہوتی ہے جب تقریب شادی خانہ آبادی ہوتی ہے۔ انسان جیتے جی جنت میں پہنچ جاتا ہے پھر دوسری قسط اس وقت وصول ہوتی ہے جب ملک الموت اس دنیا سے رہائی کا پروانہ لاتے ہیں۔ انسان مجازی جنت سے حقیقی جنت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ یہاں ان بے چارے نصیبوں کا ذکر نہیں جو بے موت مارے جاتے ہیں:

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

سچ پوچھو تو شادی ایسا کام ہے جو نہ کرو تو حسرت اور کر گزرو تو عبرت!

قدیم زمانے میں شادی کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی جو کوئی بہادری سے یہ کارنامہ انجام دیتا... اسے گھوڑے پر بٹھا کر سارا شہر گھمایا جاتا لوگ تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے لیکن جب گھوڑے گدھے کی تمیز ختم ہو گئی تو ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اور دنیا سے یہ رسم بھی ختم ہو گئی!

پہلے عورتیں مردوں کی بے وفائی پر آنسو بہاتی تھیں اب ہنستی مسکراتی ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے۔ مائیں بچوں کو جوان کرتی ہیں اور بیویاں جوانوں کو بوڑھا کرتی ہیں۔ مشرق کی مثل مشہور ہے کہ "کچھ دن ساس کے تو کچھ دن بہو کے" لیکن وہ تو سارے دن عورتوں کے ہیں مردوں کے حصے میں صرف راتیں آتی ہیں اور وہ بھی

ہماری زبان میں عورتوں سے باتیں کرنے کو "غزل" کہتے ہیں اور دانائوں کا خیال ہے کہ جب عورتیں باتیں کریں تو اسے "ہزل" کہتے ہیں، خدا نے عورتوں کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا ہے۔ پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ عقل مند اسے سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ویسے یہ مسئلہ بڑا نازک ہے صنفِ نازک سے بھی نازک! ہم اتنا کہنے کی جسارت کریں گے کہ اگر خدا نے عورت کو مرد کی پیشانی سے پیدا کیا ہوتا تو اسے سر پر بٹھانا واجب ہوتا اگر پیروں سے پیدا کیا ہوتا تو اس کی جگہ مرد کے قدموں میں ہوتی لیکن خدا نے عورت کو ہر افراط و تفریط سے بچایا اس لیے عورت کی جگہ مرد کے پہلو میں ہے، دل سے قریب! اسی لیے وہ دل کے دروازے کھٹکھٹاتی ہیں۔ دنیا میں عورت کو سب کچھ آتا ہے، صرف خاموش رہنا نہیں آتا۔ ایک خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے اور ایک آفت کی پرکالہ ہزار بلاؤں کو جنم دیتی ہے!

اچھی صورت دل کو متاثر کرتی ہے اور اچھی آواز روح کو وجد میں لاتی ہے اس لیے ہم اپنی بیگم سے کہتے ہیں بیگم! آپ گاتی رہو۔ آپ کی آواز کے اجالے میری زندگی کے اندھیروں کو دور کر دیں گے۔ وہ بتی گل کر دیتی ہے۔

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

محبت بہت اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اس لیے اسے کفایت سے خرچ کرنا چاہیے لیکن خواتین اسے بڑی فیاضی سے خرچ کرتی ہیں! آخر میں گھر والوں کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ ان کے حصے میں جھڑکیاں اور گالیاں ہی آتی ہیں۔ اس لیے مرد گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ گالیوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جب کبھی محبت کی بات چھڑتی ہے عورتیں بڑی جذباتی ہو جاتی ہیں لیکن زندگی صرف محبت ہی نہیں بقول شاعر اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔۔۔

زندگی صرف محبت ہی نہیں اے دوست!

زندگی پھول ہی پھول نہیں لیکن گلشن ہی گلشن ہے جہاں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی، جہاں نسیم سحر کی اٹکھیلیاں بھی ہیں اور بادِ صرصر کے جھونکے بھی، جہاں بہاروں کی سوغات بھی ہے اور خزاں کی ویرانیاں بھی۔ سوال یہ ہے کہ:

ان اندھیروں سے کوئی کیسے بچے

وہ اندھیرے کہ جو روشنی سے ملے

فطرت کی ادائیں بڑی دلکش اور حسین ہوتی ہیں، پرندوں کے لیے اڑنا اور مچھلیوں کے لیے تیرنا مشکل نہیں ہوتا۔ ہمارے لیے قلم چلانا ایسا ہی ہے جیسا ہماری بیگم کے لیے زبان چلانا۔۔۔۔ وہ اپنی دانست میں بہت کم گو ہیں لیکن جب بولنے پر آتی ہیں تو دنیا کا کوئی موضوع نہیں چھوڑتیں جیسے وہ ہماری بیوی نہیں بی بی سی لندن ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے لیکن زبانی جمع خرچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ دنیا کی تمام عورتوں کا اصول ہے کہ جب تک کوئی بات ممکن نہ ہو تب تک شروع کر دو!۔۔۔۔ ہم نے ایک دفعہ اپنی بیگم سے کہا بیگم! ہم معلوم جنتی ہیں، یہ عرض کیا تم اتنا بولتی ہو میں خاموش رہتا ہوں۔ میں صبر کرتا ہوں تم شکر کرتی ہو۔ تم شاکرہ اور میں صابر۔

کا مقام جنت ہے وہ ہمیں ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے انھیں ہمارے جنتی ہونے پر شبہ ہو، شک کرنا عورتوں کے لیے کوئی خاص بات نہیں البتہ شک نہ کرنا بڑی خاص بات ہے۔

ایک مولوی بیگم کے سوالات کی بوچھار کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے پوچھا بیگم! آج کی دنیا میں مرد کے لیے ٹی وی ضروری ہے یا بیوی؟ فرمایا بیوی اشد ضروری ہے، ہم نے کہا ٹی وی سے دنیا کی خبریں ملتی ہیں۔ فرمایا، ساری خبریں تمھیں میں سناتی ہوں اور تبصرے مفت!

پھر بیگم کی ایک دلیل نے ہمیں لاجواب کر دیا فرمایا آپ ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول سے اپنی ناک پر بیٹھی مکھی نہیں اڑا سکتے جب کہ میں اپنے ہاتھ میں موجود کسی بھی چیز سے مکھی مار دیتی ہوں، یہ کہا اور نمک دانی سے مکھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اب ہماری ناک سوجھ گئی ہو تو اس میں ان کا کیا قصور؟ کون کہتا ہے کہ نادان کی دوستی جی کا جنجال؟

" وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں!

عورتیں ہر لحاظ سے مردوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ ان کی محبت میں استقلال کا رنگ جھلکتا ہے۔ جبکہ مردوں کو پہلے غصے پر پیار آتا ہے پھر پیار پر غصہ!

ہمیں خوب یاد ہے کہ کبھی ہمیں بیگم کا غصہ میں تمتماتا چہرہ نظروں کو سرور بخشتا تھا، انھیں غصہ دلانے کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا، جمال جب جلال سے ہم آہنگ ہو جائے تو کمال ہو جاتا ہے ——— محض چھیڑ چھاڑ کے لیے ہم نے کہا بیگم! یہ لپ اسٹک بڑی واہیات چیز ہے۔ اس کا رنگ اچھا ہوتا ہے نہ مزہ۔ تم روز اس قدر میک اپ کیوں کرتی ہو، پرانے جوتے کو پالش کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس ڈائیلاگ نے ہمیں اتنے جوتے پڑے کہ دنوں تک ہمارا سر اور ان کا پیر بھاری رہا ———

ایک دفعہ ہم نے انھیں کسی بات پر بہت غصہ دلایا، شریف زادی غصہ پی گئیں، ہم نے پانی کی صراحی آگے بڑھائی اور کہا اب کچھ پانی بھی پی لیجیے آؤ دیکھا نہ تاؤ صراحی اٹھائی اور سر پر دے مارا ہم پانی پانی ہو گئے، اچانک ہمیں سقراط کا صبر و تحمل یاد آ گیا۔ ہم نے کہا یہ تو ہونا تھا، مطلع ابر آلود تھا گرج چمک کے ساتھ بوندا باری ہو رہی تھی۔ اس غیر متوقع ردّ عمل سے وہ چونک گئیں اور ہمارے قریب آکر کہا آپ کے سارے کپڑے گیلے ہو گئے۔ ہم نے گرج دار آواز میں کہا بیگم!

" تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

پہلے وہ کہتی تھیں تو ہمارے سوا کوئی نہ سنتا تھا اب وہ کچھ کہتی ہیں تو ہمارے سوا ہر کوئی سن لیتا ہے:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

جب ہم دونوں بات کرتے ہیں تو محلے والے یہ سمجھتے ہیں کہ جھگڑا ہو رہا ہے لیکن بیگم کا اصرار ہے کہ بات کرنے کا صحیح طریقہ ہے، اس طرح لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر میں زندہ لوگ رہتے ہیں۔ گڑے مردے نہیں نہ زندہ دلوں

کا گھر ہے کوئی جال پی کا تکیہ نہیں ہے!

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا تھا جو اپنی بیوی کو ایک بار شاپنگ کروا تا ہے اسے جہنم کے دس گز معاف ہو جاتے ہیں۔ ہم پروردگار عالم سے امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے جہنم کے سارے گز معاف کر دے گا۔ ہماری ساری تنخواہ بیگم کی شاپنگ کی نذر ہو جاتی ہے ـــــــ یوں تو ہمارے عہد میں اتنی ساری سہولتیں ہیں لیکن دو خامیاں، قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ گرانی اس تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے کہ ساری دنیا کی عورتیں اس کی شاکی ہیں اور دوسرے یہ کہ مردوں کی تنخواہیں اتنی قلیل ہیں کہ وہ بیویوں کی شاپنگ کے لیے کافی نہیں ہوتیں اگر دنیا کی معیشت اتنی سدھر جائے کہ ضرورت کی ساری چیزیں سستی ہو جائیں اور تمام مردوں کی تنخواہیں دوگنی ہو جائیں تب بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ عورتوں کی خرچ کی رفتار زیادہ ہوتی ہے یا مردوں کی کمانے کی صلاحیت؟

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جب ہم اپنی بیگم سے کہتے ہیں جانِ تمنا! بزرگوں نے کہا ہے "جتنی چادر اتنا پیر پھیلاؤ" تو وہ کہتی ہیں حضور! یہ اس وقت کی مثل ہے جب عورتیں چادر اوڑھ کر گھروں میں بیٹھی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں چادریں بہت کم بنتی تھیں۔ اب بڑی سے بڑی چادر مارکٹ میں آسانی سے مل جاتی ہے۔

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

شیکسپیئر نے کہا تھا "اے کمزوری تیرا نام عورت ہے" ہم ہندوستانی مرد عورت کو کمزوری نہیں شکتی کہتے ہیں، عورت ملک کی طاقت ہے کمزوری نہیں، البتہ روسی ادیب ٹالسٹائی کی بات ناقابل فہم ہے وہ کہتا ہے عورت کے متعلق میں اپنی رائے اس وقت دوں گا جب میری قبر کھودی جا چکی ہو گی۔ میں رائے ظاہر کرنے کے بعد قبر میں کود جاؤں گا اور تابوت کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے کہوں گا۔ اب میرے ساتھ جو سلوک چاہو کر لو ـــــ!"

دراصل عورتوں کے متعلق ہم مردوں کا علم ابھی بہت ناقص ہے، ہم انہیں ابھی تک "ناقص العقل" سمجھتے ہیں وہ تیر نظر سے گھائل کرتی ہیں اور مردوں کے سینے پر مونگ ہی نہیں دلتیں بلکہ ہوائی جہاز بھی چلاتی ہیں۔ راکٹ سے بم بھی گراتی ہیں گھر اور آفس بھی چلاتی ہیں اور ملک کا نظم و نسق بھی چلاتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں افلاطون جیسے عقل مند مردوں کو جنم دیتی ہیں۔ انسانیت کی عظمت عورت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ آنے والی نسلوں کی پرورش جس گود میں ہوتی ہے وہ گود قابل احترام ہے، عورت کا دل طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے اور یہ رحم و محبت سے معمور بھی ہے۔ دنیا کی سب سے بہترین چیز بہترین عورت ہے جو قابل احترام ہے ایسے میں کوئی کیسے یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے میری بیوی سے بچاؤ؛

کیا یہ ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

•••

محمود نشتر
غزل

سرزد ہوا ہے پیار ردہ ہم سے حماقتاً
ہمراج گھر بھی ہوگیا اپنا غنیمتاً

رستے کی چھیڑ چھاڑ پہ پولس کی مار دھاڑ
میرا کوئی قصور نہیں تھا ارادتاً

واعظ مری شراب کی بوتل کو دیکھ کر
کیا کہہ رہا ہے مجھ سے نہ جانے اشارتاً

ملنا اگر ہے ان سے تو تحفے دلایئے
ہے آج کل کا پیار بھی گویا تجارتاً

دشمن کہ دوست سب کو میں پہچانتا ہوں خوب
قائم ہے رابطہ میرا سب ہی سے ضرورتاً

ہم نے کیا جو عقد بڑی دھوم دھام سے
کرنا پڑا ہے ترک ولیمہ کفایتاً

بڑھتی ہوئی گرانی پہ جب بس نہ چل سکا
فاقوں کی ڈالنی پڑی عادت سہولتاً

دھنس جائے گا زمین میں دشمن کمر تلک
اک دھول ہی رسید جو کر دوں مروتاً

جوتے نمازیوں کے اٹھانے سے فائدہ
بہتر ہے مرغیاں ہی چراؤ شرافتاً

نشتر ہیں تیرے دور کے کیسے مشاعرے
بریانی ہے نہ قورمہ روٹی ضیافتاً

غزل
شجاع الدین عاطف (آسٹریلیا)

جب میرے راستے میں حجامت کدہ پڑا
پھر اپنے گنجے سر کی طرف دیکھنا پڑا

سہرا پہننے کو تو بس اک لمحہ چاہیے
افسوس آدھی عمر مجھے سوچنا پڑا

یوں گائے جا رہا ہے مرا بے سُرا گلا
گھوڑا کہیں ہو جیسے کوئی ہنہنا پڑا

O

اترتی حلق سے ہے یہ جناب آہستہ آہستہ
یہ کرتی ہے جگر کو پھر خراب آہستہ آہستہ

ابھی میں نوشہ ہوں اے قرضدارو سانس لینے دو
کبھی فرصت سے لے لینا حساب آہستہ آہستہ

نہ اترایا کرو اے حسن والو تم ذرا سوچو
سبھی بجھ جایا کرتے ہیں حباب آہستہ آہستہ

ترا یوں غیر سے دن رات ملنا دیکھ کر اب تو
ہوا جاتا ہوں میں جل کر کباب آہستہ آہستہ

مرے ہمراہ بیگم ہیں، رہو محتاط تم دیکھو
نظر سے کر رہے ہو کیوں خطاب آہستہ آہستہ

روانی سے پڑھیں گو آپ چہرے کی کتابوں کو
مگر پڑھیے ذرا دل کی کتاب آہستہ آہستہ

برسنے جب لگیں بیگم تو عاطف نے کہا ان سے
حضور آہستہ آہستہ جناب آہستہ آہستہ

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

سوچنا

ہر سوچنے والا مفکر نہیں ہوتا اور ہر مفکر ہوشیار نہیں ہوتا اسی لیے "غیر دماغ پروفیسروں" کی کمی نہیں ایک مفکر یا دانشور کہہ لیجیے مقررہ وقت میں سوچنا اور ایک ابلا انڈا بھی کھانا چاہتے تھے ایک ہاتھ میں ٹیبل گھڑی اور دوسرے میں انڈا تھا۔ جب پانی ابل پڑا تو انڈے کی جگہ گھڑی پانی میں ڈال انڈا ہاتھ میں لیے سوچتے رہے اور گھڑی ان کے دماغ کی طرح ابلتی رہی۔

گھڑی قید تنہائی کے سوچنے والے سائنس داں گیلیلو کی ایجاد ہے۔ اور اس ایجاد نے بنی نوع انسان کو گھڑیوں کے "چکرویو" میں پھانس لیا ہے۔۔۔

ہر پل ہر گھڑی آدمی سوچتا ہے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے سوچنے کے نتیجے میں کیا کچھ نہیں ہوجاتا۔ نیوٹن نے سوچا سیب شاخ سے ٹوٹ کر نیچے کیوں گرا اوپر کیوں نہیں گیا۔ لیجیے اس "سوچ" نے اتنا ہنگامہ بپا کیا کہ مقناطیسی کشش کے ساتھ آسٹروناٹس اور کاسموناٹس کو ساری دنیا کے محبوب" چودھویں کے چاند" اور ننھے منوں کے "چندا ماما" تک پہنچا دیا۔

کسی نے خدمت خلق کی چاہ میں (ذاتی مفاد میں نہیں) سوچا کہ اخبار نکالیں گے اور اخبار نہ صرف نکل پڑا بلکہ دوڑتا ہوا گھر گھر پہنچا اور سبھی پڑھنے والوں کو پریشان کرنے لگا۔ کسی نے امتحان کا نتیجہ دیکھا باولی میں چھلانگ لگا دی، کسی نے کسی کا "ضرورت رشتہ" کا اشتہار دیکھا اور اغوا پر مجبور ہوگئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اخبار نکالنے کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ کسی نے بھلی چنگی زندگی میں سوچا کہ شادی کریں گے۔ شادی تو کیا ہوتے تباہ ہوگئے۔

ایک غضب کا عمدہ سوچنا یہ ہے کہ زندگی بھر کنوارے رہیں گے، خوش نصیبی سے کچھ لوگ اس میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں یعنی نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ کرکے بھی دکھا دیتے ہیں۔

لیکن ایسے مظاہرے کو بڑے صبر و ضبط سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ [illegible] حریص نہیں ہوتے اس لیے صحت

کے ساتھ عمر میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ ایسی بھی مثال ہے کہ کسی کی صبر کی ڈوری ٹوٹ گئی تو چار کم "سو" میں باضابطہ دھوم دھام سے نکاح کیا۔ مسند سجائی اور پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ اولاد کی نہ صرف پرورش کی بلکہ ان کی بھی شادیاں رچائیں اور بالآخر سنچری پر "بیس برس" کی شان دار اننگز کھیل کر "بیاک ٹو دی پویلین" ہو گئے۔

ادراک کی بلندیاں ہر ایک میں الگ ہوتی ہیں۔ ایک کی سوچ؟ اور دوسرے کی سوچ . . . . . . میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے لہٰذا جب غالب نے فکر کی تو "دیوان غالب" وجود میں آیا اور جب ہم سوچتے ہیں تو کالے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ دیوان تو وجود میں نہیں آتا دیوانوں کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ اور سفید بال بھی "چندیا" چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ادراک کی سرحدیں فتنہ انگیزی سے جا ملتی ہیں کہ عبادت خانے توڑ دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ "اپنی سوچ" کا مقابلہ ہم زد کے بندروں کی سوچ سے کر سکتے ہیں کہ ان کے آرام کے لیے جھولے لگوائے جاتے ہیں۔ حفاظت کے لیے جال لیکن وہ ٹھان لیتے ہیں کہ توڑ کے رہیں گے تو بس توڑ کے پھینک دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ شیطان کا انسان کے لیے آزمودہ تحفہ ہے۔ عجلت پسندی کی "سوچ"۔ کچھ لوگ کبھی کبھی اتنا جلد معاملہ نپٹانا چاہتے ہیں کہ بے چارہ کہتا رہ جاتا ہے کہ کچھ سوچنے کی مہلت دو لیکن وہ سوچنے کے موڈ میں نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں وہ ہو جاتا ہے جو سب نہیں چاہتے تھے پھر کہنے لگتے ہیں "ایسا ہوگا ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا 'خواب و خیال'، گمان میں بھی نہ تھا"۔ کولمبس یہ سوچ کے نکلے تھے کہ انڈیا جائیں گے لیکن پہنچ گئے امریکہ، جس سے ایک عالم کو فائدہ ہوا لیکن جب ہم ہندوستانی سوچتے ہیں تو اکثر دوسروں کا نقصان ہو جاتا ہے

مکان دار سوچتا ہے کرایہ دار کو گھر سے نکال پھینکیں گے لیکن کرایہ دار عدالت کا فیصلہ سامنے رکھ دیتا ہے کہ فلاں تاریخ سے وہ کرایہ دار نہیں بلکہ قانونی طور پر مکان دار قابض و متصرف ہے۔ نوجوان سوچتا ہے کہ "خوب جی بھر کے جہیز لے گا"۔ بعض خسر بلند ہمت، حوصلہ مند واقع ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ سوچ لیتے ہیں کہ چلو بیٹی اٹھ گئی اب اس دنیا میں بیٹھ کر کیا کرنا ہے اور وقت سے پہلے اس پیاری دنیا سے منہ موڑ کر بوریا بستر گول کر لیتے ہیں۔ ایسا سوچنا اور اس پر عمل کرنا بشمول اس کی بیٹی داماد بلکہ آنے والے نواسے نواسوں وغیرہ سب کو اچھا لگتا ہے اس لیے بڑے احترام سے ان کی خبر پر حاضر ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ "زندہ خاموشی" سے تو "ایسی دائمی خاموشی" کا جواب نہیں۔

ہرشد مہتا نے سوچا تھا کہ دو سال میں ارب پتی بن کر دکھلائیں گے اور انھوں نے لمحوں میں بنکوں کو کنگال کر دیا لہٰذا سوچ کے دائرے میں عزم و حوصلہ، ارادہ، قوت گویائی، شرارت، شرافت، عبادت جیسے ستارے جگمگا رہے ہیں اچھے ستاروں کا انتخاب کیجیے اور ان کی "لائٹ" دنیا میں پھیلایئے تاکہ دنیا جنت جیسی لگے۔ ●○

رشید قریشی

کھنّہ صاحب

المعروف بہ شری کھنّہ، شری کنّا، شری کھانا، شری کھنّا !!

(جناب رشید قریشی مرحوم کا یہ غیر مطبوعہ
مضمون جشن کھنّہ کے تقریبی اجلاس میں پڑھا گیا تھا)

کھنّہ صاحب کے خود نوشتہ حالاتِ زندگی کے چند اہم نکات یہ ہیں :

کہ وہ ۱۹۱۴ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے۔

کہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اور کیمبرج یونیورسٹی سے ٹرائی پاس کیا۔

کہ وہ واحد ہندستانی ہیں جنہیں آئی اے ایس کے ساتھ کیمبرج کرکٹ بلو کا اعزاز حاصل ہے۔

کہ اردو مزاح میں اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

کھنّہ صاحب کا یہ مختصر تعارف با تصویر ہے۔

میں اپنے مضمون کو خود صاحب تصویر سے آراستہ کرتا ہوں۔

چالیس برس پہلے کھنہ صاحب تقریر نشر کرنے نشر گاہ آئے تھے۔ میں نشر گاہ کے ایک کارکن کی حیثیت میں ان کا خیر مقدم کرنے کیلئے موجود تھا۔ خوش پوش گٹھا ہوا تنومند جسم۔ دلکش ملاحتوں سے دمکتا چہرہ۔ عہدہ کا اعزاز اور شہرت کا انجاز گردن کی استامت اور آنکھوں کی چمک سے ہویدا۔ مسکراہٹ سے کچھ دبتی ایک خوشنما جھلک کو ہونٹوں میں دبائے۔ اپنی غلبہ گیر شخصیت کو ساری فضا پر مسلط کرتے۔ جچے تلے جمے تک قدم ڈالتے کھنہ صاحب اسٹوڈیوز کی طرف بڑھے۔ ان کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے احتراماً میں نے اپنی گردن جھکائی اور اپنا نام بتایا۔ کھنّہ صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُس ہاتھ کو تھام کر میں نے محسوس کیا۔ اس میں جو نرمی ہے وہ قلم کے لئے ہے۔ جو گرمی ہے وہ زندگی کے لئے ہے جو سختی ہے وہ دنیا کے لئے ہے۔

یہ کھنّہ صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں ریڈیو اسٹیشن چھوڑ کر سکریٹریٹ چلا گیا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ خوش نصیبی مجھے یہاں لے آئی ہے کیونکہ یہاں کھنہ صاحب کی راست ماتحتی کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ میں اپنی مشلیں خود ہی لیجاتا کہ اس تقریب سے ملاقات کا موقع مل سکے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کھنہ صاحب نے میری رائے سے اختلاف کیا ہو۔ مسودہ کی کسی غلطی کو درست

ہوتے تو مجھ سے پوچھتے اگر اس کو اسطرح کر دیا جائے تو؟ ... میں کہتا اس کو تو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ ابھی مسلسل تین دن
موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور حسین ساگر کا پانی محافظ خانہ میں گھس آیا اس پانی کے ساتھ ایک سانپ بھی اپنی کھوئی
جنت کو ڈھونڈتا سکریٹریٹ پہنچ گیا۔ مثلوں کے بستوں کو جھٹکتے ہوئے محافظ خانہ کے اٹنڈر نے سانپ کو دیکھا تو سانپ
سانپ چیختا ہوا باہر نکل آیا۔ سکریٹریٹ کے کارکن تو بالعموم تماشہ پسند ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اٹنڈر کے اطراف
ایک مجمع لگ گیا اور نعرے اٹھنے لگے۔ سانپ نکلا ہے جان کو خطرہ ہے ... چھٹی دو۔ گھر جانے دو۔ میں نے جلدی سے
ایک نوٹ لکھا اور کھنہ صاحب کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ میری تجویز تھی کہ سانپ کو ہلاک کر دینے کے لئے کوئی آمادہ نہیں
اسلئے مناسب ہوگا اگر کسی سپیرے کی خدمات حاصل کی جائیں اور سانپ کو پکڑوا کر زو بھیجدیا جائے۔ سپیرے کو اس کام
کا معاوضہ دینا ہوگا۔ کھنہ صاحب نے پوچھا ... معاوضہ ... کتنا معاوضہ ...؟ میں نے جواب دیا۔ اٹنڈر کو ایک سپیرا
گیٹ کے پاس ہی مل گیا ہے اور وہ دس روپے مانگتا ہے۔ کھنہ صاحب نے منظوری دیدی۔ سپیرے نے بین پر فلم ناگن
کی ایک جھومتی دھن بجا کر سانپ کو پکڑ لیا۔ اس خبر کو ملٹز نے اسطرح چھاپا کہ آندھرا پردیش سکریٹریٹ میں ایک سانپ نکلا تو
اسے پکڑنے کے لئے ریاست کے سارے سپیروں سے ٹنڈر طلب کئے گئے۔ دوسرے دن وہی اٹنڈر بھاگا بھاگا میرے
پاس آیا کہ صاب کل جہاں سانپ تھا آج وہاں اس کی مادہ آ بیٹھی ہے ... بہت بپھری ہوئی ہے۔ اتنے میں دو چار اور
اٹنڈر آ گئے اور سراسیمہ لہجے میں کہنے لگے صاب اس سانپ کو بھی سپیرے سے پکڑوانا چاہیئے ورنہ یہ تو مادہ ہے ...
غصہ میں بھری ہوئی ... جس نے اس کے نر کو پکڑوانے کا انتظام کیا ہے .... اس کی خیر نہیں ... میں کھنہ صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ اور انھیں اس تازہ صورتحال سے آگاہ کیا۔ کھنہ صاحب سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہو گئے۔ ہنسی کی اچانک تحریک ہو تو
جس انداز سے ہنستے ہیں انھوں نے میرے پیش کردہ نوٹ پر تحریر کیا۔ پہلے سانپ آیا ... پھر اس کے لئے بے چین
ہو کر اس کی مادہ آئی اور ان دونوں کے پیچھے یقیناً ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچے بلکتے آ جائیں گے۔ میں مزید کسی منظوری
کا حامی نہیں ہوں۔ میں نے کھنہ صاحب کا حکم سپیرے کو سنا دیا۔ وہ سماجی کارکن نکلا اور کسی معاوضہ کے بغیر ہی سانپ
کی مادہ کو پکڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور جب وہ محافظ خانہ سے باہر آیا تو سانپ کو پکڑ کر اسطرح گھماتا ہوا جیسے سرکس کا
سدھانے والا ہنٹر باز ہے۔ اچھی خاصی بھیڑ کو اپنے ساتھ لئے وہ سکشن سکشن گیا اور ہر جگہ خاتون کارکنوں کے قریب
پہنچ کر سانپ کو ان کے چہروں کے مقابل لہراتے ہوئے چندہ وصول کرتا گیا۔ کھنہ صاحب بھانپ گئے تھے کہ سانپ
سپیرے کا چھوڑا ہوا ہے لیکن مجھ سادہ لوح کا دل رکھنے کے لئے انہوں نے سپیرے کی خدمات حاصل کرنے کی منظوری دیدی۔
کھنہ صاحب کی ماتحت نوازی کا ایک اور واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے ایک باورچی کو گیسٹ ہاؤز
کے عملہ میں بھرتی کرنا چاہا۔ اس کی درخواست اس تجویز کے ساتھ سکشن کو وصول ہوئی کہ جانچ کے بعد رپورٹ پیش ہو۔
گیسٹ ہاؤز والوں سے پوچھا گیا انہوں نے جواب دیا کہ کوئی جائیداد تقرر طلب نہیں ہے اس جواب کی روشنی میں درخواستگذا
کو فہمائش دیدی گئی کہ اس وقت درخواست پر کوئی غور نہیں ہو سکتا۔ اس غیر متوقع جواب کو اس باورچی نے مناسب موقع
پر وزیر اعلیٰ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور عملہ حکمی کے مرتکبین کا جواب طلب کیا۔
کھنہ صاحب متعلقہ ڈپٹی سکریٹری تھے۔ انہوں نے مددگار معتمد کو بلا کر تفصیلی نوٹ دینے کی ہدایت کی۔ مددگار
معتمد بہت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے مجھ سے غلطی ہو گئی ہے جناب اب کیا کروں۔ کھنہ صاحب نے کہا اب کچھ

مت کیجئے اپنا نوٹ میرے پاس بھیج دیجئے۔ مددگار معتمد کا نوٹ آیا تو کھنہ صاحب نے اس پر لکھا۔ سکشن سے جو غلطی اتفاقیہ سرزد ہو گئی ہے اس کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ نفسِ معاملہ میں میں نے شخصی طور پر مطلوبہ معلومات حاصل کر لی ہیں اور جلد ہی تعمیلی رپورٹ گزران دونگا۔ چیف سکریٹری نے لکھا۔ اب کسی مزید کارروائی کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اور وزیر اعلیٰ نے تعمیلی رپورٹ کے نیچے دو لکیریں کھینچ کر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ اگر کھنہ صاحب شریفانہ مشفقانہ حاکمانہ جرات کے ساتھ سینہ سپر نہ ہو جاتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ وزیر اعلیٰ کے منہ چڑھے باورچی کی درخواست کو رد کر دینے کی پاداش میں کم از کم تین گھروں کے چولہوں کی آگ بجھا دی جاتی اور فی چولہا چھ پیٹ ہی شمار کئے جائیں تو اٹھارہ پیٹ بھوکے کھنڈر بن کر رہ جاتے۔

دفتر سے باہر بھی کھنہ صاحب کا یہی اصول رہا۔ ہر شخص کی امکانی مدد اور دل شکنی کسی کی بھی نہیں۔ جب وہ ادارہ اکیڈیمی کے ڈائرکٹر تھے۔ سکریٹریٹ کا ایک خستہ حال اٹنڈر آیا۔ گڑگڑانے لگا کہ صاحب آپ نے جس بیٹی کی شادی میں مدد کی تھی اسے اس کے شوہر نے چار بچوں کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا ہے۔ مظلوم ہوں' مقروض ہوں' مدد کا محتاج ہوں۔ کھنہ صاحب نے اسے باہر ٹھہرنے کو کہا اور میرے جانے کے بعد اسے اندر بلا لیا۔ جب وہ اٹنڈر واپس جا رہا تھا تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے اور وہ دوسرے ہاتھ سے بار بار اپنی آنکھیں صاف کرتا جاتا ہے میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا "اللہ صاحب مصیبت ڈالتے ہیں کھنہ صاحب مصیبت ٹالتے ہیں۔ اللہ ان کو اچھا رکھے۔

کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی کہ کھنہ صاحب صرف شفقت اور مروت کو بروئے کار لاتے ہوئے کس طرح نظم و نسق کو قائم رکھ لیتے ہیں ایسے سرکش جو سخت سے سخت سزا کو بھی خاطر میں نہ لائیں کھنہ صاحب کی صرف تیوری کے بل یا لہجہ کی سختی سے راہ راست پر آ گئے۔ میں کہتا جناب عالی یہ آپ کے کردار کی عظمت ہے' آپ کی انسانیت کا کرشمہ ہے یا آپ کی نیک طینتی کا سحر ہے ... جو میرے کا جگر بھی کٹ کے رہ جاتا ہے۔ جواب ملتا' آپ کی عنایت ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ سخت گیری میری طبیعت ہی میں نہیں۔ فطرت کی اس فیاضی پر مجھے رشک آتا ہے کہ مہربان ہوئی تو ایک شخص کو ہی سب کچھ بنا ڈالا: اچھا انسان' ذہین طالب علم' ممتاز کھلاڑی' کامیاب عہدیدار' محبوب شوہر اور مقبول مزاح نگار بھی۔ کھنہ صاحب فطری مزاح نگار ہیں اور اب کہنہ مزاح نگار بن گئے ہیں۔ مزاح کے بدلے رجحان کے ساتھ ان کا مزاح بھی نئے رنگوں میں نکھرتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مزاح آبشار نہیں۔ صاف و شفاف رواں پانی ہے جو سبزہ کی اوٹ میں چھل چھل چھل بہتا رہتا ہے۔ "ضرورت ہے ایک صدر کی"۔ کا ایک اقتباس ملاحظہ:

"صدر کے انتخاب میں صدر کی صحت کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ بانیان جلسہ اپنے شکار کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی ماہر باورچی مرغ خریدتے وقت اس کے صحت مند ہونے کا یقین کر لینا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد کا ایک منظر ہے۔

"صدر کو ہار پہنایا جاتا ہے جن کو گلے سے اتار کر موصوف میز پر رکھ دیتے۔ کنوینر صاحب میز پر سے ہار ایک کارکن کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ تصویر کشی میں آسان ہو مگر وہ کارکن کو یہ تاکید بھی کر دیتے ہیں کہ ہار کو [illegible] رکھنا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ہار اپنی افادیت کی آخری منزل [illegible] اس وقت پہنچتا ہے۔ جب کنوینر صاحب اس کو دوسرے صدر کے پہنچنے سے بچا کر بالآخر اپنے گھر لیجاتے ہیں اپنی بیگم کو [illegible] کوشش کرکے عرض کرتے ہیں: ہار پھولوں کا مری جان تیرے واسطے ... آخر شب!"

امریکہ کے قیام کے دوران ایک مشغلہ کا احوال یوں بیان ہوا ہے :

"آپ کا یہ خاکسار۔ ٹیلی ویژن کا دیوانہ تھا اور اکثر و بیشتر ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے ان امورِ خانہ داری سے گریز جاتا تھا جو نیک بخت نے میرے تفویض کر دیئے تھے ۔ایسا کرنے جب وہ آواز دے کر مجھے ٹیلی ویژن کے سامنے سے اٹھانے کی کوشش کرتی تھیں اور میں ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا تو پھر وہ میرے نزدیک آ کر خشمگیں نگاہوں سے چنگاریاں برساتے میری آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ ہلاتی تھیں تو میں شانے ہلا کر اپنی بے بسی کا اظہار کر دیتا تھا ۔میری عمر کے لوگوں کو بعض دفعہ ٹی بی ہو جاتا ہے مگر دوستو میرے رویئے کے بارے میں تنقید کی تلوار بے نیام کرنے سے پہلے یہ ملحوظ رہے کہ امریکہ میں مجھے "ٹی وی" ہو گیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کھنہ صاحب کی مزاح نگاری کی خصوصیات کے اندازہ کیلئے یہ نشاندہیاں کافی متصور ہوں گی۔ کھنہ صاحب آپ کو صاحب جشن ہونا مبارک ہو۔ آپ سے عرض کرنا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا اس کے بارے میں آپ توثیق کر دیں کہ جو کچھ بھی کہا گیا وہ سچ تھا۔ حقائق پر مبنی تھا اور یہ کہ من گھڑت یا مبالغہ اس میں بالکل نہیں ... اور آپ میری اس کوتاہی کو بھی معاف فرمائیں کہ میں اپنی لاعلمی کی بنا پر آپ کی بہت سی اچھائیوں کے اظہار سے قاصر رہا۔

اور آیئے اب ہم سب اپنی محبت اور عقیدت کی وساطت سے دعا کریں کہ وہ انسان جس نے انسانیت کو انسان کی تلاش میں بھٹکنے نہیں دیا۔ جس نے اپنی وضعداری، اصول پسندی اور اعلیٰ ظرفی سے تہذیب و شرافت کی روایتوں کو مٹنے نہیں دیا۔ وہ انسان جس نے اپنی مسکراہٹوں کو تقسیم کر کے مسکراہٹوں سے محروم لوگوں کو رونے نہیں دیا۔ وہ انسان ہم میں تادیر بطور مزاح نگار سلامت رہے ۔

●●

مسیح انجم
(حیدرآباد)

بھارت چند کھنہ کی یاد میں

۲۰ اپریل کی صبح ابھی میں اپنے بستر سے اٹھنے اور سستی کو بھگانے کی تیاری میں اپنے ہاتھ پیر جھٹک ہی رہا تھا کہ میرے بڑے لڑکے نے کسی قدر بدحواسی میں کہا کہ "بابا! ان کا انتقال ہو گیا ہے!!"

میں نے سٹپٹا کر پوچھا "کن کا؟"

وہ بولا "بھارت چند کھنہ صاحب کا!"

میں اپنے ہاتھ میں اخبار لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "پتہ نہیں آج کل کے نوجوانوں کی فہم و فراست کو کیا ہو گیا ہے؟۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ کون سی خبر کب اور کس طرح سنانا چاہیے؟ خاص طور پر انتقال کی خبر سنانے میں تو بڑی احتیاط برتنی چاہیے جب کہ سننے والے کی حالت ایک مرمت طلب عمارت کی سی ہو۔

کھنہ صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر میں دو، تین منٹ تک بالکل خاموش بیٹھا رہا اور اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو پرسہ دے لیا۔

کھنہ صاحب کی موت کی خبر پڑھ کر مجھ پر نہ تو روایتی انداز کی بجلی گری اور نہ اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ کیوں کہ پچھلے دس سال سے وہ جس انداز کی زندگی گزار رہے تھے اس میں "وجود" "اطلاع" اور "خیر خیریت" نام کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لکھنا اور چھپنا، چھپانا تو دور کی بات رہی اپنی نقل و حرکت پر تک پابندی لگالی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ قلم کو تیاگ کر خود اخوتی کے قول میں بند ہو گئے ہیں۔ اگر اخبار میں انتقال کی خبر شائع نہ ہوتی تو بیسویں صدی بھی گزر جاتی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ اردو دنیا میں بھارت چند کھنہ نام کا ایک شریف مزاح نگار بھی تھا جو شائستہ مزاح تحریر کر کے لوگوں میں تبسم تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ "عمر" کے آخری حصے میں ایک ایسی منزل بھی آجاتی ہے جب کہ ایک ادیب (اگر وہ شریف ہو) اپنے آپ سے کچھ بیگانہ سا ہو جاتا ہے لیکن ایسی بیگانگی کس کام کی کہ زندگی ہی میں لوگ اسے بھلا دیں۔ کھنہ صاحب کو لوگوں نے ان کی زندگی ہی میں بھلا دیا تھا۔

کھنہ صاحب کا وطن پٹیالہ (پنجاب) تھا۔ ان کی کتاب "تیر نیم کش" میں، سن پیدائش ۱۹۱۲ء درج ہے۔ انھوں نے

۱۹۹۵ء

حیدرآباد دکن کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا تھا۔ وہ یہاں ماریڈپلی سکندرآباد میں رہتے تھے۔ وہ ماریڈپلی سے پنجارہ کب گئے کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ بہرحال۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

وہ انتہائی شریف اور نیک نفس انسان تھے۔ ان کی شرافت کی قسم کھائی جاسکتی تھی وہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے پہلے صدر رہے۔ وہ "زندہ دلان" کی میٹنگوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن مشورہ دینے اور حکم مسلط کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انھوں نے "زندہ دلان" پر کبھی بھی اپنی صدارت مسلط نہ کی اور نہ کبھی یہ کہا کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ وہ کم سے کم وقت میں زندہ دلان کی میٹنگ کو نپٹاتے تھے۔ یوں بھی ہم زندہ دلان ان کے آنے سے پہلے ہی تمام طے شدہ امور تہہ کرکے رکھ دیتے تھے۔ وہ کم بولتے اور زیادہ سے زیادہ سننا پسند کرتے تھے۔ وہ میٹنگوں کو "ہاں صاحب!" "ٹھیک ہے صاحب!" "کیا کریں صاحب!" "اب جانے بھی دیجیے صاحب!" کے ذریعہ بڑی خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچاتے۔ یہ فقرے ان کی کمزوری نہیں بلکہ انکسار کی علامت تھے۔

وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہ جانتے کے باوجود کہ ادبی جلسوں اور مشاعروں میں وقت کی پابندی نہیں کی جاتی، وہ ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں موجود رہتے اور وقت پہ پہنچنے کی اذیت سہتے۔ لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ جب منتظمینِ جلسہ "دیری" کی معذرت چاہتے تو الٹا انھیں شاباشی دیتے اور کہتے کہ ہاں صاحب جلسہ ہے، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ (اسپورٹس مین اسپرٹ اسی کو کہتے ہیں) چوں کہ وہ کرکٹ کے ایک اچھے کھلاڑی بھی رہ چکے تھے۔ اسی لیے ان میں اسپورٹس مین اسپرٹ آگئی تھی۔ بلکہ بہت زیادہ ہی آگئی تھی۔ ان میں صبر کا مادہ زیادہ تھا۔ ناگوار باتوں کو سہنے کا ان کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔ یہ دو خصوصیات ان پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہ رہ سکیں۔ چناں چہ یہی وجہ تھی کہ ان کے چہرے پر دائمی تعزیتی کیفیت قائم رہتی تھی وہ مسکراتے تو یوں لگتا گویا طنز فرما رہے ہوں۔۔۔ ان کی وقت کی پابندی کا ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شادیوں میں دولھوں کا دیر سے آنا ایک روایت بن چکی ہے لیکن اب میں جس شادی کا ذکر کر رہا ہوں اس میں دولھا میاں ٹھیک وقت پر موجود تھے اور ادھر "ایک مدعوئین" بھی ٹھیک وقت پر حاضر۔ یہ دونوں کوئی اور نہیں نوشہ مصطفی کمال اور "ایک مدعوئین" بھارت چند کھنہ تھے جو وقت کی پابندی کی سزا بھگت رہے تھے۔ میں ان دونوں حضرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مصطفی کمال آنکھوں آنکھوں میں رسومات کی ادائیگی میں تاخیر کی کھنہ صاحب سے معذرت چاہ رہے تھے (نوشہ جو تھے) تو ادھر اس کے جواب میں کھنہ صاحب آنکھ کے اشاروں سے کمال صاحب کو تسلی دے رہے تھے کہ پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ بے بس و مجبور تھے۔

کھنہ صاحب کی "نوٹنگ" اور "ڈرافٹنگ" بھی بڑی لاجواب تھی۔ آندھرا پردیش میں جب اردو اکیڈیمی قائم ہوئی تو کھنہ صاحب کو اکیڈیمی کا سکریٹری/ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ اردو اکیڈیمی کے پہلے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ کوئی پانچ ماہ پہلے اردو اکیڈیمی کے قدیم اشلجات کو تہذیب دینے کا کام میرے تفویض کیا گیا تو اس وقت مجھے کھنہ صاحب کی تجاویز کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کی نوٹنگ اور ڈرافٹنگ (اردو بمعہ انگریزی) پڑھنے کے علاوہ دیکھنے سے بھی تعلق رکھتی تھی۔ کسی لفظ کو قلم زد بھی کرتے تو ہوتا کہ مجرم کی گردن تو اڑا دی گئی ہے مگر سر اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے جب "زندہ دلان حیدرآباد" نے "جشن ظرافت چند کھنہ" کے عنوان سے سہ روزہ تقاریب منائیں تو اس موقع پر میں نے کھنہ صاحب پر ایک خاکہ "زندہ دلان حیدرآباد کے پیرو مرشد" کے عنوان سے لکھا اور تہنیتی جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ کھنہ صاحب "جمالی پیرو مرشد" کی تعریف میں آتے تھے۔ جلال تو ان کو آتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک آئی اے ایس عہدے دار ہونے کے باوجود Dignity of labour کے قائل تھے۔ وہ اپنے ڈرائیور اور چپراسی تک کی عزت کرتے اور ان کی ضروریات اور احساسات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

جب تک کھنہ صاحب کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی ایک قسم کی طمانیت حاصل تھی کہ کبھی نہ کبھی ان سے ملاقات ہو جائے گی لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ پٹیالہ کا سفر ان کا آخری سفر ہوگا۔ کھنہ صاحب ایک اچھے ادیب اور ایک اچھے مزاح نگار ہونے کے علاوہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ اور مجھے ایک اچھے اور نیک انسان کے کھو جانے کا غم ہے ●●

قصہ مختصر

(خود نوشت حالات)

نام بجارت چند کھنہ (کھنہ کو بھو کے کھانا، خوش باش "کہنہ" اور خالص جنوبی خطہ کے لوگ "کنہ" بولتے ہیں)

پیدائش: ۲۲ر جولائی ۱۹۱۲ء

وطن: ہندوستان (تقسیم سے پہلے اور بعد)

سکونت: سکندرآباد - آندھرا پردیش میں (نہایت بے سکون)

تعلیم: ایم - اے (عثمانیہ) تاریخ
ٹرائی پوس (TRIPOS) کیمبرج - قانون اور تاریخ میں (جو ملازمت حاصل کرنے میں بالکل بے کار ثابت ہوئی)

سروس: انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس

ع: یہ البتہ کام کی چیز ہے تو ورنہ ہم تھے آدمی کس کام کے

پیشہ: فائیلوں کی فیکٹریوں میں فیصلوں کو ایسے انوکھے فن اور فائن نوک قلم سے تحریر کرنا کہ فریادی کی فریاد فرو نہ ہو اور فائیل فسری طریقے پر رواں دواں اور کارروائی اور فیصلے کے درمیان کے فاصلے برقرار رہیں - نیز یہ امر بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ فیصلوں کی ذمہ داری اپنے عہدہ سے ایک درجہ اوپر والوں کے سر پر رہے - اس فن کے کمال کا مظاہرہ تا دم تحریر مندرجہ ذیل محکموں میں کر سکا ہوں -

بحیثیت: سررشتہ دار محکمہ صدر ناظم محابس
معتمد کمیٹی قیام امن
مددگار ناظم محکمہ اطلاعات
انڈر سکریٹری محکمہ اصلاحات حکومت نظام
(ایک قابل ذکر اصلاح جو یہ محکمہ کر سکا یہ تھی کہ حکومت نظام ختم ہوگئی) مددگار معتمد پبلک سروس کمیشن
معتمد پبلک سروس کمیشن
نائب معتمد (سروسیز) محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن
نائب معتمد (پولیٹیکل) محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن
نائب معتمد (جنرل) محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن
ٹرانسپورٹ کمشنر
زائد معتمد و چیف الیکٹورل آفیسر
لیبر کمشنر
معتمد گورنر آندھرا پردیش

(بہت سے خیر خواہ اکثر و بیشتر گفتگو یا مراسلت کے دوران ہمارا تنزل کر کے ہمیں پرسنل سکریٹری، پرائیوٹ سکریٹری اور پرسنل اسسٹنٹ کی سطح پر لے آتے ہیں پھر بھی شکر ہے کہ ابھی تک پرسنل اٹنڈنٹ کے عہدہ سے ہم کو سرفراز نہیں کیا گیا۔

اولاد: دو لڑکیاں

پہلی یعنی بڑی، چھوٹی سی عمر میں خود دو "چاند کی
ٹکڑیوں" کی ماں بن چکی ہے اور اپنے ماں باپ
کو نانا نانی بنا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس
بزرگی کے رتبے پر پہنچا دیئے جانے پر ہم اور خصوصاً
اول الذکر بڑی شرم محسوس کرتے ہیں۔

دوسری یعنی چھوٹی، کرکٹ کی اصطلاح
میں بالکل "فلوک" سے عالم وجود میں آئی لیکن
اس اوپر والے کی عنایت سے خاندان کی پہلی
ڈاکٹر بن گئی ہے اور نہ صرف صحت قائم رکھنے
بلکہ والدین کو اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے
کے متعلق بھی صحیح مشورے دیتی ہے (اولاد نرینہ
نہیں رکھتا۔ اگرچہ پیشوایانِ مذہب کا خیال
ہے کہ اس کمی کی وجہ سے جنت کے دروازے
ہمارے لیے بند رہیں گے۔ لیکن اولادِ
نرینہ کی چکر میں پڑ کر اور آدھ درجن بچوں کے
باپ بن کر ہم اپنی موجودہ زندگی کو دوزخ میں
تبدیل کر دینے کے لیے تیار نہیں۔ درحقیقت
ہمارا عقیدہ ہے کہ لڑکوں سے لڑکیاں
بھلی کہ لڑکے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا ہاتھ اپنی
پتلون کی طرح تنگ اور ان کی پریشانیوں کو
اپنے بالوں کی طرح دراز کیے رکھتے ہیں۔ باقی
رہے۔ پیشوایان مذہب تو ان کو میرا جواب یہ
ہے کہ:

ہم نہیں شیخ جی ان باتوں میں آنے والے

مشغلے: کرکٹ۔

(پنجاب تقسیم سے پہلے) اور عثمانیہ کی کرکٹ ٹیموں
کی نمائندگی۔ کیمبرج بلو ریاست کی ٹیم کی نمائندگی
... دکھائی۔ بہرحال نمائندہ ٹیموں کے لیے انتخاب
نہ کیے جانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی فرسٹ
کلاس کرکٹ کھیلنا ترک کیا۔ (اب کرکٹ کا منظر
کشی کی کوشش کرتے ہیں) کہتے ہے والہانہ محبت۔ منصوبے کی
ابتدائی جلد رقعت کر رسائل کو دینا اور بعض اوقات دوبارہ تکمیل
ادا کرنا۔

سرکاری طور پر دورہ کرنے کے ضمن میں آل انڈیا
ریڈیو یا کسی رسالہ کے بے وقوف مدیر سے مضمون
لکھنے کے لیے جو معاوضے یا رقوم ملیں ان میں سے
کچھ بیوی کے تصرّف سے بچانے کی ناکام کوشش۔
کچھ سنی دیکھی کو لکھنا نثر میں۔
گھوڑ دوڑ کے میدان میں کامل طور پر اور سرتاپا
چغد ہونے کا ثبوت دینا۔ اس کے باوجود ـــــ
چھٹتی نہیں یہ لت کہ ہے ایسی پڑی ہوئی
سب سے بڑی خوشی: اگر نل کھولیں تو اس میں سے
موت کی ہچکیوں کی سی آوازوں کے بجائے پانی
نکلے۔
اگر بجلی کا سوئچ آن کروں تو کرنٹ کی سپلائی کو اسی
یقین کے ساتھ حاصل کروں جس طرح آج کل
کے امتحانوں میں پرچے حل کرنے کے لیے طلبہ
"فارن ایڈ" حاصل کرتے ہیں۔
ریل یا ہوائی جہاز میں جگہ حاصل کرنے کے لیے
ان اداروں کے بکنگ کلرکوں سے اگر یہ جواب
ملے کہ سیٹ مل سکتی ہے۔
اگر کسی کو لینے یا چھوڑنے کے لیے
ریلوے اسٹیشن یا ایروڈروم (بشرطیکہ موخرالذکر
عجیب و غریب ادارے کے ملازمین اسٹرائیک
پر نہ ہوں) جائیں تو ریل گاڑی یا ہوائی جہاز
وقت مقررہ پر آئے یا جائے۔
اگر سنیما میں فلم ختم ہونے پر اور قومی ترانہ بجنے
کے دوران سنیما بین خلوص و احترام کے ثبوت میں
خاموشی سے بغیر ہلے جلے کھڑے رہیں۔

اگر موٹر کار اور سکوٹر سڑک کے بیچوں بیچ چہل قدمی کرنے والے منچلے راستے سے ہٹ جائیں۔

اگر دھوبن ہمارے کپڑوں سے پتھر توڑنے کی کوشش میں کپڑے پھاڑ کر یا قمیصوں وغیرہ کے بٹن توڑ کر نہ لائے۔

جب ڈاک خانے سے لفافے خریدیں تو بند کرنے کے لیے ان پر گوند لگی ہوئی ہو یا پھر استعمال سے پہلے ہی اس طرح چپکے ہوئے نہ ہوں جس طرح الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے نیتا سے غرض مند

سب سے بڑا استعمال:

اگر کوئی شخص نل کے پانی کا استعمال کرنے کے بعد نل بند کرنا بھول جائے یا اس طرح بند کرے کہ پورا پانی بند نہ ہو یا پھر نل بند کرتے ہوئے اپنی حیوانی قوت کا اس شدت سے مظاہرہ کرے کہ نل بند کرنے کی ٹونٹی کے THREADS تباہ ہو جائیں۔

اگر دعوت میں کوئی شخص اپنے آلودہ ہاتھ سے DISH کا چمچہ پکڑ کر چمچے کا ہینڈل گندہ کر دے (یہ شاید اس مقصد سے کیا جاتا ہے کہ دوسرے اس DISH کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔)

اگر چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش میں کوئی شخص کانٹا اس طرح پکڑے جس طرح تھرمامیٹر پکڑتے ہیں اور چھری اس طرح جیسے قتل کا ارتکاب کرتے وقت قاتل چھرا پکڑتا ہے۔

اگر کوئی مہمان حلوہ یا ایسی ہی کوئی چیز ہاتھ سے کھاتے ہوئے اپنے آلودہ ہاتھوں کو [illegible]

اگر کوئی شخص فلش استعمال کرنے کے بعد زنجیر کھینچ کر یا ہینڈل دبا کر پانی چھوڑنے اور اس کو صاف کرنے کا کام آئندہ استعمال کرنے والے کے لیے چھوڑتا ہے۔

جب کوئی معزز مہمان ڈھیر سا تیل سر میں ڈال کر تشریف لاتے ہیں تو اپنے سر کو ہمارے گھر کی دیواروں سے رگڑتے ہیں اور جب ایسا کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو صوفے پر دراز ہو جاتے ہیں تاکہ اپنی یادداشت کے نشان مستقل طور پر چھوڑ جائیں۔

جب کوئی احمق، معزز مہمان ہماری موٹر سے اترنے کے بعد ہندوستانی ساخت کے موٹر کے دروازے کو بند کرنے کے لیے، ایسی وحشیانہ قوت سے دے مارتا ہے کہ نہ صرف موٹر کا مالک بلکہ اس کے دروازے کا تمام اندرونی سسٹم درہم برہم ہو جاتا ہے اور موٹر کے دروازے کو مزید استعمال کرنے کے لیے بیس پچیس روپے کے اخراجات کا بار الگ اٹھانا پڑتا ہے۔

ہماری سب سے بڑی شیخی:

ہندوستان کی وہ واحد شخصیت ہونا جس کو کیمبرج کرکٹ بلو ہونے کے ساتھ ساتھ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کا رکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ہماری شہرت:

کیا بھلا لوگ اگر ہم کو گدھا کہتے ہیں
ہنسی آتی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

○

بھارت چند کھنہ

توضیحِ شریر

جب ہمارے ملک کی ایک ریاست میں بے چینی اور خلفشار، احتجاج اور نعرے بازی سے بڑھ کر فسادات اور کشت و خون کی شکل اختیار کر گئے تو حسبِ معمول مقتدر سیاسی پارٹی کے موٹے اور ٹھوس لیڈر نے ایک توضیح نیتا کو جن کا تعلق اس کی اور خوبیوں کے علاوہ پست اقوام سے تھا۔ اس ریاست کے صحیح حالات وہاں جاکر دریافت کر کے بھیجنے کی ہدایت کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو خط لکھا گیا وہ پیش خدمت ہے:

"پوجیہ ادھیکش جی!

آپ کے حکم کے مطابق یہاں پہنچ گیا ہوں۔ ریل کا سفر آپ کی آشیرواد سے بڑے مزے میں گزرا۔ صبح مسافروں نے جنھوں نے فرسٹ کلاس کا بھاڑا دیا تھا، میرے دو سیٹوں کے کوپے ڈبے میں اکیلے سفر کرنے پر سخت اعتراض کیا۔ لیکن یہ سب آپ کا چمتکار ہے کہ ریل والوں نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ میں بڑا خطرناک آدمی ہوں اور ریل کے سفر میں مجھ پر دورے پڑتے ہیں۔ اور میں لوگوں کو کاٹ کھاتا ہوں۔ ویسے دیکھنے میں بھی لگتا بھی خطرناک ہوں۔ میرے جسم اور چہرے پر بال اور خاص طور پر میرے کانوں پر بال کی اگان کچھ ایسی ہے کہ ریلوے والوں نے میرا نام "کانن بالا" رکھ دیا ہے۔ خیر اس کوپے ڈبے میں سفر کرنے کا بڑا بھلا واقعہ تھا۔ ویسے میرے گاؤں کے گھر کی کوٹھری بھی اسی مطابق ہے۔ ریل کرمچاریوں نے مجھے یقین دلایا کہ مجھ کو راستے بھر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور اگر میں چاہوں تو ننگا سو سکتا ہوں۔ دراصل میرا اپنا بھی یہی ارادہ تھا اور ایسا کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ ادھیکش جی میرے پاس کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا ہے۔ چنانچہ میں سب کپڑے اتار کر بڑے ٹھاٹھ سے ننگا سویا۔

راشٹر میں کھڑکی کے شیشوں میں سے لوگوں نے جو مجھے اس حالت میں دیکھا تو شاید یہ سمجھے کہ کوئی ناٹک کا پاتر سمادھی لگائے پڑا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پلیٹ پھارم پر اتر کر پھول پہنے جھنڈے دیکھوں۔ کے روپ میں درشن اور آشیرواد دوں۔ یہ بڑا سنہری موقعہ تھا جیسے ... اپنے اندر دکھشنا لینے اور ووٹ پکے کرنے کا مگر اپنے پرچار کو کیسے بھول سکتا تھا۔ میں لیٹے رہا اور پلیٹ پھارم پر میری جے جے کار ہوتی رہی۔

اب جرا ریاست کا حال سنیے۔ اکھباروں کی کھبروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پردیش میں کھانے کو اناج نہیں۔ میں نے پردھان منتری سوکھے لال جی سے ... پوچھا کہ پردیش کا دھان کہاں چلا گیا۔ سوکھے لال جی نے کہا دھن کی ٹانگیں نہیں ہوتیں اس لیے وہ کہیں جا نہیں سکتا۔ تم اکھبار مت دیکھو، واقعی سوکھے لال جی بڑے مجے میں ہیں۔ کھوب کھاتے اور کھوب پیتے ہیں۔ میں بھی ان کی سنگت میں کھوب کھا پی رہا ہوں، سوکھے لال جی نے مجھے تین چار جوڑے کپڑوں کے بنوا دیے ہیں۔ کہتے ہیں ان کے پرانت کی کھادی بڑی اچھی ہے۔ میرے واپس جانے سے پہلے چار جوڑے کپڑوں کے اور بھی بنا دینے کا وعدہ سوکھے لال جی نے کیا ہے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ میں سادہ کپڑے پہنا کروں۔ اسی پر عمل کر رہا ہوں۔

کل شام جب ہم کھا پی رہے تھے تو ...... میں نے سوکھے لال جی سے پوچھا کہ آپ کے پردیش میں پھساد، آتش جدگی، کھتل و کھون کی کھبریں کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ سوکھے لال جی کہتے ہیں، یہ سب ہماری پارٹی کے کھلاپھ والے گنڈے کر رہے ہیں۔ مگر دنگے پھساد تو ہونے ہی چاہئیں۔ کیوں کہ ان کے بگیر جندگی پھیکی پڑ جائے گی۔ پھسادوں کے پھائدے جو سوکھے لال جی نے بتائے ہیں یہ ہیں کہ ان سے جو لوگ جکھمی ہوتے ہیں وہ اس کابل نہیں رہتے کہ کچھ کما سکیں۔ اس سے گلے کی تانگی میں جیادتی پیدا ہوتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو ابھی جکھمی نہیں ہوئے گلہ دینے میں بہوت ہو رہتا ہے۔ لوٹ مار، چھوٹے قسم کی جندگی بنانے کا جریعہ ہے۔ روپیہ پیسہ ان لوگوں سے لوٹا جاتا ہے ...... جن کے پاس یہ ہوتا ہے اور یہ جاتا ہے۔ ان کے پاس جو نگر نامائی نہیں رکھتے۔ اس لیے سب لوگوں کو ایک ہی لائن میں لانے کا یہ کھرا نسکھہ ہے۔ پھر ملک کی دولت ملک میں ہی رہتی ہے۔ پوجیہ باپو جی اس ترکیب سے جب مال و دولت ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کے پاس پہنچ رہی ہے تو کیوں نہ اس میں سے کچھ حصہ آپ کے سیوک کے پاس بھی جو بڑا گریب ہے آ جائے! سوکھے لال جی کا بھی پھل پھول رہے ہیں۔ پچھلی گاتے کے ماپھک پھل سے پھلستان بن گئے ہیں مجھے برابر کا حصہ نہیں دیتے۔ مگر میں سوچتا ہوں، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی ——— اس میں ساری لنگوٹی آپ کی، بس ڈوری سے میرا کام چل جائے گا۔

توڑ پھوڑ اور جلانے سے ملک کو یہ پھائدہ ہے کہ پرانے مکان اور کوٹھیوں کی جگہ نئی عمارتیں بن جائیں گی اور سڑکیں بھی چوڑی کی جا سکیں گی۔ اس میں بھی لوگوں کا پھائدہ ہے۔ کتل کھون سب سے جیادہ پھائدہ مند ہیں۔ کھاندانی منصوبہ بندی تو ہماری اکارت ہوئی۔ کتل کھون کی وجہ سے آبادی گھٹائی جا سکتی ہے مگر اس کام کو تیج کرنا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کتل کھون جندہ باد۔!

سوکھے لال جی کے خیالات میں نے بتا دیئے۔ اب آپ کی کھبر کی کھاتر اپنی رپورٹ لکھ رہا ہوں۔

یہاں پھیلی ہوئی اپھواہیں جو لوگ حکومت کے کھلاپھ پھیلا رہے تھے۔ آپ کی آشیرواد، سوکھے لال جی کے جور

اور اس اوپر والے کی مہربانی سے ان سب کا سپھایا ہو گیا ہے۔ اس کا نام نشان نہ باقی نہیں رہا اس لیے یہاں اب کا بھی امن چین ہے۔ مگر بیچ چینی اور پساد چاروں طرف ہو۔ اور ہر جگہ پھیلا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ملتا۔ صرف ناشتہ، رات کا کھانا اور دوپہر کو تھوڑی چائے جلد ملتی ہے۔ اور جب ہم کھانے کو بیٹھتے ہیں تو کھترے سے بچنے کی کھاتر ہر وکت دونوں ہاتھوں میں ہتھیار رہتے ہیں اور اس وکت بھی جب میں یہ لکھت لکھ رہا ہوں میرے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے اور دوسرے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں باگیوں کا پوری طرح سپھایا ہو چکا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے پساد ابھی پوری طرح نہیں پھیلے۔ اس وکت بہت سے واقعات اور ان گنت وارداتیں ایسی بھی سے ہو رہی ہیں کہ ہر چیج ٹھہری ٹھہری ہوئی ہے۔ پستھیت کچھ ایسی ہے کہ اگر چور کی ہوا بھی چلے تو پتہ نہ چلے۔ کل ڈاک کی تیجی سے چلتی ریل گاڑی کو لوٹ لیا گیا۔ لٹیروں نے ڈاک کے سب تھیلے ریل میں وزن کم کرنے کے لیے واردات کی جگہ پر ڈال دیے۔ اچھا کہ سے پوری گاڑی میں کوئی مانس نہیں تھا، نہ کوئی مسافر، نہ ڈاک کے کرمچاری اور نہ ہی انجن چلانے والے۔ اس لیے بے چارے لٹیرے آخر کس کو اور کیا لوٹتے؟ کھالی ہاتھ لوٹ گئے۔

پرسوں باگیوں کا ایک جتھا بڑے بڑے جھنڈے اونچے کیے سوکھے لال جی کی کوٹھی کی طرف حملے کے ارادے سے بڑھ رہا تھا۔ ان کے پاس کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے جاہر ہو تا کہ باتی میں وہ کون ہیں۔ یہ لوگ نہایت گم سم پوری کھاموشی سے کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ البتہ اس جتھے کے بہت سے لوگ ڈھول پیٹ رہے تھے اور کچھ پھلی سنگیت گا رہے تھے۔ ہر طرف پورا سناٹا چھایا ہوا تھا جس کو سن کر محلے کی عورتیں اور بچے اپنے اپنے ... گھروں سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے کان نکال کر سننے لگے۔ وانت نکالنے کی کسی نے جرأت نہیں کی۔ لیکن سوکھے لال جی کوٹھی کے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے اور مائیکروفون پر باگیوں سے مکھاتب ہوئے۔

" مورکھو، سر پھرو، باگیو، کیوں فجول اپنا ٹائم نشٹ کر رہے ہو۔ میرا ٹائم بھی تمہارے جھنجھلے سے خراب ہو رہا ہے۔ میں اسپیکر نہیں ہوں کہ باتوں میں وکت جائع کروں۔ اسپیکر تو سردار دسلطان ہیں اور سرداروں میں سب سے بڑے سردار وہ بھائی پٹیل تھے۔ جب وہ گجر گئے تو ان کی ارتھی پر ہجاروں لاکھوں پھول چڑھائے گئے تھے۔ پھولوں میں سب سے عمدہ پھول غلاب کا ہوتا ہے۔ غلاب کا پھول جاہر لال جی کی شیروانی پر ہمیشہ ٹانکا رہتا تھا۔ غلاب کے پھولوں سے غلکند بنائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی دوائی ہے جس سے پیٹ درد سے اٹھنے والی درد کی دور ہو جاتی ہے۔ معدہ بالکل صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔ دراصل ہاجمہ ٹھیک نہ ہونا سب بیماریوں کی جڑ ہے۔ اور جڑی بوٹیوں میں سب سے اہم جڑی سنجیوی بوٹی تھی جس کو ہنومان جی لکشمن جی کی جندگی بچانے کے لیے پربت سمیت لے گئے تھے۔ پربتوں میں سب سے بڑا پربت ہمالیہ پربت ہے۔ ہمالیہ پربت کے پیچھے چینی بستے ہیں۔ اور چینیوں میں سب سے اچھی چینی وہ ہے جو سپید اور میٹھی ہو۔ چینی کا بھاؤ بھی آج کل بہت چڑھا ہوا ہے۔ باگیو بھاگ جاؤ۔ نہیں تو آٹے دال کا بھاؤ بھی بڑھا دوں گا۔ اور تمہارے ناکوں سے چنے چبوا دوں گا۔"

باگیوں نے سوکھے لال جی کی بات نہیں مانی اور کوٹھی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے پاس بہت کم سنتری

تھے۔ دسمبر کے جیسا ہی اس کھاموشی سے پھائدہ اٹھا کر سوکھے لال جی کی کوٹھی کی چھت پر سیڑھیاں اور ماچس لے کر جا بیٹھے، دو وکت کی نجاکت کے لحاظ سے تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم لوگ بھاگنے کی کیفیت میں پہنچ چکے تھے اور اگر ہمارے کدم کسی قدر ٹھہرے ہوئے تھے تو وہ اس بحث کی وجہ سے کہ سر پر پگ رکھ کر جائیں یا پگ پر سر۔ اس حالت میں جب ہمارے آدھے سے جیادہ جوان سنتروں کے ساتھ گولیاں بھی کھا کر موت کی نیند سو گئے تو اس وکت ہمارے سب جوان اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

کھوش کسمتی سے حملہ کرنے والے باگیوں کے پاس بندوکیں نہیں تھیں۔ سوائے گنّے کی مشینوں، تلواروں اور برچھوں کے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے اور وہ بالکل نہتے تھے۔ چوں کہ ہمارے پاس وافر مکدار میں بارود تو پیں تھیں۔ ہم نے سب باگیوں کے سر کاٹ لیے سوائے ان کے جو آسانی سے ادھر ادھر کھسک گئے، کچھ پھسل کر گندی نالیوں میں گر گئے اور ایسی چیخ پکار مچانے لگے کہ فضا میں سوائے کھاموشی کے کچھ اور نہیں سنائی پڑتا تھا۔

جب ہم لوگوں نے گور سے حالات کا جائجا لینا شروع کیا تو یہ بات بڑی کھوبی سے جاہر ہو گئی کہ ہر ایک نے مکھتلیپ رنگوں کی وردیاں پہن رکھی تھیں مگر سب کے سب لوگوں کی وردیاں نیلے رنگ کی تھیں۔ جب ہم لوگوں نے ان کی تلاشی لی تو پتہ چلا کہ ان کے کھتر ناک سینے ادھر ادھر پڑے ہوئے ہیں جن کے سرے پر نوکیں نہیں تھیں۔ ادھیکش جی اگر چاہیں تو ان کو ڈنڈے کہہ لیں مگر سوکھے لال جی کے کھیال میں یہ نوکوں کے بگیر نیجے ہی تھے۔ ان کے ایک بڑے تھیلے میں بالکل کھالی بوتلیں ملیں جو پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ اس جتھے کی ایک لسٹ بھی ملی جس میں تمام ناٹھ نام ہندی میں لکھے تھے۔

اب کوٹھی کے چاروں طرف یعنی کوٹھی کے سامنے اور پیچھے ہتھیار بند پھوج لگا دی گئی ہے اور میں یہ رپورٹ آپ کو بہت جلدی میں بیٹھ کر کھڑے کھڑے لکھ رہا ہوں۔ اگر حالات کے بیان میں کسی قسم کی کمی لگے تو اس کی وجہ روشنائی کا سوکھا پن اور میری پیاس ہے جو دو پہر سے وسکی نہ ملنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ ادھیکش جی وسکی بڑی اچھی چیز ہے۔ آتے ہوئے آپ کے لیے بھی لیتا آؤں گا۔ پٹنہ بجے کی چیج ہے۔ مکر اس کے سامنے کوئی چیج نہیں مجھے تو جیسے پتا جی اب پانی بھی اچھا نہیں لگتا۔ انگریج بڑے کابل لوگ ہیں۔ کیسی بڑھیا چیج بناتے ہیں۔ اگر آپ اجاجت دیں گے تو ہم بھی ایک دو بھٹیاں لگا لیں گے اور وسکی بنانے کی کوشش کریں گے۔ ایک کارپیج اندسٹری کا کام کریں گے، بڑا اچھا ہوگا۔ سوت کاتنے اور کھادی بنانے میں کوئی پھائدہ نہیں۔ اگر وسکی سارے ملک میں بننے لگے تو جن پرانتوں میں پانی کی کمی ہے وہ اس سے پوری کی جا سکتی ہے۔ آپ اپنے اگلے ویکھیان میں اس کی چرچا کیجیے۔ سوکھے لال جی آج صبح مجھے بتا رہے تھے کہ ان کی ریاست میں جو بیل پیدا ہوتے ہیں اور جو ریاست میں ہی پل کر بڑے ہوتے ہیں وہ اصل "بہاری" کہلائے جاتے ہیں۔

اب باگیوں کی سجا کی بات سنیے۔ سوکھے لال جی کہتے ہیں کہ جن باگیوں کو کھید کی سجا دی جاتی ہے ان کی گنتی اتنی بڑھ گئی ہے کہ شہر کی پرانی جیل ان کی کھپت کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ پھل حال انتجام یہ ہے کہ کانون کے مطابک ان کھاتیوں کو جن کو عدالتوں سے سجا ملتی ہے اور جو ان میں سے جیل میں نہیں رکھے جا سکتے ان کے جسموں کو پہلے سر سے علیحدہ کر لیتے ہیں اور پھر ان کو زمین تلے سجا کی مدت تک سجا بھگتنے کے لیے گاڑ دیتے ہیں تاکہ ان کو

دم لینے میں تکلیف نہ ہو اور وہ سزا کی مدت آرام سے گزار دیں۔

نئی جیل بنانے کے لیے خزانے میں روپیہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اس افراتفری کی حالت میں خزانہ کھسک گیا تھا اس لیے سوکھے لال جی اور ان کے نزدیک والوں نے سب رقم آپس میں بانٹ کر حفاظت سے رکھ لی ہے اور سوکھے لال جی نے بکیراگت سے نئی جیل بنانے کی ایک بڑی اچھی یوجنا بنائی ہے جو یہ ہے:

— ایک نئی جیل پرانی جیل کی زمین پر بنائی جائے جو پرانی جیل سے بہت بڑی ہو۔

— نئی جیل کے لیے اینٹ، پتھر، چونا، سمنٹ وغیرہ پرانی جیل کو توڑ کر نکالا جائے اور اسی مسالے سے نئی جیل بنائی جائے۔

— اور پرانی جیل کو اس وقت تک کام میں لایا جائے جب تک کہ نئی جیل بن کر پوری طرح تیار نہ ہو جائے۔

یہاں افراتفری ایسی ہے کہ مجھے بھروسہ نہیں کہ یہ خط آپ کو ملے یا نہ ملے مگر آپ سے یہ درخواست ہے کہ مجھے اس خط کے ملنے کے بارے میں ضرور خبر دیں۔

نوٹ: میرے چار جوڑے کپڑوں کے درزی کے پاس ہیں اگلا خط ان کو پہن کر لکھوں گا۔ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیں۔

آپ کا خادم
گلوٹارام

بھارت چندکھنہ

جوابِ لاجواب

یہ درہائے بیش بہا جو آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ہم کو جنرل نالج کے ایک امتحان میں دیئے گئے جوابات میں سے حاصل ہوئے ہیں چوں کہ جواب انگریزی میں لکھے گئے تھے اس لیے زبانِ انگریزی میں جو جدتیں اور خوبیاں پیدا کی گئی تھیں ان کا اظہار ترجمہ میں ناممکن ہے۔ بہرحال جن نئی معلومات کا علم سوالوں کے جوابات سے ہوتا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں چوں کہ خود سری قابلیت جوابات زیرِ بحث لکھنے والوں سے کسی طرح کم نہیں اس لیے ہم نے بھی اپنی معلومات کے اعتبار سے چند جواب کسی قسم کی فارن ایڈ حاصل کیے بغیر درج کر دیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

سوال: کسنجر کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ؟

جواب: (۱) کسنجر ایک مشہور اور نہایت فیشن ایبل گجرہ ہے۔

(۲) ایک پاسنجر ٹرین ہے جو امریکہ سے چلتی ہے اور شہر سویز سے گزرتی ہوئی چین چلی جاتی ہے

(۳) ایک تاریخی مقام کا نام ہے جس کا ذکر تاریخ میں نہیں ہے۔

(۴) ایک مشہور شہر جو دریائے گومتی کے دہانے پر آباد ہے یہاں وہ کنکر اٹھائے جاتے ہیں جو چاول میں ملانے سے چاول بن جاتے ہیں۔

(۵) ہندوستان کی ایک دو ماہی پوجا۔

(۶) ایک بہتا ہوا دریا ہے جو تھک کر آرام کی خاطر ٹھہر گیا ہے۔

(۷) فلم اسٹار سنجے جب فلم میں ہیروئن کو کس (KISS) کرتا ہے تو اس کو کسنجر کہتے ہیں۔

۲: سانچی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ؟

- سانچی اس لیے مشہور ہے جو پر سانچے موتی ٹانکے جاتے ہیں۔

— پنسلین کی فیکٹری اور پنسلین بنانے کے کارخانے سانچی کہلاتے ہیں۔
— ایک پہاڑی مقام جہاں بستر کی چادریں اور دروازوں کے کھٹکے بنائے جاتے ہیں۔
— سانچی میں لوہے کے سانچے بنائے جاتے ہیں۔
— یہ راکٹ اڑانے کا ایک پلیٹ فارم ہے
— ایک قسم کی گیہوں کی خمیری روٹی جو موٹی اور خستہ ہوتی ہے اور بغیر آٹے کے بنائی جاتی ہے۔

۳۔ ہائی جیکنگ سے کیا مراد ہے؟
— جب موٹر گاڑی کو جیک پر چڑھا کر بہت ہائی کر دیا جائے تو اسے ہائی جیکنگ کہتے ہیں۔
— ایک ایسی ترکیب جس سے جن لوگوں کی چیزیں اڑائی جاتی ہیں۔ ان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ سوشیل آرڈر کا اہم جزو ہے۔
— اس کی اصل وجہ قیمتوں کا بڑھانا ہے۔ اگر قیمتیں واجبی ہوں تو کوئی ہائی جیکنگ کیوں کرے۔
— ہماری حکومت کی جدید ترین تشہیر کا اسسٹنٹ۔
— اکثر فلموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔
— ایک نایاب شے جو صرف بلیک مارکٹ میں ملتی ہے۔

۴۔ نان الائن منٹ کس کو کہتے ہیں؟
— اگر موٹر کے پہیے ٹیڑھے بنکے چلیں تو اس کو نان الائن منٹ کہتے ہیں۔
— شوہر اور بیوی کے جھگڑے نان الائن منٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔
— نان الائن منٹ کی وجہ سے حاملہ عورتوں کو زچگی کے وقت بہت تکلیف ہوتی ہے۔
— کمزور قوموں کی منزلِ مقصود اس دھرتی پر صرف دو چیزیں ہیں۔ اچھی اور بری۔ نان الائن منٹ ان میں سے کسی کو ووٹ نہیں دیتا اور تنہا بدصورت اور نشوونما کے بغیر پڑا رہتا ہے۔
— ایک قسم کا پیپر منٹ ہے جس کو چوسنے سے CONTENTMENT پیدا ہوتا اور RESENTMENT نہیں ہوتا۔

۵۔ گولان ہائٹس سے کیا مراد ہے؟
— ایک اونچا مقام جہاں صرف گوالنیں رہتی ہیں۔
— اگلے وقتوں کا ایک مشہور کرکٹ کا کھلاڑی۔
— ایک مقدس مقام
— سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن
— ہندوستان کا سب سے بڑا ٹی۔ وی سینی ٹوریم۔
— وسطِ ایشیا کا سب سے بڑا پتنگ اڑانے کا مقام۔ یہاں ایک زمانے میں روم کے شہنشاہوں اور انگلستان کے نائٹس کے درمیان جو نائٹ لباس پہنا کرتے تھے۔ پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس کو گولان اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کی سب پہاڑیاں گول ہیں۔ ان مقابلوں میں جو مانجھا استعمال ہوتا تھا وہ سوکھے حوض حیدرآباد سے بنڈلوں کے ذریعہ گولان ہائٹس بھیجا جاتا تھا۔

— میں نے گولان ہائٹس کی سرخیاں اخباروں میں بہت مرتبہ دیکھی ہیں مگر تفصیلات کی جانب دھیان نہیں دیا۔ میرے خیال میں گولان لفظ گول سے نکلا ہے اور آج کل روسی اور یہودی کھلاڑیوں میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ فٹ بال کے میدان میں گول کی اونچائی کتنی ہو۔

۹- جائنٹ فیملی کیا ہے؟

— جب ایک فیملی، فیملی پلاننگ سے کسی دوسری فیملی سے جڑ جاتی ہے تو اس کو انگریزی میں جائنٹ فیملی کہتے ہیں۔

— جائنٹ سے مراد ہے دیو، اور دیو بہت اونچا بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے فیملی کو جائنٹ فیملی کہتے ہیں۔

— ہندوؤں کی ایک فیملی جس کے سب فرد اکٹھے رہتے، کھاتے اور سوتے ہیں مگر فرداً فرداً آپس میں لڑتے اور مرتے ہیں۔

— ہندو فیملی جس میں بیٹے، بیٹیاں، بھتیجے، بھتیجیاں اکٹھے رہتے ہیں اور آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں تاکہ خاندان کی دولت فیملی میں رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی اولاد بعض نیتاؤں کی طرح فاتر العقل اور احمق ہو جاتی ہے۔ یہ اکٹھے رہتے اور لڑتے - جھگڑتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ مرتے ہیں۔

۷- چرا پونجی سے کیا مراد ہے؟

— کالے منہ کا بندر۔

— ایک مشہور جہاز جو ابھی تک پانی پر تیر رہا ہے۔

— ایک حیوان

— ایک مقام جو اپنی مٹھائیوں کے لیے مشہور ہے

— ایک شاعر کا تخلص ہے۔

— ایک پہاڑی مقام جہاں ایک رئیس نے اپنی پونجی زمین میں گاڑ دی تھی۔

— چیرا تلگی زبان میں ساڑی کو کہتے ہیں۔ پونجی سے مراد بچائی ہوئی رقم ہے۔ اس لیے چراپونجی کا مطلب ہے وہ رقم جو عورتیں بچا کر اور ایک تھیلی میں ڈال کر ساڑی میں ٹھونس لیتی ہیں۔

۸- سکائی لیپ کیا چیز ہے؟

— ایک سنیما کا نام ہے۔

— عالم غیب کی خبروں کا مرکز۔

— یہ چاند پر رہتا ہے۔

— امریکہ وہاں ہے اور وہاں سے تحقیق کر رہا ہے۔

— اس کی کامیابی سے ساری دنیا خوشحال ہو جائے گی۔

— یہ ست رنگی قوس قزح ہے۔ اس پر بارش سے پہلے بادلوں کا قبضہ ہوتا ہے جب کہ آسمان اسکائی لیپ ہوتا ہے۔

— امریکہ کی اونچی عمارتیں جن کو SKY SCRAPERS کہتے ہیں جب آسمان کو چھو لیتی ہیں تو اس کو اسکائی لیپ کہتے ہیں۔

— اسکائی لیپ عورتوں کی لپ اسٹک [illegible] ہوا ہے۔ یہ بڑا ہی خوب صورت بچہ ہے

— کسی [illegible] کا نام ہے

— [illegible] کا خطرہ رہتا ہے۔

— یہ سوال شاید غلط چھپا ہے۔ ممتحن نے مسودے میں لیپ کی بجائے "لیک" لکھا ہوگا۔ اور ظاہر ہے سکائی لیک سے مراد ہے وہ جھیل جو آسمان پر واقع ہو اور جس کے ٹپکنے سے بارش ہوتی ہے۔

(۹) MATHA HARI کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

— ہری کی ماں کو ماتا ہری کہتے ہیں۔

— جب کوئی بیوی بغرض محال شوہر سے جھگڑتے ہوئے ہار جائے تو اسے ماتا ہری کہتے ہیں۔

(۱۰) کالیداس ایک NOTABLE کوی تھا اس کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟

— کالی داس ایک نہایت طاقت ور پہلوان تھا اسی لیے اس کو مہا کوی کہتے تھے۔

— وہ NOTABLE اس لیے تھا کہ اس کے پاس لکھنے کے لیے کوئی میز نہیں تھی۔ یعنی کالی داس "NO TABLE" کوی تھا۔

پلٹوں کا ہمارے گھر آنا

اس مضمون کا عنوان ذرا وضاحت طلب ہے۔ "پلٹوں" لفظ "پلٹا" سے اخذ نہیں کیا گیا ہے بلکہ پنجاب کی زرخیز زمین پر بسنے والے لوگوں کی ایک ذات پلٹا کہلاتی ہے۔ اس لیے پلٹوں سے مراد اس پلٹا سے تعلق رکھنے والا میاں بیوی کا ایک جوڑا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں پلٹوں کا ذکرِ خیر کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ انمول جوڑا ہمارے اجڑے ہوئے گھر کی رونق اس وقت بنا جب کہ ہم ایک بڑی ذمہ داری سے نپٹ کر اس خیال سے مطمئن ہو بیٹھے تھے کہ کم از کم ایک سال تک فراغت رہے گی۔ بڑی لڑکی کے پیر پیلے ہو چکے تھے اور ہمارا گھرانا تیمارداری، رشتہ داروں کی خاطر داری، قرض داری، اور رواداری کی زیر باری سے فراغت پا چکا تھا۔ میری چھوٹی لڑکی اور بیوی خدمت گزاری کرتے کرتے بری طرح نڈھال ہو گئی تھیں۔ بالکل بنڈی کے ان بیلوں کی طرح جو وزن کا بوجھ نہ سہار سکنے کی وجہ سے باوجود کوڑے مارنے کے قدم ہلانے سے قاصر ہو کر سڑک پر ہی گر جاتے ہیں۔ خادم بھی ہر اعتبار سے ہلکا ہو چکا تھا۔ جیب خالی ذہن خالی۔ دماغ خالی۔ اس کے علاوہ قدموں میں لڑکھڑاہٹ، زبان میں لکنت، دل میں گھبراہٹ اور نظر میں دھندلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

زندگی کی کچھ ایسی اجڑی ہوئی کیفیت میں ایک رات ہم تینوں نیند کی بے ہوشی میں کھوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر کسی کی دستک اور کتّے کے بھونکنے کی آوازوں نے ہمیں بستر پر سے اٹھنے پر مجبور کیا۔ نیم بیداری کی حالت میں آنکھیں ملتے ہوئے خاکسار گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دروازے کے سامنے ایک تانگہ ہمہ قسم کے سامان سے لدا کھڑا تھا۔ جس کے ایک طرف تانگے والا اور دوسری طرف ایک صاحب کھڑے تھے کہ تانگے میں کسی کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ صاحب اپنی یتیمانہ شکل و صورت اور خستہ حالی سے بالکل ایک ایسے لسانی ذریعہ

معلوم ہوتے تھے جو قلمدانِ وزارت پر تصرف کرنے سے پہلے اپنا توشہ دان سنبھالے جنتا کی تصویر بن کر منظرِ عام پر دکھائی دے۔

میں چوں کہ ان صاحب کو نہیں جانتا تھا اس لیے میں نے ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے۔۔ جناب کسی غلط فہمی میں یہاں تشریف لے آئے ہیں۔ یہ مکان خالی نہیں ہے۔ اس میں ہم رہتے ہیں۔ پیشگی کرایہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو ادا کرتے ہیں۔ دیکھیے میں ابھی ابھی بستر سے اٹھ کر آرہا ہوں۔

موصوف کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کہنے لگے غلط فہمی مجھے ہو رہی تھی۔ وہ تو صحیح پتے پر پہنچے تھے۔ اتنے میں تانگے میں رکھے ہوئے سامان میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے سمجھا یہ حرکت تانگے کے ٹٹو کے پاؤں ڈگمگانے سے پیدا ہوئی ہوگی۔ مگر میری حیرت کا اندازہ کیجیے کہ مختلف قسم کی ٹوکریوں، تھیلیوں، توشہ دانوں کے نیچے سے یک لخت ایک دیوی جی ایسے نکل آئیں جیسے کسی محل کی آڑ سے پیلا ماہتاب یا جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب۔

دیوی جی جن کا دم ان کے اوپر رکھے ہوئے سامان کے بوجھ سے گھٹنے لگا تھا، ذرا دم لے کر بولیں۔ یہ کیا بحث ہو رہی ہے۔ میں نے کہا دیوی جی یہ صاحب آپ کے جو بھی ہیں۔ ان سے کہیے کہ براہِ کرم اپنی راہ لیں نہ میں ان کو جانتا ہوں نہ آپ کو پہچانتا ہوں۔ اگر یہ سامان جو آپ کے تانگے میں لاد کر لائی ہیں میرے کسی نامعلوم بھکاری چچا نے وصیت میں میرے لیے چھوڑا ہے تو میں اس سے دست بردار ہوتا ہوں۔ اگر آپ کرم فرما مرحوم کا نام وغیرہ بتا دیں تو میں فوراً اپنی وصیت آپ کے نام لکھ دیتا ہوں۔ میں اس سامان کو اپنی جھونپڑی میں نہیں آنے دوں گا۔ ادھر دیکھیے تانگے کا ٹٹو اس سامان کے بوجھ سے بالکل اسی طرح دبا جا رہا ہے جس طرح ملازم پیشہ لوگ ٹیکس کے بوجھ تلے دم توڑ رہے ہیں۔ مجھ پر نہیں تو کم از کم اس بے زبان پر ہی ترس کھائیے۔

یہ بحث چل رہی تھی کہ بیوی بھی ڈگمگاتے قدموں سے باہر نکل آئیں۔ کہنے لگیں یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں؟ کیا آپ نے بغیر پوچھے براج میں یہ کوڑا کرکٹ خرید لیا تھا؟

میں نے کہا ہرگز نہیں بلکہ میں بھی یہی جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ کون ہیں۔ یہ کس کا سامان ہے؟ اور یہ ہمارے گھر کے سامنے کیوں کھڑے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ گھر کرائے کے لیے خالی نہیں مگر یہ لوگ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ گھیراؤ کیے کھڑے ہیں۔ پرماتما کے لیے اپنا شاہانہ عتاب استعمال کرو اور اس عذاب سے نجات دلاؤ۔

اس پر موصوف گوہر ریز ہوئے کہ ہم آئے تو ہیں قیام ہی کے لیے مگر کرایہ پر نہیں۔ بولو کیا تم گھنشیام نہیں ہو؟۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تمہاری بیوی کا نام منورما نہیں؟ کیا تمہاری بیٹی کا نام مہامایا نہیں؟ کیا یہ مقام سکندرآباد نہیں؟

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موصوف ہر دوار کے پنڈے ہیں لیکن محض کسی کا نام معلوم کر لینا گھر میں گھس جانے کا اجازت نامہ نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا تھا کہ ان کو جواب دوں میرا نام خجالت داس ہے۔ میری بیوی قریب المرگ کہلاتی ہے اور بیٹی قسمت کی ماری" یہ مقام جہاں ہم رہتے ہیں اس کا نام "دوزخ" ہے۔ اس لیے دفع ہو جاؤ ورنہ میں ایسے قتل کا مرتکب ہو جاؤں گا جو ناقابلِ برداشت اشتعال کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ مگر دیوی جی جو تانگے سے اتر کر

... پاس ہی کھڑی تھیں۔ نیک بخت کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگیں: منورما۔ یہ پلٹا صاحب ہیں۔ تم شاید ان کو نہیں جانتیں؟

نام سنتے ہی نیک بخت کو چکر آگیا اور اگر میں ان کو سہارا دے کر تھام نہ لیتا تو وہ یقیناً دھڑام ... سے زمین پر آرہتیں۔ پلٹا صاحب نے صبح کے ... دھندلکے میں جو یہ ماجرا دیکھا تو فرمانے لگے آپ لوگ شاید الٹرا ماڈرن قسم کے لوگ ہیں جو صبح کی ملاقات گلے مل کر کرتے ہیں۔ بہرحال ہماری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے صبح۔ کے روزمرّہ کے پروگرام پر کاربند رہیے۔

میں چاہتا تھا کہ پلٹا صاحب کا گلا دبوچ ڈالوں مگر دونوں ہاتھوں سے بیوی کو تھامے کھڑا تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اتنے میں بیوی نے ہوش سنبھالا، سر کو ایک دو جھٹکے دیئے کہ دماغ سے دھندلکے کے جالے نکل جائیں۔ پھر کہنے لگیں۔ پلٹا صاحب میری چاچی کے تایا جی کی چچیری بہن کے سوتیلے بھائی کی پہلی لڑکی کے شوہر ہیں۔

رشتہ سن کر میں کانپ اٹھا جو اتنا ہی دور دراز کا تھا جتنا فاصلہ حیدرآباد سے پٹیالہ کا ہے اور اس رشتہ کو عالم وجود میں لانے کے لیے متعلقہ مرد اور عورتوں کو ایک دو مرتبہ بڑی لائین سے چھوٹی لائین پر بھی سفر کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ یہ پلٹے آتنی دور سے ہمارے گھر کو نشانہ قیام بنا کر کس طرح گھر سے نکل پڑے تھے۔ کیا یہ ضروری تھا کہ وہ ایسے وقت نازل ہوں جب کہ ہم اپنی تمام مالی اور جسمانی قوت پر داشت تمام کر چکے تھے اور پھر اگر اس طرح مرگ ناگہانی کی طرح آنا ہی تھا تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ساری گرہستی کا سامان لے کر خانہ بدوشوں کی طرح گھر سے نکل پڑیں۔

ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ میرے کان میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی تانگے کا ٹٹو بھی کان پھٹکنے لگتا تھا۔ تانگہ والے نے اس طلسم خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا میں کب تک اس بوجھ کو لادے یہاں کھڑا رہوں۔ اگر یہیں اترنا ہے تو سامان اتاریئے۔

پلٹا صاحب کسی ایسے اشارے کے منتظر تھے۔ انھوں نے تانگے والے کی ہدایت کو گھر میں ٹھہرنے کی اجازت سمجھ کر سامان اتارنا شروع کر دیا۔ میں ہار مانتے ہوئے اس طرف لپکا جہاں ہمارا نوکر بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا اور کہا کچھ مہمان آئے ہیں۔ ان کا سامان اندر رکھو۔

نوکر کہنے لگا کہ صاحب بندگی! بہت ہو چکی۔ جب میں ملازم ہوا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ گھر میں صرف تین لوگ ہیں مگر آپ کا گھر تو ایک مستقل سرائے ہے اگر ایک شخص رخصت ہوتا ہے تو اس کی جگہ دو آ موجود ہوتے ہیں۔ آپ تو خیر سے خیر مقدم کر کے الگ سٹک جاتے ہیں اور کام کا بوجھ مجھ پر آن پڑتا ہے۔ میں بھی آخر انسان ہوں گدھا نہیں کہ سر جھکائے آپ کے مہمانوں کا کام کیے جاؤں۔ میں تو رخصت ہو رہا ہوں۔ آپ خود ہی اپنے مہمانوں کو سنبھالیے۔ یہ کہہ کر وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ میں نے اس کی بڑی منت سماجت کی کہ بھئی یہ تو بن بلائے مہمان ہیں۔ گھر میں آجانے والے کو کس طرح دھتکارا جائے۔ وہ کہنے لگا آپ کی تہذیب آپ کو مبارک میں اب یہاں نہیں رہ سکتا، آپ ان کو نکالیے ورنہ میں چلا۔

میرے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ پلٹ کر پلٹا صاحب کے ساتھ سامان اتارنے میں ہاتھ

بتاؤں۔ بڑی جدوجہد کے بعد ہم سب اس سامان کو گھر کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ ان کا بستر اتنا وزنی تھا کہ معلوم ہوتا تھا، اس میں بستر کی بجائے کسی موٹے انسان کی لاش ہے یا سیسہ بھرا ہوا ہے۔ تین انسانوں نے بمشکل اسے گھسیٹ کر گھر کے اندر پہنچایا۔ گھر کے اندر حالت یہ تھی کہ سب کمروں میں پلنگوں کا سامان الٹے پلٹے پڑا تھا۔

بیوی نے رسماً اس یقین کے ساتھ کہ اتنی صبح یہ لوگ "نہیں" کہیں گے، پوچھا کہ آپ تھکے ہوں گے، چائے بناؤں؟ میں نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا، نوکر گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہ مزید مہمانوں کو ہمارے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

پلٹا صاحب نے صراحت فرمائی کہ نوکر فالتو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

ہم برابر چائے پئیں گے۔ گہری تیز چائے۔

دیوی جی نے ارشاد فرمایا میں گائے کا خالص کچا دودھ پیوں گی۔ گائے کا خالص کچا دودھ اور ۱۹۹۸ء کے آزاد ہندوستان میں جس میں ہر شخص کو چیزوں میں ملاوٹ کی پوری پوری آزادی حاصل ہے! یہ سن کر مجھ پر مرگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بیوی اور لڑکی سکتے میں آگئیں۔ کچھ دیر تک ہم تینوں پتھر کی مورت بنے رہے۔ آخر میں نے مردہ آواز میں کہا کہ گائے کے کچے دودھ کا تذکرہ غالباً سنسکرت میں لکھے ہوئے رامائن اور مہابھارت کے نسخوں میں ہوگا۔ ہم نے اس شے کو کبھی دیکھا نہیں۔ ہم کو بڑی مشکل سے ڈیری کے دودھ کی دو بوتلیں ملتی ہیں جس کو ہم بغیر کسی تحقیق کے کہ یہ بکری، گائے، بھینس، خرگوش یا شتر مرغ کا دودھ ہے بڑے اختصار سے چائے میں ڈال کر پیتے ہیں اور پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاتے ہیں۔ گائے کا خالص دودھ تو کجا، آج کل خالص گائے جس کا تصور ہمارے ذہن میں ہے، نظر نہیں آتی!

بیوی نے رسوئی خانے کا رخ کیا۔ میں سامان پھاندتا ہوا ایک کونے میں بادشاہ پورس کی طرح اپنی قسمت کو کوستا ہوا بیٹھ گیا۔ لڑکی غسل خانے میں جا بیٹھی کہ بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اتنے میں بیوی چائے کی بڑی کیتلی مع لوازمات ایک ٹرے میں رکھ کر لے آئیں۔ میں بیوی کو گھر کے ایک غیر آباد حصے میں لے گیا اور درخواست کی کہ اس زبردستی گھس آنے والے جوڑے سے ان کا پروگرام دریافت کرنا مناسب ہوگا تاکہ پتہ چلے کہ اس بلائے بے درماں سے کب چھٹکارا حاصل ہوگا۔

ہم دونوں مختلف سمتوں سے واپس کمرے میں آگئے۔ ان چند منٹوں میں پلٹا صاحب نے چائے کی کیتلی خالی کر رکھی تھی۔ دراصل ٹرے میں رکھی ہوئی ہر چیز خالی تھی۔ پلٹا صاحب نے چائے کے جو پیالے اس ٹھاٹھ سے پیے تھے کہ شکر دانی کی سب شکر اور دودھ دانی کا سب دودھ چائے میں گھول کر پی گئے تھے۔ جبکہ کیتلی میں جو چائے کی پتی تھی اسے بھی کھنگال کر ڈال گئے تھے۔ غرض یہ کہ ڈھکنا الگ پڑا تھا۔ پیندا چمک رہا تھا۔ بیڈ ٹی پینے کا ایسا شاندار مظاہرہ دیکھ کر میرے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ پلٹا صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، چہرے پر دمک اور آنکھوں میں چائے کے سرور کی چمک تھی۔ دیوی جی نے بستر کھول دیا تھا۔ بستر کیا تھا، اس میں ایک دنیا آباد تھی۔ ایک پیڑھا ترازو

اور چلنی - پانچ سیر گیہوں تولنے کی باٹ - ایک چھوٹی سی انگیٹھی - کوئلوں کی گٹھڑی مختلف وضع قطع کی تھیلیاں پیتل کے چھوٹے موٹے برتن - ایک ٹاٹ کا ٹکڑا - توا - بیلن - ایک بکٹ نما گلاس اور بستر کی تعریف میں آنے والی اشیا کی حد تک دو نہایت غلیظ تکیے ۔ میں نے غور سے نگاہ ڈالی تو ایک تکیے پر یہ تکیۂ کلام درج تھا ۔

بشر پیدا ہی ہوا ہے خوب کھانے کے لیے
زندگی اس کی ہے ورنہ آنے جانے کے لیے

اور دوسرے تکیے پر یہ تحریر تھی ۔

اب کے بالم پھر کھلا دے سبزیاں ابلی ہوئی
گوبھی مٹر اور لوکی ، سب کے سب ابلی ہوئی

حیرت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ کھا کر جو ہم نے سر باہر نکالا تو دیکھا دیوی جی بستر میں بیلن ہاتھ میں لیے بیٹھی ہیں ۔ بیوی ان کے آئندہ کے پروگرام کے متعلق پوچھ رہی تھی اور دیوی جی کہہ رہی تھی کہ اب کا سب پروگرام خاک میں مل گیا تھا ۔ گائے کا خالص دودھ نہ ملنا ان کے لیے ایک عظیم سانحہ سے کم نہ تھا ۔ بہرحال دیوی جی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح کے وقت سنتروں کے چھلکوں کی چائے گڑ اور ڈیری کا دودھ ملا کر ہی مجبوراً پی لیا کریں گی ۔ یہ نسخہ سن کر میری لڑکی غسل خانے سے باہر نکل آئی ۔ بستر دیکھا تو ٹھٹکی اور تصویرِ حیرت بن کر دیوار سے لگ کر کھڑی رہ گئی ۔

پلٹا صاحب نے کہا کہ وہ کوئی گورنر تو تھے نہیں جن کا پروگرام مرتب کیا جاتا ہے ۔ کشتیٔ عمرِ رواں میں وہ بیٹھے تھے اور کشتی جس جگہ ان کو لے جاتی تھی وہی ان کی منزل وہی ان کا کنارہ بن جاتا تھا ۔ فکرِ فردا نے انھیں کبھی نہیں ستایا تھا ۔

ظاہر ہے کہ فکرِ فردا پلٹا صاحب کو کیوں ستاتی جب کہ ہمارے جیسے رشتہ دار ابھی دنیا میں موجود تھے ۔ وہ تو مزے سے کشتی میں بیٹھے تھے مگر خاکسار بحرِ فنا میں ڈوبا جا رہا تھا ۔ پلٹا صاحب اس روایتی کمبل کی طرح ہم سے چپٹے گئے تھے جو ہمیں نہیں چھوڑ رہا تھا ۔

دیوی جی نے کہا " ہم دونوں بیمار ہیں ۔ تبدیلی ہوا اور صحت بنانے کے لیے نکلے ہیں ۔ ظاہر ہے تبدیلیٔ آب و ہوا کا اثر چار ہفتوں سے پہلے کیا ہو سکتا ہے ۔

مدتِ قیام کی صراحت سن کر میں غش کھا کر گرنے لگا تھا کہ بیوی نے مجھے گلے لگا لیا میں وہاں سے ہٹ گیا اور جا کر اپنے بستر پر گر پڑا کیوں کہ یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم میاں بیوی بار بار غیروں کی موجودگی میں اس طرح چپکے جائیں ۔ گلے ملنے کے جو عادتات زیرِ بحث ہیں وہ جذبات بھڑکنے سے نہیں بلکہ حواس بھٹکنے سے پیدا ہو رہے تھے ۔

بستر میں پڑے پڑے جو آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں ان کا نچوڑ مختصراً یہ تھا کہ یہ جوڑا صحت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کھانے پینے میں پرہیز اور انتہائی احتراز برتتے تھے ۔ دیوی جی نیچرپیتھی کی قائل تھیں اور کچی سبزیاں پتے پھل اور ابلی ہوئی چیزیں نمک کے بغیر استعمال کرتی تھیں ۔ البتہ پلٹا صاحب کھانے کے معاملے میں اتنی کڑی احتیاط نہیں کرتے تھے بلکہ کچی پکی سبزیاں ، کچے پکے ہر قسم کے پھل ، ابلی اور تلی ہوئی ترکاریاں وغیرہ بھی بلا احتراز

کھا لیتے تھے۔ یہ لوگ اصلی گھی کھاتے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں جلاتے تھے اور گیہوں چکی میں پیس کر آٹا بناتے تھے۔

بیوی نے جو آہیں بھرتی ہوئی یہ تفصیلات سن رہی تھیں۔ بالآخر کہا آپ لوگ منہ ہاتھ دھولیں تو ناشتہ تیار کروں۔ پلٹا صاحب نے کہا شیر بھی کبھی منہ دھوتے ہیں۔ دیوی جی نے کہا کہ وہ ریل گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی سب ضروریات سے فارغ ہو چکی تھیں اس لیے بیوی نے دل پر پتھر رکھ کر ناشتہ تیار کیا۔ دیوی جی کے لیے سنترے کے چھلکوں، دودھ اور گڑ کو ابال کر بنایا ہوا مرکب اس کے ساتھ جس قدر پھل گھر میں موجود تھا وہ سجا کر میز پر رکھ دیا۔ پلٹا صاحب کے لیے انڈے، ٹوسٹ اور چائے۔ ناشتہ میز پر سجایا ہی جا رہا تھا کہ پلٹا صاحب ایک دو جماہیاں لیتے ہوئے دیوی جی کے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ میزبان کو بلانے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے، آکر کرسیوں پر ڈٹ گئے۔

دیوی جی نے کہا پلٹا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ انڈے نہیں کھائیں گے۔ پلٹا صاحب نے کہا انڈے مجھے بہت پسند ہیں مگر یہ عورت ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ مجھے کچھ کھانے ہی نہیں دیتی۔ یہ کہہ کر وہ انڈوں اور ٹوسٹ پر ٹوٹ پڑے۔ بیوی نے ہم سب کے لیے آٹھ ٹوسٹ بنائے تھے۔ پلٹا صاحب نے ان سب پر جس قدر مکھن میز پر رکھا گیا تھا لگایا اور آدھی بوتل جیم کی تہہ کی صورت میں۔ ان پر جمائی اور پھر یکے بعد دیگرے سب کا صفایا کر دیا۔ حلق تر کرنے کے لیے انھوں نے مزید چار پیالے چائے کے بھی پیے۔ دیوی جی نے اپنی پرہیزی چائے اپنے لیے بالٹی نما گلاس میں بھر کر پی۔ چائے کے ساتھ چار سنترے اور کچھ انگور کھائے۔ جو پھل وہ نہ کھا سکیں پلٹا صاحب غیر ارادی طور پر کھا گئے۔ غرض جب یہ دونوں میز پر سے اٹھے تو میز پر رکھا ہوا کھانے کا تمام سامان ختم اور مطلع بالکل صاف تھا۔ البتہ نمک دانی میں کچھ نمک رہ گیا تھا جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ پلٹا صاحب کی نظر اس چھوٹی سی چیز پر نہیں پڑی تھی۔

گھر کی نوکرانی آچکی تھی وہ برتن اٹھانے لگی۔ بیوی پلٹوں کی بھوک دیکھ کر حواس باختہ ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے رونے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہماری لڑکی کتے کو لے کر ایک کونے میں جا بیٹھی تھی۔ میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اپنے ہوش و حواس قائم رکھوں۔ بیوی اور لڑکی تو SHOCK کا شکار ہو چکے تھے انھیں پانی میں گلوکوز ملا کر پلایا، دلاسا دیا، ہمت بندھائی اور خود ضروریات سے فارغ ہو کر دفتر چلا گیا۔

آپ سمجھیں گے کہ اب میں شاعری کرنے لگا ہوں۔ مگر یقین مانیے کہ دفتر میں بار بار مجھے یہ خیال ستاتا رہا کہ نیچرو پیتھی کے پرستاروں کا یہ عجیب و غریب جوڑا کہیں ان بھوت پریتوں کی اولاد تو نہیں تھا جن کے قصے بچپن میں ہمیں ڈرانے دھمکانے کی غرض سے سنائے جاتے تھے۔ مجھے اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ لوگ بیوی کو ابال کر نہ کھا جائیں۔ میرا یہ اندیشہ اس وجہ سے بھی پیدا ہو رہا تھا کہ جب سے ہندوستان نے آزادی حاصل کی ہے اس کے بہت سے نیتا رام راج قائم کرنے کے درس دیتے پھر رہے ہیں اور میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں واقعی ترقی کر کے ہم راون اور سروپ نکھا کے زمانے میں تو نہیں پہنچ گئے تھے۔

جب دفتر سے اٹھ کر گھر پہنچا تو بیوی کو زندہ پا کر اس نیلی چھتری والے کا شکر بجا لایا۔ درحقیقت میں نے بیوی کو بالکل اسی حالت میں پایا جس حالت میں ان کو چھوڑ گیا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ پلٹا صاحب کا پیٹ بھرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھیں یعنی کھانا پکا رہی تھیں۔ دیوی جی اپنی چکی پیس رہی تھیں اور پلٹا صاحب پلنگ پر دراز دن میں کھایا ہوا کھانا ہضم کر رہے تھے۔

اتنے میں شام ہوگئی۔ شامِ غریباں، شامِ مجبوراں، شامِ مہمان فراواں! پلٹا صاحب اٹھے۔ کہنے لگے۔ اس حیدرآباد کا موسم برا نہیں۔ اچھا مقام ہے۔ میں پلٹا صاحب سے دس گز دور بیٹھا تھا۔ نزدیک اس لیے نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ ان کے جسم سے ایک عجیب قسم کی تیز بساند آتی تھی جیسی چڑیا گھر میں ریچھوں یا شیروں کے پنجروں کے پاس آتی ہے۔ ہمارا کتا بھی سہما سہما سا تھا۔ وہ ان سے دور بیٹھا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ کہیں انسان کی کھال میں کوئی درندہ تو گھر میں نہیں گھس آیا تھا۔

میں نے پلٹا صاحب سے کہا ہم لوگ رات کا کھانا جلد کھا لیتے ہیں۔ پلٹا صاحب نے جواب دیا کہ کھانے کے معاملے میں انھوں نے کبھی کسی وقت کو بے وقت نہیں سمجھا۔

دیوی جی نے بڑی ناراضگی سے اپنا کھانا خود پکایا یعنی ارامن اس لیے کہ ہم جاہل نیچرو پیتھی کی ہدایات کے خلاف مٹی کے تیل سے جلنے والا اسٹو استعمال کرتے تھے۔ ان کی خوراک یہ تھی۔ پاؤ سیر چکی سے پسے ہوئے آٹے کی آٹھ بڑی بڑی روٹیاں۔ ایک لمبا کدو کاٹ کر ابالا ہوا اور کچی سبزیوں کی چٹنی جو پودینے کی چھ گڈیوں، چار مولیاں چھ ٹماٹروں اور پاؤ سیر گاجر کو کوٹ کر بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ گھر میں جس قدر دہی تھا وہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا۔

ہمارے کھانے میں بیوی نے چھ روٹیاں ہم تینوں کے لیے اور چھ پلٹا صاحب کے لیے تین پاؤ ابلا ہوا چاول۔ آدھا کلو بھنا ہوا قیمہ، آدھا سیر ماش کی دال۔ آدھا سیر ٹماٹر اور آلو کی ملی جلی ترکاری اور آدھا سیر مٹر اور گاجر کا بھجیا تیار رکھا تھا۔ پلٹا صاحب میز کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ان کے بیٹھنے سے پہلے ہی میں نے دو دو روٹیاں ہماری تین پلیٹوں میں رکھ دی تھیں تاکہ صبح کی طرح بھوکا نہ اٹھنا پڑے۔ دیوی جی نے کہا پلٹا صاحب قیمہ نہیں کھائیں گے اور پلٹا صاحب نے کہا یہ عورت ٹوکنے سے باز نہیں آتی۔

قصہ مختصر پلٹا صاحب نے روٹی کھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن چاولوں کی قاب لے کر تین چوتھائی چاول اپنی پلیٹ میں لیے اور چمچے اور کانٹے کی مدد سے چاولوں کو ایسی شکل میں جما لیا جس طرح راج مزدور گیلے چونے کے انبار لگا کر اور ان میں گڑھا بنا کے اس میں پانی ڈال دیتے ہیں تاکہ چونا گیلا رہے۔ پلٹا صاحب نے چاولوں کے بیچوں بیچ بنائے ہوئے گڑھے کو دال سے پر کر کے اس پر سبزیوں کی تہیں جما لیں۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے انھوں نے کٹی ہوئی پیاز اور ٹماٹر بھی طلب کیے۔ چاولوں کے انبار میں چمچہ بھر بھر کر پلٹا صاحب نے کھانا پیٹ میں منتقل کرنا شروع کیا۔ کھاتے کھاتے انھوں نے قیمہ کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں جو چٹنی سی پڑی ہے ان کی طرف بڑھا دی جائے۔ چناں چہ قیمہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کو انھوں نے چاولوں میں بنائے ہوئے گڑھے میں بھر لیا اور پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ جب بالآخر وہ اٹھے تو سوائے چھ روٹیوں کے میز پر پڑی ہوئی ہر پلیٹ اور قاب خالی ہو گئی تھی۔

پلٹا صاحب اور دلیپ جی اپنے پروگرام کے مطابق بیس دن تک اپنی صحت سنوارتے اور ہماری حالت زار کو اور زیادہ خراب و خستہ کرتے رہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس جوڑے کو نہ جانے کیسی قوت ہاضمہ بخشی تھی کہ ان بیس دنوں میں انھیں کبھی بدہضمی کی خفیف شکایت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ورنہ جس بے تکے پن سے یہ دونوں صبح، دوپہر اور شام کے وقت غذا کو نیست و نابود کرتے رہے تھے۔ ان کا کسی مہلک عارضہ میں مبتلا ہو جانا ہمارے نقطۂ نظر سے یقینی تھا مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ورنہ سبحان غازی
کے ساتھ ساتھ ان کی تیمار داری کا بار بھی ہمیں کو اٹھانا پڑتا۔ پلٹا صاحب کے قیام کی تفصیل ان کی بھوک کی طرح دراز ہوتی جا رہی ہے۔ مگر خدا خدا کر کے ہمارے بھی دن پلٹے اور پلٹا صاحب کے جانے کا دن آ گیا۔ میں نے دفتر سے دو دن کی رخصت لے کر ان کی روانگی کا نہایت مکمل انتظام کر دیا تھا۔ اس لیے وہ مقررہ تاریخ کو رخصت ہو گئے۔ میں سوچتا ہوں کہ پلٹوں کا یہ جوڑا اگر کھانے سے ذرا توجہ ہٹا کر سوچتا تو حالات کے اعتبار سے ان کا یہ کہہ دینا کہ ان کے پاس واپس جانے کا کرایہ نہیں تھا۔ غیر مناسب نہ ہوتا۔ اگر وہ ایسا کہتے تو ظاہر ہے کہ میں ان کا کیا بگاڑ لیتا اور ان کو نہ صرف واپسی کا کرایہ دیتا بلکہ سفر کے اخراجات بھی باول ناخواستہ ان کی مٹھی میں رکھ دیتا۔ اس زاویہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو پلٹوں کے آنے سے مجھے سراسر دو سو روپے کا فائدہ پہنچا تھا۔

خیر صاحب قصہ ختم ہوا۔ ہم تینوں خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں گو حالت مردوں سے بدتر ہو چکی ہے۔ مگر ہمارا پیارا کتا پلٹا صاحب کی بھوک کی تاب نہ لا سکا اور ان کے جانے کے ایک ہفتے کے اندر ہی ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ اب مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں چھپ جائے اور پلٹا صاحب کی نظر اس پر پڑ جائے تو کیا عجب کہ وہ داد دینے کے لیے پھر ایک مرتبہ اپنا ہمہ گیر بستر حیدرآباد کے سفر کے لیے باندھنا شروع کر دیں۔

بھارت چند کھنہ

لوتھر گارو

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو ریاست حیدرآباد کا وجود ختم اور نئی ریاست آندھرا پردیش کا جنم ہوا - آناً فاناً سکریٹریٹ میں نئے نام، نئے چہرے، نئے عہدے دار، نئے انداز، نئے قواعد اور نئے قوانین لاگو ہو گئے - ہر شخص، ہر عہدہ دار گارو تھا مثلاً صبح راؤ گارو، شام راؤ گارو، پاترا پرساد گارو وغیرہ - کچھ دن بعد ایک گارو صاحب نے صبح دفتر آتے ہی مجھ سے کہا کہ کھنہ گارو تمہارے دفتر کا کمرہ (جو میرے لیے پچھلے آٹھ سال سے... مختص تھا) چیف منسٹر گارو نے پسند کر لیا ہے - اس لیے آپ مہربانی کر کے اپنے گارو ہیں کے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔" یہ اسی کمرے کا ذکر خیر ہے جس میں سنجیوا ریڈی گارو، مرحوم سنجویا گارو، برہمانند ریڈی گارو، نرسمہا راؤ گارو اور پھر اپنے سبھی سربراہ گارو اجلاس فرماتے رہے ہیں۔

بہر حال میں اپنے نئے کمرے اور نئے ماحول میں ایک صبح بیٹھا تھا کہ چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ لوتھر گارو آئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں - جب میں نے پوچھا "کون لوتھر ــــــ؟" تو بتلایا گیا "این - لوتھر گارو۔" میں نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے - مارٹن لوتھر کے بعد این "یعنی نارٹن لوتھر، کوئی پادری صاحب ہوں گے - میں نے اندر آنے کو کہا اور اپنی شیطانی صورت پر معصومیت کا نکھار پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا - اب آپ میری حیرت کا اندازہ لگائیے جب پادری گون کی بجائے ایک نہایت صاف ستھرے سوٹ میں ایک نہایت قبول صورت نوجوان، چہرے پر نہایت بے لوث مسکراہٹ بکھیرنے چیتے کی چال میں مصافحہ کا ہاتھ بڑھائے اندر داخل ہوا - میری بھی سمجھیے کہ باچھیں کھل گئیں - آندھرا پردیش بننے کے بعد پہلی مرتبہ ایک گورا چٹا تیکھے خدوخال والا انسان نظر آیا تھا۔

میں نے پوچھا "لوتھر صاحب! کیا آپ بھی گارو ہیں؟"

کہنے لگے کہ "ابھی تک تو صحیح معنوں میں گارو نہیں ہوں - کیوں کہ میرے اوپر کئی گارو بیٹھے ہیں اور ان میں ایک تو خود آپ ہیں - مجھے بہ حیثیت انڈر سکریٹری آپ کے تحت کام کرنا ہے۔"

اس طرح میری ملاقات لوتھر صاحب سے ہوئی۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ موصوف کام کرنے میں بہت تیز ہیں
گو ان کی عمر اس وقت ۳۲ یا ۳۴ سال تھی مگر ان کا دماغ بہت سلجھا ہوا تھا۔ زبان انگریزی پر بڑا عبور حاصل تھا۔ نظم
و نسق کے اصولوں سے بڑی واقفیت تھی۔ مختلف قوانین و ضوابط ازبر یاد تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کبھی
ہم کسی مسئلے پر گفتگو کرتے تو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے انڈر سکریٹری ہیں یا میں ان کا سیکشن افسر ہوں۔ ان کے سپرد جو
کام کیا جاتا وہ اسے نہایت خوش اسلوبی سے اور انتہائی خاطر خواہ طریقہ پر انجام دیتے بلکہ جو کام میرے . . . .
میرے لیے ہوتے ان کو بھی یہ کہتے ہوئے کہ یہ بھی میں ہی دیکھ لوں گا، میری چھٹی کرا دیتے۔ وہ سب کام نہایت عمدہ انداز
تھے۔ البتہ میں نے ان کو یہ بتلا دیا تھا کہ میاں کام جتنا چاہتے ہو کرو مگر اس بات کا خیال رہے کہ کہیں میرے متعلق یہ مشہور
نہ ہو جائے کہ تلنگانہ کا یہ کھتہ بالکل "بیکار" ہے اور آپ کے کام کام میں کسی طرح میرا کام تمام ہو جائے۔
ان کے تعلیمی کارنامے سنیے۔ لوتھر صاحب نے بی اے آنرز پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں پاس کیا۔
یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس فرسٹ کا درجہ حاصل کرنے کی علت میں ان کو گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ ہوشیار پور کالج سے ان
ہونہار نے ایم اے پولیٹیکل سائنس ۴۵ء میں کیا۔ آئی۔ اے۔ ایس میں منتخب ہونے کے بعد ٹریننگ حاصل کرنے کے
دور میں اسسٹنٹ کلکٹر منگوڈ ور مقرر ہوئے اور فلڈ ریلیف کے کام میں ان کی بہترین کارکردگی کی پاداش میں گورنمنٹ گزٹ
میں ان کے کام کو سراہا گیا۔ پھر یہ سب کلکٹر نرول مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جی۔ اے۔ ڈی میں انڈر سکریٹری پھر ڈائرکٹر
انفرمیشن، جہاں سے وہ اسکالرشپ پر لیڈز یونیورسٹی گئے اور وہاں سے انڈسٹریل مینجمنٹ کے موضوع پر پوسٹ
گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا۔ واپسی پر ایک وفد کے ساتھ ٹورزم کے تعلق سے کراچی گئے۔ اس کے بعد مرکزی ہوم افیئرز
اور میٹل کی منسٹری میں ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں فولاد کے منسٹر کے ساتھ لندن اور ماسکو بھی گئے۔
دلی سے واپسی پر ڈائرکٹر انڈسٹریز مقرر ہوئے اور اس وقت کلکٹر حیدرآباد ہیں۔ لیبیا کی حکومت کے صنعت و حرفت
کے محکمے کی تشکیل میں مدد دینے کے لیے مختصر سی مدت کے لیے لیبیا بھی ہو آئے ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اپنی باقی
ماندہ مدتِ ملازمت میں موصوف دنیا کے اور مقامات کی بھی جہاں وہ ابھی تک نہیں جا سکے زیارت کر لیں گے۔
لوتھر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے
مگر ایسا شاید پرانے زمانے میں ہوتا ہوگا۔ لوتھر صاحب کے زمانے میں بھی عورت تو ہے مگر یہ پیچھے ہے اور نہ سامنے
بلکہ ساتھ ساتھ اور دوش بدوش۔ میں ذکر کر رہا ہوں لوتھر صاحب کے نہایت قابلِ احترام بہتر نصف کا۔ موصوفہ
کالج میں ان کے ساتھ تھیں، انھوں نے بھی ہوشیار پور کالج سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر پولیٹیکل سائنس
کے ان دو طالب علموں نے کتاب عشق کے اوراق پر نظر ڈالی۔ اور جنونِ عشق کو ختم کرنے کا جو واحد علاج ہے، وہ کیا۔
یہاں اس بات کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ لوتھر صاحب کے والدین نے لوتھر صاحب کی شادی
میں گھوڑا جوڑا تو کجا۔ اس بات کی بھی شرط عاید کر دی تھی کہ لڑکی صرف اپنے پہنے ہوئے لباس میں وداع کی جائے گی
اور بصورت جہیز ایک سوئی بھی ساتھ نہ لا سکے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے سماج کی یہ شاید منفرد شادی تھی جس میں لڑکے
کے والدین نے ایک پائی بھی نہ لینے کی شرط پر بیٹے کی شادی کرنا منظور کیا تھا۔
مسز لوتھر بھی انگلستان پلٹ ہیں۔ وہاں کے کسی اسکول میں مدرس کے فرائض بڑی قابلیت سے انجام دیتے

کے بعد دلی کے ایک اسکول میں درس و تدریس کا کام کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج میں تعلیمی ماہر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں اور اب ان کی قابلیت اور ان کی بے پناہ خوبیوں کی وجہ سے حیدرآباد کے ایک اچھے اسکول نے ان کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

لوتھر صاحب ایک مکمل مجسم اور بھرپور "گارڈ" بن چکے ہیں۔ اگر ان سے بات کرنا ہو اور صبح میں ذرا دیر ہو جائے تو وہ گھر سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ دفتر میں فون ملاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہاں نہیں پہنچے۔ کچھ دیر بعد پھر فون ملاؤ تو بلا مبالغہ ان کا پی اے جو چنگیزی قسم کا ہے جواب دیتا ہے "صاحب ایک میٹنگ میں ہیں" دو گھنٹے کے بعد اگر پھر فون ملاؤ تو جواب ملتا ہے کہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ مزید دو گھنٹے کے بعد قسمت آزمائی کرو تو اس مرتبہ وہ نہایت اہم کانفرنس میں منہمک ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ظالم ۵ بجے تک ان سے بات نہیں ہونے دیتا اور ۵ بجے کے بعد وہ کہتا ہے کہ اب دفتر برخواست ہو چکا ہے اور لوتھر گارو وہاں نہیں ہیں۔

لوتھر صاحب اس وقت نظم و نسق کے اعتبار سے اپنے عروج پر ہیں۔ اور ابھی ان کی ملازمت کے تقریباً ۸ سال باقی ہیں۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ اگر وہ مرکزی حکومت کے پلے نہیں پڑ گئے تو ہمارے جیسوں کی صف میں شامل ہونے سے پہلے چیف سکریٹری کے عہدہ پر ضرور فائز ہوں گے۔

لوتھر صاحب ہر کام بڑی باقاعدگی اور نہایت سلیقہ سے کرنے کے عادی ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے بڑے پابند ہیں۔ ایک ملازم سرکار ہونے کے ناطے سے حکومت کی فیملی پلاننگ کی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہوتے ہوئے انھوں نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی پر اکتفا کیا ہے اور لڑکا اور لڑکی (خدا ان کی عمر دراز کرے) ایسے ذہین کہ بڑے ہو کر ماں باپ سے بڑھ چڑھ کر شہرت اور ناموری حاصل کریں گے۔ صاحبزادہ صاحب جو ابھی سینئر کیمبرج کے آخری سال میں ہیں انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور شاعری بھی ایسی کہ اچھے اچھے رسالوں میں شائع ہو جاتی ہے۔ بیٹی بھی اپنی عمر کے لحاظ سے بہت قابل ہے۔

ہم اس بات پر ناز کرتے ہیں کہ لوتھر صاحب زندہ دلانِ حیدرآباد کے نائب صدر ہیں اور ایک نہایت اعلیٰ مزاح و طنز نگار ہیں۔ ان کے افسرانہ قلم میں بہت زور ہے اور یہی زورِ قلم ان کی تخلیقات میں بھی نمایاں ہے۔

میں یہ دعا کرتا ہوں کہ ان کو اپنے سرکاری کاموں سے کبھی کبھی اتنی فرصت مل سکے کہ ان کی ادبی صلاحیتوں کو زنگ نہ لگنے پائے۔ اگر وہ دفتر کے اوقات کے علاوہ مکمل چین و سکون اور کسی قسم کی مداخلت سے بچنا چاہتے ہیں تو حقیر مشورہ اس بارے میں یہ ہے کہ وہ اپنے دفتر کے پی اے کی خوبیوں والا کوئی پی اے اپنے گھر کے برآمدے میں متعین کر لیں۔ ایسا کرنے کے بعد ان کے گھر کے اندر ہوا کا جھونکا بھی داخل نہ ہو سکے گا۔

ضیاءالحق قاسمی (کراچی)

ماہنامہ شگوفہ کی سلور جوبلی

شگوفہ کی خبر سے طائرِ گلشن چہک اٹھا
اسی کی بھینی خوشبو سے چمن سارا مہک اٹھا
اسی نے ہم کو پچیس سال تک بے حد ہنسایا ہے
مگر اپنے غموں کو اپنے اندر ہی چھپایا ہے
خداوندا شگوفہ کو خضر کی عمر مل جائے
کلی ہر شاخ کی گلشن میں خزاں میں بھی ہو تو کھل جائے
مدیرِ محترم ہیں ڈاکٹر صاحب رسالے کے
یہ بانی ہیں دکن کی ظلمتوں میں اس اجالے کے
شگوفہ کو انھوں نے اپنا خونِ دل پلایا ہے
وہ خود ہنستے نہیں لیکن زمانے کو ہنسایا ہے
جریدے کی اشاعت بھی تو جوئے شیر لانا ہے
مزاح و طنز لکھوانا تو ٹیڑھی کھیر لانا ہے
مزاح و طنز کے ایسے جرید سب حقیقت ہیں
زمانے بھر کے لوگوں کے لیے مالِ غنیمت ہیں
مزاح و طنز کے سارے قلمکاری اس میں شامل ہیں
مزاح و طنز کے شعبے میں وہ شہرت کے حامل ہیں
رضا نقوی، جناب مجتبیٰ اور یوسف ناظم
تمنا زندگی چاہو تو پڑھنا ہے انھیں لازم
حمایت، بیگ، خوند میری، نریندر ہیں مشیر فیگی
دلیپ و مضطر و نیر بھی ہیں ان کے امیروں میں

شگوفہ کی ہے سلور جوبلی خوشیاں مناؤ تم
ہمیں آواز آئے گی کوئی نغمہ سناؤ تم

بگڑ رائچوری کی یاد میں

ناداری میں بھی خودداری کا اعلیٰ مظہر تھے بگڑ
خود غرضی کی اس دنیا میں بھولے شنکر تھے بگڑ
غم ہائے گوناگوں ان کی صحبت میں سہمے رہتے تھے
غم کے بیماروں کے حق میں اک خوشتر نسخہ تھے بگڑ
ہنستے ہنستے ہر ظلم سہیں ہنستے ہنستے سب کام کریں
یعنی اک سیدھے سادے ہندوستانی شہری تھے بگڑ
بھارت ہو یا پاکستان، سکہ ان کا چل جاتا تھا
شعری منڈی کے سرکل کا امریکی ڈالر تھے بگڑ
جب بھی وہ مائیک پہ آتے تھے ہر سامع چپ ہو جاتا تھا
شعری محفل کا آئی ایس آئی سانسر تھے بگڑ
خاموشی ہی کا سکے سے ہر دشمن کو جیت کرتے تھے
پھر گرا ان سے ڈرتا تھا ایسے دھرمیندر تھے بگڑ

بھارت کے کونے کونے میں پیدا ہوتے رہتے تھے
لگتا ہے قیسی کے گھر کی برقی کا میٹر تھے بگڑ

قیسی قمر نگری
(کرنول)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

825/C ۔4۔ سیکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ ۔ عابڈز ۔ حیدرآباد ۔ 1

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلائے جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد (مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جینی، بدھسٹ) کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دیے جاتے ہیں۔

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت ۱۰،۰۰۰ روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے اور ما باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی ۶۰۰۰ روپے سے کم ہونی چاہیے۔

(2) خود روزگار اسکیم کے تحت 2،50،000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹورس وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۹۳ء تک 47210 افراد میں 8،52،16000 روپے مارجن منی قرضہ جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 36،44،81،000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 61000 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 4،04،68،000 روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 85ء سے اب تک 50104 افراد میں 9،53،33،000 روپے مارجن منی جس کی لاگت 40،49،49،000 روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے گزشتہ سال دو لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تعلیم دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کیے گئے ہیں جس پر ۱۵ لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا۔ جس سے ۲ ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں ۱۳ ہنر سکھانے کے لیے اس سال 240 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں 53 کو کمپیوٹر 28 کو ٹائپ رائٹنگ 100 کو لائٹ موٹر ڈرائیونگ 11 کو لیب ٹیکنیشین 7 کو بیوٹیشن 1 کو شارٹ ہینڈ 10 کو الیکٹریشن 5 کو ٹیلرنگ 1 کو ویڈیوگرافی 15 کو فیبریکیشن 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ 5 کو ہیرے تراشنا 6 کو کارپینٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔ محمد [illegible] علی خاں

دسے کے خط (مراسلے)

"شگوفہ کا سلور جوبلی نمبر" ملا۔ بے حد شکریہ! اس معیار کا نمبر پر بھی مبارک باد قبول کریں۔

مجتبیٰ حسین نے یوسف ناظم کا خاکہ کھینچنے میں کنجوسی کی ہے۔ یوسف ناظم دھان پان آدمی ہی لیکن ان کی جسامت اور پھیلاؤ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس وسعت کے پیش نظر مجتبیٰ صاحب کو اپنے مضمون کو پھیلانا چاہیے تھا۔

مال مفت نے مزہ دوبالا کر دیا۔ مال مفت جو ظہرا، جیلانی بانو، نریندر لوتھر، مسیح انجم، پسندیدہ مہدی، وجاہت علی سندیلوی اور دوسروں نے لذت بخش حد تک متاثر کیا۔ یوسف ناظم اور مانک ٹالہ نے امریکہ اور مصر کی خوب سیر کرائی ہے۔ رفیعہ منظور الامین نے نئے سال کی مبارک باد جس طرح دی ہے ممکن ہے بہت سے قارئین اسے قبول نہ کریں — آدھا تیتر آدھا بٹیر کا مزہ دو آتشہ سے کم نہیں۔ اتنا سب کچھ ہضم کرنے کے لیے چورن تک پہنچنا ہی تھا۔ ڈکار لینے کے بعد ریاض میں تمام شگوفہ تک چہل قدمی کر آیا۔ ساری مبارک باد دوبارہ قبول کریں۔

مناظر عاشق ہرگانوی بھاگلپور

شگوفہ پابندی سے مل رہا ہے۔ سلور جوبلی نمبر بہت شاندار تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے عزائم برقرار رکھے۔ مارچ کے شمارے میں پاپولر میرٹھی کی غزل بہت پسند آئی اور مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون دیکھی کی ملکہ خوب رہا۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ مجھے ڈاکٹر عابد معز صاحب کی کتاب کی رسم اجرا میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں میں نے ایک تہنیتی نظم پڑھی۔

اقبال شانہ، حقل (سعودی عرب)

اپریل ۹۴ء کا شمارہ (بجوریات نمبر) شگوفے کی سلور جوبلی پر یقیناً ایک بہترین یادگار ہے۔ ۲۵ سال کے طویل عرصے میں پھیلا ہوا ۹۰ سے زائد شعرا کا منتخب کلام بے شک دلچسپ، لاجواب، معنی خیز اور طنز سے لبریز ہے۔ آپ کے اس شاندار کارنامے کو محفوظ کرنا ہر باذوق پر واجب ہو گیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

محمد یحییٰ جمیل، ناگپور

شگوفہ کا ۲۵ سالہ شعری انتخاب مجھ تک پہنچا۔ دیکھا پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ دیوان دل جلاں مفید ہے۔ شگوفہ کو تقریباً دہائی تک پابندی سے نکالتے رہنا کسی کمال سے کم نہیں اس پر انتخاب پیش کرنا سب کو جمع کرنا ہمت والوں کا کام ہے۔ اس میں سب کچھ ہے اور سب بہت خوب ہے۔ شگوفہ کا یہ نمبر قابل تعریف ہے۔ خدا کرے یہ کام جاری رہے۔

جہاں قدر چغتائی۔ بھوپال

---

۲۵ سالہ لاثانی دار شعری انتخاب پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ یقین واثق ہے کہ آپ اسی طرح باقاعدگی اور تزک و احتشام سے نت نئے شگوفے کھلاتے رہیں گے۔

دنیائے طنز و مزاح میں آپ کا اقبال بلند رہے۔

ڈی۔ این راز، پنچ کولہ (ہریانہ)

آپ کے ارادے ناقابل یقین حد تک خطرناک ہیں۔ خوب صورت، رنگا رنگ سوونیر کی اشاعت کے بعد سلور جوبلی نمبر، شعری انتخاب، نثری انتخاب کی اشاعت کا عزم ساتھ ہی مذاکرہ، سیمینار اور طنز و مزاح کے مقابلوں کا اعلان سچ بتائیے شگوفہ کی اس اڑان کے پیچھے ڈاکٹر عابد معز جیسے عاشق ابھر کی عملی اور مالی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اندرونی کمزوریوں کا ہاتھ ہے۔ آپ کی سرگرمیوں کو دیکھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ اردو زبان زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

[illegible]

اداریہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کے اولین صدر اور شگوفہ کی مجلسِ مشاورت کے رکن نامور مزاح نگار بھارت چند کھنہ کا گزشتہ مہینے چنڈی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً ۸۲ برس کے تھے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد سے کھنہ صاحب کا تعلق ابتدا ہی سے تھا۔ ۱۹۶۶ء میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ ان ہی کی صدارت میں تشکیل دی گئی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں فائن آرٹس اکیڈیمی کے ادبی شعبہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی صدارت پر وہ متمکن ہوئے۔ ان کی نگرانی میں کل ہند پیمانے پر سالانہ مشاعروں اور ادبی اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۷۲ء میں خود مختار ادارے کی حیثیت سے زندہ دلانِ حیدرآباد کو سوسائٹیز ایکٹ کے تحت باضابطہ رجسٹر کیا گیا اور بھارت چند کھنہ کی صدارت میں علحدہ باڈی تشکیل دی گئی۔ انھوں نے ادارے کی ترقی اور اسے اعتبار اور وقار عطا کرنے میں اہم حصہ ادا کیا۔ ادارے کے قیام سے قبل ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ مزاحیہ محفلوں سے ان کی وابستگی کے بعد ان کے مزاح میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے ان کی دو کتابیں "تیر نیم کش" اور "کیا نام نہ ہوگا" شائع کیں۔

کھنہ صاحب اصولوں کے پابند، وضع دار، پرخلوص اور نہایت شریف انسان تھے۔ ان کو مجھ سے خاص تعلق خاطر تھا۔ محبت، اپنائیت اور اعتماد کی ایک عجیب دل فریب فضا میں ہم کام کرتے تھے۔ پچھلے چند سال سے انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ شگوفہ اور زندہ دلان سے بھی ربط قائم نہ تھا۔ اب تو ہمیشہ کے لیے یہ ربط ٹوٹ گیا۔ لیکن ان کی یادیں کبھی ہمارے دل سے محو نہ ہو سکیں گی۔

عرصہ قبل شگوفہ کا ایک مختصر بھارت چند کھنہ نمبر شائع ہو چکا ہے۔ یہ شمارہ ان کے انتقال پر ایک حقیر سا نذرانۂ خراجِ عقیدت ہے!

- شگوفہ کی سلور جوبلی کے سلسلے میں منعقدہ نثر و نظم کے مقابلوں کے نتائج کا آئندہ شمارہ میں اعلان کیا جائے گا۔
- آئندہ شمارہ سے شگوفہ کے عام شمارہ کی قیمت ۸ روپیہ ہوگی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۷
شمارہ : ٦

جون ۱۹۹۴ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : عابد معز (ریاض)

کتابت : محمود سلیم - محمد غالب اور فضل محمد
طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ : ۸ روپے
زرِ سالانہ : ۸۵ روپے
بیرونی ممالک : ۲۰ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ :- ۳۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون آفس 595710 مکان 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

[illegible] 1-4 [illegible] فلور [illegible] اسٹیٹ - عابڈز - حیدرآباد - 1

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دی جاتی ہیں۔

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم

(1) غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت 10,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیے۔

(2) خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۹۳ء تک 47210 افراد میں 8,52,16000 روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 86,44,81,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 61000 6 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 4,04,68,000 روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 85ء سے اب تک 50104 افراد میں 9,53,33,000 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 40,49,49,000 روپے ہوتی ہے۔ جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈ میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کیے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں 13 ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں [illegible] کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپنگ، 100 کو لائٹ موٹر ڈرائیونگ، 11 کو لیب ٹکنیشن، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الیکٹریشن، 5 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیو گرافی، 5 کو فیشن [illegible] کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ، 9 کو ہیرے تراشنا، 6 کو کارپینٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 216 نظام آباد میں 100 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح اس سال جملہ 1100 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

خواہش مند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر ربط پیدا کریں۔

[illegible]

وجاہت علی سندیلوی

یوں بھی ہوتا ہے

ان دنوں ہم ایک طرح سے جنت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو بھی آسائش چاہتے ہم کو میسر تھیں اور کسی قسم کی کوئی فکر ہمارے قریب پھٹکنے نہ پاتی۔ ہم سلیم لوپر ہاؤس قیصر باغ کے سامنے [illegible] میں سے ایک ایسے کمرے میں رہتے جس کا دروازہ گلابوں کی کیاریوں اور لان کی طرف کھلتا۔ صاف ستھرے قیصر باغ میں جہاں صرف راجاؤں، مہاراجاؤں کی کوٹھیاں اور لان تھے، ہوا ہر وقت پھولوں [illegible] کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتی رہتی۔ شہر کے دوسرے حصوں کے شور شرابے کا کوئی گزر یہاں [illegible] آنکھوں میں تازگی، سینے میں کشادگی اور روح میں پاکیزگی محسوس کرتے۔

سویرے منہ اندھیرے چودھری صاحب ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتے۔ جتنی دیر میں،

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

گنگناتے ہوئے ہم ضروریات سے فارغ ہوتے۔ وہ بے چارے ہیٹر پر چائے بنا بیٹھتے اور پھر ہم دونوں سویرے کی ہوا خوری کے لیے چل نکلتے، کبھی ریزیڈنسی کی طرف، کبھی بنارسی باغ کی جانب، کبھی دریا کے کنارے غرض جدھر سینگ سماتے اور ڈیڑھ گھنٹے کا وقت جو اس کارِ خیر کے لیے مخصوص تھا، اجازت دیتا۔ اس [illegible] میں تمام تر ادبی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مباحثوں میں گزرتا۔ چودھری صاحب بہت کم گو تھے لیکن جب بولتے تو بہت باریک چٹکی لیتے۔ دیکھنے میں وہ بہت سنجیدہ، خاموش، معصوم بلکہ [illegible] آتے کہ انھیں دیکھ کر کسی یتیم خانے میں چندہ دینے کو جی چاہتا لیکن وہ جب زبان کھولتے تو ان کی ہر بات میں تیکھی، شرارت، طنز اور اپنے مخاطب کو چھیڑنے کا عنصر ضرور شامل ہوتا۔ [illegible] وہ [illegible] کے خلاف [illegible] اس قسم کے اشعار پڑھتے:

[illegible]
[illegible]

لیکن ایک دن چلتے چلتے کہہ گزرے "بھائی ان خانقاہوں میں کچھ تو ضرور ہے!" اب ہم راستے بھر بکتے جھکتے اور باجے کی طرح بجتے رہے۔ اور وہ خاموشی سے سنتے اور مسکرا دیتے۔ ان کی عمر ہماری عمر سے دگنی تھی یعنی ۴۸ سال۔ ایم اے علیگ اور اردو انگریزی کے کافی مشہور صحافی تھے۔ وہ اس زمانے میں ایک مقامی انگریزی اخبار کے سب ایڈیٹر تھے۔ ہماری خالہ زاد بہن اُن کو بیاہی تھیں اور وہ سلیم پور ہاؤس سے قریب تلوئی ہاؤس میں رہتے تھے۔

بھاٹوری سے واپسی میں چودھری صاحب اپنے گھر کی طرف مڑ جاتے اور ہم اپنے کمرے میں پہنچ کر نہاتے، دھوتے اور من پسند ناشتہ کرنے کے بعد باورچی کو دوپہر اور شام کے کھانے کے متعلق ہدایتیں دیتے اور گھر سے نو بجے نکل کھڑے ہوتے۔ تحقیق و دوستوں کے یہاں ہوتے ہوئے ان کے ہمراہ یونیورسٹی پہنچتے۔ وہاں پڑھائی سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ طلبا کے مطالبات، تحریکوں، ہم جماعت لڑکیوں اور تازہ ترین اسکینڈلوں کے متعلق تبادلہ خیال اور خوش گپیاں رہتیں۔ آخری گھنٹے میں حاضری بول کر یا بلا کہ ہم دو بجے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں پہنچ جاتے اور کھانے کے بعد اخبار پڑھنے کی کوشش میں سو کر اٹھتے تو کچھ احباب آ جاتے۔ چائے پی کر شام کو بٹلر پارک پہنچ جاتے۔ وہاں کچھ اور دوست مل جاتے اور گپ شپ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کسی پکچر پیلس میں کوئی اچھی فلم ہوتی تو اسے دیکھتے اور پھر دس بجے گھر آ کر کھانا کھاتے اور ناول یا اخبار پڑھتے پڑھتے غافل ہو جاتے۔ یہ تھی اس زمانے میں ہماری زندگی سادہ اور بے خدشہ۔

ہمارے اس خوانِ نعمت میں اگر کوئی کباب کی ہڈی تھی تو عبدالجبار خان آئی سی ایس سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ۔ ہمارے ہمسایہ سلیم پور ہاؤس کی کوٹھی میں پورٹیکو کے بائیں جانب پانچ کمروں میں سے ایک میں ہم رہتے اور اس کے دائیں جانب پانچ کمروں میں سے تین میں خاں صاحب اپنی اینگلو انڈین بیوی اور چند سال بچیوں کے ساتھ اقامت پذیر تھے۔ بڑے رعب داب اور چیخ و پکار کے انسان تھے۔ ہر وقت آسمان سر پر اٹھائے رہتے۔ اُن کے کمروں اور ہمارے کمرے سے مشکل سے پچیس گز کا فاصلہ ہو گا اور ان کی گھن گرج آواز اور سناٹے [illegible] سے ہم براہ راست متاثر اور مکدر ہوتے۔ عجیب پاگلانہ جیسی طبیعت پائی تھی انھوں نے۔ فوراً [illegible] سلگ جاتے اور دغنے لگتے۔ بھولا بھٹکا کوئی سائل ان کے دروازے پر پہنچ جاتا تو سب سے پہلے جھنجھلاتے، اپنے اہلکاروں پر بری طرح غراتے۔ اور نوکروں کو ہمیشہ ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے۔ کوئی نہیں ملتا تو [illegible] ستم کے لیے اپنے بے زبان کتوں ہی پر بے تحاشا چلانا شروع کر دیتے۔ ہم اس [illegible] سے بہت عاجز اور پریشان رہتے۔ ہمارے بالکل ہی سراسیمہ ہو جانے میں جو کسر رہ جاتی وہ خاں صاحب کا بیگم صاحبہ سب [illegible] سردیوں میں انگریزی گانوں کے گراموفون ریکارڈ [illegible] پوری کر دیتیں۔

[illegible] اپنے شہر [illegible] چیزوں سے بچنے کے لیے [illegible] بالکل [illegible] کے سر کے مصداق [illegible] ہم [illegible] گھٹنے [illegible]
[illegible]

میں چار پانچ منٹ کے لیے سلیم پورے لکھنؤ جاتے۔ ان کی آمد پر نہیں معلوم خان صاحب کیسے اپنے حلق میں آلۂ خاموشی (SILENCER) اتار لیتے اور سلیم پور ہاؤس پر جو خاموشی چھا جاتی اس میں سب سے بڑا حصہ انھیں کے کردار کا ہوتا۔ لیکن سلیم پور ہاؤس جانے کے لیے جیسے ہی راجہ صاحب کی موٹر گیٹ سے باہر نکلتی خان صاحب اپنی بتایا' اصل میں سرود صل کرنے کے لیے چل پڑتے اور :

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

کا مضمون ہو جاتا۔

کسی چھٹی کا دن تھا۔ ہم کھانا کھا کر سونے کی تیاری میں بستر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکا یک بے نا وقت چودھری طالب نمودار ہوئے اور جتنی دیر میں ہم اٹھ کر بیٹھے چودھری صاحب نے پلٹ کر دروازے کے باہر سر نکالا، اور غالباً کوئی اشارہ بھی کیا کیونکہ فوراً ہی خدا بخش کی چیخ نما آواز بلند ہوئی "جنت کی شیرینی ہے، لکھنؤ کی فیرینی ہے" اور وہ اپنی ڈلیا لیے کمرے کے اندر آ گیا۔ خدا بخش کی مٹی کی کوری پیالیوں میں جمی ہوئی فیرینی جس پر کھرچن کی چھوٹی سی مہر بھی لگی ہوتی ہوتی واقعی خوش بو اور ذائقے میں لاجواب ہوتی۔ یہ کیا ہی پیالی سے جو کافی بڑی ہوتی' جی بھر جاتا لیکن ہوس میں چودھری صاحب اور ہم نے دو دو پیالیاں کھائیں اور ایک پیالی ہم نے اپنے باورچی کو بھی کھلائی تاکہ وہ عبرت پکڑے اور اپنی کھیر کو ایسی فیرینی کے معیار پر لانے کی کوشش کرے۔ اس زمانے میں فیرینی کی ایک پیالی چار پیسے میں ملتی اور چار پیالیاں خریدنے پر ایک گھاتے میں' یعنی پانچویں مفت مل جاتی۔ خدا بخش کی فیرینی مشہور تھی۔ اس کے خریدار بہت تھے اور وہ مشکل ہی سے ہتھے چڑھتا۔ اس روز چودھری صاحب خاص طور سے اسے ہنکا کر ہمارے کمرے تک لائے تھے۔

ہم لوگ فیرینی کھا کر ابھی ٹھیک سے کلیاں بھی نہیں کر پائے تھے کہ خدا بخش کی صدا "جنت کی شیرینی ہے، لکھنؤ کی فیرینی ہے" کے تعاقب میں عبدالجبار خاں کی پہلے للکار اور پھر ڈانٹ پھٹکار سنائی دی۔ "کون ہے "یہ کم بخت، کون ہے الو کا پٹھا، جنت میں جہنم بیچنے والا۔ پکڑ لو سالے کو اور دھکے دے کر نکال دو۔ ہماری نیند خراب کر رہا ہے حرام زادہ! کوئی اور جگہ نہیں ملتی اس کو ہمارے ہی سر پر آ کر چیختا ہے مردود، کتے چھوڑ دو اس پر" ہم نے اور چودھری صاحب نے جھانک کر دیکھا تو بوڑھا خدا بخش سر پر اپنی ڈلیا سنبھالتا، بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے خان صاحب کے باوردی چپراسی پیر پٹخ پٹخ کر چیخ رہے تھے: "اب ادھر کا رخ کیا تو ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں رکھ دی جائیں گی تمھاری۔ بھول جاؤ گے اپنی شیرینی فیرینی" اور اس طرح خدا بخش کو خان صاحب کے اختیار سماعت سے باہر کر دیا گیا۔

دوسرے روز ہم سال انگریزی اخبار کے فکاہیہ کالم میں یہ چند سطریں دکھائی پڑیں:

"بانکے خاں ابھی زندہ ہے، بعض برطانوی افسروں کی شکل میں۔ انھیں اگر خواب غفلت [illegible]"

انھیں ہونے دو اور وہ دن اب دور نہیں جب ان کی مادرِ مشفق برطانوی آمریت بھی ہمیشہ کے لیے سو جائے گی۔"

چار مہینوں سے میں عبدالجبار خان صاحب کا قریبی ہمسایہ تھا لیکن آج تک وہ مجھ سے صاحب سلامت کے بھی روادار نہیں ہوئے تھے۔ برطانوی سول سروس میں داخل ہونے کے بعد عموماً ایک ہندوستانی بھی اپنے آپ کو انگریز یا اس کا روحانی رشتے دار تصور کر کے خالص انگریزوں سے بھی زیادہ صاحب بہادر بن جاتا اور عام ہندوستانیوں سے ملنا اپنی کسرِ شان سمجھنے لگتا۔ خان صاحب نے مجھ سے متعارف ہونے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ان کی ہیبت ناک چیخ پکار، جس سے کہ میں لرزہ براندام رہتا، تو میں نے ضرورت سے زیادہ سنی تھی، اور اس کی بنا پر میں جانتا تھا کہ وہ میرے پڑوس میں رہتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے یہ جانتا تھا کہ قطب مینار دہلی میں اور تاج محل آگرہ میں ہے، لیکن اس کے علاوہ میں ان کے وجود کے جغرافیے اور تاریخ سے بالکل ہی نابلد تھا۔ اور وہ میرے لیے ایک ورقِ ناخواندہ تھے۔

ایک دن صبح کی ہوا خوری کے سلسلے میں چودھری صاحب اور میں جب بنارسی باغ سے واپس آ رہے تھے تو دیکھا کہ سامنے سے پانچ آدمی ایک قطار میں یکے بعد دیگرے قدم ملاتے تاکہ درمیان میں مقررہ فاصلہ قائم رہے آ رہے ہیں۔ یہ جلوس قریب آیا تو دیکھا کہ سب سے آگے اجلاس کا ایک چپراسی ایک کتے کو اور اسی طرح اس سے کچھ پیچھے دوسرا چپراسی دوسرے کتے کو زنجیر کے ذریعے سنبھالے چل رہے ہیں۔ اس کے پیچھے قریب دس قدم کے فاصلے پر خود بدولت عبدالجبار خاں صاحب سٹی مجسٹریٹ اور ان سے قریب دس قدم پیچھے ان کا پیشکار اور سب سے پیچھے باوردی اردلی رواں دواں چلے آ رہے ہیں۔ خان صاحب اپنی ڈیل ڈول کی عظمت ظاہر کرنے والی مونچھوں کے ساتھ نہ صرف باقاعدہ سوٹ بوٹ میں تھے بلکہ ہیٹ بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر مئی کے مہینے کی کسی تپتی ہوئی دوپہر کی تمازت اور کرختگی تھی۔ وہ قریب آئے تو اتفاقاً میں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، چودھری صاحب نے بھی سلام علیکم کہا۔ خان صاحب نے ہماری طرف دیکھے بنا اپنی رفتار میں کوئی کمی لائے بغیر اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا جیسے اپنی ناک پر سے کوئی ناشدنی مکھی کو ہٹا رہے ہوں، اور منہ تانتے اپنی رو میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ "رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے" کا مرقع گئے۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک پیر کا آستانہ مرجعِ خلائق تھا۔ انھیں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا بڑے بڑے سرکاری افسر، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، زمیندار، تاجر وغیرہ ان کے ہاں حاضری دیتے۔ میرے والد مرحوم بھی ان پیر صاحب کے بڑے معتقد تھے بلکہ ایک دفعہ مجھے [illegible] [illegible] لڑکیوں کے درمیان [illegible] تھا۔ وہ جب بھی [illegible] پیر صاحب [illegible] جاتے [illegible]

حکم دے رکھا تھا کہ میں مہینے میں کم سے کم دو مرتبہ ضرور پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دوں اور ان کو نذر پیش کروں۔ اور اسی غرض سے انھوں نے میرے جیب خرچ میں دس روپے ماہوار کا اضافہ کر دیا تھا۔

میں بے یقینی کا پورا شکار تھا لیکن والد صاحب کے حکم سے سرتابی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتی۔ میں پہلی مرتبہ تو بادلِ ناخواستہ آستانے پر حاضر ہوا لیکن میں نے وہاں کی فضا اور ماحول بالکل خلافِ توقع پایا۔ پیر صاحب بڑے خلیق اور بارعب بزرگ نظر آئے۔ ہر شخص کا حال بہت توجہ سے سنتے اور خندہ پیشانی سے اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے۔ میری باری آئی تو والد صاحب کی خیریت دریافت کی، میرے رہنے سہنے کے متعلق پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ سلیم پورہ ہاؤس میں رہتا ہوں تو مسکرا کر فرمایا "وہیں تو عبدالجبار خاں رہتے ہیں"، اس وقت میں نے ان کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بھی اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ خان صاحب کس قسم کے انسان نما حیوان ہیں۔ میں نے نذر پیش کی تو اسے قبول نہیں کی اور فرمایا "ابھی نہیں، جب تم خود کمانا تب نذر دینا"۔ میں اٹھ کر چلنے لگا تو حجرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹوکرے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "اس میں سے کچھ پھل لیتے جاؤ"۔ ٹوکرے اور اس کے قریب کی سینی میں بہت سے پھل تھے۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں صرف ایک سنترا اٹھایا تو بولے "سیب" اور انگور نے کیا قصور کیا ہے؟ انھیں بھی لو۔" اور میں نے ایک سیب اور تھوڑے سے انگور بھی اٹھا لیے۔ میں پیر صاحب کی شفقت سے بہت متاثر واپس آیا۔

اس کے بعد میں خود اپنی خوشی سے پیر صاحب کے آستانے پر ہر پندرھویں روز جانے لگا اور جب بھی جاتا وہ مجھے طرح طرح کے پھل اور کبھی مٹھائی بھی ضرور عطا کرتے۔ اگر کبھی ایک دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو ایک نامعلوم قسم کی بے چینی محسوس کرتا اور پیر صاحب بھی بڑی یگانگت اور محبت سے تاخیر کا سبب پوچھتے اور مجھے حیرت ہوتی کہ اپنے یہاں کے سینکڑوں آنے والوں کے درمیان انھیں میرے آنے کا دن کیسے یاد رہتا۔ میرا ہی جیسا برتاؤ وہ دوسرے مریدوں اور عقیدت مندوں سے بھی کرتے۔ میرے عقائد میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پیر صاحب سے نیاز حاصل کر کے میں ایک عجیب سکون اور طمانیت محسوس کرتا اور میں اکثر سوچتا کہ کیا ایسے بے لوث ہمدرد اور شفیق پیر بھی ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں!

ایک اتوار کو میں پیر صاحب کے یہاں چلا گیا ـــــ حالاں کہ اس روز میں عموماً سنیما چلے جانے کی وجہ ان کے یہاں نہیں جاتا۔ میں ان سے شرف نیاز حاصل کر کے باہر کے کمرے کی دہلیز تک پہنچا تھا کہ میں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ سامنے صحن سے عبدالجبار خاں سوٹ میں ملبوس لیکن جوتا اتارے اور سر پہ ہیٹ کے بجائے رومال باندھے چلے آ رہے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر بڑی عاجزی برس رہی تھی اور ان کی مونچھیں دس بج کر دس کے بجائے آٹھ بج کر بیس منٹ بجا رہی تھیں۔ [illegible] اعلیٰ قسم کے پھلوں کا ایک بڑا ٹوکرا، جس کے اوپر قرینے سے کچھ اور بھی ڈبے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھائے ہوئے تھا۔ خان صاحب پیر صاحب کے سامنے پہنچتے ہی ان کے قدموں پر سجدہ ریز ہو گئے۔ [illegible] اپنا سامان ایک کونے میں رکھ دیا اور الٹا باہر چلا گیا۔ [illegible] صاحب کے [illegible]

کو اس عالم عاجزی میں نہ دیکھنے کے لیے۔

پیر صاحب نے خان صاحب کو ان کے سجدے سے اٹھایا اور ایک طرف سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہنس ہنس کر کچھ پوچھا جس کا جواب خان صاحب نے سر جھکائے، ہاتھ جوڑ کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد خان صاحب نے پیر صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر آنکھوں سے لگایا اور الٹے پیروں واپس ہوئے یعنی پیر صاحب کی نظریں جہاں تک دیکھ سکتی تھیں، ان کی جانب پیٹھ نہیں کی۔

اونٹ کے پہاڑ کے نیچے آنے کا ہم نے یہ واقعہ کچھ نمک مرچ چھڑک کر چودھری صاحب کو سنایا تو بہت محظوظ ہوئے کہنے لگے: "میاں! پیر صاحب کے سامنے اپنی فروتنی اور انکساری ظاہر کر کے تمہارا خان صاحب خلق خدا کے ساتھ اپنی کج خلقی اور رعونت کا لیکھا ڈیوڑھا برابر کرنا چاہتا ہے۔ خوشامد پسند لوگ خود بھی خوشامد کرنے میں بڑے طاق ہوتے ہیں۔ ہائے مرزا غالب نے کس غضب کا نکتہ آشکار کیا ہے:

اسدؔ یہ عجز و بے سامانی فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

اور پھر فلک کج رفتار نے ایک بالکل ہی نیا گل کھلایا اور انہونی کو ہونی کر دکھایا۔ چودھری صاحب جس اخبار میں کام کرتے اس کا انگریزی ایڈیٹر، صاحب بہادری کے تینوں گنوں میں چوکس تھا یعنی مے نوشی قمار بازی اور حسن پرستی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ شراب گھر پر یا کلب میں پیتا، جوا ریس کورس میں کھیلتا لیکن عشق دفتر میں لڑاتا کیوں کہ یہی وہ ایک جگہ تھی جہاں اس کی تند خو میم سائے کی طرح اس کے ساتھ نہ ہوتی۔ اس نے اخبار میں ایک ایسا انعامی مقابلہ شروع کر رکھا تھا جس میں انگلستان میں کھیلے جانے والے فٹ بال میچوں کے متعلق پیشین گوئی کرنا پڑتی اور مقابلتاً صحیح جواب دینے والوں کو علی الترتیب سو، پچھتر اور پچاس روپے انعام دیے جاتے۔ اس زمانے میں یہ رقمیں اتنی حقیر نہیں تھیں جتنی کہ آج کل۔ لال باغ کے پیرا ڈائز ہوٹل میں ایک روپے کی مرغ مسلم کی پوری پلیٹ ملتی اور چار آنے میں ملائی کے برف کی اتنی بڑی قلفی آتی کہ کھاتے کھاتے جی بھر جاتا۔

ایڈیٹر نے انعامی مقابلے کے جوابوں کی وقت مقررہ تک وصول یابی کا کام چودھری صاحب کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ شام کو اپنی تازہ ترین منظور نظر مس جولیا جانسن کے ساتھ جو اس کی ٹائپسٹ تھی اپنے دفتر کی تنہائی میں کرتا۔ وہاں قتیل کے میچوں گولوں کے علاوہ بھی اور بھی گل کھلتے اور ع یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا کا سماں ہو جاتا۔ ایڈیٹر گرگ باراں دیدہ تھا، سمجھتا کہ مس جانسن کے ساتھ اس کی تنہائیاں ہنسی مذاق کا باعث بنتی ہیں لیکن اپنے آپ کو انگریز اور حاکم قوم کا فرد سمجھتے ہوئے وہ ایسی معمولی سی بات کا نوٹس بھی لینا محض حماقت خیال کرتا۔ قسمت کے ہیر پھیر سے [illegible]

مس جولیا جانسن تیکھے ناک نقشے اور بھرے بھرے جسم کی ایک پچیس سالہ لڑکی تھی جو بہت زیادہ اخلاق اور نخرے دکھاتی۔ وہ جان بوجھ کر غلط ہندوستانی اپنے انگریزی الفاظ کے لہجے اور تلفظ کے ساتھ بولتی تاکہ اس سے اس کا رشتہ اور مضبوط نظر آئے اور عام ہندوستانیوں کو زیادہ مرعوب کیا جا سکے۔ اپنے کام سے جو وقت ملتا اس کو وہ انگریزی جاسوسی ناول پڑھنے اور ٹافی چبانے میں صرف کرتی۔ دیکھنے میں وہ اُلّو سی لگتی اور بات بے بات کھلکھلاتی رہتی لیکن تھی بڑا چلتا پرزہ۔ وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے فرضی نام سے وقت مقررہ کے اندر جواب کے تین فارم جو بالکل سادہ ہوتے فیس داخلہ کے پوسٹل آرڈر کے ساتھ داخل کر دیتی۔ جانچ سے پہلے جب اسے صحیح جواب معلوم ہو جاتا، جو صرف چند ہندسوں پر مشتمل ہوتا تو وہ ایڈیٹر کی نظر بچا کر اس کو اپنے سادہ فارموں پر لکھ دیتی اور انعام کی رقم ہڑپ کر جاتی۔ ایڈیٹر اس وقت کی عالم میں ہوتا کہ فارموں میں اندراج کیا اگر اس کی مونچھ بھی صاف کر دی جاتی .... تو اس کے فرشتوں کو خبر نہ ہو پاتی۔ اس وقت اس پر صرف عشق کا بھوت ہی سوار نہیں ہوتا بلکہ شراب کے نشے کی پری کا بھی سایہ ہوتا۔ مس جولیا جانسن کا یہ دھندا مہینوں چلتا رہا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ اگر ایک طرف بظاہر لٹتی رہی تو دوسری طرف در پردہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتی بھی رہی۔

کچھ عرصے بعد اڑتی پڑتی شکایتوں اور خود اپنی چھٹی حس سے ایڈیٹر نے مرا ہوا چوہا سونگھا (اس کے انگریز ہونے کی رعایت سے انگریزی کا محاورہ استعمال کیا جا رہا ہے) اسے تعجب تھا کہ بالکل صحیح جواب جسے انگلستان میں انگریزی کے ماہرین فن بڑی مشکل سے نکال پاتے ہیں ہندوستانی کیسے تڑ سے نکال دیتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے تو مس جولیا سے چھٹکارا حاصل کیا ـــــ وہ یوں بھی اس کے لیے پرانا اخبار ہو چکی تھی اور پھر کچھ دنوں بعد استعفا دے کر انگلستان واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ اخبار کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے لیے یہ یادداشت چھوڑ گیا کہ میں نے انعامی مقابلہ بند کر دیا ہے۔ کیوں کہ مسٹر چودھری جو کھدر پہنتا ہے اور باغی خیالات کا انسان ہے اس کے جوابوں میں گھپلا کرتا تھا۔ اور اخبار کو لوٹتا تھا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کی خفیہ پولیس کے ذریعہ جانچ کرائی جائے اور مسٹر چودھری کو قرار واقعی سزا دلائی جائے۔

یہ یادداشت جب بورڈ آف ڈائرکٹرز کے سامنے پیش ہوئی، جس میں زیادہ تر تعلقہ دار صاحبان، سرکاری افسر اور خطاب یافتہ افراد تھے، تو چونکہ ایک انگریز ایڈیٹر کے قلم سے لکھی ہوئی تھی لہٰذا صحیفۂ آسمانی سمجھی گئی اور اس پر فوراً عمل درآمد کیے جانے کے احکام صادر کر دیے گئے۔ چودھری صاحب کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائی گئی اور انھیں معطل کر دیا گیا۔ پولیس نے پندرہ روز کے اندر ہی الٹی سیدھی تفتیش کر کے چودھری صاحب کو فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ بعد میں بڑی مشکل سے ضمانت پر چھوٹا اور ان کا چالان میاں مجید خان صاحب سٹی مجسٹریٹ کے اجلاس پر بھیج دیا۔ خان صاحب کے اجلاس پر کسی چالان کے بھیج دیے جانے کا مطلب ہوتا مقدمے کی کارروائی سے پہلے سزا کا حکم سنا دیا جانا۔ خان صاحب پولیس کے [illegible] تھے۔ وہ ویسا ہی کرتے جو پولیس چاہتی۔

خاں صاحب جب اجلاس پر جلوہ فگن ہوتے تو ان کی رعونت، خشونت اور بد کلامی میں چار چاند لگ جاتے۔ اہلکار، مستغیث، ملزم اور گواہ تو کیا وکیل تک ان کے اجلاس پر قدم رکھتے ڈرتے تھے۔ قاعدے اور ضابطوں کی پابندی کا انھیں خبط تھا اور اسی سلسلے میں خوامخواہ سی بات پر وہ بقول شخصے کاٹ کھانے دوڑتے...... ان کے اجلاس پر سو میں ننانوے ملزم نہ صرف سزایاب ہوتے بلکہ دوسرے اجلاسوں کے مقابلے میں زیادہ سخت سزا پاتے۔ ان کا یہ مقولہ خاص و عام میں مشہور تھا۔ "چھوڑنا چھڑانا مدر کا کام ہے میرا نہیں۔"

چودھری صاحب ملازمت سے معطلی اور فریب دہی کے الزام کی رسوائی سے ہراساں اور پریشان تو تھے ہی لیکن اس نقصان اور شماتت ہمسایہ سے کہیں زیادہ اس بات سے خوف زدہ اور سراسیمہ تھے کہ اب انھیں عبدالجبار خاں صاحب کے اجلاس پر ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا:

ہم کھڑے ہیں پھر اسی کے روبرو
موت بھی آتی نہیں آئی ہوئی

میرے کہنے سے میرے ساتھ چودھری صاحب، پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اشک بار آنکھوں اور گلوگیر آواز سے اپنے خلاف ڈسمنڈ فاکس ایڈیٹر کی سازش کا پورا کچا چٹھا سنایا۔ پیر صاحب نے یہ بات توجہ اور ہمدردی سے سنی اور بہت متاثر نظر آئے لیکن جب چودھری صاحب اس ٹیپ کے بند پر آئے کہ آپ خاں صاحب سے میری سفارش کر دیں تو وہ خاموش ہو گئے اور جب چودھری صاحب نے اپنی التجا کئی مرتبہ دہرائی تو بڑی سنجیدگی سے فرمانے لگے "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کسی انسان سے فرمائش نہیں کرتا اور پھر کسی مقدمے میں سفارش کرنا میں اصولاً بہت معیوب سمجھتا ہوں۔ آپ خدا پر بھروسہ کریں، انشاءاللہ انصاف ہی ہوگا۔"

خاں صاحب کے ہاتھوں کس قسم کا انصاف ہوگا، ہم لوگ جانتے لہٰذا حزن و ملال اور مایوسی کا مرقع بنے ہم دونوں پیر صاحب سے رخصت ہوئے۔ حسب دستور انھوں نے پھل اور مٹھائی عنایت کی اور جب ہم لوگ دروازے تک پہنچ گئے تو واپس بلا کر چودھری صاحب سے کہا: "آپ اتوار کو فوادر ساڑھے نو کے قریب میرے یہاں آتے رہا کیجیے۔" یہ کہتے وقت پیر صاحب کے چہرے پر مونا لیزا جیسا تبسم تھا، جس سے بہت کچھ اور کچھ بھی نہیں سمجھا جا سکتا:

یہ تبسم آپ کا میرے لیے اک راز ہے
انتہا اس کو میں سمجھوں یا کوئی آغاز ہے

ہر اتوار کو بلا ناغہ چودھری صاحب وقت مقررہ پر صاحب آستانہ پر حاضری دیتے رہے۔ عبدالجبار [illegible] صاحب [illegible] نظریں ان پر پڑتیں تو انھیں لگتا جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو لیکن رفتہ رفتہ ان نظروں میں [illegible] اور ناراضگی کے شعلے بھڑکنے کے بجائے انسانیت، ہمدردی اور پسندیدگی [illegible]

چودھری صاحب کے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو مس جولیا جونس بطور گواہ استغاثہ پیش ہوئی۔ اس نے خانۂ شہادت میں وہ ناز نخرے اور شوخیاں دکھائیں کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو خان صاحب آسمان، زمین ایک کر دیتے لیکن اس سلسلے میں ان پر کئی بریک لگ گئے تھے ایک تو یہ کہ وہ مغربی تہذیب کے پرستار تھے اور اس کا تقاضا تھا کہ جنس لطیف کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھا جائے، دوسرے یہ کہ مس جولیا ایک انگریز خاتون کی منظورِ نظر رہ چکی تھی اور تیسرے یہ کہ اٹھلا اٹھلا کر وہ جو اکھڑی اکھڑی زبان بولتی اس میں خان صاحب کو حکمران قوم کے لہجے کی کھنک سنائی دیتی اور ان کے لیے:

اے گل بتو خرسندم کہ تو بوئے کسے داری

کا مضمون ہو جاتا۔

استغاثے کے وکیل نے جب مس جولیا کے بیان کرائے تو اس نے وہی سب کچھ دہرایا جو پولیس نے اسے سکھایا تھا بلکہ یہ اپنی طرف سے جوڑ دیا کہ "مسٹر چودھری ہم سے فلرٹ کرنا مانگتا لیکن ہم اسے لفٹ نائیں دیا سکتا۔" لیکن جرح میں اس نے پولیس کے ہاتھوں کا نعل ادا کیا۔ اور ہر سوال کا جواب اس صفائی سے دیا کہ . . . . دودھ اور پانی کا فرق صاف نظر آنے لگا۔ اس کے بعض جوابات کو نہ پیش کرنا اس کی صاف گوئی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

"فٹ بال کے نتیجوں کا صحیح نتیجہ جب مسٹر ڈسمنڈ فاکس کو ٹیلی فون سے معلوم ہوتا تو وہ سب سے پہلے آپ ہی کو بتاتا؟"

"آف کورس! اور کس کو وہ بتا سکتا؟ وہ ہم سے بہوت اٹیچڈ تھا۔"

"اٹیچڈ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب ہے کہ وہ ہم کو لائک کرتا، پسند کرتا، ہم سے اپنا کچھ بھی نائیں چھپانا مانگتا۔ ہم کو اپنی ڈو DOVE بولتا!"

اس جواب پر حاضرین سے کچھا کھچ بھرے ہوئے اجلاس میں کچھ کھلکھلاہٹیں اور [illegible] کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خان صاحب زور سے گرجے "آرڈر! آرڈر۔ اجلاس میں تمیز سے بیٹھنا سیکھیے ورنہ باہر جائیے"

"آپ کو اپنی ڈو DOVE وہ سب کے سامنے بولتا؟"

"اوہ نو! ڈونٹ بی سلی۔ اپنے آفس کی پرائیویسی [illegible] جب ہم کٹ دونوں ہوتا بولتا۔"

"تو آپ کے اور مسٹر فاکس کے تعلقات صرف ایک ایڈیٹر اور ٹائپسٹ کے نہیں بلکہ کچھ اور بھی تھے؟"

"اوہ یس۔ وائی کا ڈفرنٹ ٹائم ایک سنسیبل بات تم نے کورٹ کو بتائی ہے۔"

"وہ آپ سے تنہائی میں چھیڑ چھاڑ کرتا اور یہ بات آپ کی مرضی سے ہوتی؟"

"ہاں کاڈ! ہم ایک دم گدھا مانگ بات کرتا (عدالت نے یہ جملہ ریکارڈ سے حذف کر دیا) تم بالکل

"تو آپ کے اور مسٹر فاکس کے ناجائز تعلقات اس کے دفتر کی پرائیویسی میں پروان چڑھے؟"

"تم ڈیٹیل جاننا چاہتا، ہم نائیں دینا سکتا - ہم ایک ریسپکٹیبل ورکنگ گرل ہے respectable working girl"

"ہم [illegible] صرف یہ جاننا چاہتا کہ تمہارا اُس سے ناجائز تعلق تھا؟"

"ناٹ ایٹ آل۔ نو ناجائز (ناجائز) نو"

"کیسا؟"

"ہم جو کچھ کرتے اپنی مرضی سے کرتا تھا - اپنی مرضی کبھی ناجائز نہیں ہو سکتا۔"

عبدالجبار خاں صاحب نے چودھری صاحب کو نہ صرف باعزت طور سے بری کر دیا بلکہ اپنی پوری ملازمت کے دوران پہلی مرتبہ جھوٹا مقدمہ چلانے کے لیے پولیس کی بڑے سخت الفاظ میں سرزنش بھی کی۔

چودھری صاحب نے اپنے مقدمے کی کامیابی پر یہ مختصر تبصرہ کیا۔

"برف پگھلتے دیکھا تھا فولاد پگھلتے بھی دیکھ لیا!"

یوسف ناظم

(بسلسلۂ گذشتہ)

امریکہ میری عینک سے

اہلِ امریکہ خوش نصیب لوگ ہیں جب ان کا مقدر لکھا جا رہا تھا یہ لوگ دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ کاتبِ تقدیر کو ان کا یہ انداز بہت پسند آیا اور آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی چابی امریکیوں کے قبضے میں ہے۔ ڈالر یہاں بجز الکاہل کے پانی کی طرح بہتے ہیں اور لوگ اس کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ وہ اسے ہاتھ کا میل نہیں سمجھتے۔ ایسا سمجھتے تو صرف ہاتھ ملتے رہ جاتے یہاں ہر شخص برسرِ کار ہے اور برسر خود کار بھی۔ پیدل چلنے والے بھی ہیں لیکن صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ دنیا کی رونق اونچ نیچ سے ہے۔

امریکی صرف ڈالر کی قدر نہیں کرتے پانی کی بھی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پانی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ دلیفرو امریکی مصالحہ اور معانقے اسی بہتے ہوئے پانی کی دین ہیں جو امریکہ سے افریقہ کو چلا جاتا ہے۔ کشافتوں کو دھونے کے لئے دودھ نہیں پانی ہی چاہیئے۔

ویسے امریکہ اس وقت کافی پریشان ہے اور یہ مایہ ناز پریشانی امریکہ کے سابق صدر جارج بش کا تحفہ ہے جو انہوں نے صدارت سے سبکدوش ہوتے وقت اپنے پسماندگان کو دیا تھا۔ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چلا ہے جو امریکہ کی جنگ پسند بے اعتدلیوں اور اس کے مالیخولیائی ذہنی جھٹکوں کی برملا مذمت کرتا ہے۔ امریکہ نے جون ۹۳ء کے آخری ہفتے میں بغداد پر بمباری تو کر لی لیکن اب اپنوں ہی کے تنقیدی مزائیل کا نشانہ ہے۔ امریکی صحافت میں اتنا ظرف ہے کہ بے گناہ شہریوں پر (جن میں مدرسے جانے والے نوعمر بچے بازار جانے والی خانہ نشین خواتین اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش مزدور شامل ہیں) بے وجہ بمباری کے خلاف خود اداریئے لکھے اور دوسرے لکھنے والوں کے مراسلے نمایاں طور پر چھاپے۔ ایک مراسلے میں تو یہ تک لکھا ہے کہ امریکہ خود وہی کر رہا ہے جس کا الزام دوسروں کو دیتا ہے۔ ایک اور مراسلے میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ امریکہ کو صدام حسین سے الرجی ہو گئی ہے۔ یہ مراسلے ۴ جولائی کے اخبارات میں چھپے ہیں۔ ۴ جولائی امریکہ کا یوم آزادی ہے۔ امریکی صحافت نے صدر امریکہ کو ان لوگوں سے خبردار رہنے کے لئے کہا ہے جو دعوا تو کچھ کرتے ہیں لیکن ان کے عزائم کچھ اور ہیں۔ بمباری کی حمایت میں کوئی قصیدہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ایک اور مراسلہ نگار نے امریکہ کے عہد نامہ آزادی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس عہد نامے میں صاف لفظوں میں دوسرے ملکوں کے حق آزادی کی حمایت اور تائید کی گئی ہے۔ اس عہد کو کیوں بھلا دیا جاتا ہے۔ اس بات پر

بھی اصرار کیا گیا ہے کہ عہد نامہ آزادی نئی نسل کو پڑھایا اور حفظ کرایا جائے۔ امریکہ میں ایسے رستم اور سہراب موجود ہیں جو ملک گیری کے نہیں دستگیری کے قائل ہیں۔

امریکہ کے [illegible] ہما کا سایہ تو ہے ہی لیکن سر پر جو دستارِ فضیلت ہے وہ ذرا سنبھال کر پہننی چاہیئے۔ کہیں بھی اور کسی بھی وقت یہ دستار مستقل چیز نہیں رہی ہے یہ سر پر اچھی تو معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سر کا حصہ نہیں ہے۔ زمین پر قدم غلط پڑیں تو دستار پہلے کانوں پر اتر جاتی ہے اور پھر آنکھوں پر۔

میڈان انڈیا

[illegible] کے بارے میں تو تقریباً طے ہو چکا ہے کہ یہ علاقہ غیر منقسم ہندوستان کا ادھار دیا ہوا حصہ ہے۔ لیکن یہی فیصلہ کیلی فورنیا کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کو غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں چھوٹے چھوٹے ہندوستان ہر جگہ حاضر ہیں اور یہ کیلی فورنیا تو بالکل میڈان انڈیا معلوم ہوتا ہے۔ اس صوبے کے ہر شہر میں خواہ وہ فرانسسکو کا کہسار ہو یا سین ہوزے (San Jose) کا مرغزار (یاد رکھیئے کہ امریکہ میں تلفظ اور املا دو الگ الگ اکائیاں ہیں) ہندوستانی برادران خورد و کلاں درختوں اور پودوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک شہر فیرا مانٹ (Feremont) جس کی آبادی کوئی ڈیڑھ لاکھ ہوگی۔ [illegible] مربع میل زمین پر پھیلا ہوا ہے (زمین یہاں ضرورت سے زیادہ ہے) یہ ہندوستان کے ہر صوبے کے منتخب نمائندوں کا پارلیمنٹ ہاؤز معلوم ہوتا ہے۔ شہر حسب معمول خوبصورت ہے۔ کیونکہ امریکہ میں غیر خوبصورت شہر ممنوع ہیں۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑ یہاں شوق کی چیز ہیں اور ان پہاڑوں کے دامن ہی میں نہیں ان کے اوپر بھی لوگوں نے اپنے آشیانے بنائے ہیں۔ ان میں پنجاب کے چھوٹے بھوروں کے شائقین ہیں جو اب بھی لسی پیتے ہیں۔ بہار کے سنگھاڑوں کے عاشق ہیں مہاراشٹرا کی مونگ پھلی اور کیلے کے جیالے ہیں، کیرالہ کے سانولے ہیں۔ ان میں تامل اور کنڑا مکی بھی موجود ہیں اور دہلی کی گلیوں کی خاک پھانکے ہوئے دیوانے بھی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف لیکن ایک دوسرے سے دور ہونے کے [illegible] بے حد قریب۔ اپنے وطن کی ڈور میں سب بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھولوں کی مالاؤں کی طرح گندھے ہوئے۔ ہر شہر میں رقص اور موسیقی کے دیوانوں کی انجمنیں اس طرح ہری بھری ہیں گویا یہاں کوئی قانون نافذ ہو گیا ہے ہندوستانیو! اگر تم نے یہاں "فائن آرٹس" کی کوئی سوسائٹی نہیں بنائی اور اسے فعال اور مستعد بنا کر نہیں رکھا تو تمہاری شہرت ہی نہیں تمہاری شہریت بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور تمہارے سبز کارڈ القطع ہو جائیں گے (القطع بیت بازی کی اصطلاح ہے) اسلئے کیلی فورنیا کے سارے شہروں میں یہ انجمنیں مکئی کی فصل کی طرح لہلہا رہی ہیں یہ فصل کٹتی نہیں ہے یہاں کی زرخیزی اور ہندوستان کی روایتی محبت کی کھاد کی وجہ سے ہمیشہ لدی پھندی رہتی ہے ان انجمنوں میں خواتین پیش پیش رہتی ہیں۔ مردوں کو بھی پیش پیش رہنے کی اجازت ہے لیکن وہ خود ہی پس و پیش سے کام لیتے ہیں اور حسب دستور خواتین کے پیچھے رہتے ہیں اور موسیقی کے پروگراموں میں صحیح موقعوں پر تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جب جی چاہا تالیاں [illegible] دیں اور سر ہلا دیا۔ نوعمر بچوں کو بھی موسیقی آشنا کان اور رقص شناس آنکھیں ملی ہیں ان کی تربیت ہی شاید ایسی ہوئی ہے کہ یہ بچے [illegible] کی صدا اور گائیکی کی ادا کو پہچانتے ہیں۔ خواتین میں جنہوں نے اپنے لباس [illegible] کو چھوڑا نہیں ہے۔ ضروری ہے دلچسپی رکھنے والی خواتین بھی شامل ہیں۔ ہر طرح کی دیوانگی فرزانگی

کے ساتھ وافر مقدار میں موجود ہے۔ فریا منٹ شہر کی ایک اسوسی ایشن جو انڈو امریکن اسوسی ایشن کے نام سے زندہ اور متحرک ہے پابندی کے ساتھ ہر ماہ کوئی نہ کوئی ایسا پروگرام منعقد کرتی ہے جس میں ہندوستان کا کوئی بڑا فنکار اپنے ہنر سے سننے اور دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتا ہے اور شائقین دوسرے پروگرام کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ نیاگرا فال کی طرح۔ (لیکن نیاگرا فال میں شور بہت ہوتا ہے۔ موسیقی کے پروگرام میں ایسا نہیں ہوتا) کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ پروگرام کے اختتام پر کوئی اہلِ ذوق بصد شوق دعوتِ طعام کا اہتمام کر دیتا ہے۔ یہ ہندوستان کی خاص الخاص روایت ہے۔ دعوتِ طعام سے مستفید ہونے پر یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہندوستانی ہاتھوں میں منجانب قدرت جو مزا اور سگھڑ پن ہوتا ہے وہ ہوا اور پانی کے بدل جانے پر بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ اسوسی ایشن بے منافع اسوسی ایشن ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں مقصد تو شامل ہے لیکن غرض کوئی شامل نہیں ہے۔ یہاں کے ہندو ٹمپل کے خوبصورت قالین یافتہ اور فرنیچر سے آراستہ آڈیٹوریم میں ستارہ دیوی کے بھائی برجو مہاراج کے ایک ہونہار شاگرد نند کمار نے تو دھوم مچا دی۔ ارشد سلمان کے پکھاوج اور طبلے کے ساتھ ایک بہاری خاتون نے وہ رنگ جمایا کہ دلوں کے طاق میں مومی شمعیں روشن اور آنکھوں کی پتلیاں شاد ہوگئیں (یہ چشم ما روشن دل ما شاد کا آزاد ترجمہ ہے اور رد و داوی میں ہوا ہے اس لئے تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رہا) رقص کی خوبی یہ تھی کہ میری سانس کی آمد و شد بھی سُر اور تال کی پابند ہوگئی۔ فنونِ لطیفہ کی جو قدر یہاں ہوتی ہے۔ وہ خود اولمپک کھیلوں کے عالمی ریکارڈ کی بات ہے لیکن اس سے زیادہ یعنی ریکارڈ شکن بات یہ ہے کہ ہندوستانی ساز مقبول بہت ہوگئے ہیں اور ہندوستانی آواز کا جادو امریکہ پر چل گیا ہے یہاں آ کے پتہ چلا کہ امریکہ صرف مونگ پھلی اور کلتی کے دانوں کا ملک نہیں قدر دانوں کا بھی ملک ہے۔ یہ تو ایک اسوسی ایشن کا ذکر ہوا ورنہ یہ علاقہ ہندوستان کے باشندوں کی تہذیبی اور تفریحی ہنگاموں کی کم سے کم دو درجن انجمنوں کی گرفت میں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہواؤں میں موسیقیت اور رقص کی کیفیت ہے اور کچھ شہر تو ہواؤں کے شہر ہی کہلاتے ہیں۔ شہری زندگی غضب کی ماڈرن زندگی ہے لیکن فضا میں کلاسیکیت کی گونج ہے۔ علومِ جدیدہ اور فنونِ لطیفہ کا یہ سنگم اعلا درجے کی سرجری کا کوئی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مختلف اعضائے جسمانی کو تو جوڑا جا سکتا ہے لیکن یہ تو ایسا ہی ہے جیسے پودا للی کا ہو لیکن پھول موگرے کے۔ انگلیاں کسی اور کی لیکن ناخن کسی اور کے۔ کہیں ایسے ہی تو ماحولیات نہیں کہا جاتا ہے لیکن یہیں ماحولیات کا تو قلمدان وزارت ہوتا ہے ماحول کا صرف ماحول ہوتا ہے۔ ہندوستان کو ہندوستان سے باہر جا کر دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

ماحولیات کے ذکر پر یاد آیا کہ ہندوستان میں پولیوشن بہت ہو گیا ہے۔ ہوا میں بھی فضا میں بھی۔ بس یہ پولیوشن باہر نہیں بھیجا جانا چاہیے۔ ہم اپنی ثقافت کے نمائندے ہیں کثافت کے نہیں۔ ہماری یہ بات سن کر آپ قائل ہو گئے ہوں گے کہ ہم نصیحتیں کتنی اچھی کر سکتے ہیں۔

رائفل اور نغمہ :

امریکہ میں قدر دانی کے جراثیم صرف شہری عوام میں نہیں فوجیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے پیغام صرف خون ریزی کا اشاریہ نہیں۔ اشک ریزی میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ فوجی

جن کا واسطہ قلم اور کتاب سے نہیں صرف رائفلوں اور مشین گنوں سے ہوتا ہے اندرونی طور پر شاعر یا نغمہ نگار تو نہیں بھی کسی نے بتایا تھا کہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جب دوسری جنگ عظیم کے تحت بالخیر کا اور امن کی (کمزور) ناختتا میں اڑلنے کا اعلان ہوا تھا تو امریکی سپاہیوں نے زمین پر اپنی رائفلیں رکھ دی تھیں اور ہم آواز ہو کر امریکہ کی محبت کا ایک نغمہ گا تھا۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ نغمہ تھا "حسین امریکہ" ——— قدردانی کی یوں نکلی کہ یہ نغمہ فیڈرل گورنمنٹ کے حکم پر نہیں لکھا گیا تھا اور نہ اس کے لئے شاعروں کو آمادہ بہ رزم کیا گیا تھا بلکہ یہ نغمہ ایک منکسر المزاج، خاموش اور تنہائی پسند اسکول ٹیچر کا لکھا ہوا نغمہ تھا۔ اس خاتون ٹیچر کو سرکاری ایوارڈ یا خطاب بھی نہیں دیا گیا لیکن امریکہ کے عالمی شہرت رکھنے والے موسیقاروں نے اس کی دھن بنائی اور سارے امریکی عوام اسے محبت، عقیدت اور احترام کے ساتھ گاتے ہیں۔ امریکہ کے اس قومی اور عوامی ترانے کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں۔

"وسیع اور فراخ آسمانوں

اناج کی فصلوں کی عنبریں موجیں

لاجوردی رنگوں میں نہائے اور پھلوں پھولوں سے لدے ہوئے پہاڑوں کے امریکہ

تجھ پر قدرت نے اپنی فیاضیاں بکھیر دی ہیں

اے امریکہ، خدا تیری آزادی کی حفاظت اور تیری ہر کوتاہی کی تصحیح کرے"

اس نغمے کی خالق کوئی بہت بڑی شاعرہ نہیں تھی لیکن امریکی شاید ناموں اور القابوں کے پیچھے نہیں بھاگتے ایسا بھاگنا ان کے نزدیک طرف داری ہے قدردانی نہیں۔ ویسے ہیرو شپ (Hero worship) بھی ان کے یہاں کورٹ شپ کی طرح ایک دستوری حیثیت رکھتی ہے لیکن امریکہ میں شاید فنونِ لطیفہ کو (جس میں ادب شامل ہے) لطیفوں کی طرح نہیں برتا جاتا ——— ہر نقطہ مکانے دارد ۔ اور جہاں تک مکانوں کا تعلق ہے امریکہ میں بے گھروں کو بھی گھروں ہی میں رکھا جاتا ہے۔ انھیں فٹ پاتھ پر بچھایا اور سُلایا نہیں جاتا۔ یہ ملک غریب الوطنوں کا تو ملک ہے لیکن خانما بربادوں کا نہیں۔ امریکہ کی خوبصورتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور اس کی داد دنیا کو لمبس کی روح کو تکلیف پہنچایا ہے۔

زرّیں دروازہ (گولڈن گیٹ)

فنِ لطیف سے فنِ تعمیر کو نسبت یوں ہے کہ آدمی چاہے تو اس فن کو حسن و جمال اور ہنر کے کمال سے فنونِ لطیفہ ہی کی ایک شاخ بنادے۔ یہی صورت کیلی فورنیا کی گولڈن گیٹ کی ہے جو شخص کبھی اور کہیں فریفتہ نہ ہوا ہو اسے یہ کام کر سکتا ہے۔ سنہرا رنگ کسے پسند نہیں۔ سنہری چیزیں ہم نے بہت دیکھی ہیں۔ حتیٰ کہ سونے کی کان بھی دیکھی ہے۔ ہم نے صاحبانِ عہد کا عہدِ زرّیں دیکھا ہے۔ اپنے سنہرے خواب بھی بہت یاد آتے ہیں۔ یہ خواب ہم نے جاگتے میں دیکھے تھے سنہرا مال و متاع (Golden Treasure) نام کی کتاب اور کئی اقوالِ زرّیں اور اب سان فرانسسکو میں گولڈن گیٹ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ ہم صراطِ زرّیں پر چلے۔ قدم تو ہم نے اس پر دھرے نہیں لیکن اس پل سے گذرے ضرور یہ گولڈن گیٹ اسی صدی کی تخلیق ہے یعنی تعمیر ہے۔ اس کی پچاسویں سالگرہ ۱۹۸۷ء میں منائی گئی (شاید اسی سائز کا بڑا سا کیک بھی تیار کیا گیا ہو اور اس پر ۵۰ موم بتیاں روشن کی گئی ہوں۔ پلوں اور عمارتوں کی عمریں نہیں

چھپائی جاتیں)، یہ پل امریکہ کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ طرہ بہت پیچ و خم نہیں ہے۔ دھنک کے سات رنگ تو مقرر ہیں اور ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن دنیا کے جو عجائبات مقرر ہیں ان میں تو اضافہ ہو سکتا ہے چونکہ جمالیات سے ہمارا گہرا تعلق رہا ہے اور خواہ وہ شاعری میں ہو یا فنِ تعمیر میں ہم اس پر بلا نا غہ فریفتہ ہوتے رہتے ہیں اور اسی پس منظر کے پیشِ نظر ہم اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ اس پل کو عجائبات کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔ پہلے سے جو عجائبات چلے آ رہے ہیں ان کی ترتیب بدلنے کی ضرورت نہیں ہے اس پل کو آٹھواں نمبر بھی دیا جائے تو اس کے جلال، جمال اور کمال میں کسی کمی کا واقع ہونا محال ہے۔ یہ پل بھی ہے بھی اور نہیں بھی کیونکہ اس پل کی بیساکھیاں نہیں ہے۔ کوہِ بے ستون کا نام ہم نے سنا ہے لیکن یہ قدرت کی صناعی کا نمونہ ہوگا انسانی ذہن کی کرامات کا نہیں۔ یہ پل معلق ہے اور ڈیڑھ میل لانبا ہے (حساب کیجئے تو چار ہزار دو سو فٹ ہوتے ہیں اس لئے حساب مت کیجئے) یک رخی راستہ ہے۔ سان فرانسسکو کی خلیج اور بحرالکاہل میں ربط ضبط پیدا کرتا ہے۔ کاریں اس پل پر اس طرح دوڑتی ہیں گویا ہوائیں پرواز کر رہی ہوں۔ یہ کیبل (آہنی ڈوروں) کے سہارے لٹکا ہوا ہے۔ شاید کبھی لرزتا بھی ہو۔ اوپر آسمان اور نیچے سمندر اس کا نگہبان اور نگران ہے۔ ۲ بلند و بالا دروازے (جو خوبصورت بھی ہیں اور مہیب بھی) اس کی ضامن ہیں۔ کیبل ان ہی دروازوں کے سہارے جھومروں کی طرح آویزاں ہیں۔ رات کے وقت جب ساری شمعیں یہاں فروزاں ہوتی ہیں تو یہ کیبل جو رگِ جاں ہیں جگمگا اٹھتے ہیں اور گمان گذرتا ہے کہ تان سین کے دیپک راگ نے آگ روشن کر دی ہے (لیکن تان سین کا وہ راگ اب ہے کہاں۔ آگ تو ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ کوئی روگ ہے راگ نہیں) سمندر ہندوستان میں بھی بہتا ہے لیکن ایسے پل یہاں نہ بنیں تو اچھا ہے۔ ہندوستان میں کئی معلق چیزیں موجود ہیں۔ کبھی کبھی تو پارلیمان بھی معلق ہو جاتی ہے۔ اس پل پر سے گذرتے وقت چونکہ آدمی نیچے نہیں دیکھ سکتا اس لئے زندہ و سلامت رہتا ہے۔ دیکھ سکتا تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ زمین زمین کے نیچے سے بھی سرک سکتی ہے۔ صرف آدمی کے پیروں تلے سے نہیں سرکتی۔

اس پل کو دیکھ کر خیال آیا کہ دنیا میں کتنی ہی چیزیں بے سہارا ہیں اور مہذب دنیا میں تو بے سہارا لوگوں کی تعداد میں (بجبر و خوبی) اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ خود امریکہ میں جہاں علم کی روشنی اور دانشمندی کے علاوہ دانشوری کی آب و تاب دھوپ کا چشمہ لگانے پر مجبور کرتی ہے وہاں بھی اب "بھوک" کا مسئلہ سر اٹھا چکا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں ہر کسی کو سر اٹھانے کی اجازت ہے ورنہ دنیا میں ایسے بھی علاقے ہیں جہاں سر ہی نہیں سر کے علاوہ کمر بھی جھکی رہتی ہے۔ تحقیقات کرنے کے شوقین اور ماہر لوگوں نے بتایا ہے کہ امریکہ میں کئی ملین بچے ایسے ہیں جنھیں غذا نہیں مل رہی ہے اور یہ بچے دودھ کیلئے آسمان کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ وہاں بھی مطلع صاف ہے۔ امریکہ میں ایسا ہونا تو نہیں چاہیئے لیکن امریکہ ہے تو اسی دنیا کا حصہ جہاں کسی بادشاہ نے دودھ کا تالاب قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نہ تو وہ تالاب وجود میں آ سکا اور نہ کہیں جوئے شیر نمودار ہوئی۔

بلبل کاشمیری (لندن)

غزل

مل فرنگستان میں بہلائیں گیا ہم بٹیروں کو یہاں لڑوائیں کیا
ہے مِرم روزی حرمِ جاناں بھی ہے پیر نہ ہو لندن میں تو ہم کھائیں کیا
تم تو جامِ جامۂ تہذیب سے ہو گئیں باہر تمھیں پہنائیں کیا
دائیں کنواں بائیں کھائی دیکھنا عشق کی راہوں میں آئیں جائیں کیا
قافیہ ٹھہرا ہسپانئے شاعری پھر بھلا یہ آئیں بائیں شائیں کیا
شارعِ مل پہ ہے وہ کوؤں کی برات سن رہے ہیں آپ کائیں کائیں کیا
جز وفیشن ہیں "زنانہ" بال بھی یہ کسی کو ہم بھلا سمجھائیں کیا
ہیں روا لندن میں سب بدفعلیاں یہ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"
لاکھ ذاتیں دیکھیے کشمیر میں "شیخ کیا - لاحول کیا ہے وائیں کیا

عقل کے بلبل کے طوطے اڑ گئے
پھر قفس میں ہے یہ ٹائیں ٹائیں کیا

غزل

ٹی ین راز (ہریانہ)

کیا ہم اپنے جشن تنہائی منانا چھوڑ دیں کیا کہا اب خواب میں بھی بڑبڑانا چھوڑ دیں
عشق کے مکتب کی میں نے سب کتابیں چاٹ لیں آپ محبوبہ کو میری ورغلانا چھوڑ دیں
کیا کمر اپنی جھکا لیں ہم دکھوں کے بوجھ سے غم اگر دل پہ پڑیں کیا مسکرانا چھوڑ دیں
کوچۂ جاناں کے کتے بھونکتے ہیں رات دن اتنے بزدل ہم نہیں کہ آنا جانا چھوڑ دیں
لوہا لکڑی اینٹ پتھر ہر شے مہنگی ہو گئی دوستوں کو مشورہ ہے گھر بسانا چھوڑ دیں
بعد سکھنے میں ہیں باقی کتنے دن لے شیخ جی اب بغرضِ مشق ہی کچھ آپ ڈھانا چھوڑ دیں
اک قیامت کیا ہے ملک میں سیلاب سے لیڈروں کو چاہیے آنسو بہانا چھوڑ دیں
پانی کے نل پہ تو حق رکھتا ہے بس مالک مکاں جو کرائے دار ہیں وہ سب نہانا چھوڑ دیں
ہے بلیک آؤٹ ضروری جنگ کے ماحول میں سرحدوں کے سامنے جگنو جگمگانا چھوڑ دیں
یہ مریضِ عشق ہیں بچ جائیں گے بیمار اور ڈاکٹروں کو لڑکیاں نبضیں دکھانا چھوڑ دیں
ہائے سپر ہٹ ہونی کے پیچھے کا نغمہ آج کل بے تکے وہ ہم پرانے گیت گانا چھوڑ دیں

مل چلے سب شاعروں سے راز کی ہے التجا
[illegible]

پرویز ید اللہ مہدی

یہ ہے بمبئی میری جان

زیرو اسٹار سے فائیو اسٹار تک

ایسا نہیں ہے کہ بمبئی میں صرف زیرو اسٹار ہوٹلوں، بھٹیار خانوں، کباب و بھیل کارنروں، چائے طعام گھروں اور سستے قیام گھروں ہی کی بہتات ہے۔ یہاں چونکہ بھانت بھانت کے لوگ بستے اور پرانت پرانت کے سیاح آئے دن وارد ہوتے رہتے ہیں اس لئے بمبئی کے بلدی حدود میں ان آراستہ و پیراستہ ہوٹلوں کی کمی نہیں جن کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن مزاج آسمان پر اور نظر ستاروں سے آگے کے جہانوں پر ہوتی ہے بلکہ پچھلے کچھ عرصہ میں ان ہوٹلوں نے اپنی اپنی توفیق اور اپنی اپنی طاقتِ پرواز کے بل بوتے پر آسمان سے ستارے نوچ کر انہیں سلمیٰ ستاروں کی صورت اپنے اپنے ماتھے پر سجا بھی لیا ہے چنانچہ ستاروں کی تعداد اور ان کی ظاہری چمک دمک کی مناسبت سے پہنچے ہوئے ہوٹلوں نے اپنی اصطلاح میں انہیں تھری اسٹار، فائیو اسٹار کے لقب عطا کر کے ان کے درجات خاصے بلند کر چکے ہیں۔

یوں تو ساری ہی تھری اسٹار، فائیو اسٹار ہوٹلیں انٹرنیشنل درجے کی حامل ہوتی ہیں لیکن چند خوش نصیب ہوٹلیں انٹرکونٹی نینٹل (INTER-continental) کے خطاب سے بھی سرفراز ہوتی ہیں اور صرف ان ہی شہروں میں پائی جاتی ہیں یہاں آدمی اور مشین میں مقابلہ آرائی چلتی رہتی ہے اور بالآخر مشین آدمی پر پوری طرح غالب آجاتی ہے اور وہ مشین ہی کی طرح بے حس اور ہر انسانی جذبے سے عاری ہو جاتا ہے۔!

ہوٹل کی مانگ چاہے ستاروں بھری ہو یا سونی، ہر ہوٹل کا بنیادی مقصد مسافر یا مہاجرین کو گھر سے دور گھر کا سکھ مہیا کرنا ہے البتہ سہ ستارہ و پنج ستارہ ہوٹلوں میں قیام و طعام کی آسائشوں و لذتوں سے کما حقہ محفوظ ہونے کے لئے آدمی کے ستاروں کا موافق ہونا ضروری ہے۔ یوں بھی ان اعلیٰ درجے کے قیام و طعام گھروں کی تعمیر کا مقصد عام لوگوں کو فیض پہنچانا نہیں ہے جن کے ستارے ہر وقت گردش میں رہتے ہیں ان آرام دہ پرتعیش ہوٹلوں میں داخلے کے لئے آدمی کا تگڑا ہونا غیر ضروری ہے کہ اس کا بینک بیلنس (BANK BALANCE) بھی تگڑا ہونا چاہیئے اسی لئے ایک عام آدمی دور ہی سے ان ستارہ صفت ہوٹلوں کو دیکھ کر اپنا جی [illegible] پر اکتفا کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے جن ہوٹلوں میں قیام و طعام [illegible] ایک [illegible]

فیمل کے ماہانہ بجٹ کو چٹکیوں میں چٹ پٹ کر دیتا ہو بلکہ اس کے پرخچے اڑا دیتا ہو۔ وہاں بار پانا ہمہ شما کے بس کی بات نہیں۔ وہاں تو صرف وہی خوش نصیب دادِ عیش دے سکتے ہیں جن کا ماہانہ بجٹ کسی ریاست کے سالانہ بجٹ کے بھی ایک کان کاٹتا ہو۔ چنانچہ بمبئی کی زیادہ تر فائیو اسٹار ہوٹلوں میں برس کے بارہ مہینے بڑے بڑے اسمگلر معہ اپنے بغل بچوں کے نامور فلمی ستارے عرف سپر اسٹار معہ اپنے چمچوں کے کھدر پوش سیاسی لیڈران معہ اپنے قدمچوں کے غیر ملکی زائرین معہ اپنے بال بچوں کے اپنے تھکے ہوئے دل دماغ اور معدے کی خالص غذا خالص شراب اور خالص شباب کے ذریعہ بھوک مٹاتے دکھائی دیتے ہیں کہ مذکورہ اشیاء کا بہترین و تازہ ترین اسٹاک ہوٹل کے حدود اربعہ میں ہمہ وقت دستیاب ہوتا ہے۔!

جب کسی شخص واحد کی ذات میں بہت ساری خوبیاں یکجا ہو جاتی ہیں تو اس کے معتقدین اس کی ایک اکیلی ذات کو انجمن سے تشبیہ دے کر اپنا حق نمک ادا کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں زیادہ تر شخصیتیں بعد ازاں انجمن مفید التمیٰ ثابت ہوتی ہیں۔ تھری اسٹار فائیو اسٹار ہوٹلیں بھی اپنی ذات سے انجمن ہوتی ہیں بلکہ ایک دنیا ان میں آباد ہوتی ہے بلکہ ہر انٹرنیشنل پائے کی ہوٹل میں شراب خانے، جوئے خانے، بنک، ٹراویل ایجنسیاں، ہیر کٹنگ سیلون، بیوٹی پارلر، گل فروش جسم فروش، بردہ فروش، ضمیر فروش، ہر قبیل کے بیوپاری اور دھندے باز اپنی اپنی دکانیں سجائے گاہکوں اور موٹے آسامیوں کی راہوں میں دیدہ و دل فرش راہ کئے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں البتہ جہاں تک ان ہوٹلوں کے مزاج اور معیار کا تعلق ہے یہ ہوٹل کے محل وقوع اور اس سے زیادہ اس کے انتظامیہ کی مہارت اور تجربے کی مناسبت سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے جس طرح ہر شخص کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے کوئی معتدل کوئی ٹھنڈا تو کوئی خبط الکٹرک اسی طرح تمام تھری اسٹار و فائیو اسٹار ہوٹلوں کا مزاج اور معیار بھی یکساں نہیں ہوتا چنانچہ بعض ہوٹلیں صرف نام کی تھری اسٹار اور فائیو اسٹار ہوتی ہیں اور ان کے "بڑے نام" پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

نام پستی میں بھی یوں روشن ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا

تھری اسٹار، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہنے سہنے، کھانے پینے و دیگر اشیائے لذیذ کے مزے لوٹنے کی بھاری قیمت تو خیر چکانی پڑتی ہی ہے۔ ہر آئیٹم کے ساتھ قیمت کے علاوہ اچھی خاصی رقم، ٹیکس اور ٹپ کی صورت میں بھی ادا کرنی پڑتی ہے گویا کردہ گناہوں کے ساتھ ناکردہ گناہوں کی سزا بھی کاٹنی پڑتی ہے۔ ٹیکس اور ٹپ کی یہ "زائد مد" ایک عام آدمی کے حق میں ویسی ہی ہے جیسے کوئی شامت کا مارا کسی تھرڈ گریڈ بھٹیار خانے میں جاتا تو ہے دو لقمے زہر مار کرنے لیکن بد قسمتی سے ہوٹل کی کراکری یعنی گلاس یا طشتری اس کے ہاتھوں شہید ہو جاتی ہے تو وہ بھوکے پیٹ منہ لٹکائے ہوئے کسی مجرم کی طرح کاؤنٹر عرف گلے والے کی طرف بڑھتا ہے پیچھے سے متعلقہ بیرا بہ آواز بلند گلے والے مستنڈے کو آگاہ کرتا ہے... "لنگی والا بھائی کے بعد پیٹ والا بابو کھایا پیا کچھ نہیں گلاس پھوڑا، دو روپیہ بارہ آنہ بھرانے کا..."!!

ہمارا خیال ہے ان اونچے درجے کے ہوٹلوں کے بلوں میں اگر ٹیکس و ٹپ کا دم چھلا نکال دیا جائے تو ایک عام آدمی زندگی میں کم از کم ایک بار دور کے اس جلوے کو پاس سے دیکھنے بلکہ چھونے کی بھی کوشش کر سکتا ہے۔ پھر بھلے ہی دس بیس روپے جو کھانے کے بعد باقی ماندہ زندگی اسے اللہ بس باقی ہوس کہتے ہوئے ہی کیوں نہ گزارنی پڑے، اس طرح دروازے سے پلٹ جانے کی حسرت تو نکل سکتی ہے لیکن ہم جانتے ہیں ان ہوٹلوں کے ارباب مجاز کو گھاٹے کا یہ سو

کبھی منظور نہیں کہ کاہوں بھی بچے بیوپاری کو اصل سے سود پیارا ہوتا ہے خدانخواستہ "ٹیکس وٹپ" کا یہ کیسہ زرا گران کے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان ہوٹلوں اور اس کال گرل (Call Girl) میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ جس کی خفیہ خدمت کی یومیہ اجرت میں اگر نخروں، غمزوں و اداؤں کی قیمت منہا کردی جائے تو پھر اس میں اور کھلم کھلا دھندا کرنے والی بازارو عورت کی اجرت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا غالباً اسی اندیشے کے مدنظر، ہر بڑی ہوٹل کا انتظامیہ اپنے عملے کو اس بات کی خصوصی ٹریننگ دیتا ہے کہ جب بھی گاہک آئے تو بڑھ کر اس کا خیر مقدم لینا، اور جائے تو بھاری بھرکم بل پیش کرکے اس کا دم لینا ۔۔!

سہ ستارہ، پنج ستارہ ہوٹلوں کی اپنے سرمایہ سے مستقل سرپرستی کرنے والے گاہکوں کی معاشی پوزیشن اور ذہنی استطاعت کا اندازہ محض اس ایک لطیفہ نما واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک چھ سالہ برخوردار جو ایام شیرخواری میں پلاسٹک کے معمولی کھلونوں کی جگہ الکٹرانک کھلونوں سے بہلائے گئے تھے اور ایام سمجھداری میں گلی محلے میں گلی ڈنڈا، اور گوری عرف نگوڑیچہ جیسے حقیر و بے قیمت کھیل کھیلنے کی جگہ ویڈیو (Video Games) ان کے من پسند کھیل ہوا کرتے تھے، اپنی افتاد طبع کے سبب ہوٹل کی لفٹ (LIFT) کو کھلونے کی طرح نیچے اوپر، اوپر نیچے چکر کھلا کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برخوردار کا یہ کھیل تماشہ ظاہر ہے دیگر معزز ساکنان ہوٹل کی آمد و رفت میں راست خلل انداز ہو رہا تھا۔ لہٰذا ہوٹل کی انتظامیہ نے فوراً اس بات کا نوٹس لیا پہلے تو برخوردار کو بہلا پھسلا کر اور سمجھا منا کر اس خطرناک کھیل سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی اور جب یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی تو ڈانٹ پھٹکار سے کام لیا گیا، لیکن یہ حربہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔ برخوردار لفٹ چھوڑنے کو کسی طور راضی نہ ہوتے۔ ہوٹل کے تجربہ کار عملے نے تھک ہار کر ان کے والدین سے رجوع کیا۔ شکایت سن کر برخوردار کے والدِ بزرگوار بجائے اس کے کہ اپنے نونہال کو تنبیہ کرتے، الٹا ہوٹل کے عملے پر پلٹ پڑے، بچہ اگر اس عمر میں کھیلے گا کھائے گا نہیں تو کیا تم لوگوں کی طرح بڑھاپے میں کھیلے گا کھائے گا۔۔؟ عملے کے ایک تجربہ کار ممبر نے سمجھانے کی کوشش کی، ہمیں آپ کے نورِ نظر لختِ جگر کے کھانے کھیلنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بے شک وہ چوبیسوں گھنٹے کھاتے کھیلتے رہیں، لیکن ہوٹل کی لفٹ کوئی کھلونا نہیں، کھیلنے کی چیز نہیں۔۔؟ مگر آپ کے ہونہار سپوت یہ بات ماننے ہی کو تیار نہیں۔

والد بزرگوار نے فرمایا۔ اگر یہ لفٹ کو کھیلنے کی چیز سمجھتا ہے تو پھر سمجھو کہ وہ کھلونا ہے اور اس کے من کو بھا گیا ہے اور آج کی تاریخ تک اس نے جو بھی کھلونا مانگا میں نے اسے خرید کر دیا ہے! ابھی بات کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں تم اپنی لفٹ کی قیمت بولو، میں ابھی اسی وقت کھڑے کھڑے اسے خریدنے کو تیار ہوں۔

اسٹاف کے ایک اور ممبر نے گڑبڑا کر کہا .... ارے مگر اس طرح کوئی لفٹ بھی خریدتا بیچتا ہے کیا؟

والد بزرگوار نے دلیل پیش کی، تم کو بھی تو کمپنی والوں نے لفٹ بیچی ہے نا، پھر تم کو اسے بیچنے میں کیا اعتراض ہے، تم اس میں اپنا منافع جوڑ کے قیمت بولو، گھبراؤ مت، میں اسے اونچی سے اونچی قیمت پر خریدنے کو تیار ہوں۔!!

اس لطیفہ نما واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صرف وہی لوگ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام و طعام کا خرچہ برداشت کر سکتے ہیں جو ہوٹل کی لفٹ بلکہ خود سالم ہوٹل کو خریدنے کی سکت رکھتے ہیں۔!!

●●

شانہ

غزل

اپنے گھر میں ڈر کے بستر میں دبکے ہی رہ گئے
چور چوری کر گیا ہم کانپتے ہی رہ گئے

بھول بیٹھے آج دو عالم کا ہم جغرافیہ
آپ کی صورت کا نقشہ دیکھتے ہی رہ گئے

لی جو انگڑائی تو ہاتھوں میں تشنج آگیا
ہاتھ جو اُس نے اٹھائے تھے اُٹھے ہی رہ گئے

پیڑ پہ آلو بخارا توڑنے چڑھ تو گئے
پیڑ کی شاخوں میں لیکن وہ پھنسے ہی رہ گئے

جب الیکشن میں ضمانت ضبط ان کی ہوگئی
وہ بنا سوچے کھڑے تھے اور کھڑے ہی رہ گئے

تیرنا جن کو نہ آیا وہ کنارے جا لگے
اور ہم کشتی میں چپّو مارتے ہی رہ گئے

ہم نہیں ڈرتے مگر شب اُن کا سایہ دیکھ کر
رونگٹے ایسے کھڑے اپنے کھڑے ہی رہ گئے

ریل کی سیٹوں پہ جو تھے بن ٹکٹ وہ سو گئے
اور ٹکٹ لے کر بھی شانہ ہم کھڑے ہی رہ گئے

بسترِ مرگ پر ڈاکٹر...

اقبال شانہ
حقل (سعودی عرب)

یوں نہ منہ موڑ کے جاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی
زندگی میری بچاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

اپنے ہاتھوں سے علاج اپنا میں کر سکتا ہوں
نرس، لوگوں کو بتاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

کون کم بخت یہ کرتا ہے میرے دل کا "مساج"
دل کو آہستہ دباؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

سانس لینے کے نہیں لنگس رہے ہیں قابل
آکسیجن تو لگاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

میں نے کتنے ہی مریضوں کو شفا بخشی ہے
مجھ کو للہ بچاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

ٹمپریچر میری باڈی کا تو دیکھو پہلے
برف میں یوں نہ لٹاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

کوئی شانہ مجھے لے جائے نہ مُردہ خانہ
ہاتھ مجھ کو نہ لگاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

قطعہ

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

کل تک کے پاس آنھیں دیکھنے کے بعد
پھر بڑھ گئی ہے پیاس انھیں دیکھنے کے بعد
پچیس سال بعد نظر آئے وہ ظریف
ٹوٹے نہیں ہیں ۳۲ انھیں دیکھنے کے بعد

ابراہیم یوسف (بھوپال)

اگر ایسا ہوتا

اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اب ہم کوئی غالب یا اقبال تو ہیں نہیں کہ غالب کی طرح اللہ پر اعتراض کریں کہ اس نے کسی سے مشورہ کیے بغیر تاروں کو بے ترتیب انداز میں آسمان پر بکھیر دیا یا اقبال کی طرح شکوہ کرتے بیٹھ جائیں مگر کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ اگر اللہ ایسا کرتا تو کیا خوب ہوتا۔ مثال کے طور پر انسان کی زندگی ہی کو لیجیے۔ اللہ انسان کو ایک معینہ مدت کے لیے دنیا میں بھیجتا ہے اور اس مدت کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ پیدائش کے بارے میں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بچے کو نو مہینے ماں کے پیٹ میں گزارنا ہوں گے تب کہیں جا کر اسے دنیا دیکھنی نصیب ہوگی اور اب تو ڈاکٹر پیدائش کا دن اور تاریخ بھی بتلا دیتے ہیں بلکہ خدا کے اس راز کو بھی فاش کر دیتے ہیں کہ پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اس راز کو فاش کرنے سے بہت سی لڑکیاں دنیا میں آ کر سانس لینے سے پہلے ہی جہیز کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اس قدر ترقی کے باوجود سائنس انسان کی موت کا وقت بتلانے سے عاجز ہے۔ بس ہم یہی سوچتے ہیں کہ اگر اللہ موت کے بارے میں بھی انکشاف کر دیتا تو کیا اچھا ہوتا۔ یعنی بچہ جب پیدا ہوتا تو اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا کہ یہ فلاں سنہ کے فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو اتنے بج کر اتنے منٹ پر فوت ہوگا تو صاحب اس سے انسان کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ بے چارے ابا جی فلاں فلاں کام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس موت نے مہلت نہ دی۔ اب ذرا سوچیے اگر موت کا وقت معلوم ہوتا تو ابا جی وہ کام ضرور کر لیتے اور اگر نہ کرتے تو اولاد یہ کہنے میں حق بجانب ہوتی کہ ابا جی بڑے کاہل تھے کہ یہ کام نہیں کیے اور ہلا وجہ ہمارے سر پر چھوڑ گئے۔ کم از کم جائیداد کا بٹوارہ تو کر ہی جاتے کہ ہم بھائیوں کو عدالت کچہری کے تو چکر نہ لگانا پڑتے۔ شادی بیاہ کے وقت جہاں اور چیزیں دیکھی جاتی ہیں یہ بھی دیکھا جاتا کہ دولہا دلہن کتنے عرصے ساتھ رہ سکیں گے اور بے وقت موت سے نہ کوئی جوان رنڈوا ہوتا اور نہ کوئی جوان لڑکی بیوہ ہوتی اور یہ جو آئے دن بیوگی جنم پتریاں ملاتے رہتے ہیں ان سے بھی نجات مل جاتی اور سب سے زیادہ فائدہ تو یہ ہوتا کہ کتنے

یہ جو قتل ہوتے رہتے ہیں یہ نہ ہوتے بس دشمن کی پیشانی پر اس کی تاریخ وفات پڑھی اور صبر کرکے بیٹھ گئے کہ مرحوم کی ابھی اتنی عمر اور باقی ہے قاتلانہ حملہ بے کار ہے۔ بلکہ عمر کا کمزور سے کمزور شخص بھی اپنے طاقتور دشمن کے سامنے سینہ پھلا کر جاتا وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم نے عزیز محترم سے اس سلسلے میں گفتگو کی تو وہ یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے غور کرتے رہے پھر بولے "تمہارے دلائل بڑی حد تک دل کو لگتے ہیں مگر مسئلہ کے دیگر پہلوؤں پر بھی غور کرنا ہوگا۔ مثلاً پولس کے کردار کے بارے میں تم جانتے ہی ہو کہ پولس لوٹ مار، چوری، ڈاکہ، اغوا اور زنا کے معاملات کو معمولی اور روزمرہ کے واقعات سمجھ کر زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ قتل کے واقعات ہی کو اہمیت دیتی ہے۔ اب اگر قتل کی وارداتیں ختم ہو جائیں تو پولس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گی۔ اور ان کی تنخواہوں اور الاونس وغیرہ کا غیر ضروری بار سرکاری خزانہ پر پڑے گا اور یہ دادا لوگ جو مار ڈالنے کی دھمکی دے کر روپیہ جھٹکتے رہتے ہیں ان کی کمائی ختم ہو جائے گی۔ جبکہ ہر شخص کو معقول روزی کمانے کا آئینی حق حاصل ہے۔ اسی لیے پولس بھی ان دادا لوگوں کو تحفظ دیتی ہے کہ وہ اپنے آئینی حق کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان پیشہ ور قاتلوں کا کیا ہوگا جو پیسہ لے کر بڑی فن کاری سے قتل کرتے ہیں۔ کسی شخص کو اس کے پیشہ سے محروم کر دینا انصاف نہیں ہے۔ ان اخبارات کے بارے میں بھی سوچو جو قتل کے واقعات کو شاہ سرخیوں میں شائع کرکے اپنی اشاعت بڑھاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی قتل پر جو دھرنے اور چکا جام کا ڈراما کیا جاتا ہے جس سے شہر میں چہل پہل اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے عوام اس تماشے سے محروم ہو جائیں گے اور کچھ لوگوں کو جو اس وقت اپنی لیڈری چمکانے کا موقعہ ملتا ہے وہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ ان وکیلوں کے بارے میں بھی سوچو جو ٹھیکہ لے کر قانونی موشگافیوں سے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے سے بچا لیتے ہیں۔ کسی کو پھانسی کے پھندے سے بچانا نیک کام تو ہے ہی۔"

عزیز محترم کے دلائل سن کر ہم چکر میں آگئے اور سوچنے لگے کہ ممکن ہے کہ موت کے وقت کو پوشیدہ رکھنے میں خدا کی یہی مصلحت ہو کہ قتل و غارت گری سے کچھ لوگوں کو رزق روزی ملتی رہے۔ ہمارے چپ رہنے پر عزیز محترم اس طرح مسکرائے جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ لیکن ہم نے فوراً پینترا بدل کر کہا "اس کا ایک خوش گوار پہلو بھی ہے۔" فرض کیجیے آپ سڑک پر جا رہے ہیں۔ سامنے سے منیر میاں اپنا سب سے قیمتی سوٹ پہنے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے چلے آ رہے ہیں۔ آپ سلام دعا کے بعد پوچھتے ہیں کیا بات ہے اس ٹھاٹ باٹ میں کدھر کا ارادہ ہے۔ کہیں ولیمہ وغیرہ پر جا رہے ہیں؟

ارے آپ کو پتہ نہیں۔ آج سلیم بھائی کا جشن وفات ہے۔ اسی میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔" منیر میاں اطلاع دیتے ہیں۔ "بخدا میں تو بھول ہی گیا تھا۔ وفات کا وقت کیا ہے۔" آپ سوال کرتے ہیں۔

"گیارہ بج کر ستر منٹ۔" منیر میاں جواب دیتے ہیں۔

آپ گھڑی دیکھ کر فرماتے ہیں۔ "ابھی تقریباً ڈھائی گھنٹہ باقی ہے۔ اچھا آپ چلیے میں لباس تبدیل کرکے ابھی آتا ہوں۔ اس معمولی لباس میں دیکھ کر سلیم بھائی برا مان جائیں گے۔ وہ ہمارے بڑے کرم فرما ہیں۔" یہ کہہ کر آپ گھر کی طرف چل دیتے ہیں کہ آپ کی ملاقات سلیم بھائی کے چھوٹے صاحبزادے سے ہوتی ہے۔ آپ ضیافت

فرماتے ہیں "ارے بھئی چھوٹے اس وقت کہاں جا رہے ہو"

"کیا بتلاؤں انکل" چھوٹے جواب دیتے ہیں۔ "اباکے لیے یہ کفن خریدا جو انھیں پسند نہیں آیا۔ لاکھ سمجھایا مگر وہ بضد ہیں کہ وہ اس کفن کو پہن کر ہرگز دفن نہ ہوں گے۔ اسے بدلنے جا رہا ہوں۔ ابا ہمیشہ اپنی مرضی ہم پر ٹھونستے رہے ہیں"

"کیا سلیم بھائی نے اپنے کفن کا خود پہلے سے انتظام نہیں کیا تھا؟"۔ آپ سوال کرتے ہیں۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں انکل۔ ابا ایک نمبر کے کنجوس ہیں۔" چھوٹے فرماتے ہیں: "اپنے ہاتھ سے ایک پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ ایک ہفتے سے برابر کہا جا رہا تھا کہ اپنی پسند کا کفن خرید لائیے مگر برابر ٹال مٹول کرتے رہے۔ اب ہم نے جو کفن خریدا وہ انھیں پسند نہیں۔ جی چاہتا ہے بلا کفن ہی بڑے میاں کو دفن کر دیا جائے۔"

چھوٹے صاحبزادے بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آپ گھر جا کر اپنا بہترین لباس زیب تن کرتے ہیں۔ ایک خوب صورت گلدستہ خریدتے ہیں اور سلیم بھائی کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک جشن کا سماں ہے۔ سلیم بھائی کے عزیز و اقارب اور پڑوسی بہترین لباسوں میں ملبوس تشریف فرما ہیں۔ فواکہات سے تواضع ہو رہی ہے۔ ایک طرف کچھ نوجوان ڈسکو کر رہے ہیں۔ لوڈ اسپیکر پر "چولی کے پیچھے کیا ہے" بلند آواز سے بج رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ادھر ادھر اچھل کود کر کے اودھم مچا رہے ہیں۔

"ٹھہرو ٹھہرو" عزیز محترم ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "تم جشنِ وفات کا نہیں جشنِ شادی کا نقشہ کھینچ رہے ہو"

"جی نہیں" ہم نے عرض کیا۔ "جب اس واقعہ کا علم ہمیں پچھتر سال سات مہینے اور تیرہ دن پہلے ہو گیا تھا تو پھر غم کیا ہے۔ ہمیں خوشی خوشی انھیں رخصت کرنا چاہیے۔ جشنِ شادی اور جشنِ وفات کا فرق کرنا بے کار ہے۔ عزیز محترم سوچتے ہوئے بولے۔ "خیر تمھاری یہ دلیل مانے لیتے ہیں۔ لیکن چولی کے پیچھے کیا ہے جیسے گانے کا یہ کیا وقت ہے۔" جب یہی سوال آپ منیر میاں سے جو آپ کے پاس ہی تشریف فرما ہیں کرتے ہیں تو وہ یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ سلیم بھائی کے بڑے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ ابا کو یہ گانا بہت پسند تھا۔ انھوں نے اس کا کیسٹ تیار کرا یا تھا۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اسے دیکھتے اور یہ گانا سنتے تھے۔ تب انھیں نیند آتی تھی۔ ان کی خوشنودی کے لیے ان کے آخری وقت میں سنایا جا رہا ہے۔ پچھتر سال کی عمر میں سلیم بھائی کے ذوق اور ان کی اولاد کی خوش مذاقی کی داد دیے بغیر آپ نہ رہ سکیں گے۔ آپ اپنے چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں۔ کچھ لوگ بے چینی سے اپنی اپنی گھڑیوں پر نظر ڈال رہے ہیں کہ ایک مولوی صاحب جو شاید فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لائے ہیں ایک رس گلا اپنے منہ کے سپرد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرات آپ کو بس انیس منٹ کی اور زحمت برداشت کرنا ہوگی۔ اس دوران آپ ڈسکو اور گانے کا لطف اٹھائیے۔ بخدا سلیم میاں کے صاحبزادوں نے بڑی دریا دلی سے کھانے پینے کا انتظام کیا ہے۔ اپنی کم خوری سے انھیں مایوس نہ کیجیے۔

آپ ذرا گھر کے اندر بھی جھانک کر دیکھ لیجیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ سلیم بھائی بہ صد قیمتی لباس

جو خاص اس وقت کے لیے تیار کرایا گیا تھا زیب تن کیے مسہری پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں گلے میں متعدد پھولوں کے ہار ہیں۔ بستر پر بھی گلدستوں اور پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ خواتین رنگ برنگ کے قیمتی لباس پہنے زیورات سے لدی پھندی ادھر ادھر خوش خرامی میں مصروف ایک کونے میں میراثنیں بیٹھی ڈھولک پر رخصتی گا رہی ہیں۔

چھوڑ دنیا کا گھر۔ تابوت میں ہو کے سوار۔ چلا اللہ کے گھر ۔ چھوڑ دنیا کا گھر۔
چلا اللہ کے گھر۔

"اماں حد کر رہے ہو۔" عزیز محترم بولے۔ "رخصتی لڑکی کی شادی کے وقت گائی جاتی ہے۔ تم سلیم بھائی کی گوا رہے ہو۔"

"اس سے بہتر کوئی لفظ فی الحال ہمارے ذہن میں نہیں ہے۔" ہم نے کہا:

"اگر اسے وداعیہ گیت کہا جائے تو کیسا رہے گا؟" عزیز محترم بولے۔

"کہہ لیجیے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" ہم نے جواب دیا:

خیر تو سلیم صاحب جو دولھا بنے بیٹھے ہیں کی نظر اپنی بہو پر پڑتی ہے۔ اسے دیکھ کر سلیم بھائی پوچھتے ہیں۔ بڑی بہو خدا بتلانا کتنا وقت اور ہے۔ ابا ابھی دس منٹ باقی ہیں۔" اچھا اچھا۔ ذرا رفیق کو بلوا دو مجھے ایک کام ہے۔ بہت اچھا کہتی ہوئی بڑی بہو چلی جاتی ہیں کہ بیگم سلیم کمرے میں آ کر

"ارے دیکھو تو چھوٹے ابھی تک کفن لے کر نہیں آیا۔ کیا لاش سڑانے کا ارادہ ہے۔" "ہاں ہاں اب میری لاش کو سڑنے کی بددعا دو۔" ۔۔۔۔ سلیم بھائی تنک کر کہتے ہیں: بخدا تمھارے منہ سے میرے لیے کبھی کوئی کلمہ خیر نہیں نکلا"۔۔۔ "اب آخری وقت میں تو خدا سے ڈرو اور مجھ پر یہ تہمت نہ لگاؤ" بیگم سلیم کہتی ہیں۔

"تمام عمر مجھے ایک منٹ سکون نہیں دیا اس وقت بھی لڑنے پر کمربستہ ہو۔ اسے کچھ دیر تو اللہ اللہ کرکے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اپنی مغفرت کی دعا کرو۔" اور یہ جو اتنے لوگ گھر کے اندر اور گھر کے باہر بیٹھے قسم قسم کی مٹھائیاں اور دیگر لوازمات سے شکم پری کر رہے ہیں اتنے نمک حرام ہیں کہ ہمارے لیے دعائے مغفرت بھی نہ کریں گے۔ بخدا ہم جب بھی کبھی کسی کے جشنِ وفات میں گئے ہیں اس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کی ہے۔" اسی وقت رفیق ان کے پاس آتے ہیں۔ رفیق کو دیکھ کر۔ "ارے بھئی رفیق وہ کلیم ہیں نا۔ ارے وہی جو خدا بھیڑے ہیں۔ موتی محلہ میں رہتے ہیں۔ ان کے گیارہ سو روپے ہم پر واجب الادا ہیں ادا کر دینا۔ نہیں تو قیامت کے دن ہمارا دامن پکڑیں گے۔ خدا بد معاش آدمی ہیں۔" رفیق کسی قدر ناگواری سے "ابا۔ آپ اس قدر ادائیگیاں چھوڑ رہے ہیں کہ ساری جائیداد فروخت کر دیں تو بھی ادائیگیاں نہ ہو سکیں۔ آخر آپ کی اولاد کا بھی تو کچھ حق ہے۔"

"یہ سب وہ لوگ ہیں جن کی طرف سے ہمارے دل میں کسی نہ کسی وجہ سے گرہ پڑ گئی تھی اور ہمارے مرنے کے بعد ۔۔۔ ان کا ایک پیسہ ادا نہیں کریں گے۔" سلیم بھائی فرماتے ہیں۔

کھولنے کی ذمہ داری آپ ہم پر چھوڑے جا رہے ہیں۔ رفیق بدمزگی سے کہتے ہیں " اور یہ چھوٹے ابھی تک کفن لے کر نہیں آیا " سلیم میاں کہتے ہیں ۔ کم از کم ہم اپنا کفن تو دیکھ لیتے " ۔ آتا ہوگا۔ بیٹھ گیا ہوگا کہیں دوستوں میں گپ شپ کرنے " رفیق اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر " اب آپ کلمہ پڑھ کر سیدھے سیدھے لیٹ جائیے۔ صرف دو منٹ رہ گئے ہیں " سلیم صاحب آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے ہیں۔ اور دو منٹ کے بعد انتقال فرما جاتے ہیں۔ رفیق لاوڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہیں " حضرات ! آپ کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ابا اپنے انجام کو پہنچے " ۔۔۔۔ " لاحول ولا قوۃ ۔ عزیز محترم بولے " اماں یوں کہو انتقال فرما گئے وصال ہو گیا۔ انجام کو پہنچنا کوئی اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا " ۔ ہم ان کے صاحبزادے کے الفاظ میں ترمیم کرنے والے کون ہوتے ہیں ہم نے عرض کیا وفات کا اعلان ہوتے ہی گھر میں چہل پہل بڑھ جاتی ہے ۔ بیگم سلیم کو خواتین ہاروں سے لاد دیتی ہیں۔ اور مبارک باد دیتی ہیں کہ سلیم صاحب پچاس سال سے جو ان کے سر پر سوار تھے اس سے نجات ملی۔ ایک بڑی بی جن کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ ہے مگر پاوڈر لپ اسٹک سے مسلح ہیں ۔ مبارک باد دیتے ہوئے فرماتی ہیں " بی بی تمہارا ہی دل گردہ تھا کہ پچاس سال ایک ہی کے پلّو سے بندھی رہیں۔ اس پر بیگم سلیم فرماتی ہیں ۔

اب کیا کرتی آپا ۔ بچوں کا خیال تھا ان کے ساتھ ایک دن بھی سکون سے گزارا ہو تو میں گنہ گار ۔۔۔ دوسری طرف کچھ خواتین نے بیگم رفیق کو گھیر رکھا ہے اور انھیں مبارک باد دے رہی ہیں کہ گھر پر اب ان کا راج ہوگا " ۔۔۔ " کیا خاک ہوگا " بیگم رفیق فرماتی ہیں " ابھی تو بڑھیا تین سال اور گیارہ دن زندہ رہے گی۔ بڑی کائیاں ہے ۔ تمام عمر ابا پر یوں حکومت کرتی رہیں جیسے وہ اس کے غلام ہوں " ۔ اب بی بی یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ ایک تجربہ کار خاتون فرماتی ہیں ۔ " بس پہلے ہی دن سے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لینا نہیں تو پچھتاؤ گی ۔ گربہ کشتن روز اوّل ۔ بڑھیا کو ایک کونے میں بٹھا دینا "

آپ کے پہلو میں منیر میاں تشریف فرما ہیں وہ زیادہ ہی بے چین نظر آ رہے ہیں۔ آپ بے چینی کا سبب پوچھتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں کہ انھیں جہانگیر صاحب کے جشنِ وفات میں جانا ہے اور آہستہ سے یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ وہاں کھانے پینے کا اس سے بدرجہا بہتر انتظام ہے کہ رفیق باہر تشریف لاتے ہیں انہیں دیکھ کر سب اس کی طرف لپکتے ہیں ۔ کوئی انھیں ہار پہناتا ہے کوئی گلدستہ پیش کرتا ہے۔ سب انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ اب وہ خاندان کے سربراہ ہو گئے ہیں ۔ رفیق مسکرا مسکرا کر سب کی مبارک باد قبول کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ سب آپ حضرات کے خلوص کا نتیجہ ہے ۔ زیادہ تر لوگ یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں کہ انھیں ایک اور جشنِ وفات میں شرکت کرنا ہے ۔ چھوٹے بغل میں کفن دبائے آتے ہیں ۔ کیوں کفن بدل لائے۔ رفیق پوچھتے ہیں " کیوں بدل لاتا ۔ میں تمہارے رخصت ہونے کا انتظار کر رہا تھا ۔ چھوٹے جواب دیتے ہیں ۔ اگر وہ بہن کفن پہن کر خدا کے حضور میں جاتے تو خدا مرعوب ہو کر ان کے گناہ تو بخش دیتا ۔

" بس بس " عزیز محترم گھبرا کر بولے ۔ " تم دنیا کا نظام ہی بدلے دے رہے ہو ۔ اچھا ہے کہ تاریخِ وفات معلوم نہیں ورنہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوتا ۔

قیسی قمر نگری
کرنول

غزل

عادتیں تبدیل کرتے رہنے کی عادت نہ چھوڑ — پاپ کرنا چھوڑ دے پر پاپ کی نیت نہ چھوڑ
دورِ نو کے ابنِ آدم کا یہ قول و فعل ہے — خوشۂ گندم مسلسل کھا مگر جنت نہ چھوڑ
انتقامی کارروائی کا خیال شر فزوں — چھوڑ دے عزت سے لیکن ہو کے بے عزت نہ چھوڑ
فائدہ آئے نظر تو باندھ تعریفوں کے پل — فائدہ کچھ بھی نہ ہو تو کوئی بھی تہمت نہ چھوڑ
کوہِ غربت توڑ کر خوشحالیوں کی نہر لا — چھوڑ دے لمحے تھکن کے تیشۂ محنت نہ چھوڑ

مقتدر ارباب کی مانند اے قیسیؔ میاں!
چھوڑ دے بھارت سے اُنسیت مگر بھارت نہ چھوڑ

نظر برنی
دہلی

کُنڈلیاں

"پتنی"

گھر کے اندر چپائی، گھر کے باہر افسر
یہ بھی افسر وہ بھی افسر، گول ہے اپنا بستر
گول ہے اپنا بستر پیارے مفت میں شامت آئی
گھر میں جھگڑا باہر جھگڑا، ایسی قسمت پائی
کہے "برنی کوی رائے" ہر اک سنے کان کھول کر سن لو
زیور یا ساڑی لے کر ہی گھسنا گھر کے اندر

"روگی"

روگی دی سی آر کا پھرتا ہے "وِکللتے"
دن کو جاگے رات کو جاگے کبھی نہ سونے پائے
کبھی نہ سونے پائے وہ پیارے کیسا پایا روگ
مہنگائی کے یُگ میں اس کی آنکھیں کرتی بھوگ
کہے "برنی کوی رائے" ہر اک سے یہ کیسا ہے بھوگی؟
آنکھیں پھوڑے پیسہ پھونکے پھر بھی خوش ہے روگی

ظہیر عارف

○

سچ اگر پوچھو تو بس یہ قابلِ تقلید ہے
آج کل کی بیویوں کی خواہشیں ہیں اس قدر
عمر اور رتبے سے اس کا واسطہ کچھ بھی نہیں
اگلی دو پشتوں کو کردیں بے نیازِ رنج و غم
مہ جبیں گونگی رہے اس کا میاں بہرا رہے
ہر پڑوسی سے محبت تو ضروری ہے مگر

کر کے سارے پاپ گنگا میں نہانا چاہیئے
ان کو خوش رکھنے کی خاطر اک خزانہ چاہیئے
عاشقی کے واسطے بس اک بہانا چاہیئے
زندگی میں مال اتنا تو کمانا چاہیئے
ایسا کچھ رشتہ مشاطہ کو جمانا چاہیئے
مال اس کا میرے گھر کے اندر آنا چاہیئے

جہاں قدر چغتائی
(بھوپال)

اُونی سوئٹر کی سرگزشت

ہم نے سنا ہے یورپ کے زیادہ تر ملک سال کے بیشتر حصے میں ٹھنڈے رہتے ہیں۔ ہم ایشیا اور آفریقہ والے اکثر گرمی سے جلتے رہتے ہیں اور کالے ہوگئے ہیں۔ سرد اور گرم ملکوں میں ہم کو ایک عجیب بات اور نظر آئی وہ یہ کہ سرد ملک والے گرم ملک والوں پر حاکم بن کر رہتے ہیں۔ پتہ نہیں اس معاملے میں سائنس کہاں سے کہاں تک ہمارے ساتھ چل سکتی ہے۔ جب سے روس موڈرن کٹ پیس ہوا ہے تو اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ مغرب حاکم، مشرق محکوم رہنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ گرم ملکوں کے سر پر کسی نہ کسی ٹھنڈے ملک کا سایہ کسی نہ کسی حالت میں ضرور رہتا ہے۔ ہمارے ملک کے سر پر کسی کا سایہ رہے یا ملک کے اندر کسی کا ہاتھ رہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ . . . . . ہم ننگے رہیں یا بھوکے، گھر میں رہیں یا فٹ پاتھ پر رہتے ہر حال میں خوش ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ہر کام قسمت پر چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں مگر ٹھنڈے ملک والے قسمت کو اپنے حساب سے لکھتے اور چلاتے ہیں۔ غریب ملکوں کو امداد دیتے ہیں قرضہ دے کر ان کا مقدر سدھارتے ہیں۔ ہم آزاد رہیں یا غلام، امیر رہیں یا فقیر مگر سردی کا موسم ہم کو پسند نہیں۔ جب بچے تھے تو سردی میں چولہے کے سامنے بیٹھ کر روٹی کا رول کھاتے تھے۔ اب وہ چولہے تو بہت جگہ بجھ چکے ہیں۔ سرد موسم میں آدمی گرم کپڑے پہنتا ہے جو جانور کے بال کاٹ کر بنائے جاتے ہیں۔ ہم درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ ہمارا مقدر ایک گرم سوئٹر سے آگے نہ جا سکا۔ غیر آزاد ہندوستان میں ہمارے ہاتھ ایک سوئٹر لگ گیا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ یہ سوئٹر ہمارے پاس آیا کیسے اور کہاں سے۔ کوشش کرتے ہیں ممکن ہے سراغ مل جائے یا سراغ لگ جائے، کہانی سوئٹر کی اگر لمبی ہوگئی تو سننے والے کہیں سنتے سنتے سو نہ جائیں۔ اس سوئٹر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہم اس کو کتنے ہی دن بعد زیب تن کریں بالکل نیا لگتا ہے۔ مضبوط اتنا کہ جیسے کسی انجینئر کا کارخانے میں بنایا گیا ہو۔ ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنی ساری زندگی میں کسی سوئٹر کا خریدنا یاد نہیں ہے۔ نہ یہ یاد ہے کہ ہم نے کسی دکان سے کوئی سوئٹر چرایا ہو۔ نہ کبھی ہمارا کوئی سوئٹر والا مہمان سردی میں ہمارے گھر آکر گرمیوں میں واپس گیا جو سوئٹر بھول گیا ہو۔ نہ کوئی دوست ہمارے پاس کا تھا اس کے تنگ ہونے پر اپنا سوئٹر ہم کو دے جاتا۔ نہ کوئی ایسا رشتہ دار یاد آتا ہے جو اتنا امیر ہو

ہم کو غریب جان کر سوئٹر تحفے کے طور پر دے گیا ہو صاحب اتنا نیا تھا کہ ہم کسی کی اترن سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ نہ کسی میلے ٹھیلے میں بھی گئے جہاں سستے داموں گرم کوٹ اور گرم سوئٹر فروخت ہوتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں ہم کو پریشان دیکھتے رہیں ـــــ ہم راز سوئٹر جانے بغیر کیسے سکون سے رہ سکتے ہیں۔ بھول کہیں نہ کہیں ہم سے ہوئی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے پہلے لکھ دیجیے لے۔ اگر ہم بھی دینے والے کا نام سوئٹر پر لکھ لیتے تو بحث کرنے سے صاف بچ جاتے۔ ارے ہاں ایک صاحب کبھی کشمیر سے لکھنؤ جاتے ہوئے ایک سوئٹر اپنے ماموں کو پہنچانے کے لیے دے گئے تھے۔ شاید یہ وہی۔ مگر نہیں ہرگز نہیں۔ امانت میں خیانت والا گناہ کرنے کی ہمت ہم میں کہاں تھی۔ وہ دن ہم بھول ہی نہیں سکتے۔ اتوار کا دن تھا صبح کے نو ساڑھے نو بجے ہوں گے جب ہم ان صاحب کے گھر یہ سوئٹر لے کر پہنچے تھے۔ ماموں تو ملے نہیں البتہ ممانی سوئٹر دیکھ کر زار و قطار رونے لگی تھیں۔ یہ کہہ کہہ کر کہ اگر یہ سوئٹر تھوڑے دن پہلے میرا بھانجہ دے جاتا تو وہ نمونیہ میں کیوں مرتے۔ مگر کم از کم میں تو اس مرض سے نہیں مروں گی۔ خدا سے ٹھنڈا رکھے جو ہم کو گرم سوئٹر دے گیا۔ اس طرح یہ ماموں بھانجے والا سوئٹر بھی نہیں ہے۔ ہمارا ہی ہے۔ بالکل ہمارا سا اس زمانے میں لوگوں نے خود فکر کرنا چھوڑ رکھا ہے۔ اسی لیے کام بگڑتے ہیں۔ یاد کیا تو دادی یاد آ گئیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہمارے خاندان میں بہادر شاہ ظفر کا ایک سوئٹر تھا۔ جب انگریز بادشاہ سلامت کو دلی سے لے گئے تو گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ جاتے وقت توشہ خانے کے محافظ کو یہ سوئٹر دے گئے تھے وہ محافظ دادی کو دے گیا اور کہہ گیا کہ جب عالم پناہ کی واپسی ہو تو یہ سوئٹر واپس لال قلعہ پہنچا دیں۔ نہ وہ دہلی آ سکے نہ سوئٹر لال قلعہ جا سکا۔ لہٰذا یہ شاہی سوئٹر ہمارا ہی ہوا۔

کیا ہوا جو والد کی ستر سالہ زندگی میں اس سوئٹر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اب اس سوئٹر کی چند خوبیاں بیان کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ جہاں تک سوئٹر کے رنگ کی بات ہے تو صاحب ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہزار منہ میں ہزار باتیں یا دوسرے لفظوں میں جیسی نگاہیں ویسے نظارے ـــ جب بھی بازار سے گزرتے ہیں لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں اس سوئٹر کا رنگ کون سا ہے۔ کسی کو اس کا رنگ نیلا کسی کو گلابی، کسی کو شرابی، ایک صاحب کو دھولیہ رنگ نظر آیا۔ ہمارے سوئٹر کا۔ کبھی کبھی تو ہم ڈر جاتے ہیں یہ دیکھ کر کہ ہمارے شہر میں "کلر بلائنڈ" کی وبا پھیل گئی ہے۔ . . . یا ہمارا سوئٹر ہی ایسا کلر بلائنڈ ہے جس کو دیکھ کر یہ مرض دیکھنے والے کی آنکھوں میں اتر کر لگ جاتا ہے۔ ہم کوئی چکتیک (ماہر چشم) ہوتے تو کچھ کہتے لیکن یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ دھنک سے زیادہ رنگ اس سوئٹر میں منفرد ہیں۔ خیر رنگوں کی بحث زیادہ نہیں بڑھائیں گے۔ مذہب و نسل کے فساد کیا کم ہوتے ہیں جو رنگ کا جھگڑا اپنے سوئٹر سے شروع کرا بیٹھیں۔ ہم تو اس کو بھی سوئٹر کی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں

اب ذکر چھیڑتے ہیں سائز کا۔ آج کا بچہ بچہ فری سائز کی خوبی سے پوری طرح واقف ہے لیکن ہمارا یہ سوئٹر زمانے سے فری سائز رہا ہے۔ بچوں نے، جوانوں نے موٹوں نے، دُبلوں نے، عورتوں نے، دلہنوں نے۔ پورے دن والیوں نے پہنا۔ مجال ہے کسی کے چھوٹا بڑا ہوا ہو۔ ہم نے پچاس میل سے لمبا سفر زندگی میں نہیں کیا لیکن ہمارا سوئٹر تقریباً آدھا ہندوستان گھوم چکا ہے۔ جاڑے میں سفر کرنے والے عزیزوں سے کہا نہ کہا منہ بھر یہ جا ملتی سوئٹر کو ساتھ لے جاتا۔ دورے ایک سال ہم اپنے سوئٹر سے محروم رہ چکے ہیں۔

[illegible]

آپ نے اپنے خطوں میں جو تعریف ہمارا کرتے ہیں۔ دوست سے کیا تعریف لیجئے صبر کرکے بیٹھ رہے
تھے ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے وہی دوست خوش ہوتے ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور سوئٹر ہمارے
ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے آپ کی امانت آپ کے حوالے کرتے ہوئے بے حد خوش ہوں دلی سے آج ہی آیا
ہوں۔ حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر بھی گیا تھا۔ دعا کر کے نماز کو جاتا تھا کہ سوئٹر لٹکا نظر آیا۔ پاس گیا
تو آپ کا سوئٹر تھا جس کو ایک سال قبل اسی جگہ لٹکا گیا تھا۔ مجھے اس کرشمے پر حیرت ذرا نہیں ہوئی۔ یہ اس
سوئٹر کا نعرہ ہے جہاں جا ہو چھوڑ آؤ۔ کوئی اس کو اٹھانے کا نہیں۔ ہمیں یقین تھا ایک دن گمشدہ "واپس ملے گا۔
آپ یہ نہ سمجھیں کہانی یہاں ختم ہو گئی حضرت یوسف کی کہانی نہیں کہ مل گئے اور کہانی ختم ہوئی۔ پھر ایک دو دفعہ
گیا مگر سوئٹر کے اون کی گرمی میں ذرا کمی نہیں آیا۔ زیادہ نہیں گزرے ہوں گے اس بات کو کہ ہمارے ایک
بزرگ کرم فرما ہم سے ملنے پہلے ہمارے گھر پر تشریف لائے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ سردی اس دن بہت
زیادہ تھی۔ پھر ہمارا کمرہ بھی ٹھنڈا تھا۔ کمزور تو تھے ہی نزلے نے حملہ کر دیا۔ اب جو چھینکیں آنا شروع ہوئیں
تو محترم ہوش بھول گئے اور گھبراہٹ میں اپنے بچوں کی اپنی بیوی کو پکارنے لگے۔ ہماری بیوی ان حضرت
کی سراسیمگی حالت دیکھ کر فکر مند گئیں۔ جھٹ اندر گئیں اور سوئٹر ان کرم فرما کے سر سے لپیٹ دیا۔ خدا کی [illegible]
میں بڑے میاں ٹھیک ہوا گویا سوئٹر سر سے پھرتی میں نہ اتارتیں تو شاید دماغ میں خشکی ہو جاتی اور ان سیلی کی
ضرورت پیش آ جاتی۔ یہ بات سن کر آپ کو تعجب ہو سکتا ہے مگر ہم اپنے سوئٹر کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بچے جانتے
ہیں۔ جب جب کسی کو بخار آیا ہے اس سوئٹر کے پہننے سے گیا ہے۔ بخار چڑھنے پر کوئی حکیم کوئی ڈاکٹر ہمارے
دہلیز نہیں چڑھا۔ ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ خود ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ ہم وہ بات کہیں یہ
بتا دیں کہ ہمارے گھر سے بہت فاصلے پر ایک لیڈی ڈاکٹر کا نرسنگ ہوم ہے جہاں دور دور سے عورتیں
کنواری گود بھرانے آتی ہیں اور کامیاب ہو کر جاتی ہیں۔ سینکڑوں اولاد والی ہو کر جاتی ہیں۔ ایک ہی
چھت کے نیچے دونوں کام ہوتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تو وہ بات یہ ہے کہ ہمارے ہی ایک
رشتہ دار ہماری معرفت اس لیڈی ڈاکٹر سے ملنا چاہتے تھے۔ کوئی آٹھ سال پہلے شادی کرکے دبئی چلے
گئے۔ وہ وہاں بیوی یہاں۔ عید کے چاند کی طرح ہر سال آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ ہمارے یہ رشتہ دار
دبئی میں کیا کرتے ہیں یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اگر ان کی دبئی جانے سے پہلے کی حالت اور اب واپس آنے کی
حالت کو نظر میں رکھ کر غور کریں تو ہم یہ کہے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ عرب کے کسی شیخ صاحب نے ان حضرت
کو گود لے رکھا ہے۔ خیر۔ تو سالانہ وصال یا ہلالی جشن۔ ہماری بیوی کے پاس آئیں اور رو رو کر کچھ
سے محرومی کی داستانیں سنانے بیٹھ گئیں۔ بڑی بڑی مزاروں پہ چادریں چڑھا کر دیکھ لیا۔ کہیں کسی
کسی کا بھوٹی فقیر کے پاس گئیں تو ان فقیر نے ڈانٹ کر کہا کہیں بچے مزاروں سے پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے
پاس آنے سے پہلے ہی [illegible] ان کے پاس [illegible] نہیں گئیں۔ اور اب میاں بیوی نے طے کیا ہے
کہ کسی [illegible] نرسنگ ہوم کی لیڈی ڈاکٹر کے مشورے [illegible] علاج کرائیں ہماری [illegible]
کی خاطر [illegible] کہ ہم کو ایک پیالی چائے [illegible] سے بھلا کے [illegible] — ہم اکثر [illegible]
[illegible] کے عادی ہو چکے ہیں۔ البتہ ہم نے [illegible] سوئٹر [illegible] کی
[illegible]

بٹیا کی کرن کئی دن سے مدہوش ہے۔ سردی کا موسم ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہے۔ باہر زیادہ سردی ہوگی سوئیٹر کو لپیٹے رہنا ہوگی۔ پھر ٹھنڈ نہیں رہے گا۔ چلو بیٹی جلدی کرو سنگھار ہوم ہو جاؤ۔ آپ کی چائے اسٹول پر رکھی ہے اٹھا کر پی لینا۔۔۔ ہم نے چائے کی پیالی مشکل سے ختم کی ہوگی کہ بچے گھر میں داخل ہوئے وہ بھی مٹھائیوں کے پیکٹ ہاتھوں میں لیے۔ ہم حیران کہ یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہوگیا۔ بیگم خوش ہوکر بولیں سنا تم نے ڈاکٹر نے بتایا کہ بٹیا امید سے ہے۔ یہ سب سوئیٹر کا کرشمہ ہے کہ درد بھی غائب اور امید کی کرن بھی پھوٹی۔ یہ عورتیں زیادہ تر بغیر سوچے سمجھے بولتی ہیں۔ چناں چہ اس جملے سے بٹیا اور اس کے شوہر یہ سمجھے کہ امید سے ہونا سوئیٹر کا کرشمہ ہے .... کیوں کہ سوئیٹر کا حلیہ کسی پرانے پہنے ہوئے پیر فقیر سے ذرا بھی کم نہ تھا پھر کیا تھا سوئیٹر کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔۔۔ اعتقاد رکھنے والوں نے بچکا سے فوراً خالہ کا رشتہ لگا لیا کیونکہ خالہ کا ٹھیک ماں سے دوسرا ہوتا ہے مگر ماں سے دوسی سی (؟؟) ہما کم سمجھا جاتا ہے۔ نئی خالہ کی نئی بھانجی سوئیٹر پہن کر بلکہ کمر میں لپیٹے ہونے کے باعث پسینے میں نہا گئی مگر سوئیٹر واپس کرنے کو تیار نہیں خالہ بھانجی تو یہ نو ماہ بعد ہی کرے اتارے گا۔۔۔ بیگم ہماری نہال ہوگئیں۔ تھوڑی سی دیر میں دو اعزاز مل گئے۔ پہلے خالہ پھر جان کتنا خود غرض ہوتا ہے انسان۔ خالہ بھانجی کا یہ لوٹا ایک دم پلٹے ہیں ہم بھلا نہیں لگا کیوں کہ اس سوئیٹر سے ہمارا واسطہ ایسا ہی ہے جیسا لنکاوی کا اس کے پسندیدہ پھل سے تھا۔ چناں چہ ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے سخت الفاظ میں سوئیٹر واپس کرنے کو کہہ دیا۔ جس کے نتیجے میں شیخ صاحب کے گود لیے بیٹے کو پیچھا چھوٹ جانے کا یقین ہوگیا وہ فرمانے لگے آپ سوئیٹر کے ایک لاکھ روپیے بطور قیمت لے لیں مگر یہ سوئیٹر ہمارے پاس رہنے دیں۔ کمزور عقیدہ لوگوں کے مزاج سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ لیکن ہماری بیوی سوئیٹر کی قیمت سن کر بے ہوش سی ہونے لگیں۔ ہم نے ان کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ فکر نہ کرو۔ یہ بہت قیمتی چیز ہے۔ اب تم کو یہ بات معلوم تو ہوگئی کہ غریب نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کو اپنی پانچ بھانجیوں کی شادی اور جہیز کی بڑی فکر ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ سوئیٹر تمہاری مدد کرے گا۔ دوسروں کے کام آیا ہے۔ ہمارے بھی کام آئے گا۔ میں نے اس ضرورت مند سے کہا۔ آپ یہ نہ سمجھنا کہ ہم بلیک میل کر رہے ہیں۔ ہم اس سوئیٹر کو فروخت تو کسی قیمت پر نہیں کریں گے۔ مگر چوں کہ ہمارے کی طرح آپ کو راس آگیا ہے۔ انشاء اللہ نو مہینے بعد آپ بیٹے کے باپ بن جائیں گے تو ہم اس قیمت پر صرف نو ماہ کے لیے دے سکتے ہیں۔ آپ اسی رقم سے صاحب اولاد ہو جائیں گے ہم لڑکیوں کو جہیز دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ بیوی بھی خوش کہ ان کی بھانجیاں ٹھکانے لگ جائیں گی ابھی سودا طے بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ہماری سالی صاحبہ بھی گھر میں داخل ہوئیں خدا اپنی بہن کو یہ خبر [illegible] پہلے بیٹی کو ان کے گھر چھوڑ گیا۔ یہ کہہ کر کہ ایک لاکھ کا جہیز جو شادی کا دیا تھا اس سے زیادہ جہیز تو فقیر اپنی بیٹی کو دیتے ہیں۔ مجھے دو ہی جانتا ہے اگر میرے سسر پانچ لاکھ بجٹ کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک ہے ورنہ تم میرے گھر واپس نہ آنا۔ میں کسی سے قرض لے کر دو بچوں کا مزہ خرید لوں گا۔ ہم سوچنے لگے ایک لاکھ روپیہ کا نام سن کر ہماری بیوی کے ہوش اڑ گئے تھے۔ یہ پانچ لاکھ سن کر تو شاید ٹھکانے لگ گئے کہ ایک لاکھ کی رقم کا کیا حشر ہے کہ ایک لڑکا [illegible]

کر نہیں جا سکتی۔ دیکھا آپ نے سستے زمانے کا سویٹر اس گرانی میں بھی سستا نکلا ـــــ اور ہم نے
سویٹروں کو مفت دے دیا۔ اور کچھ دیا اگر ہو سکے اور پورہ سکے تو نو ماہ بعد لوٹا دینا ـــــ ہم اپنے ملک میں
شخص کو لنگوٹی لگائے دیکھ چکے ہیں۔ جس نے کہا تھا جب تک ہر شخص کے تن پہ پورا کپڑا نہ دیکھ لوں میں بھی
بسنے نہ پہنوں گا۔ بات تو عجب ہے کہ ہر شخص ہو سویٹر والا۔ ایک سویٹر ہے اگر پاس ہمارے تو بجا کیا!

غزل

عبدالحفیظ لقب عمران (اچلپور)

درشن مری آنکھوں کو کرانے نہیں آتے
بجلی سے وہ بجلی پہ پلسانے نہیں آتے

وہ آنکھیں ملانے کی روش چھوڑ چکے ہیں
حد ہو گئی اب آنکھیں دکھانے نہیں آتے

کہتے ہیں کہ ساقی کا رویہ نہیں اچھا
اب نند یہاں پینے پلانے نہیں آتے

وہ ماتا و پتا کی طرح رہتے ہیں کیوں کر
وہ پیسے جنہیں یار و کمانے نہیں آتے

وہ جان ہتھیلی پہ لیے ملتا ہے تجھ سے
عاشق کو ترے حیلے بہانے نہیں آتے

برسوں سے مرا دل ہے حسینوں کے اثر میں
برسوں سے مرے ہوش ٹھکانے نہیں آتے

بدنام مجھے کر دیں گے یہ دل کے تقاضے
دنیا سے مجھے راز چھپانے نہیں آتے

دادا گل کا سردار سمجھتے ہیں مجھے سب
اب غنڈے ادھر رنگ جمانے نہیں آتے

تصویر ہے خزاں کی نہ بہاروں کے اشارے
موسم بھی ترا یاد دلانے نہیں آتے

دراصل تری ماتا کو ہوا رہے کرنا
ہم تیرے پتا جی کو پٹانے نہیں آتے

دولت کی ہے دنیا میں تقسیم غلط ہے
کچھ ہیں غریبوں کے پھٹانے نہیں آتے

دراصل ہمیں ہاتھ دکھانے کا جنوں ہے
ہم تجھ سے کبھی ہاتھ ملانے نہیں آتے

منظر کی کشش سے جواں ہو جاتے ہیں مجبور
وہ آبرو ابلا کی بچانے نہیں آتے

اس گاؤں میں رہتے ہیں حکومت کے مخالف
اس سمت مسرت کے خزانے نہیں آتے

یہ کام کراتے ہیں وہ چمچوں کے ذریعے
خود نیتا کبھی آگ لگانے نہیں آتے

لگتا ہے انہیں مشق ستم کا نہ رہا شوق
اب مجھ کو حسیں لوگ ستانے نہیں آتے

طاقت کا مری اس طرح پرچار ہوا ہے
رستم بھی لقب مجھ سے لڑجانے نہیں آتے

غزل

وحید شیخ (ودیشا)

سن سن کے لوگ ہو گئے بیمار دوستو
تفسیر زیست ہیں مرے اشعار دوستو

کل تک جو اپنے آپ کو کہلاتے تھے مدیر
سائیکل پہ بیچتے ہیں وہ اخبار دوستو

میں نے ارادہ عشق کا تبدیل کر دیا
عاشق پہ پڑتی دیکھی جو کل مار دوستو

اپنی حدیں پھلانگا کے کرتے تھے جو گناہ
پولس نے ان کو کر دیا حد پار دوستو

بیگم کے آ گئے ہیں تیور کڑے وحید
ترجمہ ہیں آج جنگ کے آثار دوستو

منظور وقار
(گلبرگہ)

تانگے

تانگوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے رامائن اور مہابھارت کی جنگوں میں تانگے استعمال کیے جاتے تھے (اس بات کی تصدیق بی آر چوپڑا کی تاریخ ساز ٹی وی سیریل مہابھارت سے ہو چکی ہے) اس زمانے میں تانگے رتھ کہلاتے تھے۔ ان تانگوں پر سوار ہو کر رام لکشمن راون بھیشم، دریودھن، ارجن اور بھگوان کرشن وغیرہ نے ایسی ایسی زوردار جنگیں لڑ چکے ہیں جو تاریخ میں ابھی تک تازہ ہیں (ان جنگوں کو تازہ رکھنے میں ٹی وی سیریلوں کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے) آج بھی تانگوں پر سوار ہو کر تانگہ راں تعداد لڑائیاں کیا کرتے ہیں لیکن یہ لڑائیاں اپنا نام تاریخ میں درج کرانے کے بجائے پولیس تھانوں کے ایف۔ آئی۔ آر رجسٹروں میں ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔

تاریخ ساز تانگوں پر سوار ہو کر اس دور کے طلسماتی بھگوان جب ایک دوسرے پر تیر و تلوار سے وار کرتے تھے تو اس منظر کو ــــ (ٹی وی پر) دیکھ کر بڑوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی تھیں تو بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگتے تھے۔ آج بھی تانگوں پر سوار طلسماتی تانگہ راں کچے راستوں پر تانگوں کو بے تحاشہ ــــ بھگاتے ہیں تو گھوڑے تانگہ سمیت بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر اٹھ کر تانگہ سمیت دوڑنے لگتے۔ اس دوران تانگہ مع مسافر طوفان میں........ گھرے ہوئے پانی کے جہاز کی طرح ڈگمگا کر اصلی حالت میں آجاتا ہے۔ راہ چلتے ہوئے مسافروں کی آنکھیں اس منظر کو دیکھ کر حیرت سے پھیل جاتی ہیں تو بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔

رامائن اور مہابھارت کی جنگوں کے بعد تاریخ ساز تانگوں یعنی رتھوں کا استعمال عام ہونے لگا۔ ایک راجہ دوسرے راجہ کی رانی یا شہزادی کو بھگا لے جانے کے لیے بھی رتھ استعمال کرتا تھا ــــ

[illegible]

آتی ہے جتنی قوم کی عمر کا اندازہ رکھنے والے [illegible] ۔ آج جو رونق تانگوں کے [illegible] انہیں بھی کہا جاتا ہے۔ ایک تانگہ ہمارے ملک کے عجائب گھر کے لیے رکھا گیا ہے۔ باقی بگھیاں بڑے بڑے شہروں کی سیر کرانے کے لیے یا ساحل سمندر پر گھمانے کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔

چند شہروں میں جہاں آثار قدیمہ کی عمارتیں خالی پڑے ہوئے قلعے، شکستہ گنبدیں، گرتے ہوئے مینار، بوسیدہ محل، قدیم مقبرے اور موسم کو سینے سے لگائے ہوئے لوگ رہتے ہیں۔ ان شہروں میں کہیں کہیں تانگے چلتے ہیں۔ لیکن ان تانگوں کی حالت زار کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے یہ بھی شہر کے مٹتے ہوئے آثار قدیمہ کا ایک حصہ ہیں۔

خصوصاً ہمارے شہر کے تانگوں کے انداز نرالے ہیں۔ بوسیدہ تختے، پیوند لگا ہوا چھت، پھٹے ہوئے گدے اور چرچراتے ہوئے چابک والے تانگے جب اونچی کھابڑ سڑکوں اور کچے راستوں پر دوڑنے لگتے ہیں تو تانگے کا ایک ایک عضو آواز کے ساتھ کانپنے لگتا ہے اور ان مسافروں کے دلوں پر بھی ایسی کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے جیسے ان کے بدن پر سانپ رینگ رہے ہوں۔ ہمارے شہر کے تانگوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ تانگہ جوں ہی دوڑنے لگتا ہے تانگے والے کا ہاتھ اور زبان ایک ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ تو گھوڑے کی چمڑی سے گھوڑے کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور زبان مسلسل باتیں کرنے میں۔ پہلے تو تانگے والے ان پڑھ ہوا کرتے تھے لیکن اب اگر ہم نکلتے وقت مسافروں کے سامنے ہمیشہ قومی اور بین الاقوامی حالات و واقعات اور سیاست پر اپنے تبصرے کرتے ہیں کہ مسافروں کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ تانگے والا مسافروں کو بتائے گا کہ ہمارے ملک کی اندرونی حالات کیا ہیں۔ نرسمہا راؤ کی حکومت کتنے دن چلنے والی ہے۔ پاکستان کتنے بم بنا چکا ہے۔ صدام حسین نے نیوکلیر بم اور اسکڈ میزائیل کہاں کہاں چھپا رکھا ہے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کی ہندوستانی کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ مسلم ممالک امریکہ کے ایجنٹ کیوں بنے ہوئے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ کس طرح حل ہو سکتا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت اس قدر زبان اسٹاپ ہو سکتی ہے کہ مسافر تنگ آ کر پیچھے ہوئے [illegible] کی روئی نکال کر کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ اکثر تانگوں میں صرف پانچ عدد مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن تانگے والا اپنے تانگے کو اس وقت تک نہیں ہانکتا جب تک کہ وہ دس بارہ مسافروں کو نہیں ٹھونس دیتا۔ جب پانچ مسافروں کی جگہ دس بارہ مسافر ٹھونسے جائیں گے تو ظاہر ہے مسافروں کو ایک دوسرے کی گود میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ [illegible] مسافروں میں سے دو تین نوجوان تانگے کے دائیں بائیں لٹکے ہوئے بھی نظر آئیں گے۔ خود تانگے والے کے لیے بھی جگہ نہیں ہوتی لہٰذا تانگے والا گھوڑے اور تانگے کو جوڑنے والی لکڑی پر بیٹھ کر تانگہ اس شان سے ہانکتا ہوا نظر آتا ہے گویا تانگے کی باگ نہیں پورے ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ آ گئی ہے۔

پہلے تانگوں میں ربڑ کے ہارن لگائے جاتے تھے۔ اس سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی [illegible] کرتا ہے [illegible] ہاتھ پہنچ جاتے تھے۔

اب ریس کے بازی لگانے کا دور نہیں رہا۔ چناں چہ اب کا کام تانگہ راں کا مند انجام دے رہا ہے۔
اکثر راہ گیروں کو ہٹانے (راہ راست پر لانے) کے لیے تانگہ راں اس طرح کے جملے بآواز بلند ادا کرتے ہیں۔

"ارے وہ بڑھو! ہٹ" "ابے وہ چمپو دیکھ کو چل"۔

"اجی خالہ ہٹ کو چلو! مرنے کے واسطے میرا ہی تانگہ ملا کیا؟"

بعض تانگہ راں شاعری کے رسیا بھی ہوتے ہیں اور اردو زبان کے خدمت گار، لہٰذا وہ شاعری کے عاشق اپنے تانگے کے دائیں بائیں اور پشت پر جہاں مناسب جگہ ملی وہاں ایک عدد شعر کے حساب سے کوئی آدھا درجن اشعار (جن میں اکثر بے وزن ہوتے ہیں) لکھوا دیتے ہیں۔

ہم اکثر تانگوں پر ہمارے بزرگ دوست علامہ پاگل پاکھنڈی کے حسب ذیل اشعار آویزاں دیکھے ہیں:

میرا تانگہ بڑا مہان ہے
پاگل پاکھنڈی کی یہ جان ہے

سوار ہوتے ہی تانگے میں نشہ چھا جاتا ہے
دیکھ کر لال گھوڑی کو بوڑھا بھی مسکراتا ہے

میری گھوڑی کی ایسی بھیانک چال ہے
جیسے جدید شاعر کی کوئی غزل ہے

بعض تانگہ راں اپنے تانگے کا نام بھی رکھتے ہیں۔ ہم نے حسب ذیل نام کے تانگے نہ صرف دیکھے ہیں بلکہ ان پر بیٹھ کر سفر کا لطف بھی اٹھایا ہے

"طوطے خاں کا تانگہ" "سڑک کا سردار" "ماں کی دعا" "غریبوں کا ہوائی جہاز" "شیروں کی سواری" "صدام کا اسکڈ میزائیل"۔

غرض تانگے ہمارے شہر کی آن بان شان، مسافروں کے لیے آفت جان، سڑک پر جانوروں کی طرح چلتے پھرتے راہ گیروں کے لیے ــــ لگام ہیں .....!!!

سلور جوبلی مزاحیہ نثر و نظم کے
مقابلوں کے نتائج
کا
آئندہ مہینے اعلان ہوگا (ادارہ)

(۱)

مشتری نے دل دکھایا عزت افزائی کے ساتھ
کچھ اضافہ کر دیا بس میں مہنگائی کے ساتھ
اس سے تنہا بات کرنے کی تمنا رہ گئی
وہ نظر آئی کبھی تایا کبھی تائی کے ساتھ
پھول کے چہرے سے اڑا خون کے رشتے کا رنگ
ہاتھ ملتے ہی لڑائی ہو گئی بھائی کے ساتھ
لوگ پھر بھی ہم کو کہتے ہیں کریلا نیم کا
دوستانہ گانٹھ کر رہتے ہیں حلوائی کے ساتھ
اس کی صورت نظر آتی نہیں اب شہر میں
مل گئے ہیں آج کل نیتا بھی بلوائی کے ساتھ
مشتری چھپتے ہی اخباروں میں اسکینڈل چھپے
ہم کو شہرت بھی ملی منہ پھٹ تو رسوائی کے ساتھ

(۲)

غوث، چشتی، تاج رمضاں کے بہانے مل گئے
قوم کے بھوکوں کو کچھ اچھے کھانے مل گئے
آنکھ والا اب تماشہ دیکھنے کی چیز ہے
اندھوں کو پھر ملنے سے نگر کے سارے کانے مل گئے
شیخ نے چھینے بٹورے لیڈروں کی بن گئی
ہندو مسلم کیا لڑے موسم سہانے مل گئے
ہاں تو مکھی بھی نہیں ملتی ہمارے رات دن
یا خدا ان صاحبوں کو کیسے تھانے مل گئے
شاعری کہتے ہی کس کو کس بلا کا نام ہے
ہم کو تو استاد سے خود چار گانے مل گئے
جب کہاں آئے منہ پھٹ زندگی وہ بیقراری کی
دل کی دھڑکن کے تانوں کو ترانے مل گئے

صاف صاف

(۳)

آ گیا امتحاں کا میرے ہاتھ میں
مات دشمن کو کراری ہو گئی
تیرہ بچے کل محلے میں ہوئے
رات بھر کیسے کنواری ہو گئی
روکھا سوکھا غیر کا اچھا لگا
گھر کی بریانی تمہاری ہو گئی
بیبیاں پتھر چبائیں بولیے
جب گراں چکنی سپاری ہو گئی
تجھ سے رخصت ہو کے رویا اس قدر
میرے گھر سے نہر جاری ہو گئی
عورتیں رہتی ہیں مردوں کی طرح
آدمی کی ذات، ناری ہو گئی
ٹیٹرا ڈریپ کھا کے منہ پھٹ سو رہو
ہو چکی اختر شماری ہو گئی

منہ پھٹ ناگپوری

شفیق الرحمٰن خاں صاحب

(لاہور)

فراہم کردہ: جناب عبدالصمد خاں (اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد)

ری ہرسل

ان دنوں ہم کالج میں ڈرامہ کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے مجھے سب سے لمبا ہونے کی وجہ سے ہیرو کا پارٹ دیا گیا۔ میں کہنے کو تو ہیرو تھا مگر سب سے زیادہ گت بھی میری ہی بنتی تھی۔ چار پانچ موٹے تازے رقیبوں سے لڑ جھگڑ کر۔ مار پیٹ کر آخر میں یہ انعام ملتا تھا کہ ہیروئن صاحبہ (جو کہ ایک داڑھی مونچھ منڈے پونے چھ فٹے حضرت تھے) سے عقد [illegible] کروں۔ تب وہ گھبرا کر چیختے کہ "ابا! معاف کرو۔ مجھے ایسے پارٹ کی ضرورت نہیں۔ تجویز [illegible] ورنہ ہی بھلا۔ میں پھر ہیرو ہی نہیں بنتا۔ مگر سب کے سب ناک بھوں چڑھانے لگے۔ اور تو اور خود ہیروئن صاحبہ ہی کی ایک زبردست ڈانٹ پڑی۔ آخر کار بڑی سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا گیا کہ چاہے کچھ بھی ہو پارٹ ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ ڈراما بھی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔

ڈرامے کے رقیبوں میں ایک صاحب [illegible] میرے دوست تھے۔ برسوں سے ہم [illegible] چلے آ رہے تھے۔ رشید نام تھا۔ رنگ کے ذرا سیاہ تھے۔ بعض اوقات ری ہرسل کے دوران میں ہم لڑتے لڑتے رک جاتے کیوں کہ وہاں ایک دوسرے کو گالیاں دینی پڑتی تھیں اور خوب مکے بازی ہوتی تھی۔ ہم بھلا بیہودگی کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ آخر کو تو دوست تھے نا۔ ادھر ڈائرکٹر صاحب چیخ اٹھتے اور چلا کر کہتے "میاں! یہ ڈراما ہے ڈراما! جب تک پوری طرح زور نہ لگاؤ گے کچھ نہ بنے گا۔ بس سمجھو کہ شیطان تم میں حلول کر گیا ہے۔"

اب بھلا ہم بیٹھے بٹھائے شیطان کی رفاقت کیسے پسند کرتے۔ کوشش کرتے کہ شیطان حلول کر جائے مگر کبھی ادھر شیطان [illegible] ہو جاتا کبھی میں اور حلول ہوتا تو درکنار شیطان صاحب [illegible] نہ ہوئے۔

کچھ ڈرامے کا خلاصہ بھی سن لیجیے۔ قصہ یہ تھا کہ [illegible] صاحب [illegible] کے [illegible] شادی کے طلب گار تھے۔ ایک دوسرے حضرت [illegible] اپنے دل سے چاہتے تھے۔ [illegible] اقرار کر کے مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اب سمجھ لیجیے کہ کیا کیا [illegible] ہوتی ہوں گی۔ سب سے بڑا

جلد گھر میں ہم دونوں رہ جاتے تھے۔ اتنے میں ہیروئن کے والد صاحب (جو کہ میرے پڑوس کے کمرے میں رہتے تھے) بیچ میں آ کر یہ فیصلہ کر دیتے تھے کہ وہ جہیز میں ایک پائی بھی نہ دیں گے۔ اگر کسی کی ہمت ہے تو وہ بے رنگ شادی کر لے۔ ارشد صاحب فوراً استعفیٰ پیش کر کے اڑنچھو ہو جاتے تھے۔ یہیں غیرت سی آتی تھی۔ چناں چہ ہیروئن سے ہماری شادی ہو جاتی تھی۔ اب ان کی باری آتی اور وہ اپنے والد سے لڑتیں۔ کہ ان کی جائیداد میں سے ہمیں بھی حصہ ملے۔ کیوں کہ وہ اپنے والد کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ اتنے میں عین وقت پر خدا تعالیٰ رحم فرماتا اور ہیروئن صاحبہ کے ایک ننھا منا بھائی پیدا ہوتا جو کہ جائیداد کا مالک گردانا جاتا۔ اور قصہ ختم ہو جاتا۔

ایک روز شام کو ہم کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ ذرا جلدی تھی کیوں کہ ریہرسل پہ جانا تھا۔

"کباب لاؤ سیاہ آدمی!" ارشد نے نوکر کو ڈانٹا۔

"اُفوہ! کالے! تو کون سا انگریز ہے؟" امجد بولا۔

"سچ! اپنا عیب کسی کو نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"اچھا میاں لمدرا زخاں! تم عیبوں سے پاک ہو نا؟" ارشد جل کر بولا۔

"بھیا کچھ بھی ہیں۔ کالے تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہ معلوم آج کل لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ خواہ مخواہ سیاہ لڑکوں سے اپنی چاند سی لڑکیاں بیاہ دیتے ہیں۔" امجد بولا۔ اور اتنے میں نوکر آ گیا۔ یہ ارشد پر چوٹ تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ ارشد صاحب ایک نہایت حسین لڑکی سے شادی کے امیدوار تھے۔ لڑکی کے والد انھیں ناپسند کرتے تھے۔ یہ ہر دفعہ رپورٹ کراتے۔ مگر وہاں ایک ہی جواب ملتا۔ آخر بالکل ناامید ہو کر ارشد نے ایک مدد بڑھی بی کی خدمات حاصل کیں جن کا فرض تھا کہ سارا سارا دن اس لڑکی کے ہاں ہز ماسٹرس وائس کے کتے کی طرح پاندان کے سامنے بیٹھی رہیں۔ اور ہر وقت ارشد کی تعریف میں رطب اللسان رہیں۔ بس یہی ایک آخری حربہ تھا۔ شاید لڑکی کی والدہ رضامند ہو جائے۔ ارشد بڑی بی کو تاکید کر کے آیا تھا کہ جس روز بھی کام مسلمان ہوتا نظر آئے فوراً تار دے دے اور باقی کام ارشد خود کرے گا۔ چناں چہ ہر روز وہ اسی تار کے انتظار میں رہتا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بجے تھے۔ میں نے ایک بڑی سی گلاب جامن کا نوالہ بنایا اور ارشد کا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب بس بھی کرو بیٹے کر دو کو ڈائل لیڈر انگریز مجھ کے چھوڑ دے۔"

"خدا کی شان، میاں اونٹ صاحب! یہ آپ کو کب سے غلط فہمی ہوئی؟"

وہ بپھر پڑا۔ "کون ایسا مسخرا تمھیں اپنی لڑکی دے گا؟" کہیں اونٹ کے افسانوں سے بچے بہلتے ہیں۔ تکمیل کر دیں۔ اچھے ہیں تو اس کے معنی یہ تو نہیں کہ رستم دوراں ہیں۔ میاں آج کل شکل و صورت کون دیکھتا ہے اور نہ ہی رنگ کو ——— خوبیاں دیکھتے ہیں خوبیاں، سمجھے! اور میرے خیال میں تو تم میں ایک بھی خوبی نہیں ہے۔

"بھیا! کسی نے سچ کہا ہے کہ خدا غلام بنائے مگر [illegible] کی صورت نہ بنائے" شاہد بولا۔

"اور تو کہاں کا رابرٹ ٹیلر ہے۔ کبڑا قد۔ ناک پر عینک جیسا۔ نہ میاں کھیل کود میں اچھے نہ پڑھائی میں۔ خدا جانے تجھے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تو ہے کس مرض کی دوا؟" ——— اب ارشد کو واقعی بہت غصہ آیا ہوا تھا۔

"اچھا اب ختم کر اس بیہودہ تقریر کو۔ چل بھیا کار چل رہی ہے ریہرسل میں چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا شتر مرغ صاحب! ایمان سے میں تم لوگوں کا لحاظ کر جاتا ہوں" "ورنہ، ورنہ ———"

"ورنہ کیا؟ ——— ابے یار چل یہ آج ورنہ بھی پوری کر لیجو ———" میں نے کہا۔

آدھ گھنٹہ بعد ہی ریہرسل ہو رہی تھی۔ میری اور ہیروئن کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ ابھی اسٹیج سے نکلی ہی تھی کہ ارشد صاحب گر گرتے آئے اور چیخ کر بولے۔

"بے وقوف انسان! آسمان اڑا چاہتا تھا۔ تارے پکڑنا چاہتا ہے؟۔ اس کے درمیان میں ہمیں ادھار پر ہم دونوں کی لڑائی ہونی تھی؟) ———

اس کم بخت نے دفعتاً ایسا زبردست مکہ مارا کہ مجھے فرش بریں تک کے تمام تمام تارے نظر آ گئے۔ اب میری باری تھی۔ میں نے سوائے مکہ بازی کے اور سیکھا ہی کیا تھا۔ بائیں ہاتھ کا جو دیا ہے تو کچھ دیر کے لیے تو ارشد صاحب کا پتہ ہی نہ چلا کہ ہے گئے کدھر؟ کچھ دیر بعد لڑکھڑاتا ہوا ایک کونے سے برآمد ہوا۔ ڈائرکٹر صاحب چلا اٹھے۔ "شاباش میرے شیرو! آج تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ بس اسی طرح کیا کرنا" اس روز ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔

دوسرے روز علی الصبح میں تالاب سے نہا کر واپس آ رہا تھا۔ کہ ڈاکیہ ملا۔ ہاتھ میں ارشد کے نام ایک تار تھا وہ دستخط کرا کے چلا گیا۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ تار وہیں سے آیا تھا۔ لکھا تھا "کام بنتا نظر آتا ہے فوراً پہنچو ———" کم بخت کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا۔

"میں کمرے میں پہنچا اور رنجیدہ شکل بنا کر بولا" افسوس ہے بھئی"

"تمہارا تار آیا ہے ——— انا للہ وانا الیہ راجعون"

"کیا ہوا؟ ——— بولو تو سہی، خدا کے لیے"

"لکھا ہے تمہاری بڑی بہن کا انتقال ہو گیا ہے"

"اسے بس بھی؟" وہ ہنس کر بولا۔

"ہاں! مگر تعجب ہے کہ تم افسوس نہیں کرتے" میں نے متانت سے پوچھا۔

"ارے لاحول ولا"

"میرے خیال میں یہ مجھ سے بھائی کی کارستانی ہے۔

"تو پھر تمہیں بہنوں سے محبت ہوگی جو اس کے انتقال پر تماشا کیا ہے۔"

"اماں تو دیکھیے۔ بہن سے ہمدردی بھائی ہے۔ مجھے زہر دکھائی دیتی ہے ـــــــ وہ گنگنا کرتے ہوئے بولا ـــــ

"اچھا سنیے۔ اگر ایک زبردست خوش خبری سناؤں تو کیا دیجیے گا؟"

"ایک گلاس ٹھنڈے کا پانی!"

لعنت ہے تجھ پر۔ ایسی ایک خوش خبری ہے۔ بس ایسی کہ تو ترتیب ہی تو اٹھے گا سن کر۔"

"اچھا تو کہہ۔" میں نے تار اسے دے دیا۔ اف۔ تار کا پڑھنا تھا کہ اس پر دیوانے پن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھٹ ناچنے لگا۔ پھر مجھ سے لپٹ گیا اور دفعتاً چیخ مار کر بولا "میں جا رہا ہوں۔"

دیکھ بے کلوا اگر ڈرامے میں حصہ نہ لیا تو اٹھوا کر دوں گا میاں کو! بچارمیں ڈال بیاہ شادی کو۔ ابے ہنس رہا ہے تو۔ یہ تو رونے کا موقع ہے۔ مفت کے جنجال میں پھنس رہا ہے۔ یہ شکل صورت کا جاؤ۔ دو دن میں اتر جائے گا پھر سر پر ہاتھ دھرے پچھتایا کیجو۔"

واہ بیٹا آیا ڈرامے والا۔ ڈرامہ تو چیز ہی کیا ہے۔ اگر اس وقت مجھے کوئی کالج چھوڑنے کو بھی کہے تو وہ بھی چھوڑ دوں گا۔ سالے قسمت جاگ اٹھی یلاونٹ۔ تیس میری حاضری لگوا دیا کیجو۔

ہونہہ۔ اتاؤ۔ لال پادشاہ کے سگریٹ پیا کرو۔

اگر ڈرامے میں شامل نہ ہوئے تو میں حاضری واضری کچھ نہ لوں گا۔ غیر حاضری کی رپورٹ ہوگی اور سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میاں بلیک ہول کو جوتے پڑیں گے۔"

"بھیا بھانڈا آج نہیں پھوٹا تو کل پھوٹے گا۔ اور پھر جوتوں کی بھی پروا نہیں۔ مگر دیکھ مجھے خدا کی قسم ہے جو میں پہلے بیس روز تک واپس نہ آجاؤں۔ ڈرامے سے دو دن پہلے پہنچ جاؤں گا۔ بس؟"

"مگر وہاں ریہرسل ضرور کرتے رہنا۔ اپنا پارٹ ساتھ لے جا۔"

بہت اچھا ـــــــ ایک گھنٹے کے بعد ارشد صاحب ٹرین میں تھے۔ اور ہم تین چار لڑکے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ تو ارشد صاحب پر لعنت بھیجی۔ پھر اس کی خوش قسمتی پر رشک کیا اور اپنی بے کسی اور بے بسی پر افسوس کیا۔ اور آخر میں اس جملے پر جلسہ ختم ہوا کہ "میاں ہمارا بھی اللہ مالک ہے"ـــــــ مجھے رات بھر خوب صورت دلہنیں دکھائی دیں۔

تیسرے روز چار بجے میں کالج سے واپس آیا۔ ارشد کے بستر پر کوئی لیٹا تھا۔ میں نے رضائی کھینچی تو دیکھا وہ کیا، ارشد بیٹھا ہوا ـــــــ اور رو رہا تھا۔

"ابے تو ـــــــ!" میں نے تعجب سے کہا۔ "تو یہاں کہاں؟ مبارک ہو۔"

"ابے شتر ہو گیا ـــــــ" وہ روتے ہوئے بولا۔

"کیا؟ خیریت کیا ہوئی۔ چلو ریہرسل میں چلیں؟"

چولہے میں جائے ریہرسل اور بھاڑ میں جاؤ تم۔ بس مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرے ساتھ کوئی ہوگا؟
کوئی بات بھی ہوگی آخر؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"یہ دیکھو ———— اس نے اپنے پارٹ کا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ "اس نے میرا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔"

"وہ کیوں کر؟"

"پھر بتاؤں گا" ———— اس نے رضائی اوڑھ لی۔

بات کو اس نے قصہ سنایا۔ بات دراصل یہ تھی کہ یہ حضرت ان محترمہ کے ہاں بلائے گئے تھے۔ آپ شوق میں آکر وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ نوکر نے انھیں باغ میں لا کر چھوڑ دیا کہ آدھ گھنٹہ تک ہوا کھاؤ۔ انھیں خیال آیا کہ فالتو وقت ہے کیوں نہ ریہرسل کی جائے؟ چنانچہ انھوں نے اپنا بدمعاش والا پارٹ شروع کر دیا۔ اور بدقسمتی سے وہ حصہ شروع کیا جہاں ہیروئن کے والد کو گالیاں دینا تھیں۔ اور برا بھلا کہہ کر استعفا پیش کرنا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جہاں ارشد صاحب جوش میں آکر ہیروئن کے والد کو گالیاں دے رہے تھے۔ عین اسی وقت لڑکی کے والد پاس سے گزر رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر سننے لگے اور سمجھے کہ سب کچھ انہیں کہا جا رہا ہے۔ جو کچھ ارشد صاحب کا پارٹ تھا۔ اس میں سے چند فقرے مجھے یاد ہیں۔

ارشد: "او خبیث بوڑھے! شاید تجھے یہ خیال ہوگا کہ میں تیری لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ ہرگز نہیں (زور آہستگی سے) نہ میں کرتا تھا اور نہ میں کرتا ہوں اور انشاءاللہ نہ ہی کبھی اس قسم کی حماقت کروں گا۔ مجھے فقط روپے چاہئیں روپے۔ یہ رشتے دار۔ عزیز و اقارب، محبت! سب کچھ فضول ہے۔ دولت ہے تو سب کچھ ہے۔ آج کل پیسہ چاہیے پیسہ۔ اگر تو نے اپنی لڑکی کی شادی کسی کے کہنے سننے سے مجھ سے کر دی تو میں یاد رکھ لے کر اسے ترسا ترسا کر ماروں گا۔ مگر ہاں جب تک تیری دولت قائم رہے گی تب تک اس کی بناوٹی خاطر مدارات کروں گا ———— وغیرہ وغیرہ۔"

اب آپ خود سمجھ لیجیے کہ لڑکی کے والد کس قدر مشتعل ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ عین اسی وقت ارشد صاحب کو بلا کر دفع ہو جانے کو کہہ دیا گیا۔ انھوں نے بڑی آئیں بائیں کی۔ صفائی پیش کی مگر وہاں ایک نہ چلی اور حضرت فوراً کان پکڑ کر نکال دیے گئے۔

یہ قصہ سن کر افسوس تو ہوا لیکن ہوا اگر ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی۔ کہ ارشد صاحب حاضر ہی رہا۔ مصرعہ اگر شاد ہو جاتی۔ تو جو غائب ہو جاتا اور پھر گردان شروع کرتا تو نہ معلوم کتنے مصدر فعل اور اسم ایجاد ہو جاتے اور اس غریب کا حلیہ بگاڑ دیتے۔

چند روز کے بعد کا ذکر ہے۔ میں اور ماجد کالج جانے لگے۔ ارشد صاحب بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔

"کیوں اب شادی تم کب کرو گے؟" "آہ" ارشد نے ایک عاشق کی طرح کہا۔

"ماجد کہنے لگا بھئی اس لڑکی سے تو بالجبر شادی کرنی ہی تھی۔ بھلا اس خوب صورت لڑکی کو کیا ہو گیا تھا

کر مجھ جیسے سیاہ آدمی کو پسند کرتی۔ اچھا ہوا شادی نہیں ہوئی۔ ورنہ ساری گھروالی کورٹ بنا رہتا۔ وہ تیری صورت سے بیزار رہتی اور تو ایک فرزند کا مدعا عمل میں لاتا۔ زندگی تلخ ہو جاتی۔ وہ کسی نہ کسی دن تیری شکل سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ــــ بس اب چپ چاپ کالج چل کسی تیری جیسی کالی کلوٹی لڑکی سے تیری شادی کرادیں گے۔ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

(خیام (لاہور) ۲۴، دسمبر ۱۹۳۸ء)

مرزا کھوپچ (بیتیا)

مزہ کچھ اور ہے

راستے پر دل لگانے کا مزہ کچھ اور ہے
لیکن اے دل گھر بسانے کا مزہ کچھ اور ہے

ایکتا کی بات اچھی چیز ہوتی ہے، مگر
ہندو مسلم کو لڑانے کا مزہ کچھ اور ہے

کردیا واپس، بھلا یہ عقل مندی ہے کوئی
قرض لے کر بھول جانے کا مزہ کچھ اور ہے

کام تو چلتا رہا تنخواہ سے لیکن حضور
اوپری آمد کو کھانے کا مزہ کچھ اور ہے

دوستوں کے سر پہ آفت کا پٹارہ دیکھ کر
سر جھکا کر مسکرانے کا مزہ کچھ اور ہے

اس کے گھر سے یہ چلانے میں کوئی لذت نہیں
ان کے گھر سے وہ چرانے کا مزہ کچھ اور ہے

صرف تقریروں کے بل بوتے وطن کی راہ میں
ذہن لٹانے سر کٹانے کا مزہ کچھ اور ہے

جب بھی مرزا کھوپچ دشمن سامنے آجائے تو
دم دبا کر بھاگ جانے کا مزہ کچھ اور ہے

غزل

سراج نرملی

گھر میں چھترخان کے فربہ بدن آجائے گا
چار کے جی کے مقابل ایک ٹن آجائے گا

عیش و عشرت میں کے ڈی کی لائف دھن آجائے گا
کھیتی میں کر کے سن بمپر جبین آجائے گا

تیری کوٹھی میسری ہو گی، میرا ہٹ ہوگا ترا
جب ہماری گفتگو میں اپنا پن آجائے گا

ڈر کے چھپ جانے کا بہرہ، جان بچانے کے لیے
ہیروئن کو چھیڑنے کو جب ولن آجائے گا

لیڈروں کے جب کبھی نجم الحسن، بدرالحسن
اندر کرنے مستقل شمس الحسن آجائے گا

خود بخود رک جائے گی سیکل ہماری اے سراج
جب ہماری راہ میں [illegible] آجائے گا

مالک شتالا (بمبئی)

متفرقات

۱۔ درگا بھوانی :-

ایک روز کچھ یارِ غار قسم کے غارت گر دوست ہمیں ہمارے آفس ہی سے پکڑ دھکڑ کر بمبئی کے آخری سرے نیوی نگر میں یونائیٹڈ سروسیز کلب میں لے گئے۔ نیوی نگر کے ہسپتال میں ہمارے ایک دوست ڈاکٹر تھے۔ جب کبھی یاروں کی نیت میں فتور آتا اسی ڈاکٹر کا گھیراؤ کر دیتے۔ سستا زمانہ تو تھا ہی لیکن فوجی سروسیز میں شراب پر ایکسائز ڈیوٹی نہ ہونے کے باعث کوکا کولا کے بھاؤ ملتی تھی۔ چنانچہ ہمارے ڈاکٹر دوست کی جبین پر بھی شکن نہیں پڑتی تھی۔

کلب کے وسیع لان میں ایک میز کے گرد ہم چار پانچ یار بیٹھ گئے۔ وہسکی اور رم کے دور چلنے لگے اور ادھر ادھر کی گپ بازی چلنے لگی۔ لیکن ہم دبدے میں پڑے تھے۔ ہماری پھولان دیوی نے اب تک غصے میں گھر کے کئی برتن توڑ ڈالے ہوں گے اور بچوں کی مار مرمت الگ سے ہو رہی ہو گی۔

چنانچہ ہم نے کلب کے آفس میں جا کر گھر کا ٹیلی فون نمبر گھمایا۔ وہاں کوئی دوسری ہی لائن لگی ہوئی تھی۔ راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں اور وہ باتیں زیر بحث تھیں کہ اگر سن لے سنسر بورڈ کے ممبران کے کانوں سے بھی دھواں نکلنے لگ جاتا۔

خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ اس روز کلب کی صرف ایک ہی ٹیلی فون کے دل کی دھڑکنیں موجود تھیں اور وہاں عشق و محبت کی الف لیلیٰ ہو رہی تھی ــــ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہم آفس جاتے اور ٹیلی فون کرنے کی کوشش کرتے۔ الف لیلیٰ کا قصہ ختم ہوا۔ ہم اللہ میاں کے شکر گزار ہوئے۔ لیکن ٹیلی فون ہر مرتبہ غلط نمبر پر جا کر لگتا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور مفت کے دارو کے باعث ہم یاروں کا سرور گھٹنے لگا۔ ہمیں بار بار ٹیلی فون کرنے کے لئے آتے جاتے دیکھ کر ایک دوست نے ہماری ٹانگ کھینچی۔

لعنت ہے تم پر ــــ بڑی بڑی ہانکا کرتے تھے۔ اپنی مردانگی کے قصے سنا سنا کر بور کرتے رہتے تھے۔ بیوی کے [illegible] کہ تمہارے قصے سن سن کر ہمارے کان بھی پک گئے [illegible] ایک منٹ دیر ہو بھی جاتی ہے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

دوست [illegible] ہے [illegible] تھا ــــ جیسے جا کر [illegible] ایک [illegible]

تھا مشیرا کہتا ہیں کہ گھر کے اندر یہ جتنا بڑا شیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے گھر میں مریل چوہے کی طرح دبک کر رہتا ہوگا۔
چھترا:- ایسے نہیں۔ اس کے چوہا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کبھی چوہے سے ڈرتی ہی ہے
پہلا:- اور پھر یہ تو گنیش بھگوان کی سواری ہے۔ یہ یقیناً شیر ہی ہے ـــــ گھر کے اندر بھی اور باہر بھی ـــــ
کیونکہ درگا بھوانی ہمیشہ شیر کی سواری کرتی ہے۔

دوسرا:- ہاں یہ درست ہے۔ اس لئے جانے دو بے چارے کو۔ اس کی درگا بھوانی اپنی سواری کا انتظار کر رہی ہوگی ـــــ

ہم نے سوچا کہ دوستوں کی اجازت ہو تو کھسک لیں۔ جتنی زیادہ تاخیر ہوگی اتنی ہی زیادہ بدبختی آئے گی ـــــ
لیکن ہائے یہ نہ تھی ہماری قسمت ـــــ کسی نے ہمیں ہلنے نہ دیا۔ اور ہماری کھلی اڑائی گئی ـــــ
ہمارے ایک دوست کے پاس موٹر کار تھی۔ وہ بمبئی کے دوسرے سرے پر رہنے والا کمپلیکس میں رہتا تھا۔ دوسرا جوہو میں اور میں پالی ہل پر ـــــ اس نے واپسی پر مجھے گھر کے دروازے کے باہر تک چھوڑنے کا وعدہ کیا اور ہم بے فکر ہو کر پینے لگے۔

واپسی پر رات کے دو بجے کے قریب وہ دونوں ہمیں ہمارے گھر کے دروازے پر ایستادہ کر کے روانہ ہونے لگے تو ہماری گھگھی بندھ گئی ہم نے بہت منت سماجت کی کہ ہمیں گھر کے اندر تک چھوڑ آئیں لیکن وہ نہیں مانے کہنے لگے درگا بھوانی کے گلے میں کھوپڑیوں کی جو مالا ہے اس میں دو کھوپڑیوں کا اور اضافہ ہو جائے گا ـــــ!

۲۔ ضرورت ہے ایک شو (SHAV - शव) منتری کی :-

مرکزی اور ریاستی منتری منڈلوں میں ایک وزیر باقاعدہ ہوا کرتا ہے جسے شرم (SHRAM ـــــ श्रम) منتری کے نام نامی اور اسم گرامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو ہم اسے اردو والی شرم کا منتری سمجھتے رہے تھے اور اس سے مراد یہ لیتے رہے کہ جتنے منتری عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے جس قدر بے شرمی کا مظاہرہ فرماتے ہیں اس کے کفارے کے طور پر منتری ..... شرم سے پانی پانی ہونے کا کام کرتے ہوں گے۔ لیکن جب ملک میں بیروزگاری کی شدت معلوم ہوئی تو ہم سمجھے کہ دال میں کچھ کالا ہے اور اس نام میں بہت سا گھٹالا ہے۔

چنانچہ اچھی خاصی تحقیق کے بعد پتا چلا کہ شرم منتری سے مراد وزیر محنت ہے۔ جو محنت مزدوری کرنے والے لوگوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے۔ حالانکہ دیش میں کوئی محنت نہیں کرتا۔ سرکار کام سے زیادہ تنخواہیں لیتے ہیں اور ایسے ایسے مطالبے رکھتے ہیں کہ اگر وہ من و عن منظور کر لئے جائیں تو ملک کی معاشیات کا بھٹا بیٹھ جائے۔ اس کے باوجود ملک میں ایک شرم منتری کے وجود کی ضرورت سمجھی گئی ہے ـــــ

لیکن ملک میں دنگے فساد، بم بلاسٹ، ریل حادثوں کے حادثات اور آتنک وادیوں کی مار کاٹ کا جو سلسلہ ہے اس کے باوجود ہمارے ملک کی مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں ایک بھی شو (لاش) منتری موجود نہیں ہے کہ جو موقعۂ واردات پر پہنچ کر لاشوں کی صحیح گنتی کا حساب رکھ سکے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو فوراً اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

[redacted]

۳- سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں :-

حال ہی میں اخباروں میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ برطانیہ کی ایک کمپنی نے بمبئی کی میونسپل کارپوریشن کو ایک خط لکھا ہے کہ اس نے بائیکلہ کے مقام پر جو پل تعمیر کیا تھا وہ پورے ایک سو سال کا ہو گیا ہے۔ اس کے معاہدے کے مطابق وہ اب ہر قسم کی ذمے داری سے سبکدوش ہو چکی ہے۔

آج سے پانچ سات سال پہلے اخباروں میں ایک خبر پڑھنے کو ملی تھی کہ گوا میں پنجم کی کھاڑی پر جو پل تعمیر کیا گیا تھا وہ سات ہی برس میں بوس ہو گیا تھا حالانکہ اس پل کے معاہدے میں بھی مدت کی مدت سو سال ہی لکھی گئی تھی۔

سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں!

ہماری ریاستی سرکاروں کو چاہیے کہ ایک پل کی تعمیر کے مکمل ہوتے ہی اس کے قریب ایک دوسرے پل کی تعمیر کا ٹھیکہ ڈال دیا کریں کہ اسی میں سب کا بھلا ہے۔

۴- لہروں کی گنتی :-

سرکار نے امپورٹ، ایکسپورٹ، انکم ٹیکس اور اسی طرح کے اور کئی قانون ڈھیلے کر دیے۔ پرمٹ کوٹے راج کا خاتمہ ہوا خیال تھا کہ رشوت ستانی کا دور بھی ختم ہو جائے گا۔

محکمہ آبکاری کا ایک افسر ہمارا دوست تھا۔ وہ جی بھر کر رشوت لیتا تھا۔ نیا دور شروع ہوا تو ایک دن ہم نے ازراہ ہمدردی اس سے پوچھا "شرما جی! موجودہ حالات میں تو آپ کی حالت بہت پتلی ہو رہی ہوگی۔"

جواباً مسٹر شرما جی نے بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پرانی کہاوت سنائی۔

"پرانے زمانے میں ایک نیک دل اور منصف مزاج بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا ایک وزیر بڑا رشوت خور تھا۔ لوگوں کی فریاد بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے اس وزیر کو دریا کے کنارے لہریں گننے اور ان کا حساب رکھنے کے کام پر مقرر کر دیا کہ اس طرح وہ رشوت خوری کیسے کر سکے گا؟ ـــــ وزیر نے لہروں کی گنتی شروع کر دی اور اس کے گھر میں اور بھی زیادہ دھن برسنے لگا ـــــ وہ کیسے؟ ـــــ وہ ایسے کہ جب کوئی کشتی راں اپنی کشتی کو کنارے سے ہم کنار کرنا چاہتا تو وہ وزیر اسے روک دیتا کہ بادشاہ نے اسے لہروں کی گنتی پر مقرر کیا ہے۔ کشتی کنارے پر آنے سے لہروں کی گنتی میں فرق پڑتا ہے۔ سمجھ گئے نا آپ؟" شرما جی نے مسکرا کر ہمیں سب بات سمجھا دی۔

انصاری اصغر جمیل (سمرین پورناپس)

چمچہ گری

ہم اور ہماری مقبولیت اب تک سینۂ راز میں رہی ہے چوں کہ ہمارے آپ سے قریبی تعلقات ہیں اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ آج اس راز سے پردہ اٹھا ہی دیا جائے ۔ دل تھام کر سنیے ہماری مقبولیت کا راز کیا ہے؟

ہم ایک ایسے ہنر کے ماہر ہیں جسے چمچہ گری کہا جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے جس میں مہارت حاصل ہونا اشد ضروری ہے تاکہ اس ہنر کا جس پر استعمال ہو، اسے یہ محسوس نہ ہو کہ اس کی چمچہ گری کی جا رہی ہے، ورنہ بیڑہ غرق ہو جائے گا۔

ہماری شاعری میں شروع ہی سے عمدہ تک بندی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ ہماری نثری تخلیقات بکواس کا پلندہ ہیں ۔ دنیا کا شاید ہی کوئی موضوع ہو، جس پر ہم نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ہم نے اپنے قلم سے رؤسا، حاکمِ وقت اور بانیانِ مجالس ر..... اس ' تعریفیں کی ہیں کہ شہر کی ہر مجلس ہمارے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے ۔ دراصل ہمارا سب کام ترتیب وار ہوتا ہے۔ اسے انگریزی میں System-atic کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر شہر میں کوئی مشاعرہ ہو رہا ہو، تو سب سے پہلے ہم منتظمینِ مشاعرہ کی تلاش کرتے ہیں ۔ اگر اس میں ہمیں کوئی شکار نظر نہ آئے تو صدرِ مشاعرہ کا پتہ لگاتے ہیں وہ اس لیے کہ اب اردو کے مشاعروں کی صدارت کوئی جاہل صاحب زر یا سیاسی شخص ہی کرتا ہے ۔ وہ دن ہوا ہوئے جب دنیائے ادب کی معتبر شخصیات صدرِ مشاعرہ ہوا کرتی تھیں ۔ ہم کسی نہ کسی طرح ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ چند دنوں تک متواتر ان کے دربار میں حاضری دیتے ہیں ۔ ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ ان کا جھکاؤ ہماری طرف ہونے لگتا ہے ۔ پھر ایک معقول [illegible] کی طرح ضیافت کرتے ہیں۔

"[illegible]"

"اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں" یہ جان کر ہم دونوں آنکھیں کھلی رکھ کر جلدی سے کہہ اٹھتے ہیں۔
"مشاعرے میں بحیثیت شاعر بھی دعوت نامہ مل جائے [illegible]"

جو ہمیں مل جاتا کہ "جا تیری مراد پوری ہوئی"۔ اس کام میں ہم جلدی اس لیے بھی کرتے ہیں کہ ہمیں خدشہ رہتا ہے کہیں ان کا ارادہ بدل نہ جائے اور گنتی سے پہلے چراغ ہی گل نہ ہو جائے۔

ہم جس مشاعرے اور ادبی محفل میں شریک ہوں گے اپنے ہنر اور فن سے سب کا دل جیت لیں گے۔ اگر مشاعرہ گنیش اتسو کے موقع پر منعقد ہو رہا ہے تو گنیش جی کی شان میں اس قدر اشعار سناتے ہیں کہ سامعین .... ہمیں گنیش جی کا سچا بھگت سمجھنے لگتے ہیں۔

ہم نے اپنے اس ہنر سے اپنی تک بندیوں سے کئی مجموعے بھی شائع کروا لیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ صوبائی اردو اکیڈمیوں سے کئی انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ہم نے بعض قدیم مقالوں کو اپنے نام سے چھپوا کر بھی اردو اکیڈمی سے انعام حاصل کیا تھا۔

ہم شہر کی ہر مشہور شخصیت سے تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ اور ان کی دعوتوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ محفلوں میں لوگ ہمارے لباس کی وجہ سے مرعوب رہتے ہیں۔

جس زمانے میں ہم طالب علم تھے، اساتذہ ہم پر مہربان تھے۔ دراصل ہم ان کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چنانچہ چمچہ گری سے انھیں اپنا لیتے۔ ویسے بھی اردو کی پرائمری جماعتوں میں کیا خاک پڑھائی ہوتی ہے؟ وہاں تو اساتذہ اور استانیوں کے درمیان فیشن کا بے مثل مقابلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس میں ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے۔ چوں کہ انھیں بھی میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کسی کی چمچہ گری سے نوکری حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے درس و تدریس سے ان کا کیا تعلق؟ ہم بھی اساتذہ کی چمچہ گری کرتے رہے۔ ان کی ہر جائز و ناجائز بات پر لبیک کہنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور ان کے منظور نظر بنے رہے۔

اب آپ سے کیا چھپائیں؟ ہماری شادی بھی اسی ہنر کی مرہون منت ہے۔ واقعہ دراصل یوں ہے کہ ہمارے خسر صاحب ایک سیاسی آدمی ہیں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے اس میدان میں دولت کی ریل پیل رہا کرتی ہے۔ ہم بھی شادی سے پہلے اپنے خسر صاحب کو اپنی موٹر گاڑی میں لے کر پھرا کرتے، چوں کہ وہ بھی چمچہ گری کو پسند کرتے ہیں اس لیے آئے دن کسی نہ کسی وزیر کے روبرو ان کی حاضری ضروری رہتی ہے۔ ہماری نظر میں ان کی بیٹی سے زیادہ ان کی دولت پر تھی۔ ہمیں یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ اپنی کانی اکلوتی بیٹی کے لیے ایک اچھے لڑکے کی تلاش میں ہیں۔ اور جہیز میں کافی کچھ دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ہم نے سوچا چلو اچھا ہے کیوں نہ خود کو ان کی دامادی کا شرف حاصل کرنے کے لیے پیش کریں۔ لڑکی کانی ہے تو کیا ہوا؟ سب کو کم از کم ایک نظر سے دیکھے گی۔ رفتہ رفتہ ہم خسر صاحب کی قربت [illegible] مگر ان کا بس چلتا تو وہ ہم سے ہی شادی کر لیتے لیکن بحالت مجبوری انھیں اپنی بیٹی کی شادی ہم سے کرنی پڑی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ہم اپنے [illegible] سسرال کا قیمتی سامان اپنے مکان میں منتقل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ سے بھی درخواست [illegible]

[illegible] اس ہنر کی تحسین [illegible]
اب ایسا بھی نہیں کہ [illegible] بھی اچھا سمجھیں [illegible] بار بار ایسا ہی سمجھیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے، دفتر میں ہم نے اپنے دو افسروں کی ایک ساتھ چمچہ گیری شروع کر دی۔ دونوں کا گریڈ ایک ہی تھا۔ ہمیں لگتا دونوں تو بظاہر دوست ہیں لیکن حقیقت میں اندر ہی اندر ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

ہم جناب "الف" کے پاس پہنچتے تو ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اور جناب "ب" کی ان برائیوں کو بیان کرتے جو سرے سے ان میں تھیں ہی نہیں۔ جناب "ب" کے پاس پہنچتے تو جناب "ب" کے متعلق وہ عرض کرتے جو انھوں نے کبھی زبان سے نکالا بھی نہیں۔

اسے اتفاق یا ہماری شامت کہہ لیجیے کہ ایک روز ہم جناب "الف" کے مکان میں جناب "ب" کا تذکرہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بغل والے کمرے سے جناب "ب" وارد ہو رہے ہیں۔ پھر ان دونوں نے ہمارا جو حشر کیا..... وہ بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس روز پتہ چلا کہ چمچہ گیری میں صاحبِ ہنر ہونا لازمی ہے۔

بالکل اسی طرح جس طرح ایک بادشاہ اپنے غلام کے ہمراہ کھیت میں داخل ہوا۔ کھیت میں لگے ہوئے بینگن کو دیکھ کر بادشاہ نے اپنے غلام سے کہا:

"کتنے خوش نما اور چمک دار بینگن ہیں۔"

یہ سن کر اس غلام نے بینگن کی تعریف میں شاندار قصیدہ پڑھ دیا۔ اور اس قدر تعریف کی۔ بادشاہ حیران ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا سنتے ہیں کھانے میں بینگن نقصان دہ ہوتے ہیں۔

یہ سنتے ہی غلام بھی اس کے نقصانات گنوانے لگا۔ اس پر بادشاہ نے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم بینگن کی تعریف کر رہے تھے۔ اور اب اس کی برائی بیان کر رہے ہو؟"

غلام نے جواب دیا "حضور ہم تو آپ کے غلام ہیں، نہ کہ بینگن کے۔"

[illegible] نے چمچہ گیری کا [illegible] بات ہم نے اپنی گرہ میں باندھ لی ہے کہ جس کی چمچہ گیری کرنی ہو وہ [illegible] کالا ہی کہنا چاہیے چاہے دنیا کلر بلائنڈ (Colour Blind) ہو جائے۔

تبصرہ
مظفر مجاز

چہرہ در چہرہ

(مجتبیٰ حسین)

خدا کی سب سے عجیب اور دلچسپ ترین مخلوق "انسان" ہر فن کار کی مرکزِ نگاہ رہی ہے۔ اس خراب آباد کی ساری ہنگامہ آرائی اسی "انسان" کے دم قدم سے ہے۔ اس کرۂ ارضی بلکہ اب تک کی تحقیق کی روشنی میں کائنات کا یہ مرکزی کردار اگر اسٹیج سے ہٹ جائے تو ایک بھیانک سناٹے اور مکمل خاموشی کے سوا کائنات میں کچھ باقی نہ رہے۔ تبھی تو اقبال نے کہا:

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مجتبیٰ حسین کی پیکر نگاری بھی اسی "انسان" کے گرد گھومتی ہے، چاہے وہ ان کے انشائیے ہوں یا خاکے، ہر جگہ اسی انسان کی جلوہ گری ہے۔ مجتبیٰ واقعات کے بے ڈھنگے پن سے اپنے فن کا جادو نہیں جگاتے بلکہ انسانوں کی جمالیات (IDIOSYNCRACIES) سے اپنی تحریر کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ ان کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس انسانی تماشے میں وہ دور کے تماشائی نہیں بلکہ اس تماشے کا خود بھی ایک کردار ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے موضوع (SUBJETS) ان کے سامنے دب سے گئے ہیں۔ کیوں کہ مجتبیٰ کا واحد متکلم بہت توانا ہے۔ علاوہ اس کے باوجود کہ ان کا تعلق دکن سے ہے جو اپنے حد درجہ انکسار اور خطرناک حد تک سادگی بلکہ سادہ لوحی سے اپنے آپ کو کبھی پہلی صف میں کھڑا ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ مجتبیٰ اپنے اظہار میں اپنی دکنی سادگی اور انکسار کا پیکر ہیں لیکن ان کے بین السطور سے جو ان کا کردار ابھرتا ہے، اس کے سامنے ان کے بعض ہیرو ننھے منے سے نظر آتے ہیں۔ بیشتر شاعروں اور ادیبوں ہی کے قلمی خاکے بناتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ مجزوانکسار کا پیکر بنے ہوئے وہ ان جیتے جاگتے کرداروں کے درمیان گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خاکے پڑھتے ہوئے اقبال کا یہ شعر میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

ز شیدم صنم بہ صورت خویش
بہ ہرنگے کہ خواستم خود بستم

انسان کی یہ ازلی صفت ہے کہ وہ اپنے دیوتا اور اصنام کو تراشتا ہے تو اپنی شکل و صورت پر ہی بناتے جو اصنام تراشتے ہیں وہ یقیناً "خیالی" نہیں ہیں۔ مجتبیٰ کے خاکے انسان کو بقول غالب کافر بنا کے پتھر تراشتے ہیں بلکہ وہ چلتے جاگتے معاشرے کے زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں وہ (یعنی فن کار مجتبیٰ) کے آئینہ تحریر میں اور کبھی ان کے آئینے میں۔ فن کار دونوں ایک دوسرے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے نظر آتے ہیں یعنی "چہرہ در چہرہ" ایک آئینہ در آئینہ عکسوں کا کھیل سا نظر آتا ہے۔ مجتبیٰ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کی چھوٹی کمزوریوں اور فروگزاشتوں میں ان کے "انسان" ہونے کی بڑائی دکھا دیتے ہیں اور اس انداز سے کہ آپ ان کی کمزوریوں سے واقف ہو کر بھی ان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں وہ ذم کا پہلو کبھی نہیں ابھارتے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی تحریر کے اس آئینے میں ان کے ممدوح اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنے مداح اور اپنے آپ دونوں کو قابلِ قبول سمجھتے ہوں گے۔ غالباً منٹو کی طرح مجتبیٰ بھی سمجھتے ہیں بلکہ اس راز سے واقف ہو چکے ہیں کہ انسان کی عظمت اور بڑائی اس کی کمزوریوں میں بھی ہے۔ یہی وہ کیمیا ہے جو انسان کو فرشتے سے افضل بناتی ہے پھر وہ ہنستے کھیلتے یہ بھی بتا جاتے ہیں کہ اس کام میں لگتی ہے محنت زیادہ اے ـــ یہ نہیں کہ مجتبیٰ اپنے موضوع میں صرف کیڑے ہی نکال لیتے ہیں ان کے نظر کی وسعت ان کے نیک و بد ہر دو کو محیط کرتی ہے۔ یوں فن کار کی نگاہ میں جب پست و بلند ایک ہو جاتے ہیں تو اس کے فن میں ایک ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ فن کار مفتی ہوتا ہے نہ نقاد اور وہ محض فوٹوگرافر بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے موضوعات کو اپنی شخصیت اور فن کے منشور سے گزار کر ایک قوسِ قزح بناتا ہے۔ جس میں زندگی اپنی ساری بوقلمونیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور یہیں سے وہ تحیر کی منزل شروع ہوتی ہے جہاں پہنچ کر آپ حیران ہو جاتے ہیں کہ اس تماشے کے تماشائی تو ہم بھی تھے لیکن فلاں فلاں پہلو ہماری نظر سے پوشیدہ ہی رہا، وغیرہ وغیرہ۔ ممکن ہے ہم مجتبیٰ کے ان ہیروز سے واقف بھی ہوں لیکن جب مجتبیٰ ہمارا تعارف ان سے کراتے ہیں تو ہمیں وہ، وہ نظر آتے ہیں جو وہ ہیں یا جو مجتبیٰ کو نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ فن کار جو مرقع کھینچ رہا ہے وہ حقیقی اور سچا بھی ہو، اس کا فن کار کی نظر کے پردے یا اس کے توہمات بھی احاطہ کیے ہو سکتے ہیں لیکن یہ کمال فن کار کا ہے کہ وہ اس صنم کو ایسا تراشتا ہے کہ آپ اسی کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں جملہ بیس خاکے ہیں۔ جن میں مصنف کا اپنا خاکہ بھی ہے۔ "خود وفاتیہ" کی شکل میں جس میں مصنف نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا وہی بیدل والی بات ہے کہ:

بانکہ منافقانہ نشیں در کمیں خویش

مجتبیٰ کے اپنے "خود وفاتیہ" سے بہتر شاید ہی بیدل کے اس بے پناہ شعر کی تشریح ہو سکے جس کا پہلا مصرع ہے:

خواہی کہ عیب تو بشود بر تو آشکار

باقی (۱۹) خاکوں میں چھ شاعر، چھ صحافی، دو افسانہ نویس یا سابق افسر شہر وغیرہ قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جاندار خاکہ محمد علوی کا ہے۔ اور عجیب ہے کہ نعمت حسن کا۔ ممکن ہے ہم واقعاتی طور پر

بلکہ برعکس ہے۔ یہاں بات مسعود حسین یا فنڈ کے فن سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک خاکہ (ذہین قوی) غالب کے مکاتیب اور ان کی طرز تحریر میں لکھا گیا ہے۔ مگر اس میں وہ بات نہیں جو غالب کی خصوصیت ہے۔ غالب کی جان والا محاورہ اس میں ناپید ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے غالب کا انشا محض حیات بن کر ابھی مصنف کے قلم میں نہیں اترا ہے۔

آخر میں کچھ زبان و بیان کے بارے میں: مجتبیٰ کی زبان اگرچہ اس ادبی رچاؤ اور چاشنی سے مملو نہیں جس سے رشید صدیقی اور پطرس سے لے کر ابن انشا اور یوسفی کی تحریریں عبارت ہیں لیکن اسی کی سادگی اور سادہ بیانی ہی ان کا حسن ہے۔ ان کی تحریر کا لہجہ کسی آب و رنگ کا محتاج نہیں۔ یوسفی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجتبیٰ نے کہیں کیچڑ میں تیرنے کی کوشش نہیں کی۔ مغلق تراکیب یا ثقیل الفاظ سے وہ اپنی تحریر کو بوجھل نہیں کرتے۔ ان کے خاکے زیادہ تر عالموں، فاضلوں، شاعروں اور ادیبوں پر ہیں لیکن ان میں انھوں نے اپنی علمیت کی دھونس جمانے کی کہیں کوشش نہیں کی نہ ان علما و فضلا کے ...... علم و فضل کی وسعت طوری پیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان کو ایک انسان کی عینک سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ کیوں کہ ایک ادیب و شاعر اول و آخر انسان ہی ہوتا ہے جس کو بیشتر خاکہ نگار بھلا بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے ممدوح کو بقول منٹو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجتبیٰ سیدھی سادی زبان میں جو ان پر گزرتی ہے ہنستے کھیلتے رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ غالباً ان کی یہی سادگی و بیباکی ہے جسے انھیں عارف و عامی ہر دو میں مساوی طور پر مقبول بنائے رکھا ہے بلکہ غیر اردو داں طبقے میں ان کی پسندیدگی اسی سادہ بیانی ہی کے سبب ہے۔ جس میں نہ تاریخی حوالے ہوتے ہیں نہ ادبی تلمیحات وہ اپنے قاری یا سامع کو کبھی پریشان نہیں کرتے۔ یہ بات علما و فضلا کی صحبت میں پڑھنے لکھنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ زندگی کو ...... اور انسانوں کو قریب سے دیکھنے سے ہوتی ہے۔ ان میں جھانکنے اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہونے سے نہیں ہوتی۔ ان سارے بکھیڑوں سے مجتبیٰ نے اپنے آپ کو اور اپنی تحریر کو دور ہی رکھا ہے۔ دلوں کو کھینچنے والی بات کی تو بہت سی فلسفیانہ توجیہات ہو سکتی ہیں۔ جن پر نقادانِ کرام کا بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ خدائے سخن میر بھی اس معاملے میں ایک سوال کر کے ہمیں سوچنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ چناں چہ میر کے اس شعر سے اس بات پر تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے:

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

●●●

دوست کے خط

(مراسلے)

محترم کمال صاحب!

السلام علیکم! شگوفہ کے ۲۵ سال مکمل ہونے پر آپ نے اداریہ میں میرا ذکر کیا ہے وہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شگوفہ کو اس مقام تک پہنچانے میں آپ نے جس محنت، خلوص اور محبت سے کام کیا ہے وہ اردو زبان و ادب خصوصاً طنز و مزاح کی تاریخ میں شگوفہ کو تا قیامت شگفتہ رکھے گا۔ آپ نے زبان و ادب پہ بے شمار نقوش چھوڑے ہیں۔ شگوفہ ان میں ایک قیمتی نادر اضافہ ہے۔

میں اپنے رب سے ملتجی ہوں کہ رب العزت آپ کو صحت و تندرستی اور شگوفہ کو بے پناہ قبولیتِ عام عطا فرمائے کہ ہم شگوفہ کی گولڈن، ڈائمنڈ اور پلاٹینم جوبلی بھی منا سکیں۔ آمین

شجاع الدین غوری (جدہ)

نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ میرے بڑے بھائی جناب سید یٰسین ادیب (ذکی گوہر نسلوی) جن کا کلام شگوفہ میں بھی شائع ہو چکا ہے، کا ۳ دسمبر ۹۲ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۰ سال تھی۔ وہ بھارتی ایئر فورس، بھارت پٹرولیم کارپوریشن میں ملازم تھے۔ سینئر اسسٹنٹ آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

محبوب ماجھوری (بلاسپور)

[illegible] صاحب کی رحلت اردو ادب کا حادثہ ہے۔ [illegible] آپ کا شعری شگوفہ بے حد [illegible] خدمت [illegible] ہے۔

یوسف ناظم

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

شگوفہ کے ۲۵ سالہ شعری انتخاب کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ اکثر قارئین نے پسندیدگی کے خطوط لکھے۔ اب نثری انتخاب کا مرحلہ ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے لیے ایک اہل صاحب دوست نواب سکندر علی خاں کی خدمات بطور مہمان مدیر حاصل کی گئی ہیں جو ان دنوں ریاض میں مقیم ہیں اور ایک ماہ کے لیے حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ انتخاب کا بیشتر کام سکندر علی خاں صاحب کے قیام کے زمانے میں انجام پا جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خصوصی شمارہ اگست پر شائع ہو۔ دیگر تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان ہوگا۔

شگوفہ کا جولائی کا شمارہ ودربھ کے مزاح نگاروں کی تخلیقات پر مشتمل ہوگا۔ اس شمارے کے مہمان مدیر مشہور مزاح نگار شکیل اعجاز ہیں۔

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ۱۹۹۳ء کا کل ہند مخدوم ایوارڈ کسی طنز و مزاح نگار کو دینا طے کیا ہے۔ یہ انعام ۱۵ ہزار روپیہ اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہم اردو اکیڈمی کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ ملک کی دوسری اکیڈمیاں بھی طنز و مزاح کے فروغ کے لیے خصوصی انعامات کا اعلان کریں گی۔ ماضی میں مہاراشٹرا اردو اکیڈمی اور دہلی اردو اکیڈمی نے کل ہند پیمانے پر طنز و مزاح کی محفلیں [illegible] طنز و مزاح کا [illegible] خصوصی [illegible] جائے گی [illegible] افسوس ہے کہ [illegible] ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

گوشہ —
ودربھ میں طنز و مزاح
مہمان مدیر: شکیل اعجاز

جلد: ۲۷
شمارہ: ۷
جولائی ۱۹۹۴ء

سرورق: شکیل اعجاز
کتابت: محمود سلیم۔ محمد غالب اور فضل محمد
طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار۔

خط و کتابت کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

فی پرچہ: ۸ روپے
زرِ سالانہ: ۸۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

گوشۂ وِدربھ

سرورق کے کیری کیچر ← بابو آر کے

سعید احمد خاں ایس ایس علی محمد اسد اللہ

رفیق شاکر شکیل اعجاز

رحمت اللہ خاں بانو سرتاج علامہ گنبد

فیاض افسوس ناظم انصاری محبوب راہی

خامہ بگوش

ادبی تحقیق
یا
پولیس کی تفتیش

ڈاکٹر خلیق انجم ان معدودے چند ہندوستانی ادیبوں میں سے ہیں جو پاکستان میں بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں اور ادبی اجتماعات میں شرکت کرکے اور اخبارات کو انٹرویو دے کر دونوں ہاتھوں سے شہرت سمیٹتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ چند سال قبل ڈاکٹر صاحب اپنے دوست اسلم پرویز کے ساتھ نیاز فتح پوری سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی آئے تھے۔ ایک فلمی اخبار کے ایڈیٹر انھیں اداکار سمجھ کر انٹرویو کے لیے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایڈیٹر کی غلط فہمی آخر تک دور نہ کی۔ اس اخبار میں جو انٹرویو چھپا، اس میں لکھا تھا۔ "ہندوستان کے مشہور اداکار خلیق انجم کراچی تشریف لائے ہیں، ان کے ساتھ ان کی فلموں کے ہدایت کار اسلم پرویز بھی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی پاکستان میں شہرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے خطوط کئی جلدوں میں مرتب کیے ہیں اور یہ پاکستان میں بھی چھپ گئے ہیں۔ چوں کہ غالب سے دل چسپی عام ہے، اس لیے خطوط غالب کے مرتب کو بھی عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ وہ صفِ اول کے محقق ہیں اور کئی اعلیٰ درجے کی تحقیقی و علمی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ محقق، صفِ اول کا ہو یا صفِ سوم کا، اس کی شہرت ایک محدود حلقے تک رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چوں کہ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری بھی ہیں، اس لیے انھیں وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب لکھنے پڑھنے سے شغف رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں وہ بابائے اردو کے جانشین ہیں۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے اور بابائے اردو کی روح کے لیے بھی شرمندہ ہونے کا معقول جواز ہے۔ بابائے اردو کی روح شرمندہ ہوتی ہے تو ہو لیکن ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے اشاعتِ اردو کا خواب نہایت عمدگی سے شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ جب تک ڈاکٹر خلیق انجم کا تعلق انجمن سے ہے اردو کے مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں۔

ڈاکٹر صاحب تحقیق کے لیے نئے نئے موضوع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ غالب سے ان کو خاص دل چسپی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے غالب کی نادر تحریریں جمع کیں۔ پھر غالب اور شاہانِ تیموریہ کے حوالے سے ایک کتاب لکھی۔ خطوطِ غالب

کی تدوین غالبیات میں ان کا تازہ ترین افسانہ ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور قاضی عبدالودود جیسے ماہرین غالبیات کے انتقال کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم ہی کو ماہر غالبیات سمجھا جاتا ہے۔ "خانہ خالی را دیو می گیرد" اسی کو کہتے ہیں۔ غالب سے ان کی اس دل چسپی کو دیکھتے ہوئے دہلی والوں نے مرزا غالب کی دیکھ بھال کا کام انھیں کے سپرد کردیا ہے۔ اردو کے عام محقق قبریں کھودتے اور مردے خراب کرتے ہیں۔ خلیق انجم پہلے محقق ہیں جو ایک قبر کی دیکھ بھال کرتے اور مردے کو حق الامکان آرام پہنچاتے ہیں۔ یعنی مزار کی چابی اپنے پاس رکھتے ہیں اور سخن ناشناسوں کو مزار کے قریب نہیں جانے دیتے۔ اسی لیے وہ خود بھی کبھی کبھار ہی وہاں جاتے ہیں۔

غالب کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دل چسپی کا دوسرا میدان دلّی ہے۔ اس شہر کے آثار قدیمہ پر انھوں نے نہ صرف ایک مستقل کتاب لکھی ہے بلکہ سرسید کی کتاب "آثارالصنادید" کو بھی مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے سننے میں آیا ہے کہ اب دلی میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں جو وہاں کے آثار قدیمہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے برابر معلومات رکھتا ہو۔ گویا قحط الرجال کی وجہ سے وہ آثار قدیمہ کے ماہر بھی بن گئے ہیں۔

غالباً آثار قدیمہ سے دل چسپی ہی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تحقیقی کتاب جگن ناتھ آزاد کے بارے میں ہے۔ حالاں کہ آزاد ہمارے زمانے کے آدمی ہیں اور خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن خلیق انجم نے جس طرح دادِ تحقیق دی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے کسی ہم عصر کے متعلق نہیں ایک ایسے شخص کے بارے میں مرتب کی ہے جو ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے اور عہدِ غالب سے تعلق رکھتا ہے۔

اردو ادب میں کئی آزاد گزرے ہیں۔ ایک تو سرشار کے فسانۂ آزاد والے آزاد ہیں۔ دوسرے محمد حسین آزاد، تیسرے "نوابی دربار" کے مصنف سید محمد آزاد اور چوتھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ اگر ڈاکٹر خلیق انجم ان آزادوں میں سے کسی ایک کو پابندِ تحقیق کرتے تو بات سمجھ میں آجاتی کہ مردوں سے بے تکلف ہونا اہلِ تحقیق کا شوق بھی ہے اور پیشہ بھی لیکن ایک زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنانا بہت مشکل کام ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مشکل کام کو نہایت آسانی سے انجام دیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان کی ادبی خدمات بے مثال ہیں۔ ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جب اقبال کا نام لینا بھی جرم تھا انھوں نے اقبال پر کتابیں لکھ کر اقبال شناسی کی راہ ہموار کی۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں اقبال کے نام پر کئی ادارے قائم ہیں اور یونیورسٹیوں میں اقبال پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ شاعری، تنقید اور اقبال شناسی کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد اس کے مستحق ہیں کہ ان کے فکر و فن کا مطالعہ کیا جائے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس جہت میں کام ہو رہا ہے اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے تو یہ کیا ہے کہ پاکستان کے اخبارات میں آزاد کے بارے میں جتنی خبریں چھپی تھیں اور رسالوں میں ان کی کتابوں پر جو تبصرے شائع ہوئے تھے، ان سب کو جمع کیا ہے۔ پھر ان تمام کانفرنسوں اور مشاعروں کے دعوت نامے تلاش کیے جن میں آزاد نے مقالے پڑھے اور کلام سنایا تھا۔ یہی نہیں ان کانفرنسوں اور مشاعروں کی جو روودادیں انتہائی غیر معروف اخباروں اور رسالوں میں چھپی تھیں۔ بزورِ تحقیق یا بذریعہ کشف ان کا بھی سراغ لگایا۔ سب چیزوں کو زیرِ نظر کتاب میں اس سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے کہ آزاد کے گزشتہ پچاس برسوں کا

ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو آنکھوں کے سامنے اس خیال سے اندھیرا بھی آجاتا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ سب چیزیں جمع کرنے میں کتنی محنت کی ہوگی۔ مہینوں تو اخبارات کی فائلیں دیکھی ہوں گی۔ تقریبات کے دعوت نامے حاصل کرنے میں بھی دو چار برس تو صرف ہوئے ہوں گے۔ غالب کے خطوں کی طرح آزاد سے متعلق اخباری تراشے جمع کرنے میں انھوں نے جس لگن سے کام کیا ہے اور تحقیق کو تفتیش کے درجے تک پہنچا دیا ہے، اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنھیں اس قسم کے کام کرکے عمرِ عزیز کو ضائع کرنے کا تجربہ ہے۔

تحقیقی دیانت داری کا یہ حال ہے کہ فاضل مرتب نے اخباری تراشوں اور دعوت ناموں کو نقل نہیں کیا بلکہ ان کے عکس چھاپے ہیں تاکہ کسی قسم کی غلطی کا امکان نہ رہے۔ مثلاً ۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے شاہ حسین کالج میں آزاد کے اعزاز میں جو محفل مشاعرہ منعقد ہوئی تھی، اس کے دعوت نامے کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ اگر عکس کی بجائے نقل شائع کی جاتی تو اس کا امکان تھا کہ تاریخ یا سنہ میں کتابت کی غلطی راہ پا جاتی جس کی وجہ سے پچاس سال بعد محققوں میں بحث چھڑ جاتی کہ اس تقریب کی صحیح تاریخ یا صحیح سال کیا تھا۔ خلیق انجم صاحب نے اس ناخوشگوار بحث کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔

اس کتاب میں بعض نادر اور قیمتی دستاویزات کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۸۰ء میں آزاد جب حکومتِ پاکستان کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے تو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے نے ان کے دورے کا تاریخ وار پروگرام مرتب کیا تھا۔ یہ پروگرام کئی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا عکس بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں آزاد کہاں کہاں گئے، کس کس ہوٹل میں ٹھہرے اور کس کس سے ملاقات کی۔ اس سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ وہ پی آئی اے کی کس فلائیٹ سے کس وقت کس شہر گئے، ان کے اعزاز میں کتنے لنچ اور ڈنر دیئے گئے۔ یہ نادر دستاویز شائع کرکے ڈاکٹر خلیق انجم نے آزاد کے سوانح نگار کے لیے بیش بہا معلومات ہی کا نہیں، انواع و اقسام کے کھانوں کا بھی ڈھیر لگا دیا ہے۔

ایک اور ایسی ہی نادر دستاویز کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں لاہور میں علامہ اقبال انٹرنیشنل کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ آزاد اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تو لاہور ایرپورٹ پر ان کے سامان کے ساتھ ایک دم چھلا یا TAG لگا دیا گیا تھا تاکہ ان کا سامان کسی دوسرے مہمان کے ساتھ نہ چلا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے خدا جانے کس طرح یہ TAG حاصل کر لیا اور اس کا عکس کتاب میں شامل کر دیا۔ اس TAG سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آزاد کو ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا، اس کا نمبر ۳۳۷ تھا۔ اس عکس کی اشاعت کی وجہ سے آئندہ کوئی محقق غلط بیانی سے کام لے کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ آزاد نے کمرہ نمبر ۳۳۶ یا ۳۳۵ میں قیام کیا تھا۔

کتاب کے آخر میں "مرقع آزاد" ہے۔ یعنی آزاد کی بے شمار تصویریں ہیں جو تقریباً ایک سو صفحات پر جلوہ گر ہیں۔ ان تصویروں میں کہیں وہ کسی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں، کہیں کسی مشاعرے میں کلام سنا رہے ہیں کہیں حقہ پی رہے ہیں، کہیں کھانا کھا رہے ہیں۔ کہیں کسی صحافی کو انٹرویو دے رہے ہیں۔ کہیں کسی بین الاقوامی شخصیت کے ساتھ کھڑے ہیں اور کہیں تصویر کھنچوانے کے لیے فوٹو گرافر کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان تصویروں سے آزاد کی زندگی کے مختلف گوشوں پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔ یوں تو سب ہی تصویریں

بہت عمدہ ہیں لیکن ہمیں وہ تصویر بہت پسند آئی جس میں آزاد فلم ایکٹریس سادھنا کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر تصویر کے نیچے دونوں کے نام نہ لکھے ہوتے تو ہمیں یہ پہچاننے میں دقت ہوتی کہ سادھنا کون ہے اور آزاد کون۔ ہم نے بارہا جمال ہم نشیں کو اثر کرتے دیکھا ہے لیکن اتنا اثر پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا۔

تصویروں کے حصے میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ بے شمار لوگوں کے ساتھ آزاد کی تصویریں شائع کی گئی ہیں۔ لیکن خلیق انجم کسی تصویر میں نظر نہیں آئے۔ کوئی غلط کام کر کے آدمی چھپ جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن ایسی عالمانہ کتاب مرتب کر کے منہ چھپانے کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلیق انجم نمود و نمائش سے اجتناب کرتے ہیں۔

کتاب میں اخباری تراشوں، خبروں، عقیدت مندوں کے خطوط اور تصویروں سے جو جگہ بچ گئی تھی اسے مضامین سے پُر کیا گیا ہے۔ یوں تو سب ہی مضمون بہت اچھے ہیں مگر ڈاکٹر حنیف فوق نے جو مقالہ لکھا ہے اسے اس کتاب کا گل سر سبد کہنا چاہیے۔ اس مقالے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت مختصر ہے۔ صرف پانچ صفحوں میں مکمل ہو گیا ہے۔ ورنہ فوق صاحب کا کوئی مقالہ ۴۵ صفحوں سے کم کا نہیں ہوتا۔ پانچ صفحوں میں تو وہ صرف تمہید باندھتے ہیں۔ اس مقالے میں انھوں نے تنقید کی ہوا باندھی ہے اور نہایت کر و فر کے ساتھ۔ یہ مقالہ آزاد کے مجموعۂ کلام "بوئے رمیدہ" کے بارے میں ہے۔ فوق صاحب نے نہایت باریک بینی سے کتاب کا مطالعہ کر کے یہ بتایا ہے کہ اس میں دوسرے شاعروں کے کچھ اشعار بغیر دعاوین کے شامل ہو گئے ہیں۔ یہ وہ شعر ہیں جن کی آزاد نے تضمین کی ہے۔ واقعی یہ بہت بڑی غلطی ہے لیکن ایسی ہی غلطی خود فوق صاحب کے مقالے میں بھی ملتی ہے۔ انھوں نے آزاد کے جتنے شعر بھی اپنے مقالے میں درج کیے ہیں وہ سب بغیر دعاوین کے ہیں۔ ان سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ شعر آزاد کے نہیں فوق صاحب کے ہیں۔ یہ شبہ خالی از مطلب نہیں کیوں کہ فوق صاحب شاعر ہیں اور آزاد کے رنگ میں عمدہ غزل کہتے ہیں۔

کتاب میں آزاد کا ایک طویل انٹرویو بھی شامل ہے جو فکر انگیز بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے زندگی بھر صرف مشاعرے نہیں پڑھے بے شمار کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ بعض علمی و ادبی مسائل پر انھوں نے بڑی عالمانہ باتیں کی ہیں تاہم بعض سوال غیر علمی و ادبی ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ آپ اپنے اخراجات کا حساب کیسے رکھتے ہیں۔ ذرا سی کوشش سے اس سوال کو ادبی بنایا جا سکتا تھا جو یوں ہوتا۔ "آپ اپنے اخراجات کا حساب نظم میں لکھتے ہیں یا نثر میں۔" آزاد اس کا جواب ان لفظوں میں دے سکتے تھے۔ "میں تو خود ہی نظم اور نثر میں خرچ ہو جاتا ہوں۔ اس کا حساب میری تصانیف میں دیکھیے۔" ایک دل چسپ سوال یہ تھا، "ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ آپ کو کسی عورت سے عشق نہیں ہوا۔ ظ انصاری نے لکھا ہے کہ آپ نے کئی ہیروں میں رانجھے کا درد فراق بانٹا ہے۔ ان میں سے کون سی بات درست ہے؟" آزاد نے ظ۔ انصاری کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میری تصانیف کو دیکھنا چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر پچاس سے زیادہ تصانیف دکھانے کی بجائے دو چار تصاویر دکھا کر سوال کرنے والے کا منہ بند کر دیا جاتا۔

مضامین کے حصے میں ہمارا بھی ایک کالم شامل کیا گیا ہے جو ہم نے ۱۹۸۹ء میں لکھا تھا۔ اس عزت افزائی کے لیے ہم مرتب کتاب کے ممنون ہیں۔ گزارش ہے کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اگر ہمارا زیر نظر کالم بھی شامل کر لیا

جائے تو ہم مزید ممنون ہوں گے۔

کتاب کا مکمل نام یہ ہے "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" یہ حال ہی میں آزاد کی ۷۵ ویں سالگرہ پر نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ کتاب دہلی سے براہ راست ہمارے پاس آئی ہے اور اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی موصول ہوا ہے وہ بھی سن لیجیے۔ کتاب کے شروع میں جلی حروف میں لکھا ہے، "جملہ حقوق ڈاکٹر خلیق انجم کے نام محفوظ ہیں۔ کسی نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے اس جملے کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت اور خانگی دونوں کے حقوق خلیق انجم کے پاس ہیں۔"

(بسلسلۂ گزشتہ)

یوسف ناظم (بمبئی)

امریکہ میری عینک سے

کچھ ہوائی باتیں : امریکہ میں کتنے ایرپورٹ ہیں یہ نہیں گننا چاہیے ۔ آپ تھک جائیں گے اور کچھ ایرپورٹ پھر بھی گننے سے رہ جائیں گے ۔ بنکوں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں کی چھتیں بھی ۔ خلاصہ ایرپورٹ کا کام دیتی ہیں ۔ ان چھتوں پر ہوائی جہاز اور جٹ طیارے تو ٹیک نہیں لے سکتے لیکن ہیلی کاپٹر کے لیے ان پر کافی جگہ رہتی ہے ۔ جن چھتوں پر ہیلی کاپٹر کے بسیرے کا انتظام نہیں ہے وہاں سوئمنگ پول بنا دیے جاتے ہیں ۔ نہانے والوں کو صرف نہانے والے دیکھ سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں ۔ سطح زمین پر جو سوئمنگ پول ہوتے ہیں ان پر خواہ مخواہ غیر متعلق لوگوں کی نظریں پڑتی رہتی ہیں حالاں کہ وہاں کوئی انوکھی چیز نہیں ہوتی ۔ بصارتیں الگ خراب ہوتی رہتی ہیں ۔ اکثر لوگ منہ کی بھاپ سے چشموں کے شیشے صاف کرتے رہتے ہیں ۔ کہیں اور جاکر بھی وہ یہ کام کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جائیں کیسے ۔ شیشے صاف کریں گے تو راستہ نظر آئے گا ۔ ایسی چیزیں جن پر نظر ٹھہرے ہی نہ اور ایسی چیزیں جن پر سے نظر ہٹے ہی نا ۔ امریکہ میں اتنی ہیں کہ عالم ہوش میں واپس لانے کے لیے آپ کو لخلخہ کی ضرورت پیش آئے لیکن امریکہ میں لخلخہ ملتا نہیں ہے ۔ ایسے نسخے البتہ ضرور ملتے ہیں جن کی ترکیبِ استعمال آپ کو معلوم نہیں ہے مزید ہوش میں آنے کا ساماں یہاں بہت ہے ۔ یہاں کی چوں کہ ہر چیز خوش جمال ہے اس لیے یہاں کے ایرپورٹ بھی حسین ہیں ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے انھیں کسی انجینئر نے نہیں کسی آرٹسٹ نے بنایا ہے ۔ ضرورت کی ہر چیز ان پر مہیا ہے ہی غیر ضروری چیزیں بھی بہت ہیں ۔ فرش چلتا ہے دکانیں آئینہ ہیں ۔ ہر ایرپورٹ پر دنیا آباد ہے ۔ اندر داخل ہونے کی کوئی فیس ہے نہیں اس لیے اگر کوئی دوسری مصروفیت نہ ہو تو آپ ایرپورٹ پر اپنی شام گزار سکتے ہیں ۔ اخبار پڑھ لیجیے ۔ ریستوران کھلے ہوئے ہیں بیٹھنے اور اونگھنے کے لیے آرام دہ صوفے پڑے ہیں ۔ ٹائلٹ موجود ہیں جن میں صرف منہ دھونے کا پانی ہے اور بکثرت ۔ باقی کے لیے کاغذی انتظام ہے ۔ ہر ایرپورٹ کے کئی گیٹ ہیں اور ہر گیٹ کا فاصلہ دوسرے

گیٹ ہے۔ اتنا ہی ہے جتنا آپ کے شہر میں آپ کے گھر سے بچوں کے اسکول تک کا ہوتا ہے۔ ہر گیٹ پر ایک نہ ایک طیارہ ضرور کھڑا ہوتا ہے۔ اور مسافر بارش کے قطروں کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔ ہر شہر میں کم سے کم دو ایرپورٹ ضرور ہوتے ہیں۔ شہر اگر ایک گز بھی بڑا ہے تو مزید ایک ایرپورٹ کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ ہر پندرہ منٹ پر آپ کو ہوائی سروس مل جائے گی لیکن اس کے لیے پہلے سے انتظام کرنا پڑتا ہے۔ عین وقت پر سفر کا ارادہ کریں گے تو ٹکٹ خریدتے وقت چوٹ زیادہ لگے گی۔ اکثر لوگ اسی لیے دیر تک سر سہلاتے رہتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں چڑھنے کے لیے اب سیڑھیاں پھلانگنی نہیں کرنی پڑتیں۔ خود ہوائی جہاز آپ کے استقبال کے لیے ایرپورٹ کے اندرونی علاقے میں موجود ہوگا۔ ہوائی جہاز کے اندر بھی آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

اور تو اور اگر بچہ دورانِ پرواز ہوائی جہاز میں پیدا ہونا چاہے تو ہوائی جہاز کا سارا عملہ سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور ہوائی سروس اپنے اس اعزاز کے صلے میں نومولود بچے کو عمر بھر کے لیے مفت سفر کرنے کا مستحق قرار دیتی ہے۔ لیکن بچے پر اپنا کوئی حق نہیں جتاتی۔ بچہ جس کا ہے اسی کا رہتا ہے۔ جوں ہی اس ولادت ـــ یوں کہیے واردات کا اعلان ہوتا ہے ہوائی جہاز میں ایک سنسنی پھیل جاتی ہے اور کافی دیر تک پھیلی رہتی ہے۔

امریکہ میں ہوائی سفر بہت مقبول ہے۔ کچھ لوگ تو ہوائی جہاز سے اترتے ہی نہیں۔ اسی میں اپ ڈاؤن کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ یہ بات ہی جھوٹ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ شاپنگ کرنے کے لیے ہوائی جہاز ہی سے ادھر سے ادھر جاتے ہیں۔ اسی لیے امریکہ کے آسمان میں ایک ہی وقت میں کئی ہوائی جہاز اڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی سائیڈ سے چلتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں آتے۔ انھیں کون سی گفت و شنید کرنی ہے لیکن کہتے ہیں ایک وقت آئے گا جب مسافروں کو مزید سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور مسافر خلا ہی میں ایک پلین سے دوسرے پلین میں منتقل ہو سکیں گے۔ ایرپورٹ پر اتر کر انھیں انتظار کی گھڑیاں نہیں گزارنی ہوں گی۔ انتظار کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کی تفصیل آپ کو کسی بھی شعری دیوان میں مل سکتی ہے بلکہ کچھ تالیفات ایسی بھی ہیں جن میں ایک ہی موضوع پر سیکڑوں شعر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتابیں بکتی بھی بہت ہیں۔ اور اکثر رسائل ہر ماہ کسی نہ کسی عنوان پر پانچ دس اشعار ضرور چھاپتے ہیں۔ کتاب کا حوالہ نہیں دیتے۔ مولف کو رسوائی سے بچاتے ہیں۔

امریکہ میں اتنے ہوائی ادارے ہیں کہ ان میں اچھا خاصا مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ مسافروں سے باضابطہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر چھپے ہوئے فارم پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھ دیں۔ (ظاہر ہے آپ تعریف ہی لکھیں گے) ہم تو چوں کہ ہمیشہ اعتراض کرنے کے عادی ہیں۔ اس لیے جی چاہا کہ فارم پر لکھ دیں کہ قلم کہاں ہے؟ صرف کاغذ؟ نصف بہتر تو کام رہ ہی گیا۔ پھر ہم نے سوچا ہوائی سروس والوں کو نصف بہتر کی یاد نہیں دلانی چاہیے۔

انٹرنیشنل ہوائی سفر اور اندرونِ ملک سفر میں کچھ نقصانات بھی ہیں اور فائدے بھی مثلاً انٹرنیشنل سفر میں فائدہ یہ ہے کہ آپ کی باضابطہ تلاشی لی جاتی ہے جب کہ اندرونِ ملک سفر کرنے والے مسافر اس اعزاز سے محروم رہتے ہیں۔ سامان کی بھی جانچ پڑتال کی جاتی ہے لیکن اگر آپ کا کوئی سامان گم ہو جائے تو آپ کو جانچ پڑتال سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی رعایت ہے۔

ہوائی جہازوں میں مسافروں کو مطالعے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کے رسائل جنھیں عام حالات میں کوئی نہیں پڑھتا۔ ہوائی جہاز کے شیلف میں رکھے رہتے ہیں۔ اخباروں کے متفرق ورق بھی ہاتھ آجاتے ہیں۔ اور آدھی آدھی خبریں پڑھ کر دل بہل جاتا ہے۔ اجنبی مسافر ایک دوسرے سے بات چیت بھی کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ دوسرے کی بات سمجھ میں نہیں آتی سمجھ میں آجاتی ہے تو دونوں لڑ پڑتے ہیں۔ ہوائی سفر میں گفتگو کی نوعیت ایسی ہی ہونی چاہیے کوئی ہوائی حادثہ نہیں ہوتا۔ کچھ آبی کچھ خاکی باتیں۔ ہم نے جان بوجھ کر ہوائی باتوں کو بادی باتیں نہیں لکھا۔ غلط فہمی کا خدشہ تھا حالاں کہ غالب نے بادنوشی اور بادپیمائی کے الفاظ استعمال کیے لیکن ان کے طرزِ استعمال نے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ طرزِ استعمال غالب صاحب کے ساتھ ہی چلی گئی۔ وہ تو ہوا کو بھی نوشِ جان فرماتے تھے اور کہتے تھے:

بادنوشی ہے بادپیمائی

امریکہ کے اردگرد دو بڑے سمندر ہیں اور یہ بہت کافی تھے لیکن اس براعظم میں جگہ جگہ جھیلیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ یہ جھیلیں شاید ہی کبھی خشک ہوتی ہوں گی۔ شکاگو کی مشیگن جھیل تو خود ہی سوال کرتی ہے خود ہی جواب دیتی ہے۔ یعنی اپنا جواب آپ ہے۔ جھیل کے آبی دامنوں میں کشتیاں اور موٹر بوٹ اتنی تعداد میں ہیں کہ اگر یہ سب کے سب ایک ساتھ جھیل میں دوڑا دیئے جائیں تو جھیل تہہ سفینہ ہو جائے۔ یہ موٹر بوٹ خانگی بھی ہیں اور عوام کے استعمال کے لیے بھی ہیں۔ موٹر بوٹ خود کو چلانی آنی چاہیے ورنہ کرایہ دے کر فائدہ کیا ہوا۔ اس جھیل نے زمین کا کافی حصّہ اپنے لیے گھیر رکھا ہے۔ ہندوستان میں اس کی اجازت نہیں ملتی ہے اور سمندری علاقے کو مبدل بہ زمین کر دیا جاتا ہے۔ جغرافیہ کی کتابوں میں بحیرہ عرب کے قبضے میں جتنا علاقہ بتایا گیا ہے اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ بہت سا علاقہ نذرِ خاک ہو چکا ہے اور اس پر رہائشی مکان بن گئے ہیں۔ امریکہ میں جھیلوں کو پاٹا نہیں جاتا۔ ان کے گرد چبوترے اور راستے بنا دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ لوگوں کی مرضی ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ جھیل کے کنارے راستوں پر اور اطراف میں محوِ استراحت ان 'پر لوگ' بے حد مصروف نظر آتے ہیں:

ہوتا ہے شب و روز تماشا کھلے بندوں

کوئی قید و بند نہیں اور ہر بندہ آزاد ہے۔ شام کے وقت لوگ سبزہ زار پر لیٹے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو صبح کے وقت یہاں دوڑتے کودتے اور سائیکلیں چلاتے۔ ان کا کام تو ہو چکا۔ اب جو محو تفریح ہیں وہ بہت پرسکون لوگ ہیں۔ مختصر پوشی، سرگوشی اور گرم جوشی ان کی تفریح کے خصوصی موضوعات ہیں۔ مشی گن جھیل میں جو فوارہ نصب ہے اس کے ہارس پاور کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ اصل تو بحث اس موضوع پر ہوتی ہے کہ یہ کن گھوڑوں سے کشید کی ہوئی قوت ہے کہ پانی سطح مرتفع بن کر اچھلنے لگتا ہے۔ (سطح مرتفع اس خفیہ زمین کو کہتے ہیں جو سطح آب کو بہت نیچے چھوڑ دیتا ہے) قریب ہی میں ۹۰ اور ۱۰۰ منزلہ عمارتیں ہیں اور ان عمارتوں کے مکین آخری منزل سے اس فوارے سے نکلتے ہوئے آبی موتیوں کا نظارہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں ہماری عمارت کا قد کیوں گھٹ گیا ہے (اس میں تھوڑا مبالغہ ہے، دس بیس منزلیں کم کر دیجیے) لوگ کبھی جھیل کو دیکھتے ہیں اور کبھی فوارے کو لیکن ان کی آنکھیں سیراب نہیں ہوتیں۔ گھنٹوں یہی منظر دیکھتے رہتے ہیں۔ گھر جا کر آنکھوں میں

ڈال لیتے ہیں جو لوگ فوارے اور جھیل کی طرف نہیں دیکھتے وہ بھی آنکھیں سینک لیتے ہیں۔ اس جھیل کے اطراف بطخیں نہیں گھومتیں۔ بطخیں مردم بیزار نہیں ہوا کرتیں لیکن اتنا مجمع ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ ماہرین طیور کا خیال ہے کہ بڑے مجمعوں میں بطخوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ انھوں نے دوسرے شہروں کی جھیلوں کو اپنی تفریح اور ورزش کے لیے چن لیا ہے۔ صبح سویرے جب ان شہروں کے زندہ دل (بلکہ شب بیدار) لوگ جھیل کے گرد گھومنے آتے ہیں تو بطخیں انھیں اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ باآواز بلند متفقہ طور پر ان کا استقبال کرتی ہیں۔ تھوڑی دور تک ان کے ساتھ بھی چلتی ہیں لیکن جب انھیں غور سے دیکھتی ہیں تو شرما کر جھیل میں اتر جاتی ہیں۔ بطخوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ واک کرتے ہوئے آدمی کتنے کپڑے پہن سکتا ہے۔ کچھ واک کنندہ لوگ بطخوں کے لیے گھر سے توشہ بھی لے آتے ہیں۔ کچھ رات کے ڈنر کا بچا کچھا پیزا (Pizza) یا بریڈ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بطخیں انھیں گھیر لیتی ہیں۔ کھانا بھی کیا چیز ہے لیکن بطخیں یہ بھی جانتی ہیں کہ آدمی پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا وہ اپنی غذا خود تلاش کر لیتی ہیں۔ آدمی سے تعلقات منقطع کرنے میں بطخیں دیر نہیں کرتیں۔

یہی امریکہ کی زمین؟ اس کا بھی جواب نہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں سنگ ریزے بھی بوئے جائیں تو سنگترے پیدا ہوں (سنگترے سنتروں کا واحد ملی شاہی نام ہے) خوبانی اور سیب تو خانہ باغ میں پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ ان کے کورٹ یارڈ اچھے خاصے مزرعے ہیں۔ ان کے مکیں نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ایک دیوانے نے تو اپنے احاطے میں ۷ قسم کے پھل پیدا کر دکھائے۔ اب وہ ان کے ناموں کے لیے سرگرداں ہے۔ امرود امریکہ کا پھل نہیں۔ پھلوں کے اس عاشق نے امرود بھی پیدا کر لیے۔ امرود اور سیب کے درختوں کے کاک ٹیل سے ایک نیا پھل برآمد کر لیا۔ درختوں کی ہر شاخ کا کوئی نہ کوئی شاخسانہ موجود ہے۔ امریکہ میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ پھلوں کا عرق یہاں پانی کی طرح بہہ سکتا ہے لیکن اسے مہر بلب بوتلوں میں بند کر کے دسترخوان کی زینت بنایا جاتا ہے۔ ویسے یہاں دسترخوان ہوتے نہیں ہیں۔ یہاں زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا طریقہ نہیں ہے۔ پکنک بھی عام طور پر کھڑے کھڑے ہی ہو جاتی ہے۔ ساحلی کناروں پر البتہ زمین کا استعمال ہوتا ہے (ساحلی کنارہ یہ ترکیب غلط تو نہیں ہے)

امریکہ کے لوگ ہوا، پانی اور زمین تینوں کا استعمال جانتے ہیں۔ زمین سے خاک نہیں اڑتی، اگر کسی کے دل پر گرد جمی ہے تو وہ اس کی اپنی ذاتی پیداوار ہے۔ یہاں سڑک پر چلنے والے جب ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں تو اسے 'ہائے' ضرور کہتے ہیں۔ یہ یہاں کا کلچر ہے۔ ہم نے جواب آں غزل میں ہائے ہائے کی۔ ان کی ہائے میں غزل کا لطف تھا جب کہ ہماری ہائے مرثیہ تھی۔ لیکن مرثیے کی گنجائش یہاں ہے نہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امریکہ کی زمین یہاں آنے والوں سے لیتی کچھ نہیں دیتی بہت کچھ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ امریکہ کا رویہ ڈائننگ ٹیبل پر کچھ ہے۔ راؤنڈ ٹیبل پر کچھ۔ شخصی سطح اور ملکی سطح دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ ایک کا کلچر دوسرے کے کلچر سے مختلف ہونا ضروری ہے۔ آدمی کے عناصر اربعہ میں سے ہم نے تین ہی کا ذکر کیا تھا آگ کا ذکر رہ گیا تھا۔ یہ ملکی سطح پر نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ ہے بمبئی میری جان

پرویز ید اللہ مہدی

شداد کی جنت جدید

مڈل کلاس افراد کا المیہ یہ نہیں کہ ان کی پیدائش چونکہ مڈل کلاس معاشرے میں ہوئی ہے اس لئے مڈل کلاس طرز زندگی، مڈل کلاس سوچیں مڈل کلاس خواب ان کے مڈل کلاس مقدر میں لکھ دیئے گئے ہیں، یہ اگر چاہیں تو ترقی کر کے مڈل کلاس معاشرے سے ہائی کلاس سوسائٹی میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اس کیلئے توڑ جوڑ بے ایمانی اور مکر و فریب سے قدم قدم پر کام لینا پڑتا ہے اور مڈل کلاس افراد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جب یہ توڑ جوڑ سے کام لینا چاہیں تو ان کی مڈل کلاس شرافت آڑے آجاتی ہے، بے ایمانی کا حربہ آزمانا چاہیں تو ان کی مڈل کلاس ایمانداری راستہ روک لیتی ہے۔ مکر و فریب کے پروں سے اپنی پرواز بلند کرنا چاہیں تو ان کی مڈل کلاس سادگی و سچائی ان کے پر کتر لیتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مڈل کلاس معاشرہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں گلے گلے ڈوبے ہوئے افراد کنویں کے مینڈک کی طرح کبھی باہر نکل نہیں پاتے۔ اس میں ڈوبے ہوئے اپنی عمریں تمام کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جن افراد کی عملداری مڈل ہوٹلوں اور تھرڈ کلاس بھٹیار خانوں تک محدود ہو، ان کا تھری اسٹار، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر اڑانا تو دور کی بات وہ ان میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے لہذا ان عالیشان ہوٹلوں کے دور ہی سے درشن کر کے خوش ہو لیتے یا پھر فلموں اور دور درشن پر ان کے دیدار کر کے نگی دل کی بجھا لیتے ہیں۔ اتفاق سے ہمارا تعلق بھی اس مڈل کلاس برادری سے ہے۔ نتیجتاً ایک عرصے تک ان سہ ستارہ پنج ستارہ ہوٹلوں کے بالواسطہ جلوؤں پر ہی اکتفا کرتے رہے اور شاید عمر بھر کرتے رہتے اور ایک دن شاندار ہوٹلوں کے در و دیوار پر باہر ہی سے حسرت کی نظر کرتے ہوئے اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتے کہ ہمارے ایک دوست کی دریادلی کے طفیل ہمیں ان کے اس جلوے کے اندرونی کوائف کو بچشم خود بہ نفس نفیس دیکھنے کا حسین موقع میسر آ گیا۔!

ہمارے مذکورہ دوست کسی زمانے میں ہماری ہی طرح، مڈل کلاس برادری کے فرد ہوا کرتے تھے لیکن ایک دن اچانک دولت کی دیوی ان پر مہربان ہو گئی، خوش قسمتی کا ایک ہی جھونکا انہیں مڈل کلاس کنویں کی گہرائی سے نکال کر تیل کے بے شمار کنوؤں عرف مشرق وسطیٰ لے گیا، جہاں پیٹرو ڈالر نے ان کے سارے دلدر دور کر دیئے۔ چنانچہ موصوف جب بھی چھٹیاں منانے آتے ہیں وطن مالوف جاتے ہوئے دو چار روز کیلئے بمبئی میں ضرور ٹھکتے ہیں اور نو دولتیوں کی طرح کسی نہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام فرماتے ہیں اور سب سے پہلے ہمیں ہی یاد فرماتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ

تشریف لے جانے سے پہلے البتہ جب بھی بمبئی میں وارد ہوا کرتے ہمارے مختصر سے غریب خانے کو زحمت قیام و طعام دیا کرتے تھے جس کے اختصار کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کسی وقت غریب خانے میں ہمارے اہل خانہ اتفاق سے باہم جتا ہو جائیں تو گھٹنے سے گھٹنا ملائے بغیر دن میں گفت و شنید اور ٹانگ میں ٹانگ پھنسائے بغیر رات میں استراحت نہیں کر سکتے اور یہ حکم میزبان اور مہربان دونوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ ہمارے نو دولتیے دوست جب تک "فارن پلٹ" نہیں ہوئے تھے، ہمارے غریب خانے کو دولت خانہ تصور کرتے تھے اس لئے اس کی تنگی انھیں کبھی نہیں کھلی، لیکن مشرق وسطی کی ہائی کلاس فضاؤں میں سانس لیتے ہی پیٹرو ڈالر کی روانی و فراوانی نے اچانک ہمارے غریب خانے کی تنگ دامانی کا شدت کے ساتھ احساس کروایا کہ ممدوح نے تادم تحریر غریب خانے میں قدم رنجہ نہیں فرمایا، ظاہر ہے اب وہ قالینوں پر چلنے اور ڈبل بیڈ پر نہا سونے کے عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا بمبئی میں قیام و طعام کے سلسلے میں اب فائیو اسٹار ہوٹلوں ہی کو ترجیح دینے لگے تھے، اس طرح غالباً وہ مڈل کلاس معاشرے سے اپنے قطع تعلق کا اور ہائی کلاس سوسائٹی میں گھس پیٹھ کا زور دار اعلان کرکے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش فرما رہے تھے، اس کیلئے موصوف نے نو دولتیوں کے دیگر اوصاف اور خصلتیں بھی اپنالی تھیں جن سے انھیں تاحال کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچا یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے البتہ ہمیں اپنالی تھیں جن سے انھیں تاحال کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچا یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے البتہ ہمیں اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان کے صرفے خرچے پر ہمیں ایک بہت بڑے فائیو اسٹار ہوٹل میں داد عیش دینے کی سعادت حاصل ہوگئی، سچ کہتے ہیں دور کے اس جلوے کو جب گاجر کے حلوے کی طرح بہت قریب سے بلکہ نظروں سے چکھ کر دیکھا تو بچپن میں بارہا سنی ہوئی کوہ قاف کی پریوں والی کہانیوں اور راجہ اندر کے اکھاڑے والے دیومالائی قصوں پر فی الفور ایمان لے آنا پڑا۔ مرزا غالب نے آسمان کی بلندیوں سے پرے جس پسندیدہ منظر کے بنانے کی حسرت میں یہ فرمایا تھا کہ سے

"عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے مکان اپنا"

آج ان کی وفات کے برسوں بعد دنیا کے بڑے بڑے شہر میں بشمول مرزا غالب کی دلی کے عرش سے ادھر والا وہ تصوراتی تخیلی مکان تو فائیو اسٹار ہوٹلوں کی شکل میں ڈھلا ڈھلایا موجود ہے لیکن افسوس بے چارے چچا غالب ہی صفحۂ ہستی سے غائب ہیں۔ !!

قومی سرمائے کی بنیادوں پر کھڑی ان لاتعداد بین الاقوامی پنج ستارہ ہوٹلوں میں یوں تو قدم قدم پر عیش و عشرت کا سامان وافر مقدار میں مہیا کرکے متلاشیانِ عیش و مستی کے اوسان بلکہ ان کے جیب و گریبان کی بھی طبیعت سے اوورہالنگ (OVER HAULING) کی جاتی ہے۔ تاہم جس مقام مخصوصہ کو یہاں 'عشرت قتل گہہ اہل تمنا' ہونے کا شرف حاصل ہے وہ عرف عام میں سوئمنگ پول (SWIMING POOL) کہلاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر گھاس منڈی کے لالہ گھسیٹا مل بھی خود کو کچھ دیر کیلئے تجمل حسین خاں کا ہم پلہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور شعر و ادب سے شغف رکھنے والا ہر صاحب ذوق قاری تجمل حسین خان کے نام نامی سے یقیناً واقف ہوگا۔ البتہ جن قارئین کی یادداشت کے کھاتے میں سے یہ نام اتر چکا ہو، ان کی معلومات کی خاطر یہ بتلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ یہ وہی تجمل حسین خاں ہیں۔ مرزا غالب والے، جن کے متعلق مرزا غالب نے یہ شعر موزوں فرمایا تھا۔ سے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

سوئمنگ پول کا معطر و معنبر پانی سنسنی خیز فضائیں رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کو خیز گرما رہی ہیں۔ منہ سے منجمد خون کو بھی رواں دواں کر دیتی ہیں۔ اسی لئے ہر فائیو اسٹار ہوٹلوں کی گود میں ایک عدد سوئمنگ پول، سوئمنگ پول کی گود میں کئی عدد تھرکتی مچلتی جل پریاں اور جل پریوں کی گود میں ان گنت جھلملاتی پھلجھڑیوں کا بطور خاص اہتمام کیا جاتا ہے کاروباری نقطہ نظر سے سوئمنگ پول ہوٹل کا شعبہ اشتہار بازی عرف پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سمجھئے۔ چنانچہ شعبہ ہذا جس قدر فعال اور سرگرم ہوگا یہاں جتنی زیادہ سرگرمی اور حرارت ہوگی ہوٹل ہذا میں بھی اتنی ہی گہما گہمی اور رونق ہوگی اور کاروبار میں بھی اتنی ہی خیر و برکت ہوگی!

ابھی حال ہی میں سوئمنگ پول کی ایک اور خوبی کا بھی ہمیں علم ہوا، اور یہ عقدہ ظاہر ہے ہمارے ان ہی دوست کے توسط سے کھلا جو حال۔ مقیم مشرق وسطیٰ ہیں اور جن کا تفصیلی ذکر ہم پچھلے ہفتے کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں موصوف چھٹیاں منانے جیسے ہی بمبئی تشریف لائے معمول کے مطابق سیدھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچے قیام کی غرض سے پھر ہمیں فون کرکے اپنی آمد کی اطلاع دی ساتھ ہی حکم صادر فرمایا۔ فوراً پہنچو! مل کر عید مناتے ہیں!

ہم نے جواباً انھیں آگاہ کیا ــ میاں تم تازہ تازہ ایک خلیجی ریاست سے آئے ہو اور تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم آج رمضان کا دسواں روزہ ہے! عید میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔!!

موصوف نے جواباً چوٹ کی۔ یہ دقیانوسی باتیں چھوڑو بھائی آخر کب تک لکیر کے فقیر بنے رہوگے' میاں عید منانے کیلئے چاند دیکھنا یا پھر ننگی تلوار کا دیدار کرنا ہی کافی ہے۔ تمہارے چچا غالب ہی نے فرمایا ہے نا ــ

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اور اس وقت ہوٹل کے سوئمنگ پول میں بخدا کئی عریاں شمشیریں بلکہ ان کی ہمشیریں بھی اٹھکیلیاں کر رہی ہیں تم فوراً پہنچو، ان عریاں شمشیروں کا مع ان کی ہمشیروں کے نظارہ کرکے فی الفور عید منا لیتے ہیں۔

ہم نے غلطی سے پیشہ کے طور پر ایک ایسی لائن اختیار کی ہے جس میں محنتانے کے بدلے میں پیسہ تو برائے نام ملتا ہے البتہ بمبئی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور وغیرہ کی تھری اسٹار تا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام و طعام کی سعادت اکثر حاصل ہوتی ہے چنانچہ اسی سعادت بزور بازوئے پروڈیوسر کے بل بوتے پر عرض کرتے ہیں کہ اکثر فائیو اسٹار ہوٹلوں کے اندرونی کوائف بشمول سوئمنگ پول کو دیکھ کر شداد کا بڑی شدت سے خیال آتا ہے' وہی شداد جس نے ہزارہا سال پہلے اسی روئے زمین پر اپنی خود ساختہ جنت بنوائی تھی۔ جس کا مالک مختار' معمار' نقشہ نویس بالفاظ دیگر نانونویس تن تنہا وہی تھا۔ اس گستاخی کی سزا اسے یہ ملی کہ اپنی تعمیر کردہ جنت میں پہلا قدم دھرتے ہی دھر لیا گیا۔ یعنی واصل جہنم کر دیا گیا۔

ہمارے حساب سے دنیا میں جنت تعمیر کرنے کی فاش غلطی تو خیر اس سے سرزد ہوئی ہی اس سے بڑی غلطی اس سے یہ سرزد ہوئی کہ وہ غلط دور میں پیدا ہو گیا۔ یقین مانئے شداد کو اگر دور حاضر ملا ہوتا تو اسے اپنی حسرت تعمیر اتنی مہنگی نہیں پڑتی بلکہ وہ بھی آج کے بلڈروں، کنٹراکٹروں کی طرح اپنی خود ساختہ و پرداختہ جنت پر فائیو اسٹار کا لیبل لگا کر سماج معاشرے میں ذلیل و خوار ہونے کی بجائے۔ سربلند و سرخرو ہوتا۔!

ان عالیشان ہوٹلوں کی شان و شوکت اور رعب و دبدبے کو دیکھ کر کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ شداد کی صدیوں پرانی جنت کی ناجائز امت آج زمین کے چپے چپے پر پھیل گئی ہے۔

••

محمد اسد اللہ (ناگپور)

چھٹی ہوتی ہے پر نہیں ہوتی

"چھٹی کا مبارک دن کئی نامبارک دنوں کے بعد آتا ہے۔" ہمارا یہ ارشاد ہمارے دوست مبارک علی کے کان میں پڑنا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئے یہ کہتے ہوئے کہ:

"جناب عالی کوئی دن مبارک یا نامبارک نہیں ہوتا۔ مبارک یا نامبارک ہوتے ہیں تو ہم اور آپ یا ہمارے کرتوت سمجھے آپ؟"

ہم اور آپ مبارک اور نامبارک کے الفاظ انھوں نے جس ترتیب سے استعمال کیے تھے اس کے پیش نظر ہمیں اندازہ ہوگیا کہ اس بحث میں آخر ہم ہی منہ کی کھائیں گے کیوں کہ برائے نام ہی وہ بہر حال مبارک تھے اور ہم نامبارک۔

ہم اس بحث کو اس لیے بھی ختم کرنا چاہتے تھے کہ اس دن چھٹی تھی جو بحث کرنے والوں کے لیے بڑا جان لیوا ہوا کرتی ہے۔ ہم نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

"خیر جانے دیجیے۔ یوں ہی سہی کہ چھٹیوں کا دن بہت دنوں بعد آتا ہے۔" کہنے لگے "۔ یہ بھی غلط۔ میرے لیے تو ہر دن چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ لہذا اس کے جلد یا دیر سے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ہم نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہہ دیا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اس پر مبارک علی تپاغ پا ہوکر کہنے لگے،

بھلا یہ کیسے ٹھیک ہے۔ پھر یہ چار چار اتوار مہینے میں کیوں ہوتے ہیں۔ سرکار چھٹیاں کیوں ظاہر کرتی ہے؟"

مجبوراً ہمیں کہنا پڑا کہ حضور! یہ چھٹیاں ان لوگوں کے لیے ظاہر کی جاتی ہیں جو ہفتہ بھر آفس میں کرسیاں توڑتے ہیں۔ خواب خرگوش کے مزے لیتے ہیں اور کئی ہفتوں سے ٹالے گئے کام کو مزید ٹالنے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ کم از کم چھٹی کے دن تو کام کے آدمی بن کر دکھائیں۔ اس لیے ضروری ہیں یہ چھٹیاں

اس پر مبارک علی کا منہ اور ہماری چھیڑی ہوئی نامبارک بحث بند ہوگئی۔

لوگوں کے لیے چھٹی خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ کوئی ہم سے پوچھے کہ چھٹی کیا ہوتی ہے تو ہمارا جواب ہوگا:

" وہ قبرستان جس میں تمام مصروفیات آسودۂ خاک ہوں اور آسودگی خاک نہ ہو، چھٹی کا دن ہوتا ہے۔"

چھٹیاں جنھیں عام طور پر سنڈے یا پبلک ہالی ڈے کہا جاتا ہے صرف انسانوں کو میسّر ہیں۔ فرشتوں کا نظام اس سے عاری ہے۔ چرندوں اور درندوں میں یہ تعطیلات ابھی ڈکلیر نہیں ہوئی ہیں۔ سمندری مخلوقات کو بھی ابھی اس کی ہوا نہیں لگی اور ہوا میں اڑنے والوں نے بھی ابھی اس قدر اونچا اڑنا نہیں سیکھا کہ ایک۔ دن چھٹی منائیں اور نہ ملے تو برا مانیں۔

چھٹی کے دن کیا ہوتا ہے۔ اس دن لوگ آزادی کے ساتھ میٹر گشتی کرنے کے علاوہ اخباروں، ٹی وی، دوستوں اور ان کی نجی زندگیوں میں جھانکتے ہیں۔ اور بیویوں کو اسکوٹروں پر بٹھا کر گھومنے نکلتے ہیں۔ یہ حال تو عام چھٹیوں کا ہے۔ انفرادی چھٹیاں ذرا مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ اس دن ہماری خوشی کا عالم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اس دن ہمیں اپنے سبک بار ہونے اور دوستوں کے کاندھے آپ کے کام سے گراں بار ہونے کی انتقامی خوشی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے انفرادی مسرت، اجتماعی خوشی سے عظیم تر ہے۔

چھٹیوں کے لیے ہمارے ہاں لفظ رخصت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس میں چھٹی کے دن فرصت کی رخصت ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ جن ملازمین کے مقدر میں ڈیوٹی سے لطف اندوز ہونا اور چھٹی کو بھگتنا لکھا ہے ان کے نزدیک چھٹی ان بدنصیب لمحات سے عبارت ہے جنھیں فضول کاموں نے اغوا کرلیا۔ چھٹیاں خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو، مصروفیات میں اضافہ کرنا، ان کا اولین مقصد ہے۔

چھٹی کے دن نہ ٹیبل ہمارے روبرو ہوتا ہے نہ ٹائم سوار رہتا ہے۔ دراصل ہفتہ بھر ہمارا آفس ہمیں ایک گڈریے کی طرح ہانکتا رہتا ہے۔ سنیچر کی شام ہم اس کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر خود گڈریا بن جاتے ہیں۔ اتوار کا دن ایک نرم و نازک سی بھیڑ۔

سوموار کو گڈریے کی لکڑی لوٹا کر ہم پھر ایک سعادت مند بھیڑ کی طرح وقت کی چراگاہ میں چرنے لگتے ہیں۔ دراصل وقت کو اپنی مرضی کے مطابق ہانکنے کا احساس ہی چھٹی ہے۔ چھٹی کے دن ٹائم ٹیبل، آفس کے سخت گیر ہاتھوں سے نکل کر ایک نرم و نازک کبوتر کی طرح ہمارے ہمارے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ ابھی ہم اسے فضا میں اڑانے کا خواب ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ بیوی بچوں، دوستوں، دشمنوں، ملنے جلنے والوں حتیٰ کہ سائیکل کا پنکچر اور جوتے کا تلا درست کرنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر چھینا جھپٹی کے بعد چھٹی کے دن کے بے ڈھنگے ٹائم ٹیبل میں ڈھل جاتا ہے — عام طور پر چھٹیوں کا یہ حشر ہوتا ہے کہ آپ چھٹی Enjoy کرنے کی تمنا میں گھر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سیلنگ کے ایک پنکھے نے تلے سے عہد وفا توڑ دیا ہے۔ شکر ہے نوکر چھٹی رخصت پر ہیں۔ گھر میں آپ کا غم گسار ہے تو بس ایک نل جو آپ کی چھٹی کو برباد ہوتے دیکھ کر آنسو بہا رہا ہے۔ اس پر بیگم یہ حکم صادر کرتی ہیں "اس نل کا [illegible] بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو چھٹی ہے تو اسے بدلوا لیجیے۔ چناں چہ آپ اس نل کو درست کرنے میں جٹ [illegible]

[illegible]

غزلیں

ناظم انصاری مرحوم
(ناگپور)

مجھ کو معتبر و فن پہ معروض بنانے والا
کون ہے تیرے سوا چونا لگانے والا

آج وہ بن گیا سنگیت سکھانے والا
کل تلک تھا جو فقط ڈھول بجانے والا

کیوں بھگانے پہ تلے ہو مجھے اتنی جلدی
کیا مرے بعد کوئی اور ہے آنے والا

لیجئے بن گیا آل انڈیا شاعر وہ بھی
میر و غالب کی غزل گا کے سنانے والا

عبدالصمد جاوید (علامہ گنبد) مرحوم

یہ لیڈر پہ نوازش ہو رہی ہے
سڑے انڈوں کی بارش ہو رہی ہے

سموسے کھا لیئے تھے کل سڑک پر
گلے میں آج خارش ہو رہی ہے

وہ غیروں پر کرم فرما رہے ہیں
ہماری آزمائش ہو رہی ہے

ریاکاری کا آیا ہے زمانہ
محبت کی نمائش ہو رہی ہے

تمنا ہے انھیں عمر خضرؑ کی
ہمیں مرنے کی خواہش ہو رہی ہے

میاں دھتو ہیں گنبد سارے شاعر
خود اپنی ہی ستائش ہو رہی ہے

ہو نہ جائے وہی جس بات سے ڈر لگتا ہے
ضبطِ تولید کی سوغات سے ڈر لگتا ہے

کل پریشان تھے حالات بدلنے کے لیے
آج بدلے ہوئے حالات سے ڈر لگتا ہے

سر پہ آفات و حوادث کا ہے اس درجہ ہجوم
اب تو خوشیوں کے بھی لمحات سے ڈر لگتا ہے

جانے کیا کچھ نئی تہذیب قیامت ڈھائے
ہم کو فیشن کی ہر اک بات سے ڈر لگتا ہے

کر دے غارت نہ کوئی حاتمِ ثانی بن کر
ہم کو الطاف و عنایات سے ڈر لگتا ہے

جانے کس وقت مریدوں کا صفایا کر دیں
پیر صاحب کی کرامات سے ڈر لگتا ہے

ہر طرف جال سیاست کے بچھے ہیں گنبد
رہنماؤں کے مفادات سے ڈر لگتا ہے

امیر مینائی کی غزل پر پیروڈی

فیاض افسوس
(اکولہ)

سوچتا تھا کچھ تو اُس دن کے لیئے
تھا تکلف کس لیئے کن کے لیئے
اَن گنت لیتے تھے کیوں گن کے لیئے
"تُو نے بلبل جب سے دو تنکے لیئے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں اُن کے لیئے"

تیری ہمدردی نے دنیا تنگ کی
ہے کمی ہر تول میں پاسنگ کی
بات ہونی چاہیئے کچھ ڈھنگ کی
"باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کمسن کے لیئے"

دل فریبِ حسن میں جب آگیا
ساری دنیا سے مرا جھگڑا ہوا
حشر لیکن عشق کا اُلٹا ہوا
وہ زمانے بھر کے ہیں میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیئے

چوڑیاں، انگشتری، پازیب، ہار
بڑھ گئیں فرمائشیں جب بے شمار
چڑھ کے میں نے کہہ دیا جانِ بہار
"ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اِس سن کے لیئے"

کھو گئی رنگیں نظاروں میں نظر
شکل بھی دیکھی نہ گھونگھٹ کھول کر
نہ ہوا کچھ، ہوگئی جھٹ سے سحر
"وصل کی شب اور اتنی مختصر؟
دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے

▲▲

فن کار

اُستاد ہے فن کار ہے یہ جان لیا ہے
چالاک ہے کمبخت نے پہچان لیا ہے

صد فخر کہ اس دورِ ترقی میں بشر کو
شیطان نے گھبرا کے گرو مان لیا ہے

ٹمٹماتا دیا

اک نمونہ بن گئی ہستی فنِ تجرید کا
مسکراہٹ تک نہیں آتی خیال و خواب میں

تیری دنیا میں ترے بندے کا ایسا حال ہے
ٹمٹماتا اک دیا اُجڑے ہوئے محراب میں

▲▲

کویت جانے والے شوہر کے اپنی نئی نویلی دلہن کو چند مشورے

مفلس قارونی (محبوب راہی)
بارسی ٹاکلی

یادوں کی قندیل جلانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
کیسی شب عروسی، کیا باجا، بارات اور ڈولی   تم ہو، میں ہوں اور شکستہ یہ چھوٹی سی کھولی
دے نہ سکا میں تمہیں آج تک کوئی ساڑی چولی   دنیا ہے مکار بہت اور تم ہو بے حد بھولی
اس کے جھانسے میں مت آنا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
ڈھیروں دولت کی ہے چاہت تم کو بھی، مجھ کو بھی   خوب چاہیئے عیش و عشرت تم کو بھی مجھ کو بھی
سونے چاندی کی ہے ضرورت تم کو بھی، مجھ کو بھی   بھاتی نہیں کم بخت یہ غربت تم کو بھی مجھ کو بھی
کڑکی کا ہے فقط زمانہ میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
کبھی پکائیں گے ہم زردہ، اور کبھی بریانی   ہوگی آئے دن اپنے گھر یاروں کی مہمانی
ہم بھی بہائیں گے پیسے کو ایسے جیسے پانی   صرف یہی دس پانچ برس کی بات ہے بیگم جانی
روکھی پھیکی اب ہے کھانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
جلد ہی بنوالیں گے ہم اچھا سا ایک فلیٹ   کوئی چیز نہ ہم رکھیں گے اس میں ڈپلیکیٹ
ساز و ساماں اس میں ہوگا بالکل اپٹوڈیٹ   بھیجوں گا جو وی سی آر اور ٹی وی اور کیسیٹ
ان سے اپنا جی بہلانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
ہر سکھ اپنے گھر میں ہوگا، ہر آسائش ہوگی   نئے ڈھنگ سے اپنے نئے گھر کی آرائش ہوگی
نوٹوں کی اپنے آنگن میں گویا بارش ہوگی   قدموں میں ہوگی ہر شے جس کی تم کو خواہش ہوگی
ہر خواہش کو دل میں دبانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک
ہر ذلت سہہ لوں گا ہر دکھ اپنے سر لے لوں گا   دولت پانے کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلوں گا
یہ نہ سمجھنا وہاں بیٹھ کر تاش واش کھیلوں گا   تنہائی کے دکھ تم ہی کیا میں بھی تو جھیلوں گا

(سلسلہ ...)

"سجنا کب آؤ گے گانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک

رو دو جی بھر کر رو دو ! چِلّا چِلّا کر رو دو — گھر ہی کیا ہے سارا محلّہ سر پر اٹھا کر رو دو
کورس میں اپنی سکھیوں کو ساتھ ملا کر رو دو — تحت اللفظ میں رو دو یا سُر تال میں گا کر رو دو
اشک یونہی دن رات بہانا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک

ٹھیک نہیں ہے بھری جوانی میں یوں تنہا رہنا — یوں کرنا ! دو چار برس اپنے میکے جا رہنا
سب سے میل محبت رکھنا سب سے اچھا رہنا — میرا کیا تم جیسا رہنا چاہو ویسا رہنا
اپنے میکے سے لوٹ آنا میرے لوٹ آنے تک
میری باتیں بھول نہ جانا میرے لوٹ آنے تک

۸۸

چوری اور سینہ زوری

— میرے دوست منظور ندیم سیول جج احمد نگر کی ایک نظم کچھ عرصہ قبل "شمع" میں شائع ہوئی۔ کسی نے اُسے "بیسویں صدی" میں اپنے نام سے من وعن شائع کروالیا۔ اسی واقعے کے ردِ عمل میں یہ نظم معرضِ وجود میں آئی ہے۔ (محبوب راہی)

ہائے میرے اک دوست کہ جو فن کار بھی اچھے خاصے ہیں
چھپی چھپائی نظم مری اک صاحب نے ہتھیالی ہے
اردو میں سرقہ کہتے ہیں ہندی میں یہ چوری ہے
میں نے جواباً لکھا "اپنے اس گھاٹے پر صبر کرو
نظم چرائی جس نے شاطر چور نہیں لگتا ہے وہ
چور اگر پکّا ہوتا تو نظم و غزل چُراتا کیوں؟
نظم و غزل بازار میں جن کی مانگ نہیں کچھ بھاؤ نہیں
میر و غالب گھر میں جن کا پوچھنے والا کوئی نہیں
مجھ کو تو اس شخص کی اس حرکت پر تعجب ہوتا ہے
چوری ہی کرنی تھی تو پھر مال و دولت کی کرتا
ٹیکس چراتا، سرکاری دستاویزات چرالیتا
دل کو چُراتا اور مَن چور زمانے بھر میں کہلاتا
جان چُراتا فرض سے اپنے آنکھیں چراتا جنتا سے
اتنی ساری چیزیں جن سے نام بھی ہوتا عزت بھی

آج اُن کا خط آیا ہے وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں
اک پرچے میں نام سے اپنے جوں کی توں چھپوالی ہے
اور اسے چھپوالینا چوری پہ سینہ زوری ہے
سینے پہ پتھر رکھ لو کچھ دل پر اپنے جبر کرو
کسی بڑے مقصد کی خاطر چور نہیں لگتا ہے وہ
اک بیکار سی شئے کی خاطر یوں رسوائی مول لی کیوں
جن کی کوئی قیمت نہیں ہے جن کا کوئی اٹھاؤ نہیں
غزلوں کے انبار ہیں جن کا پوچھنے والا کوئی نہیں
اُس کی نادانی اس کی نیت پر تعجب ہوتا ہے
سونے چاندی، لعل و جواہر، تاج و حکومت کی کرتا
نیندیں چُراتا، خواب چراتا، دن اور رات چرالیتا
کرشن کنہیا ماکھن چور زمانے بھر میں کہلاتا
ووٹ چراتا جنتا کے اور پھر کرتا جنت لے
اور اگر خواہش ہوتی بڑھ جائے تھوڑی شہرت بھی
تو ماہی سے مل کر تھوک میں غزلیں نظمیں لے لیتا
بدلے میں کالی دولت سے تھوڑے پیسے دے دیتا

۸۸

شکیل اعجاز (اکولہ)

(رپورتاژ)

آ، اب لوٹ چلیں

اکولہ سے گوا کے سفر پر روانہ ہوئے تو بنٹی نے مسرور اور اقبال بھائی سے چپکے سے کہا کہ مجھے کولہاپور میں اس حسین لڑکی کی ایک جھلک دیکھنی ہے جس سے اکولہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ تم کسی نہ کسی بہانے ماروتی وین کو وہاں آدھ گھنٹہ کے لیے روکنا۔ اس پر مسرور نے کہا کہ کولہاپور آنے تک چائے پلاتے رہو۔ چائے کے ساتھ اقبال بھائی کہیں ناشتہ کا بھی اصرار کرتے رہے اور لیتے رہے۔ قافلے کے سردار فہیم کو اس بات کا علم نہ تھا۔ انھوں نے چلتی گاڑی میں نقشہ پھیلایا۔ ٹھہرنے اور چلنے کا حساب کتاب کیا۔ بولے ہم کو اکولہ کے بعد اورنگ آباد۔ وہاں سے پونا اور پونا سے سیدھے گوا رکنا ہے۔ راستے میں کولہاپور وغیرہ نہیں رکنا ہے۔ بنٹی نے صورت اتار لی۔ مسرور اور اقبال بھائی اسے کنکھیوں سے دیکھ کر مسرور ہونے لگے۔ ایک دوسرے کو اشارہ کرنے لگے کہ چہرہ ملاحظہ ہو۔ مسرور بولے پانچ روپیے دو تو کولہاپور میں رکنے کا بندوبست کرتا ہوں۔ بنٹی نے دے دیئے۔ پونا میں فہیم نے پھر کہا کہ اب سیدھا گوا چلیں گے No Kolhapur۔ بنٹی نے مسرور کو پانچ روپیے یاد دلائے۔ مسرور نے کہا صبر ——— ذرا صبر۔ اب تم دیکھو کولہاپور میں کیسے میری طبیعت خراب ہوتی ہے۔ وہاں آدھا گھنٹہ ٹھہرنا پڑے گا۔ تب تک تم دیدار کر آنا۔ کولہاپور کی ہوٹل میں چائے خوانی کے لیے گاڑی رکی بنٹی بے چین ہو رہا تھا۔ مسرور اور اقبال بھائی نے اپنی کوشش کر کے دیکھ لی کہ فہیم کو یہاں ایک گھنٹہ رکنے کے لیے راضی کرلیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بنٹی اداس ہو گیا۔ آخر مسرور اور اقبال بھائی نے اس کے کان میں کہا ——— بھاگ جاؤ جلدی سے ——— ادھر ہم نمٹ لیں گے۔ وہ اٹھ کر واقعی بھاگنے لگا۔ فہیم نے پوچھا ——— کدھر؟ مسرور بولے اس کو حاجت محسوس ہو رہی ہے۔

بنٹی نے آٹو رکشہ کیا لڑکی کے گھر پہنچا۔ خوش قسمتی۔ لڑکی گھر ہی پہ تھی۔ کیلے، شکر پارے، نان خطائی، مٹھائیاں بنٹی کے سامنے رکھی گئیں۔ اس نے تھوڑا سا کھایا اس لیے کہ دوستوں کی فکر بھی لگی ہوئی تھی اور دیدارِ یار کی مسرت بھی۔ میزبان چائے کا اصرار کرتے رہے۔ اس نے لیموں شربت کی فرمائش کی۔ دس منٹ کے اندر وہاں سے اٹھ گیا۔

لڑکی دروازے تک آئی۔ مسکرائی۔ دیر تک ۔ دور تک دیکھتی رہی۔ یہاں اس کی اسکول کی ٹیچر ستار صاحب بھی ملے۔ کہا میں بھی ماتھیران پہنچ رہا ہوں وہاں ضرور ملاقات ہوگی۔" آپ اپنی گاڑی کا نمبر دے دیجیے۔ میں اپنی سسرال کا پتہ دیتا ہوں۔ بنٹی نے انھیں لکھ کر دیا۔ اور انھوں نے ماتھیران کا پتہ۔ ان کاغذات کو وہاں دو تین لوگوں نے بھی دیکھا۔ پھر بنٹی نے پتے کا وہ اہم کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ لیکن دوستوں میں پہنچ کر دیکھا کہ گاڑی نمبر کا کاغذ خود اسی کی جیب میں واپس آگیا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ ستار صاحب کی سسرال کا پتہ خود ستار صاحب نے نہایت احتیاط سے اپنی ڈائری میں رکھ لیا تھا کہ گم نہ ہو جائے۔ بنٹی نے واپس آتے ہی دوستوں سے پوچھا کتنا وقت لگ گیا۔ مجھے آنے میں؟ مسرور نے کہا۔ دس منٹ۔ بنٹی واقعی یقین کر رہا تھا کہ فہیم نے گاڑی کی پچھلی نشست سے آواز لگائی کہ پون گھنٹہ لگ گیا پورا۔ تب بنٹی نے معذرت کی اور سفر جاری ہوا۔

گوا پنجی (PANJI) کے ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر مسرور اور میں اگلے دن کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ اقبال بھائی نے بغل کے روم میں ٹھہری ہوئی ایک فیملی سے دوستی کر لی تھی۔ وہاں کی تین بچیاں شادیہ۔ شہناز اور صباحت اقبال بھائی کے ساتھ مل کر اس قدر شور مچا رہی تھیں کہ ہم دونوں ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر بیٹھ کر بھی ایک دوسرے کی آواز سن نہ پا رہے تھے۔ ہلتے ہوئے ہونٹوں سے اندازہ لگا کر جواب دے رہے تھے۔ اس میں اکثر اندازے غلط ہونے کے سبب ہم دو دفعہ ایک دوسرے سے لڑ چکے تھے۔ پریشان ہو کر مسرور نے نقشہ لپیٹ لیا۔ مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل کر ہوٹل کی گیلری میں بیٹھ گئے۔ وہاں بھی ان لوگوں کے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مسرور نے بیرے کو بلایا۔ دو روپیے دیئے کہا روم نمبر ۱۱ میں ایک موٹا آدمی تین چھوٹی بچیوں کے ساتھ شور مچا رہا ہے۔ تم ان کو ڈانٹو کہ شور مت کرو اس کے بعد بیرا ہر آدھے گھنٹہ بعد روم نمبر گیارہ میں آکر سب کو ڈانٹنے لگا۔ مسرور بہت خوش ہوئے۔ دس بجے رات کو جب ہم ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مسرور نے دروازہ کھولا تو وہی بیرا تھا اور ڈانٹنے آیا تھا کہ شور مت کرو۔ فہیم نے کہا رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ زیادہ دیر تک جاگیں گے تو کل سیر کرتے وقت سستی رہے گی۔ اس لیے سو جاؤ۔ سو رہے تھے کہ رات ساڑھے بارہ بجے وہی بیرا آیا اور ڈانٹنے لگا کہ شور مت کرو۔ مسرور بولے یہ بڑا فرماں بردار بیرا ہے۔ اپنی ہوٹل کھولے گا تو اسی کو منیجر بنائے گا۔

اگلے دن ہم لوگ ہوٹل چھوڑ کر تفریح کے لیے روانہ ہونے لگے۔ تب وہ موٹا دوڑا مسرور کی طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈانٹنے اور شور مچانے سے منع کرے، مسرور نے مزید پانچ روپیے دے کر اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ فہیم بولے کام کرانے کی فیس دو روپیے اور کام بند کرانے کی فیس پانچ روپیے۔ اقبال بھائی بولے یہ تو وہی ہوا کہ تھیٹر میں داخلہ مفت ہے لیکن شو کے بعد باہر نکلنے کی فیس دس روپیے۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد پورے سفر میں کسی بیرے کی خدمات مسرور نے حاصل نہیں کیں بلکہ کوئی بیرا ایسے ہی بے خیالی میں ان کے پاس کھڑا ہو جاتا تو یہ اس طرف پیٹھ کر لیتے یا جیب سے رومال نکال کر منہ پھاوڑ لیتے تھے۔

یہاں دوپہر کا کھانا کھلانے میں ہوٹل کے نوکروں نے وقت لگا دیا۔ پروگرام کے مطابق بہت سارے مقامات شام تک دیکھ لینے تھے۔ بہرحال ہم لوگ باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ مسرور نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی آسمان کی طرف کری۔ باقی تین انگلیوں کو انگوٹھے کی گود میں بٹھا دیا۔ سوالیہ نظروں سے فہیم کی طرف دیکھنے لگے۔ فہیم بولے یار تم اتنی دیر کیا کر رہے تھے؟ اب جلدی سے نمٹ کر آؤ۔ اقبال بھائی گاڑی اسٹارٹ کر کے موڑ پہ لے آئے وہاں ٹریفک کانسٹیبل بار بار سیٹیاں بجانے لگا۔ فہیم نے کہا زیادہ سیٹیاں مت بجاؤ۔ اس گاڑی میں سب آدھا ہی آدمی ہیں۔ ہم لوگ بے چین ہونے لگے۔ مسرور کا پتہ نہ تھا۔ ہوٹل اتنی بڑی کہ ڈھونڈیں تو کہاں۔ میں نے کہا بھی کہ دیکھ کر آتا ہوں تو فہیم نے ڈانٹ دیا کہ خاموش بیٹھو۔ تم اگر گم ہو گئے تو ڈھونڈنے میں مسرور سے بھی دگنا وقت لگ جائے گا۔

چھوٹے سے آدمی ہو۔ جلدی نظر نہیں آتے۔ مسرور پورے بیس منٹ بعد آئے۔ گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی لیکن ہم سب ان کو ڈانٹنے لگے۔

فہیم: تم کو وقت کی اہمیت کا بالکل احساس نہیں۔ دوستوں کو ستانے میں بڑا لطف آتا ہے تم کو۔

اقبال بھائی: کوئی دوبئی والا مل گیا ہوگا۔ اپنے قصے اس کو سنا رہے ہوں گے۔ میں سترہ برس دوبئی میں تھا۔

میں: کھڑے ہوں گے کسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے۔

مسرور خاموشی سے ڈانٹ ڈپٹ سنتے رہے پھر بولے، سب کا ڈانٹنا ہو گیا؟

ہم سب نے کہا ہاں۔

مسرور: اصل میں میری پوری نیت تھی کہ تین منٹ کے اندر واپس آجاؤں۔ کاؤنٹر پر میں نے محمات میں منیجر سے پوچھا کہ بیت الخلا کہاں ہے تو اس نے بغل والی گلی کا سرخ دروازہ بتا دیا۔ میں نے دروازہ ڈھکیلا تو وہ اندر سے بند تھا۔ چناں چہ میں اندر والے آدمی کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے اور پانچ منٹ بعد زور زور سے کھڑکھڑا دیا تو دروازہ کھلتے ہی ایک آدمی سر پر کفن سا باندھے ہوئے اور کفن ہی اوڑھے ہوئے۔ ہاتھوں میں گرم گرم توے لیے نمودار ہوا۔ ایک توے میں روغنی روٹی تھی دوسرے میں تلا ہوا انڈا تھا۔ پشت سے مرچ مسالوں کی خوشبو آرہی تھی اور برتن کھڑک رہے تھے۔ میری کالی رنگت دیکھ کر اس نے مجھے گوا کا آدمی سمجھ لیا۔ انگریزی میں پوچھا: What do you want میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ I want BaitulKhala تو وہ ٹھٹھیا گیا غالباً ہیڈ باورچی تھا اور اپنے آپ کو سورما سمجھتا تھا کہ سارے جہاں کا علم رکھتا ہوں۔ لیکن بیت الخلا سن کر سٹی گم ہو گئی۔ کہا: چکن۔ سبزی۔ آلو مٹر۔ رائس، ناٹ بیت الخلا۔"

میں فوراً وہاں سے بھاگا اور در در بھٹکنے کے بعد آخر منزل مراد کو پہنچا۔ اصل میں، میں اپنے وطن کے لحاظ سے سب سے خراب دروازے کھٹکھٹا رہا تھا لیکن یہاں سب سے صاف ستھرا اور خوب صورت دروازہ اسی کا تھا جسے میں نے ڈر کے مارے اس لیے چھوڑ دیا کہ منیجر کے سونے کا کمرہ ہوگا۔ فہیم نے پوچھا لیکن اس ذلیل منیجر نے شروع میں تم کو کچن کا دروازہ کیوں بتا دیا تھا؟

مسرور: عموماً ہیڈ باورچیوں کی منیجروں سے بالکل نہیں بنتی۔ شوہر اور بیویوں کے جھگڑوں کا سبب بھی یہی باورچی خانہ

بھے۔ ہوسکتا ہے منیجر نے اس کو ستانے کے لیے یہ عادت بنالی ہو کہ جب بھی کوئی کام سمجھ میں نہ آئے اسے باورچی کی طرف سرکا دیا جائے۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ یہ کوچا ہے۔ یہاں لوگ اتنی آسان اُردو بھی نہیں سمجھتے۔

فہیم : لیکن تم بھی غضب کی چیز ہو۔ گیا میں جب سے اترے ہیں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم ڈھونڈ کر عربی اور فارسی کے الفاظ بول رہے ہو۔ کل تم نے خود مجھ سے دو تین ایسے الفاظ کہے کہ میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ تم سمجھے میری طبیعت خراب ہے۔ ادھر اکولہ میں' دینی مدارس میں جاتے ہو تو عالموں سے انگریزی میں بات کرتے ہو۔ پچھلے ہفتے مولانا وارث اللہ سے پوچھا نہیں تھا کہ suggestion box کہاں ہے۔ مجھے ناخن تراش چاہیے۔ وہ بیچارے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گئے۔ تب مجھے کہنا پڑا کہ یہ چھوٹی قینچی مانگ رہے ہیں جو آپ کے تکیے کے پاس نظر آ رہی ہے۔ Scissor

مسرور : منیجر ہے بڑا ذلیل۔ مجھے ہیڈ باورچی پر ترس آیا جو کفن میں لپیٹا ہوا تھا۔

اقبال بھائی : ہیڈ باورچی کہاں معصوم ہے۔ کفن میں لپیٹا تھا پھر بھی ایک ہاتھ میں روغنی روٹی دوسرے میں تلا ہوا انڈا لیے گھوم رہا تھا۔ دیکھ لینا جہنم میں جائے گا۔

مسرور : انڈا لے کر؟

فہیم : منیجر کے رویے پر حیرت کی ضرورت نہیں۔ وہ یقیناً اس کو ستانے کے لیے ہر پریشان آدمی کو اس کا پتہ بتاتا ہوگا۔ شکیل نے ہم سے کہا نہ تھا کہ جب وہ ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال میں پڑھتا تھا۔ اور وہاں سے کیرتی نکیتن ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ہوسٹل میں بیسیوں کمرے تھے۔ بیسیوں ضرورتیں تھیں۔ طالب علم ایک دوسرے کے کمروں میں اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں مانگتے گھومتے رہتے تھے۔ انہی دنوں رفیق مرزا اور ڈاکٹر نسیم۔ آئی ساجد میں ان بن ہو گئی۔ رفیق مرزا کے پاس جب بھی کوئی آتا کہ فلاں چیز چاہیے تو وہ ساجد کا پتہ بتا دیتے کہ ابھی ابھی لے گئے ہیں۔ لوگ ساجد سے مانگتے اور جب وہ نفی میں جواب دیتے تو ہر روز کم از کم چار لڑکوں سے ان کا جھگڑا ہوتا۔ جھگڑے اور بحثیں کرتے کرتے وہ اتنے تھک گئے کہ دس روز بعد کمزور ہو کر بخار میں مبتلا ہو گئے۔ تب رفیق مرزا کو چین ملا۔

فہیم کو عادت ہے جہاں جاتے ہیں وہاں کی مشہور چیزیں خود تو خریدتے ہی ہیں۔ دوستوں کو بھی دلا دیتے ہیں۔ رانچی میں چمڑے کے بیگ کی دکان میں گھس گئے۔ پورا ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے ہم لوگوں کی بھوک اتنی چمک رہی تھی کہ دو قدم چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم بیزار ہو کر دکان سے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ فہیم نے آواز دے کر اندر بلایا اور ایک ایک بیگ ... دیا۔ مسرور بولے یار اس بیگ میں روٹیاں بھر کے دے دو۔

رات کو کھانا کھا کر۔ نہا کر۔ گیا کی سڑکوں پر چارپایاں کی تلاش میں نکلے۔ مقصد چہل قدمی بھی تھا۔ مسرور کی عادت ہے کہ جہاں جاتے ہیں مسلم محلوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کتنی آبادی ہے؟ کتنی مسجدیں ہیں؟ کیا بیوپار ہے؟ وغیرہ۔ لیکن سفر میں ان کو زیادہ ترمنہ کی کھانی پڑی کیوں کہ کولھاپور میں مسلمانوں کے محلے کا نام پوچھا تو معلوم ہوا "پاگل چوک"۔ یہاں رانچی میں "ستیاناس" ... اس کے بعد مسرور نے کم از کم دوستوں کے سامنے مسلم محلوں کا نام نہ پوچھا۔

یہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے اس کا نام "روشن منزل" تھا۔ فہیم نے رات ہی اعلان کر دیا تھا کہ صبح جلد نکلنا ہے۔ سردی کے باوصف ہم لوگ جلد جاگے۔ اپنی اپنی باری پر نہانے لگے۔ چار کمروں پر ایک ہی حمام تھا۔ تیار ہو کر روم کا دروازہ بند کر کے نیچے اترنے ہی والے تھے کہ ایک چھوٹی سی گڑیا جیسی خوب صورت بچی حمام کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی کہ جلدی نکلو۔ جلدی نکلو۔ یہ بچی جس کمرے میں ٹھیری ہوئی تھی وہاں کل رات نہایت حسین لڑکیاں ہم دیکھ چکے تھے۔ اچانک ہم تینوں کو کچھ کام یاد آ گیا۔ مسرور نے کہا میں ذرا شرٹ ان کر کے بیلٹ لگا لوں۔ اقبال بھائی بولے، سوٹ کیس قرینے سے لگانا ہے۔ میرے جوتے میں بہت کنکر محسوس ہو رہے ہیں۔ اسے اتار کر صاف کرنا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اپنے اپنے یہ ضروری کام کرتے وقت ہماری نظریں حمام کے دروازے پر تھیں۔ نیچے سے گاڑی کا ہارن ہر منٹ پر فہیم بجا رہے تھے۔ آخر آٹھ منٹ کے بعد خدا خدا کر کے حمام کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ہم اپنے دلوں کو تھام ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور پانچ برس کا ایک دبلا پتلا لڑکا نکل کر بھاگنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خوب ہنستے رہے۔ لیکن گاڑی میں پہنچ کر مسرور یہ قصہ فہیم کو اس طرح سنانے لگے جیسے یہ سب مسرور کی شرارت تھی۔ اقبال بھائی اور مجھے ستانے کے لیے۔

آج رات ہم نے یہ ہوٹل چھوڑ دیا۔ یہ مسلمانوں کا تھا۔ بہت مہنگا تھا۔ اور سہولتوں سے خالی تھا۔ بالکل اسی قسم کا ناخوش گوار احساس بھابلیشور میں بھی ہوا تھا۔ جہاں ایک مسلم ٹرسٹ کا ہوٹل تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے ماحول میں ٹھیریں لیکن روم کا خوب کرایہ، عدم سہولتیں اور خراب رویہ دیکھ کر ہم لوگ اداس ہو جاتے تھے۔ اللہ ہم مسلمانوں کو نیک توفیق دے۔

کل رات اتفاقاً اکولہ کے ایک اور دوست بھی مل گئے۔ وہ بیوی بچوں کے ساتھ سیر پر آئے ہوئے تھے۔ باتوں کے دوران میں نے ان سے کہا جب بھی گوا آتا ہوں صبح چھ بجے سمندر کی سیر ضرور کرتا ہوں۔ کہنے لگے مجھے بھی سمندر کی سیر کا بڑا شوق ہے۔ میں نے کہا بس پھر تو ٹھیک ہے۔ میں کل آپ کی ہوٹل چلا آتا ہوں۔ ساتھ چلیں گے۔ وہ ذرا سنبھل گئے۔ سر کھجانے لگے۔ پھر کہا۔ ایسا کرنا۔ تم ہوٹل تک چلے آنا۔ میں نیچے کھڑا دکھائی دیا تو ٹھیک ہے ورنہ آپ اکیلے چلے جانا۔ بعد میں اقبال بھائی مجھ پر سخت ناراض ہوتے بولے ———

اقبال بھائی: یار تم کو اتنی بھی عقل نہیں ہے؟ وہ شادی شدہ آدمی ——— اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ سردیوں کے دن ہیں۔ اتنی صبح وہ کیسے تیار ہو کے نیچے آ سکتا ہے ——— اس نے سر کھجانا شروع کیا پھر بھی تم سمجھ نہ سکے۔ بے وقوف۔

مسرور: سر کھجانا تو بہت چھوٹا اشارہ ہے۔ وہ استرا لے کر پورے سر کے بال نکال لیتا تب بھی یہ نہ سمجھتے۔

اکولہ میں بیٹھ کر جس وقت ہم نے گوا کا پروگرام ترتیب دیا تھا اس وقت اس وقت ہم بھٹ

خوش ہے کہ ایلورہ اجنتا کی غاریں اور مورتیاں دیکھیں گے۔ مہابلیشور کی خوب صورت تاریخی پہاڑیاں دیکھیں گے اور گوا کے ساحل سمندر دیکھیں گے جہاں دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور اب دس دن بعد جب کہ ہم اکولہ واپسی سفر پر نکلے ہیں دل خوشی سے لبریز ہیں۔ جیسے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ لیکن منی آج اتنا خوش ہے جتنا سفر شروع کرتے وقت بھی نہیں تھا۔ وہ اجنتا میں غاریں دیکھ کر پریشان ہوا۔ کہتا ہے مہابلیشور میں ہر طرف پہاڑیوں کے سوا کیا تھا اور گوا میں ہر طرف سمندر کے سوا کیا تھا۔ اپنا اکولہ اچھا ہے وہاں نہ غاریں نہ مورتیاں۔ مہابلیشور کی پہاڑیاں ہیں نہ گوا کے ساحل سمندر۔ وہ زیادہ تر مکیش کے گانے سنتا رہا۔ خاص طور سے جس دیش میں گنگا بہتی ہے کا یہ گانا ـــــ

لاکھ لبھائیں محل پرائے ـــــ اپنا گھر پھر اپنا گھر ہے ـــــ آ، اب لوٹ چلیں۔

تضمین بر غزلِ غالب

فصیح اللہ خاں نقیب
(اکولہ)

لگا کر چلم کا جو دم دیکھتے ہیں　　نظر جو نہ آئے وہ ہم دیکھتے ہیں
کہ سوکھے ہوئے کو بھی نم دیکھتے ہیں　　"جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
"خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

عجب ہے درازیٔ قامت کا عالم　　تو میٹر امیتابھ بچن ہے اک سم
وہ ہے جزوِ ضربی تو ہے عادِ اعظم　　"ترے سرو قامت سے اک قدِ" آدم"
"قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں"

وہ آئینہ جو خود ہے جذبوں سے عاری　　تمھیں کیا بتلائے گا بیوٹی تمھاری
کبھی خود کو دیکھو نظر سے ہماری　　تماشا کرلے محوِ آئینہ داری
"تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں"

مرے درد کو پوچھ بِگ سے بِٹل سے　　حکیموں کے دل سے طبیبوں کے دل سے
مرض کا پتہ لے دواؤں کے بِل سے　　سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
"کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں"

ہے اہلِ کرم کا عجب کیس غالبؔ　　کرم میں ریا کی ہے اب ریس غالب
دکھلاتے ہیں اور بجٹ فیس غالبؔ　　بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
"تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں"

کیسے کہے گا آپ بھلا تو سراب کو　　کیسے بدل سکے گا حقیقت سے خواب کو
گھٹ بڑھ رہے گھٹتے جلتے ہوئے ماہتاب کو　　معلوم ہے ہے ساری کریڈٹ خضاب کو
تو لاکھ سینت سینت کے رکھیو شباب کو
"ہے بعد دوپہر کے زوال آفتاب کو"

بوتل میں جن ہے سر پہ چڑھ کے ہے ناگ　　غیظ و غضب میں کھل کے اُٹھاتی ہے منہ سے جھاگ
پیتے ہیں جو اِسے انھیں کھا جاتی ہے یہ آگ　　دنیا میں تار ہے نہ مٹے وائنگیں کی لاگ
مائی بلی کو، کلموہی خانہ خراب کو
"دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر شراب کو"

(سلسلہ اگلے صفحہ پر)

جو رعب و دبدبہ تھا وہ کب کا اکھڑ گیا
نٹ بولٹ ڈھیلے ہوگئے چیسیں بگڑ گیا
وہ نوجواں تھا جس کو پہنایا سکرٹ گیا
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

کِس کی نظر لگی ہے تری آب و تاب کو
اے قوم! ہائے کیا ہوا تیرے شباب کو

ہلکٹ حوالدار ہوئے، قُربِ حشر ہے
قزاق شہریار ہوئے قربِ حشر ہے
بچے، بزرگوار ہوئے قربِ حشر ہے
شاہیں، مردہ خوار ہوئے قربِ حشر ہے

ہے ذلتوں کا سامنا عزت مآب کو
گِدھ بھی دِکھانے آنکھ گئے ہیں عقاب کو

تھا چودھویں کی شب میں حسیں چاندنی کا نور
آئی نظر چمکتی ہوئی شئے کہیں پہ دُور
لپکے تھے اس طرف کہ وہ آئینہ ہے ضرور
نکلا چمک رہا تھا کوئی پارک میں حضور

کیسے کروں بیان میں اس تب کو تاب کو
تو کس سا کر رہی تھی زمیں ماہتاب کو

صاحب! تمہارے نام کا جھنڈا بلند ہو
صاحب! تمہیں عوام کی واحد پسند ہو
صاحب! تمہیں تو ایک پَل ارجمند ہو
صاحب! تم اس وطن کے چمن کی شگند ہو

تلنے لگیں گے ایسی سیاست کے باب کو
چمچوں کی فوج کھائے گی عزت مآب کو

۵۵

رفیق شاکر

بڑے خالو

محلے بھر کے لوگوں کو جگاتے ہیں بڑے خالو
بڑی خالہ سے لڑنے پہ جو آتے ہیں بڑے خالو

کوئی بیگن میں تلی بھر رہا ہے ایسے لگتا ہے
جو اپنی نکیرٹی میں نس لگاتے ہیں بڑے خالو

سری دیوی کی کوئی فلم آجائے جو گاؤں میں
جتندر کی طرح ہلڑ مچاتے ہیں بڑے خالو

شلو بیٹنگ ہی چلتی ہے اگر ہو دال دستر پہ
مٹن مل جائے تو بیکسر لگاتے ہیں بڑے خالو

بڑے خالو سے بچوں کو ڈراتی ہیں بڑی خالہ
بڑی خالہ سے بڈھوں کو ڈراتے ہیں بڑے خالہ

وہ ہنستے ہیں تو سولہ دانت کا چوکا چمکتا ہے
بنا کا گیت مالا بن کے آتے ہیں بڑے خالو

جہاں پر دال کسی کی بھی نہیں گلتی کبھی شاکر
وہیں اکثر بیری پائے گلاتے ہیں بڑے خالو

بابو آر کے
(اچلپوری)

میاں گل خام

دنیا کی رنگینی قدرت کے رنگین مناظر کے دم سے ہی قائم نہیں ہے بلکہ کچھ بیکر خاص بھی دنیا کی نیرنگیوں کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ ایسی ہی رنگارنگ صفات سے متصف ہمارے ایک شناسا ہیں جنہیں ایک عالم میاں گل خام کے نام سے جانتا ہے۔ اپنی پیدائش کے متعلق یہ نشر یہ وہ اکثر نشر کرتے آئے ہیں کہ ان کی ولادت باسعادت کی مسرور ساعتوں میں خوشی سے سرشار ہو کر سارے ملک نے چراغاں کیے، مٹھائیاں بانٹیں اور پٹاخے چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال دیوالی کے تہوار کو وہ اپنی سالگرہ سے تعبیر کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ... تو صاحب، عین دیوالی کے دن بغیر منتوں، مرادوں کے یعنی رضا کارانہ طور پر میاں گل خام پیدا ہو گئے۔ اس طرح جس دن ملک میں ہر سو پٹاخے پھوٹ رہے تھے ٹھیک اسی دن ان کے گھر میں ان کے والدین کے قسمت پھوٹ رہے تھے۔ ان کے والدین بچپن میں ہی ان کا ساتھ چھوڑ گئے، یہ کہنا .... تو ان کے والدین کے ساتھ زیادتی ہوگی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میاں گل خام یتیمی اپنے مقدر میں لکھالائے تھے اس لیے چار و ناچار ان کے والدین کو مرتے ہی بنی۔ ورنہ اتنی سرعت سے مرجانے کے دن تو ان کے بھی نہیں تھے۔

ایک مدت سے ان کی زندگی کا معمول یہی ہے کہ ..... دن نکلتے ہی یہ محلے میں ران ڈالتے ہیں، شہر کھنگال لیتے ہیں اور مصافحوں، معانقوں کے مواقع تاکتے ہیں۔ ملاقاتی کے بد مزاج ہونے تک مزاج پرسی کا سلسلہ تانتے ہیں۔ اس اثنا میں اگر کسی بیمار سے ملاقات ہو جائے تو معالجے، تعویذ، گنڈے کے مشورے اگلنے لگتے ہیں اور پھر دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگتے ہیں کہ بیمار شفایاب ہوا تو غسل صحت کا پلاؤ کھائیں گے، ورنہ تقریب چہلم کی بریانی تو کہیں گئی نہیں۔ کھانے سے شدید شغف کے باعث ہی ان کے تعلق سے مشہور ہے کہ ان کی عقل بجائے دماغ کے ان کے پیٹ میں بسا ہی ہے۔ اسی لیے یہ ہر بات بجائے دماغ کے اپنے پیٹ سے سوچنے کے عادی ہیں۔ ایک مدت سے یہ اپنے پیٹ کے ہو کر رہ گئے ہیں اس سلیمان کے پیٹ پر توندکی افتاد آن پڑی ہے۔ ایک عرصے سے انھوں نے جس تن دہی کے ساتھ اپنی توند کی تربیت

کی ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ میاں گل فام شریف النفس اور بے ضرر بھی ہیں۔ ویسے بھی توند بردار لوگ نہایت شریف ہوا ہی کرتے ہیں۔ اور شاید شرافت و آداب اسی توند کی وجہ سے ان کے حصّہ میں آتے ہیں کیوں کہ اتنے تن و توش کو لے کر شرارت کرنا ذرا محال ہوا کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے یا ایسے لوگ ہلکے پیٹ کے ہوتے ہیں۔ کوئی چیز اپنے پیٹ میں نہیں پچاتے، یہ جو بھی چیز کھاتے ہیں اس کی نشانی اپنی توند پہ چھوڑ جاتے ہیں۔ پان کھائیں تو پان کا پیک ان کی توند پر ٹپکتا ہے۔ مشروب پئیں تو وہ ان کی توند پہ چھلکتا ہے۔ سبزی ترکاری ان کی توند پہ لگی ہے۔ الغرض ان کی توند ان کے معدے کا اسٹاک بورڈ ہوا کرتی ہے۔ خوش خوراکی میں بھی میاں گل نام کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ویسے کھانے کو تو یہ کچھ بھی کھا لیتے ہیں لیکن غذا میں گوشت ان کے معشوق کا درجہ رکھتا ہے۔ لب سڑک کوئی فربہ حلال جانور گزر جائے تو ٹکٹکی باندھ کر یہ مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور ایسے حسین موقعہ پر اگر کوئی مہربان دس بیس چپاتیاں ان کے ہاتھ پر رکھ دے تو یہ جانور کو دیکھ دیکھ کر ساری چپاتیاں چٹ کر جانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ اسی بسیار خوری کے باعث یہ ہر ایرے غیرے سے علیک سلیک کا سلسلہ بنائے رکھتے ہیں تاکہ ہر اچھی بری تقریب طعام میں وہ یاد رکھے جائیں۔ اس کے باوجود بھی صاحب تقریب بھلے ہی انھیں بھول جائے لیکن یہ اسے کبھی نہیں بھولتے اور اپنے رزق سے جا ہی ملتے ہیں۔

ہر روز بازار میں آتے ہی میاں گل فام چوکنّا ہشاش بشاش ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔ اور رزق کی تلاش کے اپنے مشن میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کی دیگ، پلیٹیں، گلاس اور ڈرم کی نقل و حرکت دیکھتے ہی یہ کان کھڑے کیے سامان طعام کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور تقریب گاہ پہنچ کر کھانا کھا ہی لیتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایسا ہی ایک واقعہ ہوا۔ موصوف گھر سے نکل کر بازار کے چوراہے پر کھڑے ہی تھے کہ لوڈ گاڑی پر ایک بڑی سی دیگ محو سفر دکھائی دی۔ یہ دل فریب منظر دیکھتے ہی ان کی آنتیں پیٹ میں بل کھانے لگیں اور زبان دہانوں کے بیچ اٹھکھیلیاں کرنے لگی۔ معدہ کلبلانے لگا، بعد ازاں پیٹ سہلاتے ہوئے دیگ کے پیچھے یہ بھی محو خرام ہو گئے۔ دیگ کی امامت میں مقتدی بنے مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے شہر کے اس کونے سے اس کونے تک گئے۔ چار پانچ کلو میٹر کی مسافت انھوں نے طے کر ڈالی۔ پیر تھکن میں چور ہو گئے۔ بڑی مشکل سے لوڈ گاڑی خدا خدا کر کے ایک در پہ رکی۔ چوں کہ اس جگہ کوئی چہل پہل تھی نہ کوئی ہنگامہ اس لیے میاں گل فام کے اوسان خطا ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیگ گھر کے اندر پہنچا دی گئی۔ اس وقت رندھے ہوئے لہجے میں انھوں نے ماجرا دریافت کیا تو معلوم یہ ہوا کہ دیگ کسی تقریب سے کارکردگی انجام دے کر واپس اپنے مقام پر لوٹی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ بجائے سر کے پیٹ تھام کر بیٹھ گئے اور آئندہ کے لیے دیگ کی اندھی تقلید سے توبہ کر لی۔

مذکورہ خوبیوں کے باوجود ان کی ذات ہمہ صفات میں شاعری کا بھی ایک پخ لگا ہوا ہے۔ یہ مشاعروں میں مدعو ہوں چاہے نہ ہوں مشاعرہ گاہ پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں اور مشاعرہ پڑھ کر سامعین کا۔ شادیوں کا

مصرف ان کے یہاں کرخت آواز میں سہرا پڑھنے اور جم کر کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بیچی بیچی آواز میں لہک لہک کر سہرا گانے کے باعث، مدعوئین تقریب میں بجائے کھانے کے ان پر خار کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔۔۔ اور شاید بے ہنگم آواز میں ان کی سہرا سرائی ہی کا نتیجہ ہے جو آج کل اطراف میں شادی کے دن اکثر دولھے بغیر سہرے لٹکائے نمودار ہونے لگے ہیں۔

سہرے کے تعلق سے موصوف کے اور ہمارے ساتھ بڑا ہی دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک مرتبہ ہمیں اپنے دوستوں کے ہمراہ شادی میں شرکت کرنے کے لیے شہر سے باہر جانا ہی پڑا۔ ہم دوستوں کے ہمراہ بس میں بیٹھے ہی تھے کہ ناگہاں اگلی سیٹ پر میاں گل فام جلوہ افروز نظر آئے۔ علیک سلیک کے بعد معلوم یہ ہوا کہ موصوف اور ہم ایک ہی شادی میں شرکت فرما رہے ہیں۔ خدا کی پناہ! یہ سنتے ہی زمین بس کے نیچے سے سرک گئی۔ ہم نے سہرے کے متعلق دریافت کیا تو بولے، میاں ہم شادی میں جائیں اور سہرا پڑھے بغیر واپس آئیں۔ اس گستاخی کی توقع آپ ہم سے اس جنم میں تو ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ پورے چھتیس اشعار کا قد آدم عالم چھائی سہرا نظم کیا ہے' بولے سناؤں؟ ہم نے کہا حضور یہ تجسس ختم ہو گا کل تقریب میں سہرا مزہ نہ دے گا۔ اس لیے سہرا سرائی کل تک ملتوی رکھیے۔ یہ سن کر وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہم نے حفظانِ سماعت کے پیش نظر انھیں اپنے دوستوں سے گفتگو میں منہمک رکھا اور چپکے سے ان کے بیگ کے اندر سے ستم گر سہرے کا سرقہ کر لیا۔ اس کارروائی کے بعد ہم سب مسرور و شاداں ہوئے کہ چلو جان بچی اچھی بھلی تقریب عقد کا مزہ کرکرا ہونے سے رہ گیا۔ دوسرے دن شادی کی تقریب میں ہم خوشی خوشی شریک ہوئے اور تقریب گاہ میں ان کی اغل بغل میں ہی بیٹھ گئے۔ ہمیں دیکھ کر موصوف کی آنکھیں لال انگارہ کیے یوں گویا ہوئے "بولے برخوردار سہرا چرانے کے بعد تم بہت زیادہ خوش ہوئے ہوگے ہے نا۔

لیکن چینل کے سارے ڈاکو مل کر بھی میرے سہرے پہ ڈاکہ نہیں ڈال سکتے سمجھے، تم سمجھتے ہو میں نے کچی گولیاں کھیلی ہیں" یہ دیکھو، اسی سہرے کی نقل یہاں محفوظ ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے پاجامے کے نیفے کے اندر سے کاغذ کی پرچی نکالی۔ کہنے لگے تمہاری رسائی یہاں بھی ہو جاتی تو کچھ حرج نہ تھا۔ سہرے کی ایک اور نقل یہاں بھی موجود تھی۔ یہ کہہ کر انھوں نے سر کی ٹوپی سر سے اتاری اور اس کی اندرونی دیوار کے اندر سے بھی کاغذ کی پرچی نکالی۔ اس طرح وہ کسی ماہر جادوگر کی طرح اپنے جسم کے مقامات پوشیدہ و ظاہر سے سہرے کی نقلیں برآمد کرتے رہے اور ہم سحر زدہ ہو کر بچوں کی طرح انھیں دیکھتے رہے۔ اور پھر ہوا یہ کہ تقریب عقد میں یہ صاحب سہرا پڑھ ہی گئے اور ہم ان کا منہ تکتے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ○○

۳۴

غزل

شیخ جھنجھٹ اکولوی

حسن کا ہے زور پہ بیوپار تیرے شہر میں ۔۔۔ خود مسیحا بن گئے بیمار تیرے شہر میں
تیر نظریں، بھوں کٹاری، توپ خانہ ہے ادا ۔۔۔ کتنے بے لائسنس ہیں ہتھیار تیرے شہر میں
پوچھتا کوئی نہیں تم کون ہو؟ کیوں آئے ہو؟ ۔۔۔ ہم پڑے ہیں صورتِ بیکار تیرے شہر میں
ہے کہاوت ایڈے بن کر پیڑے کھانا چاہیئے ۔۔۔ ہم ادا کرتے ہیں یہ کردار تیرے شہر میں
لگتا ہے اب چیونٹیوں کے بھی نکل آئے ہیں پَر ۔۔۔ مفلسی بھی کر رہی ہے پیار تیرے شہر میں
یوں تو جھنجھٹ کی ہزل میں کچھ شگفتہ پن نہیں
ہو گئے رنگین یہ اشعار تیرے شہر میں

○

خود کو میں اکثر سمجھ لیتا ہوں ہٹلر رات کو ۔۔۔ جب چڑھا لیتا ہوں یارو ایک بمپر رات کو
ان کو دادا کی کشش لاتی ہے شاید کھینچ کر ۔۔۔ بھنبھنایا کرتے ہیں جو منہ پہ مچھر رات کو
جانِ من کیا تو ہی میرے خواب کی تعبیر ہے ۔۔۔ خواب میں دیکھا تھا میں نے لال ٹکّر رات کو
تھی ہواؤں کی شرارت میں یہ سمجھا نیند میں ۔۔۔ کھٹکھٹاتا ہے میرا دروازہ دلبر رات کو
چاند تارے جھانکتے رہتے ہیں ہر سوراخ سے ۔۔۔ آسماں لگتا ہے میرے گھر کا چھپّر رات کو
بیوی مینیجر ہے میں چپراسی اور بچّے کلرک ۔۔۔ سب اکٹھا ہوتے ہیں بنتا ہے دفتر رات کو
چاہے وہ لیڈر، منسٹر یا کلکٹر ہو جناب ۔۔۔ سامنے عورت کے بن جاتے ہیں نوکر رات کو
ہو گئی جھنجھٹ سے جھنجھٹ واقعی جھنجھٹ ہے وہ
کل ہوئی تھی راستے میں اس سے ٹکّر رات کو

○

ملے نجات مجھے ذیل کی بلاؤں سے ۔۔۔ سکوں حرام ہے بچوں کی کاؤں کاؤں سے
ہے شہر بھر میں ترا حسن ٹارگٹ سب کا ۔۔۔ اُتار دل میں نظر آ تری بلاؤں سے
مری ہزل کو ہضم کر کہ چین آ جائے ۔۔۔ شکم کا درد بڑھاتا ہے کیوں دواؤں سے
سُنا ہے دہلی کو "ریلی" چلی ہے بھانڈوں کی ۔۔۔ ہوئے ہیں جمع سبھی بھانڈ گاؤں گاؤں سے
یہ کم سِنی میں مرا وسعتِ سخن دیکھو ۔۔۔ کہ داد پائی ہے میں نے مرے چچاؤں سے
فدا ہے اس لیے جھنجھٹ بھی آج ٹُن ٹُن پہ
سنے ہیں تذکرے ٹُن ٹُن کے پارساؤں سے

رحمت اللہ خان ملوی (اکولہ)

عمر... تماشہ یا تماشائی

عمر تماشا ہے یا تماشائی؟ یہ سوال اپنی جگہ پر لیکن تجربات شاہد ہیں کہ یہ آدمی کو تماشا بنا دیتی ہے "کشتی عمر کا تماشا بسوں، ریلوں اور سینما گھروں میں اکثر نظر آتا ہے۔ جہاں حسب موقع عمر اچانک گھٹ جاتی ہے یا گھٹا کر بتائی جاتی ہے۔ ریلوں اور بسوں کے قاعدے ہی کچھ ایسے ہیں کہ کبھی تو مسافر بے بس ہو جاتا ہے اور کبھی محکمہ۔ مسافروں کی بے بسی اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ محکمہ کی بے بسی کبھی کبھار لیکن "عمر" کے ہاتھوں محکمہ کی بے بسی قابلِ دید ہوتی ہے۔ بارہ برس سے ۱۵ برس والی عمر کے بچے اچانک چھوٹے ہو کر ۸ یا دس کی حدود میں آ کر آدھے ٹکٹ کے مزے لوٹتے ہیں۔ اور ۵ یا ۶ برس کی عمر اچھل کر ماں باپ کی گود میں براجمان ہو جاتی ہے اور بچے قانونی طور پر فری یا (W.T) کے حق دار بن جاتے ہیں۔ یہ کھیل اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب رنگ ماسٹر (T.C) رنگ میں آتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک کہ رنگ ماسٹر رنگ میں رہتا ہے۔ ادھر (T.C) غائب ادھر "عمر" اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سیٹ پر براجمان...... ایک مرتبہ ایسا ہی دل چسپ منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہمارے ایک ہم سفر نے اپنے ۱۵ سال کے بچے کا آدھا ٹکٹ T.C کے ہاتھ میں تھما دیا۔ T.C بھی گرگِ باراں دیدہ تھا۔ اس نے دونوں باپ بیٹے کو اوپر سے تلے تک کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کی پوری پوری کوشش کر ڈالی مگر وہ بھی شاید "آل پروف" تھے۔ آخر کو T.C نے بڑے ہی ڈپلومیٹک انداز میں گفتگو شروع کی:

ٹی سی: "بیٹے، تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو"؟

بچہ: جی میں! ساتویں جماعت میں!........

T.C: ماشاء اللہ بڑے ہونہار، فرماں بردار اور ہوشیار لگتے ہو۔ اچھا بیٹے یہ بتاؤ کہ تم اپنی تیرھویں سالگرہ کب مناؤ گے؟

بچہ: جی ٹرین سے اترتے ہی۔

بڑا ڈپلومیٹ کون تھا بچہ یا ٹی سی۔ یہ تو ہماری سمجھ میں نہ آسکا۔ لیکن اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑا "عمر کی شاطرانہ چالوں کے آگے عقل بے بس ہے۔ فارسی والوں کی ذہانت کی بھرپور داد دینی پڑتی ہے جنھوں نے یہ مقولہ ایجاد کر رکھا ہے" بزرگی بہ عقل است نہ کہ بہ سال" اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس مقولے کی صداقت پر اسی دن ہم ایمان لے آئے۔ ایسے سینما تھیٹر جہاں عمر پر پابندی ہوتی ہے۔ عمر اپنے ڈبل رول کے ساتھ

جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اور یہ تماشہ حقیقی تماشے سے زیادہ دل چسپ اور دل پذیر بھی ہوتا ہے۔ پانچ یا چھ برس کی عمر کے بچے کو والدین اپنی بغل میں داب کر جب گیٹ کیپر تک پہنچتے ہیں تو بحث و تمحیص کے ہنگامے گرم ہوتے ہیں کہ خوب چیخیں۔ ہر فریق دوسرے سے زیادہ تیز اور بلند آواز میں بولنے کی کوشش کرتا ہے سننے کی کوشش کوئی بھی نہیں کرتا۔ استدلال ہوا استدلال تاریخ پیدائش وزن۔ جسامت کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑے جاتے ہیں۔ صحت سے لے کر قد تک کی پیمائش زبانی طور پر ہو جاتی ہے اور اسی بحث میں گیٹ کیپر کو دھکا دے۔ والدین فراٹے سے اندر اور تھیٹر کی تاریکی میں مدغم۔ گیٹ کیپر بے چارہ ٹٹولتا رہ جاتا ہے۔۔ اہمیت اس کی نہیں کہ جیت کس کی ہوئی؟ اہم بات تو یہ کہ بچہ کی بجائے والدین کا قد معلوم ہو جاتا ہے۔ اچانک عمر کم ہو جانا عجوبہ نہیں رہا۔ یہ تو معمولات زندگی میں شمار ہونے لگا مگر عمر کا اچانک بڑھ جانا حیرت انگیز بھی ہے وقت کی ضرورت بھی کیوں کہ کوئی بھی شخص اپنی بڑھتی ہوئی عمر بتانا پسند نہیں کرتا بلکہ ایسا کرنا فخر کی بات بھی سمجھی نہیں جاتی۔ صرف بچپن میں معصومیت اور بھولا پن ایسا کرواتا ہے۔ بچوں کو اپنے جلدی بڑا ہو کر ممی یا پپا بن جانے کا شوق رہتا ہے۔ اگر ان کی یہ سمجھ میں آ جائے کہ ممی یا پپا بننے میں کتنے جھمیلے ہیں تو شاید وہ بھی اپنی عمر ہمیشہ گھٹا کر ہی بتائیں۔ دوسری قسم کے لوگ جو اپنی "عمر" ذرا بڑھا کر بتا دیتے ہیں وہ تازہ تازہ ایام شباب کی رنگینیوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ کورٹ شپ کے لیے بھی ایسے نوجوان ایک آدھ سال زیادہ ہی بتا دیتے مگر عمر کے اچانک بڑھ جانے کا تماشہ بھی سینما تھیٹر پر دیکھنے میں آتا ہے۔ شہر کے کسی سینما تھیٹر میں "A" سرٹیفکیٹ والی فلم یعنی (only for Adult) لگی ہو تو "ہونہار برواکے چکنے چکنے پات" دیکھنے کے شوق میں بالغ ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے لڑکے اور لڑکیاں بڑے اہتمام کے ساتھ اونچی ایڑی کے 'سینڈل اور جوتے سنبھال کر رکھتے ہیں۔

سیاست کہاں کم اپنا جلوہ نہیں دکھاتی جہاں چہ الیکشن کے مواقع پر ۱۵ ' ۱۶ برس کا لڑکا "بالغ" بنا دیا جاتا ہے ایک نقلی ووٹ سوالاکھ کا "عمر" کی پوری زندگی میں بڑھنے کے حادثات کم ہوتے ہیں اور گھٹانے کے واقعات زیادہ ہیں اور کم عمر بتانا اور محسوس کروانا آج کا فیشن ہے چاہے اس کے لیے لیپا پوتی ہی کیوں نہ کرنی پڑے، مثال مشہور ہے "بندر بوڑھا بھی ہو جائے تو قلابازیاں نہیں بھولتا۔

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

کوئی میرے دل سے پوچھے

ہماری زندگی کے بیش قیمت پندرہ سال کرائے کے مکان میں اس طرح گزرے کہ مالکِ مکان کی صبح و شام جھڑکیاں کھاتے رہے۔ مہمانوں کے سامنے اپنی بے عزتی کو گوارا کرتے رہے اس عذابِ مسلسل کو برداشت کرتے کرتے جب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ کسی طرح روز مرہ کی زندگی سے کاٹ کسر کر کے ایک ذاتی مکان بنایا جائے۔ ایسا مکان جو شہر سے دور کسی ویرانے میں ہو۔ جہاں اپنے قرض کی وصولی کے لئے کوئی نہ پہنچ پائے۔ حالانکہ اب تک ہماری زندگی پُرسکون تھی۔ ہمیں کسی بھی طرح کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی تھی۔ سوائے مالک مکان کے جس نے ہمارے سکون کو غارت کر رکھا تھا۔

ہماری فطرت میں ایک خرابی ہے۔ وہ یہ کہ اگر دل کے کسی گوشے سے کوئی آواز نکلے، یا ہمیں اس کی طرف سے کوئی حکم ملے، تو اسے بجالانا ہم اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ تو آگا دیکھتے ہیں اور نہ ہی پیچھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم بارہا خود کو ذہنی جسمانی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا کر چکے ہیں۔

جوں ہی ہم نے دل کی آواز کو اذانِ مقدس کی طرح بلند آواز میں اپنے حلق سے باہر کیا۔ فوراً ہمارے احباب اور عزیز و اقارب مارے خوشی کے بے حال ہو گئے۔ اس کے برعکس جس ہستی نے ہمارے دل پر پہلی ضرب لگائی۔ وہ تھی ہماری نصف بہتر۔ ہمیں اس طرح حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے ان کے لئے ہم نے کوئی سوتن کا انتظام کر لیا ہو۔ ہم نے اکیلے میں بیگم صاحبہ کے گرے ہوئے تھوبڑے کو اوپر اٹھایا۔ پھر ان کے آلۂ سماعت لگے ہوئے کان میں انتہائی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"بیگم! کرائے کے مکان میں رہ کر ہم لوگ بے عزتی برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ دوستوں اور رشتہ داروں سے کافی قرض لے چکے ہیں۔ جنھیں واپس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم شہر سے دور رہنے لگیں گے، تو کوئی بھی ایرا غیرا ہمارا دروازہ نہیں کھٹکھٹائے گا۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ مالک مکان کو ہم نے دو سال سے کرایہ تک ادا نہیں کیا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ ہمیں اس مکان سے انگریزوں کی طرح بے عزتی سے نکال دے۔ جنھیں ہندوستانیوں نے ہندوستان سے نکالا تھا۔ ہم کیوں نہ خود ہی مکان خالی کر دیں۔

"بیگم کو" ہم نے پٹا ہی لیا۔ اس مہم کو سر کرنے کے بعد ہم نے اپنے ایک دوست کے مکان کے کاغذا
پر ان کے نام سے اور ان ہی کے ذریعہ بنک سے بہت ساری رقم مکان بنانے کے لئے حاصل کر لی۔

مکان کی تعمیر کا کام بہت اعلیٰ پیمانے پر دھوم دھام سے شروع ہوا دور دور سے لوگ افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے۔ قرض کی رقم سے تقریباً بیس فیصد اس تقریب میں صرف ہوئے۔ پھر مکان بننا شروع ہوا۔ تعمیر میں ہمارے سبھی احباب پیش پیش رہے وہ جو مشورے دیتے رہے۔ ان سے قرض لئے ہوئے روپیوں کی نیا ڈانواڈول ہونے لگی۔ توڑ پھوڑ کی کاروائیاں ہوتی رہیں۔ اور ہم پیسے لگاتے رہے۔ جی چاہتا تھا کہ دیوار اٹھانے کے لئے جو گڑھے کھودے جا رہے ہیں ان میں ہمارے احباب کو بھی ڈال دیں تاکہ ان کے مشوروں سے نجات تو ملے۔

خدا خدا کر کے کسی طرح مکان تیار ہو گیا۔ ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اب ہم زمین اکڑ کر چلنے لگے۔ بیگم خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ وہ بالکل ترو تازہ لگ رہی تھیں۔ اس کے برعکس مکان کی تعمیر کی نگرانی میں ہم دن دن بھر دھوپ میں کھڑے ہو کر یوں ہو گئے تھے جیسے ابھی ابھی کولتار کے ڈرم سے نکالے گئے ہوں۔

مکان کے اندر قدم رکھنے کی ایک رسم ہمارے بزرگوں سے چلی آ رہی ہے۔ اسے "گھر بھوج" کہتے ہیں۔ گویا مکان بنانے والے نے مکان بنا کر زمین پر ایک بوجھ کا اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا اس کا کفارہ ادا کرنے کیلئے لنگر چڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ لوگ آئیں اور اس کی بربادی کا تماشہ دیکھیں۔

اب مکان کی نمائش بھی ضروری تھی۔ ہم نے اپنے دل کی آواز کے برخلاف "یہ رسم ادا کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور شہر میں اپنی دھاک جمانے کے لئے اپنی بساط سے باہر دعوت کا اہتمام و انتظام کیا۔ دعوت نامے اندازے سے زیادہ تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ کچھ لوگ کھانے سے محروم ہو گئے۔ مدعو احباب بجائے شرمندہ ہونے کے ہم پر برس پڑے اور ہمارا مذاق اڑانے لگے۔ اس وقت ہمارے دل پر جو گذر رہی تھی اسے سوائے خدا کے اور کوئی جاننے والا نہ تھا شاید وہ بھی انٹرسٹیڈ نہیں تھا کہ اس سے نجات ملتی۔

گھر بھوج کے بعد سے یکے بعد دیگرے، لوگ ہمارا مکان دیکھنے کیلئے آنے لگے۔ گویا ہم نے مکان نہیں کوئی عجائب گھر کھڑا کر دیا ہو۔ کچھ لوگوں نے تو اپنے بال بچوں سمیت دن بھر وہاں قیام بھی کیا۔ یعنی ہمارے مکا کو پکنک اسپاٹ بنا لیا۔ مکان بننے کے بعد تو بیگم صاحبہ کو جنت ہی مل گئی تھی۔ چنانچہ وہ انتہائی خوش اخلاقی سے ہر کسی سے پیش آ رہی تھیں۔ ہم بھی دل سے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ خاص اس مقصد کے لئے دفتر سے ایک ماہ کی رخصت لے رکھی تھی۔ تاکہ کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ ان کے استقبال کیلئے ہم موجود نہیں تھے۔ ہم نے مہمانوں کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہاں تک کہ اپنی جمع پونجی کے ساتھ بیگم کے زیورات پر بھی ہاتھ صاف کر دیئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے رشتہ داروں کو تسلی نہیں ہوئی اور وہ ہر جگہ ہماری شکایت کرنے لگے۔ لہٰذا ہم نے اکلوتی سائیکل بھی فروخت کر دی اور اپنے مہمانوں کے لئے ہر طرح کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ بفضل خدا اب بھی جاری ہے۔ لیکن ادھر کوئی میرے دل سے پوچھے کہ کیا گذر رہی ہے؟

ہم نے سوچا تھا کہ اب ہمیں کم از کم اتوار کو تنہائی میسر آئے گی۔ لیکن ادھر اتوار کا سورج اپنے مکا

سے نکلا، اُدھر ہمارے مکان کی کال بیل بج اٹھی۔ دروازہ کھلتا ہے تو اپنے کسی عزیز کو اہل و عیال کے ساتھ اپنا مہمان پاتا ہوں۔ خراٹے لیتی ہوئی بیوی کو نیند سے بیدار کرنے پر دو چار تلخ باتیں سن لیتا ہوں جو شاید ہمارا پیدائشی حق ہے۔ جلی بھنی بیگم پہلے ہمیں اور ہمارے خاندان کے ہر فرد کو، پھر مہمان اور اس کے خاندان کے ہر بشر کو نت نئی صلواتوں سے نوازتی ہوئی اٹھتی ہے۔ پھر پل بھر میں اپنے چہرے پہ بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرکے مہمانوں کا استقبال کرنے لگتی ہیں۔

گھڑی نے اتوار کی صبح نو بجائے۔ کال بیل بجی، دیکھا تو ہمارے رشتے کے بھائی، اپنے مکمل سامان کے ساتھ دروازے پر اندر آنے کے لئے بے چین ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ ان کی بھابھی صاحبہ نے انھیں مفت کی روٹی توڑنے سے منع فرما دیا ہے اور ہماری چھاتی پر مونگ دَلنے کے لئے بھیج دیا ہے کہ بیٹھا جاؤ! وہ حاتم طائی کی ساتویں اولاد ہے۔

اور اب ہمارے دل نے جبر کے دراز سلسلہ کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا ہے یہی حال رہا تو ڈر ہے کہ بڑے چاؤ سے بنائے ہوئے اس مکان سے ہم نقل مقام ہی نہ کر جائیں۔ ••

صاف صاف

مُنہ پھٹ ناگپوری

جس دن سے آ گئے ہیں وہ میرے پڑوس میں
لگتے ہیں نوجوانوں کے پھیرے پڑوس میں

ناگن کا تذکرہ جو کیا ہم نے ایک دن
آ آ کے بس رہے ہیں سپیرے پڑوس میں

زلفیں ہیں زیبِ دوشِ ہر اک نوجوان کے
حالات ہوگئے ہیں گھنیرے پڑوس میں

معشوق پہ شباب کا آنا غضب ہوا
عشاق نے لگالیے ڈیرے پڑوس میں

وہ جانِ آفتاب سرِ بام آگیا
دربار لگ گیا ہے سویرے پڑوس میں

باہر کے چور اُچکوں سے محفوظ ہوگئے
ہم نے بسا لیے ہیں لٹیرے پڑوس میں

وہ باربر ہے، اُسترا قینچی ہے اس کے پاس
کس کی مجال زلف بکھیرے پڑوس میں

مُنہ پھٹ چلو یہاں سے، شرافت اسی میں ہے
ہوتی ہے روز روز ہی ٹنٹے¹ رے پڑوس میں

¹ لڑائی جھگڑا

غزل

مسعود احمد جھانپڑ
(ناگپور)

اُس کی گلی سے آج گزر جائیں ہم تو کیا
تڑوا کے ہاتھ پاؤں سدھر جائیں ہم تو کیا

گھر میں ہماری بیوی ہی قابو میں جب نہیں
باہر جو سب کے کان کتر جائیں ہم تو کیا

لومڑ کی طرح زندگی اپنی گزار کر
زندہ ہیں ہم تو کیا ہیں جو مر جائیں ہم تو کیا

جب وقت تھا تو بھیڑ کی صورت بنے رہے
بے وقت مثلِ شیر بپھر جائیں ہم تو کیا

پاپوں کے گہرے تال سے اک لاش کی طرح
پھر ڈوبنے کے بعد اُبھر جائیں ہم تو کیا

چندہ یتیم خانے کا کر کر کے رات دن
اپنی بھی جیب مال سے بھر جائیں ہم تو کیا

کرسی ہمارے نام کی ہے کام کی نہیں
بیٹھے رہیں تو کیا جو اُتر جائیں ہم تو کیا

جھانپڑ دکھائی دیتے ہیں تگڑے مزدور ہم
جا کر مقابلے میں پسر جائیں ہم تو کیا

قطعات

صوبیدار خاں فوجی
(جلگاؤں)

خوش ہیں لیڈر ہی اس زمانے میں
نام ہوتا ہے، کام ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے آج کا نادان
صرف لوٹنے سے نام ہوتا ہے

کار والے بھلا یہ کیا جانیں
کتنی آنکھوں میں دھول جاتی ہے
اپنی جنتا ہی بھولی بھالی ہے
پونچھ لیتی ہے بھول جاتی ہے

ایم
سعید احمد خان
اکولہ

موکھے میں سے

خدا بھلا کرے ہمارا کہ بچپن میں ہم خوب نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے تھے اور فلمیں دیکھتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ افطار کے لیے کھجور ہم جیب میں رکھ کر فلمیں دیکھتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ افطار کے لیے کھجور ہم جیب میں رکھ کر گئے اور افطار تھیٹر میں ہوا۔

لیکن جب سے ہم کلرک ہوئے اور کلرکی کرتے کرتے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوئے یعنی اردو زبان میں ایم اے کیا تب سے نجانے کیا ہوا کہ طبیعت میں ایک اچاٹ پن سا آگیا۔ دنیائے فانی کے سارے ہنگامے بے معنی لگنے لگے پھر یہ خلجان اتنا بڑھا کہ ہم بے معنی ہنگاموں میں ہی گم ہو گئے　　اور کچھ رہ گئے تو بس ایک کلرک رہ گئے۔

رمضان شریف میں ہمارے آفس کے ساتھی جب پچ پچ تھوکتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ روزہ دار ہیں۔ تب ہماری اذیت کوشی بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ ہم اس سے معذرت چاہتے ہوئے کہ "آپ تو غالباً روزہ دار ہیں، میں ذرا ٹھنڈا پانی پی کر آتا ہوں" وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔

جن لوگوں کو تھوکنے کی عادت نہیں ہوتی وہ بھی کسی نہ کسی طرح اپنے روزہ دار ہونے کا اظہار کر ہی دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے اکثر ہم کہتے ہیں "اچھا صاحب! چلتے ہیں، ذرا فلاں فلم دیکھ آئیں۔ آپ تو غالباً۔" وہ ہماری طرف نہایت نامعقول انداز میں دیکھتے ہیں اور اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ یعنی غصہ میں بھی یہ بات نہیں بھولتے کہ وہ روزہ دار ہیں۔

اس سال بھی رمضان شریف کچھ یوں ہی بے کیف گزر رہے تھے کہ ہمارا وہی بچپن کا ایک دوست آگیا جس کے ساتھ ہم تھیٹر میں افطار کیا کرتے تھے۔ کہنے لگا،

"منوج کمار کی کلرک لگی ہے۔ سکنڈ شو چلیں گے۔"

ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس بھری دنیا میں کوئی تو ہمارا ہوا۔ میں نے کہا "سکنڈ شو ہی کیوں۔ میٹنی شو کیوں نہیں؟"

"کچھ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں یار"! اس نے شرما کر بتایا۔

"ساڑھے چھ بجے کا شو چلیں ——؟"

روزہ افطار رہتا ہے اس وقت۔" وہ مزید شرما کر بولا پھر یکایک اسے غصہ آگیا۔ کہنے لگا "تم ½۹ بجے کا شو کیوں نہیں چلتے۔ نماز کے نہ روزے کے۔" اب شرمانے کی باری ہماری تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ شام کا کھانا کھاتے ہی مجھے بچوں کی طرح نیند آجاتی ہے۔

بہر حال ہم۔ نے اس رات سکنڈ شو 'کلرک' دیکھی۔ دوسرے دن میں نے آفس میں، اپنے ایک ساتھی سے کہا "اب میں رمضان شریف میں کبھی فلم نہیں دیکھوں گا۔ مجھے سزا مل گئی۔ ایک دو حاسدوں کے قلم رک گئے اور وہ "خر" میری طرف ہمہ تن گوش ہوگئے۔" آخر ہوا کیا؟" میرے روزہ دار ساتھی نے خوش ہوکر پوچھا۔ مجھے سزا یہ ملی کہ مکمل تین گھنٹے فلم 'کلرک' دیکھنی پڑی۔ اسے بیچ میں چھوڑ کر آ نہیں سکتا تھا کہ جس دوست نے میری ٹکٹ نکالی وہ پہلوان بھی ہے۔"

ہمارا اوٹ پٹانگ تبصرہ اس ساتھی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ . . . .

. . . . . . لیکن اگلے دن اس نے بتایا کہ تمھارا تبصرہ اب میری سمجھ میں آیا۔ جب میں نے فلم دیکھی "اللہ کا غضب تم نے اس مہینہ فلم دیکھ لی" اب خوش ہونے کی باری میری تھی۔

میں نے تمھاری طرح ٹکٹ نکال کر کرسیوں پر بیٹھ کر فلم نہیں دیکھی بلکہ جہاں سے فلم پردے پر پھینکی جاتی ہے وہاں موکھے میں سے دیکھی۔

ایک صاحب جو ہماری بات چیت سن رہے تھے ایسے غصے میں بھر گئے جیسے یہ ان کا ذاتی معاملہ رہا ہو کہنے لگے "یار شیخ امیر صاحب آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔ آپ بھی رمضان شریف میں . . . . ."

"یار تھیٹر میں نہیں دیکھا اور بولا نا کہ پوری فلم موکھے میں سے دیکھا۔ اور سزا تو آخر مجھے بھی ملی نا۔ مشین چلانے والا مجھے وہاں بیٹھا کر خود غائب ہوگیا تھا۔ نا بابا اب کبھی رمضان شریف میں فلم نہیں دیکھوں گا۔

موکھے میں سے بھی نہیں۔؟ میں نے حسرت سے پوچھا۔

جواب میں اس نے پیپر ویٹ اٹھالیا اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔

ایس۔ایس علی (اکولہ)

بابو
بھولے بھالے

ڈال آٹے کا بھاؤ معلوم ہونا ایک محاورہ ہے۔ جس شخص کو دال آٹے کا بھاؤ معلوم نہ ہو وہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ خوش نصیب ہوتا ہے کیوں کہ وہ گھر گرہستی کی پریشانیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا جہان کی باتیں کرسکتے ہیں لیکن گھریلو معاملات میں بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خوش نصیب ہمارے دوست بھی ہیں۔ عقل مند ہیں اس لیے ساری فکروں اور پریشانیوں کو رنگوں میں گھول کر مصوری کرتے ہیں۔ بگڑی ہوئی صورتوں کو "تصویر بتاں" میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں لیکن اکثر شیونگ کرنا بھول جاتے ہیں۔ بے شمار لوگ انھیں جانتے ہیں لیکن اکثر وہ لوگوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ دال آٹے کا بھاؤ تو چھوڑیئے وہ خود اپنے "بھاؤ" سے بھی آگاہ نہیں۔ کسی محفل میں اگر انھیں تپاک سے بلایا جاتا ہے تو دائیں، بائیں، اور آگے پیچھے دیکھنے لگتے ہیں کہ آخر کسے اتنے تپاک سے بلایا جارہا ہے۔ لاپروائی کا عالم یہ کہ کتابیں اور رسالے خرید کر لائیں گے اور پڑھنے سے پہلے ہی کسی وزیر کو دے کر بھول جائیں گے۔ چلیے یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ان کا یہ بھولپن two way نہیں بلکہ one way ہوتا ہے۔ جب سے ہمارے کچھ نایاب آڈیو کیسٹ اور رسالے ان کی نسیان کا جز بنے ٹھہرے، ہم نے ان سے "لین دین" کے جزو ثانی سے دست برداری میں عافیت سمجھی۔ اور آج تک فائدے میں ہیں۔ آپ ریڈیائی اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں۔ لیکن کون سا مضمون کس رسالے یا اخبار کو بھیجا یہ یاد نہیں رہتا۔ کبھی کبھار ہم جیسے شبہ جینتک تکلیف اٹھا کر انھیں اطلاع دیتے ہیں کہ "یار آپ کا فلاں مضمون فلاں رسالے میں چھپا ہے۔" تو کمال حیرت اور خوشی سے کہتے ہیں "اچھا؟ کمال ہے یار! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر آپ نے دیکھ لیا ہے نا اچھی طرح؟ ذرا ایک نظر ہمیں دکھائیے گا۔" گویا مضمون ان کا نہیں ہمارا شائع ہوا ہو۔

نوکری پیشہ آدمی ہیں بے چارے۔ بے چارے اس لیے کہ پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اپنے کام میں طاق ہیں۔ ان کے پرنسپل کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پے بل پر سائن کرکے جو کچھ ملا جیب میں ڈال کر چل دیتے ہیں۔ انھیں اپنی بنیادی یافت اور گرانی الاونس وغیرہ کا

کوئی علم نہیں ہوتا۔ اب آج ہی ہم نے انھیں مبارک باد دے ڈالی کہ بھائی مبارک ہو، یکم جنوری ۱۹۹۴ء سے ۶۰ (ساٹھ) فیصد D.A. ڈیکلیر ہوگیا ہے تو کہنے لگے "یار ہمیں کتنے روپے ملیں گے؟" ہم نے کہا "بھائی یہ تو آپ کی Basic pay پر منحصر ہے۔" کہنے لگے "یہ تو ہمیں نہیں معلوم" اس طرح وہ عام نوکری پیشہ لوگوں کی طرح پریشان نہیں ہوتے کہ آج Basic pay کیا ہے۔ Increment کب اور کتنا ملے گا؟ D.A کتنا ہے۔ اگلا پے کمیشن کب بیٹھے اور نیا Pay Scale کب لاگو ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

ٹائم ٹیبل کی جو نقل ان کو دی جاتی ہے۔ رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ پھر سال بھر اندازے سے پیریڈ لیتے ہیں ان کو یہ معلوم تو نہیں رہتا کہ میرا آف پیریڈ کون سا ہے۔ اور بتائے بھی کون؟ اس لیے ایک پیریڈ لینے کے بعد ساری کلاسوں میں جھانکتے ہیں۔ جہاں کلاس خالی نظر آئی وہاں اپنا پیریڈ سمجھ کر پڑھانے لگتے ہیں۔ اس کلاس کا ٹیچر جب دور سے دیکھ لیتا ہے کہ میری کلاس میں شکیل صاحب چلے گئے تو وہ مسرور ہوکر کینٹین یا ٹیچرس روم کی آرام کرسی کا رخ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی دوسرے صاحب کا پیریڈ لے کر باہر نکلے تو اسکول کے سب سے محترم اور قابل استاد احقر اللہ خان صاحب کو سامنے مسکراتے ہوئے منتظر پایا۔ احقر اللہ خاں صاحب کے ہاتھ میں سگریٹ تھا جسے وہ کچھ چھپا کر پی رہے تھے۔ انھوں نے شکیل صاحب کا ہاتھ پکڑا اور درخت کی چھاؤں میں لے گئے پھر بولے "شکیل صاحب! آپ جونیر کالج کلاس کو Persian کتنے سالوں سے پڑھا رہے ہیں؟"

"یہی کوئی پانچ چھ سال سے"

"جی نہیں آپ نو سال سے پڑھا رہے ہیں" ان کے ساتھی نے تصحیح کی۔

"اچھا تو آپ کو اس کا الاونس ملتا ہوگا؟"

"جی ہاں بالکل ملتا ہے"۔ "کتنا"؟

"ڈیڑھ سو روپے" ان کے ساتھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ کہنے لگے۔

"ارے صاحب آپ کو ایک پیسہ بھی الاونس نہیں ملتا۔ میں ابھی کلرک سے مل کر آرہا ہوں۔ الاونس کے لیے آپ کو کوشش کرنا چاہیے"

ایک دفعہ تو شکیل صاحب نے یعنی ہمارے بابو بھولے بھالے نے...... ارے آپ نے انھیں پہچانا نہیں، جی ہاں یہی اپنے شکیل اعجاز صاحب .... تو انھوں نے ایک بار تو حد ہی کردی ہوا یوں کہ ان کے جونیر کالج میں تنخواہ کے روپیہ میں کچھ خرد برد ہوگئی۔ کیشیر پریشان کہ روپیہ کہاں گیا؟ ہیڈ آفس سے انکوائری آفیسر آگیا۔ اس نے پرنسپل کے کمرے میں عدالت جمائی اور پھر ایک ایک ٹیچر کو باری باری بلا کر جرح کرنے لگا۔ شکیل صاحب کا نمبر بھی آیا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی ان کے ہاتھوں سے کتابیں پھسل پڑیں (اگر ہاتھوں میں طوطے ہوتے تو ضرور اڑ جاتے)

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر آفیسر نے انھیں ہی مجرم سمجھ لیا۔ وہ انھیں ڈانٹنے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ شکیل صاحب بول پڑے "یس سر"۔

"یس سر؟ واٹ ڈو یو مین بائے اٹ؟" آفیسر نے کڑک کر کہا۔

"نو سر..... نو سر..... میرا مطلب ہے نو سر"

" واٹ نوسر؟ تم نے کیشیر سے ڈبل پے منٹ وصول کیا اور اب کہتے ہو نوسر۔ بعد پہلے لیتے وقت اچھا لگا اور اب نوسر، نوسر کرتے ہو۔ کیوں ؟"

.... " یس سر۔ آپ کہتے ہیں تو میں نے لیا ہوگا لیکن جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں لیا سر۔ سوری سر"

آفیسر نے کہا " ہوں، تو یہ بات ہے۔ تمہاری صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اصل مجرم تم ہی ہو۔"

پرنسپل صاحب نے کچھ دیر تو اس کامک سین کا لطف لیا۔ لیکن معاملہ کو ٹریجک موڑ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً بول پڑے :

ٹھہریئے صاحب ! آپ بھی کس گھن چکر کے چکر میں آ گئے۔ ان کو تو صرف اپنے سبجکٹ اور پیریڈ یاد رہتے ہیں۔ تنخواہ وغیرہ کے معاملات میں یہ بالکل زیرو میں زیرو ہیں۔ اچھا شکیل صاحب آپ تشریف لے جایئے۔"

شکیل صاحب پسینے میں نہائے، کچھ جھکائے، کچھ گھبرائے، آفس سے باہر نکلے تو ان کے ساتھیوں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو مجرم پکڑا گیا اور ان کی جان چھوٹی۔

ایک گھنٹہ بعد شکیل صاحب سب کچھ بھلا کر بچوں کو پڑھانے میں مشغول تھے کہ آفیسر ان کی کلاس میں آدھمکا۔

شکیل صاحب پھر سے گھبرانے کی تیاری میں تھے کہ اس نے ان کے کاندھے پر دوستانہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا " معاف کرنا بھائی۔

میں نے تم سے کچھ سخت کہہ دیا تھا۔ اصل مجرم تو خیر ٹریس آؤٹ ہو گیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم کو مجرم سمجھ لیا تھا۔"

" نو سر" شکیل صاحب کے منہ سے نکلا۔

" واٹ نو سر؟ میں نے آپ جیسا شخص آج تک نہیں دیکھا۔"

" یس سر" شکیل صاحب نے آفیسر کی تائید کی اور وہ بے چارہ اپنا سر پیٹتے ہوئے کلاس سے باہر نکل گیا۔

○○

انور احمد قریشی نشتر
(اکولہ)

گانجے کا اثر ۱

ہر گھڑی میرا خلاؤں میں گزر ہوتا ہے
پاؤں دھرتی پہ مگر عرش پہ سر ہوتا ہے
کس قدر گانجے کی پڑیا میں اثر ہوتا ہے

ڈر تھا نظروں کا تصادم نہ بنا دے پاگل
بزمِ جاناں میں گئے شیخ لگا کر گاگل
جیسے موٹر کی حفاظت کو "بفر" ہوتا ہے

وائے قسمت مجھے معشوق ملا ہے بھینگا
ٹیڑھی آنکھوں کا ہر اک تیرِ نظر ہے ترچھا
دل نشانہ ہے مگر چھلنی جگر ہوتا ہے

ناقدِ شعر و سخن ہوں کرو عزت میری
خاکسارانِ ادب کو ہے ضرورت میری
جیسے پنسل کے مٹانے کو ربر ہوتا ہے

بوجھئے آپ بھلا کیا ہے تخلص میرا
نشتر ہو حال اگر "تے" کا اٹھا دیں ڈیرا
نون اور "شین" ہٹا دینے پہ تر ہوتا ہے

گانجے کا اثر ۲

قرضوں کا اک پہاڑ ہے خادم کی جان پر
بیگم کی ہے نگاہ فقط نائیلان پر
آدمی پگار اٹھتر ہے اک پاندان پر
دو بار قرقی آ چکی میرے مکان پر
جوں پھر بھی رینگتی نہیں بیگم کے کان پر

"بٹ" اور "پٹ" کا کیوں ہے تلفظ جدا جدا
"واک" اور "ٹاک" میں نہ کریں "ایل" کو کیوں ادا
"سی ایچ" سے نکلے "چھ" کہیں "کاف" کی صدا
انگلش زبان کیسی نرالی ہے اے خدا
عادی ہو کیسے کوئی بھلا اس زبان پر

(سلسلہ آگے ...)

۱۔ک ۲۔ CH ۳۔ L ۴۔ TALK ۵۔ WALK ۶۔ PUT ۷۔ BUT ۸۔

اسکول میں گیا نہیں تعلیم سے ہوں دُور
"بارہ[1] کھڑی" پہ بھی مجھے حاصل نہیں عبور
حد ہے کہ دستخط کا بھی مجھ کو نہیں شعور
اس پر بھی منتری ہوں میں تعلیم کا حضور
"ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر"

[1] ہندی حروف تہجی

کڑکی کا سخت دَور ہے تنخواہ ہوئی تمام
مہماں بھی آگئے مرا کرنے تمام کام
طعنے بھی سُن کے جانے کا لیتے نہیں ہیں نام
"کل جائیں گے" وہ کہتے ہیں ہنس ہنس کے صبح و شام
لعنت خدا کی ایسے "چپکٹ" میہمان پر

اک وقت تھا کہ میں بھی تھا اک لکھ پتی جناب
صوفے پہ بیٹھ پیتا تھا انگلینڈ کی شراب
چکر میں آ کے سٹّے کے ایسا ہوا خراب
وہ صوفے وہ شراب ہوئے سب خیال و خواب
پیتا ہوں گانجہ بیٹھ کے اب "باردان[2]" پر

معشوق اس صدی کا وَفا سے ہے بے خبر
آہ و فغاں کا اس پہ نہیں ہوتا کچھ اثر
عشاق کے دِلوں پہ نہیں جیب پر نظر
یوں بن سنور کے بام پہ ہوتا ہے جلوہ گر
بیٹھا ہو جیسے کوئی شکاری مچان پر

[2] اناج کا خالی بورا

نشتر ترے رقیب ہوئے جلتے ہیں کباب
پیتے ہیں گھونٹ خون کے کھاتے ہیں پیچ و تاب
باتوں کا تیری اُن کو نہیں سوجھتا جواب
سر جوڑ کے بناتے ہیں منصوبے بے حساب
بیٹھے ہوں جیسے چار چغد اک چٹان پر

ممتاز حسین فہیم

(اکولہ)

شگوفے

(۱) ایک مرتبہ اورنگ زیب عالمگیر نے یہ مصرعہ موزوں کیا اور زیب النسا سے اس پر مصرعہ لگانے کو کہا۔ مصرعہ یہ تھا:

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد

ان کی زبان سے یہ مصرعہ نکلا تھا کہ فوراً ہی اس نے دوسرا مصرعہ یوں لگایا:

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد
کہ چرم گرگ تیغ شیر افگن را سپر باشد

[ترجمہ: (دلیروں کی دلیری مرنے کے بعد زیادہ ہو جاتی ہے کہ بھیڑیئے کی کھال شیروں کو مار گرانے والی تلوار کے آگے ڈھال بن کر آتی ہے۔ (بھیڑیئے کی کھال سے ڈھال بنائی جاتی ہے)]

(۲) اردو کے مشہور شاعر سید انشاءاللہ خان انشا نواب سعادت علی خان والیٔ اودھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ایک دن نواب نے تمام درباری شاعروں کو اس مصرعہ پر فی البدیہہ مصرعہ لگانے کا حکم دیا:

اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ

اور کہا "اگر کوئی اس مصرعے پر مصرعہ نہ لگا سکا تو کسی کی خیر نہیں۔"

تمام شعرا پریشان ہو گئے کہ اس بے تکے مصرعہ پر کیا مصرعہ لگایا جائے۔ لیکن انشا کا دماغ حاضر تھا۔ انھوں نے تھوڑی دیر سوچا اور مصرعہ لگا کر شعر مکمل کر دیا۔ اب پورا شعر یوں ہو گیا تھا:

اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ
لیلیٰ! اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

(۳) شیخ امام بخش ناسخ ایک مشاعرے میں ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا مگر خواجہ حیدر علی آتش اور چند شعرا ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ مزاج پرسی کے بعد کہا "جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا۔" انھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ ناسخ نے فوراً یہ مطلع پڑھا:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چوں کہ نام بھی امام بخش تھا اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔

(۴) مرزا اسداللہ خاں غالب اور مولانا امام شہید میں نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مرزا غالب نے خاص ظریفانہ انداز میں کہا:

"اجی حضرت! یہ تو بتایئے آپ شہید کب سے ہوئے" امام نے برجستہ جواب دیا "جب سے کافر غالب ہوئے"

(۵) ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی اور شیخ امام بخش ناسخ بھی موجود تھے۔ شیخ

صاحب نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت جی ایک مصرعہ کہا ہے دوسرا مصرعہ نہیں ہوتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انھوں نے جواب دیا کہ فرمایئے۔ ناسخ نے مصرعہ پڑھا:

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا

ان کے منہ سے یہ مصرعہ نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرعہ تیار تھا:

تب تو ایک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

اس مصرعہ کا سننا تھا کہ حاضرینِ جلسہ پھڑک اٹھے۔

(۶) ایک بار مرزا خاں داغ دہلوی اجمیر تشریف لے گئے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ان کے شاگرد نواب عبداللہ خاں مطلب نے کہا "استاد آپ جا رہے ہیں جاتے ہوئے اپنی کوئی نشانی تو دیتے جایئے۔

یہ سن کر داغ نے برجستہ کہا:

داغ کیا کم ہے نشانی کا یہی یاد رہے

(۷) ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرے میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی نے یہ مطلع پڑھا:

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

مشاعرے میں بہت داد دی گئی۔ مگر جلال لکھنوی نے تعریف کرنے میں کمی کی اور جب ان کی باری آئی تو یہ شعر پڑھا:

دل میرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

(۸) سید انور حسین آرزو لکھنوی کے شاگرد چوہدری جلیل احمد نے ایک بار یہ مصرع پڑھ کر:

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا

آرزو صاحب سے کہا کہ اس مصرع پر دوسرا مصرع لگ ہی نہیں سکتا کیوں کہ جو کہنا تھا وہ ایک ہی مصرع میں مکمل ہو گیا۔

آرزو صاحب نے قدرے تامل کے بعد یہ کہہ کر بات کی تردید کر دی:

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا
ہاتھ انگڑائی کو لے اٹھے اور میخانہ بنا

(۹) مولانا عبدالماجد سالک کی صدارت میں ہونے والے ایک نعتیہ مشاعرے میں پنڈت ہری چند اختر نے ایک نعت پڑھی جس کی سامعین نے بے حد تعریف کی۔ سالک صاحب نے داد دیتے ہوئے کہا ـــــ "واہ کیا کافر ہے اور کیا انداز ہے"۔

اختر صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"میں وہ کافر ہوں جس پر ناز کرتا ہے مسلمان بھی"

(۱۰) کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری کلام سناتے سناتے چراغ حسن حسرت سے مخاطب ہو کر بولے:

"حسرت صاحب! ملاحظہ فرمایئے مصرعہ عرض کیا ہے"۔

اور حسرت، حفیظ صاحب کا مصرعہ کہنے سے پہلے ہی نہایت بے چارگی سے کہنے لگے ـــــ "فرمایئے حضرت شوق سے فرمایئے! اپنی تو عمر ہی غزلوں کے مصرعے اٹھانے اور مردوں کو کندھا دینے میں گزر گئی ہے"۔

(۱۱) اردو کے مشہور شاعر سلام مچھلی شہری نے ایک بار بہت اداسی کے عالم میں اردو کے نامور شاعر اسرار الحق مجاز سے کہا ـــــ کیا کہیں مجاز صاحب! افسوس کی بات ہے کہ لوگ میری شاعری کو سمجھ ہی نہیں پاتے"۔

انھیں تسلی دیتے ہوئے مجاز بولے۔ "گھبراؤ مت دوست جب میں تمھاری شاعری کو انگریزی میں ترجمہ کروں گا اور پھر کوئی شخص اس کا اردو میں ترجمہ کرے گا تو ہندوستان میں صرف تم ہی اردو کے شاعر نظر آؤ گے"۔

(۱۴) مدحت الاختر کے رفیق کار پروفیسر فاروق جن سے مدحت بہت بے تکلف ہیں۔ ہمیشہ شیروانی زیب تن کیے رہتے ہیں ۔ ایک بار جب کسی نے ان کو تنگ شیروانی میں دیکھا تو مدحت سے کہا۔

"فاروق میاں کی شیروانیاں تنگ ہوگئی ہیں۔"

مدحت نے فوراً کہا:

"نہیں وہ تنگ آگئی ہیں۔"

ہندوستانی پیریسٹروکا
Perestroika



ڈاکٹر محبوب راہی

ودربھ میں طنز و مزاح کی صورتِ حال

زیادہ دن نہیں گزرے جب ثقہ قسم کے ناقدین کرام طنز و ظرافت کو دوسرے درجے کی چیز سمجھ کر اسے منہ لگانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں جہاں اردو شعر و ادب کے دیگر میدانوں میں تخلیق کاروں کی وہ بھیڑ بھاڑ نظر آتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے جبکہ طنز و مزاح والے ایک کونے کھدرے میں دبکے دبکائے اتنے کم کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جائیں مثلاً ..... معاف کیجئے، مثالیں پیش نہیں کر سکوں گا کہ اس کے تمام تر حقوق نقادوں کے نام محفوظ ہیں چنانچہ نقضِ امن کا اندیشہ ہے۔ ویسے بھی اردو شعر و ادب کے ہر صاحبِ نظر قاری پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ ہاں اس حقیقت کا اعتراف غیر مناسب نہ ہوگا کہ ان ادوار میں طنز و مزاح نگاروں کی تعداد قابلِ افسوس حد تک کم ہی سہی لیکن بلحاظ معیار ہر ایک کی قد آوری اور بلند قامتی کا وہ عالم کہ قطب مینار اور ایورسٹ کی بلندیاں ان کے آگے سرنگوں لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں غالباً طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب شمار کرنے کی حوصلہ شکن اور جانبدارانہ روش ہی نے اس میدان میں بیشتر تخلیق کاروں کو پیش قدمی سے باز رکھا یا پھر یہ بھی ممکن ہے ترسیل و ابلاغ کے فقدان کے باعث ان کے نام اور کارنامے گمنامی کے دبیز تہوں تلے دب دبا گئے ہوں۔

بہرحال اس تعلق سے جو کچھ ہوا اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اظہارِ مسرت کرنا مقصود ہے اس طرب انگیز صورتحال پر جو دورِ حاضر میں طنز و مزاح کو ادب کی ایک باوقار صنف تسلیم کئے جانے پر سامنے آئی ہے۔ نگر نگر طنز و مزاح نگاروں کی جے جے کار ہو رہی ہے۔ ہر طرف ان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اور صورتحال بایں جا رسید کہ ناقدین کرام اگر حسبِ روایت ان سے چشم پوشی برتیں تو کور چشم کہلائیں۔ میرے اس اظہارِ حقیقت پر بھی حقیقت پسند قارئین صاد کریں گے کہ حالات کی اس خوشگوار تبدیلی کا تمام تر کریڈٹ زندہ دلانِ حیدرآباد کو جاتا ہے کہ جنھوں نے یہی کوئی پچیس تیس برس پہلے حیدرآباد کے تمام زندہ دلوں کو یکجا کر کے ایک فعال انجمن تشکیل دی۔ خالص طنز و مزاح پر مشتمل ہندو پاک میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ "شگوفہ" جاری کیا۔ جو بالآخر چہار دانگ عالم میں یکتائے روزگار تسلیم کیا گیا۔ طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کو جہاں اب تک کوئی منہ لگانے کو تیار نہ تھا "شگوفہ" کی صورت میں ایک شاندار اور جاندار ذریعۂ ترسیل و ابلاغ میسر آگیا اور اس موضوع پر عالمِ وجود میں آنے والی کم و بیش ہر تخلیق دنیا کے کونے کونے

میں گھر گھر پہونچنے لگی۔ مستزاد زندہ دلان حیدرآباد کی سہ روزہ سالانہ تقریبات' ایسا تزک و احتشام وہ شان و شکوہ کہ سبحان اللہ ہی کہتے بنتی ہے۔ طنز و ظرافت نگاروں کے لئے شگوفہ اور مذکورہ تقریبات آب حیات نہ سہی کم از کم شربت روح افزا کی تاثیر ضرور رکھتی ہیں کہ یہ ان کے نام' شناخت اور مقام و مرتبہ بنانے کا واحد ذریعہ ہیں۔ مختصر یہ کہ زندہ دلان حیدرآباد نے صنف طنز و مزاح کو ایک مقام افتخار و اعتبار عطا کر دیا ہے۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں طنز و ظرافت کے باب میں سب سے پہلے لکھنؤ کا نام آتا ہے کہ اس عہد کا ہر تیسرا ظرافت نگار لکھنوی ہوا کرتا تھا۔ قسام ازل نے لکھنویوں کی وراثت کا حقدار حیدرآبادیوں کو قرار دیا کہ حیدرآباد کی آب و ہوا اور زمین میں یہ بیج خوب پنپتا اور برگ و بار لاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ مملکت طنز و مزاح پر زندہ دلان حیدرآباد حکمرانی کر رہے ہیں۔ لیکن وہ جو کہا ہے کہ رونا رلانا ہر حیوان ناطق کا پیدائشی حق ہے جسے وہ لیکر ہی رہتا ہے بعینہ یہی اصول فطرت ہنسنے ہنسانے کے باب میں بھی جاری و ساری ہے۔ بات بہت دور کی نہیں کروں گا۔ بس یہی پچھلی دو تین دہائیوں میں منعقد ہونے والے آل انڈیا قسم کے مشاعروں اور شگوفہ کے از اول تا حال تمام شماروں پر ایک سرسری نظر ڈالئے اعداد و شمار کی روشنی میں یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئے گی کہ طنز و مزاح کے میدان میں مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے ودربھ کے تخلیق کار زندہ دلان حیدرآباد کے شانہ بشانہ نہیں ان کے پیچھے چلنے والوں میں سر فہرست ضرور ہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں میدان طنز و ظرافت کے شہسوار حضرت یوسف ناظم کی گرانقدر رائے پیش خدمت کر رہا ہوں۔

> "ودربھ نے ادھر مزاح کے میدان میں اتنے ہی کھلاڑی پیدا کئے ہیں جتنے کہ کرناٹک اور کیرالا نے تیز دوڑنے والے۔ شیخ رحمن اکولوی' شکیل اعجاز' سید صفدر' اسد اللہ' حیدر بیابانی' جاہل ناگپوری' شاعروں میں سب سے پہلے ناظم انصاری اور پھر مفلس فاروقی' حیدر بیابانی' اور فیاض افسوس کے نام کون بھول سکتا ہے۔ صرف طنز و مزاح کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ودربھ ایک علحدہ ترقیاتی بورڈ کے مطالبے میں حق بجانب ہے۔" (بابو آر کے کی کتاب "خطا معاف" کے مقدمے سے

دو چار بار مختلف گوشوں سے زندہ دلان ودربھ کے قیام کی سرگوشیاں بھی سنائی دیں لیکن ہمارے ودربھ والے انجمن سازی سے زیادہ انجمن شکنی میں دلچسپی اور مہارت رکھتے ہیں۔ لہٰذا بات آئی گئی ہو کر رہ گئی۔

اس قدرے طول طویل تمہید کے بعد نفس مضمون کی طرف آتا ہوں۔ موضوع اس قدر عمیق و بسیط ہے کہ اگر یونیورسٹی سے ربط ضبط بڑھا کر اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ہتھیائی جا سکتی ہے۔ میں صرف یہاں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں ایک سرسری جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

برسبیل تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ ودربھ سے اکولہ۔ امراوتی۔ بلڈانہ اور ایوت محل ان چار اضلاع پر مشتمل علاقہ 'برار' کبھی سلطنت حیدرآباد کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا جو ٹوٹ کر پہلے وسیع تر مملکت انگلشیہ اور آزادی کے بعد نئی صوبائی تشکیل کے نتیجے میں مہاراشٹرا کی جھولی میں جا گرا۔ لہٰذا برار میں حیدرآبادیت کے اثرات کا مقابلتاً زیادہ پایا جانا امر فطرت ٹھہرا۔ درج ذیل تفصیلات اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

استعجاب انگیز مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ محض یاد داشت کے سہارے ودربھ کے جن اٹھائیس

طنز و مزاح نگاروں کی فہرست میں نے تیار کی ہے ان میں نثر نگاروں کی تعداد شاعروں کے برابر ہے اور کم و بیش سبھی کی تخلیقات شگوفہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ سوال تھا تقدیم و تاخیر کا تو میرے لئے شاعروں کو مقدم رکھنے کا ایک معقول جواز نکل آیا کہ بدبختانہ اتفاق سے اس فہرست میں چار نام ایسے ہیں جو اپنے بیش بہا تخلیقی کارنامے نیز اپنی خوش گوار اور ہنگامہ خیز یادیں ہمارے درمیان چھوڑ کر ملک عدم جا بسے ہیں اور یہ کہ یہ چاروں شاعر تھے۔

۱۔ ان میں سر فہرست مرحوم ناظم انصاری ناگپوری کا نام آتا ہے۔ جنھوں نے مشاعروں کے وسیلے سے وہ قابل رشک شہرت و ناموری حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جب تک زندہ رہے کشمیر سے کنیا کماری اور بنگال تا گجرات شہر شہر نگر نگر ان کے منفرد اشعار، اچھوتے طرز بیان اور پاٹ دار آواز سے گونجتے رہتے۔ اکیلے ناظم انصاری کی شمولیت کسی بھی بڑے سے بڑے مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ گوبھی کے پھول ان کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے جو ان کی زندگی ہی میں منظر عام پر آچکا تھا۔ ناظم انصاری کے ہزاروں اشعار آج بھی کئی لوگوں کو ازبر ہیں مثلاً شعر

وہ ہیں شوخ و چنچل وغیرہ وغیرہ
میں بیمار مریل وغیرہ وغیرہ

۲۔ عبدالصمد جاوید (مرحوم) نظم و نثر میں یکساں مہارت، مخصوص تنقیدی بصیرت کے مالک۔ اکولہ سے ہفتہ وار "ہم لوگ" عرصے تک نکالتے رہے اور اسی میں اپنا تمام اثاثہ مفت خور اردو والوں پر لٹا کر روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں ملازمت کرلی۔ علامہ گنبد کے نام سے انقلاب کے اندرونی صفحہ پر روزانہ ان کی ایک ہزل شائع ہوتی جس کا ہر شعر تازہ ترین سیاسی و سماجی واقعات کا ایک دلچسپ مرقع ہوتا۔ صدائے گنبد کی شکل میں اپنا شعری اثاثہ اور مسعود جاوید کی صورت میں اپنا سعادت مند بیٹا اپنے چاہنے والوں کے درمیان چھوڑ گئے ہیں "رہنمائے دکن" حیدرآباد کے دو برس مدیر رہے۔ شعر

حیدرآباد سے گنبد کا تعلق ہے ضرور
بے سبب تو نہیں کھاتا ہے کھٹائی آخر

۳۔ نواب سرخاب اکولوی: نواب بیزار کے نام سے ہزل گوئی اور سرخاب کی حیثیت سے مزاحیہ شاعری فرماتے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے دونوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ شعر سنانے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ غضب کا انداز مزاحیہ اشعار سناتے اور اس پر وقار متانت کے ساتھ کہ بس۔ ایک قطعہ یاد آرہا ہے شعر

لیاقت ہماری یہیں کہہ رہی تھی کہ تم زندگی بھر حجامت کروگے
مگر فضل اللہ یہ کہہ رہا تھا کہ حجامت نہیں تم صدارت کروگے

قابل ذکر بات یہ کہ سرخاب مرحوم نے یہ قطعہ مسند صدارت سے بطور خطبۂ صدارت پیش فرمایا تھا۔

۴۔ نایاب اکولوی: زین العابدین نام۔ نایاب تخلص۔ سرخاب مرحوم کے برادر خورد۔ ابھی ابھی سال بھر پہلے شہر بھر میں آئے دن شعری نشستوں اور مشاعروں کے ذریعہ ہنگامے جگانے والے نایاب خود آغوش لحد میں جا سوئے اور اسم بامسمیٰ نایاب ہو گئے۔ سنانے کا انداز بڑا دبنگ ہوتا

اور ویسے ہی ان کی شاعری بھی۔ ملاحظہ کیجئے ؎

غیروں سے تو گھبرانا، اپنوں پہ غرّانا
یہ ہمت مردانہ، لاحول وَلا قوت

۵۔ فیاض افسوس : اس میدان کے باقیات الصالحات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مشاعروں کے وسیلے سے ہندوستان کا طول و عرض ناپتے رہتے ہیں۔ گرجدار آواز اور پروقار سنجیدگی کے ساتھ سماج کے ادبڑ کھابڑ مسائل بالخصوص سیاست بزاں کے طنز لطیف کی کراری چوٹیں سامعین کو لوٹ پوٹ کردیتی ہیں۔ مجموعہ کلام "کفِ افسوس" شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کرچکا ہے۔ "شگوفہ" میں اکثر چھپتے رہتے ہیں۔

۶۔ فنی ایوت علی : برسوں سے لکھ بھی رہے ہیں اور چھپ بھی رہے ہیں مشاعروں میں گلہائے کامرانی سے دامن بھر کر اکثر خالی جیب گھر لوٹتے ہیں۔ شگوفہ کے صفحات پر بھی جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔

۷۔ لقب عمران : عبدالحفیظ نام۔ خلش تسکینی اس قلمی نام سے سنجیدہ شاعری کرتے ہیں۔ زود گوئی کے لئے خاصے مشہور ہیں۔ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شگوفہ کے قارئین کے لئے لقب عمران اچلپوری خاصا جانا پہچانا نام ہے۔

۸۔ فوجی جلگانوی : مقامی بولی کی آویزش سے خالص براری لہجے میں مزاحیہ اشعار سناکر مشاعرہ لوٹنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ؎

فلک کا کھلا کا کھلا رہ گیا منہ
کئی بجلیاں کھا گیا آشیانہ

۹ - ۱۰ - کم و بیش یہی پوزیشن حسین خاں جنجھٹ اکولوی کی بھی ہے۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے اپنی ہزلوں کا ایک مجموعہ "اڑان پٹو" منظر عام پر لاکر ثواب دارین کے مستحق ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ غنی اعجاز اکولوی : سنجیدہ شاعری میں ایک منفرد اور باوقار حیثیت کے مالک ہیں۔ ہندوستان کے کم و بیش تمام معیاری ادبی جرائد میں مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مجموعہ غزلیات "دشتِ آرزو" شائع ہو کر ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے مزاحیہ شاعری بھی کر لیتے ہیں۔ شگوفہ میں چھپتے رہتے ہیں۔

۱۲ - ۱۳ - انوار احمد نشتر اور فصیح اللہ نقیب اکولوی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ نشتر کہنہ مشق جبکہ نقیب نسبتاً جونیر ہیں۔ مشاعروں میں اپنی غزلوں نظموں اور گیتوں سے دونوں خوب رنگ جما لیتے ہیں۔ دونوں میں ایک قدر مشترک اور ہے وہ ہے مشاعروں کی نظامت کی خوش سلیقگی۔ ہر دو طنز و مزاح بھی خوب لکھتے ہیں۔ شگوفہ میں چھپتے رہتے ہیں۔

۱۴۔ منہ پھٹ ناگپوری ۔ ناگپور کے کہنہ مشق معروف شاعر، ادیب، سیاستداں اور مہاراشٹر اردو اکادمی جناب

۱۵۔ جلیل ساز : جو اپنے جی کا بخار نکالنے کے طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ شگوفہ میں آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۱۶۔ جھانپڑ ناگپوری : مشاعرے میں پڑھنے کا ان کا اپنا ایک انداز ایک مخصوص اسٹائل ہوتا ہے۔ جو انھیں ہمیشہ سرخرو رکھتا ہے۔ شگوفہ کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔

۱۷۔ جاہل ناگپوری : دودھ بچہ کا ہمہ جہت تخلیق کار، شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق، صحافت ہر میدان میں ہرفن مولا۔ کئی شعری اور نثری کتابوں کا مصنف اور مرتب۔ دودھ بچہ نامہ کے ذریعہ جس نے دودھ بچہ کی صحافت کو ایک نیا موڑ ایک نئی جہت دی۔ عبدالرحیم نشتر کے نام سے پوری اردو دنیا میں معروف۔ تخلیق چاہے نظم ہو یا نثر ہر لفظ اپنے اندر ایک نشتریت لئے ہوئے۔ ساری دنیا سے برہم۔ ہمہ وقت آمادۂ پیکار۔ جب نشترزنی سے جی نہیں بھرتا تو جاہل بنکر شگوفہ کے صفحات پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

۱۸۔ تشکیل اعجاز :۔ دھان پان سے مختی سی شخصیت لیکن اردو دنیا کے لئے بہت بڑا اور بھاری بھرکم نام۔ جتنا اچھا مصور اتنا ہی اچھا طنز و مزاح نگار با اوقات فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ تشکیل اعجاز کی کونسی شخصیت زیادہ مستحکم، اہم جاندار اور پائیدار ہے۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "دراصل" شائع ہو کر شہرت دوام حاصل کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں بحیثیت مرتب دو کتابیں "اوراق مصور" اور "سورج کی تلاش میں" تشکیل اعجاز نے ترتیب دی ہیں۔ ولی دکنی سے محبوب راہی تک ہر دور میں ہر اہم شاعر و ادیب کا اسکیچ تشکیل اعجاز بنا چکے ہیں جنھیں ایک البم کی شکل میں پیش کرنے کے چکر میں ہیں۔ اردو والوں کے لئے یہ بڑی دستاویزی نوعیت کی چیز ہوگی۔

۱۹۔ شیخ رحمن اکولوی : طنز و مزاح میں خاصا معروف نام ہے "بلا عنوان" "الف سے قطب مینار" اور "ناٹ اوٹ" ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں جو باذوق ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ منی افسانوں پر مشتمل "عکس شعور" اور بچوں کے لئے "سنو بچو" اور "سات سمندر پار سے" یہ کتابیں رحمن اکولوی کی فنکارانہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتی اور انھیں ایک ہمہ جہت فنکار ثابت کرتی ہیں۔

۲۰۔ ڈاکٹر سید صفدر :۔ جدید لب و لہجے کے شاعر، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے ایک معتبر اور منفرد نام۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "شاعری اور شیوہ پیغمبری" شائع ہو کر مخصوص معیاری ذوق رکھنے والوں میں پسند کیا گیا ہے۔ شگوفہ میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مضمون "پوسٹ مین" بہت مقبول ہوا ہے۔

۲۱۔ ڈاکٹر طاہر اسد اللہ : انشائیے "بوڑھے کے رول میں" اور مزاحیہ مضامین "پر پرزے" دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ شگوفہ کے ذریعہ اپنی شناخت کو مستحکم کرا چکے ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ انشائیہ نگاری کی بدولت ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مشہور و مقبول ہیں۔

۲۲۔ سعید احمد خاں :۔ تین جاسوسی ناولوں کے مصنف، کئی افسانوں کے خالق۔ شگوفہ میں کئی مزاحیہ مضامین چھپ چکے ہیں۔

۲۳۔ **رفیق شاکر:** شگوفہ میں چھپتے رہتے ہیں۔ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک کتاب "سیکنڈ ہینڈ" شائع ہو چکی ہے شاعری بھی کرتے ہیں۔

۲۴۔ **ایس ایس علی** (بالاپور) اور **آر یو خان مالوی** (پی راجہ) دونوں حضرات اپنے مضامین کے ذریعہ اکثر شگوفہ کے صفحات پر جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں اول الذکر نے انگریزی صحافت اور ثانی الذکر نے تبلیغی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔

۲۵۔ **انصاری اصغر جمیل:** ناگپور کے نوجوان مزاح نگار ہیں شگوفہ کے ساتھ ساتھ دیگر اخبارات و رسائل میں بھی ان کے مضامین بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ناگپور سے ایک مزاحیہ رسالہ "مزاح نامہ" بھی نکالا تھا جو حسب روایت بند ہو چکا ہے۔

۲۶۔ **شکیل شاہجہاں:** ڈرامہ نگاری میں خوب نام کمایا ہے۔ شگوفہ کے لئے مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔

۲۷۔ **بانو سرتاج:** ودربھ کے طنز و مزاح نگاروں میں خاتون اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں اردو سے زیادہ ہندی میں مقبول ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تعلیمی مسائل پر بھی لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ "شگوفہ" والوں کے لئے بانو سرتاج کا نام محتاج تعارف نہیں۔

۲۸۔ **مفلس قادری:** علاقہ ودربھ کا بدنام ترین شخص، شاعری شروع کی تو غزل، نظم، نعت، منقبت، ادب اطفال سب پر ہاتھ صاف کیا۔ ہر اخبار ہر رسالے تک اس کی دسترس۔ غزل کے مجموعے "ثبات" "تردید" "بازیافت"، بچوں کی نظموں کے دو "رنگا رنگ" "زور گل بوٹے" تمام پر پہلے تو مختلف اکادمیوں سے گرانٹ لی۔ پھر انعامات بھی ہتھیا لئے۔ پی ایچ ڈی کی بھی تو مظفر حنفی پر گویا ایک تو کریلا اسی پر نیم چڑھا۔ پھر اس ضخیم مقالے کو فخر الدین علی احمد کمیٹی سے ایک خطیر رقم چھین کر چھپوا بھی لیا اور مہاراشٹرا اردو اکادمی سے انعام بھی اچک لیا۔ مزید یہ کہ دلی پہنچ کر راشٹرپتی سے نیشنل ایوارڈ بھی حاصل کر لیا۔ مزید برآں مہاراشٹرا اردو اکادمی کا رکن بھی بن بیٹھا ہے۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے مفلس قادری کا مکھوٹا پہن کر شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد کو بھی اپنے دام فریب میں اسیر کر رکھا ہے۔

(یہ مضمون محض یادداشت کے سہارے لکھا گیا ہے یقیناً کچھ نام سہواً چھوٹ گئے ہوں گے۔ راقم الحروف ان سے معذرت خواہ ہے)

●●

پھر ملیں گے ....

(ادارہ)

زیر نظر شمارہ میں ودربھ کے مزاح نگاروں کی تخلیقات پر مشتمل ایک خصوصی گوشہ شریک ہے۔ مہاراشٹرا میں دراصل ودربھ کے علاقہ کو طنز و مزاح کا زرخیز خطہ کہا جا سکتا ہے۔ جہاں طنز و مزاح نگاروں کی ایک نئی کھیپ بھی تیار ہوئی ہے۔ جن میں سے بعض نے خوب نام کمایا اور جن کی تخلیقات اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بعض مزاح نگاروں کی تخلیقات اس شمارہ میں شریک اشاعت نہ ہو سکیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔ ہم مشہور آرٹسٹ اور مزاح نگار برادرم شکیل اعجاز کے ممنون ہیں جن کے تعاون کے بغیر اس شمارہ میں ودربھ پر خصوصی گوشہ شریک کرنا ممکن نہ تھا۔

●●

Dr.BRAOU/Advt.No.14/94 Tel.No:244728

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، روڈ نمبر ۴۶، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵۰۰۰۳۳

مسلسل تعلیمی پروگرام

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار اردو میں ایک کورس کا آغاز

"غذا اور تغذیہ سرٹیفکیٹ پروگرام"

کورس کا مقصد: اس کورس کا آغاز اردو میں پہلی بار عوام کو صحیح غذا اور تغذیہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے کیا جارہا ہے۔ یہ کورس گھریلو کام کاج کرنے والی عورتیں اور ان تمام خواتین اور مردوں کے لیے جو تندرستی اور تغذیہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں از حد مفید ہے۔

مدت: اس کورس کی مدت چھ (۶) ماہ ہے آپ اس کی تکمیل دو سال کے اندر بھی کر سکتے ہیں۔

قابلیت: اس کورس میں داخلہ کے لیے صرف اردو لکھنا اور پڑھنا جاننا ضروری ہے۔ مزید کسی تعلیمی قابلیت کی قید نہیں۔

عمر: اس کورس میں داخلہ کے لیے آپ کی عمر یکم جولائی ۹۴ء کو کم از کم ۲۰ سال کی ہونی چاہیئے۔ زائد عمر کی کوئی قید نہیں۔ اس کورس میں خواتین اور مرد دونوں داخلہ لے سکتے ہیں۔

فیس: -/210 روپے (بشمول رجسٹریشن فیس، نصابی مواد (Course Material) اور امتحان کی فیس)۔
SC/ST طلباء و طالبات کے لیے فیس میں رعایت یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق دی جائے گی۔

تجویز کردہ تعلیمی مراکز: اس کورس کا آغاز مندرجہ ذیل اداروں میں قائم کردہ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے تعلیمی مراکز (Study Centres) میں عارضی طور پر کیا جارہا ہے۔ ان تعلیمی مراکز میں یہ کورس اسی وقت شروع کیا جائے گا جب کہ طلباء کی معقول تعداد داخلہ لے۔ ان تعلیمی مراکز میں اتوار کو صبح ۹ تا دوپہر ۲ بجے کے درمیان کلاسس ہوں گے۔ ان کلاسس کے لیے حاضری ضروری نہیں ہے آپ چاہیں تو اپنے طور پر خود مطالعہ کر سکتے ہیں۔

1) پرنسس شہکار ویمنس ڈگری کالج، پرانی حویلی، حیدرآباد۔ 2) گورنمنٹ سٹی کالج، نزد ہائی کورٹ حیدرآباد۔ 3) گورنمنٹ جونیئر کالج گرلز، نامپلی، حیدرآباد۔ 4) نیو گورنمنٹ ڈگری کالج، مینٹل بستی، خیریت آباد، حیدرآباد۔ 5) ایم۔ ڈی۔ ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج، محبوب نگر۔ 6) آرٹس اینڈ سائنس کالج، صوبے داری، ورنگل۔ 7) گری راجہ گورنمنٹ کالج، نظام آباد۔ 8) ایس۔ آر۔ آر۔ گورنمنٹ کالج، کریم نگر۔ 9) ہندو کالج، گنٹور۔ 10) سلور جوبلی گورنمنٹ ڈگری کالج، کرنول۔ 11) گورنمنٹ کالج، کڑپہ۔ 12) گورنمنٹ کالج، اننت پور۔

نوٹ: ایسے طلبا و طالبات جو مندرجہ بالا تعلیمی مراکز سے دور ہیں یا کسی وجہ سے تعلیمی مراکز میں اتوار کے دن کلاسس حاضر ہونا نہیں چاہتے وہ راست طور پر ڈائرکٹر، اسٹوڈنٹ سروسس برانچ، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، روڈ نمبر ۴۶، جوبلی ہلز، حیدرآباد سے ربط قائم کرسکتے ہیں اور اپنا تعلیمی مواد حاصل کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرنی ہوگی اور نزدیک کے تعلیمی مرکز میں امتحان دینا ہوگا۔

درخواستیں حاصل کرنے کا طریقہ: اس کورس میں داخلہ کے لیے درخواست براہ راست مندرجہ بالا تعلیمی مراکز سے 10/- روپے کی ادائیگی پر حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ تعلیمی مراکز جمعرات کے علاوہ ہر دن دوپہر ۲ بجے تا شام ۶ بجے کھلے رہتے ہیں۔ درخواستیں بذریعہ ڈاک ڈائرکٹر اسٹوڈنٹ سروسس برانچ، سے بھی منگوائی جاسکتی ہیں۔ اس کے لیے آپ 25/- روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ) بنام "رجسٹرار، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد" لے کر ڈائرکٹر، اسٹوڈنٹ سروسس برانچ کو روانہ کریں۔ (فون نمبر 244728 ہے)

یہ ڈیمانڈ ڈرافٹ 24-6-94 کے دن یا بعد کی تاریخ کا ہونا چاہیے۔

درخواستیں فروخت کرنے کی تاریخ کا آغاز: 24-6-94 ،

درخواستیں داخل کرنے کی آخری تاریخ: 24-7-94 ، کورس کا آغاز: 21-8-94

رجسٹرار

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۲۷
شمارہ: ۹
ستمبر ۱۹۹۴ء

طباعت: دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد

فی پرچہ: ۸ روپے
زرِ سالانہ: ۸۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ:
۳۱- [illegible] کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون: 595716 - رہائش: 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

C/825-1-4 سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ - عابد روڈ - حیدرآباد - 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں ۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم۔
غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش اگربتی کارخانہ وغیرہ کے لئے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25٪ کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ما باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی /6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے
خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20٪ کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 4٪ یا 6 سود پہ دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۹۴ء تک 47210 افراد میں 8,52,16000 روپے مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 86,44,81,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 8,10000 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 4,04,68,000 روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 50104 افراد میں 9,55,33,000 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 40,49,49,000 روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔
گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھلائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (13) ہنر سکھلانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائٹنگ، 100 کو لائٹ ڈرائیونگ، 11 افراد کو لیاب ٹیکنیشن، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 5 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیو گرافی، 15 کو فیبریکیشن، 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ، 5 کو ہیرے تراشنا، 6 کو کارپینٹری کی تربیت دی جائے گی۔
گنٹور میں 218، نظام آباد میں 190، افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔ خواہش مند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خان
(منیجنگ ڈائرکٹر)

یوسف ناظم
(بمبئی)

امریکہ میری عینک سے

شکاگو دنیا کے مفروح ترین شہروں میں سے ایک شہر ہے ——— لیکن

شکاگو میں قباحت کیا ہے : اس شہر میں قباحت یہ ہے کہ قابلِ دید مقامات تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شکاگو ہم یہ دیکھنے گئے تھے یا وہ دیکھنے گئے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہم آگرہ جا رہے ہیں یا اورنگ آباد جا رہے ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تاج محل دیکھنے جا رہے ہیں یا ایلورہ اجنتا دیکھنے جا رہے ہیں اور پھر سیاحوں کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ عجوبے ہیں کہاں ——— (ویسے تاج محل کو دنیا کے ۷ عجائبات میں جگہ نہیں ملی ہے اور ایک لحاظ سے یہ ٹھیک ہی ہے۔ تاج محل کی تعمیر اس زمانے میں ہوئی جب تعمیر کے فن میں حسن اور نزاکت کے اظہار کے ذرائع بافراط پیدا ہو چکے تھے یعنی اوزار اور خام مال۔ تعلیم اور عملی تربیت یہ ساری باتیں مہیا تھیں اور تاج محل کو دیکھ کر شاعر کہہ سکتے تھے۔ ؎

چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

لیکن ایلورا اجنتا کے غار جب بنے اس وقت دنیا میں صرف غار تھے اور ان کے علاوہ تھا کیا۔ اس زمانے میں فنِ تعمیر کا ایک محیرالعقول تجربہ پیش کرنا، تاج محل کی تعمیر سے کئی گنا زیادہ مشکل بات تھی۔ لیکن ٹھہریئے ہم کدھر سے کدھر نکل گئے۔ شکاگو جانے والے سیاح (بالعموم) یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم دنیا کی بلند ترین عمارت دیکھنے جا رہے ہیں یا ہم وہاں کے ۲ میوزیم دیکھنے جا رہے ہیں یا۔ اب یہ لمبی فہرست ہے اور اسی فہرست میں "بہائی ٹیمپل" کا نام بھی شامل ہے آدمی شکاگو جائے اور بہائی ٹمپل نہ دیکھے ایسا ہی ہے جیسے آپ کیلا کھانا چاہیں اسے چھیلیں کیلا پھینک دیں اور صرف چھلکا آپ کے ہاتھ میں رہ جائے (اپنی زندگی میں ایک مرتبہ تو آپ نے ایسا کیا ہی ہوگا) اس مقابلے میں ہم نے غلطی نہیں کی اور وہ بہائی ٹمپل؟ یعنی شکاگو کے بہائی ٹمپل کو جو اس براعظم میں اپنی نوعیت کا واحد ٹمپل ہے بچشم خود دیکھا۔ ٹمپل کی عمارت بلند و بالا۔ فنِ تعمیر کی نزاکت تو نہیں لیکن نفاست اس کے در و دیوار سے آشکارا ہے۔ خوبصورت [illegible] صاف شفاف سنگی فرش سرسبز و شاداب کیاریاں، نیلگوں پانی کے حوض۔ ان تمام چیزوں سے مزین اور کشادہ احاطہ اشارہ یہ ہے اس پرسکون اور [illegible] بخش ماحول کا جو عمارت کے اندرونی حصہ میں بہائی معتقدین کو [illegible] ہے۔ عمارت کی [illegible] میں ان تمام بڑے لوگوں کی تصویریں آویزاں ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی موقع پر [illegible] ان بڑے لوگوں میں کئی ملکوں کے صدر اور سربراہ اور [illegible] شہرت کے فنکار اور [illegible]

تمام مذاہب کے پیشوا شامل ہیں۔ کتب خانے میں بہائی عقیدے کی ابتداء اور ارتقا سے متعلق ضخیم کتابیں بھی موجود ہیں اور وہ لٹریچر بھی جو ہاتھوں ہاتھ بک گئے اور یہ ہاتھوں ہاتھ لیا اور خریدا جا رہا تھا۔ عمارت میں زائرین کا استقبال بڑی محبت اور جوش دل کے ساتھ کیا جاتا ہے اور آنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی اجنبی مقام پر نہیں آگئے ہیں بہائی لٹریچر دنیا کی سبھی بڑی زبانوں میں موجود ہے۔ بہائی عبادت گاہیں بھی دنیا کے کئی ملکوں میں تعمیر کی جا چکی ہیں۔ آپ ان کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ ان سب میں بہائی ٹیمپل ہمیں ممتاز اور منفرد دکھائی دیا اور محسوس ہوا کہ یہ عمارت عظیم ملک کے شایان شان ہے۔ عمارت میں نرم قالینوں اور آرام دہ فرنیچر سے دو بڑے بڑے آراستہ آڈیٹوریم اجتماعات کیلئے موجود ہیں اور ٹمپل میں دعائیہ مجلسوں کا سلسلہ سال بھر قائم رہتا ہے۔ زائرین یہاں پہنچ کر اپنی اپنی مرضی کے مطابق دعائیں مانگتے ہیں۔ بہائی عقیدے کے مطابق سارے علم کی بنیاد خالق حقیقی ہے (جو برتر و عظیم ہے) آگاہی ہے اور سارے پیغمبروں نے اپنی تعلیمات میں اسی نظریئے کا اعلان کیا ہے — اور یہ کرہ زمین اپنی اکائی میں ایک ملک ہے اور دنیا کے سارے انسان اس کے شہری ہیں — اس عبادت گاہ سے باہر نکلتے وقت ہمیں اپنی کوتاہی علم کا احساس یوں ہوا کہ ہمیں یہ یاد نہیں آیا کہ دنیا کے سارے ادیان و مذاہب میں سے کیا کسی مذہب کا سورج کسی حویلی کی چار دیواری سے طلوع ہوا تھا؟ — اس عبادت گاہ کے اندرونی وسیع ہال کے خوبصورت اور مدور گنبد کے اندرونی حصے میں عربی کیلی گرافی کا دلفریب نمونہ بھی دیکھنے کو ملا جس میں خدا کی عظمت کا اعتراف اور اعلان ہے۔

(نوٹ :- اس موقع پر احمد خاں ساتھ تھے۔ بحث و مباحثہ انھیں مرغوب ہے اور اپنے نقطہ نظر کی تائید میں کافی جوش کا اظہار کرتے ہیں۔ عزیز قیسی کے بھائی ہیں کیوں نہ کریں)

شکاگو نباتاتی (بوٹانک) گارڈن :-

اسے دیکھ کر ساحر لدھیانوی کا ایک مصرع یاد آگیا (افسوس کہ یہ مصرع ایک فلمی گیت کی نذر ہوگیا) مصرع ہے " تجھے زمیں پہ اتارا گیا ہے میرے لئے " ("ہے میرے لئے" کی جگہ "شکاگو میں" پڑھ لیجئے مصرع وزن سے خارج نہیں ہوگا) مصرع یوں ہوا۔ تجھے زمیں سے اتارا گیا شکاگو میں۔

پھولوں کا مجموعہ جسے گل دستہ کہتے ہیں ہر کسی نے دیکھا ہے بلکہ شاید اس کی خدمت میں پیش بھی کیا گیا ہو۔ لیکن یہ گارڈن باغوں کا مجموعہ ہے اسے آپ "گلستان کدہ" کہہ سکتے ہیں۔ اس دور دور تک پھیلے ہوئے مجموعہ گل و برگ و شجر کا ابواب ہیں۔ (آپ کم سے کم دس مرتبہ یہاں آنا چاہیئے اور اسے قسط وار دیکھنا چاہیئے) یہاں ہم مشہود اور اسلم کے اہل خاندان کے ساتھ گئے تھے۔ مووی کیمرہ ان کے ساتھ تھا۔ کیمرہ بھی تھک سکتا ہے اس دن معلوم ہوا۔ یہاں کار کو ٹھہرانے (پارکنگ) کے لئے خود کافی دیر تک ٹھہرنا پڑتا ہے۔ کوئی ہٹے تو آپ کو جگہ ملے۔ گارڈن میں داخل ہوتے ہی ایک جھیل آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ پانی بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ سکتا ہے یہ اس جھیل کے فوارے سے پتہ چلتا ہے۔

سفید براق موتیوں سے سجی ایک مصفا کی بلند ہونے والی دھاریں یہی منظر پیش کرتی ہیں۔ جھیل کے اطراف گوشہ عافیت (مرغزار) بنے ہوئے ہیں اور آپ کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ آپ کھڑے رہیں تو بیٹھنے کے لئے کرسی فوراً [illegible] یہاں [illegible] آتے ہیں۔ کرسی نشینی کے لئے نہیں آتے [illegible] کرسی کے شوقین [illegible] سے [illegible] کی طرح [illegible] آتے [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] خیر مقدم [illegible] ہے۔

لیکن ہمارا ہی سمجھنے ہے اس گارڈن میں دنیا بھر کے پھول، پودے، شجر سایہ دار تو ہیں ہی لیکن ترکاریاں بھی بہت ہیں اور آپ چاہیں تو ان کے نمونوں کی ایک فیروز اللغات مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم نے یہاں چند ریسرچ اسکالر بھی دیکھے ہیں جو قلم کاغذ اور کیمرے سے مسلح تھے اور مصروف نبرد آزمائی) گارڈن میں موٹر گاڑیاں منع ہیں سائیکلیں جائز ہیں اور ان کا راستہ مقرر۔ پالتو جانوروں کی بھی اجازت نہیں ہے)۔ ہم نے [illegible] صرف چند ابواب پڑھے۔ لیکن جاپانی کے مطالعے کے لئے "دیدہ بینا" چاہیے۔ گلاب کے لئے امریکہ کی مٹی شاید ساز گار نہیں ہے۔ لیکن یہاں گلابی باغ، (یہ روز گارڈن کا صحیح ترجمہ ہے) میں گلابوں کی بہار دیکھی اور جی خوش ہو گیا۔ پھولوں میں وہ رعنائی اور خوشبو نہیں ہے جو چنڈی گڑھ کے ذاکر باغ کے پھولوں میں ہے لیکن تعداد میں پودے زیادہ تھے اور آنکھوں میں سما نہیں سکے۔ گلاب ہماری کمزوری ہے اور اس وقت سے ہے جب ہم نے یہ سنا تھا کہ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا اور پھر بعد میں یہ بھی پڑھا کہ سو جتن ترے عارض کے گلاب اور زیادہ۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جیسے گلاب میں مہک نہ ہو تو وہ گل ہو جاتا ہے اور ہم اس بات کے بھی قائل ہیں کہ گلابوں کی بہار دیکھنی ہو تو اجمیر جانا چاہیے یہاں للی یہاں کا زبردست پھول ہے۔ تیسری بات جس کے ہم قائل ہیں یہ ہے کہ للی کے سفید پھول تزکیہ قلب اور تصفیہ خون کے لئے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ کیتھولک شادیاں ہوں یا سالگرہیں انہی پھولوں کی مرہون منت ہوتی ہیں یہاں کی للی ہمارے گلاب کا مسکت جواب ہے۔ جاپانی گارڈن کو تین جزیروں کا گارڈن مانا جاتا ہے۔ اسے ہم "فردوس نگاہ" کا نام دینا پسند کریں گے۔ رنگ برنگی سنگریزوں کا جگمگاتا حسن اس باغ کے نادر و نایاب پودوں اور پھولوں کی دلآویزی کی حفاظت کرتا ہے اور ناظرین کو یہ جنت نگاہ منظر اس مقام سے ہٹنے نہیں دیتا۔

یہ گارڈن محکمۂ تحفظ جنگلات کی ملکیت ہے اور شکاگو کی ہارٹی کلچر سوسائٹی اس کی اتالیق و نگرانکار ہے۔ خوشی ہوئی کہ جس طرح آداب محفل ہوتے ہیں اسی طرح آداب گلستاں ہوتے ہیں اور یہ بھی مرتب کئے گئے ہیں اور ان آداب کی تفصیل مطبوعہ صورت میں آپ کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ آپ گارڈن میں بستر بچھا کر لیٹ نہیں سکتے۔ جتنے عرصے میں آپ کا لپٹا ہوا بستر کھلے گا۔ اتنی ہی دیر میں بلکہ اس سے پہلے آپ کو اس ہدایت نامہ کی آخری سطر کے مطابق "گلستان بدر" کر دیا جائے گا۔ اس کا خیال رکھیے اور اس باغ میں درختوں پر بھی چڑھنے کی کوشش مت کیجیے درخت تو ٹوٹیں گے ہی آپ خود بھی ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں۔

جس دن ہم یہاں گئے تھے اتفاق سے دو دو لہنیں بھی اپنے دولہوں اور ہمراہیوں اور سہیلیوں کے ساتھ وہاں آئی تھیں انھوں نے ایک باغ میں اپنے ولیمے کا بھی انتظام کیا تھا۔ سنا ہے کہ یہ یہاں ہوتا رہتا ہے اور یہ بھی کہ شادی کی تقاریب میں شریک ہونے والوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ اس موقع کی مناسبت سے اپنے لئے پھولوں و ہم آہنگ کپڑے کرائے پر حاصل کر لیں۔ اس جاپانی گارڈن کے علاوہ یہ دولہنیں بھی ہمیں پسند آئیں۔ نئی نئی کی چادر کھا دینے کو جی چاہا لیکن وہ تو گھری ہوئی تھیں۔ ہم مسکرا کر رہ گئے۔

شکاگو شہر کی دوسری قباحت :-

شکاگو شہر کی ایک قباحت کا ذکر تو آپ پچھلے صفحوں میں پڑھ ہی چکے ہیں لیکن یہاں ایک اور قباحت کا

بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یہ نظر نہ آنے والی قباحت ہے۔ دراصل یہ ایک کیفیت ہے جو یہیں کی پیداوار ہے اور جب باہر سے وزٹ پر آنے والے لوگ وزٹ سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس ہونا چاہتے ہیں اس وقت یہ کیفیت انھیں بطور یادگار پیش کی جاتی ہے۔

یہاں سے رخصت ہونے والے شخص کو جو پہلے ہی سے اپنی فکروں اور الجھنوں میں مبتلا ہوتا ہے اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے چلتے وقت خوش خوش نہ جا سکے۔ اس کا چہرہ اترا ہو اور وہ حتی المقدور افسردہ ہو۔ ایرپورٹ پر اس کے عزیز و اقارب یا دوست احباب وداعی تقریب منعقد کرنے آتے ہیں تو وہ کہا سنا معاف کرنے کی تنبیہ آمیز فرمائش کرتے ہیں۔ مسافر بھی یہی الفاظ دہراتا ہے کسی رشتہ دار کی ہدایت ہوتی کہ انڈیا پہنچتے ہی فون کر دینا (گویا انڈیا میں فون مفت ہوا کرتے ہیں) دوسرے کا حکم ہوتا ہے کہ جتنے خط میں نے دیئے ہیں وہ سب کو فوراً پہنچا دینا۔ ورنہ جمال کو فون کر دینا کہ تم آگئے ہو وہ خود تمہارے گھر آ کر اپنا خط وصول کر لے گا۔ دوسروں کے نام کے خط بھی اسے ہی دے دینا' اور ہاں دیکھو خالہ جان سے جا کر ضرور کہہ دینا کہ ان کا چہیتا بیٹا اختر یہاں بہت خوش ہے۔ پھوپھی کے گھر بھی ضرور جانا۔ وہ بہت اکیلی ہو گئی ہیں ——— انڈیا میں تمہیں لینے تو کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا پھر بھی یہ ہندوستانی روپے ساتھ رکھ لو ——— ایرپورٹ پر کام آئیں گے' سنا ہے وہاں ایرپورٹ پر روپے کا چلن بہت ہے۔ لیکن ایسا سب کے ساتھ ہوتا نہیں ہے اور میرے ساتھ بھی نہیں ہوا۔ لیکن میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ شکاگو میں ہے کوئی بات جو اس شہر کو اس حد تک معشوق بنائے ہوئے ہے۔ یہ ہم سخنوں اور ہم زبانوں کا شہر ہے۔ پتہ نہیں اس دن غالب صاحب کے ساتھ کیا واردات ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بد دل ہو کر انھوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ؎

"رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

اس موضوع پر غالب نے جو شعر کہے ہیں ان کا یقیناً کوئی نہ کوئی جواز ہوگا۔ لیکن اگر آپ ہماری رائے پوچھتے ہیں تو انھیں اتنا برہم ہونا زیب نہیں دیتا۔ جانے پہچانے چہرے تو آدمی کے لئے تسکین کا سامان ہوتے ہیں۔ شوپنہار جیسا قنوطی فلسفی بھی یہی بات کہتا بس اس کی زبان جرمن ہوتی۔

امریکہ میں اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ایک ہی ایرپورٹ کو دو اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی بیرون ملک کی اڑانیں بھی ایک ہی ایرپورٹ سے ابھرتی ہیں اور اندرون ملک کی پروازیں بھی اسی ایرپورٹ سے بلند ہوتی ہیں۔ انتظام یہ کیا گیا ہے کہ ایرپورٹ کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں۔ شکاگو کے او ہیر (O'Hare) ایرپورٹ پر ہمیں ایسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمیں گو کہ نیو یارک کینیڈی ایرپورٹ جانا تھا۔ لیکن وہ مشک ایرپورٹ سے۔ ان دونوں میں فرق صرف خورد و کلاں کا ہوتا ہے۔ شکل و صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے۔ ہم ۲ مئی ۱۹۹۳ء کو شکاگو پہنچے تھے پہلی ستمبر ۱۹۹۳ء کو جب چار ماہ ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی تھا ہم نے شکاگو کو خیر باد کہہ دیا۔ لیکن شکاگو سے ہم انڈیا نہیں بھاگے نیو یارک سے ہوتے ہوئے نیو جرسی چلے گئے ہم نے اس شہر کا نام بہت سنا تھا۔ اور ہمارے عزیز بھی تو یہاں تھے۔ آخری پڑاؤ ضروری تھا۔

(جاری)

مُجتبیٰ حُسین

اُردو جیل میں پہونچ گئی ـــــ!

صاحبو! کچھ عرصہ پہلے ہم نے خوش خبری سُنائی تھی کہ اُردو پھر گھروں میں واپس آرہی ہے۔ اب ایک اور خوشخبری آپ کو یہ سُنانی ہے کہ اردو اب خدا کے فضل وکرم سے جیل میں پہونچ گئی ہے۔ آپ خود حیرت میں مبتلا ہوں گے کہ اُردو جیل میں پہونچ گئی اور ہم اس اطلاع کو "خوشخبری" قرار دے رہے ہیں دراصل ہماری حالت اس افیونی کی سی ہے جو سرِشام اپنی ترنگ میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ دُور سے اس کے کانوں میں آواز آئی "بچاؤ۔ بچاؤ"۔ افیونی نے آواز کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ ایک آدمی اندھے کنوئیں میں گرا ہوا ہے اور اس کے باہر نکلنے کے سارے امکانات مسدود ہیں۔ افیونی نے پہلے تو اس آدمی کی حالت کا اندازہ لگایا اور پھر اس سے کہیں زیادہ اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اپنی ترنگ میں یہ کہہ کر چلتا بنا "میاں! تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ میری یہی دُعا ہے۔ خدا حافظ"۔ ہمارا بھی اب یہی حال ہے کہ اردو جہاں بھی اور جس حالت میں بھی نظر آتی ہے اس کے حق میں یہی دُعا کرتے ہیں "بڑی بی! تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ چاہے امریکہ میں رہو یا دوبئی میں، لندن میں رہو یا جاپان میں"۔

اردو کے جیل میں پہونچنے کی اطلاع پر آپ یہ ضرور پوچھیں گے کہ اردو کا جرم کیا ہے جو اسے جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔ بھیا اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ان دنوں جیل جانے کے لیے کوئی جرم کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بہت سے لوگ یوں ہی جیلوں میں بند ہیں۔ یوں بھی اُردو ایک قصوروار زبان ہے۔ اس کا سب سے بڑا قصور تو یہ ہے کہ اس ملک کی آزادی کی جنگ اسی زبان میں لڑی گئی تھی۔ آزادی کی جدوجہد میں جتنے بھی لیڈر جیلوں میں بند ہوئے وہ یہی زبان بولتے ہوئے بند ہوئے تھے (لیڈر تو اپنی سزا جیلوں میں بھگت چکے بلکہ آزادی کے بعد تو یہ اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان بھی ہوگئے تھے)۔ کچھ تو اب بھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں)۔ لیکن اس زبان کو ابھی تک ذرا واقعی سزا نہیں دی گئی تھی۔ آزادی کے پورے سینتالیس برس بعد بھی یہ زبان آزادانہ گھوم رہی تھی۔ اب تو اسے جیل میں پہنچنا ہی تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انصاف میں دیر تو ہوسکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔

لیکن آپ نہ گھبرائیں۔ اردو کو کسی جرم کی پاداش میں جیل میں بند نہیں کیا گیا ہے۔ زبان اور کلچر وہ الگ چیزیں ہیں جنھیں سزا دینے کے لیے انھیں جیل میں بند کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ انھیں تو سماج میں رکھ کر بھی کڑی سے کڑی سزا دی جاسکتی ہے۔ تغافل سزائے موت سے بھی کہیں زیادہ سنگین سزا ہے۔ اردو کے جیل میں جانے کی اب جو ہم خبر سُنا رہے ہیں تو اس کا تعلق اصل میں اردو کی ان گرمائی کلاسوں سے ہے جنھیں کچھ عرصہ پہلے عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے حیدرآباد میں زور و شور سے شروع کیا گیا تھا۔ اس کا اثر ہندوستان کے دیگر علاقوں پر بھی

دہلی کی اُردو اکیڈیمی پہلے ہی سے اردو کی کلاسیں چلاتی آئی ہے لیکن جوش جنون میں دہلی اردو اکیڈیمی کے سکریٹری اور ہمارے دوست زبیر رضوی نے اسے جیل میں بھی پہونچا دیا ہے۔ زبیر رضوی اردو کے شاعر ہیں اور وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو شاعری اور جیل کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ شاعری اور جیل کے تعلق کو تو چھوڑیئے۔ ہمارے تو کچھ شاعر بھی مختلف جرموں کی پاداش میں بہ نفس نفیس جیل جا چکے ہیں۔ حسرت موہانی جیل میں تھے تو انھوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی تھی۔ آٹا بھی اچھا پیستے تھے اور شعر بھی اچھے کہتے تھے لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ شعر سے بڑھیا ان کا پیسا ہوا آٹا ہوتا ہے یا آٹے سے بڑھیا ان کے شعر ہوتے ہیں۔ جو کام بھی کیا سچے خلوص اور لگن سے کیا۔ ہمارے فیض احمد فیض جیل نہ جاتے تو اردو ادب کو "زنداں نامہ" نہ دے سکتے تھے۔ مخدوم نے بھی جیل میں جا کر اچھی شاعری کی۔ غالب چونکہ اپنی شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے غالب نے قمار بازی کے جرم میں حوالات کی ہوا کھانے کو ضروری سمجھا۔ غرض جیل اور اردو شاعری کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔

زبیر رضوی نے سوچا کہ کیوں نہ جیل کے قیدیوں کو اردو پڑھائی جائے تاکہ انہیں پتہ چلے کہ گوشۂ قفس میں کتنا آرام ہوتا ہے اور اگر قفس کے اس گوشہ کا انتظام پولیس کی مشہور زمانہ عہدیدار کرن بیدی کے ہاتھوں میں ہو تو کیا کہنے۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ دہلی کی مشہور زمانہ تہاڑ جیل میں جہاں بدنام زمانہ قیدی رہتے ہیں قیدیوں کے لیے اردو کلاسوں کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقع پر دہلی کے وزیر جیل مسٹر ہرسرن سنگھ بلی اور انسپکٹر جنرل (جیل) مسز کرن بیدی بھی موجود تھیں۔ تہاڑ جیل کی جیل نمبر 4 سب سے بڑی جیل ہے اور اس جیل میں 60 فیصد قیدی ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے (آدمی کو سزا مل جائے تو پھر وہ سچ بولنے لگتا ہے۔ یہ قیدی ان آزاد شہریوں سے بدرجہ بہتر ہیں جو مردم شماری کے وقت حالات اور مصلحت کے دباؤ میں آکر اپنی مادری زبان اردو کی بجائے ہندی لکھوا دیتے ہیں)۔ اس جیل میں 300 قیدیوں نے اُردو سیکھنے کے لیے ان کلاسوں میں داخلہ لیا ہے۔ اور ان کلاسوں کے لیے دس ایسے پڑھے لکھے قیدیوں کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو باقی قیدیوں کو اردو پڑھا سکیں۔ ان اساتذہ کو اردو اکیڈیمی دہلی ماہانہ سو روپے معاوضہ بھی دے گی۔ ان کلاسوں کے لیے قاعدے اور اسٹیشنری بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ مسز کرن بیدی نے اعلان کیا کہ اردو کی کلاسیں دہلی کی دیگر جیلوں میں بھی شروع کی جائیں گی۔ تہاڑ جیل میں اردو کی ایک لائبریری بھی کھولی جا رہی ہے جس کے لیے اردو اکیڈیمی نے کئی اُردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں بھی تحفہ میں دی ہیں۔

جیل میں قیدیوں کو اردو پڑھانے کا بندوبست نہ صرف خوش آئند ہے بلکہ قیدیوں کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔ اردو شاعری واحد شاعری ہے جو قیدیوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے لطف اندوز ہونے کا گر سکھا سکتی ہے۔ جب تک وہ اردو نہیں سیکھیں گے انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ درِ قفس پر صبا کیسے کیسے پیامات لے کر آتی ہے بہت سے قیدیوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ صبا کیا چیز ہے اور اس کی مدد سے کیا کیا کام لیے جا سکتے ہیں۔ پھر قید میں رہنے کا مطلب ہجر کی کیفیت سے گزرنا ہے اور خدا کے فضل سے ہماری شاعری میں ہجر کو کچھ ایسا بلند و بالا مقام عطا کیا گیا ہے کہ بعض اردو شاعر تو وصل کے نام سے ہی گھبراتے ہیں اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر معشوق سے وصل کی نوبت آ گئی تو ان کی شاعری کی عصمت لٹ جائے گی۔ قیدیوں کو صیاد، بہار اور رہنما کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں بھی شاعری مدد دے گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اردو جیلوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ کیا عجب کہ کل کے

ملک یہ اسکولوں میں بھی پھر سے پڑھائی جانے لگے

آخر میں ایک بات اور عرض کرتے چلیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست کو جب یہ پتہ چلا کہ تہاڑ جیل کی لائبریری میں اردو کے شعری مجموعے بھی رکھے جانے لگے ہیں تو وہ کل اپنے مجلد دس شعری مجموعوں کے نسخے اپنے ساتھ لے کر ہمارے پاس آگئے اور مصر ہوگئے کہ ہم اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرکے ان کے شعری مجموعوں کو جیل کے اندر پہونچا دیں تاکہ قیدی ان سے مستفیض ہوسکیں۔ ہم نے کہا "ہم اپنے اثر و رسوخ کو مظلوم قیدیوں کے خلاف بالکل استعمال نہیں کریں گے۔ انھیں جو بھی اور جتنی بھی سزا ملنی تھی وہ مل چکی ہے۔ اب ہم اس سزا میں مزید اضافہ کرکے توہینِ عدالت کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے۔" ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے ہماری بات کا مطلب نہیں سمجھا اور پیہم اصرار کرتے رہے کہ ہم ان کے شعری مجموعوں کو کسی نہ کسی طرح جیل کے اندر پہونچا دیں۔ اس پر ہم نے پھر کہا "ہمیں ڈر ہے کہ اگر آپ کے مجموعے جیل کے اندر پہونچ گئے تو اکثر قیدی نقب لگا کر جیل سے بھاگنے کی کوشش کریں گے" ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے تب بھی ہماری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

■■

اقبال شاؔنہ
مقیم سعودی عرب

پسینے میں

بہت گرمی ہے لیکن گنگناتے ہیں پسینے میں
غزل اپنی بہر صورت سناتے ہیں پسینے میں

لرز جاتے ہیں پتّے کی طرح ہم سامنے اُن کے
اور اپنا حالِ دل اُن کو سُناتے ہیں پسینے میں

رہیں وہ "ایر کولر" کی ہوا میں چین سے یارو
اِدھر ہم یاد میں اُن کی نہاتے ہیں پسینے میں

وطن لوٹے ہیں، بجلی گرمیوں میں فیل ہوتی ہے
وطن والے بچارے ڈوب جاتے ہیں پسینے میں

وہ امریکا و یورپ بہرِ تعطیلات جاتے ہیں
ہم اپنی چھٹیاں اکثر مناتے ہیں پسینے میں

اُتر جاتا ہے میک اَپ قہر کی گرمی میں چہرے سے
انھیں مشکل سے ہم پہچان پاتے ہیں پسینے میں

ہمارے چھوٹ جاتے ہیں پسینے دیکھ کر اُن کو
"کچن" سے جب ہمیں بیگم دکھاتے ہیں پسینے میں

مئی اور جون میں وہ اُون کے کپڑے پہنتے ہیں
حماقت سے وہ اپنی ڈوب جاتے ہیں پسینے میں

نہانے کے لیے حمام کی حاجت نہیں رہتی
ہم اُن کے سامنے شاؔنہ نہاتے ہیں پسینے میں

عابد مُعز

(جدہ میں ڈاکٹر عابد معز کی کتاب "واہ حیدرآباد" کی رسمِ اجرا میں پڑھی گئی)

محفلِ طنز و مزاح کی شان ہیں عابد معز
قہقہوں کا اک نیا طوفاں ہیں عابد معز

سامنے موصوف کے ادنیٰ سے ہم کٹ پیس ہیں
اور ظرافت کی مکمل تھان ہیں عابد معز

حیدرآبادی مضامیں واہ اُن کے خوب ہیں
حیدرآبادی مزاح کی جان ہیں عابد معز

ناز ہے اپنے وطن کی خاک پر اُن کو جناب
دل سے اپنے شہر پہ قربان ہیں عابد معز

شخصیت موصوف کی اتنی بھی پیچیدہ نہیں
دیکھنے میں بھی بہت آسان ہیں عابد معز

جو بھلے ہیں لوگ اوروں کو سمجھتے ہیں بھلے
میں سمجھتا ہوں بھلے انسان ہیں عابد معز

تالیوں سے اُن کا استقبال شاؔنہ کیجیے
شہر میں آج آپ کے مہمان ہیں عابد معز

شفیقہ فرحتؔ (بھوپال)

چلتے چلاتے....

فرسٹیم فائیر

"ایک چکّر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں"

عمر کی زنجیر کے باوجود پیروں میں چکّر ہے۔

ایک نہیں کئی کئی۔ بیچارہ پوسٹ مین اوقات گھن چکر تو مفت میں بدنام ہے گھن چکر کی طرح تو ہم گھومتے رہتے ہیں۔ کچھ پاتے کچھ کھوتے ہوئے —— اور اس چلنے چلانے کے سلسلے میں ہمیں سفر بہت کرنا پڑتا ہے اور ہر بار زبان اردو کا ترجمہ انگریزی میں ہو جاتا ہے۔ یعنی اردو کا سفر انگریزی کا سفر بلکہ بلکہ SUFFERINGS بن جاتا ہے۔

لیکن اگر حسبِ معمول زاویہ نگاہ ذرا سا بدل لیں یعنی ترچھا کر لیں کر ترچھی نظر کے تیر۔ بیچارے کارگر ہوتے ہیں نشانے پہ بیٹھیں نہ بیٹھیں ——! آگے آپ سمجھدار ہیں۔ حضور معافی چاہتے ہیں کہ ہم بار بار آپ کی عقل و فراست کی خیریت پوچھتے رہتے ہیں اور زندہ و تابندہ رکھتے ہیں ہوشیار خبردار کی طرح تب بھی تو خدمت ہوئی خواص کی نہ سہی عوام کی ہی سہی —— ہاں حضور۔ پٹری ہم نے بدل لی —— دل اور دل تو نہیں بدلا۔

اس سلسلے میں اور اکثر بغیر کسی سلسلے کے آئے دن ریل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور ریل کے کرایہ اس کی سو پیچ فاسٹ رفتار سے مائل بہ پرواز ہیں کہ فرسٹ کلاس کی رقم IInd کلاس کے دھکے کھلاتی اور ہڈی تڑواتی ہے تو بے ساختہ بھولے بسرے بھولے بھالے حضرت میر یاد آجاتے ہیں۔

"یکسر دہ استخواں شکستوں سے چور تھا" (میر تقی میر)

اگر کبھی فرسٹ کلاس نصیب ہو جائے تو سارا وقت افسوس ہوتا رہتا ہے کہ اس سے تو پانچ برس پہلے ہوائی جہاز ہی میں اڑ لیتے کر دس پانچ سال کی عام آدمی کی زندگی میں کیا حیثیت و اہمیت۔!

تو عالم کیف و سرور میں ہم نے سوچا کہ ہمیں وہ شہرت یافتہ فریڈم فائیر والا ایر کنڈیشن پاس کیوں نہیں مل سکتا۔ آپ کہیں گے کہ دھکے سے ٹوٹ پھوٹ اور کانٹوں کے بستر کے درمیان کیف و سرور کا کیا عمل دخل.... اور کیا ذکر ان کا تو عرض یہ ہے کہ غم کا اپنا ایک نشہ ہے اور تکلیف میں راحت محسوس کا مطالعہ کیا مزید معلومات۔ یعنی ریفرنس کے طور پر دیکھئے اور پڑھئے "ڈیمنی کے" کا ناول CITY OF JOY۔ آخر کو

اور پھر غالب نے بھی تو فرمایا ہے

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

ہاں تو بات تھی فریڈیم فائیٹر کی۔ اگر ہم نے ذرا بھی عقل سے کام لیا ہوتا تو جتنی ہماری مار کٹائی گھر میلو آزادی اور پڑھنے کی آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھی اس سے نصف میں ہم فریڈیم فائیٹر امتحان درجہ اول امع ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر سکتے تھے کہ اس جنگ آزادی میں عمر کی کوئی قید تو تھی نہیں۔ تین چار سال کا بچہ بھی ڈنڈے سے لاٹھی، لات جوتے کھا سکتا تھا ـــــ وہ ہم نے حسب ہمت کھائے، وہ بھی پولس والوں کے کہ والد اس خاکسار کے ڈی آئی جی تھے۔ سرکار انگلشیا کے وفادار ـــــ وہی ڈنڈے جو کانگریسی کارکنوں اور ستیہ گرہیوں پہ برسا کرتے تھے وہی ذرا ہلکے سے کبھی ہم پہ بھی اٹھیلا کرتے تھے۔ اور پاس ڈنڈوں کی گنتی کر کے تو دیئے نہیں گئے

فریڈم فائیٹر سال دو سال سے لے کر گھنٹہ دو گھنٹے جیل میں رہے۔ ہمارا گھر جو اس زمانے میں بنگلہ کہلایا کرتا تھا اس کے در و دیوار کیا کسی جیل خانے سے کم تھے ـــــ ؟ رہی زندگی۔ وہ با مشقت تو اب تک گزر رہی ہے۔
غالب کی طرح ہم بھی عالم بالا سے اس عالم آب و گل میں سزا کاٹنے ہی تو آئے ہیں۔

مگر ہائے رے نا عاقبت اندیشی کہ ان تمام حادثات کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔ ضابطہ تحریر میں اسے لائے نہیں اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کام ہو نہ ہو سرکاری کاروائی کی کھونٹی چاہیئے۔ سیکڑوں اسکول، اسپتال، سڑکیں، پل، تالاب ڈھونڈے ڈھونڈے نہیں ملتے بلکہ کاغذ پہ وہ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔

گویا ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ لیکن سرکاری ریکارڈ میں وہ پکی سیاہی سے لکھے موجود ہیں۔ اور خرچہ ان کا ماہ بہ ماہ دیا جاتا ہے رسیدی ٹکٹ پہ ـــــ تو کیا ہماری درد بھری داستان اور لرزہ خیز وارداتوں کا ایک سرٹیفکیٹ نہیں بن سکتا تھا؟ جان کے مرنے کے ساتھ تھوڑا سا مال بھی خرچ کر دیتے۔
مگر اتنی دور اندیشی ہوتی تو دنیا کے تمام انعامات و اعزازات سے نوازے جاتے، ان الفاظ میں تعریفیں کی جاتیں جو ہماری آپ کی لغت میں موجود ہی نہیں ـــــ گھر کی ٹوٹی پھوٹی بے قفل الماریاں روپیہ پیسوں سے اور بینک کی کوری خالی پاس بک آنکڑوں سے بھر جاتیں اور کچھ نہیں تو ایک تامر پتر تو مل ہی جاتا۔ پنشن جاری کر دی جاتی کہ ابھی ابھی خبر لگی ہے کہ ایک دن کی جیل کے بھی وارے نیارے ہیں۔

اور ہم بقیہ زندگی ہنسی خوشی گزارتے لیکن
"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ ۔ ۔ ۔"

سلیم مقصود (جدہ)

آہ ٹ جخ

خواجہ صاحب خودکشی کے لیے ساری چیزوں سے لدے پھندے تیار ہوگئے۔ انھیں دیکھ کر مشتاق احمد یوسفی کے مرزا کی یاد ذہن میں تازہ ہوگئی جو کرکٹ کا میچ دیکھنے ایسی ہی سج دھج سے جایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب سر سے پاؤں تک کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی چائے کا تھرماس اور ٹیپ ریکارڈر بھی رکھ لیا تھا۔ بیوی اور بچوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ بلکہ بیوی نے تو آج اس خوشی کے موقع پر صدہا اقسام کے پکوان بنائے تھے۔ گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ کسی نے خواجہ صاحب کو روکا نہیں۔ بلکہ رشتہ داروں نے انھیں گھر سے ایسے رخصت کیا جیسے وہ ترقی پر ایک مقام سے دوسرے مقام کو جا رہے ہوں۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے ان کی بیگم سے پوچھا:

بھئی خیر! خواجہ صاحب خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اہلیہ نے الٹا سوال داغ دیا۔ "آپ جینا کیوں چاہتے ہیں؟"

ہم کوئی جواب نہ دے سکے۔ کیوں کہ ہم جس دور میں جی رہے ہیں اس میں زندہ رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔

بچوں سے بھی ہم نے وہی سوال پوچھ لیا جو خواجہ صاحب کی بیگم سے پوچھ چکے تھے۔ جواب ملا "ابا ایک کوشش کوئی دس سال سے کر رہے ہیں آج تک انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ سیدھا ریلوے لائن پر جاتے ہیں۔ اور پٹریوں کے درمیان شطرنجی بچھا کر لیٹ جاتے ہیں۔ مگر بھلا ہو ان محکموں کا آج تک کوئی ٹرین وقت پر نہیں آئی۔ چنانچہ دس سال سے والد صاحب کی خودکشی کی آرزو معرض التواء میں پڑی ہے جیسے یہ بھی کوئی عوامی منصوبہ ہو۔ دیکھیں! ناکام ہو کر ہی جب راشن پانی ختم ہو جائے گا واپس آ جائیں گے۔ ہم انھیں اس لیے نہیں روکتے کہ اس عمر میں ان کے لیے تفریح کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ واپس گھر آنے کے بعد کافی ہشاش بشاش نظر آتے ہیں"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔ اگر کسی دن ٹرین وقت پر آ جائے تو!!

دوسرے بیٹے نے ہنس کر جواب دیا۔ "دس سال سے تو ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے بجٹ اور ہماری ٹرین میں یہ بات مشترک ہے کہ بجٹ میں کبھی نفع نہیں آسکتا اور ٹرین کبھی وقت پر نہیں آسکتی۔ اگر کسی دن ٹرین وقت پر آ جائے تو اسے یا تو ٹال جانا پڑے گا یا لیٹ ہو جانا پڑے گا کیونکہ مسافروں کو پتہ ہے کہ ٹرین تاخیر سے روانہ ہوتی ہے اس لیے وہ وقت پر بھی نہیں آئیں گے۔ اگر ٹرین وقت پر روانہ ہو تو ظاہر ہے اسے مسافر کہاں سے ملیں گے۔"

جب خواجہ صاحب کو میں نے بھیگی آنکھوں اور ڈوبتے دل سے رخصت کیا۔ لیکن ان کے اہل خاندان ایسے خوش تھے جیسے خواجہ صاحب خودکشی کرنے نہیں بلکہ خاندان کا نام اونچا کرنے جا رہے ہوں۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا حیدرآباد سے کوئی ریلیف [illegible] کی قطار روانہ کی جا رہی ہو۔

کھانے کی چیزوں کے علاوہ ان کے ساتھ کمبل، چادریں، دوائیں اور میری دعائیں بھی تھیں۔ خیر صاحب! یہ المناک منظر میں پوری طرح نہ دیکھ سکا اور گھر لوٹ آیا۔ خواجہ صاحب سے میری دوستی کوئی ایسی پرانی بھی نہ تھی۔ پنشن آفس میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور یہ ملاقاتیں آخرکار دوستی میں بدل گئیں۔ بوڑھاپے میں سارے بوڑھے ایک ہی عمر کے نظر آتے ہیں اس لیے پتہ نہیں ہم میں کون زیادہ بوڑھا تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی دوسرے دن اتوار تھا دیر تک سوتا رہا۔ پھر اٹھا غسل کیا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار دیکھنا شروع کیا ایک سرخی پر نظر پڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ لکھا تھا۔ "انگریز کے جانے کے بعد پہلی بار کل دلی تا حیدرآباد ٹرین ٹھیک وقت پر نامپلی اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ یہ کیا ہو گیا۔ خواجہ صاحب بالآخر اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے خاندان کے افراد کا اس بار اندازہ غلط ثابت ہوا۔ فوراً کالے کپڑے بدل کر میں پرسے کے لیے خواجہ صاحب کے گھر روانہ ہوا۔ جاتے جاتے ایک سیاہ رومال بھی خرید کر بازو پر باندھ لیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے پر میرے منہ سے نکلا "بھوت" اور میں خوف سے بھوت سے لپٹ گیا۔ خواجہ صاحب ہی نے دروازہ کھولا تھا۔ معلوم ہوا کہ انھیں کل گھر سے نکلنے میں تاخیر ہو گئی۔ جب یہ اسٹیشن پہونچے ٹرین جا چکی تھی۔ لوکل ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرنا خواجہ صاحب اپنے بین الاقوامی وجود کی توہین سمجھتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" کہنے لگے۔ "یار! زندگی کی یکسانیت سے تنگ آکر ایسا کرتا ہوں۔ اور یوں سمجھو کہ یہ ریلوے کے محکمے کے خلاف ایک قسم کا احتجاج بھی تھا۔ اب ریلیں وقت پر چلنے لگی ہیں اس لیے میں نے یہ احتجاج ختم کر دیا ہے ــــ"!

□□

پرویز ید اللہ مہدی (بمبئی)

یہ ہے بمبئی میری جان

بارے بیرے کا کچھ بیان ہو جائے!

جو شخص پیدائشی بہرا ہو، لیکن وقت پڑنے پر بہرا بن سکتا ہو وہ بڑی آسانی سے کسی بھی ہوٹل میں بیرا بن سکتا ہے، تاہم بمبئی کے ہوٹلوں میں بیرے کی پوسٹ پر راست 'تقرر' شاذ ہی عمل میں آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ نو وارد ان بمبئی کی اکثریت بیرا گری اور حمالی کو ترقی کی راہ کا پہلا سنگ میل تصور کرتی ہے اور اس تصور کا سبب دراصل ان اشخاص و افراد کے تعلق سے ملک کے کونے کونے میں بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی وہ افسانہ طرازیاں ہیں جن کی رو سے راتوں رات امیر بننے کے لیے ان حضرات نے اپنی جدوجہد کا آغاز بیرا گری اور قلی گری کے پیشے سے کیا اور آج وہ نمبری دُنیا کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔ گویا اس قماش کے اشخاص کی نظر میں امیر بننے کا شارٹ کٹ فارمولا اگر کوئی ہے تو وہ بیرا گری و حمالی کا پیشہ ہے۔

جہاں تک بیرا گری کے پیشے کا تعلق ہے اس اسامی کے خواہشمند اصحاب کو یہاں ٹریننگ کے کم سے کم دو مدارج شرطیہ طے کرنے پڑتے ہیں اور یہ ٹریننگ اتفاق سے فوجی رنگروٹوں کی طرح بااُجرت بھی ہوتی ہے اور بامشقت بھی۔

ٹریننگ کا پہلا دور عموماً ہوٹل کے فرش کی لیپا پوتی، یعنی گیلے کپڑے سے فرش کو چاچم چمکانے اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ تک محدود ہوتا ہے، گویا پہلے راؤنڈ میں زیر تربیت امیدوار کو فرش پر جھاڑو اور ٹیبل پر کپڑا مارنے کے فن اور اس کی باریکیوں سے روشناس کروایا جاتا ہے۔ فرش پر گیلا کپڑا مارنے کا عمل، ہوٹل کے عملے کی اصطلاح میں کٹکا یا پھٹکا، مارنا کہلاتا ہے۔ اور ٹیبل پر کپڑا مارنے کا عمل صافی لگانا یا صافی مارنا کہلاتا ہے لفظ صافی سے ذہن میں فی الفور صاف صفائی کا تصور اُبھرتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ صافی سے مراد صاف صفائی ہی ہو ویسے بھی بقول مرزا غالب ؎

سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

اس کے علاوہ ہوٹل میں مستعمل صافی کی اصطلاح کا ہمدرد دواخانے کی جڑی بوٹیوں والی صافی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہمدرد والی صافی خون صاف کرتی ہے ہوٹل والی صافی خون سوخت کرتی ہے۔

بمبئی کے بیشتر ہوٹلوں میں صافی لگانے کی کارروائی کپڑے کے جس میلے خورے ٹکڑے کی مدد سے انجام دی جاتی ہے اس کے رنگ و روغن کو دیکھ کر اس کی کوالٹی اور اصلی رنگ کو پہچاننا ہمیشہ اتنا ہی پیچیدہ اور مشکل مطلب ہے جتنا کہ کسی ... [illegible] ... ہے جہاں چکنائی جذب کرتے کرتے اس کا رنگ ... [illegible]

تربیت اُمیدوار کے ہاتھوں میں کسی فوجی رسالے کے باوقار جھنڈے کی طرح تھما دیا جاتا ہے کہ چل بیٹا پچھلے تمام جھنڈے اکھاڑ کے نئے جھنڈے گاڑنا شروع کر دے۔ اور جب اُمیدوار ہوٹل کے ہر کونے ہر ٹیبل پر اپنے نام کے جھنڈے گاڑ دیتا ہے یعنی کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کو کمال ہوشیاری سے ٹیبلوں کے نیچے اور ٹیبل پر جمع شدہ کچرے کو چابکدستی سے گاہکوں کے دامن میں منتقل کر دینے میں مہارت تامہ حاصل کر لیتا ہے تب اسے ترقی دے کر گاہکوں کو پانی پلانے کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے اور یوں ٹریننگ کے دوسرے دور کی بسم اللہ ہوتی ہے۔ ٹریننگ کے دوسرے راؤنڈ میں پانی کے ہر گلاس میں اپنی تمام انگلیاں ڈبو کر گاہکوں کی خدمت میں پیش کرنے کی ٹریننگ اسے بطور خاص دی جاتی ہے۔ اس عمل سے بیرے کی انگلیاں اور گاہکوں کی طبیعت دونوں صاف رہتی ہیں جب عمل اور ردعمل کی اس مسلسل یلغار کے نتیجے میں بیروں کی انگلیاں اور گاہکوں کی انتڑیاں دونوں پوری طرح فگار ہو جاتی ہیں تب امیدوار کی ٹریننگ کا دوسرا اور فائنل راؤنڈ اختتام کو پہنچتا ہے اور ہوٹل کا انتظامیہ کامیاب امیدواروں کو بہ یک جنبش قلم بیروں کے جلیل القدر عہدے پر فائز کر دیتا ہے۔

یہاں ہم آپ کو یہ بتانا ہی بھول گئے کہ خداوند قدوس نے حضرت انسان کو انگلیاں کیوں عنایت فرمائی ہیں۔! ان کا صحیح مصرف کیا ہے؟ ان اہم اور ضروری اُمور پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم سب کو بیرا برادری کا ممنون ہونا چاہیئے جن کے توسط سے یہ عقدہ کھلا کہ انگلیوں کا مصرف، صرف کھانا ملانا، پھر اسے نوالوں کی صورت منہ میں منتقل کرنا اور بعد ازاں انگلیوں کو چاٹنا ہی نہیں بلکہ انھیں جڑوں تک پانی کے گلاسوں میں ڈبونا بھی ہے۔ اگلے وقتوں میں البتہ ہر طرف چونکہ فراخی و خوشحالی ہوا کرتی تھی نتیجتاً ہر گھر میں چاہے وہ دولت خانہ ہو یا غریب خانہ دودھ گھی کی کم از کم ایک آدھ ندی یقیناً بہا کرتی تھی اسی لیے ہر دوسرے شخص کی پانچوں گھی میں اور سر دودھ کی کڑھائی میں ہوتا تھا لیکن بُرا ہو اس دور خانہ خراب کا پانچوں انگلیوں کو ڈبونے کے لیے اب گھی کی جگہ پانی کے گلاسوں پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ سہولت بھی صرف بیرا برادری کو حاصل ہے، باقی لوگوں کو تو چلّو بھر پانی بھی میسّر نہیں ہے۔!!

بیرے کی پوسٹ کا متمنی اُمیدوار جیسے ہی ٹریننگ مکمل کر کے بیرے کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتا ہے ویسے ہی اُسے یہ عرفان ہوتا ہے کہ اس مملکت کا یا کم سے کم جتنے بھی ٹیبل اسے تفویض کیے گئے ہیں، ان کا مالک کُل وہی ہے چنانچہ گاہکوں کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کر سکتا ہے یہ حضرات چونکہ اپنے پیشے کی رعایت سے خود کو ان داتا کا پرسنل سکریٹری سمجھتے ہیں لہٰذا جو ضرورت مندان ان کے آگے سر جھکا کر اپنے زانوئے شکم تہہ کرتا ہے اس کی خدمت میں ترنت اس کی مطلوبہ اشیائے خورد و نوش حاضر کر دیتے ہیں اور جو ان کے آگے گردن اکڑائے محض حکم چلاتا ہے اسے اس وقت تک انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں جب تک کہ وہ بھوک سے نڈھال ہو کر وہ ان کے آگے اپنے ہتھیار نہیں ڈال دیتا۔ بالفاظ دیگر اپنے آگے سر تسلیم خم کرنے والے کو نرمی کرتے، کھلاتے ہیں تو اکڑ فوں دکھلانے والے کو محض انتظار کی کوفت۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمارا پالا ایسے ایسے ستم ایجاد بیروں سے بھی پڑ چکا ہے، جن کی ستم ظریفیاں بلا مبالغہ تعزیرات ہند کی کسی نہ کسی دفعہ کے تحت آتی ہیں مثال کے طور پر یہی دیکھئے، جب کوئی گاہک بھیجہ فرائی کا آرڈر دیتا ہے تو ستم ظریف بندے گاہک کی بغل ہی میں کھڑے کھڑے بہ آواز بلند باورچی خانے کے انچارج تک مذکورہ آرڈر کچھ اس طرح پہنچاتے ہیں: "عبدل! صاحب کا بھیجہ فرائی کر!" اسی طرح آرڈر اگر کلیجی سے متعلق ہوا تو [illegible] "صاحب کی کلیجی نکال!" گویا یہ فتنہ گر حضرات گاہک کے آرڈر کو خود گاہک ہی سے منسوب کر کے اس غریب کے [illegible] بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسی پر [illegible]

یہ کہ گاہک ہی کا بھیجہ فرائی کرکے، اسی کی کلیجی تلواکے، بل بھی اسی سے چکواتے ہیں، دلّی کی ناک کاٹ کے، دلّی کو چلتا کرنا، اسے ہی کہتے ہیں۔

ان ستم ظریف اصحاب سے منسوب ایک اور مشہور عام اصطلاح کے ذکر کے بغیر ان کی اختراع سازیوں کا باب ادھورا ہی رہے گا۔ اس مخصوص اصطلاح کا تعلق بھی ظاہر ہے کھانے پینے ہی کی اشیاء سے ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی یہ خاصیت ہے کہ کھانے کے نام پر آگے سے بنے چاہے کتنے ہی آئیٹم کیوں نہ ہڑپ کر جائیں لیکن دو نوالے چاول کھائے بغیر ہماری بھوک نہیں مٹتی، چنانچہ ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر نوش فرمانے والے ننانوے فی صد گاہکوں کے آرڈر میں کم از کم آدھی پلیٹ یعنی ہاف چاول ضرور شامل ہوتے ہیں۔ ان مٹھی بھر چاولوں کی یہ حضرات جیسی منہ زبانی درگت بناتے ہیں، اُس کی تفصیل بعض ان معصوم قارئین کے لیے پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں جنھیں بمبئی کے ہوٹلوں میں جانے اور کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

چاول کا آرڈر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہی یہ فوراً سوال داغتے ہیں۔ "زندہ یا مارکے ؟" زندہ یا مُردہ کی یہ انوکھی ترکیب خالص ان ہی اربابِ ذوق کے ذہن رسا کی اختراع ہے تاہم اس انوکھی اصطلاح کا تعلق زندگی اور موت کے فلسفے سے ہرگز نہیں ہے بلکہ زندہ چاول سے مُراد سوکھے سادے چاول ہوتے ہیں اور مارے ہوئے چاول وہ ہوتے ہیں جن پر سالن، شوربہ یا دال کا پورا ڈونگا اُلٹ دیا گیا ہو۔ ایک مرتبہ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا اتفاق سے ہم نہ صرف اس واقعہ کے راوی ہیں بلکہ یہ واقعہ ہماری ذات ہی سے منسوب ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ ایک ستم ایجاد بیرے کے اس زندہ یا مار والے طرحی مصرعے کے جواب میں ہم نے ازراہِ مذاق کہا۔ "چاول ضرور لائیے لیکن نہ زندہ نہ مار کے۔ !"

ہمارے اس انوکھے آرڈر پر بیرے نے حیرت سے پوچھا۔ "نہ زندہ نہ مار کے، تو پھر کیسا چاول لائے صاحب ؟"

ہم نے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا . . . . . "تڑپتا ہوا۔ !"

بیرے نے تڑپ کر پوچھا . . . . "تڑپتا ہوا" ؟ یہ تڑپتا ہوا چاول کیا ہوتا ہے صاحب ؟

عرض کیا . . . . "تڑپتا ہوا چاول وہ ہوتا ہے جس پر شوربہ انڈیلا نہیں جاتا بلکہ صرف تھوڑا سا چھڑکا دیا جاتا ہے۔!"

بیرے کی پوسٹ کے لیے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا یقیناً ضروری نہیں ہے لیکن حساب کتاب کے معاملے میں کسی سود خور سیٹھ کی طرح پکا ہونا لازمی ہے کیوں کہ کس گاہک نے کیا کھایا، کتنا کھایا، اس کا حساب رکھنا بیرے کا اولین فرض ہے۔ جن ہوٹلوں میں گاہکوں کی آمد و رفت کی رفتار خاصی تیز ہوتی ہے وہاں حساب کتاب کے معاملے میں بیروں سے تھوڑی بہت بھول چوک لازمی ہے کہ یہ بھی آخر کو بشر ہوتے ہیں، تاہم ہشیار بیرے فوراً اپنی بھول سدھار لیتے ہیں، مثال کے طور پر فرض کیجیے کسی گاہک نے کھائی تو ہیں چار روٹیاں لیکن بیرے نے بھول سے بل میں صرف تین روٹیوں کی قیمت جوڑ دی ہو اور گاہک بھی موقع کا فائدہ اُٹھا کر چوکے بر چھوٹے کہ کر چلتا بنا ہو ایسے میں اچانک بیرے کو اپنی بھول کا احساس ہو جائے تو وہ مذکورہ گاہک کے پیچھے نہیں لپکتا بلکہ اگلے گاہک کے بل میں متنازعہ روٹی کی قیمت جوڑ کر اپنی بھول کا "پوسٹ مارٹم" کر لیتا ہے گویا اس کی ٹوپی اُس کے سر اور اس کی ٹوپی اس کے سر کے مصداق اس کی روٹی اس کے بل میں ——— اور اس کی روٹی اس کے کھاتے میں جوڑ کر پچھلے بل میں ہونے والی کتابت کی غلطی کی تصحیح نئے بل میں کر لی جاتی ہے۔ بھول کے فی الفور پوسٹ مارٹم کا یہ انوکھا طریقہ صرف بمبئی کے بیروں ہی کا خاصہ ہے۔!

غزلیں

پاگل عادل آبادی

بکرا مجھے بلی کا بنانے لگے ہیں لوگ
الٹی چھری گلے پہ چلانے لگے ہیں لوگ

جوتوں سے ہوشیار نمازی جو ہو گئے
لوٹے وضو کے تب سے چرانے لگے ہیں لوگ

شنکر نے پان کی جو لگا کر دکان دی
کھا کر ادھار چونا لگانے لگے ہیں لوگ

پکچر جو "میں نے پیار کیا" خوب چل گئی
گھر گھر کبوتروں کو اڑانے لگے ہیں لوگ

دعوت بغیر کھا تو لیتے گھس کے پیٹ بھر
توشہ بھی اپنے گھر کو بھجانے لگے ہیں لوگ

لے دے کے ایک پھٹ پھٹی باقی جو رہ گئی
اس پر بھی ہاتھ اپنا پھرانے لگے ہیں لوگ

جھگڑے لگا کے مندر و مسجد کے دیش میں
پبلک کو بے وقوف بنانے لگے ہیں لوگ

دینے لگے ہیں داد بھی سر پیٹ پیٹ کر
پاگل کے ساتھ خود بھی دِوانے لگے ہیں لوگ

○

میرا چوکا بھی ہے چھکا آپ کے باپ کا کیا جاتا
امپائر ہے میرا سالا آپ کے باپ کا کیا جاتا

کھانا پینا جوا مٹکہ جس پیسے سے چالو ہے
وہ ہے میرے باپ کا پیسا آپ کے باپ کا کیا جاتا

انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے جھڑ گیا منہ کا فرنیچر
عشق کروں گا کھلم کھلا آپ کے باپ کا کیا جاتا

آپ کے باپ کی ہیرو ہونڈا، آپ کی یہ جاگیر سہی
میرا ہے بن باپ کا رکشا آپ کے باپ کا کیا جاتا

کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی سیدھی کبھی بھی ہوتی ہیں
پی جاتا ہوں کر کے توبہ آپ کے باپ کا کیا جاتا

دیش بھی میرا قوم بھی میری تم ہو ٹوکنے والے کون
کھا جاؤں گا بیچ کے جھنڈا آپ کے باپ کا کیا جاتا

میری مرضی کا ہیں مالک چاہے جدھر بھی لڑھکوں گا
میں ہوں بن پیندے کا لوٹا آپ کے باپ کا کیا جاتا

میرے باپ کا تھا یہ پیشہ گولی مندر دم باہر
میرا بھی اب ہے یہ دھندا آپ کے باپ کا کیا جاتا

چپکا ہوا اک چمچہ ہوں میں تنخا ہوا اک بھمچہ ہوں
پھر بھی باپ کا میں ہوں چہیتا آپ کے باپ کا کیا جاتا

انٹرنیشنل شاعر ہوں میں میرے لیے سب جائز ہے
ٹھینگے وہ اب اندھا چشما آپ کے باپ کا کیا جاتا

یہ بھی اک بزنس ہے پیارے یہی تو اک دھندا
لے کر کھا جاؤں گا چندا آپ کے باپ کا کیا جاتا

○

ابوشہلا
(ریاض)

ہوئے تم دوست جس کے...

"A friend in NEED is a friend INDEED" آج سے تقریباً چالیس سال پہلے انگریزی کے استاد نے ہمیں یہ بات بتائی تھی جو آج تک ذہن نشین ہے۔ لہٰذا اس سچے دوست کی تلاش میں آج تک سرگرداں ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں سے دوستی بنائے پھرتے ہیں۔ مگر آج تک اس مقولہ کی صحیح عکاسی کرنے والا دوست نہیں مل سکا۔ تلاش ہنوز جاری ہے۔

لڑکپن کی بہت سی یادیں آج بھی تازہ ہیں جیسے موہنی سی صورت کا گول گپتا تھا بڑا ہی پیارا۔ ہم ایک جان دو قالب تھے یہ اور بات ہے آدھی جان گوری اور آدھی جان کالی تھی۔ چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے (ایک ہی اسکول میں تھے) چار سال کے بعد الگ ہوئے تو چالیس سال بعد ملے۔ واشنگٹن میں 'دوست' نے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھوڑ سواری کرتے ہیں مگر دوستی کی لگام تھام نہیں سکتے۔ بہت دیر تک ہم بچپن کی دوستی کا دم بھرتے رہے اور وہ سگریٹ کے دم لیتے رہے۔ ہم مجبور تھے اب نہ تو وہ گول تھے نہ گپتا اور نہ ان سے کہہ سکتے تھے ہم دھول دھپّہ کریں تو کیا کریں دل مسوس کر رہ گئے۔ بادل نخواستہ انھوں نے شام میں Drinks پر مدعو کیا۔ ہم کیا پیتے؟ خون جگر پی کر رہ گئے۔

پھر آیا نوجوانی کا زمانہ۔ بازوؤں میں مچھلیاں تھیں بہاریں تھا سب کا چہیتا موسم تھا کیا سہانا۔ چپہ چپہ بوٹا بوٹا دوست بنا۔ اتنے دوست تھے کہ بہت سوں کی تو شکلیں تک یاد نہیں۔ ملنا ملانا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا ہنسنا رلانا جھگڑنا منانا سب چلتا تھا بس Friend in NEED والی بات ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ہوتی کہاں سے؟ ان دنوں امتحان میں نقل کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کوئی بھی دوستی کا حق جتانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ سب مرفہ الحال تھے اپنا اپنا کھاتے اور گنگناتے چلے جاتے تھے۔ ضرورت کسی کو کسی کی نہیں تھی۔ جب فارغ التحصیل ہوئے اور زمانے نے ستایا اور ملازمت کا گھن چکر شروع ہوا تو ضرورت کی ضرورت پڑنے لگی۔ سوچیے خوشی تو بہت تھی کہ کئی 'دوست' اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور بے شمار احباب با اختیار ہیں اور کئی ہماری Friends علی NEED میں کام آسکنے کے قابل ہیں بیشتر کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ تلاش روزگار میں مصروف تھے کہ ایک موقع ہاتھ آیا۔ ایسی کہانی سے نظر [illegible] گمان آیا جیل کے جیل بھر جائے "ناپائدار" تھے۔

ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دل ہی دل میں ہم نے سوچا کہ چلو نوکری تو پکی ہے بس تھوڑی کی بات
طے ہونی ہے —— اور پھر اپنی نوجوانی کی دوستی یاد آنے لگی۔ اس بچپن کے جنرل منیجر مختار علی عرف میاں مختار کھل
بنے بیٹھے تھے کس قدر دبلے پتلے نازک سے تھے۔ پانی سے بہت ڈرتے تھے اور تیرنے کے لئے کبھی رضامند
نہیں ہوتے تھے۔ کوئی کہتا کہ ان کو تیرنا ہی نہیں آتا تو کوئی باوثوق ذرائع سے کہتا کہ وہ صرف اپنے حمام میں
ہی اپنے کپڑے اتارتے ہیں اور یہ کہ ان کی پسلی کی کتنی ہڈیاں ہیں وہ روزانہ گن لیا کرتے ہیں۔ یہ جوڑوں کا حساب
یاد تھا۔ اپنے پتلون کے پائنچے وہ کبھی ٹخنوں تک نہیں چڑھاتے اس ڈر سے کہ کہیں ہم ان کو "سارس" کے
نام سے نہ پکاریں۔ مگر ہم نے انھیں جو نام دیا تھا وہی زبان زد عام تھا "آپا جان"
بس اسی طرح کی پُرلطف یادوں میں ہم کھوئے رہے۔ دوسرے دن انٹرویو تھا ہم وقت سے نصف گھنٹہ
پہلے پہنچ گئے تھے یہ سوچ کر کہ شاید موصوف سے ملاقات کا بہانہ مل جائے مگر نہ ہو سکی۔ وقت مقررہ پر ہمارا نام پکارا
گیا۔ بہت ہی اکڑ کے اپنی کرسی سے ہم اٹھے اور دوسرے امیدواروں کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ کا چھڑکاؤ کرتے
ہوئے اپنے "دوست" کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دل تو خوشیوں سے پاگل تھا ہی شاید اس وقت دماغ بھی
پاگل ہو چلا تھا۔ جیسے ہی "مختار" پر نظر پڑی بے اختیار ہو گئے۔ خلاف توقع (ان کے) ہم سیدھے ان کے
قریب پہونچے کہ بغل گیر ہو سکیں۔ وہ نہ تو کرسی سے اٹھے نہ سلام کا جواب دیا اور نہ مسکرائے بلکہ بڑے ہی کرخت
لہجے میں کہا "please be seated" ہم نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے ان کو مخاطب کیا "مختار صاحب" انہوں
نے کہا "please sit down" ہم نے دیکھا کہ یہ مختار ہمارے مختار سے بالکل الگ تھے۔ کافی تنومند
رنگ کچھ سانولا سا، قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے اور چشمہ لگائے ہوئے "آپا جان" کی بجائے "دولہا جان"
لگ رہے تھے۔

خیر جناب! انٹرویو شروع ہوا خدا جانے کیا انہوں نے پوچھا اور کیا ہم نے جواب دیا صرف اتنا
یاد ہے کہ انہوں نے کہا "You may go, we will inform you" جس پوسٹ کے لئے انٹرویو ہوا تھا اس
کے لئے قابلیت اور تجربے میں ہم سے بہتر شاید دوسرا امیدوار نہیں تھا۔ اور یہ ہم اپنے اسی دوست کی قسم کھا کر
کہہ سکتے ہیں پھر بھی ہمارا انتخاب نہیں ہو سکا۔ شاید اس لئے کہ "جنرل منیجر" ہمارے بچپن کے دوست تھے اور شاید
انھوں نے وہ مقولہ یاد نہیں رکھا تھا "A friend in need" والا۔

اب تو خیر سے عمر کی نصف صدی کی آمد آمد ہے دوستوں کے خون کو سفید ہوتا ہوا دیکھ کر ہمارے سر کے
رہے سہے بال بھی اتنی جلدی سفید ہو رہے ہیں "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" کے مصداق اب بھی ہم شوق سے دوست
بناتے ہیں دل و جان سے دوستی کرتے ہیں دل بھی دیتے ضرور ہیں مگر کسی کی جان لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہماری اس طرح کی پالیسی پر ہمارا
جب ہمارا ایک دشمن نما دوست نصیحت تو بجائے ان سنی کرنے کے انہوں نے مشورہ دیا "آپ ان" سے دوستی کیوں نہیں کرتے
جو بے حد پسند وہ پالے کرتے ہیں جن کی وفاداری کا چرچا سارے عالم میں ہے اور جن سے حضرت انسان وفاداری سیکھ
سکتے ہیں" بات تو ان کی سمجھ گیا "ان" سے دوستی کرنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ بھی بے وفا "دوستوں"
کا کاٹ کھاتے ہیں ؎

دشتِ شب میں شبنم امید کا خیال
پتھر سے زندگی کی دعا مانگتا ہوا

وحید اشرف
(دہلی)

بیلج

بیاج کی کئی اقسام ہیں لیکن میں اس بیج یا بیاج کا ذکر کروں گا جو اکثر صورتوں میں صاحب کا وجود بڑھا کر انھیں صاحب حیثیت کر دیتا ہے اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے اس بیاج کا شاید کوئی نام نہ ہوا ہو سکتا ہے عمداً اس کا نام نہ رکھا گیا ہو کیونکہ دوسری صورت میں یہ اپنی خصوصیت اور قوت کی بنا پر نام ور ہو جاتا ہے اور اس کو لگانے والا گمنام ہی رہ جاتا۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ دانشوروں کے سیمیناروں اور سیاسی جماعتوں کے جلسوں اور مشاعروں میں خاص خاص مندوبین و کارکن حضرات اپنے سینہ کے بائیں جانب مین دل کے اوپر، دل سے بھی بڑے گول یا کئی پہلو والے بڑے ستارے کی طرح رنگ برنگے اکثر صورتوں میں سرخ بیاج لگائے رہتے ہیں۔ ایسے حضرات ہر کس و ناکس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ خیر ناکس کو چھوڑیے کیونکہ ناکس کا مطلب آج تک واضح نہ ہو سکا البتہ ہر کوئی یہ جاننے کی فکر میں ہے کہ سینے پر اتنے بڑے بڑے بیاج لگانے کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ان ہی میں ہر کوئی میں سے ایک قسمی دوست سے جو سیاست داں بن جانے کے بعد صرف قریبی رہ گئے تھے۔ میں نے اس بڑے بیاج کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ یہ دراصل اپنی جان بچانے کا بھی طریقہ ہے کیونکہ قاتل چاہے سفاک مرد ہو یا حسین عورت قتل کے لیے دل ہی کا نشانہ لیا جاتا ہے اس بیاج میں کچھ نہیں ہوتا سوائے بلٹ پروف دھات کے جو کپڑے کے اندر محفوظ رہتی ہے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انھوں نے علم دیو اسکے ہیرو کی مثال پیش کر دی جس کی جیب میں ایک دھاتی بڑا سا سکہ ہوتا ہے اور ہمیشہ اسی سکہ کی وجہ سے پستول سے نکلی ہوئی گولی دل میں گھر کرنے کی حسرت لیے حتی سینے پر گر جاتی ہے۔ انھوں نے قائل کر دیا کہ سیاست داں کے جلسوں میں حقیقتاً بیج ان ہی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن دانشوروں کے سیمیناروں اور مشاعروں میں استعمال ہونے والے بیجوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ بھی کوئی بات ہوئی یہ بیج اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ لیڈ از منتظمین جلسہ ہیں یا وی آئی پی۔ شناختی نشان ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ ہر ذی روح انسان کی زندگی کے سب سے اہم اور ایک منفرد و رنگتا اجلاس یعنی شادی بیاہ کی تقریب میں دولہے میاں یا دلہن والوں نے کوئی شناختی نشان کبھی استعمال کیا ہے؟ جاؤ لگنگی باما پسند ہی ہوتا ہے کہ بن بلائے مہمان نہایت آزادی سے گل چھرے اور خوب اڑاتے اور چلے جاتے ہیں جب بھی قریب کے ہاتھوں کو یہ گمان رہتا ہے کہ یہ منحوس دلہن والوں کے رشتہ داری ہوتی ہوں گے اور دلہن والوں کو یہ

یہ ٹھیک ہے کہ یہ یقیناً کشادہ پیٹ والوں کے اخلاص کی رشتہ دار ہوں گے اور کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بن جائے جہالت کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ دیگر کی دعوت ہے یا دعوت ہے سسر کی سوئم فاتحہ کا کھانا دراصل یہی وہ مواقع ہیں جب کہ پیٹ کی ضرورت ہوتی ہے دبلے والوں کا پیٹ دلہن والوں کے جہیز کی طرح سرخ اور سالے و سالیوں کا پیٹ ہریالے کی طرح ہرا ہونا چاہیے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہونے والی ساس ان کے لیے ہریالا بنا ہے اور دلہن والوں کے لیے سب کا پیٹ ہونا چاہیے جو اس بات کی طرف واضح اشارہ کر دے کہ دلہن کے ساتھ نہ دیے جانے سے ان کا مستقبل تاریک و سیاہ ہو گیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے جب مجھے بھی صاحب پیٹ بنایا تو بڑی حیرانی ہوئی کہ جس پیٹ کے تعلق سے اکثر غور کرتے تھے اب وہ دوسروں کے سینے پر گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے کیا پتہ تھا کہ وہی پیٹ ایک دن ہمارے سینہ سے بھی آ لگے گا ۔ اور جب اس کے کرشمے دیکھے تو یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ جب بھی میں نے کوئی پیٹ دیکھا تھا تو صاحب پیٹ کو دیکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا ۔ یہ کمبخت انسان کی اپنی شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے اجلاسوں و سیمیناروں میں پیٹ والے پہلے ہی اتنی تیزی کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں کہ انھیں دیکھنا مشکل ہی ہوتا ہے بلکہ پیٹ والے خود زیادہ سے زیادہ مؤمنین کو اپنا پیٹ دکھانے میں مصروف نظر آتے ہیں ۔

متحدہ عرب امارات کے مرکز ابوظبی میں عالمی تجارتی میلہ میں ہماری کمپنی نے بھی شرکت کی تھی ایک جرمنی پروڈکٹ کمپنی نے جس کے ہم ملک نمائندہ تھے اپنے پروڈکٹ کی نمائش کا اہتمام کیا تھا ۔ اسی سلسلہ میں ہمارا سینہ بھی پیٹ نکلنے کے بعد پھیل گیا تھا ۔ نمائش گاہ شہر سے بیس کلومیٹر دور تھی نمائش میں حصہ لینے والوں کی سہولت کے لیے شہر کی پانچ و سات ستارہ والی ہوٹلوں تک منتظمین نے دو خوبصورت بسیں مہیا کی تھیں جس میں اکثر سفید فام یورپی یہاں شہروں کی سیر کرتے ہیں اور جس میں بیٹھے لوگوں کو گردنیں اونچی کر کے لوگ دیکھا کرتے ہیں کئی بار میں نے بھی گردن اونچی کر کے ان کو دیکھا ہی نہیں بلکہ آہ حسرت بھی بالکل اسی انداز میں کھینچی تھی جس طرح یہ بسیں اپنے ویکیوم باکس سے اضافی ہوا خارج کرتی رہتی ہیں ۔ ہماری بس کے ڈرائیور صاحب اتفاقاً حیدرآبادی تھے ۔ سید خلیفہ اپنے ملک کے دوسرے شہروں میں اپنی خاص زبان استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ لوگ پہچان کر حیدرآبادی ہونے کا طعنہ دیں گے ۔ ہم اردو بولنے والے لیکن دیار غیر میں اپنی شناخت کے اظہار اور اس کی بقا کی کوشش کی جاتی ہے یوں بھی ہمارے کچھ مخصوص حرکات و سکنات بے نیازی ایسے ہیں کہ شناخت کے اظہار کے لیے زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔

یہ پیٹ جس طرح کسی بھی شخص کو صاحب توقیر کر دیتا ہے تو اسی طرح ان حضرات کو جو پیٹ دور رکھنے کے باوجود پیٹ والوں کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں حقیر کر دیتا ہے ایسے ہی ایک واقعہ سے شناسائی EXHIBITOR کو بڑی ہزیمت اٹھانی پڑتی اگر وہ اپنے جامہ میں ہی نہ رہ جاتا تو وہیں کی آستین [illegible] سے الجھنے سے بچ جاتی ۔ ہوا یوں کہ اس EXHIBITOR کو ابھی پیٹ نہیں ملا تھا وہ جب اس بس کی طرف بڑھا جس پر اس کی ہوٹل کا نام درج تھا تو سید بھائی نے بالکل حیدرآبادی پولیس والے کی طرح ہاتھ دکھا کر اسے ناپسند کر دیا اور اس کے ہوٹل کی طرف والی بس کے متعلق پوچھا اس نے کہا کہ کل ہی جاتے تو سید بھائی نے بھی [illegible] کے بعد کہا یہ مخصوص لوگوں کی بس ہے آپ اپنے کی بس میں جائیے

وہ لڑکی LISTEN مسٹر ہدن — LISTEN مسٹر کہتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سعید بھائی کو انگریزی سے چڑ تھی اس لیے نہیں کہ انھیں انگریزی بالکل نہیں آتی تھی بلکہ اس لیے کہ ہندوستانی آخر اپنی زبان کیوں نہیں بولتے۔ بس ان کی کھوپڑی پھر گئی۔ "آپ نیچے اتر جائیے"۔ "پیچھے کھڑے ہیں انھیں تکلیف ہو رہی ہے" ان کے اس جارحانہ رویے سے وہ بھی اپنا جامہ اتارنے پر مجبور ہو گیا جیسے کہ رہا ہو انگریز اور انگریزی تہذیب کی ایسی کی تیسی سعید بھائی نہایت اطمینان سے اسے دھکا دے کر نیچے اتر آئے اور اس غریب کا ہاتھ کھینچنے لگے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مضبوطی سے سیڑھیوں پر لگے ہوئے ڈنڈے کو پکڑ کر اوپر آنے کی کوشش کی سعید بھائی نے بھی زچ ہو کر اس کے بائیں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا اس کی آستین پھٹ کر سعید بھائی کے ہاتھ میں آ گئی اسی اثنا میں وہ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ گیا؛ ادھر سعید بھائی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے لیکن گرتے گرتے انھوں نے اس کے دوسرے ہاتھ کو جھٹکا دیا اس کا دایاں ہاتھ بھی چھوٹ گیا گرتے گرتے اپنی مدافعت میں اس نے سیٹ کے اس حصہ کو پکڑنے کی کوشش کی جو سر ٹیکنے کے لیے سیٹ سے کچھ بلند ہوتا ہے وہ اس کو پکڑ نہ سکا کیونکہ وہ گول تھا۔ اس کا ہاتھ بھی پھسلا اور اپنی جھونک میں سعید بھائی کے اوپر جا گرا ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک پستہ قد مصری اچھل کر پیچھے آیا اور تابڑ توڑ اس ہندوستانی پر گھونسوں کی بارش کر کے اپنے جذبۂ نسلی امتیاز کا ثبوت دیا۔ دراصل جس چیز کو وہ سیٹ کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا وہ اس سوتے ہوئے مصری کا شفاف سر تھا۔

پہلی بار بیج سجائے جب میں ابوظبی کی حیدرآبادی ہوٹل سارہ ریسٹورنٹ (جہاں میں کھانا کھایا کرتا تھا) پہنچا تو ہوٹل کے مالک رشید بھائی نے غور سے میرے بیج کو دیکھا اور میں ان کو دیکھ کر انجان بنا رہا کیونکہ اس کا لطف بھی لینا تھا وہ دو بڑے قدموں سے کاؤنٹر سے باہر نکل کر آئے اور میرے بیج کی دیدہ بوسی کرتے ہوئے بری طرح سے اچھل کر بیرے کو پکارا کہ میں گھبرا گیا۔ "اسے دیکھو صاحب کے لیے میز صاف کر" اور خود پذیرائی میں لگ گئے خاطر داری میں اچانک وضعداری کے اس رویہ کی توقع نہیں تھی میں دیارِ غیر میں دکن میں رہنا چاہتا تھا۔ میری کرسی اس میز پر لگا دی جہاں ایک وجیہہ بارعب فرنچ کٹ والے عرب حضرت بیٹھے تھے۔ اب ایک دولت مند آدمی کے سامنے احساسِ برتری کا اظہار ممکن نہیں اس لیے میں نے اپنے کچھ دانتوں کی نمائش کرنے کے بعد بیج دکھانے کی کوشش کی تاکہ توازنِ رعب برقرار رہ سکے۔ اس میز پر بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ان ہی جیسے جسیم و بارعب صاحب داخل ہوئے اور ہماری میز کی طرف بڑھ کر ان عرب کو دیکھا جنھوں نے دکنی مغلظات میں اپنے ساتھی کا استقبال کیا۔ میں ہکا بکا ہو گیا۔ "اچھا تم لوگ عربی لباس سے [illegible] ہو یہ لو۔ دیکھو میرا بیج" مزید اپنے جسم کو تانا تو ان دونوں کی نظر بالآخر میرے سینے کے بیج پر پڑ گئی۔ انھوں نے بھی میرے بیج کی دیدہ بوسی کی کچھ پڑھا اور اچانک مہذب و شائستہ ہو گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید اس بیج کے نیچے کچھ لکھا ہوگا اب تک لوگوں کے متغیر رویے سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد جب پیسے دینے کاؤنٹر پر گیا تو رشید بھائی پیسے لینے تیار ہی نہیں تھے اور اس بات پر مصر رہے کہ آج میری طرف سے میزبانی قبول کیجیے۔ رشید بھائی نہ صرف ہوٹل چلاتے تھے بلکہ سارہ ریسٹورنٹ میں سارا حیدرآباد سے آتے تھے لہٰذا دکنی کھانوں کے ذریعہ سب کو ایک مرکز پر جمع کیے ہوئے تھے۔ میں ہوٹل سے باہر نکلا تو حسبِ معمول میرے چار یار باہر منتظر تھے ان میں ایک گو کہ میرا ساتھی تو نہیں تھا مگر اس کے ساتھ میری سلام دعا تھی بے تکلفی تھی دوسروں کی طرح جیسے ہی اس نے بھی میرے سینے کا بیج

1

نمبر ۹۲

جبیں بوسی کی اور فوراً اس کے رویے میں بھی تغیر پیدا ہو گیا۔ بعد سلام مجھ سے ہاتھ ملانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اور فوراً گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ گیا باقی کے تین ساتھیوں نے بھی میرے بیاج کی جبیں بوسی کی اور صم بکم ہوگئے۔ میں سوچا کہ آخر دیکھوں تو اس بیج پر کیا منتر لکھا گیا ہے کہ جو بھی بے تکلف دوست ملتا ہے اچانک باتکلف ہو جاتا ہے اور جو میں نے بھی بیج پر غور سے نگاہ ڈالی تو حیرت سے میری بھی آنکھیں حلقوں کا ساتھ چھوڑ گئیں اس بیج پر وہ لکھا تھا جو میں نہیں تھا البتہ تو نہیں بتاؤں گا کہ کیا لکھا تھا بہرحال بیج میری شخصیت پر حاوی ہو گیا تھا اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ میرے اپنے اس بیج کی وجہ سے مجھ سے دور ہو جائیں فوراً بیج کو نوچ کر جیب میں رکھ لیا۔

حیدرآباد

کے

موضوع پر

ممتاز مزاح نگار

عابد معز

کے

تیکھے اور دل چسپ مضامین

واہ حیدرآباد

★

کمپیوٹرپرآفسٹ طباعت

سرورق: شعیب کارٹونسٹ

ناشر:

زندہ دلانِ حیدرآباد

قیمت: ۴۰ روپے

ڈاکٹر سید عابد حسین (بھوپال)

اچھی دُلہن ملے تو کہاں

(تخلص بھوپالی کی "پاندان والی خالہ" پر مبنی بھوپالی لب لہجے میں ایک ریڈیو ڈرامہ !)

(زنجیر کھڑکھڑانے کی آواز)

بہو : کون ؟

زیتون : ارے مَیں ہوں زیتون بی۔ اللہ مارا کون سا ڈاکہ پڑا جا رہا ہے جو دن دھاڑے کُنڈی چڑھائے بیٹھی ہو۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

بہو : کون ؟ مَیں پہچانی نہیں۔

زیتون : اور بائی تو کون ہے۔ کیا ہوا نجات کو۔ وہ بھی ہو گئی اللہ کو پیاری۔

خالہ (اندر سے) : ارے کون ہے بہو۔

بہو : (اونچی آواز سے) کوئی زیتون بی ہیں۔ آپ کا پوچھ رہی ہیں خالہ۔

خالہ : ارے زیتون تو۔ زندہ ہے ابھی۔ مَیں تو فاتحہ پڑھ چکی تھی تجھ پر۔ اس شبرات بھی دعا مانگی تھی اللہ زیتون کو بخش دینا۔ اس نے بڑا دل جلایا ہے۔

زیتون : ارے نجات یہ ڈھکوسلے چھوڑ۔ سٹھیا گئی پر زبان ویسی ہی قینچی کی طرح چلتی ہے جیسے پچاس سال پہلے۔

خالہ : اری بہو۔ تو ہکا بکا کیوں کھڑی ہے۔ کھٹیا ادھر سرکا دے۔ اسی پر بیٹھیں گے۔ یہ زیتون ہے۔ میری بچپن کی سہیلی۔ اب بھی پہلے کی طرح ٹھکانا لگی ہے۔ لیکن اس کے کاٹے سے ابھی تک کوئی مرا نہیں

(دونوں ہنستی ہیں)۔

زیتون : اری تو کیسی چاندنی سی بہو لائی ہے۔ خدا تجھے شرمائے نجات اپنے دونوں کیڑوں کی ایک ہی ایک شادی کر لی اور بھولے منہ سے یہ نہیں بتا کہ دو پیسے کا خط ڈال دیتی مُرغ ڈبے میں۔

خالہ : لو اور سنو۔ دو مرتبہ لڑکے کو تمہارے گھر بھیج کر بلوایا۔ تمہارے داماد نے یہی کہا کہ ابھی بمبئی میں ہو۔ بمبئی کو تو تم نے ایسا دانتوں سے پکڑا رہے کہ خدائیوں میں نہیں چھوڑتیں کہیں جھاڑو پھرے سینما میں جا گے اچھل کود نے تو نہیں لگی تو ؟

زیتون : ہاں مَیں تو کرنے ہوں گی سینما میں۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ البتہ تیری بہو ضرور ایسی ہے کہ اگر رنگ روغن لگا کے چلی جائے تو اب بھی جتنا تھیٹر والے تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔

۱؎ پاندان والی خالہ کا نام

۲؎ دونوں بچے

خالہ: (سرگوشی کے لہجے میں) اری چپ کمبخت۔ وہ دلہن سُن رہی ہوگی۔ بہنی کیا گئی ہے کہ دیدوں کا پانی مرگیا۔ ہاتھ بھر کی زبان لے کے آئی ہے۔

زیتون: (رازدارانہ لہجے میں) اچھا نجات تجھے قسم ہے میرے سر کی سچ سچ بتا۔

خالہ: اللہ خیر۔ کون سا آسمان ٹوٹ پڑا۔

زیتون: سُنا تھا تو نے غفور دادا سے نکاح کرلیا۔

خالہ: خُدا تجھے شرمائے زیتون۔ مَیں نے تو سنا تھا کہ تو کسی کے گھر میں جا بیٹھی۔ بڑھی ہوگئی مگر باتیں ایسی کرے گی۔ آگ لگے تجھ کا سرنہ پیسہ۔

زیتون: ارے کیوں جلتی ہے نجات؟

خالہ: خصم کرنا ہوتا تو اللہ بخشے اُن کے مرنے کے بعد وہ شاکر[1] علی خاں کا پیغام آیا تھا۔ مگر بندی نے صفا ٹال دیا۔ آج پچیس سال ہوگئے مرے ہوئے کے نام پے بیٹھی ہوں۔

زیتون: اچھا نجات اب یہ باتیں چھوڑو۔ کام کی بات سنو جس کے لیے یہاں تک سیر توڑ کے میں آئی ہے۔

خالہ: وہ تو جانتے تھے۔ بی بی زیتون اور بلا مطلب کے کہیں جائیں۔ خیر کھلو۔ بولو۔

زیتون: اچھا یہ طعنے تشنے تو باتی بند کر۔ اب ذرا ڈھنگ سے سُن لے میری بات۔ وہ اللہ رکھے تیرے غلام کی سگائی کرنا چاہتی ہوں یہ سوملا کھیڑی کے جاگیردار کی لڑکی ہے

خالہ: بڑا نہیں۔ توبہ کر توبہ۔ ایسی لڑکی ہے کہ سارا گھر نچا دے گی پورے گھر کو۔ بڑی چڑچڑی اور زبان دراز ہے۔ مَیں نے بھی اپنے لڑکے کی بات چلائی تھی۔ سُنا تو نے لڑکی نے نقیبن سے کیا پوچھا تھا؟

زیتون: کیا؟

خالہ: پوچھنے لگی ہوئی پیغام تو لے آئیں مگر لڑکا کچھ پڑھا لکھا ہے اور کماتا دھماتا بھی ہے۔

زیتون: نہ بابا نہ۔ ایسی بے غیرت بے حیا لڑکی مجھے نہیں چاہیئے۔ اچھا وہ نواب تعلقدار کی بھانجی کا حال؟

خالہ: مَیں کہوں باتی اس کو گھر میں لانے کے بجائے اپنے لڑکے کو کنوارا ہی پڑا رہنے دو۔ لڑکی ہے کہ آگ لگی ہتھنی کی ہتھنی۔ یہ آل بتھل[2] رکھی ہے۔ تمہارا لڑکا تو اس کے سامنے ایسا لگے گا جیسے کدّو کا ڈنٹھل۔

زیتون: اچھا وہ رجب علی داروغہ کی لڑکی کیسی ہے گی

خالہ: اے زیتون، کمبخت ماری وہ تو سیلی پٹاخری ہے۔ جب دیکھو بیمار۔ مجھے تو دِق کی مریض معلوم ہوتی ہے۔ پھر آنکھیں دیکھو تو جیسے اِلی کے بیج۔ منہ کی بھاڑ، اللہ ہے توبہ، بالشت بھر کی۔ پیشانی پوری بالوں سے بھری ہوئی۔

زیتون: توبہ ہے تو کیا لڑکے کو زندگی بھر لنڈورا ہی بیٹھا رہنے دوں۔ تمہیں تو باتی کوئی لڑکی پسند ہی نہیں۔

خالہ: اب باتی جتنے گھر تم نے بتائے وہ تو سب ایسے ہی ہیں۔ بے فضول کی تعریف تو مرکے بھی آٹھوں، تو نہیں کروں گی۔

---

[1] مجھ پالک کے ایک مقتدر مزدور لیڈر جن کی سالہ و شادی نہیں کی۔ [2] خوب موٹی۔

زیتون : اچھا شمس الدین خاں مستند کی سالی کیسی ہے
خالہ : ہوں! معلوم ہے اُس کی عمر کیا ہے جوانی سے اُتر گئی۔ بیس سال تو مجھے ہو گئے اس کے پیغام سلام تکتے دیکھ کے۔ کوئی خرابی ہوگی جب ہی تو گھر بیٹھی ہے۔ تم بھی تو اپنی کچھ بُڈھی عقل سے سوچو۔
زیتون : اچھا یہ تمہارے محلّے میں رہتے ہیں نصیر خاں اِنس پیکٹر
خالہ : نصیر انس پکٹر کی آس نہ اولاد۔ کیا اُس کی جورو سے پیغام لگواؤ گی۔
زیتون : اے نہیں۔ خدا تجھے سمجھے۔ ایک بات میں کہتی ہوں تو دس باتیں تو سنا دیتی ہے ۔ اے اس کی بہن ہے۔
خالہ : ہوں تو اب گانے بجانے والی کو لاؤ گی گھر میں زیتون کیوں؟ کیا بائی پیشہ کرائے گی اُس سے؟ معلوم ہے اس کی بڑی بہن قوالن ہے۔ ہزاروں میں بیٹھ کے تالیں بجا بجا کے گاتی ہے جھاڑو پھری۔ خربوزے کو دیکھ کے خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ بڑی کو دیکھ کے چھوٹی بھی حلق پھاڑنے لگی ہوگی۔
زیتون : بس کر سنجات، معلوم ہو گیا تجھے تو کمبخت پورے شہر میں ایک لڑکی بھی کام کی نہیں دکھائی دیتی۔ اللہ کی تجھ پہ مار۔
خالہ : تو پھر آئیں تھیں کیوں۔ کوئی تمہارے ہاتھ جوڑنے تو گئے تھے نہیں۔ او بی بی ہم تمہیں بتائیں گے لڑکی۔ اب پوچھتی ہو تو بتاؤ یا سب سچ سچ جو ہو جانتے تھے۔ سچ منظور نہیں تو جاؤ۔ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔

زیتون : لیکن اللہ کی بندی تو نے ایک ایک کر کے سب کے کیڑے نکال دیئے۔ اب تو ہی بتا کر لڑکی کیسی
خالہ : ہاں یہ بات ایک تم نے ڈھنگ کی پوچھی۔ تو سنو زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو۔ بس قرآن، بہشتی زیور پڑھ لے۔ گھر گرہست ہو۔ سینے پرونے میں ٹھیک ہو۔ اور دیکھو زیادہ کالی بھی نہ ہو کہ رات میں گھل مل جائے۔ نہ اتنی خوبصورت کہ مردوئے سیٹیاں بجاتے پیچھے لگیں۔ بس موافق کی ہو۔
زیتون : اچھا بائی پھر آؤں گی۔
خالہ : اچھا تو زیتون پھر جلدی خبر لینا۔ اور ہاں رستے میں کسی مردوئے سے بات چیت مت کرنا میکا گھر جانا" (دونوں ہنستی ہیں)

(موسیقی کا لمبا وقفہ۔ منظر بدلتا ہے)

(دروازے کی زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ)

بہو : خالہ، خالہ۔ وہ آئی ہیں آپ کی سہیلی، زیتون خالہ۔
خالہ : اسے ادھر ہی لے آ۔ دالان میں۔ میرے تو جی جان سے رہ رہ کے پیٹ میں درد اٹھ رہا تھا۔ کدھر گئی مُردار۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی بھی ملی یا اسی غم میں سدھار گئی۔
زیتون : کیوں مری جاتی ہے۔ یہی بتانے تو آئی ہوں تجھے
خالہ : کیسی ہے؟
زیتون : کچھ نہ پوچھ۔ لڑکی کیا ہے جیسے آسمان سے چاند اُتر آیا ہو۔ بشریٰ ایسی کہ جب سے میں گئی ہوں اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔
خالہ : تو کیا زیتون کسی اندھی لڑکی کو دیکھ آئی بائی۔ پہلے خوب پڑھا پڑھ کے دیکھ لینا۔ نہیں تو کہیں بچارا خصم ہاتھ میں لکڑی لیے پھرتا ہے [illegible]
زیتون : لو بھئی اللہ سُنو۔ اس آگ لگی [illegible] دے رہی ہے، کیسی [illegible] ہے؟

خدا تجھے حیا دے نجات، اتنی بھی گئی بیتی میں نہیں کہ اندھی اور آنکھوں والی میں تمیز مجھ سے نہ ہو۔

خالہ : چل چل، بڑی بنتی ہے سیانی۔ ایسے ہی سیانے تو کرتے ہیں گدھے میں۔

زیتون : میری توبہ، میں بھی کہاں آئی۔ تجھ سے مشورہ لینا تو کیچڑ میں پتھر پھینکنا ہے۔ اُلٹے اپنے منہ پر چھینٹے آتے ہیں۔ اللہ جھوٹ نہ بلائے دس لڑکیوں کا پوچھا ہوگا مگر مجال تو ہے ایک بھی پسند آئی ہو۔ تو اپنے کو ہی دیکھ، تجھ جیسی زبان دراز اور پھوہڑ کو جب خصم مل گیا تو دوسروں کی بھی اُلٹی سیدھی نبھ ہی جائے گی!

خالہ : ارے ہٹ اُدھر۔ اللہ نہ کرے میں پھوہڑ ہوں۔ ہزاروں میں ایک تھی۔ پیغاموں کی لام ڈور سی لگی رہتی تھی میرے گھر پے۔

زیتون : یہ کسی اور کو بتانا مجھ سے نہیں چلے گا۔ بچپن سے جانتی ہوں تیری نس نس کو۔

خالہ : تنک چڑھی تو تُو ہے ہمیشہ کی ہے۔ بس اپنی ہاں میں ہاں ملوانا چاہتی ہے۔ تیرے دل کی سی کوئی کہہ دے تو ٹھیک، نہیں تو جھاڑ پھر جھاڑتے جھاڑ ہیں۔

زیتون : اری نجات اب بڑھاپے میں تو یہ اینٹھنا اُمٹھنا چھوڑ دے۔

خالہ : لیکن یہ تو تو بتا کہ یہ پری تجھے ملی کہاں ؟

زیتون : وہ مولوی نور الہٰی جو . . . . .

خالہ : بس بس بائی معلوم ہوگیا۔ نور تو کیا پھٹ مار برس رہی ہے آگ لگے کے منہ پے اللہ کی۔ یہ دیکھو میرے مکان پے ہیرے پھیر کرکے اور مجھے پٹا پٹا کے دو ہزار روپے دے دیئے اب دن رات تقاضے کر رہا ہے۔ سنئے بات کرتے گیا تو، خدا اُسے دوزخ کا کُندا بنائے، کہنے لگا ایک ہزار اور لے لو اور مکان میرے نام کر دو۔

زیتون : جب قرض لیا ہے تو واپس تو کرنا ہوگا۔

خالہ : خدا نہ کرے ہم کوئی نادہندہ ہیں۔ اللہ جب دے گا ضرور واپس کریں گے۔ لیکن بائی اصل بات تو یہ ہے کہ بے ایمان کے دانت اس گھر پر ہیں۔ اور زیتون ذرا تو بھی سوچ موٹی بدعقل کہ جس لڑکی کا باپ ایسا سوت پڑا بے ایمان ہو اس کی بے ایمانی کے پیسے سے پلی بچی تیرے گھر میں کیا برکت لائے گی۔

زیتون : اب سچ پوچھو تو بائی مجھے تو گھر بڑا صاف ستھرا دکھا۔ ہر چیز قاعدے قرینے سے رکھی تھیں۔ عورتیں بھی سلیقہ وند معلوم پڑتی تھیں۔

خالہ : اوں ہونھ۔ صاف صفائی مت دیکھو گھر کی۔ گُن دیکھو گھر والوں کے۔ یہی اوپری صفائی دیکھ کے تو لوگ پھنس جاتے ہیں۔ پھر روتے ہیں۔ زندگی بھر۔

زیتون : تو پھر اور کوئی لڑکی دیکھوں کیا؟

خالہ : شادی کرنا ہے تو دیکھنا پڑے گی۔ سال سال بھر پاؤں ٹوٹے ہیں پھر پھر کے۔ تب کہیں جا کے ڈھنگ کی بہو ملی تھی۔

زیتون : اچھا تو اب قلعدار صاحب کی بھتیجی کو دیکھوں ؟! موت پڑی جا لو کچھ تو رائے دے مجھے۔

خالہ : اللہ نہ کرے میں جالو ہوؤں۔ لو بھی ایک تو بدعقل جھاڑو پھیری کو ٹھیک رستہ بتاؤ اور اُوپر سے گالیاں سنو۔ اور کیوں بائی گھر داماد رکھوانے کا ارادہ ہے کیا۔ ورنہ دیکھ لینا اگر جنا جنگ کی تو لڑکی کیا کروائے گی میاں سے۔ عورت ہو کے گھر میں تو اپنی حیثیت سے کم۔!

زیتون : اے چل ہٹ۔ تجھ سے کون جھاڑو پھیری کے گا

غریب ہوئے تو بیکار ۔ امیر ہوئے تو بیکار ۔ میں آگ لگی کہاں مشورہ لینے آگئی ۔ تیرے مشوروں پر کوئی چلے تو اللہ چاہے زندگی بھر کنوارا ہی بیٹھا رہے ۔ توبہ ہے ۔

خالہ : اری تیری غرض پڑی تھی تو ہی آئی تھی ناک رگڑتی ۔ ہائی بتا دے کس سے اپنے بیٹے کا بیاہ کردوں ۔ تیرا ہاتھ تو پکڑ کر نہ لائے تھے ۔ غضب خدا کا سچ بولو اور اُلٹے گالیں سُنو ۔

زیتون : سہیلی سمجھ کر آئی تھی دل کا دکھڑا لے کر ۔ لیکن تو نے کبھی کلیجا ٹھنڈا کیا ہے جو اب کرے گی ۔ خدا ۔ نجات تجھے اب تو اٹھا لے جھاڑو پھری جو دنیا کو نجات ملے ۔

(دروازہ دھڑ سے بند ہونے کی آواز)

خالہ : گئی کمبخت ۔ خود بھی پاگل بنی در در کے چکر لگا رہی ہے اور مجھے بھی پاگل کر دیا ۔ اللہ کسی کو شادی کے چکر میں نہ ڈالے ۔ نہ آگ لگے لڑکوں میں ڈھنگ نہ لڑکیوں میں ۔ اللہ ہی ہے جو یہ پار لگ جائیں ۔ اس چودھویں صدی میں ۔

غزل

محمد حنیف انصاری

دِل پانی پانی آبروئے غم دار دیکھ کر
سر خم ہوا ہمارا در یار دیکھ کر

تھرّایا جسم تیورِ دل دار دیکھ کر
دِل کانپتا ہے ابرو کی تلوار دیکھ کر

بیوی کا مری شوقِ خریداری دیکھئے
خالی کرادی جیب وہ بازار دیکھ کر

زیر و زبر نظامِ زمانہ ہے ان دنوں
ہوتا ہے یہ گماں مجھے گھر بار دیکھ کر

موسم کی سختیوں کا کروں کیا؟ مقابلہ
گم عقل و ہوش ہیں در و دیوار دیکھ کر

عُریاں لباس جسم پہ تھا اس طرح سجا
شرما گئی حیا نئے اطوار دیکھ کر

مجھ کو یقین ہے کہ نہ آئیں گے وہ حنیف
ملتے تھے وہ کبھی مجھے زردار دیکھ کر

فضل حسنین (الٰہ آباد)

مانگنے کا فن

یوں تو مانگنا دُنیا کے قدیم ترین پیشوں میں سے ایک ہے البتہ اس فن کے نت نئے طریقے ضرور ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ مانگنا اب اِتنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا اور اگر سمجھا بھی جائے تو اس کے بغیر گزارا بھی کہاں؟ ہماری آپکی تو بات ہی کیا جانے کتنے ملک اسی قرض کے سہارے ٹکے ہیں۔

مانگنے والوں کی قسمیں بے شمار ہیں۔ اس لیے ہم اس وقت صرف کچھ ایسے مانگنے والوں کا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کریں گے جو کچھ لیتے ہی ہیں کبھی نہ واپس کرنے کے لیے۔

ہمارے ایک شناسا اکثر ہم سے سو روپے کا چکر مانگتے ہیں اور وہ بھی ماہ کے اواخر میں جب ہم خود تنخواہ کے انتظار میں گنتی گننے میں مصروف ہوتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ مہینے کا آخری ہفتہ ملازمت پیشہ کے لیے کتنا نازک ہوتا ہے۔ بہرحال ہم ان صاحب سے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کرتے ہیں "بھائی! سو روپے کی بات کرکے کیوں دل کو چوٹ پہونچاتے ہو۔ بھلا اب دس بیس روپے ہی بچے رہ گئے ہوں تو بہت ہیں۔" اس پر موصوف نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں۔ "اچھا لاؤ بھی جو ہے وہی دے دو! ابھی تو کام چلے۔ پھر سو کا نوٹ ٹوٹے گا تو واپس کر دوں گا۔" اور آپ یقین جانئے کہ پھر وہ سو کا نوٹ شاید ہی ٹوٹ پاتا ہے۔ کیوں کہ جب ہم انھیں یاد دہانی کرانے کی نیت کرتے ہیں تو ان کے سامنے پھر وہی مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس مخصوص نوٹ کا راز تو اس روز کھلا جب ہم نے تیسرے ماہ اسی نوٹ کو پہچان لیا۔ تب معلوم ہوا کہ موصوف اس سو کے نوٹ کو صرف قرض مانگنے کے لیے ہی استعمال میں لاتے ہیں۔ وہ نوٹ کبھی ٹوٹتا نہیں۔

بات نوٹ کی نکل پڑی ہے تو ہماری بیگم کی ایک چہیتی سہیلی صاحبہ کا انداز بھی دیکھتے چلئے۔ وہ محترمہ جب بھی ہمارے یہاں تشریف لاتی ہیں تو باہر سے ہی واویلا مچانا شروع کرتی ہیں۔ جب بیگم دروازے پر پہونچ جاتی ہیں تو ان کی سہیلی صاحبہ نہایت اطمینان سے رکشے والے کو اتنا بڑا نوٹ دکھاتی ہیں جس کے بھنائے جانے کا ذرا بھی امکان نہ ہو۔ نتیجتاً ہماری بیگم صاحبہ کو ہی رکشے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

چینی، چائے کی پتی اور آٹا کچھ ایسے آئٹم ہیں جن کا لین دین اگر پڑوسیوں میں نہ ہو تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ پڑوسیوں سے تعلقات مخدوش ہیں کیا ان سے بنتی نہیں۔ اس لیے ان چیزوں کا مانگنا ہی غیر فطری سمجھا جاتا ہے لیکن آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ ہمارے ایک دوست کافی دنوں سے ہمارا سوٹ پہن کر ہی تقریبات کی زینت بن رہے ہیں۔ اتفاق سے ہم کچھ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارا وہ سوٹ اس دوست کے جسم پر

صحیح بیٹھتا ہے یہاں تک کہ ایک دن ہمارے ایک شتر کے شناسا نے ہمیں ٹوک ہی دیا۔ "یار! یہ سوٹ جس کا ہے اسی پہ جچتا ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ اتنے اچھے سوٹ کی بے عزتی کرتے ہو"؟ بات سچ بھی ہے۔ بیچارے اس دوست کا کہنا تھا کہ ہمارے سوٹ کچھ اور ڈھیلا کر دیا۔ اس لیے وہ سوٹ اب واقعی بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کو یہ جان کر مزید حیرت ہوگی کہ ہمارے سوٹ کا کپڑا انھوں نے اپنی پسند سے ہی خرید وایا تھا اور درزی کے یہاں موصوف ہمارے ساتھ ساتھ گئے تھے نیز سوٹ کچھ ڈھیلا ہی تیار کرنے کی تاکید بھی فرمائی تھی ہمیں اس وقت گمان بھی نہ گزرا کہ موصوف کے منصوبے کتنے دور رس ہیں۔ بلکہ اس معاملے میں خواتین ہی بہتر ہیں کہ سلوانے کے تین دن میں جسم پر فٹ ہونے کا چکر نہیں ہوتا۔

ایسے مسافر تو آپ کو بھی اکثر ملے ہوں گے جن کی جیب کٹ چکی ہوتی ہے یا وہ لٹ چکے ہوتے ہیں اور انہیں اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لیے کرایہ درکار ہوتا ہے لیکن جب ایسے مسافروں کی جیبیں اکثر کٹنے لگیں تو لوگوں نے کرائے کی رقم دینے کے بجائے ٹکٹ خرید کر دینا شروع کر دیا لیکن محکمہ ریلوے کی ٹکٹ واپسی کی سہولت ان مسافروں کے کام آنے لگی۔ پھر جب اس اسٹائل کا بھی بھانڈا پھوٹنے لگا اور لوگوں نے اس قسم کے مسافروں پر ترس کھانا چھوڑ دیا تو ایک روز ہم نے ایک ایسے مسافر کو دیکھا جو ایک چوراہے پر کھڑا لوگوں سے دریافت کر رہا تھا۔ "بھیا! یہ سڑک کہاں جاتی ہے"؟ لوگوں نے بتایا۔ "مرزا پور"۔ اس نے پھر دوسری جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہ سڑک کہاں جاتی ہے"؟ لوگوں نے بتا دیا۔ "کانپور"۔ اور وہ مسافر اسی سڑک پر خراماں خراماں چل پڑا۔ وہاں موجود لوگوں کو حیرت ہوئی اور ان میں سے ایک نے آواز دے کر اسے روکا اور بولا۔ "ارے بھائی کانپور یہاں سے بہت دور ہے۔ کیا پیدل ہی جاؤ گے"؟ اس پر مسافر نے بڑی معصومیت کے جواب دیا۔ "پھر کیا کروں بھائی جی! کسی طرح پہنچ ہی جاؤں گا۔ دراصل میرے روپے کہیں گر گئے اور میں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہیں"۔ اتنا سنتے ہی وہاں موجود لوگ اس کی خودداری کی داد دینے لگے اور سب نے چندہ کر کے کانپور تک کا کرایہ اسے [illegible] تھما دیا یہ الگ بات ہے کہ وہی مسافر جب ایک دوسرے چوراہے پر یہی سین دہراتا ہوا نظر آیا تو پہلے واقعے میں موجود ایک صاحب نے اسے دوڑا لیا۔

اب ایک ادبی حادثہ "بھی ملاحظہ فرمالیں جو ہمیں بھلائے نہیں بھولتا۔

ہوا یوں کہ ہمارے ایک شناسا شاعر کے پاس ایک روز ایک روایتی قسم کے شاعر صاحب تشریف لے آئے اور بغیر کسی تکلف یا تامل یوں گویا ہوئے۔ "استاد! مجھے آج ایک مشاعرے میں جانا ہے اور میں ادھر کافی دنوں سے خالص غیر ادبی مشاغل میں ملوث رہا ہوں اس لیے غزل کہہ نہیں پایا اور میرا پہلے کا کلام سامعین اب کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب مشاعرے کتنی مشکل سے رسائی ہو پاتی ہے اس لیے یہ موقع جانے بھی نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے اپنی کوئی تازہ غزل عنایت فرما دیجیے پھر جیسے ہی مجھ سے کوئی غزل ہوگی فوراً ادا کر دوں گا"۔

مانگنے کی ایک نئی اسٹائل کے شکار ہم ابھی حال ہی میں ہوئے جب ایک شناسا نے ہم سے کہا "یار تمہارے پاس دس دس کے دو یا پانچ پانچ کے چار نوٹ ہوں گے"؟ ہم نے اپنی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر ان کی جانب بڑھا دیئے۔ موصوف نے آنکھوں میں فاتحانہ چمک پیدا کرتے ہوئے ہمارا شکریہ ادا کیا اور نوٹ ہمارے ہاتھ سے یوں اچک لیے جیسے اگر انھوں نے اس عمل میں ذرا بھی تاخیر کی تو نوٹ اپنی اصل جگہ

جیب میں واپس چلی جائیں گی۔ اس کے بعد موصوف اس حادثے کو یکسر فراموش کرتے ہوئے دیگر لغویات میں مشغول ہوگئے کچھ دیر کے بعد ہم نے انھیں پھر اصل بات یاد دلائی کہ "تم نے مجھے بیس کا نوٹ دے دیا؟" "بیس کا نوٹ"؟ انھوں نے پوری طرح چونکتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ان سے کہیں زیادہ چونکتے ہوئے کہا: "ابھی تم نے مجھ سے بیس کا نوٹ نکلوا لیا تھا نا؟ اس پر موصوف نے ایک مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا۔ "ارے یار! تم بھی کمال کرتے ہو۔ اگر بیس کا نوٹ میرے پاس ہوتا تو تمہیں کیوں خواہ مخواہ زحمت دیتا۔ دراصل اس وقت مجھے بیس روپے کی سخت ضرورت تھی اس لیے تم سے اس طرح مانگنا پڑا کہ انکار کی ذرا بھی گنجائش نہ رہ سکے۔

ان مانگنے والوں کے درمیان رہتے ہوئے اب ہم نے بھی یہ فن سیکھنا شروع کردیا ہے۔ مثلاً اسکوٹر چلانے کا شوق ہم اپنے سوٹ والے دوست کی اسکوٹر سے ہی پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتفاق سے وہ صاحب ہمیں اب بھی اتنا ہی معصوم سمجھتے ہیں جتنا کہ ہم پہلے کبھی ہوا کرتے تھے۔ انھیں کیا معلوم کہ زمانہ کی ستم ظریفی نے ہمیں بھی سمجھ دار بنادیا ہے۔ چنانچہ اب ان کی اسکوٹر کا واسطہ ان سے عموماً پٹرول بھروانے تک ہی رہتا ہے۔ ہاں کبھی جب اسکوٹر ستانے لگتی ہے تو ضرور ہم کچھ دنوں کے لیے اسے ان کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں اسکوٹر کی صحت بحال ہوئی ہم پھر اس پر اپنا قبضہ بحال کرلیتے ہیں۔ سنا ہے اب وہ اپنے استعمال کے لیے کوئی دوسرا اسکوٹر خریدنے کی سوچ رہے ہیں کیونکہ ایک روز دبی زبان سے کہہ بھی رہے تھے کہ اگر کہیئے تو آپ کے لیے کوئی سیکنڈ ہینڈ اسکوٹر ہی دیکھوں۔ جس پر ہم نے پورے خلوص کے ساتھ کہا تھا۔ "نہیں یار! میرا ہاتھ اس اسکوٹر پر اتنا سٹ ہوچکا ہے کہ دوسرا اسکوٹر اب شاید ہی جمے۔ اسی کو چلنے دو۔"

آخر میں ہم آپ سے بھی یہی عرض کرنا چاہیں گے کہ اگر آپ بھی اس طرح کے مانگنے والوں سے عاجز ہوں تو اس فن کو خود اپناتے ہوئے پیش بندی کرکے اپنی جان بچایئے نیز حتی الامکان خود کو مستفید کرنے کی کوشش بھی کیجیے!

نیاز سواتی
(پاکستان)

سائیں

تو مجھے ایسا کوئی گوشت کھلا دے سائیں!
جو بڑھاپے میں جواں مجھ کو بنا دے سائیں!
خود جو کھاتا ہے مجھے بھی وہ کھلا دے سائیں!
اپنے جیسا مجھے مشٹنڈا بنا دے سائیں!
کار والا اُسے ہفتے میں بنا دے سائیں!
نوکری بیٹے کو سسٹم میں دلا دے سائیں!
دوسری پارٹی جلسہ جو کرنے پائے
اُس کے جلسے میں کوئی پھڈا کرا دے سائیں!
والدہ میری بضد ہے کہ کروں میں شادی
مجھ کو شادی کی مصیبت سے چھڑا دے سائیں!
قرض لے کر جو نظر پھر نہیں آیا مجھ کو
مجھ سے بچھڑا ہوا وہ یار ملا دے سائیں!
ایسے تعویذ کی حاجت ہے مجھے شدّت سے
جو مری ساس کو بیگم سے لڑا دے سائیں!
پھر کہے گی نہ تری اہلیہ "بیمار ہوں میں"
وجہِ بیماری اگر، عمر بتا دے سائیں!
کالا بکرا میں تری نذر کروں گا لا کر
مجھ کو ڈسکو کی وبا سے جو چھڑا دے سائیں!

نذیر بن ضمیر
(مالیگاؤں)

ہے قولِ شیکسپیئر کا کیا نام میں دھرا ہے

ہے قولِ شیکسپیئر کا کیا نام میں دھرا ہے!

صاحب ہیں ایک عاقل ہے اُن کا نام 'بدھو'
ہر گل ہے جن کی میٹھی کہتے ہیں اُن کو بیدھو
جھینگر سے ڈرنے والے صاحب کا نام شیرو
تاجر تو تیز رَو ہیں کہلائیں سیٹھ دھیرو
رحمت تو سر سے پا تک سب کے لیے ہے زحمت
ذی شان علی کی دیکھو کچھ شان ہے نہ عظمت
ناکردہ کرم کو کہتے ہیں شیخ اکرم
کمزور و ناتواں کا اسمِ گرامی رستم

ہے قولِ شیکسپیئر کا کیا نام میں دھرا ہے!

رنگت ہے کالی کالی پر نام ہے جمیلہ
صورت نہ شکل کی ہے کہلائے مس شکیلہ
شہناز و ناز بیگم ناز و ادا سے عاری
نازک سی نازنیں تو دس پانچ پہ ہے بھاری
قسمت کو اپنی روئیں بی سعدیہ سعیدہ
بے کیف سی غزل ہے بد ذوق ہے [illegible]
تا حد ہے [illegible]
نکلیں مس تبسم بیگم [illegible]
ہے قولِ شیکسپیئر کا کیا نام میں دھرا ہے
اپنے عمل سے انساں اچھا بُرا بنا ہے

شاہد رشید (امراوتی)

نمونہ ہائے فنِ چمچہ گری

انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ ترقی کے مدارج کتنے کم وقت میں طے کرتا ہے اگر وہ کئی سال تک ایک ہی پوسٹ پر براجمان رہتا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ موصوف کے پاس "ضروری قابلیت" کی کمی ہے۔ ضروری قابلیت یعنی چمچہ گری وہ دو منہ کا سانپ ہے۔ جس کے ایک منہ میں زہر اور دوسرے منہ میں گوہر ہوتا ہے۔ اس کا ڈسا نہ مرتا ہے نہ زندہ رہتا ہے۔ جتنا زہر کو نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اتنا خون میں سرایت کرتا جاتا ہے گوہر تو پھر گوہر ہے اسے کون لے سکتا ہے!

کچھ لوگ چمچوں کے عاشق کچھ شوقین اور کچھ بذاتِ خود چمچے ہوتے ہیں۔ عشق اور مشک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چھپائے نہیں چھپتا۔ کہتے ہیں کہ ایک ملک کے وزیر اعظم کے ساتھ ان کے وزراء ایک دعوت میں مدعو تھے۔ وزیر اعظم کی کابینہ میں ایک وزیر چمچوں کے بے انتہا عاشق تھے۔ چمچوں کے حاصل کرنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ وزیر موصوف نے دورانِ دعوت چاندی کا چمچہ نظر بچا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وزیر اعظم کی نظروں پر پڑ گئی کھانا ختم ہونے کے بعد وزیر اعظم نے میز پر بیٹھے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج میں آپ کو ایک جادو دکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وزیر اعظم نے ٹیبل سے چمچہ اٹھا کر اپنی شیروانی کی جیب میں ڈال لیا اور لوگوں سے کہا کہ دیکھئے یہ چمچہ اب میں ہمارے وزیر صاحب کی جیب سے نکالتا ہوں۔ لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وزیر اعظم نے وزیر موصوف کی جیب سے چمچہ برآمد کیا۔ معاشرتی چمچے بھی اسی طرح اڑائے جاتے ہیں کبھی کو نیا چمچہ میسر آجاتا ہے اور کوئی بے چمچہ شرمندہ سا کھڑا رہتا ہے۔ آدمی کا بے چمچہ ہونا بھی ایسا ہی قابلِ رحم ہے جیسے کسی زردار کا بے وقعت ہو جانا۔ چمچہ سوشل اسٹیٹس (SOCIAL STATUS) ہے۔ اور اسی لیے چمچہ دکھانے کی چیز ہے۔

اگر آپ کو کسی شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہو کہ وہ کتنا بڑا ہے۔ تو آپ کو جاننا چاہیئے کہ اس شہر میں کتنے ویڈیو سینٹر اور سینما گھر ہیں۔ اسی طرح آدمی جتنا بڑا ہوگا چمچوں کی فوج اس کے پاس اتنی بڑی ہوگی۔ [illegible] آپ ہی سمجھ لیجئے۔ ہماری انجمن نے ایک ادبی جلسہ کی صدارت کے لیے صوبہ کے ایک سرکردہ لیڈر کو مدعو کیا۔ [illegible] دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ڈائس پر جہاں ادیبوں کی نشستیں متعین تھیں ان پر لیڈر صاحب کے [illegible] چمچے براجمان ہو چکے تھے۔ انجمن کے سکریٹری نے اپنی استقبالیہ تقریر کے خاتمہ پر جب یہ شعر پڑھا

"وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"

تو مجمع سے آواز آئی۔

"کبھی ہم ان کو کبھی ان کے چمچوں کو دیکھتے ہیں"

چمچہ گری ایک فن ہے۔ کامیاب زندگی کے لیے اس سے واقفیت ضروری ہے۔ ہم نے بارہا اس فن کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ آپ بھی ہمارا ایک تجربہ سُنئے۔ آفس میں روزانہ کام کے ساتھ باس کی ڈانٹ کھانا ہمارے روٹین میں شامل تھا۔ چھٹی کے دن ہمیں دن بھر کھٹی ڈکاریں ستاتی رہتی تھیں باس کی ڈانٹ ہمارے لیے نعم ہضم غذا کا کام کرتی تھی لیکن بُرا ہو ہمارے ساتھیوں کا کہ ادھر ہم ڈانٹ کھاکر واپس آئے اور ادھر ان کی کھی کھی کھی . . . . . شروع ہو جاتی۔ ہم ان کی ہنسی پر پیچ و تاب کھاتے رہتے آخر ہم نے اس کا کامیاب حل تلاش کر ہی لیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن کا غذات پر باس کی دستخط لینے کے لیے پہنچے تو اس کی تیوری پر بل دیکھتے ہی دس کا ہندسہ نمودار ہو چکا تھا۔

کیا یہ آپ نے لکھا ہے؟

جی۔!

آپ کو کلرک نہیں کسی آفس میں چپراسی ہونا چاہیے۔

جی۔!

آپ گدھے ہیں آپ کو ایک لیٹر لکھنا نہیں آتا۔

جی۔!

یہ کیا جی جی کی رٹ لگا رکھی ہے ایک دو اور آپ جیسے مل گئے تو ہمیں فرم بند کرنا پڑے گی۔ اگر تم مینجر کے سالے نہ ہوتے تو کھڑے کھڑے ڈسمس کر دیتا۔

ہر شئے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے باس کا غصہ بھی نقطۂ ابال کے بعد دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ ہم نے بھی آج قلعہ فتح کرنے کی ٹھان لی تھی۔ موقع دیکھ کر ہم نے مسکانا شروع کیا۔

"سر وہ جو کل آپ نے مجھے نوٹس ایشو کیا تھا میں نے اسے سمجھنے کے لیے پروفیسر شرما کو دکھایا تھا۔ آپ کی انگریزی سے وہ بہت مرعوب ہوئے"

کیا کہہ رہے تھے۔

"سر وہ کہہ رہے تھے یہ طرز تخاطب تو کسی انگریزی کے اہل زبان کا معلوم ہوتا ہے لیکن جب میں نے آپ کا نام بتایا تو وہ حیرت میں پڑ گئے"

بس اس مکروہ سانپ کو نوکری کا راستہ دکھانے کا ہمارا وہ پہلا دن تھا۔ بعد میں ہماری بین کی ہر آواز پر سیدھا ٹوکری میں جاکر بیٹھنے لگا۔ اب کوئی میٹنگ آفس کا کوئی کام ہمارے مشورہ اور مداخلت کے بغیر پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس چمچہ گری کی انتہا اس دن ہوئی جس دن ہمارا پروموشن اور باس کا ریٹائرمنٹ آرڈر آفس میں موصول ہوا اسی دن ہم نے باس سے فوری چارج لیا کر نیک کام میں دیر کیسی۔

اب ہم گن گن کر اس سے بدلے لے رہے ہیں سب سے زیادہ مسرت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ فائل بغل میں دبائے ہمارے ٹیبل کے سامنے ہماری توجہ کا منتظر ہوتا ہے۔ اور ہم جاہلانہ انداز سے کام لیتے ہوئے اس

کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر اب ادب کی کرسی پر ہے۔ اس پوسٹ پر ہمیں دو طرفہ چوکسی رکھنی پڑتی ہے۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس میدان میں کوئی اور چمچہ تو ہماری جڑیں نہیں کاٹ رہا ہے اور دوسرا یہ کہ کوئی اور ہماری چمچہ گری تو نہیں کر رہا ہے۔ کہنے کی بات نہیں ہے لیکن جب بات نکل ہی آئی ہے تو ایک راز کی بات آپ کو بتاتے چلیں کہ چمچہ جب تک پلیٹ میں رہتا ہے تب ہی تک چمچہ ہوتا ہے منہ کو لگتے ہی چھرا بن جاتا ہے۔ اس کے زخم کا زہر لیوکیمیا کی مانند پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو صاحبان ہوشیار .... چمچوں سے ہوشیار !

۵۷

ایس۔ایس علی
(اکولہ)

ہوس اور نشاطِ کار

یوں تو عالی جناب اسّی کراس کر چکے تھے لیکن اپنے سے نصف عمر کے بڑھوں سے زیادہ صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ وہ اپنی ذات میں شاعر، مصنف، اسکالر، محقق وغیرہ سب کچھ تھے اور وہ بھی خود ساختہ! انھیں اپنی کتابیں شائع کرنے کا بہت شوق تھا لیکن وہ کتابیں "چھاپنے" میں اپنی جیب کو زیرِ بار کرنے یا مقروض ہونے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ بہت ہی مستغنی قسم کے آدمی تھے۔ جب بھی انھیں اپنی کوئی کتاب چھاپنی ہوتی کسی نہ کسی اکادمی، آرگنائزیشن یا ادبی ادارے کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے ہموار کر لیتے اور رہا سوال کتابوں کی نکاسی کا تو صاحب اپنے عالی جناب ٹریپل حاجی تھے! کسی بھی پڑھے لکھے شخص کے مقابل ڈٹ جائیں تو کیا مجال جو وہ ان کی کتاب خریدنے سے انکار کر سکے۔

جب انھوں نے اپنے نویں مجموعۂ کلام کو کسی بڑی فلمی شخصیت کے ہاتھوں ریلیز کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً ہی ایک انجمن کی بنیاد ڈال دی اور بن بیٹھے اس انجمن کے صدر اور خازن۔ اب انھوں نے انجمن کے نائب سکریٹری اور ممبران کی مدد سے پروگرام چاک آوٹ کیا اور جٹ گئے۔ چندہ وصول کرنے میں سب سے پہلے تو انھوں نے انجمن کے ممبروں کو یاد دلایا کہ (charity begins at home) یا پھر یہ کہ پہلے خویش پھر درویش!) لیکن خود کچھ دینے (جو کہ دراصل لینے کے حکم میں ہی تھا) سے اس لیے انکار کر دیا کہ "اگر میں خود ہی اپنے پروگرام کے لیے چندہ دوں گا تو اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی؟"

عالی جناب نہ صرف یہ کہ باتونی تھے بلکہ اپنی باتوں کے جال میں لوگوں کو پھنسائے رکھنے کا فن بھی جانتے تھے۔ انجمن کے ممبران کے لیے کام کرنا (چندہ وصول کرنا) ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ وہ انھیں چندہ کی رقم میں سے کچھ بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بیچارے ایک پیالی چائے کو ترس گئے۔ آخر بے چارے چلتے چلتے پاؤں کے مارے خود اپنی جیب سے خرچ کرتے اور چل پڑتے اگلے مرحلے کی تلاش میں اگر کسی جگہ بذریعۂ بس یا رکشہ جا کر چھاپہ مارنا ہوتا تو اپنا اپنا کرایہ ادا کر

ہوا یوں کہ ایک دن عالی جناب جب پورے جوش و خروش کے ساتھ روپیہ بٹورنے میں مصروف تھے۔ انھیں ایک شخص ملا۔ یہ ان کا جانا پہچانا سا تھا لیکن انھوں نے اسے پہچاننے میں عجلت سے کام لیا۔ پہلے تو اس کی آتش شوق کو خوب بھڑکایا پھر رسید بک اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے اکیس روپے کی رسید کٹوائی اور ان سے مصافحہ لے کر رخصت ہوا۔ اس شخص کی رنگت سرخ تھی اور انگلیاں کچھ ٹیڑھی میڑھی تھیں، بالکل عالی جناب کی غزلوں کی بحروں کی طرح۔ عالی جناب نے متفکر لہجے میں اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کہیں وہ شخص جذام کا مریض تو نہیں تھا۔

پریشان ساتھیوں میں سے ایک نے کہا "جی ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔

" لگتا کیا خاک ہے جناب وہ یقیناً اس بھیانک مرض میں مبتلا ہے۔ میں ذاتی طور پر اسے پہچانتا ہوں۔ یہ تو اس کا خاندانی مرض ہے۔" دوسرے نے لقمہ دیا۔

"ہائیں! کتنے دھوکے باز ہو تم لوگ! جب میں اس کم بخت سے مصافحہ کرنے والا تھا تو اس وقت مجھے کسی نے روکا نہیں؟"

"بخدا میں نے آپ کو اشارہ کرنے کی کوشش کی انکل! لیکن آپ اسے شیشے میں اتارنے میں اتنے زیادہ کھو گئے تھے کہ آپ نے ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔"

"اوہ اب کیا ہوگا؟ جذام تو بڑا خطرناک مرض ہے؟"

"خطرناک نہیں جناب موذی.... جی ہاں موذی....... نہایت ہی موذی اور وبائی مرض ہے۔ اس کے جراثیم انسانی جلد پر نہایت تیزی سے پھیل جاتے ہیں اور آپ نے ماشاءاللہ.... معاف کیجیے ....آپ نے بدقسمتی سے اس سے مصافحہ کرلیا ہے۔!"

عالی جناب کے ایک طرفدار نے کہا "اب آپ کو اپنے ہاتھ فوراً ڈیٹال یا اسپرٹ سے دھو لینے چاہییں۔ کم سے کم صابن سے تو ضرور۔"

عالی جناب کی پیشانی پریشانی کے سبب پسینہ سے تر ہوگئی۔ انھوں نے پیشانی صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن فوراً ہی ہاتھ روک لیا۔ اب وہ اپنے ہاتھ دھونے اور جراثیم سے پاک ہونے سے پہلے اپنے جسم کے کسی حصے کو چھونا نہیں چاہتے تھے۔

اب چلی یہ ٹولی ایک کالج کی طرف، اپنے پروگرام میں ایک پروفیسر صاحب کو مدعو کرنے۔ بات چیت کے دوران عالی جناب نے پروفیسر صاحب سے پوچھا:

"کیا آپ کے پاس صابن ہے پلیز؟"

پروفیسر نے اس غیر متعلق اور عجیب و غریب سوال پر انھیں سر سے پاؤں تک حیرت کے ساتھ دیکھا۔ "نہیں کوئی بات نہیں اگر آپ کے پاس صابن نہیں تو آپ کے کالج کی لیبارٹری میں ڈیٹال یا اسپرٹ تو ضرور ہوگا؟"

اب تو پروفیسر صاحب نے عالی جناب کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

عالی جناب کے ایک ساتھی نے تجویز پیش کی "ہمیں کہیں اور کوشش کرنی چاہیے۔ اب ... کی لیبارٹری بند ہو چکی ہوگی۔"

اس نے اسی کے ساتھ پروفیسر صاحب کو اشارہ کر کے کچھ کہنے سے روک دیا اور عالی جناب کی نظر بچا کر اپنی شہادت کی انگلی سر کے قریب لے جا کر اس طرح گھمائی گویا کہہ رہا ہو "عالی جناب اپنا [illegible] کھو بیٹھے ہیں۔"

پھر اس غول بیابانی کی قیادت میں عالی جناب ایک موٹر گیرج کی جانب روانہ ہوئے اور گیرج کے مالک سے کچھ پٹرول دینے کا مطالبہ کیا۔

"لیکن آپ کی گاڑی ہے کہاں؟" گیرج کے مالک نے پوچھا۔

"گاڑی؟ بھئی گاڑی سے تمھیں کیا مطلب؟ ہمیں صرف تھوڑا سا پٹرول چاہیے، ہاتھ دھونے کے لیے۔"

"جی کیا کہا؟ ہاتھ دھونے کے لیے پٹرول؟ بھئی واہ گرم پانی سے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑنا تو سنا تھا۔ آپ پٹرول سے ہاتھ دھو کر کس کے پیچھے پڑنا چاہتے ہیں؟"

"کمال کرتے ہو یار۔ انکل کسی کے پیچھے کیوں پڑیں گے؟ وہ تو ہم سب کے آگے آگے ہیں۔ ہمارے لیڈر ہیں۔ اب سیدھی طرح سے پٹرول دینا ہے تو دو ورنہ . . . . . . "

"ورنہ کیا کر لوگے؟ ایں؟" گیرج والا بھی اکھڑ گیا۔

"ورنہ ہم تم سے صرف چندہ لے کر ہی آگے بڑھ جائیں گے۔"

ایک سنجیدہ سے ساتھی نے گیرج والے کو سمجھایا کہ پٹرول کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سن کر گیرج والا رحم کھا کر پٹرول پیش کر دے گا لیکن ان کی امید کے خلاف اس نے کہا:

"کیا چاچا، ایک دن سب کو مرنا ہے۔ پھر تم اس بڑی عمر میں مرنے سے بھلا اتنا ڈرتے کیوں ہو؟"

عالی جناب نے جواب دیا "جانتا ہوں، جانتا ہوں لیکن میں اپنی دس نامکمل کتابوں کی اشاعت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں بہت سے پلان اور اسکیمیں ہیں۔ میں اپنے تجربات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دینا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر پرویز احمد
(ریاض)

مزاحیے

سب سیاسی اچھے ہیں
گلیوں میں ہے تاریکی
بجلی کے یہ کھمبے ہیں

قانون کی کرسی پر
آکر ہے ڈٹا پھر سے
انصاف کی برسی پر

جو شور سا برپا ہے
وہ ننگ سیاست کی
انمول سی کرپا ہے

سب سے بڑا چمچہ ہے
اس کو ہی پکڑ پیارے
کفگیر کا دم چہ ہے

گاڑی چلی جائے گی
سبزی تو ذرا لے لوں
کیا خاک پکائے گی

سچ بات پہ ہنستا ہے
جھوٹوں کا بنجارا ہے
دھیلے میں بھی سستا ہے

سوچے ہیں اکیلے میں
جو مال چرالیا ہے
لے آئیں گے تھیلے میں

یہ گھر بھی انوکھا ہے
اک کونے میں ٹٹی ہے
اک کونے میں دھوکا ہے

دروازے پہ تالا ہے
کھڑکی سے ذرا دیکھو
کمرے میں اُجالا ہے

بے فرد گھرانہ ہے
انسانوں کی بستی میں
بھوتوں کا ٹھکانہ ہے

بشیر بانو (حیدرآباد)

باتوں ہی باتوں میں

"لو دیکھو انگوٹھی، خالہ امی لے آئی ہیں"

"ارے! یہ تو خالص ہیرے کی ہے"

"تم کو پہچان ہے ہیروں کی ——؟"

"بالکل بالکل۔ دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں"

"سچ سچ بتاؤ تم جوہری ہو یا بادشاہ ——؟"

"جوہری!!"

"شکر ہے۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ اب آئندہ تم سے بات کرنی ہو تو حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں سے شروع کرنا پڑے گا"

"ویسے بھی تم کو آئندہ ادب سے بات کرنی ہے"

"وہ کیوں؟"

"میں تمہاری ہونے والی نند ہوں۔ بھائی جان نے تم کو پسند کرلیا ہے"

"یعنی بغیر دیکھے ہی"

"اچھی طرح دیکھ کر"

"حیرت ہے انھوں نے کہاں دیکھا ہوگا۔ میں تو ہمیشہ آٹھ تو پردوں میں چھپی رہتی ہوں"

"اور وہ یونیورسٹی کے لان پر ٹہلتی ہوئی، اسٹیج پر ٹھمک ٹھمک کر گاتی ہوئی، گیٹ پر ناز و انداز سے کھڑی رہنے والی تمہاری روح ہے؟"

"اچھا تو انھوں نے مجھے یونیورسٹی میں دیکھا ہے۔ لیکن تم سوچو اس طرح بے پردہ لڑکیوں کو یوں چھپ چھپ کر دیکھنا غیر شریفانہ فعل نہیں ہے کیا؟ لڑکوں کو تو ہمیشہ نظر نیچی رکھنی چاہیے۔ شرماتے ہوئے لڑکے اچھے لگتے ہیں"

"اور لڑکیاں بغیر دوپٹے کے اچھلتی کودتی قہقہہ لگاتی دلوں کو لبھاتی اچھی لگتی ہیں"

"یہ تم کونسی لڑکیوں کا قصہ سنارہی ہو؟ بھئی میں تو سر پہ آنچل اوڑھے رہتی ہوں"

"سچ!! اب تمہارا دوپٹہ کہاں ہے؟"

"وہ! وہ رہا تمہاری مسہری پر"

"یہ تم ہمیشہ میری مسہری پر دوپٹہ، پرس، کتابیں کیوں رکھتی"

"غنیمت چپل نہیں رکھتیں"

"دل تو چاہتا ہے وہ بھی وہیں رکھوں"

"دماغ خراب ہوگیا کیا؟"

"گستاخی مت کرو۔ میں تمہاری ہونے والی بھابی ہوں"

"تو تم نے انھیں قبول کرلیا؟"

"قبول کیا۔ قبول کیا۔ قبول"

"اور میں نے بھی تمہیں قبول کیا۔ قبول کیا۔ قبول کیا"

"اوہ! بھائی جان آپ کب آئے؟"

غزلیں

ہنٹر کریم نگری

وہی دُنیا کا حال ہے سو ہے — اچھے لوگوں کا کال ہے سو ہے
سوانگ ڈالیں وہ شیر کا تو کیا — وہی بندر کی چال ہے سو ہے
کالو کاکا خدیر بن بیٹھا — اُس کا اچھا خیال ہے سو ہے
لیا ڈوپی میں یار لوگوں کا — اپنے فن میں کمال ہے سو ہے
چھوکری دینے کیا سبھی ڈرتیں — نوکری کا سوال ہے سو ہے
عید بارات کو سلامی میں — وہی لنگی تو وال ہے سو ہے

کتنا پٹ مارلیو مگر ہنٹر
نوکری تو بحال ہے سو ہے

○

وہ فیصلہ جو سالے کے فیور دیا گیا — سسرال کے حدود کے اندر دیا گیا
سسرے کے ہارٹ فیل کا تھا بس یہی سبب — شادی میں نقلی سونے کا زیور دیا گیا
کلا نے سات رعیپے فی الفور دھر لیئے — جس وقت ہم کو پانی پہ بٹھا کر دیا گیا
اُس محکمۂ آبرسانی کو کیا کہیں — دو دن میں ایک بار ہی واٹر دیا گیا
پختہ بنانے عاشقِ ناکام کا مزار — چولھے کی پکی راکھ میں کنکر دیا گیا
ٹوٹیں گے کیوں نہ خون کے رشتے یہاں بھلا — چاندی کا جب کہ بیچ میں ساگر دیا گیا
کیسے چلے گی گاڑی ہماری حیات کی — جب کہ ہر ایک پہیئے میں گیاٹر دیا گیا

ہنٹر غزل لکھیں بھی تو کیا خاک ہم لکھیں
جب کہ ہر ایک ہاتھ میں پتھر دیا گیا

شجاع الدین عاطف
(ڈائریکٹر یا)

○

نام زُلفوں کا تری جس نے گھٹا رکھا ہے — بس اُسی نے یہاں بادل کو خفا رکھا ہے
چپکو! آج مرے سر پہ برستی کیوں ہو — میں نے کب آپ کو مسجد سے چرا رکھا ہے
ہیرا معصوم محبت کا کرشمہ دیکھو — اُس کی شادی کے بھی رقعہ کو چھپا رکھا ہے
بلب میں نے جو جلیوں کی روشنی، بجھول ہوئی — اب تو اُس نے مجھے انگلی پہ نچا رکھا ہے
خود پہ بھی ہنس لیا کرتے ہیں یہاں ہم اکثر — خود پہ ہنسنے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے
ہوگئی ہے تری پہچان بھی دشوار مجھے — تو نے جس روز سے زلفوں کو کٹا رکھا ہے

جب سے بیگم مری میکے کو سدھاریں عاطف
غیر سے گھر نے مجھے بیچ نہ جانا سمجھا ہے

محمد عاصم مشیکی (الہ آباد)

خاکہ

مُشتاق شاد

نکلتا ہوا قد، مائل بہ گدازی جسم، مزاج میں رکھ رکھاؤ، آن بان اور خوددار — شاعروں کے رسیا، خوش پوشاک، خوش فکر اور زود گو شاعر مشتاق شاد سے میں پہلی بار ریاض میں ملا۔ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آپ کا چہرہ نہ تو اس خورشید کی مانند ہے جو اپنی تھکن اتار نے شام کی گود میں پناہ لیتا ہے اور نہ ہی اس سحر کی طرح کہ کوئی کہہ دے کہ ابھی ابھی قدرت نے اندھیرے کی مانگ میں اُجالے کی افشاں بھری ہے، اور نہ ہی اس بچہ کی طرح معصوم، جو روتے روتے ہنس پڑے تو ایسا محسوس ہو جیسے برسات میں دھوپ نکل آئی ہو۔ نہ ہی اس وقت کی طرح کہ جب اندھیرا اُجالے کا ہاتھ تھامتا ہے تو اُفق سے رنگوں کا آتش فشاں پھٹ پڑتا۔

"ہر رنگ سے عاری چہرہ"

مجھے گمان گزرا — ہونا ہو، موصوف کسی تھانے کے، ایس، ایچ، او، ضرور رہے ہوں گے۔ میں قریب آنے کے بجائے مزید دُور ہو گیا بلکہ دُور ہی رہا کہ پولیس والوں کی دوستی اچھی اور نہ دشمنی — خدا بھلا کرے میرے ایک شاعر دوست کا جس نے میری کم ہمتی اور کم علمی کا پردہ یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ آپ شاعر مشتاق شاد ہیں۔ تب مجھ پہ یہ راز منکشف ہوا کہ وہ حضرات جو نمود و نمائش کو فوقیت دیتے ہوئے۔ قوسِ قزاح جیسے کچے رنگوں کو بجائے پھرتے ہیں، وہ دراصل اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ اور پھر میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ اچھا۔ اچھا۔ آپ ہیں وہ مشتاق شاد کے متلاشی ہیں۔

ساحل پہ کوئی ریت کا گھر بھی نہیں ہرا
میں خیمۂ حباب نہ دیکھوں تو کیا کروں

ایک اور صاحب نے مجھے شرفِ ملاقات کی قبولیت بخشی نہیں بلکہ سلط کی۔ مشتاق شاد کے نیاز مندوں میں سے تھے۔ چھلی ہوئی پیاز کی طرح داڑھی مونچھوں سے بے نیاز چہرہ — فرمایا۔ "یہ جو مُشتاق شاد بندہ ہے نا بڑا ہی دَم دَم والا ہے" میری نظریں پچونا چہرے پر ٹِکی ہوئی کھائل ہو رہی تھیں، پھر اشہب نگاہ کے مطابق عمر وظیفہ خوار صاحبزادے لگ رہے تھے... پھر دَم دَم دونوں سے پُر لور واقفیت "چہ معنی دارد" میں نے پوچھا — آپ حکیم ہیں۔

فرمایا۔ اوپر والا حکیم ہے۔ بڑا حکیم — جس نے اس دم دم نسخہ یا شہ ساش، روح، جادو، منتر، طاقت اور طلسم کی دھار وغیرہ کو کوٹ کر بنایا ہے۔ جو کسی کسی خوش نصیب کے حصے میں آتا ہے۔ اس کی دو شاخیں میرے پاس تھیں۔

ایک وہ بزرگان دین میں سے تھے جن کی شان میں گویے گاتے پھرتے ہیں کہ "دَمَہ دَم مست قلندر" دوسرے الحمدللہ باحیات — مشتاق شاد، جو دمہ کا دم بھرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے یہ احتیاط بتائی ہے کہ دو پاکٹ سگریٹ پی سکتے ہیں — لیکن کم نیکوٹین والے۔ شاد نے ایسا ہی کیا لیکن پاکٹ چار کر دیئے — یعنی،

"اپنا مرض بھی تھا اور اپنا علاج بھی"

یہ بات مجھے کسی صنفِ نازک نہیں بلکہ ایک شاعر دوست نے بتائی کہ آپ پیار کرنے والے مرد ہیں۔ بُری عادتوں کے متعلق میں نہیں جانتا سوائے اس کے کہ آپ بھی شاعری کے حوالے سے ایک دو شعراء کے استاد ہیں۔

ایک مرتبہ کسی سرائے میں شگفتگی کا تحفہ لینے کو پیش کرنے کے لیے تشریف لے گئے، خوابوں کے چھپر کھٹ پر ابھی پوری طرح دراز بھی نہ ہوئے تھے کہ تعبیر شہزادی کے روپ میں، جھک کر سلام کر رہی تھی، چونکہ کنیزیں شہزادوں کے چکروں میں تھیں، چنانچہ اس کا پورا پورا فائدہ آپ کو ہوا۔ اس لیے کہ وہ سرائے کوئی عام سرائے نہ تھی بلکہ سرائے عالمگیر تھی میں نے اپنی نانی کا ایک جملہ اپنے کسی افسانے میں استعمال کیا تھا کہ نانی حجلۂ عروسی کی طرف بڑھتے قدموں کو روک کر کہا کرتی تھیں کہ بیٹا ایسا دن ہو قاضی پڑھائے ساری عمر اور بیوی پڑھائے ایک رات، صبح اٹھے تو دنیا ہی بدلی ہوئی۔ اور یہی شاد کا ہوا، نہ جانے شہزادی نے کیا پٹی پڑھائی کہ شادی کرلی لیکن شاعری چھوڑ دی۔ اپنا ضخیم غیر مطبوعہ کلام دریائے راوی میں بہا دیا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سمندر، دریا کو نذر کر دیا، اب کوئی کیا جانے کہ یہ اِتراتی، مچلتی، اٹھلاتی اور رقص کناں لہروں کی شکل میں دراصل شاد کے ذہن سے پھوٹتی ہوئی وہ رواں بحریں ہیں جو کم ظرف دریا کو نصیب ہوئی ہیں۔ پھر بھی حاسد کہتے ہیں کہ جس دن سے شاد نے اپنا کلام دریائے راوی میں بہایا ہے وہ اسی دن سے خشک پڑا ہے۔

شاید نہ سمجھ آئے مری بات کسی کو
وہ فکر ہوں، جو اپنے ہی مکتب کے لیے ہوں

مشتاق شاد اپنا کلام دریائے راوی کے چرنوں میں رکھ کر جب واپس ہوئے ہوں گے اور کسی نے پوچھا ہوگا، "آپ شاعر ہیں"

تو نہ جانے کس دل سے جواب دیا ہوگا "شاعر تھا بھائی اب تو صرف شوہر ہوں"۔

اس کے بعد آپ نے زندگی کا بڑا حصہ بچوں کے مستقبل کے لیے وقف کر دیا۔ یہ کہاں کا دانشمندانہ فیصلہ تھا کہ ایک تخلیق کی خاطر دوسری تخلیق کو قربان کر دیا۔ اس کا جواب ہمارے پاس ہوگا — ہے۔ یا نہیں۔ لیکن اس کا جواب بھرپور زندگی پانے والے مریض آپ کے ڈاکٹر بیٹے کو ضرور دیکھتے کہ تمہارے والد کا فیصلہ غلط نہ تھا۔

میرے ماں باپ نے جو روپ دیا مجھ کو
اپنے بچوں کو اسی رنگ میں ڈھالا میں نے

مری تقریباً چار دہائیاں وطن میں گذارنے کے بعد ادبی فضا سے معمور شاموں کو خیرباد کہا، احباب کی محفلوں کو ویران کیا اور صحرا کی راہ لی۔

ظاہری مفلسی کی عزت بنائے رکھے
فقیر ہوں اور بادشاہوں میں آگیا ہوں

---

* مشتاق شاد [illegible]

صحرا کی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ویرانیاں، تنہائیاں اور گم گشتہ کہانیاں۔ کبھی قیس کے چاک گریباں کے خیال نے تڑپایا اور کبھی لیلیٰ کی آنکھیں اور ان آنکھوں میں لرزتے آنسو، احساس میں بوند بوند ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے، آپ کے اندر کا شاعر زخمی پرندہ کی طرح پنجرۂ جسم میں پھڑپھڑانے لگا۔ نیندوں میں بے چینیاں اور بے قراریاں گھلنے لگیں۔ رات کا سناٹا چیخ بن گیا تو پھر کروٹ کر اٹھ بیٹھے

اے چارہ گرو، درد کی لذت ہی گھٹا دو
کچھ بوجھ تو کم ہو، کسی عنوان میرے دل کا

کوئی غمگسار آگے بڑھا اور نہ چارہ ساز، کیونکہ اس درد کا مداوا، غفلت کو اوڑھے خود ان کے اندر کا شاعر تھا۔ اسے جھنجھوڑا تو لذتِ درد کی شعاعیں ہر سو پھیل گئیں۔ درد اتنا بڑھا کہ دوا ہو گیا۔ پھر یہ قیمتی نسخہ "رنگ رنگ" ہمارے ہاتھوں میں آیا۔

"ڈھیر میں سنگ بھی ہیں، موتی بھی"

ایک بار پھر کتابوں اور شاعری کا جنون بڑھا تو ہوش کی باتیں کرنے لگے، مکان کتب خانہ نظر آنے لگا۔ اور گھر بیت الغزل بن گیا۔ ایک میں کتابیں قالین اور میز پہ کتابیں، ایک شخص کی جگہ چھوڑ کر پورے بستر پر کتابیں ہی کتابیں۔ اور ایسی جگہ جہاں سوئی کا سمانا مشکل ہو جائے وہاں بھی شوقِ کشش سے کتاب گھڑی نظر آتی ہے!

ایک قطرہ مجھے درکار تھا جس کی خاطر
کر دیا سارا سمندر تہہ و بالا میں نے

ہمارے بہت ہی محترم دوست شاعر کی اصطلاح میں اگر آتے جاتے صنفِ نازک نظر آجائے تو فرماتے، "عاجم" "غزل" کیسی ہے۔ اور ہمارے مشتاق شاد صاحب نوعمری میں ہی "لوک گیت" کی تلاش میں کشمیر کی حسین وادیوں میں خاک چھانتے رہے ہیں۔ اب خدا جانے آپ گیت کی تلاش میں سرگرداں تھے یا پھر غزلوں کے۔

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ کا یہ کارنامہ ادبی حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا کہ گیت کے ایک بن سنورے مصرعہ کو سامنے رکھتے، معنوں کی مالا پہناتے، استعارات کے نازک برش سے رنگ بھرتے، تشبیہات کے زیور سے آراستہ کرتے اور لفظوں کا جوڑا پہنا کر مفروضہ قرطاس کی سیج پر بٹھا دیتے، تب کہیں جا کر اس مصرعہ کی تمام روح آپ کی عمیق سوچوں کی بدولت بے جان جسم میں اتر آتی اور پھر نقاد بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ ایسی بن سنوری غزل کسی شاعر کو نصیب ہوئی اور نہ ہوگی یہ کمال اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو شاد جیسا ذہن رکھتا ہو اور مشتاق بھی ہو اور مشتاق بھی۔

شوق ہے ناتمام جب تک ہم
اشک دل تک، لہو نہیں کرتے

محمد فاروق نشتر
(میسور)

ادب کا اعتبار — شمس الرحمٰن فاروقی

ہماری شاعری کا بھی بہت برا حال تھا۔ یہ قافیہ، ردیف، حسن و عشق اور دلِ بے تاب کی زلفوں میں بری طرح گرفتار تھی جو بھی جیالا۔ . ان پیچیدگیوں کی اسیری سے نجات کے نام پر آزادی کا نعرہ لگاتا لوگ ا[س] کے دشمن ہو جاتے۔

مگر زمانے کو قیامت کی چال چلنی تھی۔ چناں چہ حالی کا دیوان شائع ہوا تو ادب زندگی کے اور قریب ہو[تا گیا] حتیٰ کہ یہ قربت ترقی پسندی کے جذباتی جھٹکے کھا کر جدیدیت کی شکل میں سامنے آئی۔ حالی نے زندگی کی دیکھ کر مقصدی ادب کی تشکیل کی تھی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کی شعاعوں سے زندگی کی ایکس رے پلیٹیں تیار کرلی ہے۔ بادرے لیزربیم تک کا فاصلہ ادب نے بھی طے کیا ہے۔

فاروقی صاحب ہر مہینہ شب خون، نکالتے ہیں اور "شب خون" زندگی سے منافقت کی پول اس طر[ح] کھولتا ہے جس طرح انسان کے اعضائے رئیسہ و غریبہ، بروز حشر، خود اس کی پول کھول دیں گے بلکہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں انتقال فرمانے والے بعض نوجوان اعضا مثلاً آنکھ، دانت اور گردے وغیرہ ڈیوٹی دیں گے۔ کراماً کاتبین اعمال ناموں کے ساتھ شب خون کی جلدیں بھی رکھ دیں گے تاکہ حساب کتاب جلد ہو سکے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ایسی تحریری تحریک کے بانی و علمبردار ہیں، جس کا سلسلہ ابد تک قائم رہنے کی تو[قع] امید ہے کیوں کہ یہ نظریات و رجحانات ہر دور کے تقاضے پیدا کرتے ہیں۔

آدمی عام طور پر ایک خاص شعبہ سے منسلک ہوتا ہے تو اس فیلڈ کے تقاضے کم اور دیگر مشغولیات کے تقاضے زیادہ پیدا کرتا ہے۔ مثلاً شاعری اور سیاست دو مختلف جذبوں کے حامل ہیں۔ ایک اچھا شاعر پیدا[ئشی سیاست] داں اس لیے نہیں ہو سکتا کہ رنگِ گل سے بلبل کے پر بنانا شاعری کا تقاضہ ہے اور جو سیاست داں شعر میں ہاتھ ڈالنے سے رنگِ گل سے بلبل کو نذر کردے گا کیوں کہ یہ سیاست کا تقاضہ ہے۔ تاریخِ ادب میں ایسے

گئی بے گناہ بلبل شہید ہوئے جن کا قصور یہ تھا کہ وہ سیاست داں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور جو شاعر سیاست کے ہاتھ لگے ان کا حشر بھی کم و بیش بلبل ہی کی طرح کا ہوا۔

لیکن اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی ایک نئی تحریک کے بانی کو وہ پیشہ راس آیا جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے جڑا ہوا ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ ہر رشتہ کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ یعنی فاروقی صاحب محکمۂ ڈاک تار سے وابستہ ہیں[ملے] اور یہی ملک کا وہ واحد پیشہ ہے جو بلا لحاظ مذہب و ملت، مساوات کا خیر خواہ ہے۔ شاید پیشہ کے انہی اثرات کی وجہ سے فاروقی صاحب نے ادب کی ہر صنف سے تعلق قائم رکھا ہے۔ نظم و نثر دونوں سے یوں انصاف ہو رہا ہے جس طرح ایک خوش نصیب شوہر دو بیویوں کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے گزار رہا ہو۔ اور نثر کے میدان میں تو ایسی کریہہ صنف سے رشتہ قائم ہے جو خوب صورت بیوی کی بد سیرتی کی طرح مشہور ہے۔ یعنی تنقید سے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی شاعری سے اتنا انصاف نہیں کرتے جتنا شاعری سے کرتے ہیں۔ یعنی اشعار کی باری والی رات بھی خشوع و خضوع سے تنقید کی نذر ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ —— "ہم دو، ہمارے دو" (بلکہ آج کل تو "ہم دو، ہمارا ایک") کی طرح "میں ایک، میری صنفِ سخن ایک" کے قائل ہیں۔ یہ حاسدانہ نظریہ اردو ادب میں اتنا ہی عام ہے جتنا مذہب میں "رشتہ کشی"۔ اس دباؤ نے فاروقی صاحب کو مصروف بھی رکھا ہے اور معروف بھی کیا ہے۔

ایک طرف دل جلوں کی کوشش کہ شمس الرحمٰن فاروقی صرف دو صنفوں کی ڈفلی بجا کر رہ جائیں اور دوسری طرف موصوف کا یہ رجحان کہ مخالفین کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ شاید یہ جذبہ اپنے لکھے کو مستند سمجھنے کے فن سے [illegible] متاثر ہے!

ستمبر کے "کتاب نما" کے مہمان مدیر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا اشاریہ "مجھے کن لوگوں نے پڑھا ہے" لکھا تھا ایک "گمنام انصاری" "نامی انصاری" بن گئے۔ انھیں گم نامی کے اندھیروں سے شہرت کے اجالے میں لانے کا سہرا فاروقی صاحب کے سر جاتا ہے۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے نامی انصاری سے نوک جھونک میں کوئی بات تھی، جس کی پردہ داری ہوئی ورنہ ہمارا یہ نقاد تو نہ مصلحت کوش ہے اور نہ پرطوڈالر کا شیدائی۔

ایک ہندوستان میں [illegible] شیخ نے خلیج میں رہ کر اپنے ادب کی بنیاد ملک میں ڈالنی چاہی [illegible] کی کھاد کا انتظام تھا۔ اچھے اچھے لالچ کی پھسلن پر چاروں خانے چت ہو گئے۔ ایک چت چدر کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ کسی طرح فاروقی صاحب کے ہاتھوں ہندوستانی شیخ کی گل پوشی کروا دے تاکہ سند ہو جائے۔ چت چدر نے فاروقی صاحب کے نام کا اعلان بھی کر دیا سنا گیا۔ بڑا حسرت و عبرت ناک سماں تھا۔ مگر فاروقی صاحب نے [illegible] یہ کہا کہ "صاحب! شیخ کے نوشہ کا گلا اتنا اونچا ہے کہ میرے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتے۔"

ملے [illegible]

شمس الرحمٰن فاروقی کے دستخط سے نقطے غائب رہتے ہیں ۔ ایک دو جگہ دیکھا تو چھاپہ خانے کو ذمہ دار سمجھا ، کئی جگہ دیکھا تو پتہ چلا کہ خود فاروقی صاحب نقطوں کو ہضم کرنے کے ذمہ دار ہیں ۔ آپ کے دستخط کو بغیر نقطوں کے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی داڑھی والا مسلمان شرعی لباس میں ملبوس ہو کر بغیر ٹوپی کے نماز ادا کر رہا ہو ۔

پاکستان کے ایک سفر کے دوران فراق گورکھپوری فاروقی صاحب کے آگے آگئے ۔ موصوف نے فراق کی جراٴت دیکھ کر کہہ دیا ۔ " احمد مشتاق ، فراق سے بڑا شاعر ہے " پاکستان میں دھوم مچ گئی کہ راتوں رات فراق کا قد چھوٹا ہو گیا ۔ لوگوں نے ہڑبڑا کر ثبوت مانگا ۔ آپ نے دلیل پیش کی کہ فراق کے یہاں فالتو الفاظ بہت ملتے ہیں جب کہ احمد مشتاق کے یہاں یہ معاملہ بالکل نہیں ہوتا ۔ ثبوت میں فراق کا ایک شعر سنایا :

ندا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

عرض کیا ۔ " یہاں " اے دوست " کیا کر رہا ہے ۔ یہ دونوں لفظ فالتو ہیں جو مصرعہ پورا کرنے کی غرض سے ڈالے گئے ہیں ، احمد مشتاق کے ہاں یہ ستم دکھائی نہیں دے گا ۔"

شمس الرحمٰن فاروقی ایک ایسی تحریک کے پروردہ ہیں جن کی رفتار میں زندگی اور زندگی میں زندگی کا ایکس رے نظر آتا ہے جو ادب کا اعتبار ہے ۔

(یہ خاکہ انجمن ترقی اردو ، میسور کے زیر اہتمام جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے اعزاز میں منعقدہ ادبی نشست میں سنایا گیا)

یوسف امتیاز
ٹورنٹو (کینیڈا)

عصمت کے انوارِ تبسم

مرزا عصمت اللہ بیگ اگرچہ ہندوستان کے ادبی نقشے پر کوئی بڑا نام نہیں ہے مگر طرزِ تحریر کی سہل روانی، تصنع سے مبرا شوخی اور ظرافت میں لکھی گئی نثر اور نظم دونوں اس بات کے گواہ ہیں کہ بقول میکش حیدرآبادی "آہ تیری قسمت دکن والا ہے تو" کی بات صادق آتی ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سنٹرل ایشیا کے علاقے ختن سے آیا تھا اور پھر دہلی کے راستے حیدرآباد میں آباد ہوگیا۔ انھوں نے اپنی نظم وطن میں سوانح لکھی ہے۔

ختن سے چلے مثلِ ریگِ رواں لیے ہاتھ میں تیغ و تیر و کماں
جمائے بدخشاں پہ اپنے نشاں حکومت کی لی ہاتھ میں پھر عناں

جہاں رہ پڑے بس ہوگیا وہ وطن

مرزا عصمت اللہ بیگ کے جوہر کو مرزا فرحت اللہ بیگ کی رشتہ داری، اردو مجلس کی صحبتوں اور مشہور ماہرِ تعلیم سجاد مرزا کی پرکھ نے خوب نکھارا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میدانِ جنگ میں مصروف ہندوستانی اور حیدرآبادی سپاہیوں کے لیے ماہنامہ "جیت" نکلا جو انگریزی رسالے پنچ کی طرح طنز و مزاح کارٹونوں اور لطیفوں کا گلدستہ تھا۔ وہ جیسے ہر فن مولا تھے۔ صحافت، ترجمہ، ادب، شاعری سب ہی میں ان کو دخل تھا۔ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء میں قطب اخشیا اشمی نے عصمت کے بارے میں لکھا کہ "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکبر الہ آبادی کا ایک جانشین سماجی ناہمواری، غلط چیزوں کی خبر لے رہا ہے۔ لیکن وہ اکبر الہ آبادی کی طرح کھلم کھلا وقت سے انحراف کرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ مرزا صاحب کے حسنِ طلب کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ پوری قوت سے دیتے تھے اور اپنی ظرافت کے باریک ناخنوں سے الجھی الجھی گتھیوں کی گرہ کھول کر رکھ دیتے تھے۔ ان کی کوئی نظم یا نثر اٹھائیے اس میں وہ حال سے باخبر ماحول سے بندھے اور صداقت کی تلاش

میں آ گئے۔ عصمت کے سب سے اہم نثری کارناموں میں حکایات رومی، سعدی اور جامی ہے جن کو انھوں نے نہایت مہارت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا۔ دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ ایک تکنیک ہے درحقیقت یہ کارنامہ ری کریشن ([illegible]) ہے۔ دارالترجمہ حیدرآباد کی ملازمت نے دوسری زبانوں کے ادبی مزاج اور حسین سانچوں کو اردو زبان کے مزاج سے واقف کروایا اور کئی مضامین اور کتابیں ترجمہ کر دیں۔ ان کا شعری مجموعہ "انوارِ تبسم" ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔

ہندوستان، پاکستان کے گلی کوچے، بازار اور ٹرینیں اب بھی بازاری دوا فروشوں کی چرب زبانی کڑک دار آواز، لہک لہک کر شعر پڑھنے سے گونج رہی ہیں۔ عصمت نے بازاری دوا فروش کے بیان اور فروخت کرنے کے انداز کا ایک نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"دوستو۔ میرا دعویٰ ہے کہ سو برس کا بوڑھا کھونسٹ ایک خوراک میں بیس برس کا نوجوان گبرو بن جائے گا اور بیس سالہ نوجوان شیر خوار بچے کی طرح زمین پر رینگنے لگے گا۔ یہ دوا ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا پارسی، کوآپریٹر ہو یا نان کوآپریٹر، روگی ہو یا نروگی،

بیمار ہو یا تندرست، مردہ ہو یا زندہ، سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ تندرست آدمی کے لیے ایک شیشی مرتے دم تک کافی ہے۔ بیمار کے لیے نصف شیشی چہلم تک کام دیتی ہے اور جو شخص بسترِ مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا ہے اس کے لیے صرف پاؤ شیشی درکار ہے۔ دو چار قطرے حلق میں ڈال دیجیے اور باقی کفن پر چھڑک کر قدرت کا تماشہ دیکھیے۔ شاعر کہتا ہے:

ایک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

عصمت کے مضامین تہذیب کے نہ صرف مختلف اقدار بلکہ نمونوں کے ترجمان ہیں۔ ان کی تحریر میں قہقہے بھی ہیں اور تبسم بکھیرتا ہوا طنز و مزاح بھی اپنے مضمون "ہماری مونچھیں" میں جہاں انھوں نے مونچھوں کی تشریح اور تعریف کی ہے اور مختلف قسم کے وضع ڈیزائن کا ذکر کیا ہے۔ وہیں مونچھوں کی طبقہ وار تقسیم اور ان سے پیوستگی کی بڑے ہی ہلکے انداز میں تشریح بھی کی ہے مثلاً:

"تتلی کی مونچھیں زیادہ تر دولت مند طبقے کے نوجوان اور شائقین لوگ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد چہے کی مونچھ ہے اسے عام طور پر بنیے بقال، سوداگر، چھوٹے موٹے کنٹراکٹر، ٹکٹ کلکٹر اور درمیانی طبقے کے لوگ رکھتے ہیں۔ اس میں یار لوگوں نے کچھ تراش خراش کر کے ایک نئی وضع بھی ایجاد کی ہے۔ جیسے خشخشی بھی کہتے ہیں جو یا تو پوری مونچھ پر قینچی چلا کر چھوڑ دیتے ہیں جو چوہے کی دم کی طرح معلوم ہوتی ہے یا مونچھ کے اوپر اور نیچے کے حصے کو استرے کی نذر کر کے صرف ایک مہین سا قطعہ چھوڑ دیتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہونٹوں پر کشمش یا چیونٹیوں کی قطار چلی جا رہی ہے۔

اس کے بعد جاپانی چلن کی مونچھ ہے اس میں مونچھ کا پچھلا حصہ استرے کی نذر کر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اگر کوئی صاحب دور سے دیکھیں تو انھیں یہ نہیں معلوم ہو کہ وہ کس بڑے نتھنوں کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ اس میں یار لوگوں نے کچھ کمی بیشی بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ جتنی ہی ملتی جلتی

یا بھنا ہی چاہیے جیسا کہ عصمت کی مقصد آدمی مونچھ سے بال برابر بھی کم۔ وہ برنے پائے اور یہ اصل نقشہ پیش نظر ہے کہ:

داڑھی گھٹا کر خوب تر، مونچھیں رکھو بڑا اس قدر
ناک میں مرغی کا پر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

عصمت کے قلم میں سلاست اور گھلاوٹ ہے۔ ہر وہ چیز جو ایک انسان کی نظر سے بغیر توجہ گزر جاتی ہے۔ عصمت کی آنکھ نے اس کو منظر عام پر پیش کیا ہے۔ اس عصمت نے شہروں، بازاروں اور عام زندگی میں پھیلے ہوئے کئی موضوعات کو لازوال کر دیا ہے۔ اب حکیم جی کے مطلب ہی کو لے لیجیے۔ حکمت کے اس پیشے اور حکیم کے کردار کی کتنی فرحت بخش تصویر کھینچی ہے۔

"حکیم جی مریضوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ کوئی بیمار ہوتا ہے تو نسخہ لکھتے ہیں اور دوا پلاتے ہیں۔ ناامیدی ہو جاتی ہے تو یٰسین پڑھتے ہیں اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کو نہلاتے ہیں اور کفناتے ہیں اور آخر میں اس کے جنازے کو کاندھا دے کر قبرستان پہنچا دیتے ہیں۔ دیکھنا مطلب کرتے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے مگر اتنا لمبا قبرستان کھچا کھچ بھر دیا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جن کے ہاتھ سے اتنے مریض مرے بھلا اچھے کتنے ہوئے ہوں گے۔ ذرا حکیم جی کا نسخہ دیکھنا یہ ہوالشافی کون سی دوا ہے"

ہندوستان، پاکستان میں مشاعرے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ جن میں ہر طرح، ہر وضع قطع بلکہ یوں کہیے ہر قسم کے اصلی اور نقلی شاعر اپنا کلام سناتے ہیں۔ داد بھی لیتے ہیں۔ حاضرین کی گالیاں بھی سنتے ہیں — بے آبرو بھی ہوتے ہیں۔ بعض وہ شاعر جن کا کلام وزن سے گرا ہوتا ہے ترنم کے سہارے کھینچ تان کر ردیف قافیہ درست کر لیتے ہیں۔ عصمت نے اپنے مضمون علی گڑھ کا ایک مشاعرہ میں ایک شاعر کا طرز بیان کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"اس کے بعد ایک صاحب فوجی لباس پہنے لفٹ رائٹ کرتے ہوئے تشریف لائے ان کے چہرے پر خوش مذاق کی جھریاں تھیں اور سامنے کے کئی دانت مدت ہوئی وظیفے پر علیحدہ ہو چکے تھے۔ اگر معمولی طریقے سے غزل پڑھتے تو شاید قافیے سے آگے ردیف پھسل کر نکل جاتی۔ اس لیے گا کر پڑھنے لگے۔ جگہ جگہ الاپ بھی لیتے تھے گٹکری بھی لیتے تھے کبھی سر پکڑتے تو اچھے بھلے شاعر کو ٹیلہ بنا کر تال دیتے تھے بلکہ جوش میں آکر کبھی کبھار پوری گت بھی بجا دیتے تھے۔ ان کی شاعری فوجی قسم کی تھی قافیہ لارنگ رولز کی طرح بھرتی کر کے غزل میں شریک کر لیا تھا۔ نمونہ غزل [illegible] سنیے:

نقاب اٹھا کے برا بنے کیجیے صاحب — شب وصال کی کیا جانے کب سحر ہو جائے
زکام میں کہیں کچلا انگیٹھی دے دے — رقابت اپنی مسلّم یہ ڈاکٹر ہو جائے

عصمت فطرتاً خوش مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ وہ ہفتہ میں ایک بار موٹر پر نکلتی تھیں کہ جب باہر جاتے تھے تو خیرات تقسیم کرتے۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ خیرات کم ہے اور زیادہ اور روز آئندہ اگر روزانہ خوب خیرات کرنے لگے تو فقیر یہ سمجھ کر کہ صاحب اگر زندگی میں اتنا زیادہ دے سکے تو مرنے کے بعد تو خوب خیرات ہوگی اور کفن دفن [illegible] بھی میں [illegible] تمہاری [illegible]

عصمت کی شاعری قدیم مکتبِ خیال کی تھی مگر وہ شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ہمارے سماج کی برائیوں کو اجاگر کیا۔ اور اصلاح و ترقی کی جانب اپنی شاعری میں اشارے بھی کیے۔ اس طنز اور اشاریت نے انھیں انگریزی الفاظ کے استعمال پر مجبور کیا جس سے ان کی شاعری کا رنگ ایک طرف سہل ہو گیا دوسری طرف اور زیادہ نکھر گیا۔ ان کی نظم نوکری کا ملا نسی ٹیوشن ہمارے سماجی ناسور اور طریق کی طرف ایک تلخ اشارہ ہے۔

دو گالیاں دل میں ہی مگر منہ سے نہ بولو
سنتے رہو حکام کی دھتکار ہمیشہ

لو جب کبھی رخصت تو کرو عذرِ علالت   اپنے کو بتاتے رہو بیمار ہمیشہ
دفتر میں کبھی اپنی غرض سے نہ ملو تم   کہتے رہو ہوٹل میں یہ بیوپار ہمیشہ

غیر ترقی یافتہ دنیا میں الیکشن محض ایک جھوٹ ہے جس نے زیادہ پیسے خرچ کیے ووٹ خریدے۔ جیت اسی کی ہوئی۔ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر انھوں نے ناصحانہ انداز میں بڑی اچھی چوٹ کی ہے۔

نوٹوں کو رکھو سامنے پھر دیکھو تماشہ   جاتا ہے اُدھر ووٹ کے آتا ہے ادھر ووٹ
ہر ووٹ کا ایک نوٹ ہے ہر نوٹ کا ایک ووٹ   لو ایک ادھر نوٹ تو دو ایک ادھر ووٹ

محبوبہ اور رقیب کا روایتی مثلث بھی عصمت کی نظروں سے بچ نہ سکا۔ ہنسی ہنسی میں انھوں نے شیخ [illegible] پر بھی طنز و مزاح کے انداز بکھیرے ہیں کہتے ہیں:

کیوں ہیں نگاہِ ناز کی بیماریاں ظالم   یہ دل ہے مرا قصرِ بکنگھم تو نہیں ہے
کیوں شکل مری دیکھتے ہی وہ ہیں بدکتے   یہ بندہ کوئی پانچواں کالم تو نہیں ہے
کیوں شاہ نگہ اتراتا ہے صدر بزم میں آکر   یاروں کی یہ پالی ہے ٹرگرم تو نہیں ہے
کیوں ڈرتا ہے تو اس کو نگلتے ہوئے زاہد   افیون کی گولی ہے یہ ڈرم تو نہیں ہے
کیوں جامۂ مے میں مجھ کو لیے جاتا ہے اے شیخ   محفل میں تری آج چھما چھم تو نہیں ہے

راشن کی لائی لعنتوں نے جہاں چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کو جنم دیا سرمایہ داروں کے پیٹ بھرے اور تجوریاں بے ایمانی کے پیسوں سے لبالب ہو گئیں وہیں تہذیب کے عام اقدار اور رواج بھی بدل ڈالے۔

اس دور نے راشن کی رسمیں ہی بدل ڈالیں   ایٹ ہوم ہے شادی میں جہلم میں ہے عصرانہ
انساں تو دونوں ہیں ظرف جدا ہیں لیکن   اوروں کا جو مسکہ ہے یاروں کا ہے پیمانہ

جس روز سے کپڑے پہ مقرر ہوا راشن   ڈھونڈے سے بھی ملتی نہیں شلوار وغیرہ

اس طرح ہو گیا ہے میرا بھرم نہ دارد   بنیان کا قحط ہے جیسے دھرم نہ دارد
اس شاعری کی وسعت نے مدہوش کر دیا   ہے جیسے معتبر دیکھا جلم نہ دارد

ہم نے جب خبر کہ زندگی اب یہ قلت ہے   سگاں کو بھی ملتا کہاں استخواں ہے

ایک طرف غلہ کا راشن ایک طرف پانی پہ ٹیکس ۔۔۔ زندگی اس آب و دانہ سے بڑی مشکل میں ہے

کچھ روز رہا اور جو پٹرول پہ راشن ۔۔۔ سب موٹریں اڑ جائیں گی اور جھٹکے رہیں گے

ادھر افراطِ زر کی زرکشی نے کر دیا عریاں ۔۔۔ ادھر کپڑے کی قلت نے اڑا دیں دھجیاں میری

ہندوستان پاکستان بلکہ ایشیا میں رکشا ایک غریب بے بس انسان کی مجبوری اور نامعقول معاشرے کی ایک دردناک کہانی ہے۔ انسانی غیرت اور شرم پر ایک بہت بڑا دھبہ۔ کسی زمانے میں رکشا انسان کھینچتے تھے پھر سیکل رکشا ایجاد ہوئی۔ آج کل آٹو رکشا کا زور ہے۔ عصمت نے اسی سماجی ناسور کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ اس طرح تشریح کی ہے کہ سارے جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے اور ساتھ ہی ہمدردی، غصہ اور بے بسی کا احساس بھی:

سڑک پہ اب نہ بگھی ہے نہ ٹانگا ہے نہ جھٹکا ہے
جدھر دیکھو ادھر بس آج کل رکشا ہی رکشا ہے
نرالی یہ سواری ہے نرالا اس کا نقشہ ہے
کہ آدھی سائیکل، تین پہیے، نصف ڈبہ ہے
اسے تو دیکھ کر لاحول پڑھ دیتا ہے شیطاں بھی
کہ حیوان اس میں بن جاتا ہے اچھا خاصا انساں بھی
سواری پر سواری یہ نئے ڈھب سے بٹھاتا ہے
کھلونوں کی طرح لوگوں کو رکشا میں جماتا ہے
پھر ایک توند کو لا کر بیچ میں ان کے پھنساتا ہے
جہاں سوئی نہیں گھستی وہاں موسل گھساتا ہے
پلاؤ کا مزہ ملتا ہے ان کو دال روٹی میں

یورپ کے اثرات نے دنیا کے ہر حصے میں تیزی کے ساتھ اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اب ساری دنیا اسی رنگ میں اندھا دھند رنگی جا رہی ہے۔ پرانے اقدار اور تہذیبیں دم توڑ رہی ہیں۔ نئے نئے لباس ادب نئے نئے فیشن سب ہی عصمت کی شاعری میں ایک عکس کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کے خیالات باغیانہ نہیں مگر اکبر الٰہ آبادی کی طرح مغرب کی ہر اچھی تقلید سے بیر نہیں رکھتے لیکن مضر اثرات کا خوف دونوں میں یکساں ہے۔ عصمت نے بھی بڑی آزادی سے اپنی شاعری میں ان موضوعات کو شعروں کا رنگ دیا ہے:

زلفیں سمٹ کے کانوں کی لو تک پہنچ گئیں ۔۔۔ مونچھیں سمٹ کے گھس گئیں یارب کی ناک میں
بڑھتا گیا فراک میں لیکن وہ اختصار ۔۔۔ دم اختصار کا بھی ہوا جس سے ناک میں

داڑھی تو منڈھاتے تھے مونچھیں بھی صاف کر دیں ۔۔۔ [illegible] اضافے لائے صورتِ مردانہ

کٹ جانے سے زلفوں کے یہ کیا نظر آتا ہے   جس لڑکی کو تم دیکھو لڑکا نظر آتا ہے

پابند نہ ہم ان کی (دُم) کے ڈ(مھ)ٹ کے رہیں گے   رسی تری زلفوں کی مگر پٹ کے رہیں گے

حُسن افزوں ہوگیا زلفیں جو ان کی کٹ گئیں   اب جسے دیکھو انہی کا بندۂ بے دام ہے
سیفٹی ریزر سا ہو اسٹینس ہوں جس کے رفیق   اپنی اصلاح آپ کر لینا انہی کا کام ہے

تہذیب نو کے سائے میں کیسی ڈھلی یہ پود
ہیں لڑکیاں تو کوٹ میں لڑکے فراک میں

عصمت نے اپنے اسلوب بیان سے اپنی شوخیانہ اور ظرافت آمیز طبیعت کو خوب استعمال کیا۔ چاہے ان کے ڈرامے ہوں یا ترجمے مضامین ہوں یا شاعری ہر ایک ان کے مزاج کی ایک گہری چھاپ ہے۔ سقیم ریاست حیدرآباد دکن کے ریڈیو کی تقاریر ہوں یا صحافت کا میدان سب میں اردو کی خاموش خدمت کی جھلک نمایاں ہے۔ بدقسمتی سے ان کی پہچان صرف حیدرآباد تک محدود ہو کر رہ گئی اور آخر کار ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی شاعری کے مقطعے ان کے مزاج کا آئینہ ہے۔

کی بسر عمر عصمت کی مگر کہنا نہیں آیا   پھر اس پر عام چرچے ہیں کہ وہ پر زور کہتا ہے

نظم سے لیتا ہوں مضمون اور غزل سے قافیے
بعد اس کے جو رہا عصمت فقط الہام ہے

مادہ گیتی نے عصمت کچھ میری پرواہ نہ کی   ساس کرتی ہے خوشامد کہتے ہیں داماد کی

یہ نئی رنگ اس قدر چھایا طبیعت پر میری   پہلے تو عصمت تھا اب گولڈ اسمتھ ہوگیا

پھنسا جالوں کے گیسو جو کٹ گئے عصمت   ہوائے کشتیٔ الفت کے بادباں نہ رہے

قلمی معاونین سے التماس۔

اپنا پتہ پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں۔
مضامین صفحہ کے ایک جانب صاف اور خوشخط لکھیں۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

طالب خوندمیری کے نام

جلد: ۲۷ شمارہ: ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴ء

سرورق: ذیشان
کتابت: محمد سلیم، محمد غالب، افضل
طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ: ۸ روپے
سالانہ: ۸۰ روپے
بیرونی ممالک: ۲۰ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد
فون: 595716 رہائش: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

اِنتخابِ کلام

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

825/C-1-4 سکینڈ فلور، مکتی اسٹیٹ - عابد روڈ - حیدرآباد - 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں لاتا ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دئیے جاتے ہیں۔ ۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لئے جیسے کرانا اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، میوہ فروشی، مرغی کا دانہ وغیرہ کیلئے قرضہ جات دئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا %25 کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود %4 کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی -/6000 روپے سے کم ہونی چاہئیے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لئے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لئے، آٹو ورکشاپ، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لئے قرضہ جات دئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا %20 کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح %6 سود پر دیا جاتا ہے۔

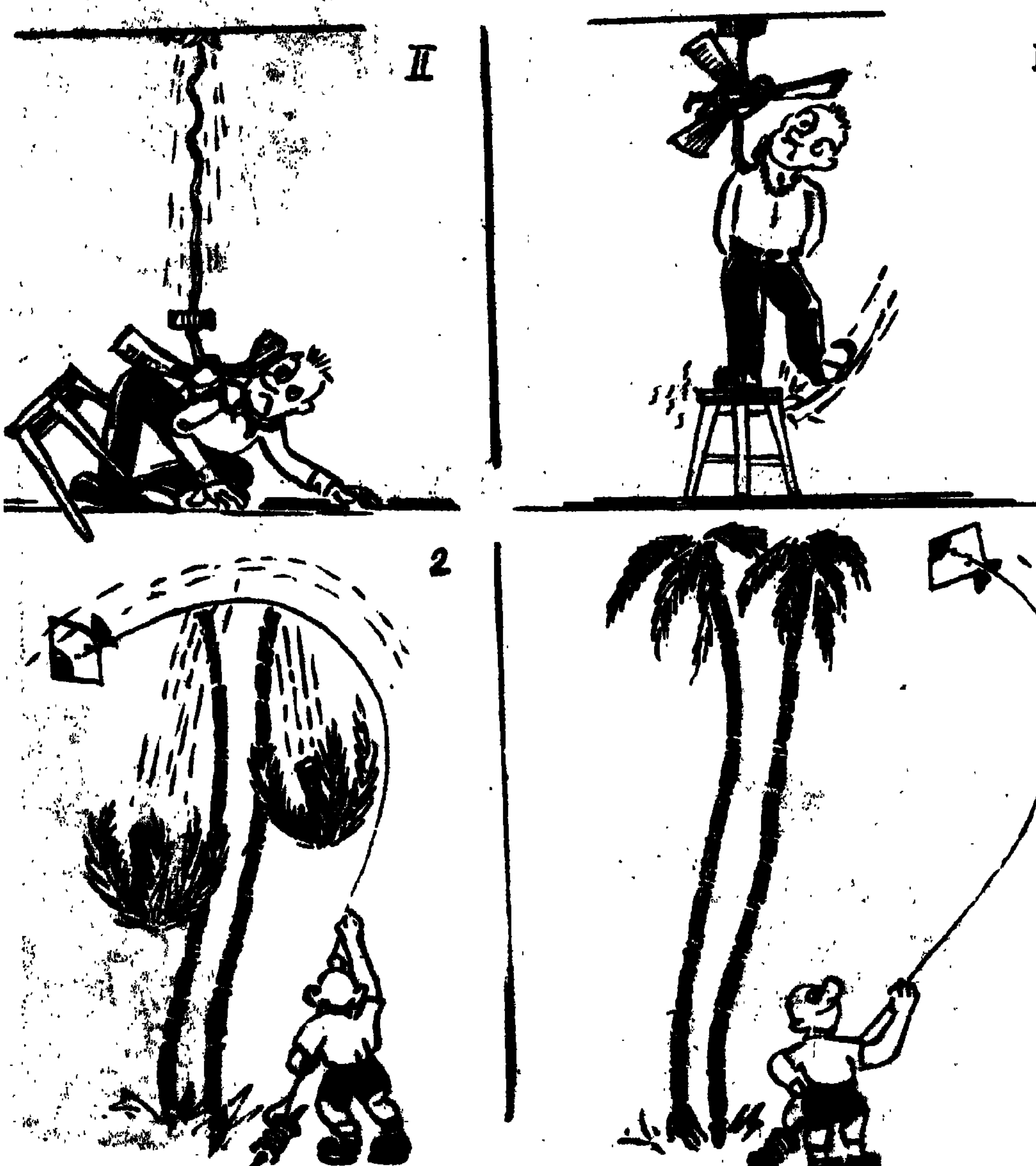
کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94ء تک 47210 افراد میں 16000 و 52و8 روپے مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 000و81و44و86 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2894 افراد میں 10000 اور 8 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 000و68و04و4 روپے ہوتی ہے۔ جاری کرچکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 50104 افراد میں 000و33و53و9 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 000و49و49و40 روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔

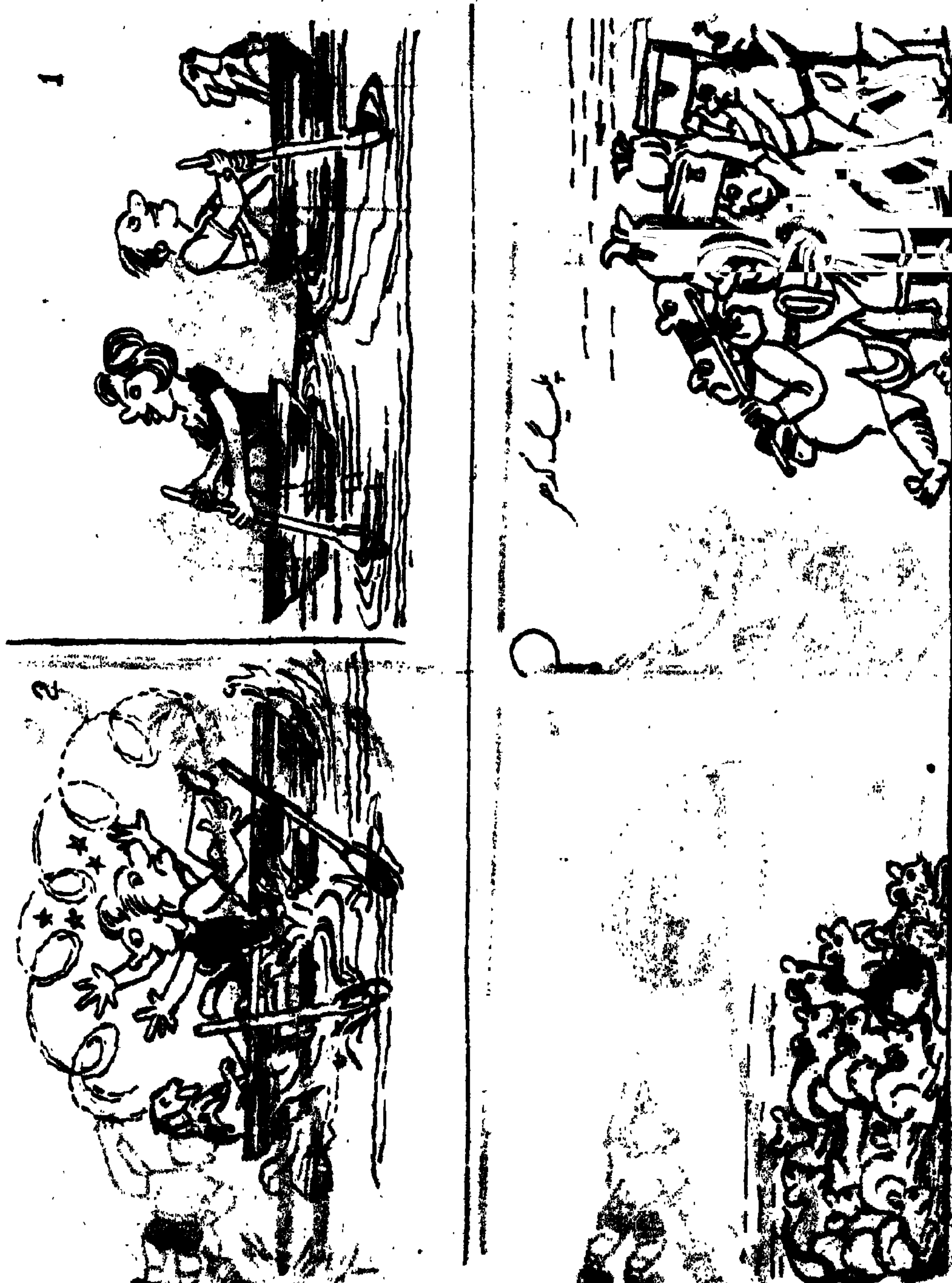
اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد 217 تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ جن پر 10 لاکھ روپے صرف آئے گا۔ جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (13) ہنر سکھانے کیلئے اس سال 246 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 25 کو ٹائپ رائٹنگ، 100 کو لائٹ ڈرائیونگ، 11 افراد کو لیاب ٹکنیشین، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 5 کو شیرنگ، 13 کو ویڈیو گرافی، 5 کو فیبریکیشن، 4 کو ریڈیو موٹر وائینڈنگ، 5 کو ہیرے تراشنا، 6 کو کمد چھری کی تربیت دی جائے گی۔

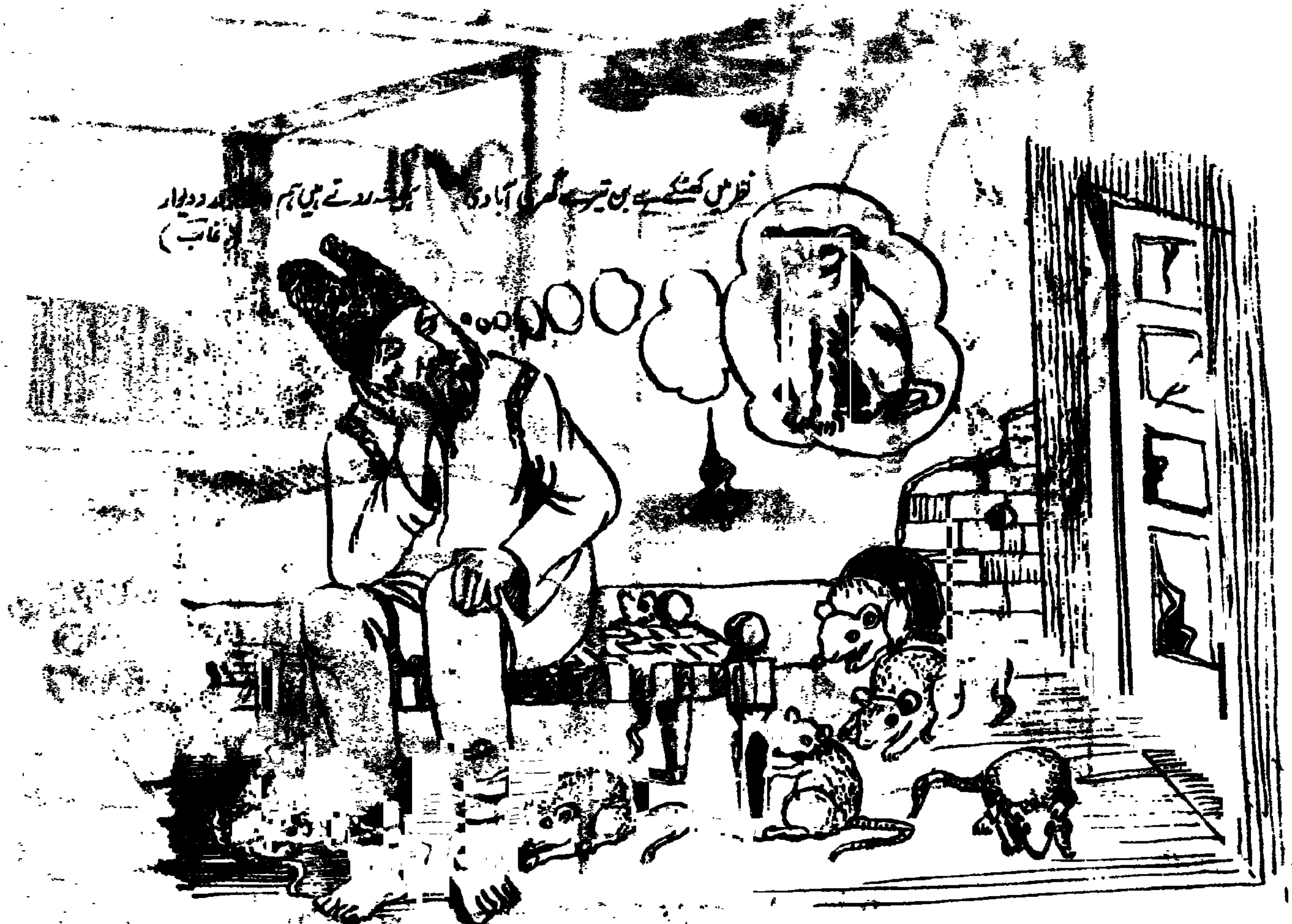
گنٹور میں [illegible] افراد کو تربیت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدوار استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔ جو اصحاب حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خان
(منیجنگ ڈائرکٹر)

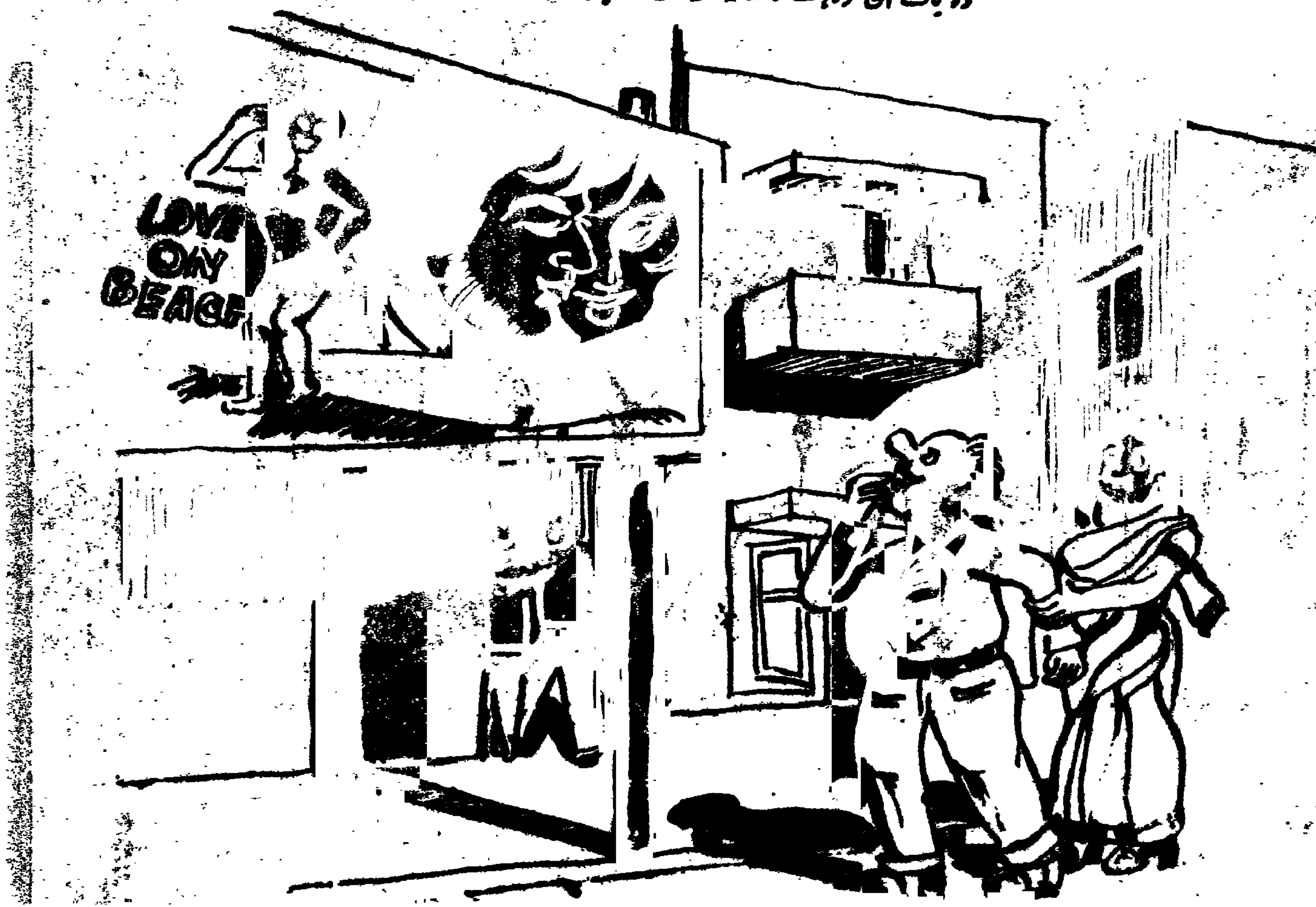
کارٹون ـــــ از ـــــ طالب خوندمیری



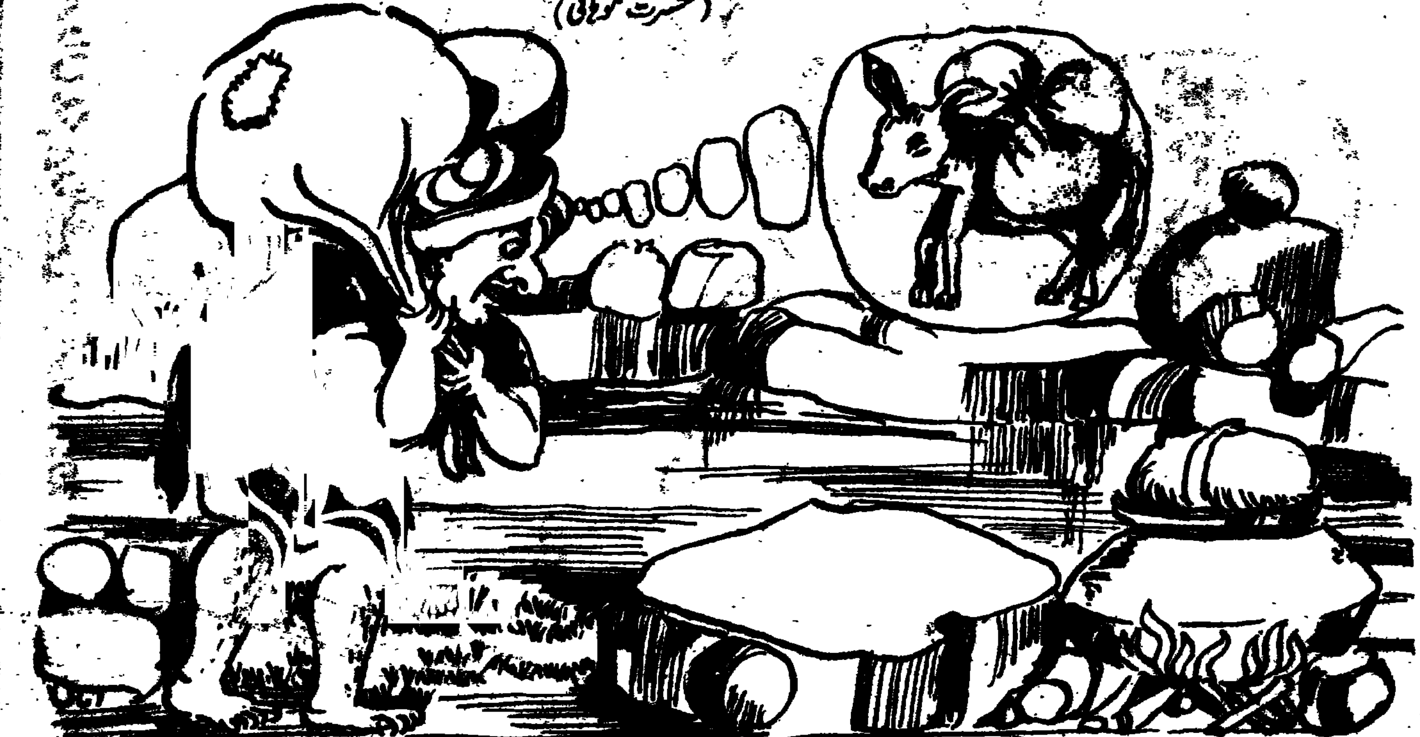

1
2
پلیگ کدھر


نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ... روتے ہیں ہم ... در و دیوار
(غالب)

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
(فیض احمد فیض)



حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں
(حسرت موہانی)




باپو کا طلسمان
جب بھی آپ بے یقینی کی حالت میں ہوں یا ... محسوس کریں کہ
آپ پر حاوی ہو رہا ہے تو مندرجہ ذیل طریقہ آزمائیں :
جن کو بھی آپ نے دیکھا ہے غریب سے غریب تر اور کمزور سے کمزور تر شخص کا تصور کریں
ہیں کیا وہ اس شخص کے لئے فائدہ مند ہوگا
۱۲۵ واں یوم پیدائش ۲ اکتوبر 1994

یوسف ناظم

طالب خوندمیری

سخن کا آرکیٹکٹ

تنقید میں ایمان داری سے کام لینے کا قاعدہ رائج نہیں ہے لیکن جہاں تک ظریفانہ ادب کا تعلق ہے اس میں ایمان داری ہی سے رائے دینی پڑتی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ظریفانہ ادب کی اہمیت ذرا زیادہ ہے۔ سنجیدہ ادب میں کمزور نثر یا کمزور شاعری قابلِ قبول نہ ہونے پر بھی برداشت کر لی جاتی ہے لیکن ظریفانہ ادب میں سطح اور معیار کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ ادب کے مقابلے میں ظریفانہ ادب مقدار کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ کسی بھی زبان میں مزاح نگاروں کی تعداد پانچ دس سے زیادہ نہیں ہوتی اور خاص طور پر مزاح گو شاعروں کو تو انگلیوں پر نہیں صرف انگلی پر گنا جا سکتا ہے۔ اور ایسا ہونا ادب اور ظرافت کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔

میری دوسری ایمان دارانہ رائے یہ ہے کہ مزاح گوئی، مزاح نگاری سے زیادہ نہیں، بہت زیادہ مشکل کام ہے۔ اور میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی مزاح گو شاعر، مزاحیہ شعر کہنے کا واقعی حق ادا کر سکتا ہے تو اسے سرکار کی طرف سے ایک قطعۂ زمین تحفے میں دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے قائم کیے ہوئے کسی کوآپریٹیو بینک سے قرض حاصل کر کے ایک چھوٹا سا گھر کا مکان تعمیر کر سکے۔ قطعۂ زمین کی سفارش کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ شاعر غزل، رباعی وغیرہ کہنے کے علاوہ قطعے بھی کہنے کا عادی ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کسی نہ کسی زمین ہی میں کہتا ہے۔

مزاح گوئی کو مزاح نگاری پر کیوں فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ بھی سن لیجیے (کام آئے گی) اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی مزاح نگار، غالب کے خطوط میں مستعمل نثر، رشید احمد صدیقی کے اسلوب، پطرس کے اندازِ بیان یا مشتاق احمد یوسفی کی اولین نثر سے متاثر ہو کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرے تو اس کا رد شعوری میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات بہت روشن ہیں لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی مزاح گو شاعر اکبر الہ آبادی؟ ظریف لکھنوی، مجید لاہوری اور اسی قبیل کے دیگر شاعروں کی راہ پر چلنے کی کوشش کرے تو [illegible] شاعر کے لیے [illegible] صاحب بھی

مشتعل و منفعل ہو جائیں گے (تجربہ کرکے دیکھیے) مزاح گوئی میں اپنا ذاتی خانگی اور نجی رنگ پیدا کرنا ضروری ہے سرقہ تو خیر دوسرا اس میں تو توارد کی بھی اجازت نہیں ہے "دانستہ، نادانستہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اچھے شعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس شعر سے قاری کو ہلکا سا شاک تو لگے لیکن یہ شعرا سے شباق نہ گزرے شعر کا اثر دیر پا ہو یا نہ ہو فوری ہونا ہی چاہیے۔ فرحت و انبساط، بجلی و تیز روشنیاں، شوخی، شگفتگی، ظرافت کے عناصر ہیں اگر یہ سامان شاعر کے پاس نہیں ہے تو مزاحیہ شاعری کا مطلب کیا ہوا۔ قاری یہی کہیں گے

"جس مال کے تاجر ہیں وہی مال ندارد"

. طالب خوندمیری جن کا مجموعۂ کلام "سخن سے کے پردے میں" اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جنھوں نے مزاح گوئی کی صنف نازک کو پوری طرح گرفت میں لے رکھا ہے (اسے فلمی زبان میں دبوچنا بھی کہتے ہیں) ویسے آدمی شریف بلکہ نیک ہیں) خود کہتے ہیں پہلا شعر انھوں نے اس وقت کہا جب ان کی عمر ۱۲ سال تھی (یہ گلا پھاڑ دینے کی عمر ہوتی ہے شعر کہنے کی نہیں) اور لطف یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز مزاحیہ شاعری سے نہیں سنجیدہ شاعری سے کیا۔ میں یہ تو نہیں لکھوں گا کہ مزاحیہ شاعری "نسبتاً" زیادہ شعور کی طالب ہوتی ہے لیکن بالعموم ہوتا یہی ہے۔ طالب خوندمیری کی صحت خواہ کیسی ہی رہی ہو عادت اتنی اچھی رہی ہے کہ انھوں نے پرسوں نعت گوئی بھی کی ہے نظمیں اور غزلیں بھی کہیں۔ ان کے سنجیدہ اشعار پہ داد ملتی رہی تو یہ عقدہ ان پر کھلا ہی نہیں کہ وہ شوخ و شنگ بھی ہیں۔ وہ شعر بھی اچھے تھے مثلاً:

کہیں سے جب کوئی پتھر نہ آیا پہلے اپنا لگا ہم کو برا یا
تمہارا شہر تھا تم حکمراں تھے مگر ہم بھی نہ تھے کوئی ایسا

جیسے سمندروں میں ہے آسماں کا عکس ڈوبا ہوا مجھی میں کوئی دوسرا تو ہے

جب سوا نیزہ پہ یہ سورج اتر کر آئے گا میرا سایہ بھی مرے قد کے برابر آئے گا
پیاس کا پھیلا ہوا صحرا پڑے گا بعد میں سامنے پہلے سرابوں کا سمندر آئے گا

اور آج بھی یہ سنجیدہ گوئی کا موقع نکال لیتے ہیں اور خوب کہتے ہیں:

تم نے آنکھوں میں ندامت بھی مری دیکھی ہے
اس لئے آگے مرے معبود تری مرضی ہے
اب خدا جانے مری ذات کہاں تک پہنچے
ہاتھ میں تیرے ہواؤں کے مری مٹی ہے

اپنے جیسے چہرے کو پہلے کتاب کر پھر اس کے بعد اس کا کوئی انتخاب کر

سکون مستقل رت تھی چمن کی تتلیاں ڈستی رہیں
برگ و گل کو خود ثمر کی ٹہنیاں ڈستی رہیں
چپ جو تھا تو دنیا کا خیال آتا رہا
لب ہلا تو ہر گھڑی خاموشیاں ڈستی رہیں
بند آنکھوں میں تھے کتنے دل نشیں منظر
کھل گئیں آنکھیں تو پھر بیداریاں ڈستی رہیں
کیا یہی تعبیر تھی طالب ہمارے خواب کی
بیڑیاں تو ٹوٹیں مگر آزادیاں ڈستی رہیں

وحشت سے ڈر نہ اب کھنڈر سے ڈر ۔۔۔ اپنے آنگن سے اپنے گھر سے ڈر
تیرا پندار پاش پاش نہ ہو ۔۔۔ تو ہے پتھر تو میرے سر سے ڈر

گفتگو جب ریگ زاروں میں چھڑی دیوار کی ۔۔۔ کس قدر محسوس ہوتی تھی کمی دیوار کی
جانے کس لمحہ اچک جائے مرا وجود جسم سے ۔۔۔ زندگی بھی جیسے بیلی ہے کسی دیوار کی
گھر کے سب افراد بہرے ہو گئے جس شور سے ۔۔۔ چیخ تھی شاید کسی گرتی ہوئی دیوار کی

آج سے تین دہائی پہلے کے اور آج کے یہ شعر جی چاہتا ہے کہ سبحان اللہ کہوں لیکن اگر میں نے . . . . اسی منزل پہ سبحان اللہ کہہ دیا تو پھر مزاحیہ شاعری کے مرحلے پر نئے الفاظ کہاں سے لاؤں گا۔

طالب خوندمیری کا دماغ فطری اور بنیادی طور پر ظرافت خیز ہے۔ پیروڈی یہ کہہ لیتے ہیں۔ مضطر مجاز کے ایک شعر کو انھوں نے صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے یوں پیروڈی بنا دیا۔

مضطر مجاز کہتے ہیں:

مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا
لیکن کسی کا قصد ہمارا کفیل تھا

پیروڈی:

مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا
لیکن کسی کا "پرس" ہمارا کفیل تھا

اسی طرح مالیگاؤں کے مشہور شاعر اشفاق انجم کے ایک مطلع کی پیروڈی دیکھیے:

ابھی شعور کو چھوا نہیں ہے دلِ انجم
کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

اس کی پیروڈی دیکھیے:

سنِ شعور کو پہنچا نہیں ابھی انجم
کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

انھوں نے شعر میں [illegible] کا لطف بھی بڑھاتے ہیں اور [illegible] کے پیروڈی بھی [illegible] کر [illegible] بھی جایا

ہیں چاہنے والی دیگر چیزیں [illegible] بنالیتے ہیں [illegible] کے۔ راغب مرادآبادی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جب مزاحیہ مشاعروں کی [illegible] [illegible] وقت کسی شاعر کا کلام سنتے سنتے اسی ردیف و قافیہ میں فی البدیہہ شعر بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ [illegible] ان کی حاضر جوابی اور ذکاوت پر دال ہے (مسور کی دال) شگوفہ پبلیش کلب حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں مشہور شاعر [illegible] کی [illegible] غزل کی زمین میں جس کے قافیہ و ردیف "مثالی ہی کیوں نہ ہو" سوالیہ [illegible] [illegible] ہے کہ اس غزل کا دوسرا مقطع بھی سن لیجیے جو مجھے یاد ہے یہ فی البدیہہ شعر سنایا:

اس کے بدن میں آگ [illegible] کی [illegible]
دل [illegible] قلب شمالی ہی کیوں نہ ہو

اسی مشاعرہ میں ستار صدیقی نے جب اپنی غزل ختم کی جس کے مصرعے یوں تھے:

ع : آگہی عقل سے بڑی ہے میاں
ع : وقت کے ہاتھ میں چھڑی ہے میاں

طالب نے فوراً دوسرے مصرعہ پر اپنا ایک مصرع چسپاں کرکے اسے ایک بہت ہی دل چسپ مطلع میں تبدیل کر دیا:

وقت کے ہاتھ میں چھڑی ہے میاں
زندگی بیچ پر کھڑی ہے میاں

لوگ کہتے ہیں انھیں غالب سے بے حد عقیدت ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ بغیر ہاتھ دھوئے غالب کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ماسٹر غالب، آرکیٹکٹ غالب، غالب حسینوں کے جھرمٹ میں، طبیب غالب جیسے عنوانات پر نظمیں کہہ کر طالب نے غالب کو مغلوب کر لیا بلکہ غالب کے اس مصرع کی روشنی میں جس میں انھوں نے کہا ہے: کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
دیکھا جائے تو غالب، مغلوب نہیں مصلوب ہو گئے ہیں۔

طالب کو اپنا کلام زبانی یاد ہو یا نہ ہو غالب کا کلام بہر حال حفظ ہے اور ان نظموں میں انھوں نے غالب کے مصرعوں کو زیر دام لے کر اپنے کلام میں چھ سات چاند لگا دیے ہیں۔ یہ ان کی ذہانت اور فن کاری ہے۔ چند مصرعے دیکھیے:

ع : میک اپ کے تحت فریب میں آجائیو اسد
ع : کالج تمام حلقۂ دام خیال ہے
ع : کس منہ سے کعبہ جاؤ گے قبلہ [illegible]

اسی نظم کا ایک بند یہ بھی ہے۔ غالب کی زبانی:

میں نے یہ کب کہا ہے کہ اچھا کہیں مجھے
[illegible] جاتا ہے کہ [illegible] کہیں مجھے
[illegible]
[illegible] مرا شعر ہے [illegible] کہیں مجھے

اس کلاسیکیت کے باوجود وہ جدید شاعر ہیں لیکن اس طرح کے جدید شاعر نہیں کہ شعر میں اور مطلب کچھ نہ ہو۔ یا مصحف غالب نظم یہ بھی ایک شعر سن لیجیے:

ان کی آنکھیں جس جھیل پر تھی جستیاں ہو گئیں
سب لکیریں ہاتھ کی کیا [illegible] ہو گئیں

آرکیٹکٹ غالب اپنے موکل کو یوں مشورہ دیتے ہیں:

یوں جو کہتا ہے تو ڈیکوریشن ذرا کروایے	سبزۂ شاداب کی جھالریں بچھوایے
جب مشعل کا بنی سب کو کھڑکیاں لگوایے	گیسوئے پیچ و خم کی جالیاں ڈلوایے

سرخیٔ لب کی یہاں ڈسٹمپرنگ کروایے وغیرہ وغیرہ

آرکیٹکٹ غالب کی نظر حمام اور فلش پر بھی ہے کیونکہ یہ دونوں حجرے بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے اور ان تمام مشوروں کے بعد ان کا آخری مشورہ یہ ہے کہ گھر کی نگہداشت اور خانہ آبادی کے مدِ نظر ضروری ہے۔ غالب نے اس کام کے لیے 'مینٹیننس' کا لفظ استعمال کیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں کہا ہے:

مین ٹیننس میں کبھی غفلت یہاں کوئی نہ ہو
ورنہ پھر ایسی جگہ رہیے جہاں کوئی نہ ہو

اس نظم میں شاعر نے شاعری کا اور اپنے پیشے دونوں کا حق ادا کر دیا۔

کھٹملوں کی فریاد میں کھٹمل یوں آہ و زاری کرتے ہیں:

کون جانے کیا بلا کھانے لگا ہے آدمی	کس ملاوٹ کی غذا کھانے لگا ہے آدمی
ہم جو پیتے ہیں اسے خوں ماننا بے کار ہے	کیوں کہ اس کا رنگ بھی بے چارہ ناز خوار ہے

اک زمانہ تھا کہ ہم نے خوں کے دریا بھی پیے
آج گھنٹوں چوستے ہیں ایک قطرے کے لیے

یا در پھر ایک جونک کھٹمل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ آدمی کا لہو نہ چوسے کسی نیتا کا لہو چوسے۔
(طالب خوندمیری کو مشورہ بلک ڈپو کا جنرل منیجر ہونا چاہیے تھا)

مندرجہ بالا مشوروں کے علاوہ طالب خوندمیری نے دلاور فگار کو بھی کچھ مشورے دیے ہیں۔ میں انھیں مشورے ہی کہوں گا حالاں کہ ہیں یہ فرمائشیں۔ دلاور فگار نے کبھی ہم ہندوستانیوں کو شگوفے کے توسط سے ایک منظوم خط بھیجا تھا۔ ایک شاعر چوں کہ دوسرے شاعر سے [illegible] ہے اس لیے طالب خوندمیری نے بھی ایک منظوم خط بھیجا۔ ممکن ہے اہل ظرافت میں [illegible] اور پیام و سلام کا یہ طریقہ رائج ہو کہ جس انداز میں سلام کیا جائے اسی انداز میں جواب دیا جائے ورنہ طالب کے کہنے کو یہ انداز [illegible] ہے۔ اس منظوم خط کے چند ٹکڑے پیش ہیں:

یہ شرط ہے کہ اس میں تبسم چھپا رہے	[illegible] ہے یہ شکر آبیدہ نم ناک [illegible]

[illegible]

منہ کا جغرافیہ ظرافت کا ہیرو ہیں ... حلوے کے طرزِ خاص کی پوشاک بیچیے
دانتوں پہ جو ہیں زمانے کی تختیاں ... [illegible] بیچیے
یا آپ خود ترکی کی طرف کیجیے سفر ... یا پھر [illegible] کے کوئی ٹاک بیچیے

صفحہ میں [illegible]
[illegible]

یہ سارا مقالہ خود طالب خوندمیری کے [illegible] موجود ہے [illegible] لیکن شاید اخلاق کا تقاضہ تھا کہ ایک شاعر سے جو ظریف النفس، ظریف الطبع اور ظریف المالک ہمارا (اور دوسرا [illegible] ہندوستانی) کچھ فرمائش کی جائے۔ طالب خوندمیری فرانسیسی زبان بھی جانتے ہیں۔

[illegible] حیدرآباد کا یہ شاعر غزلیں بھی کہتا ہے اور قطعات بھی۔ ایک غزل میں کہا ہے:

گرا دی تھی کسی نے راہ میں ہماری رستم اپنی ... ہمیں مقصود تھی اس کی حفاظت جیب میں رکھ لی
ذرا سی سی ہے بچا کر پھینک دی [illegible] نے ... تو واعظ نے اٹھا کر حسب عادت جیب میں رکھ لی

ہمیں دنیا نہیں ملتی مگر کچھ لوگ ایسے ہیں
جنھوں نے صرف دو سجدوں میں جنت جیب میں رکھ لی

ہمارے دوست شاہد صدیقی نے کہا تھا:

[illegible] ہی اور ایک رات آئی ... آپ تو کہتے تھے دن نکلنے والا ہے

یہی مضمون جب کسی مزاح گو کے ذہن میں آتا ہے تو اس کی بات یہ بنتی ہے:

بیڑیاں ٹوٹیں زمانہ ہو گیا ... رخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی ملی تھی رات میں ... سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

طالب خوندمیری رات کے ماہرین میں سے ہیں۔ قیس نے لیلیٰ سے جب کہا کہ جانِ من تمہارے والدین کا رنگ تو اچھا خاصا صاف ہے لیکن تمہارا رنگ کالا کیوں ہے تو طالب کی زبان میں لیلیٰ نے کہا "کیا بتاؤں میں اندھیری رات میں پیدا ہوئی"۔

طالب خوندمیری کے مجموعۂ کلام کا نام میرے حساب سے "بحر الکاہل" ہونا چاہیے تھا۔ کلام بحر میں تو ہے ہی لیکن اس کی طباعت و اشاعت میں شاعر کے تساہل اور لاپرواہی یا پھر مصروفیت کا [illegible] بحر الکاہل معلوم ہوتا ہے۔ طالب خوندمیری گزشتہ ۲۰ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ [illegible] ایک [illegible] ہے۔ شاعری کا [illegible] اور یہ طالب کا مطلب تھی یا نہیں لیکن انھیں کی خوب [illegible] یہ سلسلہ اس لیے جاری رہے گا کہ ہندوستان میں [illegible] نہیں بچتا ہے۔

طالب خوندمیری نے اپنی [illegible] میں [illegible] اب تک تقریباً ڈھائی [illegible]

۱۷

ملے گا اور ان کو یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ اگر دو مسجدوں کے سہارے جنت جیب میں رکھی جا سکتی ہے تو مسجد کا نقشہ بنا کر بھی ثواب دارین " حاصل کیا جا سکتا ہے۔

طالب خوندمیری کو اس لحاظ سے بھی اولیت حاصل ہے کہ یہ ہندوستان کے پہلے آرکیٹکٹ مزاح گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں نامیئے ہی نامیئے ہیں۔ مزاح کی کھانیں ہیں اور طنز کے جھروکے اور مستزاد ایک روف گارڈن

مجھے یقین ہے کہ ان کا مجموعہ کلام نئے سال ۹۴ء کا بہترین تحفہ ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سرکار بھی اس قہقہہ آور گیس کی قدر کرے اشک آور گیس کا استعمال اب بند ہونا چاہیے۔

• یوسف ناظم : ۱۹- الہلال ، ۱۳- باندرہ ری کلیمیشن بمبئی ۴۰۰۰۵۰

حیدرآباد کے موضوع پر

ممتاز مزاح نگار

عابد معز

کے

تیکھے اور دل چسپ مضامین

واہ حیدرآباد

کمپیوٹر آفسٹ طباعت : فرینڈز شعیب کمپوزنگ

ناشر

زندہ دلان حیدرآباد

قیمت : ۴۰ روپے

مجتبیٰ حسین

طالب خوندمیری

ایک تاثر

طالب خوندمیری کو میں جب جب دیکھتا ہوں تو حیرت کرنے لگتا ہوں کہ ایسے نفیس، مہذب، خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش گفتار، خوش شکل، خوش عقل، خوش پوشاک اور خوش خصال انسان کو بیٹھے بٹھائے شاعر بن جانے اور وہ بھی طنزیہ شاعر بن جانے کی کیا سوجھی۔ جس شخص کو کسی حسین و جمیل دوشیزہ کے ساتھ سینما کے اسکرین پر دکھائی دینا چاہیے تھا وہ ایسے ڈھب بے ڈھنگ، بدشکل اور بد ہیئت شاعروں کی سنگت میں بیٹھا .... مشاعروں میں لہک لہک کر کلام سناتا ہوا نظر آتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بے پناہ داد بھی وصول کرتا ہے۔ مانتا ہوں کہ شاعری کا شکل و صورت اور شاعر کے حلیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اسے کیا کیجیے کہ ہمارے ہاں بدشکل اور بد ہیئت شاعروں کی بہتات ہے۔ اچھی شکل کے بیان اور ذکر سے تو ہماری شاعری بھری پڑی ہے لیکن اس موہنی شکل کو شاعری میں ڈھالنے والا عموماً ایسی ویسی شکل کا ہی ہوتا ہے۔ طالب خوندمیری جیسی شکلیں ہمارے ادب میں استثنائی حیثیت رکھتی ہیں۔

طالب خوندمیری عملی زندگی میں نہایت سنجیدہ، بردبار، متین اور گمبھیر آدمی ہیں۔ آپ انھیں جدھر سے چاہیں الٹ پلٹ کر دیکھ لیں۔ یہ کسی زاویہ سے شاعر نظر نہیں آئیں گے۔ پیشے کے اعتبار سے ارکیٹکٹ ہیں۔ گویا طرز تعمیر، آرائش، سلیقہ، توازن اور نفاست یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی اہمیت ان کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی آرکیٹکٹس کے بارے میں تو کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ طالب خوندمیری نے عمارتوں کو ایک طرز تعمیر عطا کرنے سے پہلے اپنی ذات و شخصیت کی تعمیر کچھ اس ڈھنگ اور سلیقہ سے کی ہے کہ اب ان کی ذات خود طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ بن گئی ہے۔ ایک انسان کسی خوب صورت عمارت کی طرح نظر آنے لگے تو یہ ایک انوکھی بات ہے۔

طنزیہ شاعر اور وہ بھی بہترین طنزیہ شاعر کی حیثیت سے طالب خوندمیری نہ صرف سارے برصغیر میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں مگر آپ میری رائے جاننا چاہیں تو عرض کروں کہ میں تو انھیں ایک نہایت سنجیدہ شاعر سمجھتا ہوں، طنز کی وہ سطح نہایت [illegible]

ہوتا ہے۔ جہاں سنجیدگی اور شگفتگی دونوں آپس میں کچھ اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ آدمی ہنستے ہنستے اور بلکہ ہنستے ہنستے رونے پر مجبور سا ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ ہنستے ہنستے اچانک سوچنے اور سوچتے سوچتے ہنسنے کیوں لگتا ہے طالب خوندمیری نے اپنی طنزیہ شاعری میں اس منزل کا سراغ پا لیا ہے۔ (یہ سودا تو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا کہ مشاعروں میں طالب کے کلام پر لوگ جب بے پناہ داد دے رہے ہوتے ہیں تو میں چپ سادھے بیٹھا رہتا ہوں۔ اس لیے کہ اکثر لوگوں کو طالب کا ہنستا کھنکتا اور مچلتا ہوا دل تو دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان کی نظر طالب کے لہو لہان کلیجے کی طرف نہیں جاتی۔ طالب جس سطح پر جا کر طنزیہ شعر کہتے ہیں، اس شعر کو اس کے اصلی سیاق و سباق کے ساتھ صحیح طور پر محسوس کرنے کے لیے کم از کم سامع کو بھی طالب کی سطح تک جانے کی سعی کرنا چاہیے۔ تبھی طالب کی شاعری کے اسرار و رموز آپ پر کھلنے لگتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ طالب نے ہمارے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ زبان کی نزاکتوں، لطافتوں اور باریکیوں سے وہ خوب واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی لفظ کو کیسے چمکایا جائے اور کسی لفظ کے معنی کو وسعت عطا کی جائے۔ میری شخصی رائے یہ ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی کی جگہ آج بھی خالی ہے۔ ہمارے ادب کا غالباً یہ واحد خلا ہے جو اب تک پُر نہیں ہو سکا ہے۔ ویسے تو برصغیر میں مزاحیہ اور طنزیہ شاعروں کی کمی نہیں ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں والا معاملہ ہے لیکن وہ جو ایک کسوٹی ہوتی ہے۔ ادب اور آرٹ کی، اس پیمانے کو برکھا جائے تو بہت کم شاعر کھرے نکلیں گے۔ بعض تو ایسے شاعر بھی ملیں گے جنہیں اگر خدانخواستہ کسوٹی پر گھسا جائے تو سالم کے سالم شاعر اپنی شاعری سمیت گھس گھسا کر معدوم ہو جائیں گے میں طالب خوندمیری کو ادب کی کسوٹی پر پورا اترنے والے اس دور کے دو تین شاعروں میں شمار کرتا ہوں اور اسی لیے ان کی عزت بھی کرتا ہوں حالاں کہ وہ عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔ تاہم عزت کا عمر سے کیا تعلق؟ اپنا تو یہ حال رہا کہ کہیں بھی کوئی قابل احترام شئے نظر آگئی تو اپنا سر جھکا لیا۔

طالب خوندمیری کے مجموعۂ کلام کا مسودہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ سوچا تھا کہ ان میں سے کچھ اشعار اپنے لیے دستاویزی ثبوت کے طور پر نقل کروں لیکن جب اس مسودہ کو بغور دیکھا تو احساس ہوا کہ اس مجموعۂ کلام کا ہر شعر اس قابل ہے کہ اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے۔ سوچا کہ اگر میں ہی یہ کارنامہ دیباچہ میں انجام دے لوں تو طالب اپنا مجموعۂ کلام کس طرح چھاپیں گے۔ اسی لیے اشعار کو نقل کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ اشعار کو کوٹ نہ کرنے کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ طالب کی غزل ہو یا نظم اس کا ہر شعر اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے جیسے کسی خوب صورت عمارت کی اس کے در و دیوار، اس کے نقش و نگار اس کی کھڑکیاں اور روشن دان ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب مل کر ایک عمارت کی تعمیر کرتے ہیں۔ اکیلی کھڑکی یا اکیلے دروازے کی عمارت سے ہٹ کر اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔ گویا طالب نظم نہیں کہتے شاعری کا ایک خوب صورت محل تعمیر کر دیتے ہیں۔ اپنی شاعری میں انھوں نے یہ روش اپنے پیشے سے اپنائی ہے۔

طالب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ پیروڈی لکھنے میں بے پناہ مہارت رکھتے ہیں۔ پیروڈی نہایت مشکل فن ہے اس کے لیے ایک ایسی ذہانت درکار ہے جو اصل کا جائزہ کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو۔ طالب کی

طالب کی بے شمار خوبیاں اب مجھے یاد آرہی ہیں۔ اچھا دوست، اچھا آرکیٹکٹ، اچھا منتظم (عالمی اردو کانفرنس کے یہ جنرل سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں) اور سب سے بڑھ کر اچھا انسان آج کے دور میں ادیب تو بہت ملتے ہیں لیکن انسان جو اچھا بھی ہو کہاں ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ طالب خوندمیری کے شعری مجموعہ کو ادبی حلقوں میں بے پناہ سراہا جائے گا۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، امبرا اپارٹمنٹ
پٹ پڑ گنج،
دہلی ۱۱۰۰۹۲

مسیح انجم

طالبؔ خوندمیری

ہمہ وقتی شاعر، جز وقتی آرکیٹیکٹ

میں اس دَور کے طنز و مزاح کے تین شاعروں کے کلام کا نہ صرف قائل ہوں بلکہ قتیل بھی۔ ان میں سے ایک شاعر تو ہمارے طالبؔ خوندمیری ہیں جو طنز و مزاح کے دار الخلافہ حیدرآباد دکن کی پیداوار ہیں۔ ہمارے شہر والے اِن کو گھر کی مرغی سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ سلوک بھی اسی طرح کا کرتے ہیں جو گھر کی مرغی کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ دوسرے شاعر ہیں رضا نقوی واہیؔ جو صوبہ بہار کے صدر مقام پٹنہ میں رہتے ہیں۔ اور آج کل بوجہ پیرانہ سالی شعر کم کہتے اور کھانستے زیادہ ہیں۔ تیسرے شاعر ہیں حضرت دلاور فگارؔ جو ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں رہتے ہیں۔ اگر آپ ان تین شاعروں کو ایک ایک نقطہ مان کر اور علاقائی تعصب سے بالاتر ہوکر اِن تین نقطوں کو بغیر ڈنڈی مارے ملائیں تو ان سے ایک مثلث بنے گا۔ اب یہ مثلث مساوی الساقین مثلث ہوگا یا مثلث مساوی الاضلاع۔ اس کا انحصار تو بڑی، پرکار اور پنسل کے صحیح استعمال اور نقد و نظر کے اکثر رفتہ اصولوں سے اجتناب پر ہے۔ ویسے، ان تین نقطوں کو ملانے سے فیملی پلاننگ کا تکون بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اس تکون کا اطلاق ان شعرا پر اس لیے نہیں ہوسکتا کہ ان کے ہاں بڑی طول طویل نظمیں اتنی زیادہ تولد ہوتی رہتی ہیں کہ وہ فیملی پلاننگ کی رد میں منظوم مشورے دے سکتے ہیں۔

کوئی بیس، پچیس سال اُدھر کی بات ہے کہ طالبؔ خوندمیری کو "بزم کہکشاں" مشیرآباد کی ایک ادبی محفل میں دیکھنے اور سُننے کا موقع ملا تھا۔ درمیانہ قد۔ اُٹھتی اور اُڑتی جوانی۔ گورا چٹا رنگ۔ ستواں ناک جو عینک کی نشست و برخاست کے لیے انتہائی موزوں۔ غضب کے گھنے بال جنھیں کالے اور چکیلے بنانے میں طالبؔ کی حکمتِ عملی اور ایک خاص برینڈ (BRAND) کے روغن روسیاہ کو بڑا دخل تھا۔ طالبؔ بالکل گلفام تھے گلفام! مگر گل بدن نہیں تھے۔ اگر قدرت نے ان کے قد کے معاملے میں صد ایک انچ کی فیاضی دکھائی ہوتی تو وہ شہزادہ گلفام کہلاتے۔ اُس محفل میں طالبؔ کے کلام پر سامعین نے اتنی داد دی کہ وہ داد کے بوجھ تلے لڑکھڑانے لگ گئے تھے۔ محفل جب برخاست ہوئی تو حمایت اللہ اور مصطفیٰ کمال نے آپس میں مشورہ کرکے طالبؔ کو زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ مشاعرے میں کلام سُنانے کی پیشگی دعوت دے دی۔ اب آپ شاید یہ پوچھیں کہ اس وقت آپسی مشورے کی کیا ضرورت تھی! تو عرض ہے کہ یہ دو معززین جب کا ر خیر [illegible] کرتے

زندہ دلان کے اسٹیج سے عوام کو روشناس کرواتے ہیں تو آپس میں مشورہ ضروری سمجھتے ہیں تاکہ شاعر کے فلاپ ہونے کی صورت میں دونوں برابر کے قصوروار ٹھہریں اور دونوں کے حصے میں برابر جلیبیا کا خون گویا آئے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ زندہ دلی کا تقاضہ یہی ہے۔ اس طرح زندہ دلانِ حیدرآباد میں ایک ٹکلفم شاعر کا اضافہ ہوگیا۔ ورنہ اس سے پہلے جن شاعروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کلام کو سمجھنے کا موقع ملتا تھا وہ چہرے مہرے کے اعتبار سے بالکل اجاڑ تھے۔ حتیٰ کہ بعض کے تخلص تک ایضاً ایضاً۔ یہ سچ ہے کہ اپنی پسند یا خوبصورت چہرے کی فرمائش خدا سے کرنا انسان کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن تخلص کو اختیار کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہونے کے باوجود اول فول قسم کے تخلص رکھ لینا کورذوقی کی علامت ہے۔

اب میں اُن تخلصوں کو نام بنام گنا کر تعزیراتِ ہند کی دفعہ "گالی گلوج" کے تحت مرتکب جرم قرار پاکر فوجداری مقدمے میں ماخوذ ہونا نہیں چاہتا۔ طالب زندہ دلان میں کیا آئے ایک نئی آواز کا اضافہ ہوگیا اور یہ آواز مشاعرے کے وقار کا سبب بنی۔

میں طالب خوندمیری کو کوئی پچیس سال سے دیکھتا آرہا ہوں۔ پہلی بار جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو وہ طالب خوندمیری کم، طالب علم خوندمیری زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ اپنی عمر کی نصف سنچری پار کرنے کے باوجود وہ اب بھی طالب علم خوندمیری دکھائی دیتے ہیں، نہایت اسمارٹ اور چاق و چوبند۔ ان کے اس رکھ رکھاؤ میں ایک خاص قسم کی نشہ کو بڑا دخل ہے۔ وہ جس نشہ کے عادی ہیں، اس کا نام ہے کام۔ ملالت ہو یا پریشانیاں ــ ان کو کام سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ پریشانیوں کے دنوں میں جس عمدگی اور جس یکسوئی سے فرائض منصبی اور فرائض ازدواجی کو انجام دیتے ہیں کہ ان کے گھر والے یہی سوچتے ہوں گے کہ وہ سدا پریشان ہی رہیں۔ کام طالب کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ وہ جتنا زیادہ کام کرتے جاتے ہیں اتنا ہی نکھرتے جاتے ہیں۔ ان کے کاموں کی فہرست کافی طول طویل ہے جس میں ان کے دوست احباب کے وہ غیر ضروری کام بھی شامل ہیں جو وقتی مشاغل کے ذیل میں آتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار یوسف اعظمی نے اپنی نظم "نیوز ریل" کو پینٹنگ کے روپ میں پیش کروانے کے لیے طالب خوندمیری کو ورغلایا تھا۔ اور وہ ان کی باتوں میں آکر نظم کو پینٹ کرنے میں یوں مشغول ہوگئے تھے جیسے یہ کام ہوا تو یوسف اعظمی جدید شاعری سے تائب ہو کر زندہ دلانِ حیدرآباد میں شامل ہو جائیں گے اور امریکہ کا رُخ نہ کریں گے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب طالب خوندمیری نے سرکاری ملازمت کو استعفیٰ دے کر پی ایچ ای سے علیحدگی اختیار کر کے کنگ کوٹھی میں شیرگیٹ کے روبرو اپنا آفس قائم کیا تھا جہاں یوسف اعظمی کا آنا جانا شروع ہوگیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ طالب کا آفس یوسف اعظمی کے گھر کے پاس ہی منتقل ہوگیا۔ پھر تو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مصداق ادارہ "حلف" کے اراکین جنھیں ڈاکٹر یوسف کمال نے "احلاف" (بروزنِ احناف) کا نام دے رکھا ہے طالب کے آفس کو یوں بسنے لگے جیسے وہ طالب کا آفس نہ ہو، "حلف" کا دیوان خانہ ہو۔ اس طرح طالب خوندمیری کے آفس میں عمارتوں اور مکانوں کے نقشے بنوانے والوں کی آمد و رفت کم اور "احلاف" کی چہل پہل زیادہ رہنے لگی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طالب زندہ دلانِ حیدرآباد کے رکن نہیں بلکہ "حلف" کے سرگرم کارکن ہیں۔ ان کی ایسی ہی سرگرمیوں کو دیکھ کر مجھ کو وہ پرانی کہاوت یاد آتی تھی جس میں "گھر کا کھا کے ماموں کی بکریاں چرانے" کے مضمون کو باندھا گیا ہے لیکن طالب خوندمیری نہ تو "حلف" سے منحرف (منحرف) ہوئے اور نہ "احلاف" سے اختلاف (انحراف) کرتے رہے پھر ایک دن "حلف" کے اجلاس میں یوسف اعظمی کی نظم "نیوز ریل" کے ساتھ ساتھ طالب خوندمیری کی [illegible]

تنقیدی تبصرہ ذیلوں پر لگادی گئی۔ "حلقہ" کا وہ ادبی اجلاس آج بھی میرے ذہن میں تروتازہ ہے۔ کیونکہ اُس ادبی اجلاس کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے مجھے "حلقی نقاد" کے نام سے چھیڑنا شروع کردیا تھا۔ اُس دن یوسف اعظمی کی نظم پر، جیساکہ "حلقہ" کی روایت رہی ہے، سخت ترین مباحث ہوئے تھے۔ (اگر کچھ کسر رہ بھی گئی تھی تو یار لوگوں نے اُن کی سطر اس سڑک پر نکال لی تھی) لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ آخر دانشوروں کی نظریں طالب کی پینٹنگ کی طرف کیوں نہیں جاتیں ؟ میں کبھی پینٹنگ کی طرف دیکھتا تو کبھی طالب کے چہرے کی طرف نظریں دوڑاتا کہ دیکھیں آرٹسٹ کے چہرے پر کس قسم کے آثار پائے جاتے ہیں۔ طالب ہال میں بہت پیچھے بالکل ایک کونے میں یوں دبکی مارے بیٹھے تھے جیسے اُس پینٹنگ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میں طالب کے ایک مداح کی حیثیت سے اس کوفت میں مبتلا تھا کہ آخر طالب کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ وہ اچھی خاصی شاعری کو چھوڑ کر نظم کو پینٹ کرنے چلے ہیں۔ ہاں تو جب کسی نے بھی اُن کی پینٹنگ کے بارے میں اپنے ارشادات عالیہ سے نہیں نوازا تو میں طالب کی محنت کو یوں رائگاں جاتا دیکھ کر اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے اُٹھا۔ میرا مقصد تو طالب کو چھیڑنا اور بحث میں گرمی پیدا کرنا تھا۔ طالب نے اُس پینٹنگ میں کارخانوں کی چند دھواں اُگلتی چمنیاں اور چند اژدھے دکھائے تھے جو لال لال زبانیں نکالے ہوئے تھے۔ اُن سب کے اوپر ایک مری ہوئی فاختہ کو اُلٹا لٹکایا گیا تھا جس کی گردن اور چونچ کسی قدر لمبی ہو جانے کی وجہ سے وہ فاختہ کے بجائے ایک اُلٹی لٹکی ہوئی بطخ سی دکھائی دے رہی تھی اس میں میری نظر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ (شاید وہ یوسف اعظمی کی جدید شاعری والی فاختہ تھی جس کی چونچ اور گردن ساقط البحر ہو گئے تھے) طالب نے پینٹنگ میں جو کلر استعمال کئے تھے وہ ذرا ڈل (dull) تھے اور باریک پوائنٹ والے برش کو بروئے کار لانے کی وجہ سے پینٹنگ ذرا دب سی گئی تھی۔ اگر طالب نے پینٹنگ کے اطراف گہرے رنگ کا چوکھٹا بنایا ہوتا تو وہ اُبھر کر آتی۔ میں انہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے پہنچا تو مجھے اپنی بی۔ ایڈ ٹریننگ کے زمانے کے ایک جواں سال مدرس یاد آگئے جنھوں نے جوشؔ کی ایک نظم کو پڑھاتے وقت اس کے ایک مصرعہ کو پینٹنگ کے ذریعہ سمجھایا تھا۔ اور وہ مصرعہ تھا :

بے چین بگولا رقصاں ہے آندھی پہ شرف پانے کے لیے

اب میں کیا عرض کروں کہ معلم نے پینٹنگ تو ٹھیک ہی بنائی تھی لیکن سخن فہمی کا ثبوت دیتے وقت "بگولا" کو "بگلا" بنا کر رکھ دیا تھا جو آندھی پہ شرف پانے کے لیے اپنے مقابل والی سمت میں پورا زور لگا رہا تھا۔ میں نے بگلے والی اُس پینٹنگ سے طالب کی پینٹنگ کا موازنہ کرتے ہوئے بس اتنا ہی عرض کیا تھا کہ "طالب نے "بگولا" کو بگولا ہی سمجھا "بگلا" نہیں سمجھا اور یوسف اعظمی کی "نیوز ریل" کو اس کے حقیقی پس منظر میں پینٹ کیا۔ اگر وہ اپنی پینٹنگ کے اطراف گہرے رنگ کا چوکھٹا بناتے تو پینٹنگ اُبھر کر آتی اور سب کی توجہ کا مرکز بنتی۔" ان دو چار جملوں کے بعد میں نے طالب پر ایک نظر ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک رنگ جا رہا تھا۔ میرا تبصرہ ختم ہونے تک ان کے چہرے پر اتنے ہی رنگ آئے اور گئے جتنے کہ انہوں نے اپنی پینٹنگ میں استعمال کیے تھے۔ میرے تبصرے کے بعد جب طالب خوندمیری جواباً عرض کرنے کے لیے اُٹھے تو ان کا چہرہ بھبوکا بنا ہوا تھا جس پر بڑی آسانی سے چنے بھون لیے جا سکتے تھے۔ طالب نے اپنے جوابی تبصرے میں راقم الحروف کی حقیر معلومات کو چیلنج کرتے ہوئے نہ صرف رنگوں کی قسمیں گنائیں بلکہ ان کے اثرات اور کمالات

وغیرہ سا کچھ اس انداز سے ذکر کیا کہ مجھے بالکل چارلس لیمب کی طرح رنگ برنگی ٹنگ دکھائی دینے لگے۔ اور آخر میں "چلتے چلاتے" کے طور پر ایک طنزیہ جملہ اس خاکسار کی طرف پھینکا کہ پینٹنگ کے اطراف چوکھٹا بنانا تو اسی کے لیے شاید ضروری ہو۔ ورنہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہ واقعہ تو بس یوں ہی "واقعۂ معترضہ" کے طور پر آگیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ادارہ "حلف" ابتدا ہی سے طالب کی کمزوری رہا ہے۔ چنانچہ "حلف" سے طالب کی وابستگی کو دیکھ کر ڈاکٹر مصطفٰے کمال کو یہ کہنا پڑا کہ طالب کے "حلف" میں گھسے رہنے کی وجہ سے ان کے کلام میں سنجیدگی آتی جا رہی ہے۔ اور ان پہ "اسلاف" کا رنگ چڑھتا جا رہا ہے۔ ایک بار تو انہوں نے باتوں باتوں میں پروفیسر غیاث متین سے یہاں تک کہہ دیا کہ "میاں غیاث متین تم لوگ ہمارے طالب کو بگاڑ رہے ہو اور زندہ دلان سے الگ کر رہے ہو!" اس پر غیاث متین نے بڑی معصومیت سے کہا تھا "اے لو! ہم کیوں بگاڑنے لگے کمال بھائی! وہ تو پہلے ہی سے بگڑے ہوئے ہیں اور مزاحیہ شاعری کر رہے ہیں!" تب مصطفٰے کمال نے حساب کو بے باق کرنے کے لیے "حلف" کے ایک سرگرم کارکن اور ممتاز شاعر مضطر مجاز پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ جس کے نتیجے میں مضطر مجاز نے چوری چھپے طنزیہ شاعری شروع کر دی اور زیج زہریلا کے نام سے طنزیہ نظمیں لکھیں جو بے حد پسند کی گئیں۔ پھر تو مصطفٰے کمال نے مضطر اور طالب کو ماہنامہ "شگوفہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل کر کے اپنی ہوشیاری کی مہر ثبت کر دی اور سارا حساب بے باق کر دیا۔

پیشے کے لحاظ سے طالب خوندمیری آرکیٹیکٹ ہیں۔ لہٰذا انھیں تعمیر شدہ عمارتوں اور زیرِ تعمیر مکانوں کے معائنہ کے لیے جانا ضروری ہو جاتا ہے جہاں ان کی ملاقات مہ رخوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ غالب نے مہ رخوں سے ملاقات کے لیے مصوری سیکھی تھی۔ تو طالب نے مہ رخوں سے ملنے اور دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کے لیے آرکیٹیکچر کو اپنا پیشہ بنایا۔ طالب خوندمیری طنز و مزاح کے واحد شاعر ہیں جنھیں دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے اور ڈرائنگ روم، بیڈ روم اور نہ جانے کیا کیا روم میں جھانکنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ ایسی سہولت اور ایسی رعایت کسی دوسرے شاعر کے نصیب میں کہاں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ طالب کو اس طرح "جھانکنے" کے لیے بہ اصرار بلایا جاتا ہے۔ اور پھر ان کو اس کا معقول معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ لیجیے صاحب! جھانکنے کا بہت بہت شکریہ! اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی کافی دلچسپ ہے جس کے راوی خود طالب خوندمیری ہیں۔ ان کے ایک کلائنٹ کو اپنے بنگلے کی تعمیر کے وقت باتھ روم سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر بار معائنہ کے وقت وہ طالب خوندمیری کو بہ اصرار یہ سمجھاتا کہ باتھ روم ایسا ہو، باتھ روم ویسا ہو۔ اور اس میں نشست و برخاست کا نظام ایسا ہو۔ طالب بھلے ہی مروت والے سہی، لیکن طرزِ تعمیر اور نقشوں کی ڈیزائننگ میں وہ دوسروں کی غیر ضروری مداخلت کو برداشت نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کی ناراضگی کو بھانپ کر اس کلائنٹ کی اہلیہ نے طالب کو یوں رام کیا تھا۔ "طالب بھائی! آپ میرے شوہر (Husband) کی باتوں کا برا مت مانیے اور ان کو باتھ روم کے بارے میں مسلسل بولنے دیجیے کیونکہ [illegible] ان کو باتھ روم میں ہی رہنا ہے۔"

[illegible] جب طالب خوندمیری مہ رخوں میں جھانکنے کے لیے نکل جاتے

ہیں تو وہ بالکل پارسا بن جاتے ہیں۔ (اب تک وہ کوئی ڈھائی سو مساجد کے نقشے تو بنا چکے ہیں جن میں سے بیشتر مسجدیں آباد بھی ہیں) مسجدوں میں جھانکتے وقت اُن پر ایک وجدانی کیفیت سی طاری ہوجاتی ہے۔ تب وہ اپنے اندر بھی جھانک کر دیکھ لیتے ہیں کہ دل میں کہیں کوئی چور تو نہیں۔ اس طرح گھروں میں جھانکتے وقت طالب سے جو کچھ سرزد ہوجاتا ہے اس کو وہ بالآخر مسجد میں بخشوا لیتے ہیں۔

طالب کو نقشہ نویسی کے کاروبار اب کچھ اتنی وسعت اختیار کر گئے ہیں کہ کبھی کبھی ان کو خود اپنے کانٹریکٹر، میستری، پلمبر، بڑھئی، اینٹ سپلائر، ریت سپلائر اور نہ جانے کیا کیا سپلائرز کو پہچاننے اور ان کے نام یاد رکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ بعض اوقات بڑی دلچسپ سچویشن میں گھر جاتے ہیں۔ اب میں کیا بتاؤں کہ ایک دن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے اپنے آفس کی چھت کو گھور رہے جا رہے تھے کہ میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم چونک پڑے اور بولے "بیٹھو میرے سچے بھائی! میرے چچا! میرے مخلص نقاد!"

میں سمجھ گیا کہ طالب کے پاس ضرور کوئی نظم ہوئی ہے، جبھی تو مسکہ لگایا جا رہا ہے۔ میں بیٹھ گیا تو بولے "ایک زبردست نظم ہوئی ہے۔ آپ سنیں گے تو پھڑک اٹھیں گے۔!"

میں نے کہا کہ ہر شاعر اپنی ہر تخلیق کو "زبردست" ہی بتاتا ہے چاہے وہ انتہائی پھسپھسی ہی کیوں نہ ہو۔ اب رہا نظم پر پھڑکنے کا سوال تو وہ نظم سننے کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ میں پھڑک جاؤں گا یا بھڑک کر بھاگ جاؤں گا!"

اس کے بعد طالب نے اپنی بیاض نکالی اور پہلا شعر پڑھ کر داد طلب نظروں سے پوچھا:
"کیسا ہے قافیہ"؟

اُس وقت دروازے کے پاس بڑی دیر سے پاپیّا نامی میستری، آفس میں داخل ہوں یا نہ ہوں، کے پوزیشن میں کھڑا موقع کا منتظر تھا۔ جیسے ہی طالب نے مجھ سے کیسا ہے قافیہ؟ پوچھا تو پاپیّا میستری نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر شرماتے ہوئے کہا "میں قافیا نہیں، پاپیّا ہوں، اور اچھا ہوں"۔ طالب کے قافیہ سے چھٹکارا دلانے کے لیے پاپیّا کا آجانا میرے حق میں فالِ نیک ثابت ہوا۔ چنانچہ میں اُٹھنا ہی چاہ رہا تھا کہ طالب نے میز پر آگے کی طرف جھکتے کرسی پر اپنی پوزیشن کو بدلتے اور دروازے کی طرف دیکھتے دماغ پر زور ڈال کر پوچھا "کون پاپیّا؟"

وہ بولا "وہی پاپیّا میستری جسے کل آپ کام دلائے تھے!"

طالب اپنی بیاض کو بند کرتے ہوئے بولے "اچھا تو اندر آتا کیوں نہیں؟ باہر سے کیوں جھانک رہا ہے۔ ہاں تو بالو کیا ہوا؟"

وہ بولا "ٹھیکے دار پیسے نہیں دے رہا ہے۔ اور بول رہا ہے دیوار میں کریک آگئی ہے!"

طالب نے کہا "تو میں کیا کروں؟ کیا کریک کا ذمے دار بھی میں ہوں؟"

ابھی یہ بات مکمل بھی نہیں ہوپائی کہ ایک اور صاحب تشریف لاتے ہیں اور ناک پر کی مکھی کو اُڑانے کے انداز میں آداب کرکے بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

طالب : آپ کا کیا ہے ؟

نو وارد : میں تاراتنا پڑھی ہوں صاب (صاحب) . وہ دروازے بند نہیں ہو رہے ہیں ؟

اب طالب سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کس کے دروازے بند نہیں ہو رہے ہیں اور کیوں بند نہیں ہو رہے ہیں ؟ چنانچہ وہ اپنی جھینپ کو مٹانے کے لیے ظرافت کا سہارا لے کر نو وارد سے پوچھتے ہیں :

ارے کس کے دروازے بند نہیں ہو رہے ہیں اور کس پر بند نہیں ہو رہے ہیں ؟"

نو وارد الٹا ہی جواب دیتا ہے " اور کھل بھی نہیں رہے ہیں صاب !"

طالب شگفتہ اکر پوچھتے ہیں " ارے کس پر نہیں کھل رہے ہیں ؟"

ابھی یہ سسپنس اور ترسیل کا المیہ یوں ہی برقرار رہتا ہے کہ ایک زیر تعمیر بلڈنگ کے مالک تشریف لاتے ہیں اور کرسی پر دراز ہو جاتے ہیں۔

طالب : " کیوں جناب ، آپ کا بنگلہ تو تیار ہو گیا . سب ٹھیک ہے نا ؟"

مالک مکان : سب تو ٹھیک ہے . لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ بنگلے کا نام کیا رکھوں ؟"

طالب : (اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے) " حد کر دی جناب ! اب نام بھی میں دوں !"

مالکِ مکان : آپ شاعر ہیں نا صاحب !

طالب (کسی قدر چڑ کر) : کیا شاعر ہونا کوئی جرم ہے ؟

مالکِ مکان : ارے نہیں صاحب ! شاعر اچھا سا نام تجویز کر سکتا ہے .!

طالب : (ظرافت کا سہارا لیتے ہوئے) پھر تو نام رکھیئے " خواب گاہِ خرگوش "

مالکِ مکان : ارے یہ کیا صاحب ! آپ نے تو مجھے خرگوش بنا دیا !

طالب : میں نے نہیں بنایا . آپ ہیں ہی خرگوش جو مکان تیار ہونے کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد تو نیند سے بیدار ہو کر اب تشریف لائے ہیں . اور ابھی تک حساب کتاب بھی فائنل نہیں ہوا ہے ."

اب میں کہاں تک گناؤں یہ تو صرف ایک دن کے ایک گھنٹے والی مصروفیت کا ٹریلر تھا . ایسی ہی مصروفیات اور ایسے ہی کرداروں کے درمیان طالب خوندمیری کے شب و روز گزرتے رہتے ہیں . ان میں اگر صبر اور ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا نہ ہوتا تو وہ کبھی کے بوڑھے ہو گئے ہوتے !

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے . میں جب طالب خوندمیری کو دیکھتا ہوں تو اس مقولے پر ایمان لانا پڑتا ہے . آپ بھلے ہی طالب کو بڑا آدمی نہ سمجھیں لیکن ہیں وہ بڑے کردار کے انسان . بڑے آرکیٹیکٹ . اور بڑے شاعر . ایک زمانے میں وہ سرکاری ملازم بھی تھے اور پی . ایچ . ای میں کام کر رہے تھے . ایک دن وہ اپنے افسر کی کسی نا معقول بات پر جو بگڑے تو فوراً استعفیٰ لکھ مارا اور نوکری کو چھوڑ کر گھر آ گئے . ان نامساعد حالات میں ان کی بیوی نے ان کا بڑا ساتھ دیا . وہ خود اکثر کہا کرتے ہیں کہ " میری بیوی اگر حوصلہ مند نہ ہوتی تو میں کب کا ہمت ہار چکا ہوتا ، اور آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ بیوی کی بدولت ہوں . سچ تو یہ ہے کہ وہ میری شریکِ حیات ہی نہیں میری محبوبہ بھی ہے !"

کہتے ہیں کہ جب رزق کا ایک دروازہ بند ہو جاتا ہے تو خدا رزق کے ستر دروازے کھول دیتا ہے۔ میں طالب اور ان کے دفتر کی ٹیم کو دیکھتا ہوں تو اس قول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ طالب نے نہ صرف اپنے گھر کو سنبھالا بلکہ کئی لڑکھڑاتے گھرانوں کو سہارا بھی دیا۔ آج ان کے کئی شاگرد (جن میں ہر ایک شاگرد رشید ہی ہے) سعودی عرب، امریکہ اور خلیجی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے افرادِ خاندان کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ خود میرا لڑکا جو اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر فائز ہے انھیں کا تربیت یافتہ ہے۔ جو کپڑوں کے انتخاب، رنگوں کے انتخاب، لباس کی بناوٹ اور تراش و خراش حتیٰ کہ ہیر اسٹائل میں تک اپنے باپ کی نہیں، اپنے استاد طالب خوندمیری کی نقل کرتا ہے۔ شکر ہے کہ شاعری نہیں کرتا۔ میں نے یہ دیکھا کہ طالب خوندمیری اپنے شاگردوں پر اپنی قابلیت کی دھونس جما کر مرعوب نہیں کرتے۔ ان میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے سیانے مسخرے پن کو برموقع و برمحل استعمال کر کے ایک دوست کے روپ میں شاگرد کو اپنے اعتماد میں لے لیتے ہیں اور پھر وہی اعتماد اُس کی نس نس میں بھر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے شاگردوں کے وجود پر چھا جاتے ہیں۔ وہ اپنے لڑکوں کے ساتھ بھی باپ کی طرح پیش نہیں آتے۔ یوں بھی دیکھنے میں وہ اور ان کے لڑکے باپ بیٹے دکھائی نہیں دیتے۔ طالب اپنے لڑکوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ طالب کے نئے ملنے والے اکثر دھوکا کھا کر یہی پوچھتے ہیں کہ ان میں باپ کون ہے اور بیٹا کون ؟ اور بھائی کون ؟!

ایک راز کی بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ طالب خوندمیری کے پاس ایک چلتا پھرتا "مٹھی فنڈ" ہوا کرتا ہے۔ چونکہ وہ خود بچپن میں غریبی کے دور سے گزر چکے ہیں اس لیے ان سے دوسروں کی غریبی دیکھی نہیں جاتی۔ (اب تو وہ کارنشین ہیں) حضورؐ نے فرمایا تھا کہ سیدھے ہاتھ سے خیرات دیں تو بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے۔ اس پر طالب بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اور سختی بھی اتنی کہ خود سیدھے ہاتھ کو پتہ نہیں چلتا کہ مٹھی میں کتنے پیسے بند ہیں ؟ طالب کی مٹھی پلک جھپکتے ہی ان کی جیب سے نکل کر سائل کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ فعل اس تیزی سے عمل میں آتا ہے کہ خود کراماً کاتبین کو ریکارڈ لینے میں بھول چوک کا امکان رہتا ہوگا۔ میں نے "خیرات" پر نظم کہنے والے شاعر تو دیکھے ہیں۔ لیکن طالب کی طرح خیرات دیتے کسی شاعر کو نہیں دیکھا اور لطف کی بات یہ کہ وہ یہ نیک کام کچھ اس انداز سے انجام دیتے ہیں کہ خیرات خیرات نہیں معلوم ہوتی "فی اللہ دیا" معلوم ہوتا ہے۔

طالب خوندمیری میں شعر کہنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر کسی بھی وقت شعر موزوں کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ چوبیس گھنٹے حالتِ تخلیق میں رہتے ہیں۔ اسی لیے میں انھیں ہمہ وقتی شاعر کہتا ہوں۔

ان کے شعر کہنے کا کوئی باضابطہ ٹائم ٹیبل مقرر نہیں ہے۔ ان کے ہاں اکثر اشعار کی ولادت بھاگ دوڑ کے درمیان عمل میں آتی ہے۔ وہ جتنی زیادہ دوڑ دھوپ کرتے ہیں اتنے ہی خوبصورت اشعار حاصل کر سکتے ہیں۔ کبھی کار میں تو کبھی اسکوٹر پر کبھی سائٹ کو جاتے ہوئے تو کبھی ٹیکسی کے

یہی حربہ ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ لندن والا حیدرآباد کے کل ہند مشاعروں میں جتنی نظمیں انہوں نے سنائی تھیں وہ ساری کی ساری پسینے میں نہائی ہوئی تھیں۔ ان سے اچھے شعر کہلوانا ہو تو انہیں ہنگامی دوڑ میں مبتلا کر دینا چاہئے۔ حالانکہ بھاگ دوڑ کے وقت اشعار کے ساقط ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے لیکن طالب کے ہاں اس کے برعکس عمل ہوتا ہے۔

طالب خوندمیری کو دوسروں کے اشعار کی مٹی پلید کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ اس فن کو پیروڈی کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن شعر کی پیروڈی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں قادر الکلامی اور ذہانت کی بڑی ضرورت پڑتی ہے ورنہ پیروڈی کرنے والے کے چہرے کے بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ طالب خوندمیری میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ورنہ اب تک کوئی بلڈنگ ان کو ڈھانے کا الزام ان کے سر ہوتا۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ ان میں شوخی و شرارت کا عنصر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ مشاعرہ کی نظامت کے وقت وہ شاعروں کے اشعار کی پیروڈی کچھ اس ہنرمندی سے کرتے ہیں کہ سنجیدگی کی فضا شگفتگی میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح وہ "سو سُنار کی تو ایک لوہار کی" کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مشاعرے میں جب ستار صدیقی نے یہ شعر:

آگہی عقل سے بڑی ہے میاں ؛ وقت کے ہاتھ میں چھڑی ہے میاں

سنایا تو طالب نے نہایت ہی برجستگی کے ساتھ اس کی پیروڈی یوں کی:

وقت کے ہاتھ میں چھڑی ہے میاں ؛ زندگی بیچ پر کھڑی ہے میاں

اور پھر مظفر مجاز کے اس شعر کو طالب نے کس خوب صورتی سے کوٹ پتلون پہنایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

مظفر: مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا ؛ لیکن کسی کا درد ہمارا کفیل تھا

طالب: مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا ؛ لیکن کسی کا "ٹرس" ہمارا کفیل تھا

ایسے کئی اشعار ہیں جن کی طالب نے پیروڈی کی ہے۔ اب میں کتنی مثالیں دوں۔؟

مجھے چاہتا ہے کہ طالب کے شعر کہنے اور تخلیق کو سنوارنے کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔ طالب اُن شاعروں میں سے نہیں ہیں جو "کہا تا اور لے بھاگے" کے زمرے میں آتے ہیں۔ طالب اپنی تخلیق کو سنوارنے میں اِتنا زیادہ وقت اور اتنی زیادہ دِقتِ نظر سے کام لیتے ہیں کہ تخلیق خود بیزار ہو کر بھاگ نکلے۔ ان کے شعر کو سنوارنے کے عمل کو دیکھ کر مجھے اس ماں کی یاد آجاتی ہے جو اپنی بیٹی کو بڑے ارمانوں سے سجا اور سنوار کر دولہا کے لئے بیٹھی ہو۔ طالب شعر کو سنوارنے کے بہانے شعر کی کھال نکال کر رکھ دیتے ہیں۔

میرا یہ منصب نہیں ہے کہ میں طالب خوندمیری کے مجموعۂ کلام "سخن کے پردے میں" کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ اس پر نقاد ہی مزید اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ اور پھر طالب خود اُن نقادوں سے نمٹ لیں گے۔ وہ جب "آشوبِ غزل" "زندگی" اور "شر" جیسے سنگلاخ موضوعات پر کافی طویل اور معرکۃ الآرا نظمیں لکھ کر سماج کے مختلف کرداروں کو طنز کا نشانہ بنا سکتے ہیں تو پھر "نقاد" کو آڑے ہاتھوں لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مگر مجھے اس وقت صرف طالب خوندمیری کی کتاب کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اس کتاب کو کئی سال پہلے ہی شائع ہو جانا چاہئے تھا۔ اس میں صرف اور صرف طالب خوندمیری کی کاہلی

بلکہ "بحر الکاہل" کو بڑا دخل ہے۔ خواہ کچھ ہو۔ "دیر آید درست آید" کے مصداق طالب کا مجموعہ اردو ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ اس کی اشاعت سے طنز و مزاح کے ... وژن (VISION) میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے ادب کو کیا دیا؟ تو میں بے دھڑک طالب خوندمیری کو پیش کر کے ان کے تعارف میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ "لیجئے صاحب طالب حاضر ہیں۔ طنز و مزاح کے ہیوی ویٹ شاعر! ایسے شاعر جو ... سے ڈرتے نہیں ہیں۔ پھر کسی کو ڈنک نہیں مارتے۔ اور اگر ڈنک مارتے بھی ہیں تو اس صفائی سے کہ ان کا ڈسا ہوا سوتے میں بھی مسکراتا ہے!" ایسے انداز طالب کی شاعری میں رواں دواں ملے گا۔

نوٹ: ۱۶ ستمبر کو ادارہ زندہ دلانِ حیدرآباد" اور "حیدرآباد لٹریری فورم (علف) کے زیر اہتمام طنز و مزاح کے ممتاز شاعر طالب خوندمیری کے مجموعۂ کلام "مخمل کے پردے میں" کی رسم اجرا عمل میں آئی تھی۔ اس موقع پر مسیح انجم نے یہ خاکہ پڑھا ——— (ادارہ)

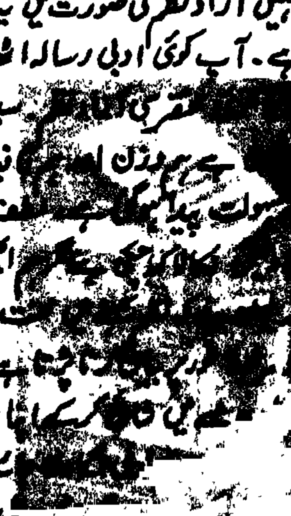
مسکراہٹ

شگفتگی اور شائستگی کا پیکر

طالب خوندمیری

(اپنے کلام کے آئینے میں)

جدیدیوں کے امام اعظم ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے شاعری کے جو تین رنگ بتائے ہیں یعنی خودکلامی، خطابت اور ڈرامہ، اُن میں سے اردو کے سہل انگار شعرائے کرام نے پہلے رنگ یعنی خودکلامی کو اختیار کرنے میں بڑی رغبت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اور بڑی لگن کے ساتھ بڑی حد تک غزل کے پہلنے میں اور کہیں کہیں آزاد نظم کی صورت میں یہ رنگ کہیں گہرا کہیں پھیکا ہمارے عصری ادب کے کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ کوئی ادبی رسالہ اٹھاکر دیکھیں شاعری کے حصے میں آپ کو غزلیں ہی غزلیں ملیں گی اور کہیں [illegible] سبب اس کا غزل کا سہل الحصول فارم ہے۔ چند دنوں کی مشق غزل کہنے کے [illegible] فیہ الفاظ سے اردو زبان مالامال ہے اب تو چشم بد دور صوتی قافیے کی [illegible] سہولت پیدا ہو گئی [illegible] کی بات تو یہ ہے کہ فارسی جہاں سے غزل ہمارے ہاں درآمد کی گئی غزل [illegible] ابھی تک وہی پھیرلیا الاپ رہے ہیں۔



[illegible] زیادہ کرنی پڑتی ہے نظم تفکر اور تعمق کا مطالبہ کرتی ہے کسی مخصوص سوچ اور فکر [illegible] ہے غزل میں اگر آپ قافیے کی انگلی تھام لیں تو کم سے کم آدھے دیوان چار سال کے [illegible] سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ یوں تو ہا جھجک یہ کہوں گا کہ اگر کسی قانون کی رو سے [illegible] تو ہماری ۹۸ فیصد شاعری ختم ہو جائے گی اور شاعروں کی گلے [illegible] جائے گی اور غزل گو شعراء معاشرے اور سماج کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے (راقم الحروف بھی اس گروہ کو سفہاں میں شامل ہے)۔

اس ساری دراز نفسی کا حاصل یہ ہے کہ غزل گوئی کے اس خراب ماحول میں جب کوئی نظموں کا مجموعہ ہاتھ لگے تو آپ یقیناً ایک خوشگوار مسرت سے دوچار ہوں گے میرے ساتھ کچھ ایسا ہوا جب طالب خوندمیری نے اپنا شعری مجموعہ "سخن کے پردے میں" تحفتاً مجھے عنایت فرمایا۔

[illegible] تو نیز اس میں جو ملتا ہے

دیکھیں کہ اردو والوں میں کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنے کا رواج اب ممنوع ہو چکا ہے)

حیدرآباد سے بشارت علی، علی اصغر، مظہر مہدی اور منظور الدین کی تمام تر نظموں پر مشتمل مجموعوں کے بعد نیر نظم مجموعہ کی اشاعت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ موسم بدل رہا ہے۔ "ذہنِ جدید" کا تازہ ترین شمارہ بھی جواں شاعروں کی حد تک تمام تر نظموں پر مشتمل ہے۔ خدا کرے کہ اردو رسالوں کے تمام مدیروں کو بھی یہ توفیق ملے

طنز و ظرافت نگاری کے تعلق سے تو یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ زندگی جب تک بے حد سادہ ہو طرح کی پیچیدگیوں سے عاری ایک میدانی سبک خرام ندی کی طرح آہستہ خرام بلکہ محرام کے انداز میں چلتی ہے یا دوسرے الفاظ میں جمود کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ بڑی سطح اور ہموار ہوتی ہے لیکن جوں جوں ان کے احوال اور حوالی میں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ کچھ ناہمواریاں اور بے ڈھنگیاں معاشرے میں داخل ہونے لگتی ہیں اور اس طرح جب زندگی کے اسٹیج کا ڈراپ سین بدلتا ہے تو اسٹیج پر طنز نگار یا مزاح نگار نمودار ہوتا ہے وہ ان تبدیلیوں بے ترتیبیوں اور بے ڈھنگیوں کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ تاہم اس موقع پر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ بعض تبدیلیاں اچھی اور ایک بہتر زندگی کی نشوونما کے لیے ہوتی ہیں۔ اگر طنز و ظرافت نگار کی فہم و فراست بیدار مغزی اور دور اندیشی سے عاری ہے تو وہ اچھی بات کی بھی کھلی اڑا دیتا ہے اس کو پائپ کا صاف اور مصفّٰی پانی ملتا ہے تو اس کا پیٹ دکھنے لگتا ہے اور ٹائپ کا حرف پڑھے تو اس کی آنکھ آ جاتی ہے اور بے چارہ بڑی لاچاری کے ساتھ شاہ ایڈورڈ کی دہائی دے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ کے دور کی طنز و ظرافت نگاری بڑی حد تک اسی رجعت پسندی کا شکار رہی اور سرسید کی زندگی بخش تحریک پر گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑی ؎

ہر اک نظر نے جھنجھوڑا گدھوں کی طرح اسے ÷ وہ اس کا جسم کہ تھا روح کی غذا کی طرح

یہ صورتِ حال صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب طنز نگاری مستقبل کی طرف پشت کیے رہتی ہے۔ ماضی پرستی اس کا شاخسانہ ہوتا ہے ہر نئی چیز کو وہ شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ تاریخ اور ماضی کا بوجھ مشرق کا سب سے بڑا مسئلہ ہے مزہ تو یہ ہے کہ اس میں اب دن دونی اور رات چوگنی ترقی بھی ہو رہی ہے۔ اب تو کچھ لوگ چار پانچ ہزار سال پیچھے پہنچ کر وقت کے پہیے کو الٹا گھمانے میں معروف ہیں اسی لیے عام شاعر اور ادیب کے مقابلہ میں طنز و ظرافت نگار کا زیادہ بیدار مغز اور روشن خیال ہونا بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کے ہاتھ میں طنز کا نشتر ہوتا ہے جہاں اسے فساد نظر آتا ہے وہ اپنے طنز کا نشتر چلا کر فاسد مادے کو خارج کرتا ہے یوں گویا طنز نگار ایک سماجی ڈاکٹر ہوتا ہے۔ بڑی بات کو تو واعظ بھی بڑی بات کہتا ہے لیکن اس کی نصیحت کا سارا زور نصیحت پر ہوتا ہے جس کا نتیجہ کبھی کبھی الٹا بھی نکلتا ہے بقول [illegible] ؎

ہم چلے آتے تھے مسجد میں کبھی ÷ کر گئے واعظ ہم کو شرابی بہت

اس لیے ہم یہ طور پر کہتے ہیں کہ شاعر کا منصب واعظ سے بلند تر ہوتا ہے وہ پیغمبر تو نہیں ہوتا لیکن شاعری کو جزویست از پیغمبری ضرور کہا گیا ہے۔

[illegible] ایک طبیب ہی ان کا مرہم [illegible] نشتر [illegible]
[illegible]

کی سنگلاخ [illegible] ہنر تیرے پڑھاتے ہیں کہ آپ [illegible] ہے کہ انھیں ہندی میں [illegible] لگتے ہیں اصطلاحات دور کھڑی آپ کی سادگی پر مسکراتے نظر آتے ہیں حالانکہ حالات اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ طالب علمی کلام پر بھی اُتر آتے تو ان کا دم [illegible] تھا فیض جیسا [illegible] مزاج شاعر بھی کہہ اُٹھا ہے

لب پہ ہے تلخی مے ایام ورنہ فیض ÷ ہم تلخی کلام پہ مائل ذرا نہ تھے !

ان کے مجموعے کی سب سے پہلی نظم "آشوب غزل" ہی کو دیکھئے جس میں انھوں نے اردو کی روایت زدہ غزل پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ آٹھ کیسوؤں پر مشتمل اس نظم میں غزل کے آٹھ کرداروں کی کھلی اڑائی گئی ہے۔ یعنی ملا محبوب، ساقی، رقیب، نامہ بر، شیخ/واعظ/محتسب/ناصح، بت/صنم/پیر/ناخدا اور خود بے چارہ شاعر۔

محبوب کی زبان سے شاعر علیہ [illegible] کھینچتے ان کے اندر کا شاعر ایسا شاعرانہ پیکر ابھارتا ہے کہ آپ ہنستے ہنستے کر رہ جاتے ہیں۔

(محبوب کی زبان سے)

ہاں مگر ہوتے ہیں یہ شاعر بہت ہی لاابالی ÷ گھر میں بیوی ایک رکھتے ہیں مگر معشوق دس
ہر غزل میں اک نیا محبوب ان کو چاہیے ÷ اور اس میں دلبری کا خوب ان کو چاہیے
لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں شاعری کے نام سے ÷ وصل کی حسرت بھی رکھتے ہیں [illegible]
کیا بتاؤں میں کہ وہ کر کے عذر ہی ایک دن ÷ کی چچا غالب نے مجھ سے پیش دستی ایک دن
جانتے ہو! پھر انہی حضرت نے اک دن کیا کیا ÷ جھک کے میرے پاؤں کا سوتے میں بوسہ لے لیا
ہائے اللہ شرم کے مارے میں کٹ کر رہ گئی
سر چھپائے اپنے گھٹنوں میں سمٹ کر رہ گئی

اس انداز کی شاعری میں پیکر تراشی بہت مشکل کام ہے لیکن شاعر اگر واقعی شاعر ہے محض ناظم نہیں تو پھر اس کے فن میں [illegible] کی طرح حسن پارے کی [illegible] شاخ سے سر نکالتا ہے کاغذ کے پھول کی طرح گلدان میں بازار سے لاکر سجایا نہیں جاتا۔ وہ شعور کا شاخسانہ نہیں بلکہ لاشعور کا انکور ہے۔

یہ نظم ایک طرح کا منظوم غنائیہ ہے جسے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم دراصل تفصیل ہے اس اجمال کی جس کو غزل کی روایتی شاعری کے خلاف ایک ردِّ عمل کہا جا سکتا ہے۔ وہ شاعری جس نے ایک طلسم ہوش ربا سا کھڑا کر رکھا ہے اور ہمارے شعرا سو سال سے ان علامتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں یہاں تک کہ [illegible] شاندار [illegible] پہنچا آخر جدید شاعر اپنا وضاحتی بیان لے کر اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ

ٹھیک ہے [illegible] کوئی طرز جدید ÷ تاکہ [illegible] !

اس نظم [illegible] جدید غزل کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرکے ختم ہو جاتی ہے اس طرح [illegible] نظم [illegible] غالب کی [illegible] شاعری کا بنیادی وصف ہے ہمارا جدید شاعر [illegible] سے محروم [illegible] کے ساتھ انھیں پیش کیا ہے [illegible] ہیئت کے [illegible] شاعر ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ [illegible] ہیئت کی ایک طرح کا [illegible]

بعض بلا اور حرق پسینہ پر کوئی ذکر کیا ہے غالب نے اس علم غلطی کا انداز کیا ہے لیکن یہ انداز اسان کا نہیں ۔

اشک کا کام ہے یہ جو کہ دو چلے ہیں ز یاد !

(موہلال لیلہ ان ادب نے تو اس بیان میں وہ کشتوں کے پشتے لگائے ہیں کہ کہنا پڑتا ہے ۔

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں !

کیونکہ مزاح بقول رشید صدیقی ایک خطرناک سفلی عمل ہے جو الٹا ہو جائے تو الٹا عامل پر اثر انداز ہوتا ہے مزاح کے لیے ذوقِ لطیف اور شائستگی بڑی بنیادی شرائط ہیں۔ ایک عامل کامل کے لیے اس کا دل سے زندہ دل ہونا ضروری ہے بلاغت سے نہیں بلکہ شگفتگی اور شائستگی کی مہر و بانکپن ہے جس میں آدمی جیتا ہے اور راز ی پاتا ہے۔ زبان اور ذہن کو بگاڑے بغیر مزاح پیدا کرنے والے شاید غالب جیسے چند ایک ہی شاعر ہوں گے جعفری برادران (سید محمد جعفری، ضمیر جعفری)۔ دلاور فگار اور وامق کے بعد غالب نے اس فریضے کو بہ احسن الوجہ ادا کیا ہے احسن الوجوہ اس لیے کہ غالب کو فن، لسان اور بیان پر زبردست دستگاہ حاصل ہے۔ جس کی مثالیں اس کتاب کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک ملیں گی آخری صفحہ اس لیے کہ وہاں کتاب ختم ہو جاتی ہے ورنہ ۔

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است !

شاعری کا رشتہ وہ ظریفانہ ہو یا کہ فلسفیانہ یا عاشقانہ ہو کہ فاسقانہ سب سے پہلے علم اور حکمت سے ہے ان الشعر من الحکمۃ مشہور قول ہے۔ علم اور حکمت سے عاری شاعری MEDIOCRITY، ABSURDITY اور OBSCENITY سے مالا مال چہار اطراف میں پھیلی ہوئی بہ مقدار وافر مل جائے گی۔ مزاح اگر ذوقِ لطیف سے عاری ہے تو محض ایک زبان بازاری ہے۔ مزاح کا کوچہ طوائف کا کوٹھا اور شراب کا شیشہ انسان کے ظرف و فہم کی بڑی کسوٹی سمجھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ثقہ حضرات کے پاؤں اس راہ میں لڑکھڑاتے ہیں لیکن ہم غالب کو سلام کرتے ہیں کہ انھوں نے طنز و مزاح کے اس ریلے میں، جس کا نعرہ حیدرآباد میں ذرا ضرورت سے زیادہ بلند ہے، کہیں شائستگی اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ممکن ہے اس موقع پر کچھ لوگ ان کی نظم "ٹیسٹ ٹیوب بے بیز" کا ذکر کریں لیکن میں پوری ذمہ داری سے عرض کروں گا کہ غالب کی فنی کاریگری اور صناعت نے اس نازک موضوع پر بڑے دبیز پردے لٹکا دیئے ہیں بقول اصغر ۔

کیسے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے ؛ مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا!

غالب نے اس نظم میں محاورات سے بھی بڑا کام لیا ہے ۔

عمر کیا کہ پیار کرنے کی فرصت ہی نہیں ؛ شاید ان کو پیار کرنے کی فرصت ہی نہیں

آنکھ میں اب پیار کی جلنے نہ پائیں گے دیئے ؛ کوئی رشتے ہی نہیں جن کے دیا بن کے بتی

[illegible] کا احساس کیا جب یاد آئیں گے بتی ؛ [illegible] اکیلے ہی اکیلے جیا جائیں گے بتی

"[illegible]" غالب کی بہت اہم اور خاصی طویل نظم ہے۔ [illegible] شاعری کی طرح ایک مشترکہ [illegible] سمجھے [illegible] شاعر [illegible] پر [illegible] کا [illegible] "[illegible]" [illegible] صاحب [illegible] اشعار [illegible] کی [illegible] نظم [illegible] کا [illegible] سے [illegible] کا [illegible] کے [illegible] سے [illegible] لیکن ان کے [illegible] کر لیجیے یا ان کے [illegible]

جب طالب نے اپنی آنکھیں اور اپنی عینک سے زندگی کو اپنے اطراف پھیلتے، سمٹتے، بکھرتے ہوئے دیکھا ہے یہ نظم شاعر کے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار اور بیان پر قدرت کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔ مجھے یہ نظم پڑھتے ہوئے انگریزی ادب کے مشہور انشائیہ نگار A.G. GARDINER (ALPHA OF THE PLOUGH کے نام سے بھی لکھتے تھے) کا ایک انشائیہ بعنوان TOP HAT یاد آیا جس میں اس نے زندگی کو مختلف پیشوں کی آنکھ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہیٹ فروش، خیاط، [illegible] وغیرہ کے ساتھ اپنے تجارب بیان کرتا ہے اُن کا پیشہ ان کے فلسفۂ حیات کی تعبیر میں کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اُسے بڑے دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حُسنِ اتفاق ہے طالب نے بھی اس نظم میں وہی زاویہ نظر اپنایا ہے تاہم جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے یہ ایک بالکل نئی انداز کی نادر نظم ہے جو ایک طرح سے افسانے کی حیثیت رکھتی ہے مزاح کے ساتھ سوز و گداز (PATHOS) کی آمیزش نے اس میں بے پناہ تاثیر پیدا کر دی ہے۔

—— "ٹائم کیپسول" اس مجموعے کی سب سے کمزور نظم ہے۔ اس میں شاعری کہیں نہیں بجز اس کے کہ منظوم خیالات کا ایک آمیزہ ہے۔ خیالات کو منظوم کرنا تو شاعری کبھی نہیں قرار پایا، چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ درجے کے کیوں نہ ہوں۔ اگر یہی "شرطِ وصلِ لیلیٰ" ٹھہرے تو جمعہ کے منظوم خطبے، جن کا خوش قسمتی سے اب چلن موقوف ہو چکا ہے شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ٹھہرتے۔ شاعری فکر و فن کا آمیزہ نہیں بلکہ مرکب ہے یہ شکر کا پانی میں حل کرنا نہیں بلکہ آکسیجن کو ہائیڈروجن سے ملا کر پانی تیار کرنا ہے کہ آکسیجن باقی رہے نہ ہائیڈروجن اور ایک حیات بخش مشروب (پانی) ہاتھ لگے ؎

تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری!

اس نظم میں شاعر نے پانی میں شکر ملا کر ایک مشروب بنانے کی کوشش کی ہے مشکل یہ ہے کہ اس نظم میں طالب نے طنز یا مزاح کی پوٹ بھی شامل نہیں کی اس لیے یہ بالکل سپاٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ سیوڈو نیشنلزم کی [illegible] یہ نظم شکر کی کمی اور پانی کی زیادتی کا آمیزہ بن کر رہ گئی ہے ایک اور نظم "فرقہ واریت" بھی اسی قبیل میں آتی ہے۔ یہ نظمیں طالب اس مجموعے میں شامل نہ بھی کرتے تو کوئی فرق نہ پڑتا —— میں ان موضوعات کا مخالف نہیں میرا اصرار صرف اس بات پر ہے کہ شاعری کی بنیادی ادبی اقدار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے ؎

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن ؛ ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

قوم پرستی اور فرقہ واریت تو خیر بڑے شریفانہ موضوعات ہیں (یہ اور بات ہے کہ فرقہ واریت کو پھیلانے میں غیر شریف لوگ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور شاعر اور ادیب جیسے شریف لوگ انھیں اپنا موضوعِ سخن بناتے ہیں)۔ مثنوی کی مثال ہمارے سامنے ہے کیسے کیسے خطرناک موضوعات کو اس نے نہیں چھا گر کہیں فنکار کے ہاتھ سے دامنِ افلاک چھوٹا ہو تو —— [illegible] خود مثنوی مولانا روم کی بعض حکایات تو ایسا خطرناک حدود کو چھوتی ہیں کہ [illegible] ہمارے فقیہانِ کرام اسے تصوف کی کتاب سمجھ کر ہاتھ نہیں لگاتے ورنہ اس پر بھی پابندی لگائے جانے کے فتوے جاری ہو چکے ہوتے [illegible] لیکن حکایات میں کہیں آپ کو لذت کوشی [illegible] [illegible] ہونا چاہیے۔

[illegible] فرقہ واریت کے موضوع [illegible] طالب کی نظم [illegible] (KICK) [illegible]

[illegible]

ہی نہیں اٹھتا لیکن چونکہ اس کا تو ام کردار نگاری مکالمے اور خود کلامی سے اٹھایا گیا ہے جس میں شاعر تخلیق یا تقریر کے ساتھ کہیں شریک نہیں ہوتا۔ جو کچھ کہنا تھا ایک اسلوب کہہ دیا گیا ہے کیوں کہ شاعری میں جو کہا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ ان کہی باتیں ہو گیا اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ رمز و ایما، اشارہ اور کنایہ نہ صرف شاعری کی جان ہے بلکہ انھیں سے شعر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اقبال کہتے ہیں ؎

وقتِ برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام

برہنہ گفتن کے ہنگام بھی رمز و کنائے سے کام لینا کمالِ گویائی ہے یعنی جذبے اور احساس کو منظوم نہ کیا جائے بلکہ انھیں لفظوں کے رگ و ریشے میں دوڑا دیا جائے جب تک رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو نہیں دوڑتا نغمہ یا تو مُردہ پیدا ہوتا ہے (STILLBORN) یا قیدِ دوام سے بیماری، نزع کے عالم میں گرفتار یا جسے وقت کے دانت چبا کر تھوک دیتے ہیں۔

طالب نے حسبِ ضرورت دکنی زبان بھی استعمال کی ہے، جیسے سلیمان خطیب کا مرثیہ لیکن بقدر نمک، اسے اوڑھ نہیں لیا۔ نمک ہو یا شکر، اس کی زیادتی کڑواہٹ ہی پیدا کرتی ہے۔

طالب کے قدرتِ بیان کی بہترین مثال ان کی نظمیں "پسند اپنی اپنی" نمبر ۱ و نمبر ۲ ہیں۔ ان نظموں میں اُنھوں نے سوسائٹی کے مختلف مرد و زن کرداروں سے کچھ مکالمے کہلوائے ہیں اور ان کرداروں ہی کے ڈکشن میں۔ جن میں نستعلیق اردو بولنے والی عالیہ بھی ہے اور ہندی اور انگریزی کی ملغوبہ زبان بولنے والی کانتا بھی، اینگلو انڈین لب و لہجے والی ڈورتی بھی ہے تو کہیں پنجابن، گجراتن اور مراہٹن۔ اسی طرح عمران، شیرخان، داسن اور شبو میاں اپنی اپنی زبان میں اپنی پسند گنواتے ہیں۔ یہ نظمیں خالص مزاح کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح ان کی نظم "تمسر" بھی اسی قبیل میں آتی ہے جس میں انھوں نے سر سے متعلق بیشتر محاورے نظم کر دیتے ہیں۔

طالب کا مزاج بنیادی طور پر کلاسیکی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہاں کلاسیکیت کی محوسیت نہیں بلکہ رچاؤ ہے۔ اس کا سبب حالی ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ "چبائے ہوئے نوالے" نہیں اگلتے ان کے یہاں خود اپنی سمجھنے کی باتیں اور خیالات ہیں بلکہ ان کے اپنے جذبات اور احساسات بھی ہیں۔ مانگے ہوئے خیالات اور احساسات پر ان کا گذارہ نہیں وہ روایت گزیدہ نہیں بلکہ روایت چشیدہ ہیں غالباً جدید تنقید و ادب کے معلمِ اول ایلیٹ بھی کہہ گیا ہے کہ جو ادب روایت سے کٹا ہوا ہوتا ہے وہ بے جڑ کا پودا ہوتا ہے جس کا پھل بھی نامعلوم! اہم بات جذبے اور احساس کی شدت اور ان کی تہذیب ہے۔ اول الذکر تو ودیعتِ خداوندی ہے جب کہ تہذیب یافتگی کے لیے فنکار کا ماحول، تعلیم اور فکری پس منظر زمین ہموار کرتا ہے جو اب آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب یہ مشکل ہے کہ آنے والی نسلیں پھر ایسے شاعروں کو پیدا کر سکیں۔ قبولیتِ عامہ کو سامنے رکھ کر [illegible] جس قسم کی شاعری کا چلن ہے وہ نہ صرف شاعری کی توہین ہے بلکہ [illegible] طالب نے اس Rat - Race [illegible] اپنے آپ کو الگ رکھا ہے [illegible] اقبال کے الفاظ میں [illegible] اپنا پیمانہ [illegible] بلکہ [illegible] شاعر [illegible] اس کا نام [illegible] ہے۔ طالب کا [illegible]

اس گفتگو میں ان کی ساری نظموں پر بات کرنا تو مشکل ہے تاہم گفتگو نامکمل رہ جائے گی اگر ہم اس کی سب سے اہم اور کامیاب ترین نظم "کھٹملوں کی فریاد" کا ذکر نہ کریں۔ سماجی اور سیاسی طنز نگاری کی یہ ایک بہترین مثال ہے اور یقیناً اس موضوع پر ایک افسانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں انھوں نے عصری سماج کے سارے ہی امراض کا احاطہ کیا ہے جیسے ملاوٹ، بے رنگ و بے شباب، [illegible] عوام کی زبوں حالی اور لیڈروں کی فارغ البالی۔ نظم ختم ہوتی ہے نیتاؤں کی خون آشامی پر۔ یہ نظم طالب کی ڈرامے اور خطابت پر عبور رکھنے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ساری نظم ایک مکالمہ ہے جو جونک اور کھٹمل کے درمیان [illegible] دونوں انسان کا لہو پی کر جینے والے حشرات ہیں اور اس طرح سوسائٹی کے خون آشام استحصال کرنے والوں کی علامت۔ کھٹمل جب اپنی داستان تشنگی ختم کرتا ہے تو ایک ادائے خاص سے جونک یوں لب کشا ہوتی ہے ؎

آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہو ؎ اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہو
اب تو میرا بھی گزارا ہے انہیں کے خون پر ؎ کیا بتاؤں میں کہ اس میں ذائقہ ہے کس قدر
ان کا خون پی کر بہت مخمور ہو جاتی ہوں میں ؎ عام جونکوں کے غموں سے دور ہو جاتی ہوں میں
منہ لگاتے ہی انھیں چالاک ہو جاتی ہوں میں ؎ بے مروت ہی سہی بیباک ہو جاتی ہوں میں
ان کی ہر شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا ؎ ایک اک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا
کس قدر خوش ذائقہ ہوتا ہے ان سب کا لہو ؎ بھوکی جنتا کا لہو بھی کچھ لہو ہے آخ تھو
ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پا جائے گا
اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزہ آ جائے گا

طالب اس نظم میں اپنے فن کی انتہائی بلندی پر ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے عصر کے کرب کو ریکارڈ کر لیا ہے۔ جس طرح امیر خسرو کی مثنویاں ان کے عصر کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی تاریخ بیان کرتی ہیں طالب نے بھی اس نظم میں اپنے عصر کی خون آشام تاریخ تحریر کر دی ہے۔ یہاں ان کے ہاتھ میں طنز کا بڑا تیز نشتر ہے وہ تلقین یا تقریر نہیں کرتے بلکہ ڈرامے اور مکالمے کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے اس نظم میں بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ جونک اور کھٹمل کا یہ مکالمہ کاش ہمارے نیتاؤں کے کان پر بھی جوں بن کر رینگ جائے۔

طالب کی باغ و بہار شخصیت کا ایک اہم گوشہ وہ بھی ہے جس کا یہ مجموعہ کلام احاطہ نہیں کرتا وہ ہے ان کی بذلہ سنجی اور تحریف نگاری جو شعری نشستوں، ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اپنے جوہر دکھاتی ہے اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ صحبت صادقاں از علم کتابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ایسے لوگوں کی صحبتیں آدمی کو انسان بنانے کے لیے [illegible] یہ بات اور ہے کہ ان کی تحریف شعر (PARODY) سے بعض اوقات موجودہ شعراء کے لیے بڑا [illegible] بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی ساری سنجیدہ [illegible] طالب کی تحریف [illegible] ([illegible]) [illegible] ہے کیونکہ شعراء [illegible] اب [illegible]
[illegible]
[illegible]

طالب محض ایک شاعر شیوہ بیان ہی نہیں ایک اچھے معمار (آرکیٹیکٹ) بھی ہیں اور بڑے اچھے ناظم مشاعرہ بھی، جو مزاح نگار ہونے کے باوجود لطیفے سنائے بغیر مشاعرے کو ایک شگفتہ اور جمالیاتی تجربہ بنا دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ (GENIUS) کسی ایک خانے میں بند نہیں ہوتا اسی بات کو غالب نے چند لفظوں میں کس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے ؎

دہیرم شاعرم بہ ہمہ فن پیرایاں شیوہ ہا دارم

طالب کا پیچھا غالب نے بھی بہت کیا ہے یا طالب نے غالب کا؟ (یہ امر بہرحال تحقیق طلب ہے!) خود ان کا تخلص چغلی کھاتا ہے کہ روحِ غالب ان میں کس قدر حلول کیے ہوئے ہے ان کے بیشتر کلام میں جہاں تہاں غالب کے مصرعوں کے ٹکڑے اور غالب کے طرزِ سخن کا تیکھا پن اور شوخی و طراری اپنی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہے لیکن اس سے طالب کی تشفی نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک دو نہیں سات نظمیں اور غزلیں بہ تقلید غالب کہہ دیا۔ غالب ایک طرح سے ان کا ALTER EGO یعنی ہمزاد بنا ہے۔ غالب بھی طالب کی طرح ہمہ پہلو شخصیت کا مالک ہے ان نظموں میں طالب نے غالب کو (RELIVE) ذروی حیات کیا ہے۔

طالب کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ وہ خود غالب کے دور میں داخل نہیں ہوئے بلکہ غالب کو اس کے دور سے نکال کر اپنے دور میں لے آئے ہیں۔ غالب کے اس عصری مرقع میں کہیں غالب آرکیٹیکٹ بن کر رہ جاتے ہیں تو کہیں آئی۔ اے۔ ایس آفیسر بن کر اس عہدے سے وابستہ عجب و حمق کو نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں کبھی طبیب بن جاتے ہیں، کبھی پامسٹ اور کہیں جیسینول کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے بہت زیادہ خوش خوش نظر آتے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد نظمیں ہیں جواب تک کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں کہیں نہیں ملتیں۔ نثر میں البتہ جہاں تہاں اس کی مثالیں مل جائیں گی جیسے کنھیا لال کپور کا انشائیہ "غالب ترقی پسندوں کی محفل میں"۔ ان نظموں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کی پشت مستقبل کی طرف نہیں ہے۔ یہاں شاعر غالب کے دور میں داخل نہیں ہوتا بلکہ غالب کو اپنے دور میں کھینچ لاتا ہے طالب کو ہم شاعرِ فردا بھلے ہی نہ کہیں لیکن یہی کیا کم ہے کہ وہ حال میں جی رہا ہے اور جو حال میں جیتا ہے وہ مستقبل کا نقیب بھی ہوتا ہے ؎

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

مبارک ہے وہ معاشرہ جو ایسے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو پیدا کرتا ہے جن کی پشت ماضی کی طرف قدم حال کی زمین پر اور آنکھیں مستقبل پر لگی ہوتی ہیں۔

(جشن کے پردے میں کی تقریب رسم اجرائی میں پڑھا گیا۔)

پروفیسر غیاث متین
شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

طالب خوندمیری کی شاعری میں ڈرامائی عناصر

طالب خوندمیری کی شاعری کا منظرنامہ، فنونِ لطیفہ کی چار اہم شاخوں سے مل کر تشکیل پایا ہے۔ پہلی شاخ تو شاعری ہی ہے۔ دوسری مصوری، تیسری فنِ تعمیر (ARCHITECTURE) اور چوتھی ڈرامہ۔ ان میں بھی صنف ڈرامہ کا اثر واضح اور نمایاں ہے۔

ڈرامہ کی مختصر ترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ "جسے کر کے دکھایا جا سکے" یعنی WHICH CAN BE ENACTED۔ طالب خوندمیری نے بھی اپنی بیشتر نظموں میں انسانوں کو عمل کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ ونیز ان نظموں میں ڈرامائی عناصر کی تشکیل، اُن کے پلاٹ، مکالماتی طرزِ اظہار، کردار سازی، کرداروں کے درمیان پائی جانے والی کشمکش، تصادم، کلائمکس اور کہیں کہیں اینٹی کلائمکس ہی سے ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ وصف انہیں اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی نظم "آشوبِ غزل" یعنی غزل کے کرداروں کی کانفرنس ہے جس کا پلاٹ، غزل کے مختلف کرداروں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں معشوق، ساقی، رقیب، ناصح، شیخ، واعظ، محتسب، ناصح، رہنما، سالار یا رہبر، ناخدا اور شاعر، شامل ہیں۔ ہر کردار اپنی اپنی زبان میں گویا ہے اور یہ سب کردار، غزل میں اُن کی جو دُرگت بنائی گئی ہے اس کا رونا روتے ہیں۔ کلائمکس کے آخری بند میں جو کردار اچانک اُبھرتا ہے وہ خود شاعر کا ہے جو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

میں نے کر دیا مختصر نفسوں میں تم کو روشناس ؞ تم مگر کہنے لگے ہو چاک میرا ہی لباس

نظم یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اینٹی کلائمکس بھی ہے جس میں شاعر یہ کہتا ہے کہ ؎

ٹھیک ہے ڈھونڈ لوں گا اب کوئی طرزِ جدید ؞ تاکہ پھر کوئی نہ کر پائے مری مٹی پلید

اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ غزل کے ان کرداروں کی زبانی طالب نے گویا ان غزل گو شعرا پر طنز کیا ہے جنہوں نے دور دور تک ان کرداروں کو درمیان میں ڈال کر اپنی فرضی محبت کے قصّے زمانے کو سنائے ہیں۔ اس نظم میں ڈرامہ کے سارے اجزائے ترکیبی پلاٹ، کردار، مکالمے، کرداروں کی کشمکش، کلائمکس اور اینٹی کلائمکس موجود ہیں۔

دوسری نظم "زندگی" انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے پر مبنی ایک خوبصورت نظم ہے۔ اس کا مکالماتی انداز، جس کردار کا [illegible] زبان شاعر ہی کی ہے، اس نظم کو موضوع اور ہیئت ہر دو اعتبار

سے منفرد بناتا ہے۔ اس نظم میں بیس مختلف کردار ہیں جو اپنے انداز میں زندگی کو منعکس کرتے ہیں۔ یہ نظم گویا ایک "ONE ACT PLAY" ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ پردہ اٹھتے ہی یکے بعد دیگرے یہ کردار اپنے اپنے لباس اور وضع قطع میں اسٹیج پر آتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کو انہوں نے جس رنگ میں دیکھا، محسوس کیا اور جانا، اُسے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ (ہر کردار اپنی عام زندگی میں جیسی زبان استعمال کرتا ہے ویسی ہی زبان اگر اس موقع پر بھی اختیار کی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا) یہاں شاعر کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس نے خود کو پہلے ان کرداروں کے روپ میں دیکھا اور پھر اپنے پڑھنے والوں کو دکھایا ہے۔ وہیں ہماری روزمرہ زندگی میں چلتے پھرتے کرداروں کا زندگی کے بارے میں جو زاویۂ نگاہ ہے اُسے بھی بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو جس پیشے سے روٹی روزی ملتی ہے اور اس کی سانس چلتی ہے، وہی تو اس کی زندگی ہوئی ـــ زندگی اور کیا ہے؟ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ سماج کے مختلف طبقات کی نمائندگی کرنے والے بیس کرداروں کو جن میں رکشہ والے سے لے کر، جدید شاعر جیسے کردار شامل ہیں ان کے اپنے زاویۂ نگاہ سے زندگی کو منعکس کرتے ہوئے دکھانا شاعر کے غیر معمولی مشاہدے اور اظہار پر اس کی بے پناہ قدرت کا ثبوت ہے۔ اس نظم میں ہر کردار کی زبانی ادا کیے جانے والے مکالموں میں چھپا ہوا طنز نشتر کی سی کاٹ رکھتا ہے۔ طنز کی مثال کے لیے صرف یہ دو بند کافی ہیں۔

"بوٹ پالش والا"

زندگی تو "صاب" جوتوں کی چمک کا نام ہے
اور ان جوتوں کو چمکانا ہمارا کام ہے
بدنما، بدشکل، جوتوں میں نہاں ہے زندگی
کس قدر روندی ہوئی کیا ہے اماں یہ زندگی

روز و شب فٹ پاتھ پر جوتوں کو چمکاتے ہیں ہم
اپنی قسمت اور کے پاؤں میں پہناتے ہیں ہم

"لیڈر" کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

آج کل مسند کی کرسی میں نہاں ہے زندگی
یہ اگر مل جائے تو پھر حکمراں ہے زندگی!
اس کا ملنا بھی تو ناممکن ہے ووٹوں کے بغیر
اور ہم کو ووٹ کب ملتے ہیں نوٹوں کے بغیر

قطع نظر مکالماتی انداز اور طرز کے اس نظم میں کرداروں کے اندرونی یا باطنی کرب کا اظہار نمایاں ہے جو نا آسودگی، تلخی اور محرومی کے ساتھ ساتھ اُس مجبوری کا احساس بھی دلاتا ہے جو زندگی کو اس کی موجودہ صورت یا حالت میں قبول کرنے نباہنے یا برداشت کرنے کا نتیجہ ہے ـــ نظم "خدشہ" بھی اپنے میں ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے۔ "رات" "شہر" اور "گلی"، "وقت" اور "مقام" (زماں و مکاں) کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "اندھیری" اور "کرفیو" اس کیفیت اور حالت کا اظہار ایک ایسی [illegible] سے "آ" اور "موت کا سا عالم" ایک خاص منظر کو پیش کرتے ہیں "کتیا" اور "بچہ" "پلّہ" دو کردار ہیں۔ جن کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ "منظر" "بے وقت" اور "مقام" [illegible] ہیں

...اکثر یہ کلائمکس ہمیں کتا اپنے پلّے سے یہ کہہ رہا ہے:

"ڈر

مجھ کو خدشہ ہے

قتل ہو نہ جائیں ہم

آدمی کے دھوکے میں"۔

نظم یہاں ختم ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن یہیں سے پڑھنے والوں کی سوچ کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اور ... طنز کے پہلو سے یہ باتیں اُبھرتی نظر آتی ہیں کہ۔

(۱)۔ کرفیو نام نہاد بھی ہوتا ہے (۲) کرفیو میں اکثر قاتلوں کو چھوٹ دی جاتی ہے (۳)۔ انسان' جانور سے بھی ... حملہ پر آ گیا ہے۔ جہاں جانور کو یہ خدشہ ہے کہ اُسے آدمی کے دھوکے میں قتل نہ کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ نظم "...شہ" موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے جس میں تاثر اور طنز' ہم آمیز ہو ... ... غالب خود میری ... سخن کے پردے میں "شاہِ غالب SERIES کی نظموں میں غالب کو مختلف روپ ... بہروپ میں دیکھا اور دکھایا ہے۔

اس سلسلے کی پہلی نظم "غالب حسینوں کے جھرمٹ میں" والی نظم ہے۔ جس میں پلاٹ، کردار، مکالمے، اور کردار کی مناسبت سے زبان کے علاوہ، "وقت" "ماحول" "زمانہ" اور "مقام" سبھی کچھ موجود ہے اس نظم میں اِن خصوصیات قطع نظر، جن کا ڈرامائی عناصر سے تعلق ہے۔ غالب کی شوخی اور ان کے اشعار کی مدد سے مکالموں کی فضا سازی کا جو ... عمل ہے وہ قاری کے ذوق کو مہمیز کرتا ہے۔

"آرکیٹیکٹ غالب" میں "اجنبی" اور "غالب" اِن دو کرداروں کے درمیان مکالمہ ہے۔ اس نظم کو کہتے ہوئے، ... نے اپنے آپ کو غالب کے قالب میں ڈھال لیا ہوگا۔ جبھی تو غالب ہی کی زبان انہی کے اپنے انداز میں اس نظم کے غالب کے مکالموں میں موجود ہے۔ دوسرے معنی میں طالب نے غالب کو اپنا ہم زاد بنا لیا ہے اس نظم کی ایک اور خوبی یہ ہے ... نے اس میں اپنے پیشے یعنی فنِ تعمیر سے متعلق اہم اصطلاحات کو نہایت شاعرانہ حسن کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔ ... شاعری کی لفظیات میں اضافہ ہوا ہے۔ اور فنِ تعمیر پر ان کی گہری نظر، شغف اور رغبت کا اظہار بھی ہوا ہے۔

"پاسٹ غالب" میں غالب اور چند حسینوں کے ساتھ ساتھ ایک طوطے کا کردار بھی ہے۔ اس نظم میں حسینوں سے غالب ... گفتگو شنیدنی ہی نہیں بلکہ دیدنی بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اس نظم کے مختلف بند باری باری سے چلتی پھرتی تصویروں کو ہمارے ... لاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح پردۂ سیمیں پر ایک منظر کے بعد دوسرا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ ... غالب میں صرف کلائمکس ہی نہیں بلکہ اینٹی کلائمکس بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا کلائمکس:

آج کچھ پڑھتا رہا دیوانِ غالب رات بھر ؛ پڑھتے پڑھتے آنکھ میری لگ گئی پچھلے پہر

... تھا ان کے شعروں کے تنوع کا اثر ؛ روپ میں پاسٹ کے غالب جو آئے تھے نظر

... کا کلائمکس دیکھیے:

... سب ... ... واقعہ ایسا تھا ؛ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

... ... اپنا ... ... خواب لاشعور کی علامت ہے اور غالب ... ...

کے اظہار کے باعث نظم میں فلم کی سی تکنیک کا احساس ہوتا ہے

نظم "پاسٹ غالب" میں کرداروں کی اپنی اندرونی کشمکش یا کرب کی یہ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔

"دبی آواز میں اک اور لڑکی نے کہا ؛ ان کے آفس میں ہے کوئی خوبصورت سی بلا
مجھ کو یہ شک ہے اسی پر مرتے ہیں وہ بچا ؛ سن کے اس کی بات غالب نے ظرافت سے کہا
آپ کا یہ شک اگر افسر پہ عیاں ہو جائے گا
ایسی باتوں سے وہ کافر، بدگماں ہو جائے گا"

اور یہ بند :

ایک لڑکی نے کہا "میرے لیے عزت مآب" ؛ میرے ابا نے کیا جس نوجواں کا انتخاب
میں سمجھتی ہوں کہ میرے حق میں ہے وہ اک عذاب ؛ تب دیا غالب نے اس کو مسکرا کر یہ جواب
غم نہ کر یہ فیصلہ کچھ اور ہی تقدیر کا
"موئے آتش دیدہ ہے حلقہ تری زنجیر کا"

اس بند کے آخری مصرع میں ایک لفظ "میری" کو "تیری" سے بدل کر طالب نے معنی کا رخ موڑ دیا ہے۔ و نیز اس نظم کے بعض بند ایسے ہیں، جن کا اختتام غالب ہی کے مصرعوں پر ہوا ہے۔ اس عمل سے ایسے تمام بندوں میں اشاریت بلکہ عبقریت پیدا ہو گئی ہے۔

غالب SERIES کی دیگر نظموں جیسے "مرزا غالب، آئی۔ اے۔ یس" اور "طبیب غالب" کے علاوہ "پیڑائی اپنی"، "تین سہیلیاں" اور "دکھڑا اپنا اپنا" (زن مریدوں کی کانفرنس) اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن کے موضوعات میں طنز (اور کہیں کہیں مزاح) اور جن کی ہیئت میں ڈرامائی عناصر کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ (نظم "دکھڑا اپنا اپنا" اگر اس مجموعہ میں شامل نہ کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ کیوں کہ اس سے خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔)

ڈرامہ سے اتنی قربت کے باعث ان نظموں کو اگر منظوم ڈرامے نہ بھی کہا جائے تو انہیں "اسٹیج" ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ، یہ ڈرامائی عناصر، ان کے بعض ہم عصر سنجیدہ گو اور طنزیہ و مزاحیہ شعراء کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن طالب کے ہاں ان کا TREATMENT دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ فرق، زبان اور اس کے تخلیقی اظہار، محاوروں کے برجستہ اور برمحل استعمال، اپنے عصر کے مسائل اور وسائل سے ان کی آگہی، مکالماتی طرزِ اظہار پر قدرت اور تنوع کے باعث پیدا ہوا ہے۔ مندرجہ بالا چند نظموں کا تجزیاتی مطالعہ، یہ ثابت کرتا ہے کہ طالب خوندمیری ایک چابک دست تخلیق کار ہیں جنھوں نے روحِ عصر کو اپنے کلام میں سمو کر اظہار کے نت نئے پیکر تراشے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری نہایت دقیع اور پرکشش بن گئی ہے۔

ڈرامائی عناصر کی حامل ان نظموں کے علاوہ، جن میں سے چند ایک کا تجزیہ پیش کیا گیا۔ اس مجموعہ کلام میں مختلف النوع موضوعات پر مشتمل بعض اہم نظمیں بھی شامل ہیں جن کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ایسی ہی نظموں میں ہماری نظموں کا [illegible] "موضوع کے اعتبار سے ایک طنزیہ نظم ہے اور اسلوب کے اعتبار سے اس میں بھی فلم کی سی تکنیک کا اظہار ملتا ہے۔ ہر بند ایک نئے منظر کو پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ [illegible] آج کل کی نظموں کی تکنیک [illegible] بے ربطی، اور مبہم، جنسی بے راہ روی، لسانی و مکانی [illegible] سے آزادی کو حق پر کر نظموں کے تخلیق

تمام فرسودہ اقدار کا تنقیدی جائزہ ہی نہیں بلکہ اس پر ایسا کاری ضرب ہے جو صرف آج کا باشعور نظم نگار ہی طنز کی صورت میں کر سکتا ہے۔ اس نظم کے آخری حصے میں طالب کہتے ہیں:

یہ پیچ نہیں ایک ایجاد تھی
کہ ان دوستوں سے بھی آزاد تھی

اور اس آخری شعر میں یوں طنز کرتے ہیں۔

ڈرکٹیر کی کار کردگی تھی جناب
کہ یہ نظم پھر بھی ہوئی کامیاب

طالب خوندمیری کے مزاج میں سیاسی اور سماجی شعور، گویا رچ بس گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظمیں ان کے گہرے سیاسی اور سماجی شعور کی غماز ہیں! ایسی نظموں میں کشمکشوں کی فراوانی بھی ہے۔ جس میں "خیال" کے کئی موڑ، نشیب و فراز کی صورت میں، ڈوبتے ابھرتے ہیں۔ ونیز اس نظم میں سماج کے ایک کردار یعنی نام نہاد لیڈر یا نیتا کو اس بری طرح بے نقاب کیا گیا ہے کہ وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ نظم کے اس آخری شعر سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی، کہتے ہیں۔

ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پا جائے گا
اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزا آ جائے گا

"آنکھوں کا گہن" "ذائقہ" "مشورہ" "ٹسٹ ٹیوب بیبیز" "شکوہ" (اردو کا اپنے وطن سے) "سیاسی سوال" "آج کا آدمی" "چار سو سال" "میں بھی تو ایک شہر تھا" اور "ہمارے شہر میں" جیسی نظمیں ہمارے دور کے سیاسی، سماجی حالات و واقعات اور مسائل ہی کا طنزیہ اظہار ہیں۔ نظم "سر" اردو زبان کے محاوروں اور ان کے تخلیقی استعمال کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد، ہو سکتا ہے کہ بہت سے سر اپنے دھڑوں سے الگ ہو جائیں۔ "ایک ورق" فسادات کے پس منظر میں تلگو کے مشہور شاعر غلام یسین اور ان کے افرادِ خاندان کے بہیمانہ قتل پر ایک متاثر کن نظم ہے جو مقتول کی سات سالہ لڑکی کی زبان سے کہلوائی گئی ہے۔ اس نظم کا یہ اختتام۔

لیکن ابّا!
اب تو ان کا پڑھنا بھی ناممکن سا ہے۔
کیوں کہ ان پر
خون تمہارا پھیل گیا ہے

پڑھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

ان نظموں کے حوالے سے طالب کی شاعری کا جو اہم وصف، ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان کے موضوعات کا تنوع ہے۔ ہمارے عصر کے بعض طنزیہ و مزاحیہ شاعر ایسے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو چند مخصوص موضوعات ہی تک محدود کر رکھا ہے۔ ان کے بالکل برعکس طالب خوندمیری کی شاعری کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ اچھی شاعری کی ایک پہچان اس کا وسیع کینوس بھی ہے۔ طالب خوندمیری کے ہاں، بات کرنے کے ذرائع اور وسائل اشیاء

اور مثالیں اتنے وسیع اور ان کا اظہار اتنا متنوع ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کے اس وصف کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کا یہی وصف، انھیں، اپنے دیگر ہم عصر طنزیہ و مزاحیہ شعراء میں منفرد بناتا ہے۔ تنوع ہی کی مثال کے سلسلے میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ طالب خوندمیری نے اپنی شاعری میں اپنے پیشے، فنِ تعمیر کا جس طرح استعمال کیا ہے ویسا، شاید ہی کسی اور شاعر نے کیا ہو۔ طالب کا شمار، ہندوستان کے اہم آرکیٹیکٹس (ARCHITECTS) میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے فن کی باریکیوں کو نظموں کی تعمیر و تشکیل میں نہایت حسن کارانہ انداز میں سمویا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے پیشے سے متعلق اصطلاحات اور لفظیات نہایت برجستہ اور برمحل استعمال کر کے، انہیں صرف شاعری کا حصہ ہی نہیں بنایا بلکہ شعری اُفق کو وسیع بھی کیا ہے اس ضمن میں صرف "آرکیٹیکٹ غالبا" کا حوالہ کافی ہے۔

طالب خوندمیری کی شاعری کی ایک اور خصوصیت طنز کی کاٹ یا نشتریت ہے، جو ان کی نظموں، غزلوں، قطعات کے پیکر دل میں خون کی طرح رواں دواں ہے، یہ خصوصیت نظموں سے زیادہ غزلوں اور قطعات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین نے "سخن کے پردے میں" شامل اپنے مضمون "طالب خوندمیری ایک تاثر" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

> "طنز کی وہ سطح نہایت اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے جہاں سنجیدگی اور شگفتگی دونوں آپس میں کچھ اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ آدمی روتے روتے ہنسنے اور ہنستے ہنستے رونے پر مجبور سا ہو جاتا ہے اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ ہنستے ہنستے اچانک سوچنے اور سوچتے سوچتے اچانک ہنستے کیوں لگ جاتا ہے طالب خوندمیری نے اپنی طنزیہ شاعری میں اس منزل کا سراغ پالیا ہے۔"[۴]

طالب خوندمیری کے ہاں طنز کا نشانہ بننے والے کرداروں میں خاص طور پر "نیتا" یا "لیڈر" "شاعر" "زاہد" "شیخ" "واعظ" "ناصح" "مفتی" "شیخ" "بیوی" اور خود ان کی اپنی ذات شامل ہے۔ یہ سب کردار ہمارے عصر اور ہمارے معاشرے ہی کی نمائندگی کرنے والے کردار ہیں۔ یوں تو ان کی تقریباً ہر نظم میں طنز کی کاٹ محسوس کی جاسکتی ہے کہیں بالراست اور کہیں بالراست۔ لیکن "ایک مشاعرہ کے سیلف پورٹریٹ" اور "ایک ورق" میں یہ نشتریت جتنی واضح، نمایاں اور روشن ہے اتنی کسی اور نظم میں نہیں۔ طالب خوندمیری کے ہاں طنز کا مقصد، دل آزاری نہیں بلکہ تعمیری اور اصلاحی ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

وہ طنز جس سے کسی کا سُدھار ہو جائے ؛ کلام تلخ سہی، شاہکار اپنا ہے!

گویا خود طالب اپنے طنز کو اپنا شاہکار بھی مانتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ نظموں سے قطع نظر، ان کی غزلوں اور قطعات میں نشتریت کی یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(رہنما پر طنز کی مثال)

اپنے بل بوتے پہ اکثر دور تک جاتے ہیں لوگ
رہنما کا ساتھ ہوتے ہی بھٹک جاتے ہیں لوگ

(شیخ پر طنز)

دعویٰ تو ہے آدمی کا کریں شیخ بعد میں
منبر سے پہلے خود کو تو حضرت، اتاریئے۔

(شاعر لوازمات کے حوالے سے) چائے، سگریٹ، پان، سامع اور داد
ایک شاعر کو بھلا کیا چاہیئے
(زمانہ پرطنز)

(واعظ پر طنز) ذرا سی مے بچا کر پھینک دی بوتل جو رندوں نے
تو واعظ نے اٹھا کر حسبِ عادت جیب میں رکھ لی۔

(قائد یا لیڈر پر طنز) اپنے قائد کو میسر نہ تھا چلو بھر بھی
ورنہ پانی تو بہت شہر کے تالاب میں تھا

(شوہر پر طنز اور ان کے حوالے سے اپنے آپ پر بھی) واقعہ یہ ہے کہ بیوی کی بہت داب میں تھا
کوئی شوہر ہو بہادر تو فقط خواب میں تھا

(اپنی ذات پر طنز) آنا کو آج بھاری بڑا اس کو ن پڑا
اب اس کے بعد ذرا سا بھی اضطراب نہیں۔

(بیوی پر طنز) آئینہ جانتا ہے حقیقت حضور کی
میک اپ کے بعد اپنی لطافت گنوائیے۔

ان اشعار کے علاوہ غزل کے فارم میں "ایک قائد کی دعا"، مکمل طور پر طنز میں ڈوبی ہوئی ہے طالب خوندمیری کی غزلوں کے یہ اور ایسے بے شمار اشعار، پڑھنے والے کو اپنی جگہ مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے اور روتے روتے سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔

طالب خوندمیری کا اصل ہنر جس میں طنز اور مزاح دونوں نہایت پختہ کاری کے ساتھ اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں قطعات میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ چار مصرعوں کی اکائی کا وہ اعجاز ہے جو قطعہ کے فارم (۴،۲،۵،۳) میں ہمیں ملتا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ دو ہی قطعات کافی ہیں۔

(۱) ایک محفل میں سُنایا، میں نے جب اپنا کلام
ایک اک مصرع سخن کی آبرو، ہونے لگا۔
میرے چہرے پر ٹماٹر بیک بیک آنے لگے
دیکھتے ہی دیکھتے میں سُرخ رو ہونے لگا

آخری مصرع میں "سُرخ رو" کی ذو معنویت مزہ دے رہی ہے۔

(۲) کیا کرشمہ ہے یہ زورِ علم دیں
گھپ اندھیروں میں اُجالے کھو گئے
کہہ دیا جب حضرت مفتی نے "کُن"
دفعتاً مومن بھی کافر ہو گئے۔

اس قطعہ میں طالب نے لفظ "کُن" رکھ کر، حضرت مفتی کی جو دُرگت بنائی ہے وہ دیدنی ہے۔

فیصلہ خود آپ ہی کر لیجئے : کون کلچر کس قدر پامال ہے
شیکسپیر کا محل ہے میوزیم : حضرتِ غالب کے گھر پر ٹال ہے

اس قطعہ میں غالب نے مشرق اور مغرب کی سوچ اور ان دونوں تہذیبوں کے فرق کو جس خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے وہ اظہار کا محتاج نہیں۔ مختصر یہ کہ نظموں اور غزلوں کی طرح قطعات میں بھی طالب نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔

طالب خوندمیری کے مزاج کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اور کسی سے بھی سمجھوتہ یا (COMPROMISE) نہیں کیا۔ نہ سیاسی، سماجی حالات و واقعات سے اور نہ شخصیتوں سے۔ اسی مزاج کے باعث ان کے کلام میں بے باکی کا ایک ایسا جوہر پیدا ہوگیا ہے جو انہیں اپنے عصر کے ایک سچے تخلیق کار کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ کولرج (COLRIDGE) کے نزدیک نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع میں تخیل کا وجود ڈھونڈے۔ (ہر اچھا شاعر خود اپنا نقاد بھی ہوتا ہے) اس قول کی روشنی میں طالب خوندمیری کی شاعری کا مطالعہ کریں تو "تخیل" ہی ان کے کلام کا سب سے اہم وصف قرار پاتا ہے۔ یہ تخیل اور اس کی بلند پروازی ہی تو ہے جس کے بل بوتے پر طالب نے غالب کو مختلف روپ اور بہروپ میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اُن کا تخیل جامد نہیں بلکہ رواں ہے جس کے پروں پر سوار ہو کر وہ کبھی غالب کو حسینوں کے جھرمٹ میں دیکھتے ہیں اور کبھی انہیں جنت میں جنت دکھاتے ہیں۔ کبھی وہ انگلستان پہنچ کر شیکسپیئر کے مکان کی خیر لاتے ہیں، جسے اب میوزیم بنا دیا گیا ہے تو کبھی دلی کے اُس کوچے کی خاک چھانتے ہیں جہاں کبھی غالب رہا کرتے تھے اور آج اس کی جگہ وہاں لکڑیوں کی ٹال ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا تخیل زمانی و مکانی حدود کو پھلانگ کر آنے والے زمانے میں ٹسٹ ٹیوب بیبیز کو دیکھتا اور اپنے زمانے کو ان کے نتائج اور عواقب سے آگاہ کرتا ہے۔

طالب خوندمیری کی شاعری کی جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا اُس سے قطع نظر اُن کی زبان، ان کی لفظیات اور طرزِ اظہار سے ان کی شاعری کا جو مزاج متعین ہوتا ہے اس کا بنیادی STRUCTURE یا ڈھانچہ سنجیدگی ہی کی دین ہے [illegible] انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ شعراء سے زیادہ سنجیدہ شعرا کا مطالعہ کیا ہے، چاہے وہ کلاسیکل ہوں کہ جدید۔ شاید اسی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان پر اشعار اپنی ابتدائی صورت میں مزاحیہ اور طنزیہ رنگ میں نہیں اُترتے بلکہ سنجیدہ معقول ہی کی صورت میں وارد ہوتے ہیں جنہیں وہ ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے طنزیہ و مزاحیہ اشعار کی صورت میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں ایسے کئی شعر پیش کئے جاسکتے ہیں جن کا پہلا یا آخری مصرعہ مکمل سنجیدہ طرزِ اظہار کا حامل ہوتا ہے اور کسی ایک مصرعہ میں وہ کوئی شوخی یا شرارت کر دکھاتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے۔

رکھتے ہیں آئینے سے زیادہ سنبھال کر بوڑھے بدن کو اپنے ہمیشہ بڑے میاں

اس شعر کے صرف دوسرے مصرعہ میں "بوڑھے بدن" کی وجہ سے طنز پیدا ہوا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

دیکھو تو ایک حرف کی صورت ہیں مختصر
سمجھو تو اک طویل فسانہ بڑے میاں

یہاں تو صرف ردیف "بڑے میاں" ہی کی وجہ سے مزاح پیدا ہوا ہے۔ اسی سنجیدہ فکر اور سنجیدگی کی بناء پر اُن کی شاعری میں پھکڑ پن اور ابتذال کے نمونے شامل نہیں ملتے اور نہ ہی ایسے لطائف ملتے ہیں جنہیں سن کر خواتین کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ اسی وصف نے اُن کی شاعری کو عصری آگہی عطا کی اور انہیں اپنے ہم عصر شعراء میں منفرد بنایا۔ مختصر یہ کہ طالب خوندمیری کی شاعری اپنے عصر اور عہد کی نمائندہ شاعری ہے اور طالب خوندمیری اپنے عہد اور عصر کے نمائندہ شاعر۔

طالب خوندمیری

انتخاب

”شبنم کے پھولے ہیں“

آرکیٹیکٹ غالب

ایک دن اک اجنبی غالب سے بیٹھک میں ملا
آپ نے بھی مسکرا کر یہ سوال اس سے کیا
نام کیا ہے آپ کا، کہیے کہاں سے آئے ہیں
کیا کوئی پیغامِ جاناں کی گلی سے لائے ہیں
اجنبی: نام تو عبدالغنی ہے، قدرداں ہوں آپ کا
ویسے میں اکلوتا مالک ہوں کتانہ شاپ کا
میں یہاں آیا نہیں نامہ بری کے واسطے
یا کسی معشوق کی سوداگری کے واسطے
غالب: اوہ! اچھا تو کہیے مطلب مرا کچھ اور تھا
میں زمینِ شعر کے بارے میں محوِ غور تھا
خیر یہ فرمایئے کیسے آپ کا آنا ہوا!
کس لیے اس بے نوا کو یاد فرمانا ہوا!
اجنبی: میں نے یہ سن رکھا ہے غالب آدمی ہیں کام کے
گھر کے نقشے بھی بنا سکتے ہیں سستے دام کے
غالب: ہاں میاں ہم بھی کبھی اک آدمی تھے کام کے
مقبرے، محل بنا دیتے تھے خاص و عام کے
عشق نے لیکن ہمیں یکسر نکما کر دیا
مبتلائے دردِ دل، مصروفِ نغمہ کر دیا
ہاتھ اب لاغر ہے کوئی کام کر سکتا نہیں
ضعف اتنا ہے کہ رندا جام بھر سکتا نہیں

اجنبی: خواہ کچھ ہو یہ مکاں میں آپ سے بنواؤں گا
آپ سے نقشہ ہی لے کر اب یہاں سے جاؤں گا
غالب: آپ کی ضد ہی چلو، ہو کر رہے گی کامیاب
بن تو جائے گا کوئی نقشہ مگر پہلے جناب

ق

فریج میں کچھ بوتلیں وہسکی کی منگوا دیجئے
ساتھ کوئی ساقیِ نوخیز بلوا دیجئے
غالب: آم کا موسم ہے ملغوبے بہت مرغوب ہیں
ٹوکرے اُن کے فقط دس بیس ہی مطلوب ہیں
اب ذرا فرمایئے نقشہ میں کیا کیا چاہیئے
کون سی تعمیر ہو، کیسا نمونہ چاہیئے
اجنبی: دیکھئے قبلہ مجھے کچھ ایسا نقشہ چاہیئے
جس کو سب اہلِ جہاں حیرت سے دیکھا چاہیئے

ق

ہاں! مگر اتنا رہے ملحوظ قبلہ ہوش مند
بے در و دیوار کا گھر میں نہیں کرتا پسند
یہ زمیں پر ہو، ہوا کے دوش پر ہرگز نہیں
عمدہ گھر یہ خواب ہو سکتا ہے گھر ہرگز نہیں
میرے گھر کو اینٹ، گارا اور چونا چاہیئے
التفات اس کے مقابل ۲ دونا چاہیئے

خوب گنجائش رہے دیوان خانے کے لیے
اک کشادہ ہال ہو مجرے دکھانے کے لیے
کم سے کم حمام دو رکھئے نہانے کے لیے
کچھ کھلا حصّہ رہے زلفیں سکھانے کے لیے
چار ہوں بیڈ روم، کیوں کہ چار کے قبضے میں ہوں
تین اکیلا لشکرِ جرّار کے قبضے میں ہوں
ہو اگر اسٹور میں بھی ایک کھڑکی خوب ہے
کیوں کہ بازو کے مکان والوں کی لڑکی خوب ہے
پچھلے حصّہ میں کہیں اک "چور دروازہ" رہے
بس مری محبوب تم کو اس کا اندازہ رہے
میں نے اک موٹر بھی قسطوں پر خریدی ہے جناب
دیکھئے دیجے مجھے گیراج ایسا لاجواب

ق

کار کے ہمراہ جس میں اس کا شوفر بھی رہے
آٹھ بچے، ایک بیوی اور دختر بھی رہے
غالب: ٹھیک ہے! اب آپ تھوڑی دیر ٹھہرئے گا یہاں
میں ابھی موزوں کئے دیتا ہوں کاغذ پہ مکاں

اور پھر غالب زمینِ فکر چمکانے لگے
ایک گھنٹہ بعد ہی پھر اُس سے فرمانے لگے

یہ ورانڈہ ہے تمھاری بیویوں کے واسطے
اک نیا زنداں ہے گویا قیدیوں کے واسطے
چھتیں بالائی منزل کی ہیں مثلِ کہکشاں
مثلِ دل محراب ہیں، پلکوں کے جیسی کھڑکیاں
ایک پائیں باغ ہے جشنِ بہاراں کے لیے
ایک سوئمنگ پول حسنِ نیم عریاں کے لیے
اب ذرا سا غور بالکنی پہ مری فرمایئے
میں جو کہتا ہوں ڈیکوریشن وہی کروایئے
سبزۂ شاداب کی شطرنجیاں بچھوایئے
چوبِ صندل کی بنی سب کھڑکیاں لگوایئے
گیسوئے پُرپیچ و خم کی چلمنیں ڈلوایئے
سرخیٔ لب کی یہاں ڈسٹمپرنگ کروایئے
شب کو دیواروں پہ داغِ دل لگا یا کیجئے
پھول بھی زخموں کے میزوں پہ سجایا کیجئے
ایر کنڈیشنڈ جو کمرے ہوں تو ایسا کیجئے
چھیپڑے عشاق کے سیلنگ سے لٹکا دیجئے
ایک دن میں دو دفعہ برش حمام کو
کیجئے گا سیلِ گریہ سے فلش حمام کو
مینٹیننس میں کبھی غفلت یہاں کوئی نہ ہو
ورنہ پھر ایسی جگہ رہیئے جہاں کوئی نہ ہو

لیجئے صاحب! مکاں یہ آپ کا تیار ہے
ہر سہولت اس میں ہے جو آپ کو درکار ہے
پرسپکٹیو ہے یہ میری شوخیٔ تحریر کا
آر۔ سی۔ سی پہ ہی ہے پیکر تصویر کا
اس طرف بھی دیکھئے، یہ آپ کا بیڈ روم ہے
خوبیاں کیا کیا ہیں اس میں آپ کو معلوم ہے
میں نے رکھی ہے جگہ اس میں ڈبل بیڈ کے لیے
خوب گنجائش ہے اوپر آپ کے ویڈ کے لیے

۱ PERSPECTIVE
۲ DECORATION
۳ DISTEMPERING
۴ CEILING
۵ BRUSH
۶ FLUSH
۷ MAINTENANCE

کھٹملوں کی فریاد

ایک دن اک جونک سے کچھ کھٹملوں نے یہ کہا
دیجئے خالہ ہمیں بھی کوئی ایسا مشورہ!

اب بجائے خون کوئی اور ہی شئے پی سکیں
آدمی سے دور رہ کر ہم خوشی سے جی سکیں

کیوں کہ اس میں خون اب کم ہی پایا جائے ہے
البتہ چوسا جائے ہے اس کو نہ چاٹا جائے ہے

اس کی شریانوں میں یوں تو خون ملتا ہی نہیں
مل بھی جاتا ہے تو اس میں ذائقہ کچھ بھی نہیں

کون جانے کیا بلا کھانے لگا ہے آدمی
کیسی ملاوٹ کی غذا کھانے لگا ہے آدمی

ہم جو پیتے ہیں اسے خوں ماننا بیکار ہے
کیوں کہ اس کا رنگ بھی پہچاننا دشوار ہے

اس میں سرخی سے زیادہ ہے سفیدی آج کل
خون کی صورت ہو گئی ہے چمڑی کی سی آج کل

اک زمانہ تھا کہ ہم نے خون کے دریا بھی پیئے
آج گھنٹوں چوستے ہیں ایک قطرے کے لیے

کیا کہیں خالہ ہماری پیاس بجھتی ہی نہیں
اس سے پہلے یہ گرانی خون کی تھی ہی نہیں

اب حسینوں کا رگوں میں بھی لہو باقی نہیں
ان کی محفل میں بھی کوئی خون پیرا ساقی نہیں

پہلے ان کا خون ہوا کرتا تھا مانند شراب
پی چکا تھا جو ان میں جیسے گلشن میں گلاب

چوستے ہی ان کو اپنا بھی نکھرتا تھا شباب
اک نئی کروٹ بدلتا تھا بدن میں اضطراب
پی کے خوں مست ہوکر جھومنے لگتے تھے ہم
اپنی اپنی کھٹمل کو چومنے لگتے تھے ہم

ہوگئے ہیں آج کل وہ نوجواں بھی بدمزا
جن کی شریانوں میں بہتی تھی کبھی جوشِ بلا
جن کا خوں پیتے ہی اکثر موج میں آتے تھے ہم
منہ لگاتے ہی جنھیں سرشار ہوجاتے تھے ہم

اب اُنھیں کو چوس کر بیمار پڑ جاتے ہیں ہم
سوکھ جاتے ہیں، سکڑ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں ہم
اب کہاں تک ہم کریں اپنے غموں کا تذکرہ
کچھ دِنوں پہلے ہمارے ساتھ ایسا بھی ہوا

پھوٹ نکلی تھی ہمارے جسم سے گانجے کی بو
پی لیا تھا بھول کر ہم نے کسی ہپی کا لہو
کیا کہیں، کیا کیا بلا، کیا قہر اُن کے خوں میں ہے
ٹِک ٹوِنٹی سے زیادہ زہر اُن کے خوں میں ہے

اپنی ساری چاشنی کھونے لگا ہے آدمی
ہائے کتنا بے مزہ ہونے لگا ہے آدمی
سُن چکی جب کھٹملوں کی داستانِ تشنگی
اک اداشے خوں چکاں سے جونک یہ کہنے لگی

آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہو
اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہو
اب تو میرا بھی گزارا ہے اِنھیں کے خون پر
کیا بتاؤں میں کہ اس میں ذائقہ ہے کس قدر

اُن کا خوں پی کر بہت محظوظ ہوجاتی ہوں میں
عام جونکوں کے غموں سے دور ہوجاتی ہوں میں
منہ لگاتے ہی اُنھیں چالاک ہوجاتی ہوں میں
بے مروت ہی سہی بے باک ہوجاتی ہوں میں

لہو کی جو شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا
لیکن اک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا

کس قدر خوش ذائقہ ہوتا ہے ان سب کا لہو
جو کہ جنتا کا لہو بھی پی کے ہو جاتے ہیں خوش

ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پایا جائے گا
اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزا آ جائے گا

چار سو سالہ

(حیدرآباد کے جشنِ چار سو سالہ پر)

اگر باقی ہے اب تک کوئی ثانی چار سو سالہ
سنیں اس شہر کی اس سے کہانی چار سو سالہ

زمانہ بعد، پھر اس شہر میں جشنِ چراغاں ہے
پلٹ آئی ہے بڑھاپے پہ جوانی چار سو سالہ

اگر ہوگی کہیں تمثیل دورِ قطب شاہی کی
چلیں گے ہم بہن کر شیروانی چار سو سالہ

ہم اپنے شہر کی ہر حال میں تعریف کرتے ہیں
کہ اس میں ہے شرافت کی نشانی چار سو سالہ

ہمیشہ جان چھڑکتے ہیں ہم اپنے مہمانوں پر
ہماری ہے یہ خوئے میزبانی چار سو سالہ

قلی کا دور ہو، یا آصفی یا دورِ جمہوری
محبت کی یہاں ہے حکمرانی چار سو سالہ

مگر اس شہر کو اب خاص ٹانک کی ضرورت ہے
نظر آتی ہے اس میں ناتوانی چار سو سالہ

ہیں لاکھوں گھاؤ جو اس شہر کی سڑکوں کے چہروں پر
ہے ان پر وقت کی یہ مہربانی چار سو سالہ

بڑھی ہیں قیمتیں اس شہر میں بس چند برسوں سے
مگر لگتی ہے چیزوں کی گرانی چار سو سالہ

قلی کو بھی یقیناً شہر کی حالت پہ دکھ ہوتا
اگر ملتی انھیں بھی زندگانی چار سو سالہ

بگڑنے پر بھی اس میں حسن ہے اب تک وہی باقی
کہ اس بیمار کے منہ پر ہے پانی چار سو سالہ

اگرچہ شاعری میں تو، ابھی تک طفل ہے لیکن
ترے شعروں میں طالب ہے روانی چار سو سالہ

زندگی

(مختلف طبقہ اور پیشے کے لوگوں کی نظر سے)

رکشا والا:

زندگی شاید مرے رکشہ کے اندر ہو کہیں
ویسے مجھ کو آج تک وہ تو نظر آئی نہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ پہیوں کی ہوا ہو زندگی
یہ بھی ہو سکتا ہے گھنٹی کی صدا ہو زندگی

شرابی:

آج تو پی لی ہے میں نے ایک بوتل زندگی
میرے ٹھینگے سے ہے جس حال میں کل زندگی
جب تلک زائل یہ بوتل کا اثر ہوتا نہیں
یار خاں کو اپنی بیگم کا بھی ڈر ہوتا نہیں

حجام (نائی):

زندگی ہے ہر مہینہ بال بنوانے کا نام
اپنے سر کو چاند کی مانند چمکانے کا نام
جو کوئی میری دکاں پہ اپنا منڈواتا ہے سر
ہوتے ہی آ کر پھسل جاتی ہے اس کے چاند پر

بوٹ پالش والا:

زندگی تو صاحب جوتوں کی چمک کا نام ہے
اور ان جوتوں کو چمکانا ہمارا کام ہے
بدنما بدشکل جوتوں میں نہاں ہے زندگی
کس قدر روندی ہوئی کیا بے اماں ہے زندگی
روز و شب فٹ پاتھ پر جوتوں کو چمکاتے ہیں ہم
اپنی قسمت اور کو [illegible] تو [illegible] ہم

بھکاری:

لوگ جس کو زندگی کہتے ہیں شاید بھیک ہے
اپنی قسمت سے ہمیں جیسی ملی ہے ٹھیک ہے
اس طرح ہے جان سوکھی ہڈیوں کے خول میں
ایک جعلی نوٹ ہو جیسے کسی کشکول میں

ٹریفک پولیس:

زندگی ہے ایک بے قابو سی ٹریفک کی طرح
یا کسی مصروف چوراہے پہ پنگ کی طرح
اس کو احساسِ اجل کوئی دلا سکتا نہیں
راستے میں اس کے ریڈ سگنل بھی آ سکتا نہیں

ڈاکو:

اک بڑے ڈاکے میں ہاتھ آئی ہے اپنی زندگی
ورنہ فولادی تجوری میں چھپی تھی زندگی
زندگی ہم کو کبھی ملتی نہیں ہے پیار سے
اس لیے ہم چھین لیتے ہیں اسے ہتھیار سے

دہشت پرست:

درحقیقت زندگی اک وحشیانہ راگ ہے
جس کے اجزا چیخ ہے دہشت ہے مقتل ہے آگ ہے
بستیاں جلتی ہیں جتنی زندگی پاتا ہوں میں
جب بھی جلتی ہے ہوا لے امن مر جاتا ہوں میں

لیڈر:

آج کل سنسد کی کرسی میں نہاں ہے زندگی
یہ اگر مل جائے تو پھر حکمراں ہے زندگی
اس کا ملنا بھی تو ناممکن ہے ووٹوں کے بغیر
اور ہم کو ووٹ کب ملتے ہیں نوٹوں کے بغیر

مہاجن (بنیا):

زندگی ہے اصل میں انسان کی سانسوں کا سود
اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا حساب ہست و بود
اپنی سانسوں کا ڈپازٹ جو کوئی کروائے گا
وہ بدن کے بینک سے اپنا پرافٹ پائے گا

نیم حکیم:

کپکپاتی ہے، تڑپتی کھانستی ہے زندگی
رنت نئی بیماریوں کو جانتی ہے زندگی
زندگی شاید کسی کالی دوا کا نام ہے
موت کہتے ہیں جسے "میری دوا" کا نام ہے

کلرک:

اک ادھوری فائل جیسی ہے ہماری زندگی
سُرخ فیتے سے بندھی ہے یہ بچاری زندگی
اس کے پروموشن کو اوپر سے سفارش چاہیے
یا کم از کم بھاری رشوت کی گزارش چاہیے

ٹیلی فون آپریٹر:

اس طرح ہم کو ملی ہے یہ حیاتِ مختصر
رانگ نمبر جیسے مل جاتا ہے ٹیلی فون پر
اس کا کوئی کال اپنے نام پر آتی نہیں
یہ امیروں کے سوا اوروں کے گھر جاتی نہیں

اسٹینو ٹائپسٹ:

ٹائپ رائٹر پہ مسلسل ٹائپتی ہے زندگی
کاربن پیپر سے ہم کو چھاپتی ہے زندگی
افسروں کی جی حضوری میں مرے جاتے ہیں ہم
ڈرافٹنگ ان کی غلط ہو تو دھر جاتے ہیں ہم

وکیل:

ایسے لگتا ہے کٹہرے میں کھڑی ہے زندگی
اعترافِ جرمِ ہستی کر رہی ہے زندگی
استغاثہ اس کا ہوتا ہے خود اپنے ہی خلاف
اس لیے کرتی نہیں ہے موت بھی اس کو معاف

فلسفی:

زندگی امکان کا اک نقطۂ موہوم ہے
جس کا مقصد آدمی کی عقل سے معدوم ہے
یہ ازل کے بطن سے نکلی، مکانی ہو گئی
پھر عدم سے جا ملی خلد آشیانی ہو گئی

نقاد:

جیسی ہونی چاہیئے ویسی کہاں ہے زندگی
ٹیڑھے میڑھے زاویوں کے درمیاں ہے زندگی
کوئی خوبی اس میں، میں نے آج تک دیکھی نہیں
میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں

استاد:

زندگی ہے درحقیقت ایک بوسیدہ کتاب
جس کا دیباچہ ادھورا ہے غلط ہے انتساب
اس لیئے بس ہے انہیں کے طاق میں رکھی ہوئی
عقل ہے معذور جن کی کھوپڑی ترچھی ہوئی

سلسلہ....

PROFIT I　DEPOSIT I
CALL E　PROMOTION E

شوخ و شریر نوجوان شاگرد:

یہ تو میں بتلا نہیں سکتا، ہے کیسی زندگی
ہاں مگر جس کو سمجھتا ہوں میں اپنی زندگی
وہ مری ہمسائی لڑکی ہے، مری محبوب ہے
اور مجھ سے صرف بارہ سال سے منسوب ہے
ناز والی ہے، حسیں ہے، پھول سی ہے زندگی
پانچ فٹ کا قد ہے، سترہ سال کی ہے زندگی

جدید شاعر (غزل کے انداز میں):

ہر طرف شوکیس میں رکھی ہوئی ہے زندگی
کس قدر بازار میں بکنے لگی ہے زندگی

آج بھی اپنی کتابوں کے کئی اوراق میں
مور کے پر کی طرح رکھی ہوئی ہے زندگی

اونچے محلوں میں تھی کل تک بھی شگفتہ اور اب
کائی کی صورت منڈیروں پر جمی ہے زندگی

آج پل پل نوحہ خواں ہے آپ اپنی موت پر
آج خود اپنا ہی کتبہ لکھ رہی ہے زندگی

خدشہ

رات بھی اندھیری تھی
شہر بھی تھا کرفیو میں
ہر طرف تھا سناٹا
موت کا سا عالم تھا
اک گلی میں
اک کُتیا!
کہہ رہی تھی پلّے سے
اب اٹھو!
چلو بیٹا! شب کے اس اندھیرے میں
چھپ چھپاتے ہم دونوں شہر سے نکل جائیں
ورنہ
مجھ کو خدشہ ہے
قتل ہو نہ جائیں ہم
آدمی کے دھوکے میں

قطعہ

پیاسی جنتا کے لیے لاکھوں کنویں کھودیں گے ہم
ایک نیتا کا یہ وعدہ وجہِ حیرانی نہ تھا
ہاں مگر جب اقتدار اُن کو ملا تب یہ کھلا
ان کے کھودے ہر کنویں میں پیاس تھی، پانی نہ تھا

سیاسی موڑ

رائے دہندہ اور اُمیدوار کے بیچ سمجھوتہ

(ساحر لدھیانوی سے معذرت کے ساتھ)

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے کوئی اندیشہ رکھوں چالبازی کا
نہ تم دیکھو مجھے پھر "مطلبی انداز" نظروں سے
تمہارے نام سے گالی نہ آئے میرے ہونٹوں پر
نہ ظاہر ہو تمہارے مکر دفن کا راز نظروں سے

چلو اک بار پھر سے ....

تمہیں "خود غرضیاں" اکسا رہی ہیں پھر الکشن پر
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ نیتا پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی نادانیاں ہیں ووٹ دینے کی
تمہارے ساتھ بھی تو کالے کرتوتوں کے سائے ہیں

چلو اک بار پھر سے ....

تڑپ چالوں سے نیتاؤں کی اب بیزار ہوں میں بھی
تمہیں بھی اب تھکن محسوس ہوتی ہے سیاست سے
مجھے بھی اب نہیں ہے شوق کوئی خود فریبی کا
تمہیں بھی کوئی دلچسپی نہیں جنتا کی خدمت سے

چلو اک بار پھر سے ....

یہی موقع ہے تم بھی ترک کر دو اپنی چالاکی
ادھر میں بھی بہلنا چھوڑ دوں رنگین خوابوں سے
بجھا سکتے نہیں تم بھی سمندر ریگزاروں میں
بجھا سکتا نہیں میں پیاس بھی اپنی سرابوں سے

چلو اک بار پھر سے ....

قیادت روگ بن جائے تو اُس کو بھولنا بہتر
جو کرسی بوجھ بن جاتی ہے اُس کو توڑنا اچھا
وزارت کامیابی سے اگر کرنا نہ ہو ممکن
اُسے کوئی "سیاسی موڑ" دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

تین سہیلیاں

پہلی سہیلی:

آؤ نا، اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
صبح میں نے چائے تو پی تھی مگر کھایا نہیں
چائے ممی نے بنائی تھی مگر بد ذائقہ
وہ بھی کالج میں پڑھاتی ہیں مضامینِ ادق
وہ بھی جس گھر کی پلی ہیں تھے وہاں نوکر بہت
میں تو پڑھتی ہوں، کتابوں سے مجھے فرصت نہیں
ایک پیالی چائے بھی اپنی بنا سکتی نہیں
اتنا پڑھ لکھ کر تو گھر کے کام کر سکتی نہیں
ویسے گھر کے کام تو ڈیڈی چلاتے ہیں مگر
ماسوا اُن کے تو کوئی کام والا ہی نہیں
آؤ نا، اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے

بھوک لگتی ہے کسی ہوٹل میں جا کر کھائیں گے
کیوں کہ باورچی ہمارا آج گھر آیا نہیں
کیوں کہ وہ پکوان کا رکھتی نہیں ہیں تجربہ
فلسفہ، تاریخ، حیوانی مدارج کے سبق
محنتی تھے یوں بھی نانی جان کے شوہر بہت
یوں بھی گھر میں کام کرنے کی مجھے عادت نہیں
بلکہ میں باورچی خانے تک بھی جا سکتی نہیں
اپنے کالج کو بھی میں بدنام کر سکتی نہیں
آج کل وہ بھی کہیں باہر گئے ہیں ٹور پر
اس لیے اب تک مرے منہ میں نوالا ہی نہیں
بھوک لگتی ہے کسی ہوٹل میں دوسہ کھائیں گے

دوسری سہیلی:

آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
آج بھی شاید وہ دیوانہ کھڑا ہوگا وہاں
دیکھتے ہی مجھ کو رکھ لیتا ہے وہ سینے پہ ہاتھ
گھر سے کالج تک برابر 'چیز' کرتا ہے مجھے
مسکرا کر کوئی فلمی گیت گاتا ہے کبھی
دیکھتے ہی مجھ کو سیٹی بھی بجاتا ہے کبھی
ذو معنی انداز سے اکثر ستاتا ہے مجھے

اپنے بس اسٹانڈ کا چکر لگا کر آئیں گے
کچھ دنوں سے جو نظر آتا ہے مجھ پر مہرباں
سرد آہیں کھینچتا ہے پھر اداکاری کے ساتھ
گدگدی نظروں سے بس میں 'گیز' کرتا ہے مجھے
زیرِ لب کچھ بڑبڑا کر منہ بناتا ہے کبھی
اپنی بائیں آنکھ دھیرے سے دباتا ہے کبھی
اپنی ممی کی بہو کہہ کر چڑاتا ہے مجھے

GAZE & CHASE

ہر گھڑی وہ چھیڑ کر غصہ دلاتا ہے مجھے
پھر بھی جانے کیوں اسی پہ پیار آتا ہے مجھے
کیا کہوں کتنی اجیرن ہو گئی ہے زندگی
ہو گئی ہے جان کی اس کی، میرے دل کی لگی
اب کتابوں سے بھی اللہ! بور ہو جاتا ہے دل
پڑھتے پڑھتے دفعتاً خوابوں میں کھو جاتا ہے دل
کیا بتاؤں کس قدر بے تاب میرا ہارٹ ہے
ہائے اللہ کیا کروں میں وہ بہت اسمارٹ ہے
آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے بس اسٹانڈ کا چکر لگا کر آئیں گے
اس کی صورت دور ہی سے دیکھ کر آجائیں گے

تیسری سہیلی

آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے سارے گروپ کا فوٹو کھنچوائیں گے
امتحاں تو ہو چکے، اب چھٹیاں ہونے کو ہیں
اور اس کے بعد سب کی شادیاں ہونے کو ہیں
کون جانے کل کہاں ہوں گے کدھر جائیں گے ہم
چھوڑ کر کالج نہ جانے کس کے گھر جائیں گے ہم
کون جانے کس کی قسمت میں ہے کیسا ہم سفر
کس سے ٹکرائے گا شاعر اور کس سے ڈاکٹر
کل ہماری زندگی میں اجنبی آجائیں گے
کوئی صفدر بیگ یا عبدالغنی آجائیں گے
دفعتاً تبدیل اپنی زندگی ہو جائے گی
آج کی صفیہ بھی کل بیگم صفی ہو جائے گی
آج ہم سب ساتھ ہیں، موقع نہ کھونا چاہیئے
یادگارِ عہدِ کالج کچھ تو ہونا چاہیئے
اپنا یہ فوٹو تو اللہ بیسٹ ہونا چاہیئے
فلم بھی نیو، کیمرہ لیٹسٹ ہونا چاہیئے
اپنا میک اپ بھی یہیں پھر ٹھیک کرنا چاہیئے
روپ تو کچھ اور بھی اپنا نکھرنا چاہیئے
عالیہ تو اپنی عینک ٹھیک کر لینا ذرا
دلکشی بھی پیار کی آنکھوں میں بھر لینا ذرا
تو بھی رخسانہ جی زلفوں کو بکھرا دے ذرا
آج کا فیشن یہی ہے اُن کو اُلجھا دے ذرا
ورنہ فوٹو، مانگ چوٹی میں جو کھنچوائے گی تو
دیکھ لینا، پوری کلانی نظر آئے گی تو
راشدہ، تو بھی ذرا پوڈر لگا لے گال پر
ورنہ ہم کو تو ترا چہرہ نہیں آتا نظر
ٹھیک میک اپ میں اگر فوٹو یہ کھنچوائیں گے ہم
اپسراؤں سے بھی بیوٹی فل نظر آئیں گے ہم
آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے سارے گروپ کا فوٹو کھنچوائیں گے

ایک ورق

(تلگو زبان کے مشہور شاعر غلام یٰسین مرحوم کی یاد میں)

(۱۹۸۴ء کے عام انتخابات میں شہر حیدرآباد میں بھیانک فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، جس میں غلام یٰسین اور ان کے خاندان کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ صرف ایک سات سالہ لڑکی کسی طرح قاتلوں کی نظر سے بچ گئی، یہ نظم اُسی کی زبان سے کہی گئی)

شاید جشنِ آزادی پہ
ابا تم نے
بھیا کی اِک کاپی لے کر
کچھ اچھے سے نعرے
اور کچھ پیارے پیارے گیت لکھے تھے
آزادی کے، ایک جہتی کے، حُبِّ وطن کے
آج
اُسی کاپی کا مجھ کو ایک ورق
گھر کے بکھرے سامان میں ملا ہے
جس پر تم نے یہ لکھا ہے
"ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی!
آپس میں ہیں....
آپس میں ہیں........"
اس سے آگے جانے تم نے کیا لکھا تھا
بھیگے بھیگے، پھیلے پھیلے، مدھم مدھم لفظوں کو میں
دیکھو کب سے گھور رہی ہوں
لیکن ابا!
اب تو ان کا پڑھنا بھی ناممکن سا ہے
کیونکہ ان پر
خون تمہارا پھیل گیا ہے

سرور ڈنڈا مرحوم کی یاد میں

مجھ کو ڈنڈا پہ آج لکھنا تھا
کچھ تو حسبِ رواج لکھنا تھا
دل میں آیا مگر خیال نیا
کیوں اٹھاؤں نہ میں سوال نیا
ان کی تعریف ہی میں کیوں لکھوں
ان کے عیباں بھی جیوں کے تیوں لکھوں
کیوں نہ ڈھونڈوں برائیاں ان میں
بیسیوں ہوں گی خامیاں ان میں
ناقدانہ جو کی نظر ان پر
عیب سب ان کے آگئے کھل کر
سب سے پہلی یہی خرابی تھی
ان کی فطرت ہی انقلابی تھی
یہ بھی کوتاہیاں تھیں ڈنڈا کی
خوش دلی، خوش کلامی، بے باکی
ایک یہ بھی قصور تھا، ان کا
دل بہت ہی غیور تھا، ان کا
یہ بھی ان کی ستم شعاری تھی
ان کو دکھنی زبان پیاری تھی
ایک یہ بھی گناہ کرتے تھے
دوستوں سے نباہ کرتے تھے

[illegible] میں تجار نہ تھا
لیڈروں میں کبھی شمار نہ تھا
ان میں کوئی بڑا کمال نہ تھا
کیوں کہ ان کی گرہ میں مال نہ تھا
عیب یہ بھی جناب رکھتے تھے
دل بڑا لاجواب رکھتے تھے
زندہ دل بھی تھے، خندہ لب بھی تھے
تھوڑے گستاخ و بے ادب بھی تھے
بزمِ شعر و ادب کی جان بھی تھے
وہ "ظرافت نواز خاں" بھی تھے
وہ فقط اک ظریف شاعر تھے
سیدھے سادے، شریف شاعر تھے
ڈپلومیٹک نہ تھا کلام ان کا
تھا سیاسی شعور خام ان کا
تھی یہ سب سے بڑی خطا ان کی
چل رہی تھی بہت ہوا ان کی
ان کے کردار میں بڑائی تھی
عمر بھر کی یہی کمائی تھی
"نہ گلِ نغمہ" تھے "نہ پردۂ ساز"
وہ تھے "اپنی شکست کی آواز"

نذرِ مصطفیٰ کمال

(ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی کتاب کی رسمِ اجراء کے جلسے میں پڑھی گئی)

جس مختصر بدن میں چھپا ہے بڑا کمال
طالب اسی کا نام ہوا مصطفیٰ کمال

اندر سے کون جانے یہ لگتے ہیں کس قدر
باہر تو اوڑھتے ہیں بڑا دبدبہ کمال

تالیف نسخہ ہائے شگوفہ کے ساتھ ساتھ
تصنیف کر رہے ہیں کتابِ وفا کمال

اِس دورِ بے حسی میں بھی اپنے وجود سے
اردو زباں کے درد میں ہیں مبتلا کمال

ملتی رہیں انھیں بھی کئی کرسیاں مگر
ان سے بھی کچھ اٹھا نہ سکے فائدہ کمال

ہلکی سی اک ہنسی میں مسائل کو ٹالنا
ہے مصطفیٰ کمال کا سب سے بڑا کمال

رکھتے ہیں مہ وشوں سے برابر معاملے
لیکن ہیں دیکھنے میں بڑے پارسا کمال

غیروں پہ جانے دھونس جماتے ہیں کس طرح
اپنوں کے درمیاں تو ہیں فرماں روا کمال

یاروں کو پہلے دامِ مباحث میں پھانس کر
پھر داغتے ہیں اپنا کوئی فیصلہ کمال

برتاؤ دوستوں سے وہی ہے کبھی کبھی
رکھتے ہیں جو سلوک عدو سے روا کمال

اوروں پہ ڈالتے ہیں کمندِ نظر، مگر!
رہتے ہیں آئینہ سے ہمیشہ خفا کمال

ایسا گناہ اُن سے جو سرزد نہ ہو سکا
دیتے رہے ہیں خود کو اسی کی سزا کمال

اپنا لہو دہن میں "شگوفوں" کے ڈال کر
کرتے رہے مزاج کی نشو و نما، کمال

غزل

خلوصِ دل سے ہر سوغاتِ رشوت جیب میں رکھ لی
سمجھ کر اس کو سرکاری امانت جیب میں رکھ لی

گرا دی تھی کسی نے راہ میں بھاری رقم، اپنی
ہمیں مقصود تھی اُس کی حفاظت جیب میں رکھ لی

ہم اپنے دل کی حالت لکھ کے جس میں اُس کو دے آئے
وہ چٹھی اُس نے از راہِ عنایت، جیب میں رکھ لی

ہمارے کوٹ سے تصویرِ جاناں گر پڑی گھر میں
یہ ہم نے کیا کیا کیسی مصیبت، جیب میں رکھ لی

ذرا سی مے بچا کر پھینک دی بوتل جو رندوں نے
تو واعظ نے اٹھا کر حسبِ عادت جیب میں رکھ لی

بزعمِ خود جو اپنی جیب میں دنیا کو رکھتے تھے
اسی دنیا نے خود اُن کی رعونت جیب میں رکھ لی

سرِ محفل [illegible] شیخ نے رسوا کیا اکثر
سرِ مے خانہ ہم نے بھی شرافت جیب میں رکھ لی

قطعات

ہر اک بھاشن میں یہ کہتے ہیں نیتا
"ہمیں اردو زباں پیاری بہت ہے"
مگر انداز سے لگتا ہے ایسا
حقیقت کم اداکاری بہت ہے

بوتلیں جب خریدتے ہیں ہم
آپ انگور لینے آتے ہیں
شیخ جی آپ بھی تو مے کش ہیں
ہم تو پیتے ہیں، آپ کھاتے ہیں

سوئے منزل ہزاروں قدم جب بڑھے
کارواں میں مسافت کا دکھ بٹ گیا
دھوپ جتنی تھی سب راہ نے لی گئے
رہنما کا سفر چھاؤں میں کٹ گیا

"پیاسی جنتا کے لیے لاکھوں کنوئیں کھودیں گے ہم"
ایک نیتا کا یہ وعدہ وجۂ حیرانی نہ تھا
ہاں مگر جب اقتدار اُن کو ملا تو یہ کھلا
اُن کے کھودے ہر کنوئیں میں پیاس تھی، پانی نہ تھا

اک نوجوان اتنا کفایت شعار تھا
دیکھو وہ کس سلیقے سے پیسے بچا گیا
شادی کے بعد اپنے ہنی مون کے لیے
شملہ کی وادیوں کو اکیلا چلا گیا

وہ مجھ سے اکتیس دسمبر کی رات کو
کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بھونچال آگیا
ہکلا رہا تھا اتنا وہ دورانِ گفتگو
دو لفظ کہہ سکا کہ نیا سال آگیا

● گجرات کے کسی منتری نے کچھ گدھوں کو دھوبیوں کے ظلم سے نجات دلوا کر ان میں سے ایک گدھے کے ساتھ تصویر کھنچوائی اور اخبار میں چھپوائی۔
اسی موضوع پر.....

آدمی جس میں کھڑا ہے ایک چوپائے کے ساتھ
ایسی اک مدھم سی فوٹو زینتِ اخبار ہے
نیچے "منتری اور گدھا" لکھا ہوا تو ہے مگر
کون جانب ہے گدھا پہچاننا دشوار ہے

شاعری ہو نثر میں یا قافیوں میں قید ہو
آج اس موضوع پر کچھ شاعروں میں جنگ ہے
ہم بھی کہتے ہیں کہ بہتر ہے یہ نثری شاعری
کیوں کہ اب اردو زباں کا قافیہ ہی تنگ ہے

● سائنس کے ایک طالب علم نے اپنی محبوبہ سے سائنس ہی کی زبان اور لہجہ میں کہا

کثیف اتنی کہ مثلِ [illegible] ہو گئی ہو تم
خفیف اس قدر جیسے کہ [illegible] ہو گئی ہو تم
نہ ہو تم تو ہمارا سانس [illegible]
ہمارے حق میں گویا آکسیجن ہو گئی ہو تم

غزلیں

[illegible] سی بات تھی چمن کو آندھیاں ڈستی رہیں
برگ و گل کو خود شجر کی ٹہنیاں ڈستی رہیں

چیخنا چاہا تو [illegible] کا خیال آتا رہا
چپ رہا تو ہر گھڑی خاموشیاں ڈستی رہیں

دشمنوں کی انگلیاں اٹھتی رہیں میری طرف
اور کچھ احباب کی ہمدردیاں ڈستی رہیں

بے حسی، کینہ، تعصب، [illegible]، مکاری [illegible]
ناگنیں تھیں یہ ہمارے درمیاں ڈستی رہیں

[illegible] صحرا کو صلہ ہم کو سرابوں سے ملا
ہم وہ پیاسے تھے کہ جن کو ندیاں ڈستی رہیں

[illegible] فیتوں سے سب محرومیاں باندھی گئیں
سادہ لوحی کو ہمیشہ کرسیاں ڈستی رہیں

[illegible] کے عجز نے اونچا کیا
اور کچھ ایسے جنھیں خوش فہمیاں ڈستی رہیں

[illegible] آنکھوں میں چھپے کتنے سہانے منظر مگر
کھل گئیں آنکھیں تو پھر بیداریاں ڈستی رہیں

کیا یہی تعبیر تھی طالب ہمارے خواب کی
بیڑیاں ٹوٹیں مگر آزادیاں ڈستی رہیں

○

[illegible] غبارِ خاک کو بکھر کی پیاس ہے
ہر خشتِ رائیگاں کو کسی گھر کی پیاس ہے

[illegible] میں [illegible] کے چہرے اتر گئے
لیکن سماعتوں کو سمندر کی پیاس ہے

[illegible] بوند بوند [illegible] لہو صرف کر چکا
پھر بھی میرے ہنر کو مرے سر کی پیاس ہے

[illegible] کو کٹتے دیکھ کے دریا بھی ڈر گیا
جب اس کو یہ لگا کہ برابر کی پیاس ہے

[illegible] ہر شخص [illegible] پہل بھی یہ اطمینان بھی
[illegible] شہروں کو آج ایسے ہی منظر کی پیاس ہے

غزل

گفتگو جب رہگزاروں میں چھڑی دیوار کی
کس قدر محسوس ہوتی تھی کمی دیوار کی

گھر سے میں گھبرا کے نکلا تو تعاقب میں مرے
دور تک صحرا میں آئی چھاؤں بھی دیوار کی

[illegible] ہم سے بھی جسم و جاں کا ہوتا ہے زیاں
کھوکھلی کرتی ہے بنیادیں نمی دیوار کی

جانا پہچانا سا اک چہرہ ابھر آیا وہاں
میرے گھر میں جب کہیں سے بھی چھڑی دیوار کی

جانے کس لمحہ ایک جائے حدود جسم سے
زندگی بھی جیسے بنی ہے کسی دیوار کی

وہ گلی بھی اب کس قدر نامانوس لگتی ہے ہمیں
جب صدا دیتی ہے کھڑکی اجنبی دیوار کی

گھر کے سب افراد بہرے ہو گئے جس شور سے
چیخ تھی شاید کسی گرتی ہوئی دیوار کی

رات بھر ڈھاتا رہا میں ہر تعلق کی فصیل
صبح دم پھر تیری یادوں نے کھڑی دیوار کی

چیدہ چیدہ

ہمیں سے جب کوئی پتھر نہ آیا
بدن اپنا لگا ہم سب کو پرایا

بہت شاداب ہے نخلِ تمنا
جھلس دیتا ہے لیکن اس کا سایا

تمہارا شہر تھا، تم حکمراں تھے
مگر ہم بھی نہ تھے کوئی رعایا

•

دنیا کا کوئی لطف نہیں یار نہ ہو تو
کیا خاک جئیں لذتِ آزار نہ ہو تو

مجھ سے مرا سرمایۂ [illegible] نہ مانگے [illegible]
یہ بات بھی میرے لیے دشوار نہ ہو تو؟

سر پھوڑ لوں اپنا ترے [illegible]
مضبوط تمہارے قصر کی دیوار نہ ہو تو

[illegible]

جب سوا نیزے پہ سورج اتر کر آئے گا
میرا سایہ بھی مرے قد کے برابر آئے گا

پیاس کا پھیلا ہوا صحرا پڑے گا بعد میں
سامنے پہلے سرابوں کا سمندر آئے گا

•••

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

عام شمارے کی بجائے طالب خوندمیری کے فن اور شخصیت کے جائزے پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ نامور طنزیہ و مزاحیہ شاعر طالب خوندمیری کا مجموعہ کلام "سخن کے پردے میں" خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے جس کی رسم اجرا ۲۱ ستمبر ۹۲ء کو جناب نریندر لوتھر نے انجام دی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اکتوبر کا شمارہ، طالب کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کے لیئے وقف کر دیا۔ وقت کی کمی کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ اُن کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں کا ذکر ہو۔ طالب کے کلام (شعرِ سنجیدہ) کا انتخاب اور ان کے بنائے ہوئے چند منتخب کارٹون بھی اس شمارے میں شریک کر دیئے گئے ہیں۔ ان شمولات کے توسط سے طالب کی پہلودار شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

طالب خوندمیری کوئی پینتیس ۳۵ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ مشاعرہ بازی میں کسی حد تک مبتلا ہونے کے باوجود انھوں نے فن کی اعلیٰ قدروں کو کبھی مجروح ہونے نہیں دیا۔ داد و تحسین کی بے جا خواہش شاعروں کو لے ڈوبتی ہے۔ طالب نے کبھی شاعروں کے عام مذاق سے مفاہمت گوارا نہ کی۔ اور ہمیشہ اپنے مخصوص رنگ میں شعر کہتے رہے۔ آج جب کہ مزاحیہ شاعری کے اصل روپ کو گہن لگ رہا ہے اور بہروپیوں کی خوب بن آئی ہے، طالب طنز و مزاح کی اعلیٰ روایات کو جس کے امین دلاور فگار، رضا نقوی واہی اور ضمیر جعفری ہیں، زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ فنی رچاؤ کے ساتھ طالب بڑے چاؤ سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے مضامین میں تنوع و تازگی، زبان میں چاشنی اور اظہار میں طرفگی ہے وہ بعید از قیاس مبالغہ سے احتراز کرتے ہوئے اپنے عصر اور اس کے مسائل کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ طالب کی طبیعت ہمیشہ حاضر رہتی ہے۔ وہ خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فی البدیہہ شعر کہنے پر بھی قادر ہیں۔ وہ جدید لہجہ میں خوبصورت سنجیدہ شعر کہتے ہیں۔ شگوفہ کے سرورق تو وہ بناتے ہی رہتے ہیں کبھی کبھار کارٹون بھی بنا لیتے ہیں۔ وہ ایک بہترین انسان، توکل پسند، قسمت پر قانع شخص ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ طالب کا شعری سفر نہ صرف جاری رہے بلکہ ادب و شعر کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچے۔

حیدرآباد کی چار سو سالہ تقاریب تو منعقد نہیں ہو سکی تھیں۔ لیکن اب، فیسٹول آف حیدرآباد کا ۷ تا ۱۸ اکتوبر ۹۲ء اہتمام ہو رہا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب فیسٹول کے ساتھ شریک کر دی گئی ہیں — ۱۱ر اکتوبر کو سینٹرل لائبریری پر ادبی اجلاس، ۱۷ر اکتوبر کو چو محلہ پیالیس پر شام لطیفہ اور ۱۸ر اکتوبر کی شام ۶ بجے فلک نما پیالیس پر کل ہند مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوگا۔ اس موقع پر شگوفہ کا سوونیر بھی شائع ہوگا۔

★

.N.No. 15822/68

SHUGOOFA
HYDERABAD

Postal Regd. No.H/HD-

ol. 27 Copy : 10

Phone : 595716

OCT/94

یوسفی صاحب نے تیسرا تیر "زرگزشت" لکھ کر چلایا ہے اور اپنے کو خواہ مخواہ ہی ایک بینک کی دولت سمجھ کر، اس کی روداد، یعنی آپ بیتی کے لئے ساڑھے تین سو ہنستے ہوئے سادے صفحات رلا رلا کر سیاہ کر ڈالے ہیں۔ ان کی یہ تحریر ایک بانکی اور نرالی طرزِ ادا کے ساتھ، تیر نظر یا قلب و جگر کے ٹکڑے نہیں، نوکِ قلم سے ہی عالم نیستی سے صفحۂ ہستی پر وجود میں آتی ہے۔ اپنی اسی قدیم طنز و مزاح کے اعلیٰ معیار کی، انھوں نے اپنی اس سوانح میں جو عزت افزائی بلکہ تاجپوشی فرمائی ہے، اس سے ان کی تحریری فطرت و محنت ہی نہیں عزت و محبت، عصمت و نزاکت ——— توبہ توبہ، صنعت و حرفت نہیں نہیں، عظمت و شوکت وغیرہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

جناب یوسفی مارواڑی ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ پیشہ کرتے ہیں یہودیوں کے ایجاد کردہ مرافہ یعنی ——— ساہوکاری کا مطلب یہ کہ جدید ادبی اصطلاح میں بینکر (BANKER) بلکہ زندگزیدہ ہیں۔ اسی لئے انھوں نے اپنے اس روپیہ سے متعلقہ سودی لین دین اور اس کی دلالی میں ڈیبٹ، کریڈٹ کے کولھو سے جُتتے ہوئے افراد کی داستان پارینہ کی منظر کشی بلکہ تصویر کشی کچھ اس طرح پیش کی ہے کہ اس پرائی دولت پر کنڈلی مار کر بیٹھنے والے ان ناگوں کا ڈسا پانی نہیں مانگتا اور ہنستے ہنستے جواں جان اکلوتی جان اپنے کو اسمٰعیل ذبیح اللہ سمجھ کر یوسفی کی سرگزشت کے حوالے کر دیتا ہے ایسا لگتا ہے کہ ان کا یہ بینک دورِ قدیم کی چند کٹھ پتلیوں اور دورِ جدید کے متحرک کارٹونوں کا بڑا ہی لطیف عجائب خانہ ہے۔ اس "کارِ جہاں دراز ہے" سے چند نمونے لے جو باعثِ تسکین بھی ہیں، میں نے بھی چرا لینے کی سعی ناکام کی ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"اپنی تحریر میں کاٹ چھانٹ کرنے اور حشو و زوائد نکالنے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے یہ تو ایسا ہی عمل ہے جیسے کوئی سرجن اپنا اپنڈکس آپ نکالنے کی کوشش کرے۔"

"ع کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے ——— کچھ رواداری میں بنائے ہوئے چار کول اسکیچ ہیں، کچھ کیریکیچر اور تین چار جی لگا کر بنائی ہوئی کچھ تصویریں ——— آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور از راہ کسرِ نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے ممکن ہے کہ بعض پڑھنے والوں کو اس خود نوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو عین قرینِ حقیقت ہوگا اس لئے اپنی زندگی میں ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقع ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے، عقیقہ، نکاح اور تدفین۔" (باقی آئندہ)